ماہنامہ چراغ راہ کراچی — ماہ جولائی سنہ ۱۹۵۱ء

جلد ۴ —— شمارہ ۷

۹-لوٹیا بلڈنگ — آرام باغ روڈ

مندرجات

سالانہ چندہ پانچ روپیہ — قیمت فی پرچہ ۸ آنے

ادارہ تحریر —— ۱۲- شاہ جمال - اچھرہ —— لاہور

سوچ بچار

"یوں بھی ہوتا ہے"

۱۱ مئی سنہ ۵۴ کا لکھا ہوا ایک خط لاہور سے چلا اور دفتر چراغِ راہ کراچی سے ہوتا ہوا آج مجھے لاہور میں موصول ہوا ہے۔ خط جوں کا توں درج ذیل ہے:-

"آپ کے لکھے ہوئے ایک مضمون "یوں بھی ہوتا ہے" کو چراغِ راہ کے مئی کے شمارہ میں پڑھا اور "عبدالحق" کی طرح تین دفعہ پڑھا، جیسے اس نے شمارہ کے مضمون "ابھار" کو پڑھا تھا۔ میری کایا پلٹ گئی ہے اور میرے خیالات یکسر بدل گئے ہیں۔ سچ پوچھئے تو میں معصیت کے سمندر میں ڈوبنے کو تھا۔ ایک کالج کے لڑکے کی حیثیت سے مجھ میں بھی بعینہ وہی برائیاں اور لغزشیں پائی جاتی تھیں جو کہ آپ نے عبدالحق میں depict کی ہیں۔ میں اس وقت عجیب بحران میں مبتلا ہوں جس طرح کسی سمندر کے ڈوبتے ہوئے کو باہر لا کھڑا کیا جائے۔ الفاظ میرے پاس نہیں ہیں کہ میں کیا لکھوں اور کیا نہ لکھوں۔ خدا سے دعاگو ہوں کہ وہ آپ کو اس نیک کام کی جزا دے۔ میں اپنے ذہنی خلفشار پر آہستہ آہستہ قابو پا رہا ہوں اور چند ہفتوں میں امید ہے کہ سکونِ قلب آجائے گا۔

نہ جانے اور کتنے انسانوں کے لئے آپ کا مضمون چراغِ راہ ثابت ہوگا!"

کون اندازہ کرسکتا ہے کہ یہ خط، ایک معصوم دل کے جذبات کا یہ بے لوث اظہار مرتبِ چراغِ راہ کے لئے کتنی بڑی مسرت کا پیغام لایا ہے۔ "یوں بھی ہوتا ہے" کی فنی حیثیت نہ جانے اساتذہ کی نگاہ میں کیا ہوگی، اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس کی فنی نگاہِ تنقید کتنی ہی کمزوریاں بھانپ لیگی، لیکن ساری دنیا کے اساتذۂ فن اور ماہرینِ شعر و ادب مل کر بھی "یوں بھی ہوتا ہے" کو فن کا ایک بلند پایہ اور بے عیب نمونہ کہہ کر مجھے اتنی مسرت نہیں دے سکتے جتنی ایک نوجوان کے ان الفاظ میں پنہاں ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ دنیا کی یہ سب سے بڑی داد ہے جو مجھے ملی ہے۔

یہ کوئی پہلا موقع نہیں، بلکہ اللہ کی طرف سے مجھ پر یہ عنایت پہلے بھی ہوتی رہی ہے۔ تقسیم سے پہلے "فسادات" پر میں نے ایک مضمون لکھا تھا جو پمفلٹ کی صورت میں بھی شائع ہوا۔ اس پمفلٹ کو پڑھ کر ایک ہندو نے عجیب تاثرات لئے اور اسلام اور جماعت اسلامی کے لئے اس کے دل میں محبت و دلچسپی پیدا ہوگئی۔ اس کے بعد دوسرا موقع "کمیونزم یا اسلام؟" کی اشاعت پر آیا۔ اس پمفلٹ کو پڑھ کر چند نوجوانوں کے ذہنوں میں نمایاں تبدیلیاں پیدا ہوئیں اور اس کی اطلاع مجھے ملی۔ پھر اس کے بعد "دارالسلام" کے عنوان سے میں نے جو خاکہ قلمبند کیا تھا اور ابھی قریب ہی میں چراغِ راہ میں شائع ہوا ہے اس پر ایک مرتبہ اور مجھے حقیقی داد ملی، جس ایثار کا نمونہ اس میں پیش کیا گیا تھا اسے پڑھ کر ایک خاتون نے اپنے گھر میں وہی کر دکھایا۔ اور اب یہ خط ہے جو اس وقت پیشِ نظر ہے۔

اسلام پسند ادیب کے لئے اصل کامیابی، اصل مسرت اور اصل داد یہی ہوسکتی ہے کہ اس کی دعوت زندگیوں کو عملاً بدل دے۔ واقعہ یہ ہے کہ جس طرح وہ ادیب قابلِ لعنت، اور وہ ادب قابلِ ترحم و ملامت ہے جو زندگیوں کو صالح قدروں سے اکھیڑ کر ان میں انتشار پیدا کرے، اسی طرح وہ ادیب انسانیت کا سچا خادم اور وہ ادب قابلِ صد فخر ہے جو انسانی سپرٹ کو ناپاک بنیادوں سے ہٹا کر پاکیزہ بنیادوں پر استوار کرکے دکھائے۔ فاسد ادب کے خلاق جتنی زندگیوں پر اثر ڈالتے ہیں، ایک دن آنے والا ہے کہ وہ ان سب کے بارے میں حساب دینے پر مجبور ہوں گے، اور صالح ادب کے پیدا کرنے والے جتنی زندگیوں کو سنوارتے ہیں، ایک دن آنے والا ہے کہ وہ ان سب کی سعادتوں سے حصہ پائیں گے۔ کون جانتا ہے کہ ایک انسانی زندگی کو اخلاقی مریض بنا دینا یا روحانی طور پر ہلاک کر دینا کتنا ہولناک جرم ہے اور کسے معلوم کہ ایک انسانی زندگی کی اخلاقی صحت بحال کر دینا اور اسے روحانی موت کے خطرے سے باہر نکال لانا پورے عالمِ انسانی

کی کتنی بڑی ضرورت ہے۔ اس ضرورت کی تشفی کے لئے اگر ہمیں کچھ بھی توفیق دی ہے تو ہم ہر لحظہ اس کے شکرگزار ہیں، اور توقع رکھتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ نے [illegible]
کو ہمارے نامۂ اعمال میں شامل فرمائے تو یہ شہادتِ خیر اپنے گناہوں کے لئے کفارہ بن جائے۔ اگر "چراغِ راہ" کسی ایک زندگی کے سنوارنے کا ذریعہ بھی بن سکا ہے تو
ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری محنتیں رائگاں نہیں گئیں۔

ان سطور کو پڑھتے ہوئے اس بات پر غور فرمائیے کہ "اسلامی ادب" کا اصل مقصد ہے کیا؟ ——— وہ مقصد لوگوں کو روحانی موت کے خطرے سے بچا
نکالنا ہے۔ پس اسلامی ادب کے کامیاب نمونے وہی ہو سکتے ہیں جو عملاً ذہنوں اور سیرتوں کو مروجہ سانچوں سے آزاد کر کے اسلامی سانچے میں ڈھال دکھائیں۔ طرزِ
بیان، تخیل، کردار، جذبات، ترتیب، جو کچھ بھی ہم انتخاب کریں اپنے گرد و پیش پر اچھی طرح نگاہ ڈال کر اسی مقصد کے مطابق کریں کہ ہماری نگارشات
زندگیوں کو بدل سکیں۔ یہ اگر نہ ہو تو پھر چاہے ہم اپنی تحریروں سے کتنا ہی حسنِ ظن رکھتے ہوں اور چاہے ہمیں اساتذۂ وقت تک کی طرف سے کتنی ہی داد ملتی رہے،
ہم درحقیقت ایک ایسا "ذوقِ بے معنی" پیدا کر رہے ہیں جس سے تفریح اور خوش وقتی کا کام تو لیا جا سکتا ہے لیکن کوئی انقلاب نہیں لایا جا سکتا۔

پھر اس واقعے سے ہمارے خیرخواہوں کو بھی، ہمارے دیانتدار ناقدوں کو بھی، اور ہمارے متعصب مخالفین کو بھی یہ سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے کہ ہم کام کیا کرنے چلے
ہیں۔ ہمارا مذاق اڑانے والوں اور ہماری علمی تہی دامنی پر پھبتیاں کسنے والوں اور ہمارے اوپر کفر کا فتویٰ لگانے والوں کو یہ حقیقت محسوس کرنی پڑے گی کہ وہ کام
جس کے آپ لوگ اجارہ دار بنے ہوئے تھے، اب ہم جیسے عامیوں کے ہاتھوں سرانجام پا رہا ہے۔ آپ اپنے "مرید" پیدا کرنے میں مصروف ہیں اور یہاں اللہ تعالیٰ کے فضل
و کرم سے "مسلم" پیدا ہو رہے ہیں۔ آپ لوگوں کو ایک فرقے سے توڑ کر دوسرے فرقے میں گھسیٹتے رہتے ہیں اور یہاں الحاد اور فسق کی صفوں سے کام کے نوجوانوں کو توڑ توڑ
کر اس "الدّین" کے محاذ پر لایا جا رہا ہے جو تمام فرقہ بندیوں سے علیٰحدہ رہتا ہے۔ آپ بلاتے ہیں مناظرانہ بحثوں کی طرف اور یہاں بلایا جا رہا ہے حقیقتِ ایمان کی طرف۔
آپ نے "تزکیہ" کی جو تکنیک اختیار فرمائی تھی اب وہ زنگ آلود ہو چکی ہے اور یہاں وہی تزکیہ ایسے طریقوں سے ہونے لگا ہے جن کی تحقیر کرنے میں آپ کبھی کوتاہی نہیں کیا
کرتے۔ آپ جس "لطیفے" کے حصول کے لئے اپنی درگاہوں پر برسوں آدمی سے ناک رگڑواتے ہیں اور عالمِ اسرار کی کئی منزلیں طے کراتے ہیں یہاں اللہ تعالیٰ کے
فضل و کرم سے وہی بغیر ان ساری حرکتوں کے براہِ راست اللہ تعالیٰ کے ہاں سے عطا ہو رہی ہے۔

ہم دراصل الحاد و فسق کے سیلاب میں ڈوبنے والوں کی جانیں بچانے کی مہم لے کے اٹھے ہیں۔ ہماری آنکھوں کے سامنے ہمارے محترم بزرگ، ہمارے عزیز بھائی،
ہماری محبوب نسلیں، ہماری قابلِ عزت خواتین کی ایک بھیڑ کی بھیڑ ہے کہ جس کا ہر فرد حالتِ اضطرار میں مبتلا ہے۔ ان میں سے جو کشتیوں پر بھی سوار ہیں ان کی کشتیاں
ان کی مرضی کے خلاف دھارے پر بہی جا رہی ہیں، اور کیسے بعد دیگرے ان کشتیوں کا الٹنا ہولناک سماں پیدا کر دیتا ہے۔ پھر جو ٹوٹے پھوٹے تختوں کو ہاتھوں
میں دبائے بہے ہیں ان کا حال اور بھی زیادہ دردناک ہے، پھر کچھ وہ ہیں جو غوطے پر غوطے کھا رہے ہیں اور تنکوں کے سہارے تلاش کر رہے ہیں۔ یہ منظر
بہت سے "جانِ بہ ساحل بردہ" لوگوں کیلئے سامانِ تفریح بھی ہے اور نہنگوں اور گھڑیالوں کی تو بن آئی ہے کہ شکار عام ہے لیکن یہی منظر غم انگیز ہماری غیرتوں
کے لئے تازیانہ بن گیا ہے اور ہمیں جب سے اللہ تعالیٰ نے دھارے کے خلاف زور لگانا اور موجوں کا سینہ چیرتے ہوئے سیدھا نکل جانا سکھایا ہے۔ ہماری مختصر
سی ٹیم اس مہم میں مصروف ہے کہ زیادہ سے زیادہ جانوں کو اس سیلابِ ہلاکت سے بچا نکالے۔

ہمارے سامنے جانیں بکتی ہیں، ہمارے سامنے اخلاق لٹتے ہیں، ہمارے سامنے عزت و عصمتوں کے چراغ گل ہوتے ہیں، ہمارے سامنے شرم کی آنکھوں کا پانی
مرتا ہے، ہمارے سامنے جوانیاں معصیت کی غلامی میں چلی جاتی ہیں، ہمارے سامنے روحانی روگ لگتے ہیں، ہمارے سامنے اصولوں کا قتلِ عام ہوتا ہے،
ہمارے سامنے حمیت کے جنازے نکالے جاتے ہیں، ہمارے سامنے مفاد کے لئے ایمان لٹتے ہیں ——— اور یہ سب کچھ دیکھ کر ہم بے چین ہیں اور جو کچھ
ہم سے بن پڑتا ہے، ہم کئے جا رہے ہیں۔

اس مہم میں ساری جد و جہد، ساری دوڑ دھوپ، ساری کشمکش جس مقصد کے لئے کی جاتی ہے اس میں وہ مزہ ہے کہ کیف آمیز بادہ بھی [illegible]
——— لیکن وہ گھڑی تو کچھ عجیب ہی گھڑی ہوتی ہے جب ہم کسی جان کو گرداب بلا سے نکال لینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اس گھڑی کے مزے سے مزا

سوچ بچار

کوئی سروے اب تک محسوس نہیں کیا جا سکا۔ ایک ماں جس کا بچہ عالم شیر خوارگی میں کھو گیا ہو اور وہ اسے برسوں کے بعد جوان ہو کر کہیں سے اچانک آ ملے تو
شاید اسے وہ خوشی نہ ہوتی ہوگی جو ایک زندگی کو موجودہ مفسدانہ ماحول کے بے رحم پنجے سے چھڑا کر ہمیں ہوتی ہے ۔
یہ ہے ہمارا کام! اب آپ خود سوچ لیجئے کہ اس کام کے ساتھ آپ کو کیا سلوک کرنا چاہیئے!

مذکورہ بالا خط کا جواب لکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ صاحب خط کا پتہ مکمل درج نہیں، لہٰذا وہ جواب یہاں درج کیا جاتا ہے تاکہ موصوف تک پہنچ سکے:-

عزیز محترم! السلام علیکم و رحمۃ اللہ

آپ کا خط کراچی کے دفتر سے ہوتا ہوا ۲۰ کی شام کو مجھے موصول ہوا۔ اس خط سے مجھے جو مسرت ہوئی میں اسے آپ سے بیان نہیں کر سکتا۔ "یوں بھی ہوتا ہے" کی داد اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہو سکتی۔ ایک زندگی جس ادیب کی کسی تحریر کے اثر سے معصیت کے پنجے سے نکل آئے اسے اپنی محنتوں کا وہ صلہ مل گیا جس سے بڑا صلہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

ہدایت دینے والا تو بہر حال اللہ تعالیٰ ہے۔ اگر کسی کا دل ایک نور کو قبول کرنے کے لئے تیار ہو، اور ذہن کے دریچے بالکل ہی بند نہ پڑے ہوں تو کسی نہ کسی دن شعاعیں اس میں داخل ہو کر اجالا کر ہی دیتی ہیں۔ سلیم الفطرت انسانوں کی علامت ہوتی ہی یہ ہے کہ وہ ہمیشہ ہدایت کے لئے ذہن کے دروازے کھولے بالکل چشم براہ بیٹھے ہوتے ہیں، اور جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی کاروان ہدایت وارد ہوتا ہے تو وہ بلا پس و پیش اٹھ کر اس کا استقبال کرتے ہیں۔ ایک دفعہ ان پر حقیقت منکشف ہو جائے سہی، پھر وہ اپنا سراپا بدلنے میں کوئی تامل نہیں کرتے۔ ایسی سعید روحوں کے لئے ایک اشارہ کافی ہوتا ہے۔

جو سعادت آپ کا نصیب ہوئی اس کے لئے اللہ تعالیٰ کے سامنے بار بار اظہار تشکر کیجیے، اور اس سعادت کے تحفظ، بلکہ اس میں اضافہ کے لئے ابھی سے کوشاں ہو جائیے۔ کم سے کم حسب ذیل امور کا التزام کیجیے:-

۱۔ ایسے لٹریچر کا مسلسل مطالعہ کیجیے جس سے آپ اسلام کی اصل حقیقت کو سمجھ سکیں۔

۲۔ نماز کی طرف اولیں توجہ دیں اور ترجمہ کی مدد سے نماز سمجھ سمجھ کر اور احتساب نفس کے ساتھ یعنی ہر بات اپنے اوپر چسپاں کرتے ہوئے اور ہر بات کی روشنی میں اپنا جائزہ لیتے ہوئے پڑھیں۔

۳۔ جس طرح بن پڑے قرآن کو ترجمہ کے ساتھ روزانہ — چاہے ایک آیت فی یوم کے حساب سے — اس نقطہ نظر سے مطالعہ کریں کہ قرآن کس قسم کا انسان بنانا چاہتا ہے اور کس قسم کے انسان کو وہ قبول نہیں کرتا۔ پھر اس قرآن کے انسان کا جو نقشہ مرتب ہو اس کو اپنے لئے سانچہ بنا لیجئے۔

۴۔ اپنی سوسائٹی فوراً بدل ڈالیے۔ ان لوگوں سے گہرا ربط ضبط نہ رکھیے جن کے نمونے پر آپ ڈھلنا نہیں چاہتے، اور ایسے احباب تلاش کیجیے جن کے ذہن اور سیرت کو آپ اس طرح کا پاتے ہیں جیسا کہ آپ کو اب بننا ہے۔

ان امور کے التزام کے ساتھ ساتھ آپ کا فرض یہ بھی ہے کہ جس ہدایت کی روشنی اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے آپ تک پہنچی ہے اس کا عملی شکریہ ادا کرنے کے لئے اسے اپنے دوسرے بے راہ بھائیوں تک بھی پہنچائیں اور پورے جذبۂ خیر خواہی کے ساتھ پہنچائیں۔

علاوہ بریں اس شخص کے لئے بھی دعائے خیر کرتے رہیں جو آپ تک حق کی بات پہنچانے کا ذریعہ بنا۔

خدا آپ کا حامی و ناصر ہو۔

(نعیم صدیقی)

متاعِ ذوق

نعیم صدیقی

شہادت گاہ میں یوں عشق کو رسوا نہیں کرتے
یہاں تو ذبح ہو جاتے ہیں اور تڑپا نہیں کرتے

مقامِ تخت آ گیا ہے، مقامِ دار اور آگے
جنھیں ہمت ہو وہ منبر پہ رہ جایا نہیں کرتے

نرالی ہے عدالت، مدعی خود جس کے قاضی ہیں
جو نکلے بے خطا اس کو کبھی چھوڑا نہیں کرتے

میں قرباں اس تقدس پر، مگر جو دیں کے خادم ہوں
خدا کی آیتوں سے اس طرح کھیلا نہیں کرتے

حقائق پاس کے واضح نہ ہوں تو دور کی سوجھے!
نجانے کتنے سو آنکھیں ہیں جو دیکھا نہیں کرتے

جو عاشق ہیں وہ کھا کر گالیاں چپکے گذر جائیں
رقیبوں اور دربانوں سے یوں الجھا نہیں کرتے

سُن اے کرمِ کتابی! ایک شے ایسی بھی ہوتی ہے
کہ جس کو مدرسوں میں بیٹھ کر سیکھا نہیں کرتے

یہ شیرہ معصیت کا! اس سے تو آتی ہے ابکائی
وہ مے پیتے ہیں ہم، پی کر جسے بہکا نہیں کرتے

کتاب اللہ کو خود دیکھ کر ہوتے ہوئے زخمی
حمیت جن میں ہو، کونوں میں جا دبکا نہیں کرتے

وہاں جب پردہ داری ہے تو پھر یہ کشف کی حرکت؟
حریمِ غیر میں روزن سے یوں تاکا نہیں کرتے

نگاہیں آخرت پر جن کی ہوتی ہیں وہ دنیا میں
کبھی تاجر کے طرزِ فکر پہ سوچا نہیں کرتے

یہ اک پنہاں تجلی کا کرم ہے، جس پہ ہو جائے!
متاعِ ذوق بازاروں میں تو بیچا نہیں کرتے

یہ میزانیں، یہ پیمانے اٹھا لو! جذبۂ ایماں
کبھی ناپا نہیں جاتا، اسے تولا نہیں کرتے

کسی بھائی کا لاشہ نوچ کر کھانا ہے اک ذلت
مگر جو اس پہ تل جائیں وہ شرمایا نہیں کرتے

کہا لالہ نے عزت ہے جنوں کی چاکِ داماں میں
کبھی عشاق بیٹھے دھجیاں ٹانکا نہیں کرتے

حذر ان پالکیانوں سے! خدا کے یہ چہیتے ہیں!
کسی مسلم کو بے کافر کہے بخشا نہیں کرتے

امیدیں لے کے بڑھ آگے، اگر دل میں وہی وہ ہوں!
انہیں آتی ہے دلداری، وہ دل توڑا نہیں کرتے

پاکستان کا شش سالہ معاشی منصوبہ

فکر و نظر کی کسوٹی پر

پروفیسر عبدالحمید ایم-اے

آج نہیں بلکہ آج سے بہت عرصہ پہلے جب Quesney کو فرانس کے لوئی پانزدہم کے درباری حکیم سے سوال کیا گیا کہ اگر تسے ملک کی بادشاہت عطا کی جائے تو وہ کیا کرے گا۔ اس نے بلاتکلف جواب دیا "کچھ بھی نہیں" یہ دریافت کرنے پر کہ پھر آخر حکومت کون کرے گا۔ اس نے کہا "قانون"۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو فطری حکومت Physiocracy کے وہ بنیادی اصول ان جوابات میں مل جاتے ہیں۔ حکومت کے پیش نظر سب سے قابل ذکر اصول اگر کوئی تھا تو وہ تھا عدم مداخلت۔ حکومت کا کام اگر کچھ تھا تو صرف اسی قدر کہ باشندگان ملک کو بیرونی حملوں اور اندرونی خلفشار سے محفوظ رکھے۔ باقی سب معاملات میں لوگ یکسر آزاد تھے اور اسی آزادی میں وہ اپنی ترقی کا راز پاتے تھے۔ اسی اصول پر عمل پیرا ہو کر اہل انگلستان نے آغاز میں بہت فائدہ حاصل کیا۔ صنعتی انقلاب ایک حیرت انگیز سرعت کے ساتھ اس ملک میں ظہور پذیر ہوا۔ انھوں نے عدم مداخلت اور ... تجارت کا خوب چرچا کیا۔ ان کی صنعتی خوشحالی اسی میں تھی کہ ہر ملک کے دروازے ان کی تیار کردہ اشیا کے لئے کھلے رہیں۔ اور دوسرے ممالک بغیر کسی تامل کے اپنا خام مال ان کے ہاتھوں فروخت کریں۔

آزاد معیشت کے نتائج

جب اس عدم مداخلت کی پالیسی پر اندھا دھند عمل کیا جانے لگا تو نتائج نہایت ہی تلخ نکلے۔ لوگوں نے صنعتی انقلاب کے اندھے جوش میں زراعت کی طرف سے تغافل برتنا شروع کیا۔ اور خوراک کی کمی انگلستان کے لئے مستقل خطرہ کا باعث بن گئی۔ بعد کے واقعات نے بتایا کہ فیکٹریوں کے دامن میں صرف رحمتیں ہی نہیں بلکہ بہت سی زحمتیں بھی پوشیدہ ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ملک کے معدودے چند سرمایہ داروں نے دولت سے خوب ہاتھ رنگے۔ مگر ان کے رنگ میں سرخی غریبوں کے خون سے حاصل کی ہوئی تھی۔ قوم کی اکثریت مفلوک الحال ہو گئی۔ اس افلاس کی تلخیوں کو کچھ مدت کے لئے منافع کے نشہ میں محسوس نہ کیا گیا مگر جب یہ نشہ ہرن ہو گیا تو اس وقت احساس ہوا کہ عوام کا معیار زندگی کہاں سے کہاں جا پہنچا ہے۔ سرمایہ دار اور مزدور کے درمیان اختلاف کی ایک ناقابل عبور خلیج حائل ہو گئی اور وہ ہر آن بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ پھر معاملہ یہیں ختم نہ ہوا بلکہ اس مجنونانہ صنعتی ترقی نے قوم کے اخلاق پر نہایت ہی مضرت رساں اثرات چھوڑے۔ وہ لوگ جو گھروں میں اپنے سلیقے سے آزادی کی فضا میں کام کیا کرتے تھے وہ رفتار زمانہ کی تاب نہ لا کر مجبور ہو گئے کہ اپنی آزادی ایسی محبوب چیز کو چند سکوں کے عوض بیچ دیں۔ یہی نہیں بلکہ جن لوگوں نے دیہات کو شہروں میں ملازمت کے لئے خیرباد کہا ان کو اتنی مزدوری نہیں ملتی تھی کہ وہ اپنے بیوی بچوں کو شہروں کی گرانی میں پال سکیں۔ چنانچہ انہیں اپنے اہل و عیال کو مجبوراً دیہات میں ہی چھوڑنا پڑتا۔ اور وہ شہروں میں ہر قسم کی اخلاقی امراض میں مبتلا ہو جاتے اور اس کے ساتھ جسمانی امراض کا بھی شکار ہوئے۔ شہروں کے تنگ و تاریک مکانات میں کئی کئی گھرانوں کا بھیڑ بکریوں کی طرح زندگی بسر کرنا ملک کی صحت کے لئے نہایت تباہ کن ثابت ہوا۔ ملک کے شائی لاک (Shylok) اس بات پر متفق ہوتے کہ وہ ... انسان کے خون کا آخری قطرہ بھی نچوڑ لیں۔ انھوں نے ان کمزوروں اور بے بسوں پر کام کا زیادہ سے زیادہ بوجھ ڈالنا شروع کیا اور جب یہ ناقابل برداشت ... (پاکستان) ان کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ شراب سے مخمور ہو کر اپنے شعور کو معطل کر دیں اور اپنے پیٹ کے پالنے کے لئے جانوروں کی طرح ... حذف کیا گیا مزدوری میں کمی کی وجہ سے ایک فرد کے لئے مشکل ہو گیا کہ وہ اپنے بال بچوں کی پرورش کر سکے۔ فاقہ کے ہاتھوں تنگ آ کر

پاکستان کا شش سالہ معاشی منصوبہ

اس نے اپنے ننھے منے جگر کے ٹکڑوں کو کارخانوں کے حوالہ کر دیا عورتیں بھی اسی لاچاری کی بنا پر فیکٹریوں میں جھونک دی گئیں۔ اس سے نہ صرف بچوں کی ذہنی وجسمانی نشو ونما کو صدمہ پہنچا۔ بلکہ حرامخوری میں بھی عجیب اضافہ ہوا

یہ سب کچھ تو اندرونِ خانہ تھا۔ ملک کی چار دیواری کے باہر حالات اس سے بھی خوفناک پیدا ہوئے۔ آمدنی کے بے جا تفاوت کی وجہ سے ایجادات کی برق رفتاری سے ملک کے عوام کی قوتِ خرید تو حد درجہ گر گئی۔ اب تیار شدہ مال کی کھپت کے لئے باہر کی منڈیوں کی تلاش لاحق ہوئی۔ کیونکہ ملک کی عنانِ اختیار سرمایہ داروں کے ہاتھ میں تھی اس لئے انھوں نے اپنے منافع کی خاطر ملک کے نوجوانوں کو بے دریغ جنگ کی آگ میں جھونک دیا۔ سرمایہ داروں کا تو صرف روپیہ صرف ہوا، مگر غربا کے شباب اور ان کی سہاگنوں کے سہاگ لٹ گئے ننھے منوں بچوں سے شفقتِ پدری کا سایہ اٹھ گیا۔

دولت کی نامساوی تقسیم سے بچت اور سرمایہ کاری میں جو تفاوت رونما ہوا اس سے تجارتی بدحالی کے چکر چلنے لگے۔ اس کساد بازاری کو طاقتور ممالک نے کمزور اقوام کو منتقل کر دیا۔ اور جو پہلے ہی خستہ حال تھے وہ اس چکر کی لپیٹ میں آ کر بہت ہی بدحال ہو گئے۔ اور اب مجبور تھے کہ وہ طاقتوروں کے منڈی کے لئے تر نوالے بن جائیں۔ دولت کے ان بچاریوں میں تیل کے چشموں پر قبضہ حاصل کرنے کے لئے، خام مال کی بازیافت کے لئے، تیار شدہ مال کی کھپت کے لئے ایک چپقلش شروع ہوئی۔ پہلی اور دوسری عالمگیر جنگ اسی جنون کا نتیجہ ہے۔

معاشی بے راہروی

عہدِ جدید میں بے روزگاری تمام دنیا کے ممالک کے لئے عظیم خطرہ کا باعث ہے۔ دنیا کی شاید ہی کوئی بیماری ایسی مہلک ہو جتنی کہ یہ۔ دنیا نے یہ تو سیکھ لیا ہے کہ کس طرح لاتعداد مال تیار کرے، مگر اس کا کوئی تسلی بخش حل پیش نہیں کیا گیا کہ اس مال کی کھپت کس طرح کی جائے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ماضی کے برعکس آج ہمارے ہاں ہر قسم کے مال کی فراوانی کے باوجود لوگ قوتِ خرید نہ پا کر اپنی معمولی سے معمولی ضروریات کے لئے ترستے رہتے ہیں۔ گندم کی کھڑی فصلیں جلا دی جاتی ہیں۔ اور غریب ایک ایک لقمہ کو یاس بھری نگاہوں سے تکتے ہیں۔ دنیا کا شاید ہی کوئی ملک ہو جس میں اندرونی خلفشار نہ پایا جائے۔ یوں دکھائی دیتا ہے کہ شاید ساری دنیا زیر و زبر ہونے کو ہے۔ بیروزگاری کی اسی لعنت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے دنیا کی تقریباً ساری قومیں اب مجبور ہو گئی ہیں کہ وہ عدم مداخلت کی پالیسی کو ترک کر دیں کیونکہ اصل خرابی مشینوں کا استعمال نہیں، بلکہ ان کے استعمال میں بے راہروی ہے۔ اسی بے راہروی کی روک تھام کے لئے دنیا کے افق پر فاشزم، سوشلزم اور اشتمالیت ابھرے۔ ان انقلابات کے بعد ایک اصول اب مسلم ہے کہ حکومت کا کام صرف بیرونی دفاع اور اندرونی جنگ وجدال سے قوم کو محفوظ رکھنا ہی نہیں، بلکہ اس کا اس سے زیادہ ضروری فرض یہ ہے کہ وہ ایک عقلمندانہ معاشی پالیسی کو اختیار کر کے اہل ملک کو بھوک، افلاس اور بیروزگاری کے حملوں سے بھی ہر طرح محفوظ رکھے، اور جہاں تک ممکن ہو ساری دنیا سے اس وبا کو دور کرنے کی سعی کرے۔ یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے کہ معاشی ترقی میں منصوبہ بندی کے تحت ایسا توازن قائم کیا جائے جس سے بچت اور سرمایہ کاری مکمل روزگار کی سطح سے گرنے نہ پائے۔ اور حکومت ایک خاموش تماشائی کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک فعال رکن کی حیثیت سے اس منزل کے حصول کے لئے جدوجہد کرے۔

پاکستان کی تعمیرِ نو کے لئے منصوبہ بندی

ہندوستان و پاکستان میں پچھلے دو سو سالوں سے معاشی میدان میں جو مصائب نازل ہوئے ان میں زیادہ دخل غیرملکی سامراج کا تھا۔ ملک کے قدرتی وسائل اس قسم کے تھے کہ اس ملک کے باشندے تھوڑی سی محنت کے ساتھ اپنی ضروریات کے لئے خود کفیل ہو جاتے۔ مگر حاکموں کو یہ کبھی گوارا نہ تھا کہ وہ اس منڈی سے لوٹ کھسوٹ ختم کر دیں۔

آزادی کی فضا میں سانس لیتے ہی اب یہ ہمارا فرض ہو گیا ہے کہ ہم اپنے ملک کو معاشی بدحالی سے نجات دلائیں اور ملک کے بسنے والوں کا معیارِ زندگی بلند کریں۔ اس کے لئے ایک سوچی سمجھی معاشی پالیسی کی ضرورت ہے۔ ہمارا راستہ دوسروں سے بہت مختلف ہے۔ ہمیں نہ تو اس بات پر مصر ہونا چاہئے کہ ہم اپنی زراعت میں بوسیدہ ہتھیاروں سے ہی کام لیں اور نہ ہی صنعتی ترقی کے جوش میں اس قدر مدہوش ہو جائیں کہ اس کے مضرت رساں پہلوؤں سے بھی دامن نہ بچا سکیں۔ وہ لوگ جو ذرائع پیداوار میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے کے خلاف ہیں وہ ممکن ہے ۲۶ ۵ گھٹن کی فضا میں سانس لے سکیں

پاکستان کا شش سالہ معاشی منصوبہ

لیکن زندگی جس کو کہ صحیح معنوں میں زندگی کہا جاسکتا ہے اس سے وہ ہمیشہ ناآشنا رہیں گے جیسا اپنی آزادی کے تحفظ کے لئے ملک کو کسی حد تک صنعتی بنانا ہے اس کی زراعت کو کافی حد تک تبدیل کرنا ہے تاکہ دنیا کے مخدوش حالات میں ہم اپنی بنیادی ضروریات کے لئے کسی کے دست نگر نہ ہوں، اور دنیا کے دو بڑے بلاکوں کی باہمی جنگ ہم پر کسی طرح اثر انداز نہ ہو سکے۔ ہمارے ملک کی سیاسی تعمیر اور معاشرتی ساخت کے تقاضے اگر یہ ہوں کہ ہم حق و انصاف کی بنا پر ان دو ظالموں میں سے کسی ایک کا ساتھ بھی نہ دیں تو ایسا کرنے میں معاشی ضرورت ہمارے سامنے کبھی مزاحم نہ ہو سکے۔ اور جسم کے مطالبات ہمیں عدل کی راہ سے ہٹنے کے لئے کہیں مجبور نہ کر دیں۔

اپنی معاشی منصوبہ بندی میں ان سب باتوں کو ملحوظ رکھنے کے علاوہ سب سے ضروری چیز جس کی طرف ہمیں توجہ دینا ہے وہ یہ ہے کہ ہماری معاشی پالیسی اجتماعی عدل میں ہر طرح سے ممد و معاون ثابت ہو۔ اور دولت کی یہ غلط تقسیم کم سے کم عرصہ میں دور ہو جائے۔ اس کی جگہ دولت سماج میں اس طریق سے گردش کرے کہ ہماری سماج کا کوئی عضو بھی اس کی کمی کی وجہ سے سوکھ کر ضائع نہ ہو جائے۔ بلکہ سارے اعضا صاف اور ستھرے خون کی اس طرح غذا حاصل کریں کہ وہ سوسائٹی کے پورے جسم کو تندرست رکھیں۔

دولت کی مساویانہ تقسیم کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ بچت اور سرمایہ کاری مکمل روزگار کی سطح پر رہے گی اور بے روزگاری کا ملک میں خاتمہ ہوگا۔ لارڈ کینز نے معاشی بدحالی کے اسباب کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ کساد بازاری کی اصل وجہ بچت اور سرمایہ کاری میں عدم توازن کا پیدا ہونا ہے، جب تک اس کو صفحہ ہستی سے مٹایا نہیں جاتا اس وقت کسی پائیدار خوشحالی کا تصور حکایت تشنہ سراب سے زیادہ نہیں۔ اس امر میں دنیا کے تمام علما معاشیات متفق ہیں کہ حکومت کی بڑی ذمہ داری لوگوں کو روزگار مہیا کرنا ہے۔ بیروزگاری ایک معاشی برائی ہے جو بہت سی معاشرتی برائیوں کو جنم دیتی ہے۔ دور حاضر میں اس کی تباہ کاریاں اس قدر نمایاں ہو کر سامنے آئی ہیں کہ کسی بیان کی محتاج نہیں۔ یہ ظالم جس قوم کے اندر قدم جماتی ہے وہ قوم ہر اعتبار سے خستہ حال ہو جاتی ہے۔ اس قوم کا صرف خام مال ہی بیکار نہیں جاتا، بلکہ قوم کے افراد کی صلاحیتیں بھی ختم ہو جاتی ہیں۔ سرمایہ تو ایک ٹھوس شکل میں ہونے کی وجہ سے کسی حد تک محفوظ رہتا ہے۔ مگر محنت کو ایک لمحہ بھر کے لئے بھی بچایا نہیں جاسکتا۔ اور افلاس کا سارا بوجھ بیچارے بے روزگار انسانوں پر آن پڑتا ہے۔

جو کچھ میں نے چند صفحات میں عرض کیا ہے اس سے آپ کو بخوبی اس بات کا اندازہ ہو گیا ہوگا کہ ہم معاشی میدان میں کیا چاہتے ہیں صنعتی انقلاب اور زرعی انقلاب کے وہ کون کون سے فوائد ہیں جن سے ہمیں دامن بھرنا ہے۔ اور ان کے کونسے مضرت رساں پہلو ایسے ہیں جن سے ہمیں اپنا دامن بچانا ہے۔ جب تک کہ ہم ان کو اچھی طرح نہیں سمجھ لیتے۔ اس وقت تک ہم اپنے راستہ کا صحیح طور پر تعین نہیں کر سکتے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہمارے ملک کے لئے کوئی ایسا معاشی منصوبہ سودمند نہیں ہو سکتا جس میں ان مقاصد کو پیش نظر نہ رکھا گیا ہو۔

پاکستان کا شش سالہ معاشی منصوبہ

ان مقاصد کی روشنی میں ہم پاکستان کے شش سالہ معاشی منصوبہ کا مطالعہ کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ کیا اس سے ہمیں یہ مقاصد حاصل ہو سکیں گے۔

ذیل میں ہم پاکستان کے مجوزہ شش سالہ منصوبہ کا ایک خاکہ درج کرتے ہیں۔[1]

قسم	مصارف (لاکھ روپوں میں)	کل مصارف کا فی صدی تناسب
(ا) زراعت و آبپاشی	۸۲۰۰	۲۲٪
(ب) نقل و حمل اور رسل و رسائل		
ریلیں	۲۰،۰۰	

[1] یہ خاکہ انجمن ترقی اردو پاکستان کے ماہوار رسالہ "معاشیات" جنوری ۱۹۵۱ء، پاکستان ٹائمز ۲۸ مئی ۱۹۵۱ء Pakistan Development Schemes سے اخذ کیا گیا ہے۔

سڑکیں	۱۰,۰۰		
بندرگاہ	۱۴,۰۰	۵۳۰۰	۲۰٪
ٹیلیفون و تار	۹۰۰		
(ج) ایندھن و طاقت		۴۷۰۰	۱۸٪
(د) صنعت و معدنیات		۴۹۰۰	۱۹٪
(س) معاشرتی مصارف			
مکانات	۴۰۰		
صحت و معالجات	۴۰۰		
تعلیم	۱۰,۰۰	۲۹۰۰	۱۱٪
فنی تعلیم و دارالفنون	۹۰۰		
آب رسانی	۲۰۰		
کل میزان		۲۶۰۰۰	۱۰۰

اس منصوبہ پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالنے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ زراعت کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ اور یہ ایک فال نیک ہے۔ کل اخراجات کا ایک تہائی حصہ اس پر صرف ہوگا۔ تجویز یہ ہے کہ نئے بند باندھے جائیں اور آبپاشی کے رقبے میں اضافہ کیا جائے۔ بیج بھنڈار قائم کئے جائیں اور مصنوعی کھادوں کی ترویج کی کوشش کی جائے گی۔ ۲۰ کروڑ روپیہ واٹر لاگنگ کی خرابیوں کو دور کرنے کے لئے مخصوص کیا گیا ہے۔ اس پر عملدرآمد کرنے کے بعد خیال ہے کہ رقبہ کاشت میں ۴۰ لاکھ ایکڑ کا اضافہ ہوگا۔ نتیجے میں اس اضافے کے بعد مخصوص چیزوں کی مقدار میں حسب ذیل اضافہ ہوگا:-

(۱) غلات خوردنی	۲۵,۵۰,۰۰۰ ٹن	(۳) تجارتی فصلیں	۲۸۰,۴۰۰ ٹن
(۲) روغنی بیج	۴۹۵۰۰۰ ٹن	(۴) چارہ	۴۸۰,۰۰,۰۰۰ ٹن

غلات خوردنی میں اس اضافہ کے بعد ۶ سال کے خاتمہ پر پاکستان ۵۵۴۴ لاکھ روپے کا غلہ (یکم اپریل ۱۹۵۰) کی قیمتوں کے مطابق باہر بھیجنے کے قابل ہو جائے گا۔ نیز ہر شخص کو غذا میں ۲۶۰۰ کلوریاں مل جایا کریں گی۔ یہی وہ مقدار ہے جو متوازن غذا میں ایک اوسط آدمی کی قوت کارکردگی برقرار رکھنے کے لئے لازمی ہے۔

(ب) ریلوں میں حسب ذیل اضافے ہو جائیں گے:-

(۱) نئے انجن ۱۷۰

(۲) مال گاڑیوں کے نئے ڈبے ۱۹۵۰

(۳) نئی مسافر گاڑیاں ۳۱۰

(۴) ایسٹ بنگال ریلوے کے ورکشاپ میں مرمت وغیرہ کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں گی۔

(۵) ریلوے کے ۳۰ لاکھ سلیپر تبدیل کئے جائیں گے۔

(۶) چاٹگانگ کی بندرگاہ میں ہر سال ۲½ ۳۹ لاکھ ٹن سامان کو اتارنے چڑھانے کی صلاحیت پیدا ہو جائے گی۔ نیز کراچی میں ایک خشک گودی مکمل ہو جائیگی

اس وقت پاکستان میں دس ہزار اشخاص کے درمیان دو ٹیلیفون ہیں۔ اس منصوبہ کے بعد ٹیلیفون کی تعداد میں ۲۶۵۷۱ سے بڑھ کر ۲۸۰۰ ہو جائے گی۔

پاکستان کا شش سالہ معاشی منصوبہ

ٹیلیفون ایکسچینج ۱۱۱ کے بجائے ۲۲۲ ہو جائیں گے۔ تار گھر ۲۶۴۳۰ کی بجائے ۲۸۴۳۸ ہو جائیں گے اور ٹیلی پرنٹر ۴ کی بجائے ۱۵ ہو جائیں گے۔

ج، قوت محرکہ میں ۲۵۶۰۰۰ کلوواٹ کا اضافہ ہوگا اس میں مالاکنڈ، رسول، درگائی، میانوالی، وارسک، کرنافلی کے سٹیشنوں کی توسیع شامل ہے۔

(۳) اس منصوبہ کا چوتھا پہلو سوتی کپڑے، جوٹ اور کاغذ کی صنعتوں کا انتظام ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ غیر منقسم ہند میں ایک شخص کے لئے ۳۰ گز سالانہ کپڑے کی ضرورت تھی۔ اس وقت پاکستان میں ۵ کروڑ گز کپڑا تیار ہوتا ہے۔ اس میں وہ دیسی کپڑا بھی شامل ہے جو درآمد شدہ سوت سے تیار ہوتا ہے۔ ۱۹۴۹ء میں ۲۰ کروڑ گز کپڑا باہر سے درآمد ہوا۔ اس طرح ہر پاکستانی کو سال میں ۹ گز کپڑا ملا۔ ظاہر ہے کہ یہ مقدار بالکل ناکافی ہے۔ اسی وجہ سے پہلی پاکستانی صنعتی کانفرنس نے تجویز کی تھی کہ آئندہ چھ سالوں میں کپڑے کی پیداوار ۱۰۰ کروڑ گز کر دی جائے تاکہ ہر شخص کو سال میں ۱۰ گز کپڑا مل سکے۔ اگرچہ یہ مقدار بھی کچھ زیادہ نہیں تاہم اس کے واسطے بھی پاکستان کو پارچہ بافی کے ۴۰ کارخانوں کی ضرورت ہوتی جن میں سے ہر ایک کارخانے میں ۲۵۰۰۰ تکلے ہونے چاہئیں۔ ان میں سے اس وقت ۱۶ کارخانے یا تو زیر تعمیر ہیں یا ان کی مشینوں کی فراہمی کے آرڈر دیئے جا چکے ہیں۔ منصوبے میں ۲۴ سوتی کارخانوں کے قیام کی تجویز رکھی گئی ہے۔ اور چھ سال کے بعد پاکستان میں کپڑے کی پیداوار ۱۳۵ کروڑ گز تک پہنچ جائے گی اور صرف ۱۵ کروڑ گز کپڑا باہر سے منگوانا پڑے گا۔ اس طرح اس مد میں جانے والی رقم میں ۳۰ کروڑ کی کمی ہو جائے گی۔

منجملہ اور چیزوں کے کاغذ بھی پاکستان کی اہم اور بنیادی ضرورت ہے۔ حسن اتفاق یہ ہے کہ چٹاگانگ کے پہاڑی علاقے میں بانس بکثرت ہوتا ہے۔ جو آج کل زیادہ تر برآمد کیا جاتا ہے۔ اس وقت پاکستان سالانہ ۴۰ ہزار ٹن کاغذ درآمد کرتا ہے اور تعلیم کی زیادتی اور سیاسی شعور کی بیداری کے بعد کاغذ کا ایک کارخانہ قائم کرنے کی تجویز بھی شامل ہے جو روزانہ ایک سو ٹن کاغذ تیار کر سکے اور جس کی سالانہ پیداوار ۳۰ ہزار ٹن کے قریب ہو گی۔ اس کارخانہ پر ۴ کروڑ کے مصارف ہوں گے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ہم اس کے بعد بڑی حد تک کاغذ کے معاملے میں خود کفیل ہوں گے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ جوٹ سب سے زیادہ پاکستان پیدا کرتا ہے مگر جوٹ کی مصنوعات اور سامان کے واسطے اسے دوسروں کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ حالانکہ اگر مشرقی پاکستان کے جوٹ پیدا کرنے والے ضلعوں میں جوٹ کی مصنوعات کے مراکز قائم کئے جائیں تو یہ مصنوعات بڑے ارزاں پیمانے پر تیار ہو سکتی ہیں۔ بلکہ بین الاقوامی تجارت میں بھی پاکستان سستے نرخ پر اپنا سامان بازار میں لا سکتا ہے۔ ارزانی کی بدولت جوٹ کی بدل پذیر اشیاء سے جو سامان تیار کیا جا رہا ہے اس کا بھی آسانی سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس منصوبے میں جوٹ کے ۵ کارخانوں کے قیام کی تجویز رکھی گئی ہے جن کے مصارف دو کروڑ روپے ہوں گے۔ اور جن سے ہر سال ایک لاکھ ۲۰ ہزار ٹن جوٹ کی مصنوعات حاصل ہو سکیں گی۔

اس منصوبہ میں دس کروڑ روپیہ مختلف قسم کی کیمیاوی صنعتوں، سفال گری، چمڑے کی صنعت اور دوسری صنعتوں، نیز چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے لئے مخصوص کیا گیا ہے۔

اس منصوبہ کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے ۲۶۰ کروڑ روپے کی ضرورت ہے۔ یہ رقم مختلف طریقوں سے حاصل کی جائے گی۔ اپنے ملک سے ہم ۱۶۵۰ لاکھ پونڈ کے قریب رقم جمع کر سکتے ہیں۔ بقیہ کے لئے ہم ۱۶۰ لاکھ پونڈ اپنے اسٹرلنگ فاضلات سے حاصل کر سکتے ہیں۔ اور اس کے بعد ۱۲۹۰ لاکھ پونڈ کی رقم ہمیں دوسرے ذرائع سے فراہم کرنا ہو گی۔

بے لاگ تبصرہ یہ ہے معاشی منصوبہ بندی کا ایک مختصر سا خاکہ جو پاکستان کی ترقی کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ معاشیات کے ایک طالب علم کی حیثیت سے ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اس منصوبہ کے سب پہلوؤں کا بالکل غیر جانبدارانہ موازنہ کر کے یہ دیکھیں کہ اس میں ہمیں کون کون سے فوائد حاصل ہوں گے اور ہمیں کون سے نقصانات سے دوچار ہونا پڑے گا۔

(۱) منصوبہ بندی کا سب سے روشن پہلو یہ ہے کہ صنعتی ترقی میں بے لگام دوڑ کی بہت حد تک پیش بندی کی گئی ہے۔ اب ہماری صنعتیں خود رو پودوں کی طرح ملک کی سطح پر نہیں ابھریں گی بلکہ ان کی ترقی اور ان کی نشوونما ایک سوچی سمجھی تدبیر کے تحت عمل میں لائی جائے گی۔ منصوبہ بندی [illegible] اور عدم مداخلت کے درمیان ایک راہ اعتدال ہے۔ برج نرائن نے اپنی کتاب (Economic Structure of India)

ہندوستان کی معاشی ساخت تیں کہا ہے کہ ملک کی صنعتی مشین حکومت کے اشارے پر متحرک ہو سکتی ہے ۔ جنگ نے اس چیز کو ثابت کر دیا ۔ جب جنگ کی ضروریات کے پیش نظر یہ بات ممکن ہے تو کیا وجہ ہے کہ ملکی فلاح کے لئے جنگ کے بعد اس پالیسی پر عملدرآمد نہ کیا جائے ۔ ہمیں اس خیال سے چھٹکارا حاصل کرنا ہے کہ سرمایہ کے استعمال کا سرمایہ دار کو موروثی حق ہے ۔ منصوبہ بندی میں قوم کے مفاد کے پیش نظر زردار کو مجبور کیا جا سکتا ہے کہ وہ سماج کی فلاح و بہبود کے لئے اپنی دولت کو استعمال کرے ۔

(۲) دوسری بات جو قابل قدر ہے وہ یہ کہ حکومت نے عدم مداخلت کی حکمت عملی کو ترک کر دیا ہے ۔ انگریز تو اس راہ پر اس لئے گامزن تھا کہ اس کی اپنی خوشحالی اسی سے وابستہ تھی ۔ عوام اگرچہ اس پالیسی سے مفلوک الحال ہو گئے ، لیکن اس کو اس سے کیا سروکار ۔ اس آزاد ملک کی قومی حکومت کے لئے یہ پالیسی کسی صورت میں بھی زیبا نہیں ۔ حکومت کا فرض ہے کہ ایک فعال ادارہ کی حیثیت سے وہ اجتماعی عدل کو قائم کرنے کے لئے انتہائی کوشش کرے ۔ مقام شکر ہے کہ حکومت نے اس عارفانہ تغافل کو کسی حد تک ترک کر دیا ہے یا اس کے نقصانات کا احساس کر کے اس کو ترک کرنے کا کسی حد تک ارادہ تو ظاہر کیا ہے ۔

(۳) تیسرے صنعتی انقلاب کے جوش و خروش نے زراعت کو ذہنوں سے بھلا نہیں دیا بلکہ منصوبہ بندی میں اس کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے ایک تہائی صرف اس کے لئے مختص کیا گیا ہے ۔ دنیا کے مخدوش حالات اس بات کے متقاضی ہیں کہ ہم بنیادی ضروریات کے لئے خود کفیل ہوں اور خوراک بنیادی ضروریات میں سے نہایت ہی اہم ضرورت ہے ۔

(۴) جن صنعتوں کو ترقی دینے کا پروگرام تجویز کیا گیا ہے وہ بھی زندگی کی اشد ضروریات ہیں ۔ اور خیال کیا جاتا ہے کہ اس منصوبہ پر عملدرآمد کر لینے کے بعد یہ ملک کسی حد تک اپنی کفالت خود کر سکے گا ۔

(۵) اس منصوبہ میں جن صنعتوں کی وسعت مقصود ہے وہ صنعتیں ہیں جن کا انحصار ملک کے خام مال پر ہی ہے ۔ مثلاً کپاس ، جوٹ ، بانس ۔ اس پالیسی سے ایک تو ملک کا خام مال صحیح طور پر اپنے ہی کارخانوں میں استعمال ہو سکے گا اور دوسرے ہمارے عوام کو روزگار میسر ہوگا ۔

دوسرا پہلو

منصوبہ بندی کے یہ سب پہلو اپنی جگہ پر بجا و درست ۔ مگر ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ کیا اس پر عمل پیرا ہو کر ملک کے فاقہ کش عوام کو بھی کوئی نفع پہنچے گا کیا ان کے لیل و نہار میں بھی کوئی نمایاں تبدیلی واقع ہوگی ۔ کیا وہ بھی جانوروں کے درجہ سے بلند ہو کر انسانیت کے ایک رکن کہلانے کے مستحق ہوں گے ۔ کیا اس متوقع خوشحالی سے ان کو بھی کوئی حصہ ملے گا ۔ یہ ہیں وہ سوال جو ذہن میں فوراً پیدا ہوتے ہیں :

(۱) پہلا کھٹکا جو اسکیم کے سامنے آتے ہی پیدا ہوتا ہے وہ نمائشی پروپیگنڈے کا خطرہ ہے جس طرح ہماری مرکزی اور صوبائی حکومتوں نے کاغذی اسکیمیں بنانے ، ان کا بار بار ڈھنڈورا پیٹنے ، مستقبل کے نتائج کو حال کے بالکل قریب لا کر پیش کرنے ، اور ایک ایک اسکیم کا کئی کئی بار افتتاح کرنے کے ہنر دکھائے ہیں ان کو دیکھنے کے بعد ہر غیر جذباتی آدمی سوچ میں پڑ جاتا ہے ۔ ہم اگرچہ خدا سے دعا کرتے ہیں کہ یہ اندیشہ غلط نکلے لیکن بہرحال اس اسکیم کے تاریک پہلو کی طرف توجہ کرتے ہی یہ ناخوشگوار چیز سب سے پہلے سامنے آتی ہے ۔

(۲) اس معاشی پروگرام کے مطالعہ سے دوسری چیز جو ذہن میں کھٹکتی ہے وہ مقصدیت کا فقدان ہے ۔ کپڑے کی پیدائش میں اضافہ ، زراعت میں جدید آلات کا استعمال ، پٹ سن کی ملوں کا قیام ، برقی قوت کی نئی نئی اسکیموں کا اجراء اپنی جگہ مستحسن اور قابل ستائش کام ہیں مگر ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ کیا ملک کے عوام بھی اس سے کوئی استفادہ کریں گے یا ان کا کام صرف ان فیکٹریوں کی بھٹیوں میں اپنے خون کو جلانا اور اپنی محنت سے چند زرداروں کی تجوریوں کو بھرنا ہوگا ۔ اگر معاملہ یہ ہے تو پھر ایسی منصوبہ بندی کا نہ ہونا ہی بہتر ہے ۔ منصوبہ بندی جس نہج پر کی گئی ہے وہ سرمایہ دارانہ ذہنیت کی غمازی کر رہی ہے ۔ اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نظر نہیں آتا کہ ملک کے کارخانے نظم پیداوار کو مشینوں کی ضرورت کے مطابق ڈھالا جائے اور اس سے چند انسان فائدہ اٹھائیں ۔ منصوبہ بندی مقصد کے حصول کا ایک ذریعہ ہے اور بذات خود کوئی مقصد نہیں ہے اس لئے اسلام ، اشتراکیت اور سرمایہ دارانہ نظام میں منصوبہ بندی مقصد کے اعتبار سے مختلف ہوگی ۔ اگر ہماری حکومت

پاکستان کا ششش سالہ معاشی منصوبہ

کا مقصد واقعی صحیح معنوں میں اسلامی نظام کو بپا کرنا ہے اور اس کے پیش کردہ اجتماعی عدل کو ملک میں پروان چڑھانا ہے تو اس منصوبہ کا ڈھانچا اس سے کافی حد تک مختلف ہونا چاہیئے تھا۔

ہمارے ارباب بست وکشاد نے اس حقیقت سے بالکل آنکھیں بند کر لی ہیں کہ اس طریق سے دولت چند بڑے بڑے سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں سمٹ کررہ جائے گی۔ اور ملک کے عوام مفلوک الحال ہو جائیں گے۔ دولت کا یہ سمٹاؤ دراصل عوام کی موت ہے۔ اور اس سے راہ نجات کی دو ہی صورتیں ممکن ہو سکتی ہیں یا خونی استبداد یا اشتراکی انقلاب۔ دنیا نے یہ دیکھ لیا ہے کہ دولت میں اگر ایک دفعہ ٹھہراؤ پیدا ہو جائے تو پھر آسانی سے اسے متحرک نہیں کیا جاسکتا۔ ہابسن اور اس کے بعد لارڈ کینز نے سرمایہ داری کا نہایت ہی عمیق مطالعہ کرنے کے بعد اس راز کو افشا کیا ہے کہ اس نظام کے بطن سے عوام کی بدحالی جنم لیتی ہے۔ اس نظام کا لازمی نتیجہ دولت کی غیرمساوی تقسیم ہے۔ یہ تقسیم لوگوں سے قوت خرید سلب کر لیتی ہے اور اس کی وجہ سے سرمایہ کاری اور بچت میں توازن کمل، روزگار کی سطح سے خود بخود نیچے گر جاتا ہے۔ لوگ ظاہری طور پر دیکھتے ہیں کہ بچت اور سرمایہ کاری میں ایک ہم آہنگی ہے، مگر یہ ہم آہنگی بے روزگاری کے درجہ پر بھی ہو سکتی ہے، اور دولت کے سمٹاؤ کی وجہ سے یہ اکثر اوقات اسی نقطہ پر ہوتی ہے۔ ہمارے چھ سالہ معاشی منصوبہ میں اس تلخ حقیقت کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اور خطرہ یہ ہے کہ اس کے پایۂ تکمیل تک پہنچنے کے بعد یہ ملک بھی انہیں ساری امراض کا شکار ہو جائے جن میں اس وقت تک یورپ مبتلا ہے اور جن سے نجات حاصل کرنے کے لئے وہ کئی بار آگ اور خون سے گزر چکا ہے۔

لہٰذا ہمیں جو سب سے ضروری فیصلہ کرنا ہے وہ یہ ہے کہ دراصل ہماری ریاست کا کعبۂ مقصود کیا ہے۔ کیا اس کے قیام کی غرض وغایت اسلام اور صرف اسلام ہے؟ یا دوسرے مروجہ "ازم"؟ جب تک کہ ہم اس مقصد کا تصفیہ نہیں کر لیتے اس وقت تک ذرائع کا تعین بالکل بیکار ہے۔ افسوس کہ اصل مسئلہ کو الٹے طریق پر حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

پھر معاملہ یہاں ختم نہیں ہوتا بلکہ دولت کی اس غیر مساوی تقسیم سے طبقاتی کشمکش کی آگ کے بھڑکنے کا ہر وقت احتمال ہے۔ قوم کے مختلف طبقوں میں دولت کا جس قدر تفاوت ہوگا۔ اسی نسبت سے طبقاتی منافرت بھی بڑھتی چلی جائے گی اور مختلف طبقوں کا باہم ایک دوسرے سے دست وگریباں ہونا کسی لحاظ سے بھی ملک کے لئے سودمند ثابت نہیں ہو سکتا۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم بروقت اس کا سدباب کریں۔ دم توڑتے ہوئے سرمایہ دارانہ نظام کو اس ملک میں دعوت دینا کسی طرح سے بھی پسندیدہ نہیں۔

(۳) منصوبہ بندی کی ظاہری چمک دمک کے لحاظ سے اس کا زرعی پہلو بہت نمایاں ہے۔ زراعت میں جدید آلات اور مشینوں کا استعمال وقت کی اہم پکار ہے۔ اور اس پر ہمیں کان دھرنے چاہئیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہمیں یہ بات ہرگز فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ یہ آلات اسی وقت فائدہ مند ہو سکتے ہیں جب ملک کی بیشتر آبادی ان کو استعمال کرنے کی سکت رکھتی ہو۔ جب تک اس ملک سے موجودہ انسانیت کش جاگیرداری نظام کو دفن نہیں کیا جاتا اس وقت تک زراعت کی خوشحالی ایک ایسا رنگین خواب ہے جس کے شرمندہ تعبیر ہونے کی کوئی توقع نہیں۔ وہ کاشتکار جو اپنی کمائی کا بیشتر حصہ جاگیردار کے آستانہ پر بھینٹ چڑھانے کے لئے مجبور ہوں۔ ان سے اس چیز کی توقع رکھنا کہ وہ جدید ایجادات سے فائدہ اٹھائیں ایک بہت بڑی خوش فہمی ہے۔ زمینوں کی بکھری ہوئی مختصر اکائیاں اور کسان کی غربت اس راہ کی سب سے بڑی رکاوٹیں ہیں ان سے البتہ اگر کوئی طبقہ فائدہ اٹھا سکتا ہے تو وہ مٹھی بھر جاگیرداروں کا گروہ ہے جن لوگوں نے بھی پاکستان کی زراعت کا بنظر غائر مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ موجودہ جاگیرداری ہمارے ملک کے بطن میں سب سے خوفناک ناسور ہے۔ اور معاشی فلاح کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اس ناسور کو کسی طرح ٹھیک کر لیا جائے۔ اگر اس سلسلے میں تفصیلات کا مطالعہ کرنا مقصود ہو تو فلاوڈ (Flout Commission) کمیشن کی رپوٹ ملاحظہ فرمائیں اور پھر دیکھیں کہ اس خاص نظام کے اثرات کس طرح زندگی کے ہر گوشہ میں نمایاں ہیں۔

یہ ہرگز نہ بھولئے گا کہ اگر آپ نے اپنے غلط منصوبے کے ذریعے بڑے بڑے جاگیرداروں اور زمینداروں کو چھوٹے زمینداروں کے مقابلے میں مشینی آلات سے مسلح کر دیا تو اس غیر مساویانہ مسابقت کی چکی میں چھوٹے زمینداروں کی بہت ہی بڑی تعداد ٹیڈی کی طرح پس جائے گی اور ممکن ہے کہ ان کی زمینیں بھی بڑے زمیندار لے

کے ماتھے پر چلی جائیں۔ اگر پورے ملک کو، اور ملک کے مختلف شعبے کے زمینداروں کو بیک وقت مشینی طاقت نہ بہم پہنچائی گئی تو پھر جو آگے ہے وہ اور آگے بڑھتا جائے گا اور جو اول قدم پر پیچھے رہ گیا وہ ہر لمحہ مزید پیچھے رہتا جائے گا۔ نیز یہ بھی نہ بھولئے کہ آپ مشینیں لا رہے ہیں تو اس کے ساتھ "بے روزگاری" بھی لا رہے ہیں۔ بے روزگاری جب زراعت کی دنیا میں داخل ہو گئی تو لاکھوں آدمی جو کئی پشتوں سے زمین سے وابستہ ہیں وہ زمینوں سے الگ ہوں گے اور بیروزگاری میں دھکیل دیئے جائیں گے تو سخت طوفان بپا ہو جائے گا۔

ایک زراعتی ملک ہونے کی حیثیت سے پاکستان کو جس چیز کی اس وقت اشد ضرورت ہے وہ یہ کہ ہماری زرعی پیداوار کی قیمتوں میں استحکام (Stability) پایا جائے، اور اسی طریق سے ہماری آمدنی میں استحکام ہو۔ لیکن منصوبہ میں اس پہلو کی طرف قطعاً توجہ نہیں دی گئی جن لوگوں نے اشیا کی قیمتوں کے اتار اور چڑھاؤ کو دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ جب قیمتیں گرتی ہیں تو سب سے زیادہ گراوٹ زرعی پیداوار میں ہوتی ہے اور سب سے زیادہ نقصان بھی بیچارے کاشتکار کو ہی برداشت کرنا پڑتا ہے جس کے پاس اشیا کو محفوظ رکھنے کا کوئی سہارا نہیں۔ وہ مجبور ہوتا ہے کہ اپنا مال ہر قیمت پر منڈی میں لا ڈالے۔ حکومت کا یہ فرض تھا وہ اس سلسلہ میں کوئی موثر اقدام تجویز کرتی اور اس ضمن میں کوئی مناسب پروگرام وضع کرتی۔ لیکن اس اہم کام سے بالکل بے اعتنائی برتی گئی ہے۔ ہمارے ملک کے تقاضے یہ ہیں کہ ہم اس طرف خاص توجہ دیں[1]۔

(۴) اس منصوبہ کا ایک اور افسوسناک پہلو مختلف شعبوں میں عدم توازن ہے۔ پاکستان ایسے غریب ملک کے لئے جس کے عوام نہایت ہی خستہ حال ہوں اگر کوئی شعبہ سب سے زیادہ توجہ کا محتاج ہے تو وہ معاشرتی ہے۔ مگر اس شعبہ پر کل مصارف کا گیارہ فیصدی صرف کرنے کا ارادہ کیا جا رہا ہے۔ اس پہلو پر خرچ ہی درحقیقت اس بات کا معیار ہے کہ ہمیں انسانیت سے کس قدر ہمدردی ہے۔ وہ ممالک جن کی سیاسی اور معاشی ساخت خالص سرمایہ دارانہ ہے انہوں نے بھی زیادہ سے زیادہ توجہ اس طرف دینا شروع کر دیا ہے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے ہاں کم از کم معیار مزدوری (Minimum Wage Laws) کے قوانین نافذ کئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ غرباء کے لئے مفت علاج اور مفت تعلیم کی سہولتیں بہم پہنچائی گئی ہیں بعض ممالک میں تو حاجتمندوں کو نقدی تک دی جاتی ہے، اور بعض میں یہ انتظامات کئے گئے ہیں کہ وہ اپنی چند ضروریات سستے داموں پوری کر سکیں۔ ان طریقوں سے دولت کے تفاوت کی تلخی کو کسی حد تک دور کیا جا سکتا ہے ۲۹ کروڑ روپے کی رقم کو صحت و معالجات، تعلیم، فنی تعلیم اور دارالمضون کے قیام کے لئے صرف کرنا کسی شعبہ میں کوئی نمایاں نتائج پیدا نہیں کر سکتا۔ اگر ہماری حکومت کی ساری جدوجہد محض عوام کی بھلائی کے لئے ہے۔ تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ یہ رقم بالکل ناکافی ہے۔ عوام کی صحت کا معیار دن بدن گر رہا ہے۔ خالص اور عمدہ غذا کے نہ ملنے کی وجہ سے، چھوٹی چھوٹی روزمرہ کی بیماریوں کا بروقت اور مکمل علاج کرانے کی استطاعت نہ رکھنے کی وجہ سے، اور شہروں میں مکانات کی قلت کے سبب سے تپ دق کا مرض جنگل کی آگ کی طرح اس ملک میں پھیل رہا ہے۔ اب جبکہ ملک کو صنعتی بنانے کے ارادے ہیں تو شہروں کی آبادی میں لامحالہ اور اضافہ ہوگا اور حکومت کو چاہئے تھا کہ مکانات اور صحت عامہ کے لئے اپنے ذرائع کی حد تک اپنی جیب کی آخری پائی بھی خرچ کرنے سے گریز نہ کرتی۔ مگر ان دونوں شعبوں کے لئے صرف ۸ کروڑ روپے کی رقم وقف کی گئی ہے جس ملک کے عوام پہلے ہی انتہائی غربت کا شکار ہوں، جن کو ہر طرح کے موذی امراض سے آئے دن سابقہ پڑتا ہے۔ ان کے لئے یہ رقم کوئی قابل ذکر فائدہ کا سبب نہیں بن سکتی۔

(۵) ایک اور پہلو جو ہمارے ملک کے مخصوص حالات کے تحت بہت زیادہ توجہ کا مستحق تھا وہ گھریلو صنعت ہے۔ مگر اس طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی وہ پیشہ جس پر ہمارے ملک کی نوے فی صدی آبادی کا انحصار ہے وہ زراعت ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں انسان کو کافی وقت دوسرے کام کاج کرنے کے لئے مل جاتا ہے۔ کاشتکار بیکار بیٹھنے کی وجہ سے اس وقت کو بہت سی لغو اور فضول باتوں میں ضائع کر دیتے ہیں۔ گھریلو صنعت کا فروغ ان کے خالی اوقات کو نہایت ہی بہتر طریق پر مفید کاموں میں لگا سکتا تھا۔ اور اس سے ان کے معیار زندگی میں ایک معتدبہ اضافہ ہونے کے قوی امکانات تھے۔

اس کے علاوہ چھوٹے پیمانے کی صنعتی ترقی ہمارے سامنے سرمایہ کی دقتیں پیش نہ کرتی اور نہ ہم اس کام کے لئے دوسری حکومتوں کے سامنے دست سوال

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو Stabilization of Agricultural Prices in India (BY P.C. MALHOTRA)

پاکستان کا شش سالہ معاشی منصوبہ

ہمارا اپنا ملکی سرمایہ جو بہت زیادہ "شرمندہ" ہونے کے سبب سے منڈی میں آنا پسند نہیں کرتا۔ وہ ایک موزوں معاشی پالیسی سے خود بخود کاروبار کا موں میں کھپ جاتا۔ ہمارے ملک کے ذہن صنعت پسند نہیں ہیں اسلئے وہ بڑی صنعتوں میں روپیہ لگانے سے ہمیشہ ہچکچاتے ہیں۔ گھریلو صنعتوں پر جہاں سرمایہ کے ضائع جانے کے امکانات بہت کم تھے۔ وہ لوگ سرمایہ لگانے کے لئے تیار ہو جاتے۔

پھر گھریلو صنعت کے لئے یہ ضروری نہیں کہ لوگ شہروں میں منتقل ہو جائیں اس کے لئے وہ اپنے گھروں میں بیٹھ کر فرصت کے اوقات میں آسانی سے کام کر سکتے ہیں۔ ان کی ترقی سے شہروں میں مکانوں کی قلت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور ملک کی صحت عامہ کو کوئی خطرہ پیش نہیں آئے گا۔

دنیا کے موجودہ سیاسی حالات کا اس وقت تقاضا یہ ہے کہ ملک ضروریات زندگی کی فراہمی کے لئے خود کفیل ہو۔ ہمارے لئے اس آدرش تک پہنچنے کا اگر کوئی ذریعہ ہو سکتا ہے تو وہ صرف گھریلو صنعت ہے کیونکہ اسی کے ذریعہ ہم زیادہ سے زیادہ شعبوں کو ترقی دے سکتے ہیں اور ایک مختصر سی مدت میں اپنی بنیادی ضروریات کی کفالت کرنے کے اہل ثابت ہو سکتے ہیں پھر اس سے ہماری زراعت کو کوئی نقصان پہنچنے کا احتمال نہیں۔ بلکہ گھریلو صنعتیں زراعت پر سے ناقابل برداشت بوجھ کو بہت حد تک ہلکا کرنے میں ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہیں۔ اگر ہم نے زراعت میں میکانکی طریقوں کا استعمال شروع کیا تو آبادی کا کافی حصہ بیکار ہو جائے گا۔ ان صنعتوں کے ذریعہ ہم ان بے روزگاروں کو کام مہیا کر سکتے ہیں۔

پاکستان میں لوگ صنعت کے اس دائرے سے پہلے ہی کافی حد تک آشنا ہیں۔ اندازہ کیا جاتا ہے کہ اس وقت گھریلو صنعتوں میں کام کرنے والوں کی تعداد ۱۵۹۹۷۷۷ ہے جن میں سے ۸۱۷۴۲ صرف کھڈی پر کام کرتے ہیں ان میں ترقی کے لئے ہمیں بنیادوں سے کام نہیں کرنا ہوگا بلکہ قائم شدہ بنیادوں پر اپنی صنعتی عمارت کو آسانی سے اٹھا سکیں گے۔

(۶) سب سے ضروری بات جو مجھے اس منصوبہ کے متعلق کہنا ہے وہ اس کی تکمیل کے مصارف ہیں۔ اس منصوبہ کے لئے تین قسم کے مصارف ہوں گے ایک اندرونی اشیا اور خدمات۔ دوسرے مبادلات خارجہ۔ اور تیسرے بیرونی قرضے۔ حالات کا رخ یہ بتا رہا ہے کہ پاکستان کو دوسرے ممالک کے مقابلہ میں اپنے مبادلات خارجہ سے زیادہ کام لینا پڑے گا۔ اور اندیشہ ہے کہ اگر اس نے اپنے خارجی توازن کی ادائیوں کو بڑھانے کی کوشش نہ کی تو اس کے مبادلات خارجہ گھٹ جائیں گے اور یہی سبب متوازن ترقی میں مانع ہو سکتا ہے۔

تیسرا سہارا جس پر ہم منصوبہ میں تکیہ لگائے ہوئے ہیں وہ بیرونی سرمایہ اور بیرونی فنی لوگوں کی خدمات کا فراہم کرنا ہے۔ اس ضمن میں ہمیں یاد ہونا چاہیئے کہ فاضل سرمایہ اور فنی خدمات کی مانگ آج دنیا کے ہر گوشے میں موجود ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ ان میں ایک قسم کا مقابلہ ہے۔ ہمارا گذشتہ سال کا یہ تجربہ ہے کہ ہم نے چند مجوزہ صنعتوں کو قائم کرنے کے لئے ضروری مشینوں کی فراہمی کے واسطے بیرونی ممالک کو فرمائش بھیجی۔ لیکن یا تو یہ فرمائشیں پوری نہیں ہوئیں یا کارخانہ داروں نے اس مال کے بھیجنے کی جانب کوئی خاص توجہ نہیں کی۔ اس وقت دنیا کے جو حالات پیدا ہو رہے ہیں ان سے اندیشہ ہے کہ ہمیں ضروری سرمایہ اور مشینیں فراہم نہ ہو سکیں گی اور چھ سال کی مدت گزر جانے کے بعد یہ منصوبہ محض ایک کاغذی منصوبہ بن کر رہ جائے۔

ہمیں اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کثیر تعداد میں ضروری سامان اور اشیاء غیر ممالک سے درآمد کرنا پڑیں گی۔ یہ اندازہ کیا گیا ہے کہ ان مصارف کی اصل لاگت جو بیرونی ملکوں سے درآمد کرنا پڑے گا تقریباً ۱۲ کروڑ پونڈ ہوگی۔ جبکہ کل بیرونی سرمایہ جو اس وقت ہمارے ملک کو درکار ہے وہ ۴۲ کروڑ پونڈ ہے۔ اس میں ایک کروڑ اور ساٹھ لاکھ پونڈ کی وہ رقم ہے جو خود ہم اپنے اسٹرلنگ فاضلات کے ذریعہ سے حاصل کریں گے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بیرونی سرمائے کی اس کثیر مقدار کو حاصل کرنے کی کیا صورتیں ہوں گی۔ رپورٹ میں بیرونی سرمائے کو حاصل کرنے کی مندرجہ ذیل پانچ صورتیں بتائی گئی ہیں۔

(ا) ملک کے خود اپنے ذاتی بیرونی اثاثوں کا استعمال

(ب) دوسرے ملکوں کے وہ افراد جو سمت پاسکے ان ملکوں کے نجی افراد کو اپنا سرمایہ دینے کے لئے تیار ہیں۔

(ج) دوسرے ملکوں کے وہ افراد جو ان حکومتوں کو اپنا روپیہ دینے پر تیار ہیں۔

پاکستان کا شش سالہ معاشی منصوبہ

(۵) بین الاقوامی اداروں سے ان علاقوں کی حکومتوں کی مالی امداد۔

(۶) دوسری حکومتوں سے ان علاقوں کی متعلقہ حکومتوں کو قرضے یا عطیے۔ چھ سال کے اندر اسٹرلنگ فاضلات سے وقتاً فوقتاً روپیہ حاصل کرتے رہنا .... ایک یقینی امر ہے۔ اس واسطے یہاں اس پہلو سے بحث کرنا غیر ضروری ہے۔ دوسرے ملکوں کے وہ افراد جو ان ملکوں کی حکومتوں یا نجی افراد کو اپنا روپیہ قرض دیں گے، ان کی تعداد کچھ زیادہ نہیں ہو سکتی۔ جن خوفناک حالات میں سے کہ دنیا گزر رہی ہے یہ کہنا بالکل مناسب ہے کہ ان ذرائع سے حسب ضروریات سرمایہ حاصل کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ بین الاقوامی بنک اور دوسری حکومتوں سے قرضہ ملنے کے امکانات تو ضرور ہیں۔ مگر وہ ہمارے لئے کسی طرح مفید نہیں ہو سکتا۔ اس دور میں سیاست اور معیشت میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ کسی معاملہ کو خالص معاشی نقطہ نظر سے جانچنا یا پرکھنا قریب قریب محال ہے۔ بلکہ ہر کام میں اصل اہمیت سیاسی مصالح کو حاصل ہے۔ بین الاقوامی بنک اور بین الاقوامی فنڈ جن کی اجارہ داری اس وقت امریکہ کے ہاتھ میں ہے ان کی توجہ سیاسی تقاضوں کی بنا پر صرف یورپ کے ملکوں کی معاشی زندگی کی تعمیر و تجدید پر لگی ہوئی ہے۔ تاکہ وہ از سر نو اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر روس کے خلاف نبرد آزما ہو سکیں۔ ان حالات میں اس بنک اور فنڈ سے کوئی زیادہ امید وابستہ نہیں کی جا سکتی۔

دوسرے ان اداروں سے قرض فی سبیل اللہ نہیں دیا جاتا بلکہ اس کے ساتھ بعض ایسی کڑی شرائط ہوتی ہیں جن سے ملک کی آزادی کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے جس ملک سے بھی قرضہ حاصل کیا جائے اس کے سیاسی اثرات بھی بڑھنے لگتے ہیں۔ اور مقروض ممالک کو اپنی قسمت چار و ناچار "ان مہربانوں" کے ساتھ وابستہ کرنا ہوتی ہے۔ ہماری سیاسی اور معاشی پالیسی کے مقتضیات یہ ہیں کہ ہم جہاں تک ہو سکے وہاں سے قرض حاصل کرنے کی کوشش کریں جہاں سے سیاسی و معاشی اثرات ہم پر کسی طرح اثر انداز نہ ہوں۔ اگر ہم نے مالی امداد کے بھیس میں بیرونی اثرات کو ملک کے اندر داخل ہونے کی اجازت دے دی جن سے کہ قرض لینے کی صورت میں کوئی مفر نہیں۔ تو پھر یہ اندیشہ ہے کہ کہیں اپنی سیاسی آزادی سے ہاتھ نہ دھو بیٹھیں۔ جو سالہا سال کی کوششوں اور قربانیوں کے بعد حاصل ہوئی ہے

(ط) اس منصوبہ کی تمام خوشنمائیوں کے پیچھے ایک اور کمزوری چھپی ہوئی ہے جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

دنیا میں جب کبھی کسی ملک میں دور تعمیر آتا ہے تو وہ "دور انقلاب" سے زیادہ مشکل، خشک، غیر دلچسپ اور بہت زیادہ ٹھنڈی اور دور رس اثرات رکھنے والی قربانیوں کا مطالبہ کرتا ہے۔ سکیمیں اور منصوبے بنا کر میدان میں ڈال دینا اور ان پر تقریریں کر کے تالیاں پٹوا لینا یا نعرہ ہائے تکبیر لگوا لینا کوئی بڑا کام ہے نہیں۔ مسئلہ اصل توجہ کے قابل یہ ہوتا ہے کہ ایک قوم میں آیا وہ روح عمل پوری طرح حرکت میں آ چکی ہے جو کسی کاغذی خواب کو عالم واقعہ میں قطب مینار کی طرح نصب کر کے دکھا دے۔ افسوس کہ یہی مقام جہاں اصل کمزوری سر چھپائے پڑی ہے۔

ہم منصوبہ کے مرتبین اور شارحین سے یہ پوچھتے ہیں کہ کیا انہوں نے اعلیٰ مقاصد سامنے لا کر کسی زندگی بخش اصول کا مظاہرہ کر کے کسی سرگرم عمل کر دینے والے فلسفے کے جام گردش میں لا کر، اور اپنے اندر انقلابی لیڈروں کے سے اوصاف کا نمونہ پیش کر کے قوم میں وہ گرمی پیدا کر دی ہے کہ وہ چھ سال تک ایک منصوبے کی کھیتی میں محنت کا ہل چلائیں، تکالیف کی دھوپ سہیں اور اپنے روپے کے بیج ڈالیں تا آنکہ یہ کھیتی پھل لائے اور ان کے دامن بھر دے۔

پس معاشی تعمیر کے منصوبے بنا کر کام کا آغاز کرنے سے بھی پہلے ایک اور منصوبے کی ضرورت ہے جو قوم کی روح عمل کو متحرک کر دے اور دلوں اور دماغوں میں نئی لہریں اٹھا دے۔

ہے کوئی ایسا منصوبہ آپ کے سامنے!

آخر میں ہم یہ بھی کہہ دینا چاہتے ہیں کہ جن لوگوں نے یہ معاشی منصوبہ مرتب کیا ہے، انہوں نے غالباً اپنے کمرے اور اسکے فرنیچر تک اپنی نگاہیں محدود رکھی ہیں اور چار دیواری سے باہر عالمگیر طوفان اٹھنے کی جو تیاریاں ہو رہی ہیں ان سے قطع نظر کیا ہے۔ یہ منصوبہ تمام تر اس مفروضے پر مبنی ہے کہ آئندہ چھ سال بالکل امن سے گزریں گے، حالانکہ اس قسم کے مفروضے پر موجودہ حالات میں کسی بھی پروگرام کی بنیاد رکھنا سیاسی بصیرت کی کمی کا ثبوت ہے۔

اگر جنگ چھڑ جائے تو فرمائیے کہ آپ اس کی تکمیل کس طرح کریں گے، اور اگر اسے موجودہ رخ سے ہٹا کر کسی دوسرے رخ پر ڈالنا پڑا تو وہ رخ کونسا ہو گا؟

یہ چند شمارات ہیں جو چھ سالہ منصوبہ کے روشن اور تاریک پہلوؤں کے متعلق ہمارے سامنے آ سکے ہیں۔ یہ مسئلہ بہر حال ایسا ہے کہ اس پر مختلف لوگ سوچیں اور تنقیدی نگاہ سے سوچیں یہاں تک کہ اس منصوبہ کا کمی بیشی ٹھیک اس رنگ میں ہو جو اسلام، پاکستان اور ساری انسانیت کے لئے ہر لحاظ سے مفید ثابت ہو۔

حق

ضیا محمد ضیاؔ

وہ بادل کی طرح گرجا وہ بجلی کی طرح کڑکا
وہ طوفاں کی طرح اُمڈا وہ شعلے کی طرح بھڑکا

بگولا بن کے آیا دامنِ کوہ و بیاباں میں
ہوا داخل نسیمِ صبح کی صورت گلستاں میں

شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں پایا
مصافِ زندگی میں سخت کوش و سخت جاں پایا

کبھی چرچا تھا درباروں میں اسکی تند خوئی کا
کبھی تھا محفلوں میں ذکر اس کی خندہ روئی کا

کبھی زنجیر سے اُلجھا کبھی شمشیر سے کھیلا
کبھی تدبیر سے اُلجھا کبھی تقدیر سے کھیلا

کبھی شدادِ دوراں کو سرِ میداں للکارا
کبھی آئینۂ نمرود کو پتھر پہ دے مارا

کبھی فرعون کا تختِ خداوندی اُلٹ ڈالا
کبھی قارون کی دنیا کا پانسہ ہی پلٹ ڈالا

کبھی مقتل میں نظارہ دکھایا رقصِ بسمل کا
محبت سے لیا بوسہ کبھی شمشیرِ قاتل کا

کبھی شعلوں میں آ کُودا کبھی موجوں سے ٹکرایا
کبھی باطل نے اس کو دار کے تختے پہ لٹکایا

کبھی برسائے پتھر اور کبھی مارے اسے کوڑے
غرض طاغوت نے اس پر ہزاروں ہی ستم توڑے

وہ دریاؤں میں گونجا، اور ایوانوں میں در آیا
کبھی چھوٹے خداؤں کی خدائی سے نہ گھبرایا

اسے زنداں میں ڈالا بارہا باطل پرستوں نے ‏ رکھا ہے اسکو اکثر پابجولاں چیرہ دستوں نے

اسے سطوت نے ڈانٹا سلطنت نے اسکو دھمکایا ‏ مگر جبر و تشدد سے کبھی دبنے نہیں پایا

بڑھا شیروں کی صورت قیصر و فغفور کے آگے ‏ نکل آیا دلیروں کی طرح منصور کے آگے

نہ کوئی مصلحت اس کی زباں کو بند کر پائی ‏ نہ سمجھوتے کی صورت ہی کوئی اسکو پسند آئی

نہ رُخ اس کا حوادث کے تھپیڑوں نے کبھی موڑا ‏ شکستِ ظاہری نے اس کی ہمت کو نہیں توڑا

نہ آلودہ ہوا دامن کبھی اس کا نمائش سے ‏ یہ نکلا کامراں ہر امتحان و آزمائش سے

اگرچہ روکتا تھا راستہ بڑھ کر ستم اس کا ‏ مگر پیچھے کبھی ہٹنے نہیں پایا قدم اس کا

کیا پیغام پیش اپنا وزیر و شاہ کے آگے ‏ کبھی جھکنے نہیں پایا وہ غیر اللہ کے آگے

کبھی جیتا نہیں اس کو کسی نے زور و قوت سے ‏ مگر ہاں نرم ہو جاتا ہے آئینِ محبت سے

انوکھی اور نرالی ہے جہاں سے داستاں اسکی ‏ رہی محوِ تشکر زیرِ خنجر بھی زباں اسکی

کھڑا کرتے ہیں جب اسکو عدالت کے کٹہرے میں ‏ یہ پہروں دم لیا کرتا ہے سنگینوں کے پہرے میں

سر و سینہ پہ پیہم زخم کھاتا ہی چلا جائے ‏ یہ ہر طرزِ جفا پہ مسکراتا ہی چلا جائے

جہاں سے جور و استبداد کی رسمیں مٹا ڈالیں ‏ شہنشاہوں کے ایوانوں کی بنیادیں ہلا ڈالیں

نہ قلت سے پریشانی نہ فخر و ناز کثرت پر

چلا آتا ہے اول روز ہی سے اپنی فطرت پر

تجربہ

رئیس احمد شبنم اکبرآبادی

محبت دوستی، اخلاص، ہمدردی، نکوکاری　　یہ دولت لے کے آیا تھا میں انسانوں کی بستی میں
سمجھتا تھا کہ یہ چیزیں ہیں دنیا کو بہت پیاری　　بہت کچھ ان کی قدر و منزلت ہے بزمِ ہستی میں

یہاں حق دوستی کے سینکڑوں ارمان رہتے ہیں
یہ انسانوں کی دنیا ہے یہاں انسان رہتے ہیں

بہل جاتے ہیں غمگینوں کے دل دنیائے ہستی میں　　مصائب میں یہاں انسان کو ہمدرد ملتے ہیں
خلوصِ دل نظر آتا ہے انسانوں کی بستی میں　　جواں مردی پہ جن کو ناز ہے وہ مرد ملتے ہیں

مظاہر دل کشی کے دوستی تیار کرتی ہے
محبت بے تکلف رات دن ایثار کرتی ہے

مگر افسوس میرا "تجربہ" کچھ اور ہی نکلا　　غلط فہمی پہ اپنی کس قدر اب میں پشیماں ہوں
میں کیا سمجھا تھا اس دنیا کو کیا نکلی ہے یہ دنیا　　میں اس دنیا کے جلوے دیکھتا ہوں اور حیراں ہوں

نکوکاری کے پردے میں گنہگاری کے جلوے ہیں
مقدس بارگاہوں میں ریاکاری کے جلوے ہیں

محبت نام ہے دنیا میں جسمانی تعلق کا　　خلوصِ دل کے پردے میں "ضرورت" کارفرما ہے
غرض کا نام اربابِ غرض نے دوستی رکھا　　حقیقت میں یہ ہمدردی بہت رنگین دھوکا ہے

یہ وہ دھوکا ہے جس میں مجھ سے سادہ لوح پھنستے ہیں
یہ وہ دھوکا ہے جس پر اہلِ باطل خوب ہنستے ہیں

غالب ـــــ ایک اور زاویۂ نگاہ سے

مسعود جاوید - بی، ایس سی (ختم)

ہر وہ آدمی جس نے انسانی ضرورتوں — مادی ضرورتوں، اور ان سے بڑھ کر ذہنی و روحانی ضرورتوں — کو پورا کرنے کے لئے اپنی توتوں اور اوقات کو قربان کر کے کوئی نئی چیز تخلیق کی ہو اور انسانیت کے خزانے میں کوئی اضافہ کیا ہو، کسی نہ کسی درجے کا بڑا آدمی ہوتا ہے، اور اس کی بڑائی کو کوئی اس سے چھین نہیں سکتا۔ غالب بھی ایک بڑا آدمی تھا اور اس کی جیسی کچھ اور جتنی کچھ بڑائی ہے وہ بہرحال ہے۔

لیکن اس کو جس مصنوعی طریق سے اچھالا گیا ہے اور اس کے لفظ لفظ کی چیر پھاڑ کر کے ان میں سے جو نکات نکالے گئے ہیں، اس سارے کارنامے کو دیکھ کر ہنسی آتی ہے۔

غالب ریسرچ کا افسانہ کیسے بنا اور اس کے کلام کی "کان کنی" کے لئے کیا چیز محرک ہوئی؟ — واقعہ اصل میں یہ تھا کہ جب شروع شروع میں انگریزی تعلیم رائج ہوئی اور ہمارے نوجوان انگریزی ادب کے نگارخانے میں داخل ہوئے تو ان کا تعارف شیکسپیئر سے ہوا اور اس کے ساتھ ساتھ شیکسپیئر کے گرد تنقید و تشریح اور نکتہ آفرینیوں کی کڑیاں جس طرح رنگین ادبی جالے بنا رہی تھیں اس سے دل مرعوب ہوئے۔ اب ان لوگوں نے اپنے ہاں نگاہ ڈالی کہ یہاں بھی ادب کی جلوہ گاہ کے لئے ایسا کوئی "صنم اکبر" مل سکتا ہے یا نہیں شیکسپیئر تو یہاں کہاں ملتا، غالب پر نگاہیں جا رکی ہوئی ہیں۔ بس پھر جو غالب غالب کی پکار بلند ہوئی اور غالب کی تفسیر کرنے کے لئے قلم حرکت میں آئے تو کسی طرف سے کوئی کمی نہ رہی۔ رسالوں کے اوراق غالب کے ذکر سے بھر گئے، کوئی ادبی مجلس غالب پر بحث کئے بغیر در خور اعتنا نہ رہی، دیوان غالب کے شاندار ایڈیشن نکلنے لگے اور ایک ایک شعر کی تشریحیں اور تفسیریں لکھی جانے لگیں۔

لیکن بات جہاں پہنچا دی گئی تھی، وہ اس کی اصل سطح سے زیادہ اونچی جگہ تھی، چنانچہ اس کا رد عمل از خود نمودار ہوا اور وہ غالب پرستی کا دور ختم ہو گیا۔ اب لوگ غالب پر بلا ضرورت لکھنے کی حرکت سے تھک چکے ہیں اور اب موقع آ گیا ہے کہ لوگ سنجیدگی سے غیر مبالغہ آلود نگاہیں ڈال کر دیکھیں کہ غالب کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔

مسعود جاوید کا یہ مضمون اس سلسلے میں ایک اچھی مثال ہے، اور اہل ذوق یقیناً اس کی قدر کریں گے۔ (مرتب)

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

یہ شعر نہ صرف غالب کی ذہنی کیفیت کا آئینہ دار ہے بلکہ اس معاشرہ کی روح کا بھی مظہر ہے جس میں غالب نے تربیت پائی اور شاعری کی۔ غالب اس دور کی پیداوار ہیں جبکہ مغلیہ عظمت کے فلک بوس قصر و ایوان سرعت کے ساتھ کھنڈروں میں تبدیل ہو رہے تھے۔ شاہی کے محور کے گرد گھومنے والا معاشرہ فنا کی گرفت میں آ رہا تھا۔ بوسیدہ انسانی رشتے ایک ایک کر کے ٹوٹ رہے تھے۔ انسان مضمحل اور غیر منصفانہ ضابطۂ حیات سے اکتا کر ایک نئی کروٹ لینا چاہتا تھا۔ مگر اس کی یہ خواہش سراسر منفی تھی، کیونکہ وہ نہیں جانتا تھا کہ نیا نظامِ حیات کیسا ہو۔ کون سا نظام زندگی نافذ ہو گا۔ اس کے ذہن میں مستقبل کی کوئی واضح اور معین تصویر نہیں تھی، وہ کبھی مستقبل کو غیر یقینی اور تاریک یا ماضی کی طرف للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھتا تھا اور کبھی، یہ جان کر کہ ماضی لوٹ کر نہیں آ سکتا،

غالب ـــ ایک اور زاویہ نگاہ سے

حال پر قناعت کرنے اور اسی سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی کشمکش و پیچ کی یہ ذہنی کیفیت اس وقت کے سارے معاشرہ پر چھائی نظر آتی ہے۔ اتنا تذبذب کے دلدل سے نکلنے کی اس وقت کے انسان کے آگے کوئی صورت نہ تھی۔ مذہب، ضابطۂ حیات کی حیثیت سے بھلایا جا چکا تھا۔ گو ہندو مت اور اسلام کے چند ذریں معاشرہ میں کارفرما تھے مگر ان پر روایات نے اس قدر ملمع کاری کی تھی کہ وہ صداقت سے دور جا پڑے تھے۔ اور ان کی افادیت ختم ہو چکی تھی ـــ اور پھر کوئی چیز، کسی نظام کا، اسی وقت افادیت دکھا سکتی ہے جبکہ اسے پورے نظام کے ساتھ نافذ کیا جائے۔ چند اصولوں کے نفاذ اور بیشتر کی تنسیخ سے کبھی کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا بلکہ نقصان ہی ہوتا ہے۔ اور اس نظام کی نیک نامی متاثر ہوتی ہے۔

ہندوستان میں اسلام کے ساتھ یہی ہوا۔ وہ یہاں کبھی بحیثیت مجموعی نافذ نہیں ہوا۔ بادشاہوں نے اسے ہمیشہ اپنے ذاتی اغراض کے لئے استعمال کیا اور اس کے انہیں اجزا کو نافذ کیا جن سے حکمرانی میں مدد مل سکتی تھی، بیشتر ایسے اجزا کو جن پر عوام کی بھلائی کا مدار تھا، نافذ ہونے نہیں دیا۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں اسلام کے متعلق یہ غلط فہمی عام ہو گئی کہ وہ بھی چند رسوم اور عبادات کا پلندہ ہے جن کا تعلق مسجد اور حیات بعد الممات سے ہے۔ ظاہر ہے ایسے ضوابط جن کی پابندی سے اس دنیا کی زندگی نہیں سنور سکتی، وہ زیادہ دن تک انسان پر حکومت نہیں کر سکتے۔ ان کی گرفت بہت جلد ڈھیلی پڑ جاتی ہے اور اگر حکمران طبقہ ان ضوابط کے نام پر عوام پر ستم ڈھائے تو فطری طور پر عوام کو ان ضوابط سے نفرت ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام ہندوستان میں زیادہ دن تک معاشرہ کی بنیاد نہ بن سکا۔ عوام مروجہ اسلام سے دور ہوتے گئے اور حقیقی اسلام کو سمجھنے کی کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ ان حالات میں یورپی تہذیب کی پرچھائیں ہندوستان پر پڑیں۔ چونکہ ہندوستانی احساسِ شکست سے چور تھے اس لئے وہ بہت جلد فرنگی تہذیب کے فریب میں آ گئے۔ مغربی قدریں ان کی ذہنی الجھن میں اضافہ کا باعث ہو گئیں کیونکہ ان قدروں کے حامل انہیں غلام بنانا چاہتے تھے۔ لیکن ان نئی قدروں کے آنے سے یہ ہوا کہ پرانی قدروں سے بے زاری اور بڑھ گئی۔

اردو شاعری میں یہ بے زاری نمایاں طور پر جھلکتی ہے کیونکہ اردو شاعری ایسے دور میں پھلی پھولی جبکہ مروجہ مذہبی ضوابط کو ذہین طبقہ اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھتا تھا اور انہیں ایک اذکار رفتہ چیز سمجھتا تھا۔ یہ خیالات اردو شاعری میں واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ غالب کے دور میں مروجہ اسلامی ضابطوں سے ذہین طبقہ کو ہمدردی نہیں تھی۔ گو روایتاً عوام ان سے منسلک تھے مگر شعوری طور پر وہ انہیں غیر مفید خیال کرتے تھے لیکن اس وقت کے ہندوستان میں ایسے اصحاب بھی تھے جو انسانیت کی بھلائی صحیح اسلامی نظامِ حیات کے نفاذ میں دیکھ رہے تھے۔ سید احمدؒ دہلوی اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کی تحریک تنفیذِ دین اسی فکر کا نتیجہ تھی۔ اس تحریک کے علمبرداروں نے عوام میں اسلام کے متعلق پائی جانے والی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی مگر کچھ زیادہ کامیاب نہ ہو سکے۔ دہلی کے کوچہ و بازار اس تحریک سے گونج رہے تھے جبکہ غالب دہلی کی ادبی محفلوں کی روحِ رواں بنے ہوئے تھے۔ اس تحریک نے انہیں متوجہ بھی کیا مگر وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکے۔ روایات اور ماحول کے بندھنوں میں جکڑے رہے اور آخر وقت تک تذبذب میں گرفتار!

بچپن کی تربیت انسان کے کردار کی بنیاد ہوتی ہے۔ یہ بات غالب کے لئے بھی صحیح ہے۔ غالب کی تربیت ایک انحطاط پذیر امیرانہ ماحول میں ہوئی۔ تعلیم و تربیت میں مذہب کو بہت کم دخل رہا۔ دورِ شباب، امیروں کے لونڈوں کی طرح رنگ رلیوں میں بیتا۔ شاہد و شراب مقصودِ حیات بنے رہے۔ عملاً مذہب سے بیگانہ تھے ہی، ملا عبد الصمد ایرانی کے فیضِ تادیب نے انہیں ذہنی اعتبار سے بھی آوارہ کر دیا۔ شاید اسی نے غالب کو عیش کوشی کا یہ مشورہ دیا تھا۔
ابتدائے شباب میں ایک مرد کامل نے یہ نصیحت کی کہ ہمیں زہد و ورع منظور نہیں، ہم مانعِ فسق و فجور نہیں۔ پیو، کھاؤ، مزے اڑاؤ مگر یہ یاد رکھو کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو، سو اس پر عمل رہا ـــــ"

اس قسم کی تربیت پانے اور اس نوع کے حالات میں رہنے کے بعد حضرت غالب کی ذکاوت سے یہ امید کیسے کی جا سکتی ہے کہ وہ مروجہ اسلامی تصورات کا مذاق نہ اڑاتے۔ انہوں نے اپنی ذہانت سے کام لے کر مروجہ اسلامی عقائد کو خوب جھنجھوڑا اور ان کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا۔ مسجد، واعظ، قیامت، سزا و جزا، دوزخ و جنت، حور و غلمان، طور وغیرہ کو کچھ اس طرح ہدف بنایا ہے کہ سنجیدہ آدمی بھی زیرِ لب مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتا۔
قیامت کا عقیدہ اسلام میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ نظامِ اخلاق کا دار و مدار بڑی حد تک اسی عقیدہ پر ہے۔ غالب نے عجیب انداز سے اس

عقیدہ پر خیال آرائی کی بجائے اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کے قائل نہیں تھے یہ بات اور بھی مسلّم ہو جاتی ہے، اگر ان خیالات کو ان کی عملی زندگی سے ملا کر دیکھا جائے:-

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن — دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے
ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا — وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

غالب کے دیوان میں ایسے اشعار بھی ہیں جن میں بظاہر ان عقائد کو صحیح مان کر مضمون آفرینی کی گئی ہے مگر جن لفظوں خیالات کے اظہار کے لئے ان عقائد کو استعمال کیا گیا ہے ان سے، ان عقائد کا تقدس پاش پاش ہو کر رہ گیا اور غالباً شاعر چاہتا بھی یہی تھا:-

کیوں نہ جنت کو بھی دوزخ سے ملالیں یارب — سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی
پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق — آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا
جو یک عمر ورع بار تو دیتا، بارے — کاش رضواں ہی درِ یار کا درباں ہوتا
کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی — گھر ترا خلد میں گر یاد آیا
میں جو کہتا ہوں کہ ہم لیں گے قیامت میں تمہیں — کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ "ہم حور نہیں"

غالب اپنی تربیت اور ماحول کے سبب مذہب کی پابندیوں کو گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ آزادہ روی ان کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی۔ اس لئے انھوں نے مذہب کی پابندیوں سے گھبرا کر نام نہاد "آزادیت" کی آغوش میں پناہ لی ہے اور "دیر و حرم" کی بنیادوں پر ضرب لگانے کی کوشش کی ہے:-

دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنا — واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں
وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے — مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو
نہیں ہے سبحہ و زنار کے پھندے میں گیرائی — وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے
طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ — دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو!

بعض وقت غالب زہد و طاعت کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں مگر تقدیر کی آڑ لے کر اپنی رندی کے لئے جواز پیدا کرتے ہیں:

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد — پر طبیعت اِدھر نہیں آتی
ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسمِ ثواب سے — ٹیڑھا لگا ہے قط قلمِ سرنوشت کا

غالب نے دو قطعات میں اپنے روزہ نہ رکھنے کی وجہ بیان کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایسا شخص روزہ کیا رکھے جس کے پاس روزہ بہلانے کا سامان اور افطار کرنے کو کچھ نہ ہو۔ یہ بات غالب[1] کے لئے صحیح ہو یا نہ ہو لیکن اس دور کی معاشی بدحالی تو اس سے ظاہر ہوتی ہے۔ افلاس میں آدمی کے لئے عبادات کی ادائیگی، اس میں کوئی شک نہیں، مشکل ہو جاتی ہے[2]۔ غالب کے دور کے عوام کی اکثریت مفلس تھی اس لئے بھی وہ مذہب کی اطاعت نہیں کر سکتے تھے۔ ذیل کا قطعہ جس حالت کو بہتر طریقہ پر ظاہر کرتا ہے:

افطارِ صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو — اس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے
جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو — روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

---

[1] غالب کے لئے تو افلاس مانع نہ تھا، افلاس تو صرف ان کی رندی ہی کے لئے تھا (مرتب) [2] عبادت کی ادائیگی میں شاید افلاس کے مقابلے میں غنا زیادہ حائل ہوگی (مرتب)

غالب — ایک اور زاویۂ نگاہ سے

بایں ہمہ رندی و بے دینی، غالب کے پاس ایسے اشعار بھی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں رسول کریم ﷺ[1] سے عقیدت تھی۔ فارسی میں تو نعتیں بھی لکھی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ نعتیں رسماً لکھی گئی ہوں۔ غالب کی اردو غزل کا ایک شعر یہ بھی ہے:

اس کی امت میں ہوں میں، میرے رہیں کیوں کام بند / واسطے جس شہ کے غالبؔ گنبدِ بے در کھلا

غالب کو جن معاشی مشکلات سے، ان کی اپنی بے راہ روی کی وجہ سے دوچار ہونا پڑا اس کی بنا پر وہ خدا سے شاکی ضرور تھے مگر خدا کے منکر نہیں تھے، انھوں نے غمِ روزگار سے گھبرا کر کہا ہے:-

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی / بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

زندگی اپنی جو اس طرز سے گزری غالبؔ / ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

خدا اور کائنات کے متعلق غالب کا نقطۂ نظر وہی تھا جو اہلِ تصوف کا ہے ذیل کے اشعار ان کے نقطۂ نظر کی وضاحت[2] کے لئے کافی ہیں:

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود / پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ / عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

غالب کے ان رجحانات کے مطالعے سے ایک بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ وہ مذہب کی پابندیوں کو مختلف وجوہ کی بنا پر گوارا نہیں کر سکتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ، برائے نام ہی سہی، مذہب سے وابستہ منسلک تھے۔ ان کے پاس اسلام کا تصور بہت تنگ تھا اسے وہ چند رسوم و عبادات کا مجموعہ سمجھتے تھے اور بس:

"میاں کس قصے میں پھنسا ہے فقہ پڑھ کر کیا کرے گا طب و نجوم و ہیئت و فلسفہ پڑھ جو آدمی بننا چاہے۔ خدا کے بعد نبی، نبی کے بعد امام، یہی ہے مذہبِ حق والسلام والاکرام۔ علی علی کیا کر اور فارغ البال رہا کر۔"

یہ تھا وہ مذہب جس پر غالب ایمان رکھتے تھے۔ غالب کی شاعری، معاشرہ کی حالت کی آئینہ دار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک قسم کی تنقیدِ حیات بھی ہے۔ غالب نے جو کچھ محسوس کیا اسے بھی بیان کیا اور ان کی دانست میں جو خرابی تھی اس کی بھی نشان دہی کی۔ گو ان کی یہ تنقید، سب کی سب صحیح نہیں ہے لیکن اس تنقید سے اس وقت کے انسان کی ذہنی الجھنوں کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا۔ دورِ غالب میں اسلام کا تصور، اسلامی ضوابط کی پابندی اور ان کا اثر زندگی پر، واعظ کی روش — سب کچھ غالب کی شاعری میں دیکھا جا سکتا ہے۔

(حلقۂ ادبِ اسلامی، لاہور میں پڑھا گیا)

(صفحہ ۲۴ کا بقیہ)

خود فراموش کہہ کے تحریکِ اسلامی کی فکری مدافعت کے لئے شعر کہلواتے ہیں۔

بہرحال یہاں جھوٹ کی کوئی بحث نہیں اور نہ فنِ افسانہ نگاری کا کوئی سوال چھڑتا ہے۔

اب اگر آپ پر افسانوں کا نزول بند ہو چکا ہے تو خدارا دوسروں کو تو محروم کرنے کی مہم شروع نہ کیجیے۔

---

[1] جی ہاں! اس کی بہت سی مثالیں آپ کو ملیں گی کہ جو لوگ رسول کریم ﷺ کے دین کو چرکے لگاتے ہیں وہی بڑھ بڑھ کے رسول کریم کی محبت کا دم بھرتے ہیں، اس طرح ان کے ضمیر کا سارا غبار صاف ہو جاتا ہے (مرتب)

[2] یہ بھی ایک عجیب بات ہے کہ رندی کو ہمیشہ تصوف کے زیرِ سایہ پناہ ملتی ہے۔

استفسارات

افسانہ اور جھوٹ

افسانہ کے بارے میں میرے ذہن میں کچھ شکوک ابھر آئے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کے مزاج اور اسلام کے مزاج میں ایک گونہ بُعد ہے۔ افسانہ کا ضمیر جھوٹ سے بنتا ہے۔ افسانہ نویس ماحول کی عکاسی کرتا ہے لیکن یہ عکاسی کسی ایک واقعہ کی نہیں ہوتی بلکہ مختلف واقعات کی کچھ کڑیاں اس طرح مربوط و منظم کرتا ہے کہ یہ مختلف واقعات ایک واقعہ یا ایک کہانی کی شکل اختیار کر جاتے ہیں۔ یہی کوشش میں سمجھتا ہوں کہ جھوٹ ہے جسے اسلام کسی حال میں بھی برداشت نہیں کرتا۔ کہا جا سکتا ہے کہ کہانی اظہار واقعہ کا فرض انجام دینے کے لئے نہیں بلکہ یہ ایک تمثیل ہے۔ لیکن تمثیل کو بھی اپنے ذہن سے گھڑنا اور پھر اس کو اس رنگ میں پیش کرنا کہ واقعی ایسا ہوگزرا ہے، بجائے خود مسلمان ذوق پر گراں گذرتا ہے۔ کیا یہ فعل "فی کل وادٍ یھیمون" کی ذیل میں نہیں آتا؟

ایک مدت سے میرا ذہن اس بارے میں الجھا ہوا ہے۔ میں نے ایک دو افسانے لکھے تھے لیکن اب کافی مدت ہوگئی ہے۔ صرف اس وجہ سے یہ کام چھوڑ دیا۔ حتی الوسع اپنے ماحول میں دوسروں کو بھی افسانہ نگاری سے روکتا ہی رہتا ہوں، لیکن جب اپنے سے بیش و دُوں اور اپنے سے زیادہ علم و تقویٰ رکھنے والے حضرات کو اس گناہ میں مبتلا پاتا ہوں تو شک گذرتا ہے کہ ممکن ہے میرا ہی اندازہ غلط ہو؟

بہرکیف "یہ تمثیل والا" جواب مجھے مطمئن نہیں کرے گا کسی علمی طریق پہ مجھے سمجھائیے۔

معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے ناشکرے پن بلکہ گستاخانہ طرزِ فکر کی یہ سزا آپ کو دی جا رہی ہے کہ آپ پر آسمانِ ادب سے افسانہ کا نزول بند کر دیا گیا ہے آپ ایک مدت سے کچھ نہیں لکھ پا رہے، اور ایک مدت تک کچھ نہ لکھ پائیں گے۔

گڑبڑ اصل میں یہ ہے کہ آپ نے جھوٹ کا ایک ایسا تصور ذہن میں قائم کر رکھا ہے کہ وہ افسانہ کی ماہیت پر غلط حکم لگنے کا موجب بن گیا ہے۔ آپ کے اس تصور کی وجہ سے مجھے اندیشہ ہے کہ آپ کسی ایسے شخص کو نہ بخشیں گے جو "آتشِ رخسار" "نورِ مسرت" "تنورِ شکم" "ظلمتِ یاس" "کوہِ الم" وغیرہ استعارہ آمیز ترکیب استعمال کر بیٹھے۔ آپ تو اسے اپنی کچہری میں بلا کر کھڑا کریں گے اور پھر کہیں گے کہ ثابت کر کہ رخسار سے کوئی آگ نکلتی ہے، مسرت کوئی تاریخ ہے اور پیٹ تنور ہے، ناامیدی روشنی کی نفی کا نام ہے اور الم کوئی پہاڑ ہے! وہ غریب کیسے یہ ثابت کرے گا اور آپ اسے دروغگوئی کے الزام میں دھر لیں گے۔ پھر کسی بات کہنے والے نے اگر کہہ دیا کہ "مصائب نے مار ڈالا" تو آپ اسے پکڑ لیں گے کہ تو زندہ و سلامت موجود ہے اور اس کے باوجود اپنی موت کا اعلان کرتا ہے، بلکہ صاحب اپنے قتل کا الزام بھی لگا رہا ہے۔ اسی طرح اگر کسی نے یہ کہہ دیا کہ "مقدمے نے کچھ نہیں چھوڑا" تو آپ اس کا گلا دبوچ لیں گے کہ تیرے پاس ابھی تو کچھ تو بہت زیادہ ساز و سامان موجود ہے، اس ڈھٹائی سے جھوٹ بولتا ہے؟ پھر اگر کسی مبتلائے ذلت نے ٹھنڈی سانس بھر کے یہ کہا کہ "بدمعاش اولاد نے زندہ درگور کر دیا" تو آپ اس کے پیچھے ہاتھ دھو کے پڑیں گے کہ ثابت کر کہ تیرے لئے کوئی قبر کھودی گئی ہے اور تجھے اس میں دفن کیا گیا ہے اور اب تو قبر کے اندر سے بول رہا ہے۔ وہ بیچارا یہ صورِ قیامت سُن کر دم بخود رہ جائے گا اور آپ اسے دروغ بافی قرار دے کے رہیں گے۔ نہ معلوم کتنوں کو آپ اس طرح حوالات میں ٹھونستے چلے جائیں گے۔ لیکن انہی میں سے کوئی اللہ کا ایسا ذہین بندہ بھی نکل آئے گا جو آسمانی کتب کو اپنے ساتھ شہادت کے لئے لے آئے گا پھر آپ کو استعارہ و مبالغہ کی وہ وہ مثالیں ملیں گی کہ آپ کا سر چکرا جائے گا۔ حضرت عیسیٰ کی دس کنواریوں والی تمثیل اور قرآن کی باغ والوں کی مثال

استفسارات

پھر کفر کو ظلمت، ایمان کو نور، وحی کو بارش، دین کی راہ کی دشواریوں کو طوفانِ برق و رعد کہنے کی مثالیں آپ کے سامنے آئیں گی، پھر مستقبل کے واقعات صیغۂ
ماضی میں بیان کئے ہوئے پائیں گے، جیسے کہ وہ واقع ہو چکے ہیں۔ یہاں آپ کی عدالتِ عالیہ کیا کرے گی؟

یہاں پہنچ کر آپ کو سوچنا پڑے گا کہ جھوٹ کا جو تصور آپ نے باندھا ہے بجائے خود اس میں کوئی خلل ہے۔ آیئے جھوٹ کی تعریف متعین کرلیں۔ جھوٹ کسی امرِ واقعہ کو اس قصد کے لئے غلط صورت میں پیش کرنے اور اسی غلط صورت کے صحیح ہونے کا یقین دلانے کا دوسرا نام ہے کہ آدمی مخاطب سے کوئی ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتا ہو یا اسے کوئی نقصان پہنچانا چاہتا ہو یا اپنے کسی عمل بد کے نتیجہ سے بچنا چاہتا ہو۔ جھوٹ کی یہ تعریف جس طرح تشبیہ، استعارہ، مبالغہ اور دوسرے اندازہائے بیان کو اپنے دائرہ سے باہر چھوڑ دیتی ہے، اسی طرح افسانہ و تمثیل کو بھی اپنی حدود سے خارج رکھتی ہے۔

آپ کو یہ ضد کیوں ہے کہ تمثیل والے جواب سے آپ بات کو نہ سمجھیں گے۔ بات سمجھنے کا یہی بہترین دروازہ ہے اور آپ اسی کو بند کرنا چاہتے ہیں۔
میں پہلے بھی اس خیال کا اظہار کر چکا ہوں اور اب پھر سے دوہرا تا ہوں کہ افسانہ ایک تشبیہِ مرکب اور ایک استعارۂ جامع کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ یہ دعویٰ تو نہ افسانہ نگار کو ہوتا ہے کہ وہ وقائع نگاری یا سوانح نگاری کر رہا ہے اور نہ بطورِ معروف پڑھنے والے یہ سمجھ کر اسے پڑھتے ہیں کہ افسانہ میں کسی حقیقی واقعہ یا کسی کی سیرت کا نقشہ کھینچا گیا ہوگا، بلکہ دونوں طرف یہ بات معلوم و متعین ہوتی ہے کہ بیان کسی واقعۂ خاص کا نہیں بلکہ سوسائٹی میں ہونے والے ایک خاص نوعیت کے واقعات کا ایک مثالی نمونہ پیش کیا جا رہا ہے، اور سیرت نگاری کسی خاص شخصیت کی نہیں کی جا رہی بلکہ سوسائٹی میں پائی جانے والی شخصیتوں کے کردار مثالی حیثیت سے سامنے لائے جاتے ہیں۔ افسانہ نگاری درحقیقت افراد کے بجائے ایک سوسائٹی کے ذہن و اخلاق کی عکاسی ہوتی ہے۔ افسانے میں بعض بکھرے ہوئے واقعات کو جوڑ کر اس طرح محدود بنا دیا جاتا ہے کہ ایک عامی کی نگاہ بھی ان سب کو محیط ہو سکتی ہے، لیکن میدانِ عمل میں وہ اتنی دوری تک پھیلے ہوئے ہوتے ہیں کہ اوسط درجہ کی حس کے ساتھ عام آدمی ان کے وجود کو اور ان کے اثرات کو نہیں سمجھ سکتا۔ دراصل افسانہ نگار، اس کا مدعی نہیں ہوتا کہ وہ کسی شخصِ خاص یا کسی واقعۂ خاص کا نقشہ مرتب کر کے لا رہا ہے، بلکہ وہ تو صرف یہ کرتا ہے کہ اپنے گرد و پیش پر نگاہ ڈال کر کوئی واقعی کردار اخذ کر لیتا ہے اور پھر اسے ایک شخصیت کا جامہ پہنا کر اس کے تاریک یا روشن اخلاقی پہلوؤں کو نمایاں کرتا ہے اور اس "حرکت" سے اس کا اصل مدعا یہ ہوتا ہے کہ انسانیت کے ایک خاص طرح کے نمونوں کے خلاف وہ بیزاری پیدا کرے کہ لوگ جہاں اسے دیکھیں ناپسند کریں، اور دوسری طرف وہ ایک خاص طرح کے نمونوں کے لئے جذبۂ احترام پیدا کرتا ہے کہ لوگ جہاں اسے پائیں اپنے لئے مثال بنائیں۔ اسی طرح وہ جس واقعہ کو افسانہ کے پردہ پر لاتا ہے، صرف اسلئے لاتا ہے کہ لوگ اپنے ماحول میں ایسے واقعات ہوتے دیکھیں تو ان سے کیا تاثر لیں اور ان کے خلاف ان کا ردِ عمل کیا ہو۔

یہ ہے افسانہ کی اصل حقیقت، اور جس پر یہ حقیقت اور جھوٹ کا صحیح مفہوم بھی واضح ہو وہ افسانہ کو جھوٹ کی تعریف کے تحت لانے کی غلطی نہیں کر سکتا۔
"فی کل وادٍ یہیمون" کے معنی دوسرے ہیں۔ یہ الفاظ شعرائے عرب کے متعلق وارد ہیں جن کی فکر تابعِ حق اور پابندِ حدود نہ تھی اور وابستۂ مقصدِ حیات نہیں تھی۔ اس وجہ سے ان کا حال یہ تھا کہ ابھی ایک جذبہ کی رو آئی اور اس میں بہ گئے، پھر دوسرے جذبے کا ریلا آیا تو اس کا شکار ہو گئے۔ ابھی تارے توڑ کے لا رہے تھے اور ابھی خاک چھانتے نظر آئے، قصیدہ کے میدان میں نکلے تو ممدوح کو خدا بنا کے چھوڑا اور ہجو کی وادی میں بڑھے تو معتوب کو شیطان سے زیادہ بدبخت ٹھہرا دیا۔ جی چاہا تو برائی کو بھلائی سے زیادہ محبوب بنا دیا اور ترنگ میں آئے تو بھلائی کو برائی سے نیچے لے گئے۔ بس ایک اندھا طوفانِ جذباتیت کا جو صریح کرکے نکلا، پھر اس کے سامنے کوئی روک ٹوک نہیں اور جس کے لئے کوئی ٹھکانہ نہیں۔ لیکن قرآن نے ان شعرا کا ذکر کرنے کے بعد "اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" کے الفاظ سے ایک اہم استثنیٰ کیا ہے اسے نظر انداز نہ فرمایئے۔ یہ استثنیٰ اگرچہ شعرائے اسلام کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ ایمان و عمل کرنے والے مسلمانوں کے لئے عام ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو شعرائے عرب کی طرح "فی کل وادٍ یہیمون" کی بیماری میں مبتلا نہیں ہیں۔ لیکن اس عام استثنیٰ کے اندر شعرائے اسلام کا خاص استثنیٰ بھی مخفی ہے۔ چنانچہ اولین شاعرِ اسلام حضرت حسان بن ثابت سے نبی صلعم نے (باقی صفحہ ۲۴ پر)

ابھی رات ہے!

منظر حسین

منظر تاریخ کو ادب کا یا حقیقت کو افسانے کا ایک سا لباس پہنا کے لائے ہیں۔ منظر کی یہ کوشش اگرچہ نو مشقی کی علامات اپنے اندر رکھتی ہے مگر بحیثیت مجموعی نہ صرف یہ کہ ناکام نہیں، بلکہ خراجِ تحسین وصول کرنے کی مستحق ہے۔ یہ افسانہ تحریک اخوان المسلمون اور اس کے لیڈر کے بارے میں ہمیں حقیقت کے چند ایسے گوشوں سے متعارف کراتا ہے جن کے متعلق کتابیں، اخبارات اور اشخاص سب کے سب گونگے ہیں۔ لیکن حقیقت جب اپنے آپ کو فاش کرنا چاہتی ہے تو اسے زبانیں مل ہی جایا کرتی ہیں۔ دنیا میں کمی بولنے والی زبانوں کی نہیں سننے والے کانوں کی ہے۔ منظر حسین جب حقیقت کے سامنے سننے والے کان لے کے گئے تو حقیقت ہمہ تن زبان بن گئی۔ (ادارہ)

آنسو اور آنسو مسلسل بہہ رہے تھے۔ وہاں صرف آنسو ہی تھے جو اب کچھ خشک ہو چلے تھے۔ ایک طرف ماں کی کمائی لٹ گئی تھی تو دوسری طرف باپ کا سہارا ٹوٹ گیا تھا۔ ایک طرف بیوی کا سہاگ اجڑ گیا تھا تو دوسری طرف ننھی دل وفا یتیم ہو گئی تھی۔ اور نہ صرف وفا یتیم ہو گئی تھی، بلکہ اس کی چار بہنیں اور ایک بھائی بھی اچانک باپ سے بچھڑ گئے تھے۔ سامنے کمرے کے سلیوں میں لپٹی ہوئی حسن کی لاش پڑی ہوئی تھی جسے فرعون کے ظالم عمال نے نہایت بے دردی سے جگہ جگہ سے کاٹ دیا تھا۔

بوڑھی ماں کی آواز روتے روتے بیٹھ گئی تھی اور کمزور باپ کی داڑھی آنسوؤں سے بھیگ چکی تھی اور غم نصیب بیوہ کی چیخیں اب ہلکی ہلکی سسکیوں میں بدل چکی تھیں اور یتیم بچوں کا ال کر رونا بھی تقریباً بند ہو چکا تھا۔ آنسوؤں کا ذخیرہ آہستہ آہستہ ختم ہو رہا تھا ــ اور کچھ دیر میں بالکل ہی ختم ہو گیا۔ اب وہاں چند رنجیدہ تڑپتے ہوئے چہروں کے سوا اور کچھ نہ تھا، جن کی خوشیاں چھین کر "استکبار" اپنی سالگرہ منا رہا تھا۔

ہاں "استکبار" اس وقت نیل کے کنارے اپنے خوبصورت اور عالی شان محل میں بیٹھا کنیزانِ حرم سے دل بہلا رہا تھا۔ اس کے اردگرد اونچے درباریوں نے گھیرا ڈال رکھا تھا جن میں درباری رقاصائیں تھرکتے ہوئے جسم کے ساتھ پھدک رہی تھی۔ اور استکبار اپنی چہیتی کنیزوں کے رنگین ہونٹوں سے لگا ہوا جام چھین چھین کر پی رہا تھا جس کے اندر سے ہر بار حسن کا "منحوس" چہرہ ابھرتا نظر آتا تھا اور وہ ہر بار اپنی کامیابی پر مسکرا اٹھتا تھا۔ کامیابی؟

حسن کی موت استکبار کی کامیابی تھی جیسے دنیا کا ہر ذلیل گروہ مردار کھا کر کامیاب ہو جاتا ہے، استکبار بھی کامیاب ہو گیا تھا۔ اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں، لیکن حسن اور اس کے اعزا و اقارب کے نزدیک یہ استکبار کی کامیابی نہیں بلکہ کھلی شکست تھی، اور استکبار کی اس شکست کی خبر گھر گھر محلہ محلہ اور محلہ سے پورے شہر میں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ پھیل چکی تھی۔ اور لوگ جوق در جوق اپنی میٹھی نیندوں کا طلسم پاش پاش کر کے اپنے محبوب لیڈر، اپنے عزیز رہبر اور اپنے پیارے مرشد کو آخری بار دیکھنے اور اسے الوداع کہنے کے لئے آ رہے تھے۔

استکبار کو محل میں منٹ منٹ کی خبر پہنچ رہی تھی۔ اگرچہ وہ جشن سالگرہ میں بے حد مصروف تھا لیکن اسے خطرہ تھا کہیں رنگ میں بھنگ نہ پڑ جائے۔ کہیں اس کے عیش کی محفل درہم برہم نہ ہو جائے۔ اس نے معاملہ کی نزاکت پر سنجیدگی سے غور کیا اور اپنے وفادار غلاموں، اپنے درباریوں سے مشورہ طلب کیا۔

"حضور ــ امن عامہ خطرہ میں ہے" ایک درباری نے خوشامدانہ لہجہ سے عرض کیا اور پھر تجویز کیا "لاش کو فوراً دفن کر دینا چاہئے" ــ گستاخی معاف اس سے تو اچھا ہوتا درباری حضرت کی منطق گراں گزری کہنا میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آخر لاش وہاں دی ہی کیوں گئی؟"

"مجرم کے متعلقین کو مجرم کی حالت زار دکھانے کے لئے۔" پولیس چیف نے فوراً جواب دیا۔

"فائدہ؟"

"تاکہ وہ اس بھیانک خاتمہ کو دیکھ لیں اور آئندہ اس قسم کی حرکتوں سے ڈرکیا نہ جائیں۔" پولیس چیف کو پھر بولنا پڑا۔

"اس کا دوسرا مقصد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انہیں روحانی اذیت پہنچے، جو جسمانی اذیت سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔" استکبار نے کہا "تم"۔ اس کا اشارہ پولیس چیف کی طرف تھا "جاؤ — لاش چھین کر دفن کروا دو — ابھی اور اسی وقت۔"

"مگر حضور — " ایک دوسرے درباری نے آہستہ سے گذارش کی "اسکے ہزاروں ساتھیوں کے متعلق آپ کا کیا حکم ہے؟ جو اس وقت اسکے گھر کے سامنے موجود ہیں مجھے ڈر ہے کہیں وہ اسکی لاش لیکر پبلک کو حضور کے خلاف نہ بھڑکائیں۔"

"انھیں گولی سے اڑا دینا چاہیئے۔" ایک جنرل نے تجویز پیش کی۔

"اس سے کیا ہوگا؟" پولیس چیف نے کہا "یہ ان کے جرم کے مقابلے میں بہت تھوڑی سزا ہے۔ انہیں مرنے سے قبل ہزار بار مارنا چاہیئے — "

"شاباش" استکبار نے تحسین آمیز نگاہوں سے پولیس چیف کو دیکھا اور پھر اپنا آخری حکم سنا دیا۔

"بدمعاشوں کو جیل میں ٹھونس دو اور — اس کے بعد تم جانتے ہی ہو، تمہیں کیا کرنا ہے۔"

پولیس چیف نے ادب سے سر جھکا دیا اور پھر شاہی حکم کی تعمیل کے لئے محل سے باہر نکل آیا۔ اور جب وہ حسن کے گھر پہنچا تو اس کی ماں دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے جواں مرگ بیٹے کی لاش کو تاک رہی تھی اور سوچ رہی تھی "میرا لاڈلا آج سے بیالیس سال قبل گوشت کا ایک لوتھڑا تھا جس کی انگوٹھوں پر میرا دل باغ باغ ہو رہا تھا۔ اور میرا شوہر اور میں اسے دیکھ کر مسرور رہا کرتے تھے جیسے کوئی عجیب شے ہمارے ہاں آگئی ہو۔ اس کا نام حسن رکھا گیا۔ پھر وہ بولنے لگا اور چلنے لگا۔ اور پھر وہ محمد دید (گاؤں) کے چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ کھیلنے لگا۔ اور کبھی کبھی باپ کے ساتھ مسجد بھی جانے لگا جہاں وہ بہت سے بچوں کو پڑھتے دیکھتا اور خود بھی پڑھنے کے لئے مچل جاتا۔ حسن مدرسے میں داخل کر دیا گیا جسکی ذہانت اور حافظے نے بہت جلد یہ منزل طے کر ڈالی۔ حسن کی مسیں ابھیگ رہی تھیں حسن جوان ہو رہا تھا حسن جوان ہو گیا اور اب وہ میری آنکھوں سے دور یونیورسٹی میں — " اچانک اس کے خیالات کا دھارا بہتے بہتے رک گیا اسکی بیالیس برس کی کمائی چھین لی گئی۔ وہ بلبلا اٹھی اور اسکی خشک آنکھوں سے پھر ایک بار آنسوؤں کا سوتا جاری ہو گیا۔

اور حسن کی بیوی اور بچے بلک اٹھے اور ماؤں نے جھپٹ کر لاش کو چھین لینا چاہا۔ مگر پولیس کے ظالم ہاتھوں نے انہیں لاش تک نہ پہنچنے دیا۔

لاش دفن کر دی گئی اور قبر کے گرد پولیس کا ایک مضبوط حصار قائم کر دیا گیا۔ گویا مرنے کے بعد حسن کو قید میں رکھنا اشد ضروری تھا۔

اور صبح ہوتے ہوتے ہزاروں آدم کے بیٹے جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیئے گئے جن کا صرف اتنا ہی "جرم" تھا کہ وہ حسن کی لاش کے ساتھ آئے تھے اور اسکی قبر پر فاتحہ پڑھی تھی۔

—— (۲) ——

اور دوسرے دن ایک سرکاری "کمیونک" جاری ہوا جس میں حسن کے اچانک قتل پر اظہار افسوس کیا گیا تھا اور ساتھ ہی اسکے ساتھیوں کی "دہشت انگیزی" اور "تخریبی کارروائیوں" کا ذکر بھی کیا گیا تھا جسکی بنا پر انہیں کچھ دنوں کے لئے "امن عامہ کے تحفظ کی خاطر" آزادیٔ نقل و حرکت سے محروم کر دیا گیا تھا۔

اور سرکاری و نیم سرکاری اخباروں نے اس پر سو فیصدی ایمان لاکر جی کھول کر تبصرہ کیا اور حسن اور اس کے ساتھیوں کو نہ صرف غدار ٹھہرایا بلکہ ان سب کو بھیانک ترین سزائیں دینے کا مطالبہ کیا۔

لیکن کیا حسن واقعی غدار تھا؟ کیا وہ واقعی "مجرم" تھا؟ کیا اسکے ساتھی واقعی "دہشت انگیز" تھے؟ کیا وہ سب واقعی "تخریبی کارروائیاں" کر رہے تھے؟ ان کے متعلق کسی نے چھان بین کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کی، جو اسکی ضرورت محسوس کرنے والے تھے، وہ جیل میں پڑے تھے اور جیل سے باہر [illegible]

وہ ڈاکر منہ میں گنگھنیاں ڈالے ہوئے تھے اور جنہوں نے ایسی جسارت دکھانے کا ذرا سا بھی خیال کیا ان کی زبانیں کاٹ کر پھینک دی گئیں۔

انسانیت اپنے محسنوں کے ساتھ ہمیشہ سے یہی سلوک کرتی آئی ہے، یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔

حسن ہستکبار کی نگاہوں میں "مجرم" تھا، اس کے غلاموں کی نظروں میں "مفسد" تھا، "شرپسند" تھا، "غدار" تھا ___ مگر وہ یہ سب نہیں بھی تھا۔ ہاں نہیں تھا۔

اسکی زندگی ایک مصلحانہ زندگی تھی، اسکی زندگی ایک مومنانہ زندگی تھی، اسکی زندگی تلخ بھی تھی اور شیریں بھی، اسکی زندگی سرد بھی تھی اور گرم بھی

اس نے زندگی میں نشیب بھی دیکھا تھا اور فراز بھی، اس نے زندگی میں ٹیڑھ بھی دیکھا اور سیدھ بھی۔ در اصل وہ بے شمار موڑوں سے گذرا تھا۔

اور اسکی زندگی میں سب سے زیادہ اہم موڑ اس وقت آیا جب وہ قاہرہ یونیورسٹی میں پڑھ رہا تھا، وہ اپنی یونیورسٹی کا سب سے زیادہ تیز اور ہونہار طالب علم تھا، یہی نہیں بلکہ وہ ایک بہترین گھوڑ سوار بھی تھا اور تیرنے اور شوٹنگ میں بھی کافی مہارت رکھتا تھا۔ لیکن ان سب سے زیادہ وہ ایک جوشیلی طبیعت کا مالک تھا اور ایک "صالح انقلاب" کا خواہاں تھا۔ اسکی یہ خواہش کسی فوری جذبہ کے تحت نہ تھی بلکہ یہ اس وقت ابھری تھی جبکہ اس کے خیالات وسیع مطالعہ سے پختہ ہو چکے تھے، جسکی شہادت کے لئے اس کا وہ لکھا موجود تھا جس میں مختلف موضوع پر درجنوں کتابیں بکھری ہوئی تھیں۔ اسکے دل میں بے پناہ امنگیں اٹھ رہی تھیں اور ان نیک امنگوں نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ شیخ یوسف سے ملے جو ان دنوں سب سے بڑے عالم اور مفکر سمجھے جاتے تھے، اور ان کی سرپرستی اور رہنمائی میں کچھ کام کرے۔

"آہ میرے بچے! ___ کوئی امید نہیں" شیخ یوسف نے حسن کے تمام سوالوں کا ایک ہی جواب دیا، جس نے اسے بھونچکا کر دیا۔ حسن سوچنے لگا یہ ہے وہ شخص جس نے فلسفۂ اسلام پر ایک کتاب لکھ ماری ہے جس کی وجہ سے آج دنیا اس کا لوہا مانتی ہے۔ اور وہ کہہ رہا ہے۔ اپنی زبان سے کہہ رہا ہے کوئی امید نہیں ___ صالح انقلاب کی اب کوئی امید نہیں ___"

"لیکن کیوں ___ کیوں امید نہیں؟" حسن نے بے چینی سے دریافت کیا۔

"بیٹے ہم بوڑھے ہو چکے ہیں نا" شیخ نے ایسے لہجہ میں کہا جس میں درد تھا اور یاس۔

"بیکار کوشش مت کرو" شیخ نے حسن کو آخری مشورہ دیا۔ وہ گھر لوٹ آیا۔ اس کا دل بے حد اداس تھا۔ وہ اس مشورہ کو ماننے کے لئے ہرگز تیار نہ تھا اور عید کے دن وہ پھر ملا اور اس نے اپنا سوال شیخ کے سامنے پھر دہرایا، جس نے شیخ کو حیرت میں ڈال دیا۔ وہی الفاظ، وہی انداز، سب کچھ وہی تھا۔ شیخ نے اسے پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "یہ صرف جوانی کا جوش ہے۔" اور اس کے ہاتھ پر عید کی مٹھائیاں رکھ دیں، جنہیں اس نے زور سے الگ رکھ دیا اور چیخا۔ "آپ جیسے لوگوں کی ایمانی کمزوری نے قوم کو تباہ کر دیا۔ برباد کر دیا۔ میں کہتا ہوں، اگر آپ سچے مومن ہیں تو اس صورت میں تسلیم کیجیے کہ مایوسی کفر ہے ___ لیکن ___ لیکن اگر یہ نہیں، تو پھر کہہ دیجیئے کہ آپ مومن نہیں ___ اور آپ اسلام کی ذمہ داریاں نہیں اٹھا سکتے۔"

شیخ کے آنسو نکل پڑے۔ بوڑھا شیخ رو رہا تھا ___ اور حسن جوش سے کانپ رہا تھا۔

"میں کیا کروں ___ بیٹے! میں کیا کر سکتا ہوں؟" شیخ کے منہ سے بمشکل یہ الفاظ نکلے۔

"آپ ان لوگوں کو یکجا کر سکتے ہیں جو اپنے دل میں اسلام کا درد رکھتے ہیں۔ آپ انہیں مل کر بیٹھنے اور بیٹھ کر سوچنے پر مجبور کر سکتے ہیں" حسن نے [illegible] کی کہ ایسے لوگوں کے نام مجھے ابھی بتائیے۔ میں انہیں بلانے کی کوشش کروں گا۔"

اور پھر فوراً دعوت نامے بھیج دیئے گئے، جسکے نتیجہ میں "شبان المسلمین" وجود میں آئی۔ حسن اس کا روح رواں تھا۔

اس تحریک سے قوم پرست طبقہ خائف تھا۔ اسے جانے کیوں یہ وہم ہو گیا تھا کہ شبان ___ ان کے سیاسی جتھے کے لئے زہر قاتل ہے۔ [illegible] اس کا بائیکاٹ کیا۔ اس کے خلاف مظاہرے کئے اور اسکے دفتر پر پتھراؤ کیا۔ حسن کے لئے یہ اپنی قسم کا پہلا تجربہ تھا جس سے [illegible]

اور سمجھا:

لیکن ابھی وہ پوری طرح آزاد نہ تھا ۔۔۔ سے اپنے اوقات کا بیشتر حصہ تعلیم کے لئے وقف کرنا پڑتا تھا۔

بی۔ اے کے امتحان کا جب نتیجہ نکلا تو وہ ہر مضمون میں اول تھا جیسے کہ وہ ابتدا سے اول آتا رہا تھا اور اس بار تو اس نے یونیورسٹی کا ریکارڈ توڑ دیا تھا (جو آج تک قائم ہے) مگر وہ "اعلیٰ تعلیم" کے لئے منتخب نہ ہوسکا۔ اس کے لئے "پاشائیت" کی ڈگری درکار تھی جو صرف چند مخصوص لڑکوں کے نصیب میں آتی تھی ۔۔۔ یہاں کی تمنا سے کبھی نہ نکلی۔ وہ صرف ایک ہی آرزو رکھتا تھا اور وہ اسے "شبان" کی شکل میں پوری ہوتی نظر آ رہی تھی۔

مگر کچھ دنوں بعد اسے یکبارگی ایسا محسوس ہوا جیسے اسکی آرزو کبھی بر نہ آئے گی جب تک کہ یہ طریق کار نہ بدلے گا۔ اس کے ذہن میں یہ خیال زور باندھ رہا تھا کہ نئی پود کی اصلاح و تربیت کے بغیر کوئی انقلاب نہیں لایا جاسکتا۔ اور اس نے اپنے ان خیالات کو عملی جامہ اس وقت پہنایا جب وہ اسمٰعیلیہ میں ایک مدرس کی حیثیت سے داخل ہوا۔ اس کی نئی تحریک "اخوان المسلمین" تھی جو "شبان المسلمین" سے بہت حد تک مختلف تھی۔

اسمٰعیلیہ کے چھوٹے سے کافی ہاؤس میں کافی بھیڑ تھی کہ اچانک وہ آیا ۔۔۔ ایک اجنبی جسے کوئی نہ جانتا تھا۔ اس نے دیکھا۔ بڑی میز کے گرد خوب گپ ہو رہی تھی۔ وہ کچھ سوچنے لگا اور سوچ کر اس چولہے کے قریب پہنچا جہاں "کافی" گرم ہو رہی تھی۔ اور پھر دفعتاً ایک انگارہ اٹھا کر اس نے لوگوں کے درمیان پھینک دیا۔ سب ڈر کر اسکے چہرے کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھنے لگے۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ "کہیئے ۔۔۔ دوزخ کی آگ کے متعلق کیا خیال ہے؟"

اور اس چھوٹے سے حادثہ نے بہتوں کو متاثر کیا اور اس کی طرف متوجہ کر دیا۔

(۳)

حسن کی تحریک ۔ "اخوان" ۔۔۔ رفتہ رفتہ اسمٰعیلیہ میں پھیلنے لگی ۔۔۔ اور اسکی آواز پر سب سے پہلے جس طبقہ نے لبیک کہا وہ مزدوروں کا طبقہ تھا۔ اسماعیلیہ کے لوگوں نے چھ مزدوروں کو جو "اخوان" بننے سے قبل صرف حجامت بنایا کرتے تھے یا ٹوٹی پھوٹی میز کرسیاں درست کرتے پھرتے تھے یا اسی قسم کے اور چھوٹے موٹے کام کیا کرتے تھے۔ یکبارگی حیرت انگیز خطیب و مقرر بنا ہوا دیکھا، جو ایک ایک مسجد میں جا جا کر اپنی دعوت پیش کرتے تھے اور ان کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ اسمٰعیلیہ میں تحریک زور پکڑ گئی اور حسن کو اپنے خوابوں کی تعبیر سامنے نظر آنے لگی۔ اب اس نے اپنے مشن کو آگے بڑھانے کے لئے لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے علیحدہ اسکول تعمیر کروائے تاکہ وہ انہیں صحیح طرز پر تعلیم دے کر صحیح اسلامی سانچے میں ڈھالے۔

لیکن جیسا کہ ہر ملک اور ہر زمانے میں ہوتا آیا ہے یہ تحریک ان لوگوں کی آنکھوں میں کھٹکنے لگی جنہیں اسلام ۔۔۔ اصل اور صحیح اسلام سے بیر تھا۔

"حسن ہمارے بچوں کو خراب کر رہا ہے"۔

"حسن چاہتا ہے کہ ہمارے بچے تیرہ صدی پرانے نظام کو اپنائیں"۔

"حسن رجعت پسند ہے اور قدامت پرست۔ وہ خدا اور رسولؐ کے نام پر ملاازم کا پرچار کر رہا ہے"۔

"حسن ملک میں انتشار پھیلا رہا ہے ۔۔۔ اسکی تجویز ہے کہ ہماری قوم "مسلم" اور "غیر مسلم" میں بٹ جائے"۔

"حسن مسلم عربوں کو اپنا ہیرو مانتا ہے اور اپنے فرعونوں کو ظالم کہتا ہے"۔

"حسن مغربی تہذیب کو اسکی اچھائیوں اور برائیوں سمیت اختیار کرنے کا حامی نہیں"۔

اور یہ شکایات حکام بالا کو لکھ کر بھیج دی گئیں۔

اور ٹھیک اسی وقت انگریزی سفارت خانہ میں ایک ہلچل مچی ہوئی تھی۔

"کرنل سائمن کی رپورٹ" زیر بحث تھی۔

"ہماری فوجیں خطرہ میں ہیں" سکرٹری نے سفیر سے کہا "حسن کی حرکات ایک بہت بڑے خطرے کی گھنٹیاں ہیں"۔

"All Balls" سفیر نے اپنے مخصوص انگریزی لہجہ میں کہا "اس کی تبلیغی دوڑ دھوپ سے ہماری فوجوں کو کیا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے؟ — کرنل سائمن تو احمق ہے۔"

"حسن ہماری فوجوں کو ملک سے نکالنا چاہتا ہے — وہ ہمارے تسلط کا سخت دشمن ہے۔"

"لیکن وہ حکومت تو نہیں؟"

"جناب — وہ ایک انقلابی تحریک کا لیڈر ہے، جو دن بدن زور پکڑ رہی ہے۔ وہ حکومت پر اثر ڈالنے کے قابل بن جائے گا — کچھ دنوں میں۔"

" سفیر سوچنے لگا اور سوچ کر بولا ایک پروٹسٹ لیٹر Protest letter، کافی ہوگا؟"

"O.K.—Sir!"

اور پھر حسن کا اسماعیلیہ سے تبادلہ ہوگیا — دارالسلطنت کی طرف۔

(۴)

دارالسلطنت میں حسن کو کام کا بہت اچھا موقع ملا۔ اس نے یونیورسٹی کے نوجوان طلبا کو متاثر کیا اور ان میں سے بہتوں کو اپنا شریک کار بنالیا، جو مناسب تربیت کے بعد اس قابل ہو گئے کہ آزادانہ طور پر کام کر سکیں۔ شہر کی مسموم فضا کی بجائے حسن نے انہیں گاؤں کی طرف بھیجا، جہاں ان کی آواز سننے کے لئے لوگ زیادہ آمادہ تھے۔

حسن سال کا بیشتر حصہ کیپٹل سے باہر گذارتا۔ ایک سادہ سی قمیص، ایک معمولی سی عبا پہنے ہوئے اور ایک چھوٹا سا بیگ ہاتھ میں لئے ہوئے وہ ملک کے کونے کونے کا چکر لگاتا — اور نہایت سرعت کے ساتھ، اور اکثر راتیں ان لوگوں کے ساتھ بسر کرتا، جو اسکے قریب آتے۔ اس طرح ان میں ایک نئی اور تازہ روح پھونک دیتا جو پہلے کبھی نہ دیکھی گئی تھی۔

جب وہ لوگوں سے باتیں کرتا تو ان میں سے ہر ایک یوں محسوس کرتا جیسے وہ خاص طور پر اسی کی طرف متوجہ ہے اور صرف اسی کی شخصیت میں دلچسپی رکھتا ہے۔

وہ جہاں بھی جاتا اپنی تقریروں سے سینوں میں اک آگ سی لگا دیتا اور پھر جدید طریقہ پر تیار کئے ہوئے پمفلٹ تقسیم کرتا جو مختصر، جامع اور نہایت ہی پُراثر ہوتے۔

ان سب کا مجموعی اثر یہ ہوا کہ ملک میں اخوان کی دو ہزار شاخیں کھل گئیں، جن سے لاکھوں آدمی وابستہ تھے۔ طلبا اور پروفیسروں کی ایک بہت بڑی تعداد نے تحریک کا ساتھ دیا اور قاہرہ اس کا مرکز بن گیا۔

حسن نے اس بڑی تحریک کو نہایت عمدگی سے آرگنائز کیا اور اسکے چلانے کے لئے انتہائی جد و جہد کی۔ وہ صرف تین گھنٹے سوتا تھا — دن رات میں تین گھنٹے۔ لیکن اسکے باوجود وہ کبھی تھکتا نہ تھا۔ وہ ہمیشہ ترو تازہ معلوم ہوتا تھا۔

اس کے پاس اب روزانہ سینکڑوں خط آنے لگے تھے جن میں بیشتر اخوان اپنی ذاتی معاملات کے متعلق ہدایات و مشورے طلب کرتے تھے۔ ان خطوں سے اس کا سکرٹری تنگ آجاتا تھا اور انہیں پڑھے بغیر اسکے حوالے کر دیتا تھا۔ مگر حسن ان سارے خطوں کو خود سے پڑھتا اور پھر اپنے ہاتھ سے جواب لکھتا۔

حسن نے یادداشت بھی غیر معمولی پائی تھی۔ اسے تقریباً بیس ہزار منتخب اشعار یاد تھے اور نہ صرف اشعار بلکہ اسے اپنے تمام اخوان کے نام بھی یاد تھے جن کی تعداد کئی لاکھ تھی۔ وہ جسے ایک بار دیکھ لیتا تھا پھر کبھی نہ بھولتا تھا — عبدالمجید، اس کا ایک ساتھی، ایک گاؤں کی میٹنگ میں دیر کرکے پہنچا جس کی وجہ اس نے اپنی بیوی کی علالت بتائی۔ لیکن تین سال بعد جب حسن اس سے دوبارہ ملا تو اس نے سب سے پہلے جو بات پوچھی وہ یہ تھی "تمہاری

یہودیا کیسی ہے؟
لیکن اس حافظہ کے باوجود وہ آدھی رات کے بعد مطالعہ کرنا ضروری سمجھتا تھا۔ وہ کہیں بھی ہو، اس کا مطالعہ جاری رہتا تھا۔ وہ قرآن کا بہت ہی گہرا علم رکھتا تھا بعض اوقات اسے بغیر تیاری کے تقریر کرنی پڑتی تھی جس میں وہ اکثر قرآن کی آیتیں موضوع کی مناسبت سے استعمال کرتا تھا جو اسکے دلائل کو مضبوط بنا دیتی تھیں اور کسی کو کبھی نکتہ چینی کا موقع نہ ملتا تھا۔
ان سب باتوں نے مل کر اسے بہت جلد ہر دلعزیز بنا دیا لیکن حسن نے اپنی ہر دلعزیزی کا کبھی ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا۔ وہ ہمیشہ پُرامن انقلاب کا قائل رہا اور باوجودیکہ اسے دو مرتبہ انگریزوں کی مداخلت پر الیکشن میں حصہ لینے سے باز رکھا گیا، اس نے اسلامی طریق کار کے مقابلہ میں کسی قسم کی تشدد آمیز روش نہیں اختیار کی اور نہ کبھی کسی کو اس کا مشورہ دیا۔
البتہ اسرائیل کی چیرہ دستیوں نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ جہاد کی تیاری کرے، جس کا موقع بہت جلد آ کھڑا ہوا۔

——— (۵) ———

فلسطین ـــ فلسطین ـــ فلسطین۔
یکایک جنگ کے شعلے بھڑک اٹھے ـــ دو ہزار سال "پرانے بھگوڑے" ـــ مغضوب بنی اسرائیل برطانیہ اور امریکہ کی امداد سے "آدھے فلسطین کے مالک بن بیٹھے دنیا کی ایک ذلیل ترین قوم، جو غریبوں کا خون چوس چوس کر موٹی ہو رہی تھی، جس کا کوئی وطن نہ تھا اور جو بالکل منتشر تھی، اچانک تخت حکومت پر براجمان ہو گئی اور عرب ـــ فلسطین کے اصل باشندے قتل ہونے لگے۔ لٹنے جلنے لگے اور گھر بار چھوڑ کر بھاگنے لگے۔
فلسطین ایک نیا بھارت بن گیا۔ فلسطین ایک نیا اسپین ہو گیا۔ فلسطین میں ایک کشمیر برپا ہو گیا۔ اور عالم اسلام میں ایک تہلکہ مچ گیا اور عرب ممالک نے اپنے مظلوم بھائیوں کی حمایت میں اعلان جنگ کر دیا۔
لیکن دنیا کے سب سے بڑے "مظلوموں کے حامی"۔ دنیا کے سب سے بڑے "غریبوں کے والی" ـــ اسٹالن کی روسی (روسیاہ) حکومت نے سب سے پہلے ـــ برطانیہ اور امریکہ سے بھی پہلے، جو اسرائیل حکومت کے ماں باپ تھے ـــ اسرائیلی اسٹیٹ کو سرکاری طور پر تسلیم کر کے اپنے بے لاگ "عدل و انصاف" کا ڈنکا بجا دیا۔ "بورژوا" کے سب سے بڑے دشمن نے سب سے زیادہ "بورژوا قوم" کی حمایت میں سب سے پہلے قدم اٹھایا ـــ شاید یہ اسلئے ہو کہ "اشتراکی خداوند" ـــ مارکس بھی یہودی نسل سے تھا۔ شاید یہ اسلئے ہو کہ اشتراکی ڈکٹیٹر دنیا کا سب سے بڑا بورژوا ہوتا ہے۔
ہاں فلسطین کی پاک سرزمین پر خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی اور بیت المقدس کی جبیں خون سے سرخ ہو رہی تھی۔ اس وقت عرب فوجیں اسرائیل کی طرف بڑھیں۔ لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ ان سے پہلے ہی وہاں ـــ سرحد پر ـــ ہزاروں مجاہد موجود تھے۔ یہ اخوان تھے۔ جو اپنی ٹوٹی پھوٹی تلواریں، رائفلیں، بندوقیں اور دیگر ساز و سامان لئے آنے والی فوجوں کی راہیں ہموار کرنے میں مشغول تھے۔
ٹاپ۔ ٹپ۔ ٹپ۔ ٹپ۔ ٹاپ۔
دھائیں ـــ دھڑڑڑ ـــ دھڑڑ ـــ دھڑ ـــ دھک۔
اخوان کی بوٹیاں جسموں سے اڑ اڑ کر آسمانوں کی طرف جا رہی تھیں۔ اخوان کی ہڈیاں ٹوٹ ٹوٹ کر۔ چیخ چیخ کر نثار ہو رہی تھیں۔ اخوان کے اعضاء کٹ کٹ کر، اچھل اچھل کر قربان ہو رہے تھے ـــ اور راستہ ہموار ہو رہا تھا۔ عرب فوجیں ان کی بنائی ہوئی سڑکوں پر بے دھڑک بڑھ رہی تھیں۔
مگر جنرل صادق اپنے ہیڈ کوارٹر میں پریشان بیٹھا تھا۔
"ہمارے پاس اب لڑنے کو ہتھیار نہیں رہا؟" جنرل نے غصے سے میز پر ہاتھ پٹکتے ہوئے کہا۔ کیوں نہیں ـــ اس کا منتظم ایک کہیں نہیں ہے؟" وہ اپنے ماتحت پر بگڑ رہا تھا۔ "کیا کبھی کوئی لڑائی ہتھیاروں کے بغیر بھی سر ہوئی ہے؟"

"ابھی تک Fresh Supplies نہیں آئیں" چیف آف اسٹاف نے کہا۔ "جو کچھ تھا اب ختم ہوگیا۔"

"لیکن اس کا حل؟" جنرل نے چیخ کر کہا۔ اسے فوری فیصلہ کرنا تھا اور غصہ میں فیصلہ ناممکن تھا ——

"اخوان ——" چیف نے کہا۔

"کیا؟" جنرل نے بات کاٹ کر پوچھا۔

"اخوان سے ہتھیار مل سکتے ہے"

"لیکن ان کے پاس اتنا زیادہ ہتھیار کہاں سے آیا؟ —— پھر ان کے ہتھیار اس quality کے نہیں جیسے ہمیں درکار ہیں۔"

"انھوں نے یہودی علاقوں پر بہت پہلے ہی چھاپہ مار کر کافی ہتھیار جمع کر رکھا ہے —— کوالٹی کا اس وقت سوال نہیں بلکہ فوج کو active رکھنے کا سوال ہے۔"

"بہت خوب" جنرل خوشی سے اچھل پڑا "ہمیں ان کی شجاعت اور ہمت کا قائل ہونا پڑے گا۔ غالباً تم نے ان کے بارے میں گورنمنٹ کو مطلع کر دیا ہوگا؟ —— مجھے ان جانبازوں کو ہراول دستہ کی خدمت انجام دیتے دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی ہے۔ اس جنگ کے ہیرو یہی ہیں —— تم ان سے فوراً ہتھیار لے لو —— جو کچھ مل سکے اور جیسا کچھ ملے۔"

اور جنرل صادق ٹیلیفون پر سپلائی ڈپو کو ڈانٹنے لگا جن کے پاس ہتھیاروں کا اسٹاک ختم ہو چکا تھا۔

اور ادھر قصر استکبار میں وزارتی درجہ (Ministerial level) ایک بحث چھڑی ہوئی تھی۔ مجلس کے سامنے انگریزی سفیر کا ایک دھمکی آمیز خط پڑا ہوا تھا۔

"اخوان کو توڑ دو —— اخوان کو بین (Ban) کر دو" انگریزی سفیر کا مشورہ تھا کیونکہ اسے ان سے سخت خطرہ تھا۔ برٹش مفادات خطرے میں تھے۔

آخر بڑے وزیر نے کہا۔ "اسرائیلی فرنٹ سے اطلاع آئی ہے کہ اخوان نہایت دلیری سے ہماری فوجوں کے آگے آگے دشمن سے لڑ رہے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ انھوں نے کس جگہ اتنی عمدہ فوجی تربیت حاصل کی اور یہ ہزاروں والنٹیر کہاں ٹرین (trained) ہوئے اور کس نے انھیں یہ ٹریننگ دی۔ پھر سوچنے کی بات یہ ہے کہ وہ اس فوجی طاقت کو واپس آکر کیسے استعمال کریں گے —— میری رائے میں اخوان ایک خطرناک جماعت ہے اس وقت کچل دینا ترین مصلحت ہے۔ یہ ایک دانشمندانہ اقدام ہوگا۔"

ایک چھوٹے وزیر نے کہا "بے شک یہ اقدام ہمارے پولیٹیکل کیریئر کو محفوظ کر دے گا —— الیکشن نزدیک ہے —— میں اس کی دل سے تائید کرتا ہوں۔"

اور استکبار نے حکم دیا۔ "اخوان کو توڑ دو۔"

(۶)

فلسطین کی جنگ یکایک بند ہوگئی۔

"نیشنلزم" نے اسلام پر غلبہ پالیا۔ عربوں میں پھوٹ پڑگئی اور اسرائیل نے انکو شکست دیدی۔

اخوان —— رنج و غم میں ڈوبے ہوئے اخوان گھر واپس آ گئے۔ مگر اب وہ ایک ایسے گروہ بنے جن کی اجتماعیت قانون نے نوچ لی تھی جن کی آواز قانون نے سلب کر لی تھی۔ جن کی املاک قانون نے ضبط کر لی تھیں۔

لیکن اخوان کا زور اب پہلے سے زیادہ ہوگیا۔ وہ عوامی توجہ کے پہلے سے زیادہ مستحق ہو گئے —— اور ملک میں اخوان کا سیلاب امڈ پڑا۔

حسن عوام کا اب سب سے زیادہ محبوب لیڈر تھا اور اسکی ہیبت سے ایوانوں اور محلوں میں زلزلہ سا پیدا ہوگیا تھا۔

"استکبار کے لئے یہ صورت ناقابل برداشت ہوگئی۔ اس کے سوا کوئی شخص عوام کا محبوب نہیں ہو سکتا تھا۔ عوام کا لیڈر کوئی نہیں بن سکتا تھا۔ یہ قدیم شا

روایات کے خلاف تھا بلکہ اس سے کھلی ہوئی بغاوت تھی۔ اور اس نے انتہائی غصہ کی حالت میں اس بغاوت کا سر کچل کر رکھ دینے کا عہد کیا۔

وہ دن استکبار نے نہایت بے چینی سے کاٹا۔ اسے ہر جگہ حسن کا مکروہ چہرہ نظر آتا تھا۔ لیکن رات ہوتے ہی اسے سکون ہو گیا۔ اسکے چہرہ پر مسکراہٹ کھیلنے لگی یہ ایسی مسکراہٹ جو ذبح سے قبل قصاب کے چہرہ پر ہوتی ہے۔

ہاں اسی رات علی پاشا نے، جو استکبار کے وزیروں میں سے تھا، حسن کو فون پر شبان المسلمین کے دفتر میں ملنے کی دعوت دی، جہاں وہ اخوان کے بارے میں ایک خوشخبری سنانا چاہتا تھا جسے ابھی تک صیغۂ راز میں رکھا گیا تھا۔

”خوشخبری؟ — اخوان کے بارے میں؟ —— ہماری عزیز جماعت کے متعلق؟ اس وقت؟ —— اچھا —— ہاں ہاں —— میں ضرور آؤں گا بلکہ آ رہا ہوں“ اور حسن ریسیور ہاتھ سے رکھ کر ”شبان“ کے دفتر روانہ ہو گیا۔ اس کے ساتھ اس کا ایک عزیز رشتہ دار بھی تھا۔

حسن نے دفتر میں کافی دیر تک انتظار کیا مگر علی پاشا نہیں آیا۔ اب وہاں بیٹھنا بے سود تھا۔ اس لئے اس نے گھر لوٹنے کے لئے ٹیکسی منگوائی، جو قریب ہی موجود تھی اور اس کے سوا وہاں کوئی دوسری ٹیکسی بھی نہیں۔

رات کے آٹھ بج رہے تھے اور اس وقت عموماً چہل پہل رہا کرتی تھی۔ مگر کسی خاص وجہ سے اس رات سڑک پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کرفیو نافذ کر دیا گیا ہو۔ جب حسن دفتر ”شبان“ کی سیڑھیوں سے نیچے اترا تو سڑک پر مکمل ”بلیک آؤٹ“ تھا۔ بالکل اندھیرا گھپ۔ اسے حیرت ہوئی کہ یہ سب اتنی جلدی کیسے ہو گیا۔ وہ جس وقت آیا تھا ہر چیز اپنی عام حالت میں تھی۔ لیکن اب کیا ہو گا۔ کیوں ہو گیا؟ —— یہ اسکی سمجھ سے بالا تھا۔

وہ خاموشی سے ٹیکسی پر سوار ہو گیا اور اس کے پاس ہی اس کا ساتھی بھی بیٹھ گیا۔

ٹیکسی اسٹارٹ ہوئی۔ چلی اور پھر کچھ فاصلہ پر جا کر رک گئی۔

”کیوں — کیا بات ہے؟“ حسن نے ڈرائیور سے پوچھا۔

”ٹیکسی خراب ہو گئی صاحب“ جواب ملا۔

اور عین اسی وقت ایک سیاہ سرکاری کار ٹیکسی کے قریب آکر ٹھہری۔ اس میں سے ایک لمبا تڑنگا شیطان نما انسان نکلا جسکے ہاتھ میں ایک بھرا ہوا پسٹل تھا۔ ریوالونگ پسٹل۔ وہ تیزی سے ٹیکسی کے دروازہ کے سامنے آکے کھڑا ہو گیا اور ایک لفظ کہے بنا فائرنگ شروع کر دی۔

ٹھائیں —— ٹھائیں —— ٹھک

حسن زخمی ہو گیا۔ اور اس کا رفیق فوراً شہید ہو گیا۔ اور قاتل سرکاری کار پر فرار ہو گیا۔ مگر ٹیکسی ڈرائیور پر کوئی آنچ نہ آئی۔

حسن ٹیکسی سے نکل کر واپس دفتر شبان آیا اور فوراً ٹیلیفون پر ”فرسٹ ایڈ“ مانگی۔ مگر کوئی جواب نہ ملا۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کیا کرے کہ ٹیکسی واپس آگئی اب وہ ”خراب“ نہیں تھی۔ وہ ٹیکسی میں دوبارہ بیٹھ گیا۔

”مجھے فرسٹ ایڈ چاہیئے —— لے چلو“ اس نے ڈرائیور سے کہا۔ ٹیکسی چل پڑی۔

لیکن فرسٹ ایڈ والوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور کہا ”اسپتال جاؤ۔ وہیں تمہیں ایڈ ملے گی۔“

اس نے ڈرائیور کو اشارہ کیا اور ٹیکسی سرکاری اسپتال کی طرف روانہ ہوئی۔ اس کے جسم سے کافی خون بہہ چکا تھا اور اب بھی بہہ رہا تھا۔ پر سرکاری اسپتال میں کوئی پرسانِ حال نہ تھا۔ وہ ٹیکسی سے اتر کر ڈاکٹر کے انتظار میں بیٹھ گیا جن کی وہاں ”کمی“ نہ تھی۔ خون اس کے جسم سے نکل نکل کر فرش پر گر رہا تھا اور وہ آہستہ آہستہ حواس کھو رہا تھا۔

اس کے پہنچتے ہی اسپتال کے پانچ ڈاکٹر —— جو اخوان تھے —— فوراً گرفتار کر لئے گئے، اور اسپتال کے گرد پولیس کا سخت پہرہ ہو گیا۔

یکایک اسکی آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھانے لگا۔ اس کا دماغ چکرانے لگا اور اس کا حلق خشک ہونے لگا۔

"ڈاکٹر —" اس نے آہستہ سے پکارا۔ اور اسے محسوس ہوا جیسے کوئی آرہا ہو۔ جیسے کوئی چل رہا ہو — اور پھر آخری بار اسے اپنے سینے کے قریب ایک سخت دھماکہ سا محسوس ہوا اور پھر ایک انتہا درجہ کا درد و کرب — جس کے بعد وہ فوراً بے ہوش ہو گیا۔

ایک — دو — تین — چار گھنٹے بعد ڈاکٹر آیا — مگر اس وقت جب وہ جا چکا تھا جب وہ اس دُنیا سے کوچ کر چکا تھا۔

اس کی لاش نہایت بے رحمی سے "پوسٹ مارٹم" کی گئی، چیری گئی، پھاڑی گئی اور پھر کھردرے کمبلوں میں لپیٹ کر پولیس کے حوالے کر دی گئی۔

"یہ لو — اپنے مجرم باپ کی لاش" پولیس نے اچانک اس کے گھر میں داخل ہو کر اس کی بیٹی سے کہا اور لاش فرش پر پٹک دی۔ وفا نے حیرت سے انہیں دیکھا اور پھر رو کر بولی "خوش آمدید ابا — میرے شہید باپ۔ آج تمہیں ابدی راحت میسر ہوئی۔" اور پھر وہ یک بیک چیخ پڑی "ظالمو۔ استکبار سے کہہ دو، تم نے صرف ایک حسن مارا ہے، ابھی ہزاروں حسن زندہ ہیں۔"

گر اک چراغِ حقیقت کو گل کیا تم نے
تو موجِ دود سے صد آفتاب ابھریں گے

(حلقہ ادب اسلامی کراچی میں پڑھا گیا)

بہار کا پیغام

راشد الخیری ارشد

کیسے پھولے پھلے بھلا گلشن — باغباں نے بدل دیئے "احکام"!
کیسی آزادی ہم نے پائی ہے — جسم آزاد اور ذہن غلام!
کشتیٔ زیست کا خدا حافظ — ناخدا محوِ لذتِ آرام!
ہو گا پیدا کوئی پھر "ابراہیم" — پوجے جاتے ہیں یاں "نئے اصنام"!
ایک دنیا ہے منتظر جس کی — نہیں نکلا ابھی وہ "ماہِ تمام"
جم کے رہ بھی سکا کبھی طاغوت — ہو مقابل میں اس کے جب اسلام؟
نئے حالات کا تقاضا ہے — کہ بدل جائیں اب پرانے امام!
چند غنچوں سے غنچگی لے کر — دے چمن کو بہار کا پیغام!

اب کے آئے گا انقلاب ایسا
لائے گا جو نئی ہی صبح و شام*

* مراد صبحِ اسلام ہے۔

بزمِ معاصرین

چند اشعار ——— فاران کراچی (جولائی ۵۱ء)

فاران کا معیارِ شعر کبھی پست نہیں ہوتا کیونکہ تاندہ ماہر کے ہاتھ میں ہے۔ تازہ شمارے کا بہرۂ منظومات بھی اپنی موجوں کے دامن میں بیش بہا موتی لئے ہوئے ہے۔

عاصی کرنالی کی غزل "رنگ و نشتر" کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ پوری غزل جاندار ہے خصوصاً یہ شعر تو اٹھا کر گوشۂ قلب میں رکھ لینے کے قابل ہیں:-

روحِ منظر نہ بنے، جانِ بہاراں نہ بنے ۔۔۔ لوگ کانٹوں سے گذر کر بھی گلستاں نہ بنے
ہوئے پورے نہ بہاروں کے تقاضے ہم سے ۔۔۔ ہم گریباں تو بنے، چاک گریباں نہ بنے
نعمتِ درد سے محروم رہے قلب و نظر ۔۔۔ بن گئے لوگ فرشتے مگر انساں نہ بنے
اے ستارو! ہمیں کیا یاد کروگے تم بھی ۔۔۔ ہم اگر مطلعِ خورشیدِ درخشاں نہ بنے
ایسے کتنے ہی گریباں ہیں جو فصلِ گل میں ۔۔۔ چاک ہو کر بھی ترا گوشۂ داماں نہ بنے

شفیق جونپوری کی غزل کے گلدستے میں یہ پھول ایک خاص نمایاں مقام رکھتے ہیں:-

تجھے تو ایک شب رونا تھا اے شمعِ سحر! رخصت! ۔۔۔ جو ساری زندگی روئے وہ تیرا ہم سفر کیا ہو
مبارک آپ ہی کو آپ کا دورِ مسیحائی ۔۔۔ کہ سب بیمار ہیں کوئی کسی کا چارہ گر کیا ہو
چمن ہی لٹ رہا ہے تو قفس کیسا نشیمن کیا! ۔۔۔ بہاریں جانے والی ہیں تو فکرِ بال و پر کیا ہو

یہ سمجھنا اہلِ ذوق کا اپنا کام ہے کہ شفیق کے آخری دو تیروں کا ہدف کون ہے، اور ان میں جو تلخیاں سمو دی گئی ہیں وہ کتنی ہمہ گیر قسم کی ہیں۔

قابل اجمیری کی دو غزلوں میں دو شعر بہرحال ایسے ہیں کہ ذوق ان سے کیف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

تری رحمت کے تصدق! تری بخشش کے نثار! ۔۔۔ میں تہی دست ہی اچھا، مجھے سائل نہ بنا!

خود ہوئی آوارہ، جلووں کو بھی برہم کردیا ۔۔۔ وحشتِ خاک کو انوار کا حامل بنا!

چراغِ راہ (تبصرہ) ——— قومی زبان (۱۶ مئی ۵۱ء)

پہلے اس معاصر نے چراغِ راہ کے اپریل مئی (۵۱ء) نمبر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:-

پنجاب کے حالیہ عام انتخابات میں جماعتِ اسلامی کی شرکت اور شکست پر اس دفعہ کے اداریے میں طویل تبصرہ کیا گیا ہے اور اس انتخابی مہم میں جماعت کی شرکت کو جائز اور پسپائی کو قابلِ فخر قرار دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں دبی زبان سے دوسری جماعتوں بالخصوص پر ہر قسم

جماعت کی بدعنوانیوں کا نشانہ وہ اگلے ہیں جو انتخابات کے زمانہ میں شائع کرتی ہیں" ـــــ مگر جماعت والے اپنی فاتحانہ شان کی شکست سے مایوس نظر نہیں آتے کیونکہ جمہوریت کے ان ناسوروں کو آئندہ انتخاب میں اپنانے سے گریز نہیں کیا جائے گا۔"

اور آخری فقرہ یہ ہے کہ:

"نظمیں اور غزلیں حسب معمول معمولی درجہ کی ہیں"

جو شخص تنقید و تبصرہ کے میدان میں خود اپنے لئے پوری آزادی چاہتا ہو اسے اپنے سے پہلے دوسروں کو اسی آزادی کا حق دینا پڑتا ہے چنانچہ ہم اپنے کسی ناقد کی رائے کو متاثر کرنے سے ہمیشہ بالاتر رہے ہیں، اور نہ کبھی ہم نے اپنے ناقدین کے تبصروں پر بحثیں چھیڑنے کو پسند کیا ہے۔ جس کا جو جی چاہے لکھے۔ لیکن "قومی زبان" کے اس تبصرے میں تعصب کی جو جھلک بالکل نمایاں ہے اس کے پیش نظر یہ چند سطریں لکھی جا رہی ہیں۔

انجمن ترقی اردو لسان و ادب اور علوم و فنون کے میدان میں ایک غیر جانبدار مرکزی جماعت کی روایات ساتھ لے کر پروان چڑھی ہے اور اس کے کارپردازوں نے اپنی روایات کی سختی کے ساتھ حفاظت کی ہے لیکن تحلیل نفسی تقسیم ملک کے بعد اس کے اندر کہاں سے سیاسی تعصبات کے جراثیم گھس گئے ہیں کہ اب اس کے خالص لسانی جریدے "قومی زبان" نے بھی اپنے آپ کو سرکاری زبان بنانے کا تہیہ کر لیا ہے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اوپر کے الفاظ کے پیچھے انجمن ترقی اردو کی روایات بول رہی ہیں یا "سرکاری گرانٹ" بول رہی ہے جو بہرحال ایڑیاں رگڑ رگڑ کر حاصل کی گئی ہے۔

معاصر کا انتخابات کی بدعنوانیوں کے متعلق یہ کہنا کہ "یہ تو ہوا ہی کرتی ہیں" ایک مسلمان کے ضمیر کے وجود کا پتہ نہیں دیتا۔ اگر کوئی برائی ہو رہی ہے تو کوئی مسلم اسے گوارا بنانے کے لئے یہ فلسفہ کیسے گھڑ سکتا ہے کہ ایسا تو ہوا ہی کرتا ہے۔ جو کچھ ہوا کرتا ہے۔ وہ اگر غلط ہے تو ہم سب مسلمانوں کا فرض ہے کہ اس کے خلاف لڑیں۔ ہمارے معاصر کے تعصب کا راز جس بات سے فاش ہوا ہے وہ یہ پیشینگوئی ہے کہ جماعت اگلی مرتبہ انتخابات کی بدعنوانیوں کو اپنا لے گی۔ یہ تو ظاہر بات ہے کہ تبصرہ نگار کا کام جو کچھ سامنے ہے اس پر تبصرہ کرنا ہے، نہ کہ جو کچھ ہوگا اس کے بارے میں پیشینگوئیاں کرنا ـــ یہ کام تو کسی جوتشی اور نجومی کے لئے چھوڑ دینا چاہئے تھا! دراصل جن لوگوں کو کسی کے بارے میں خواہ مخواہ کی کد ہو جاتی ہے وہ عجب چکر میں پڑ جاتے ہیں۔ پہلے تو ماضی کو کریدتے ہیں اور حال کو سونگھتے ہیں کہ کوئی چیز مل جائے، لیکن اگر یوں کام نہ چلے تو پھر ان کا سارا سوئے ظن اور تعصب سمٹ کر مستقبل کے بارے میں پیشینگوئی بن جاتا ہے کہ اچھا اگر ابھی تک کوئی چیز قابل گرفت نہیں تھی تو آگے چل کے تو ضرور ہو گی ہی۔ لہٰذا ایک ضرب پیشگی سہی!

ہمارے تبصرہ نگار بھائی کے لئے اس میں کوئی ہرج نہ تھا کہ وہ پانچ سال صبر کرتے (بلکہ سندھ اور سرحد کے انتخابات میں تو چند ماہ ہی کا فاصلہ ہے) اور پھر اگر وہ واقعی ہمیں غلطی کرتے ہوئے دیکھتے تو اپنا سارا بخار نکال لیتے۔ اس سے میں اگر ہم اُف بھی کرتے تو گردن زدنی تھے، لیکن آخر اتنی بے صبری کیا ضرور کہ وقت سے پہلے ہی ایک الزام چیپک دیا جائے۔ بصورت دیگر اگر جماعت اسلامی نے اپنے آپ کو ناپاک حرکتوں سے پاک رکھا جیسے کہ اس کا عزم ہے تو فرمایئے آپ کیا ایک شریف آدمی کی طرح آنکھیں اٹھا سکیں گے ـــ اور پھر اس پیشگوئی کے غلط نکلنے پر اگر اللہ کی عدالت میں آپ سے جواب طلب کیا گیا تو ذرا ارشاد ہو کہ جناب والا کا استدلال کیا ہوگا!

آخر محترم تبصرہ نگار کے لئے یہ کوئی زبان اور ادب کا مسئلہ تھا ـــ جبکہ آپ لوگوں کا اصل میدان یہی ہے، نہ کہ سیاست!

البتہ دوسری ضرب جو لگائی گئی ہے کہ "نظمیں اور غزلیں حسب معمول معمولی درجہ کی ہیں" (اس میں "حسب معمول" کی دستوں کو نظر انداز نہ کیا جائے) اس پر ہمیں کوئی شکایت نہیں۔ آپ بلحاظ خیالات اور فکر، اور تخیل اور نادرہ کاری ہمارے شعراء کی تخلیقات کو ہیچ نہ قرار دیں، بلکہ یہ بھی کہیں کہ ان میں قافیہ و ردیف کا کوئی نشان نہیں ملتا، اوزان میں گھٹاؤ اور وزن کے کوئی آثار نہیں پائے جاتے، اوزان میں صرف و نحو کے قواعد کا تیا پانچہ کیا گیا ہے تو بھی ہم ان شاء اللہ کوئی احتجاج نہ کریں گے ہم کو ترقی پسندوں کے ملک ادب میں شہریت کے حقوق نہیں مل سکے، ہمیں قدیم غزل کے اساتذہ نے اپنے دیس سے باہر دھکیل دیا ہے، اور ہمیں بھی ہم پر شاید نہیں ہے کہ انجمن ترقی اردو کا جزیرہ بھی ہمیں اپنی حدود میں قدم رکھنے سے روک دے تو بھی ہم خدا کی وسیع کائنات میں کہیں نہ کہیں جگہ پا سکتے ہیں۔ "ملک خدا تنگ نیست..."

(باقی صفحہ ۴۵ پر)

ان سوالوں کا ایک ٹھوس جواب دینے کے لئے کہ:-

- شعر کی دنیا میں کفر و اسلام کی تفریق کیا معنی رکھتی ہے!
- اسلام پسند شعرا کی راہیں کس مقام پر دوسروں سے الگ ہو جاتی ہیں۔
- وہ نئے راستے بناتے ہوئے کس رفتار سے پیش قدمی کر رہے ہیں!
- انھوں نے نظریۂ تخیل اور جذبات و حسیات کے کونسے نئے نمونے پیش کئے ہیں
- ان کی کمزوریاں کیا ہیں اور ان کی معذوریاں کیا ہیں!

ہم یکم اکتوبر ۱۹۵۱ء کو چراغ راہ کا شعر نمبر پیش کر رہے ہیں!

اس نمبر میں کیا ہوگا؟

ا ۔ اسلام پسند شعرا کی بہترین تازہ نظمیں

ب ۔ اسلام پسند شعرا کی نظموں کا ایک جامع انتخاب بہ ترتیب ذیل:-

اگست ۱۹۴۷ء تک
اگست ۱۹۴۷ء تا اگست ۱۹۴۸ء
اگست ۱۹۴۸ء تا اگست ۱۹۴۹ء
اگست ۱۹۴۹ء تا اگست ۱۹۵۰ء
اگست ۱۹۵۰ء تا اگست ۱۹۵۱ء

ج ۔ اس انتخاب پر تعارفی تبصرے ۔۔۔۔ چند ذمہ دار اصحاب کے قلم سے!

د ۔ ایک جامع افتتاحیہ مرتب کے قلم سے!

گلگشت!

(تعارف کتب و جرائد)

"یہ ہے تدبر قرآن!"

مولانا امین احسن اصلاحی کے نام سے اگر کوئی شخص پاکستان اور ہندوستان میں واقف نہیں ہے تو پھر اس کے متعلق یہ بدگمانی کرنا شاید صحیح ہو کہ وہ اسلام سے بھی اور علم و ادب سے بھی ہزاروں میل دور آباد ہے۔ جس شخص نے "حقیقت توحید" "حقیقت شرک" "حقیقت دعوت و تبلیغ" "اسلامی ریاست" اور "پاکستانی عورت دوراہے پر" جیسی کتابیں لکھ کر ایک طرف اسلام کے لٹریچر میں علمی خزانوں میں اضافہ کیا ہے اور دوسری طرف ادب کو مالا مال کیا ہے اسے کسی لکھے پڑھے آدمی کا نہ جاننا ایک ایسی کوتاہی ہے کہ جس پر آدمی کو شرمندہ ہونا چاہیئے۔ ایسے لوگوں کا تو کیا ذکر کہ جو ساری عمر تعصبات کی زنجیریں اپنے بدن پر لپیٹے رہتے ہیں اور اپنے فکر و ذہن کے محل کو تاریک رکھنا اس سے ہزار درجہ بہتر سمجھتے ہیں کہ اس میں کسی ایسے سورج کی کوئی کرن داخل ہو جائے جو ان کے ناپسندیدہ افق سے ابھرا ہو۔ حالانکہ وہ کسی سورج کا کچھ نہیں بگاڑتے، اپنا ہی نقصان کرتے ہیں۔

مولینا اصلاحی کی ساری عمر قرآن سے روشنی اخذ کرتے اور اس روشنی میں عملی زندگی کی وادیاں طے کرتے گذری ہے۔ مولینا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ جنہوں نے تدبر قرآن کی شاہ راہ مستقیم کو صدیوں کے غبار اور جھاڑ جھنکار سے صاف کرنے میں مسلسل محنت کی ہے، آپ کی فکری تربیت کا ذریعہ بنے اور قرآن کے نظم و اسالیب اور بلاغت کی حقیقتوں کو آپ کے ذہن نشین کر دیا۔ اپنے بے مثل استاد کا یہ بے مثل شاگرد تدبر قرآن کے موضوع پر مختصر مگر گہرائیاں رکھنے والی ایک چھوٹی سی کتاب —— تدبر قرآن —— ہمارے سامنے لایا ہے۔

تدبر قرآن کا مواد کسی قدر مختلف زبان میں "الاصلاح" (سرائے میر اعظم گڑھ) میں آج سے چند سال قبل شایع ہوتا رہا تھا۔ اب وہی مواد بانداز نو مرتب کر کے کتابی صورت میں مکتبہ چراغ راہ (۱۰، اے، دی مال، لاہور) نے قرآن کے ابجدیات کے پیاسے نوجوانوں کے سامنے لا رکھا ہے۔

یہ کتاب دو بظاہر متضاد حقیقتوں کی اس طرح توضیح کرتی ہے کہ وہ باہم بالکل ہم آہنگ ہو جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ قرآن کا فہم بغیر تدبر و تفکر کے ممکن نہیں، دوسری یہ کہ قرآن کو اس کے اتارنے والے نے آسان بنایا ہے۔ ان دو حقیقتوں کو جو لوگ سطحی نگاہ سے دیکھتے ہیں وہ ان میں تضاد محسوس کرتے ہیں، لیکن جو لوگ حقیقت شناس نگاہوں سے ان کا جائزہ لیتے ہیں ان کو یہ دونوں حقیقتیں باہم دگر منطبق نظر آتی ہیں۔ تدبر قرآن اور تیسیر قرآن دونوں کی ماہیت کو یہ کتاب بڑی خوبی سے واضح کرتی ہے۔

کچھ مدت سے "قرآن قرآن" کا چرچا تو ہمارے ہاں بہت عام ہے، لیکن افسوس کہ یا تو یہ آواز بطور فیشن کے بلند کی جاتی ہے —— اور اس فیشن کو فیشن بنانے میں ہمارے مقررین، صحافیوں، شاعروں اور سیاسی کارفرماؤں نے بڑی محنتیں صرف کی ہیں —— ورنہ جو لوگ قرآن سے کچھ تعلق پیدا کرتے ہیں، ان میں سے اکثریت ان کی ہے جو اس کی آیات سے کھیلتے ہیں، اور پھر بہت سے ایسے بھی ہیں کہ ان کو باوجود کوشش کے قرآن سے وہ کچھ نہیں ملتا جسے وہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ پھر طرفہ یہ کہ قرآن پڑھا جاتا ہے اور اصلاح نہیں ہوتی بلکہ الٹا فتنوں کو فروغ ہوتا ہے۔

"تدبر قرآن" کے فاضل مؤلف کے اپنے الفاظ میں اس حقیقت پر غور فرمایئے:۔

"سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ قرآن مجید تو ہدایت و رہنمائی کی روشنی ہے۔ اس کو ضلالت و گمراہی کی تاریکی سے کیا تعلق؟ ہونا تو

بیٹھا کر جو اسکو دیکھتا اور پڑھتا اسکو ٹھیک راہ مل جاتی، سیدھا راستہ نظر آجاتا، وہ ہدایت و ایمان سے معمور ہو جاتا، ہر گوشے میں وحدت و یک جہتی کی شاہراہ اس پر کھل جاتی، اختلاف و تفرق کے تمام پیچ نکل جاتے، اور اسکی تعلیم و دعوت کی ہم آہنگ، غیر مبہم اور پرزور صداؤں سے اسکے دل و دماغ اس طرح بھر جاتے کہ اسکے علاوہ نہ وہ کچھ سوچ سکتا، نہ کچھ سمجھ سکتا۔ مگر ہو یہ رہا ہے کہ اسکو ایک تلوار کی طرح دوست اور دشمن دونوں استعمال کر رہے ہیں۔ مومن اسی کے لئے کہ حق و عدل کے اصول متعین کرے، اور منافق اسی کے ذریعے سے سچائی اور حقیقت کو مغلوب کر لینا چاہتا ہے ——— آخر قرآن ہر ایک پر کیوں نہیں کھل جاتا ——— وہ سب کو کھینچ کر ایمان و عقیدہ کی ایک ہی شاہراہ پر کیوں نہیں کھڑا کر دیتا؟"

دراصل کتاب کا پہلا حصہ تمام تر اسی ایک سوال کے جواب پر مشتمل ہے۔ اصلاحی صاحب اولاً یہ واضح کرتے ہیں کہ قرآن میں دو طرح کی آیات ہیں۔ محکمات اور متشابہات۔ "محکمات اپنے مفہوم و مطلب میں بالکل واضح ہیں ——— ان کا تعلق ہماری عملی اور اعتقادی زندگی کے اساسی مسائل سے ہے اسلئے ہم ان کے تمام پہلوؤں کو اچھی طرح اپنی گرفت میں لے سکتے ہیں اور منطق و استدلال کی تمام کسوٹیوں پر جانچ کر ان کی نسبت اپنے قلب کو ہر طرح مطمئن کر سکتے ہیں۔ لیکن متشابہات کا حال ان سے کچھ مختلف ہے۔ اصولی طور پر تو وہ عقل و استدلال کی نہایت محکم بنیادوں پر ہوا کرتی ہیں ——— لیکن چونکہ ان کا تعلق اس عالم محسوسات سے ماوراء احوال و امور سے ہوتا ہے اس وجہ سے ان کی تفصیلات ہماری عقل و منطق کے دائرے میں نہیں سماتیں۔"

دوسری طرف قرآن کے محل میں داخل ہونے والوں کی بھی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو فریفتہ ہو کر آتے ہیں، دوسرے وہ جو جاسوسی کے لئے داخل ہوتے ہیں، یا یوں کہئے کہ ایک گروہ وہ ہے جو قرآن کے سامنے سائل بن کے آتا ہے۔ اور دوسرا وہ ہے جو چور بن کے چوروں کی سی نیت کے ساتھ قرآن کی بارگاہ میں قدم رکھتا ہے۔ پہلے گروہ کے لئے اصل طمانیت محکمات میں ہوتی ہے، پھر وہ محکمات کی روشنی ساتھ لے کر متشابہات کی حقیقتوں کا کھوج لگاتے ہیں پھر یا تو ان کو شرح صدر حاصل ہو جاتا ہے یا وہ شرح صدر حاصل کرنے کے لئے نیک نیتی سے جد و جہد جاری رکھتے ہیں اور کسی قدم پر بھی قرآن سے بدظن نہیں ہوتے۔ یہ ہوتے ہیں "الراسخون فی العلم"۔ دوسری طرف طالبین فتنہ اور ارباب زیغ کا گروہ ہوتا ہے جو اپنے ارادہ و نیت کی اصلاح کئے بغیر محض اپنے اغراض و خواہشات کی تائید ڈھونڈنے کے لئے قرآن پڑھتے ہیں اور بجائے اسکے کہ اپنی باگ قرآن کے ہاتھ میں دے دیں، چاہتے ہیں کہ قرآن کی باگ اپنے ہاتھ میں لے کر اس کو جس طرف چاہیں پھیریں ——— ان کو تسلی و طمانیت یا عمل و اطاعت کی راہ مطلوب نہیں ہے کہ اسکو پاکر مطمئن ہو جائیں، ان کو در اصل ٹھوکروں اور لغزشوں کی تلاش ہے، اسلئے پورے قرآن میں صرف وہ بات ان کو پسند آئے گی جس سے اپنی خواہشوں کو تسلی دے سکیں یا اپنے مخالفوں کو چپ کرا سکیں۔ ظاہر ہے کہ جس شخص کی تلاش یہ ہو گی اس کو قرآن کے محکمات کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ ایسے لوگ تو صرف متشابہات کی طرف ٹوٹیں گے اور جن باتوں کا اجمالاً مان لینا ان کے لئے کافی ہوتا اور جن پر ایمان و یقین کے لئے قرآن کی عملی رہنمائیاں کافی تھیں وہ ان کی جزئیات و تفصیلات کے بخیے ادھیڑیں گے۔"

اس سلسلۂ بحث میں قرآن کا قانون ہدایت و ضلالت بیان ہوا ہے جس کی روشنی میں اصلاحی صاحب نے واضح کیا ہے کہ قرآن سے ہدایت اخذ کرنے کے شرائط و آداب کیا ہیں؟

یہ سلسلۂ بحث پورا ہی بجائے خود پڑھنے کا ہے، لیکن ایک اشارہ ایسا ہے کہ اسے بیان کئے بغیر آگے بڑھنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ صفحہ ۳۳ پر علم قرآن کے لئے عمل کی اہمیت پر اصلاحی صاحب ان الفاظ سے اظہار مدعا فرماتے ہیں:-

"یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ رہنا چاہیئے کہ خدا کی شریعت عمل کے لئے نازل ہوئی ہے، اسلئے اس میں علم و عمل یا جاننا اور کرنا دو چیزیں نہیں ہیں۔ اس میں جاننا بعینہ وہی چیز ہے جس کو کرنا کہتے ہیں۔ اگر کوئی شخص جانتا ہے اور اس پر عمل نہیں کرتا تو وہ جاننا یہاں جہل محض"

پھر تدبر قرآن کے وسائل پر گفتگو کرتے ہوئے کتاب واضح کرتی ہے کہ:-

گلگشت

"قرآن مجید کے فہم و تدبر کے لئے اصلی چیز خود قرآن مجید ہی ہے۔ سلف کا مذہب بالاتفاق یہ رہا ہے کہ القرآن یفسر بعضہ بعضاً (قرآن کا ایک حصہ اسکے دوسرے حصے کی خود تفسیر کرتا ہے)"

لیکن ———

"عموماً طالب تفسیر کو یہ راہ نہایت دشوار نظر آئی اور وہ بعض ایسی وادیوں میں نکل گئے جو فہم قرآن سے نہایت دور کرنے والی تھیں حالانکہ فہم قرآن کی کلید خود قرآن ہی ہے۔ وہ اپنے تمام احتمالات کی خود تشریح کرتا ہے، وہ اپنے مفہوم و معنی کی تعیین، اپنے مقاصد و مطالب کی تفسیر اور اپنے نکات و حقائق کی تشریح کے لئے کسی چیز کا محتاج نہیں ہے، بلکہ قرآنی بلاغت کا یہ ایک عجیب اعجاز ہے (اور یقیناً اس آسمان کے نیچے صرف اسی کتاب عزیز کی یہ خصوصیت ہے) کہ وہ اپنے اکثر مشکل الفاظ اور دقیق اسالیب کے حل کے لئے اپنے اندر مثالوں اور نظائر کا ایک قیمتی ذخیرہ بھی رکھتی ہے۔"

فاضل مؤلف مطالعۂ قرآن کے لئے "تفسیروں" کو ذریعہ بنانے کے حق میں نہیں ہیں۔ کیوں؟ کیونکہ ———

"ہمارے پاس جو تفسیریں ہیں وہ دو ہی قسم کی ہیں، یا تو وہ کسی خاص اسکول کی ترجمانی کر رہی ہیں یا وہ روایات اور اقوال سلف کے تمام رطب و یابس کا مجموعہ ہیں۔ اور ایک حقیقی طالب کی راہ میں یہ دونوں چیزیں روک ہو سکتی ہیں۔ طالب قرآن جب ان کے چکر میں پھنس جاتا ہے تو اسکی جستجو اور تحقیق کی رَد طبعی نہیں رہ جاتی، مصنوعی اور غیر طبعی ہو جاتی ہے۔ وہ اس راہ پر پڑ چلنے کے بعد قرآن کے لفظوں کی رہنمائی سے محروم، اور اس کا مذاق آہستہ آہستہ دوسروں کے خیالات و افکار سے مغلوب ہو جاتا ہے۔"

تو پھر صحیح راہ کیا ہے؟ ——— یہ کہ:

"آدمی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگائے۔ صرف قرآن کو اپنی تمام توجہ کا مرکز بنائے۔ اسکی ایک ایک آیت بلکہ ایک ایک لفظ پر تدبر کرے، ٹھیک مفہوم متعین کرے، طبیعت میں جو سوال پیدا ہو اس پر بار بار غور کرے، جو بات سمجھ میں آئے اس کے نظائر و شواہد تلاش کرے، سیاق و سباق سے اسکی مطابقت معلوم کرے، نظم کے اعتبار سے اس کا موقع و محل دیکھے، عمود کلام کے پہلو سے اسکی مناسبت کو جانچے، پھر اس پر خود اپنی طرف سے شکوک و شبہات وارد کرے، اور جب دیکھ لے کہ اس نے جو بات سمجھی ہے بالکل پکی ہے، اس میں کسی پہلو سے کوئی خامی نہیں ہے، تب تفسیروں میں اسکو دیکھے، اور ہمیشہ صحیح روایات پر نگاہ رکھے (منکرین حدیث کی غلط توقعات کا یہاں خاتمہ ہو جاتا ہے) ضعیف اور کمزور روایات کو جن سے کتب تفسیر بھری ہوئی ہیں، کبھی ہاتھ نہ لگائے۔ انشاء اللہ صحیح روایات سے اسکی تائید ہوگی اور وہ اپنے دل میں ایک ایسی خوشی کا جوش محسوس کرے گا جس میں اطمینان، بلندی، اعتماد اور عشق و محبت قرآن کی، نہیں معلوم کتنی کیفیتیں ملی ہوئی ہوں گی۔"

پھر فاضل مؤلف ایک نہایت پیچیدہ مرحلے کا تذکرہ کرتے ہیں، یعنی اگر کوئی شاذ مقام ایسا ہی آ جائے کہ:-

"ملتے جلتے کرنے کے بعد آپ کسی آیت کے باب میں کسی نتیجہ تک پہنچے اور جب تفسیر کی کتابوں کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ صحیح حدیثیں اور سلف کے اقوال آپ کے اختیار کردہ مطلب کے خلاف ہیں اور کوئی ادنیٰ تائید بھی آپکے ساتھ نہیں ہے تو اس وقت کیا کریں گے؟ کیا روایات اور اقوال سلف کو چھوڑ کر اپنی بات پر جم جائیں گے؟ نہیں طلب صادق کی راہ یہ نہیں ہے، بلکہ آپ ان احادیث اور اقوال کی روشنی میں اپنی تاویل پر دوبارہ غور کریں گے۔ اس صورت میں گمان غالب تو یہی ہے کہ اگر آپ غلطی پر ہوں گے تو آپ کی غلطی خود واضح ہو جائے گی۔ لیکن فرض کیجئے آپ نے یہ مرحلہ بھی طے کر لیا مگر آپ کو اپنی ہی تاویل صحیح معلوم ہوتی ہے۔

لے یہ بات یہاں اس معنی میں نہیں کہی جا رہی ہے جس معنی میں منکرین حدیث کے ہاں کہی جاتی ہیں۔

گلگشت

اب کیا کریں گے؟ اب خود حدیث پر غور کریں گے، اس کو ہر پہلو سے پرکھیں گے، ہر کسوٹی پر جانچیں گے، انشاء اللہ یہ چیز مفید ثابت ہوگی۔ یا تو آپ کی تاویل کا ضعف واضح ہو جائے گا، یا حدیث کی اصل حقیقت واضح ہو جائے گی۔"

مولانا نے اس مقام پر متنبہ کر دیا ہے کہ جب ایسے مراحل آئیں تو عجلت اور تیز گامی کی روش نہایت مضر ہوگی، کوئی فیصلہ کرنے میں زیادہ سے زیادہ توقف کیا جائے، بار بار اللہ تعالیٰ سے رہنمائی اور شرح صدر کے لئے دعا کی جائے اور اطمینان حاصل کرنے کی جد و جہد جاری رکھی جائے۔ پھر جب وہ مقام آجائے کہ قرآن کا منشا صراحت کے ساتھ ذہن نشین ہو جائے اور کوئی خلش باقی نہ رہے تو پھر قرآن کی بات کو اختیار کر لیا اور اس امر کی پروا نہ کی جائے کہ کوئی چیز اسکے خلاف ہے۔

اس طریقۂ فکر و نظر کا حقیقی فائدہ اصلاحی صاحب نے بالفاظِ ذیل واضح فرمایا ہے:-

"اس سے آدمی کو جو کچھ ملتا ہے، یہ اسکی اپنی تحقیق و کاوش کا ثمرہ ہوتا ہے اور آدمی کی یہ ایک نفسیاتی خصوصیت ہے کہ وہ اپنی کمائی کو بہت عزیز رکھتا ہے۔ اسکی محبت اسکے ریشے ریشے میں پیوست ہو جاتی ہے اور اسکی حفاظت کی راہ میں وہ کسی چیز سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ گویا اصلی ایمانی کیفیت جو قرآن کی اصلی منزل مقصود ہے، اسی طریقۂ فکر و نظر سے ملتی ہے۔ پھر اس سے طالب کے زاویہ نگاہ میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے، وہ ٹھوکریں کھا کر اور سختیاں جھیل کر فکر و تدبر کے میدان کا آزمودہ کار سپاہی بن جاتا ہے اور تحقیق و کاوش کے مورچوں میں کبھی بددل اور پست ہمت نہیں ہوتا۔ وہ گھسنے کی تمام راہوں اور نکلنے کے تمام راستوں کا ماہر ہوتا ہے۔ اسکی ایک راہ بند کر دو گے دوسری راہ کھول لے گا!"

اس بحث کے آخری حصے میں قرآن کو سمجھنے کے لئے عرب قدیم اور عرب بعہد نزول قرآن اور تاریخ عرب سے تعلق رکھنے والی اقوام کے حالات کو جاننے کی اہمیت واضح کی گئی ہے، نیز قرآن کے الفاظ، نحوی تراکیب، ادبی اسالیب اور محاورات کے بارے میں جو مشکلات پیش آسکتی ہیں ان کو حل کرنے کے لئے مفید ارشادات درج ہیں۔ (باقی آئندہ)

★ ★ ★

جب کبھی اپنی صحت کی خاطر آپ کو کسی دواخانہ کی طرف رجوع کرنا ہوتا ہے۔ تو [illegible]
دل میں یہ سوال پیدا ہوتے ہیں۔

الف ۔ کیا وہ دواخانہ جس سے آپ دوائی لینا یا منگوانا چاہتے ہیں۔ اپنے مرکبات میں قیمتی اور اعلیٰ ادویہ نسخوں کے صحیح وزن کے مطابق ڈال رہا ہے

ب ۔ کیا تجربہ کار اور صحیح طبیب آپ کے لئے دوا تجویز کر رہے ہیں۔

خدا کا شکر ہے کہ اس کے فضل سے حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی اس دھوکا باز اور اشتہاری زمانہ میں بھی اس دوگونہ معیار پر پورا اتر رہا ہے۔

عالیجناب امام طب حکیم نذر احمد دہلوی کی سرپرستی دواخانہ اس کی

صداقت کی بہترین دلیل ہے

حکیم صاحب موصوف کسی نئے تعارف کے محتاج نہیں۔ ہندوستانی پبلک عموماً اور طب یونانی سے دلچسپی رکھنے والے حضرات خصوصاً مدت دراز سے حکیم صاحب کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ آپ فن طبابت میں [illegible] سالہ [illegible] رکھتے ہیں۔ آپ کی زندگی کے ۸ قیمتی سال مسلسل طور پر **مسیح الملک حکیم اجمل خاں** صاحب مرحوم دہلی کے طبیب [illegible] کی حیثیت سے ان کے ساتھ سفر و حضر میں کٹے۔ آپ ہندوستانی دواخانہ دہلی کے ہر شعبہ کے مسلسل چھ سال تک نگران رہے ہیں۔ کتاب **حاذق اور طب کلاں** آپ کی وہ مایہ ناز اور مقبول عام تالیفات ہیں جو محتاج تعریف نہیں۔ آپ **طبیہ کالج دہلی** کی اعلیٰ کلاسوں کے پروفیسر رہے ہیں آپ کی علمی خدمات کے اعتراف میں یونانی طبیہ کالج دہلی کے جشن سلور جوبلی کے اہم موقعہ پر مارچ [illegible] کو منتظمین کالج نے آپ کو امام طب کی اعزازی ڈگری سے سرفراز فرمایا۔

ایں سعادت بزور بازو نیست [illegible]

[illegible] کو پیش نظر رکھ کر حکیم صاحب موصوف بنفس نفیس حاذق دواخانہ کے [illegible] [illegible] اپنے آپ کی نگرانی میں تیار کراتے [illegible]
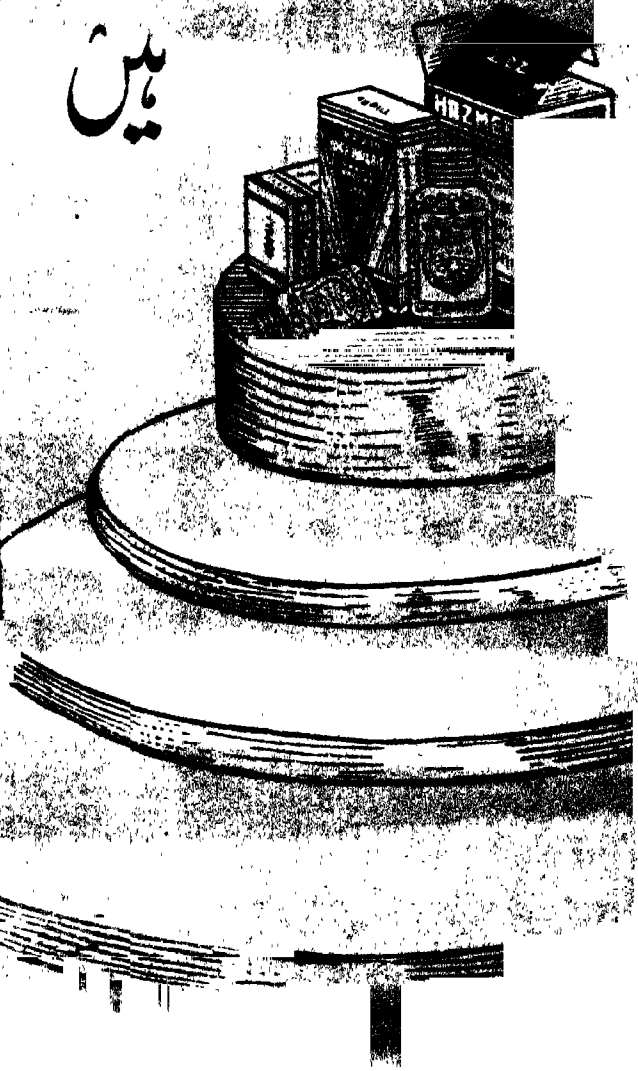
[illegible] حاذق دواخانہ بندر روڈ کراچی

افطار کے وقت
روح افزا
کی آپ کو ضرورت ہے
Hamdard DAWAKHANA

Only Title Printed at SHAN ELECTRIC PRESS Arambaugh Road, K
Printer & Publisher Ghulam Mohammed, M. Chaudhri

اگست ۱۹۵۱ء

مرتب
نعیم صدیقی

مکتبہ چراغِ راہ
لوٹیا بلڈنگ۔ آرام باغ روڈ کراچی

ماہنامہ چراغِ راہ کراچی

ماہ اگست سنہ ۱۹۵۱

جلد ۴ ——— شمارہ ۸

۹۔ لوٹیا بلڈنگ ——— آرام باغ روڈ

فہرست

سالانہ چندہ

قیمت فی پرچہ

ادارہ تحریر

۱۲۔ شاہ جمال۔ اچھرہ

لاہور

غلام محمد پرنٹر پبلشر نے ناظر پریس کراچی سے طبع کروا کر ۹۔ لوٹیا بلڈنگ۔ آرام باغ روڈ دفتر چراغِ راہ کراچی سے شائع کیا۔

سوچ بچار

ہم کیا ہیں؟

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا   اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں

کہا جاتا ہے کہ:
"تمہارے ہاں بڑی تغیر ناپذیری (RIGIDITY) ہے۔"
"تم ذرا کچھ عقیدہ پسند (ORTHODOX) لوگ ہو۔"
"تم کوئی لچک نہیں رکھتے۔"
"تم اسلام کا ایک پرانا تصور ماضی سے اٹھا لائے ہو اور اب اسے جوں کا توں پاکستان میں نافذ کرنا چاہتے ہو۔"

تمام ہوائی پروپگنڈے ہوا ہو گئے، تمام الزام تراشیوں کا کھیل ختم ہو چکا ــــــ مخالفت کے شکے میں اب تک جو جا بجا سکڑوں ٹیوبوں کے ذریعہ طولی جاری ہے اب ٹیوبوں کی حرکت ختم جانے پر وہ اپنا جو کمین ابھار کر لائی ہے، وہ بس اتنا ہی کچھ ہے۔ سارے پہاڑ کھود دیے جانے کے بعد جو چھپا صاحبہ برآمد ہوئی ہیں وہ یہ ہیں۔

یہ تین باتیں جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کچھ ایسے ہی الفاظ میں "عالم بالا" کے سدرۃ المنتہیٰ پر بھی کہی جاتی ہیں اور پھر یہی ہیں جو وہاں سے اوس بن کر نیچے ٹپکتی ہیں، یہاں تک کہ عرش سے لے کر فرش تک انھی آیات کے چرچے ہوتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ ساری مخالفتوں کا راز انھی کلمات میں مستور ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان کلمات کے پیچھے جو ذہن کام کر رہا ہے اس کا کچھ تجزیہ ہو جائے۔ مگر اس سے پہلے ایک حقیقت کو متعین طور پر سمجھ لیجئے۔

پاکستان میں اسلام کے لئے بیک وقت تین مختلف آوازیں اٹھ رہی ہیں۔

ایک آواز قدیم طرز کے دینی حلقوں سے بلند ہو رہی ہے۔ اس حلقے کی بعض متوسلین بہت ہی مخلصانہ جذبات کے ساتھ اسلامی نظام کا قیام چاہتے ہیں لیکن جدید سیاسی و معاشی احوال اور جدید علوم سے زیادہ واقفیت نہیں رکھتے اور اجتماعی معاملات سے عملاً بے تعلق ہوئے پوری قوم کے ساتھ ان کو صدیاں گزریں لیکن افسوس کہ ذہنی طور پر بھی اس میدان سے واسطہ نہیں رہا۔ ہمارے ان حضرات کو بجز چند بزرگوں کے اسلام کے اصولوں کو نئے دور کے احوال میں نصب کرنے کے تقاضوں کا پورا پورا علم نہیں، دعوتِ دین دیتے ہوئے عہدِ حاضر کے جس دماغ سے واسطہ پڑتا ہے اس کی الجھنوں کا اندازہ نہیں، بلکہ ان کے پاس ان الفاظ اور اصطلاحات کا ذخیرہ بھی نہیں جن کو اسلام کی تفہیم کا ذریعہ بنائے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ یہ الفاظ نہ تو ان حضرات کی تحقیر کے لئے لکھے جا رہے ہیں اور نہ اپنی برتری کے خوبصورت ادعا سے لذتِ نفس حاصل کرنے کے لئے، بلکہ محض یہ ایک امرِ واقعہ کو ذرا جرأتِ رندانہ کے ساتھ عرض کیا جا رہا ہے۔

ان میں سے چند خواص الخواص حضرات کو مستثنیٰ کرکے باقی جو اکثریت ہمارے سامنے آتی ہے وہ "اجتہاد" کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرتی ہے، اس کے نزدیک بدعت اور اجتہاد ہم معنی ہو گئے ہیں۔ یہ اکثریت خلافتِ راشدہ کی ایک ایک جزئی نظیر کو جوں کا توں آج بھی نافذ کرنا ضروری

سمجھتی ہے۔ اور یہ اکثریت آج سے صدیوں پہلے کی فقہ کے باریک سے باریک استنباط پر کڑا پہرہ قائم رکھنا چاہتی ہے۔ اس اکثریت میں وہ لوگ بھی ہیں جو کسی شخص کو میز کرسی پر بیٹھ کر کام کرتے ہوئے دیکھیں تو یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ یہ شخص تارکِ سنت ہے، یہ کسی کی شیروانی پر سات بٹن لگے ہوئے دیکھ پائیں تو فوراً اسراف کا فتویٰ لگا دیں گے۔ ان کے سامنے اگر نماز میں تو کجا، خطبۂ جمعہ میں آلۂ مکبر الصوت کا استعمال کیا جائے تو یہ فوراً اس سوچ میں پڑ جائیں گے کہ نماز ہوگی یا نہیں اور خطبے کا ثواب ملے گا یا نہیں۔

دوسری آواز جس سے پورے "نقار خانے" کی آن بان ہے اور جسے بلند کرنے کے لئے سرمایہ، پریس، ریڈیو اور ہماری حکومت کے جملہ ذرائع و وسائل وقف ہیں "روحِ تجدد" کی آواز ہے۔ روحِ تجدد نے ان لوگوں کے سینوں میں آشیاں بندی کی ہے جن میں بدقسمتی سے اسلام پر ایمان و اعتماد تو باقی نہیں رہا، لیکن اسلام سے انتساب کی عادت راسخ ہو چکی ہے، اور جن کے دل میں اصل قدر دنیا کی چند مقتدر قوموں کے اصول و نظریات اور طور طریقوں کی ہے۔ ان کا "اسلامی نظام" وسیع المشرب ہے، اس کا بڑا ظرف ہے، اُس کی بڑی سمائی ہے —— دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں کہ جس کے لئے اس کے اندر جگہ نہ نکالی جا سکے۔ پورا کفرستان اس کے اندر ڈال دیجئے وہ ایسا حل ہو گا کہ ہمہ تن "اسلامی" بن جائے گا۔

ان کے اسلامی نظام میں اتنی وسعت ہے کہ یہ سفید امپیریلزم کے رتھ میں جُتنے کی اجازت بھی دیتا ہے، یہ اسلام دشمن طاقتوں سے رشتۂ نیاز مندی قائم کرنے کا دروازہ بھی کھولتا ہے، یہ سیفٹی ایکٹ جیسے قوانین پر بھی مہرِ توثیق لگا دیتا ہے، یہ فلم اسٹوڈیوز اور آرٹ گیلریوں کے افتتاح پر تلاوتِ قرآن بھی کرا سکتا ہے، یہ عبدل چودھری کے آرٹ کو بھی برکت دے کر پوتر بنا دیتا ہے، یہ عزاروں کی نمائش کو بھی ملت کے استحکام و ترقی کا وسیلہ تسلیم کر لیتا ہے، یہ کاک ٹیل پارٹیوں کو بھی سندِ جواز دے سکتا ہے، یہ مینا بازاروں کو بھی اکسیر با دے سکتا ہے، یہ غیر مسلموں کو اسلامی ریاست کا صدر تک بنانے کا روادار ہے، یہ سودی بینکوں پر اپنی برکات بھیج سکتا ہے —— اور پھر یہ امریکہ کے دستور کا خیر مقدم کر سکتا ہے۔ یہ "اسلامی سوشلزم" کا جامہ زیبِ بدن کر سکتا ہے۔

یہ حضرات ملک کے اقتدار پر قابض ہیں، اس کے ایڈمنسٹریشن میں پوری طرح دخیل ہیں، اس کی سیاست میں وزن رکھتے ہیں، اس کی معیشت میں نفوذ حاصل کئے ہوئے ہیں اور عوام ان کی انگلیوں میں گردش کرتے ہیں۔ یہ چونکہ نظام کو چلاتے ہیں، اجتماعی مسائل ان کے سامنے آتے ہیں، وہ ان کے لئے علمی تیاری پر مجبور ہوتے ہیں، ان کے تعلقات دوسرے ممالک سے ہیں، اس وجہ سے قدرتی طور پر ان کے اندر احساسِ برتری ہونا چاہئے لیکن مصیبت یہ ہے کہ یہ احساسِ برتری اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ اب یہ اسلام کی تعبیر و تاویل کے مقام کے دعوے دار ہیں، حالانکہ انھوں نے اسلام کے مطالعہ پر اور اس کے مطابق سوچنے کی تربیت پانے پر، اور اس کے اصولوں کے سانچے میں اپنی عملی زندگیاں ڈھالنے پر کبھی نہ وقت صرف کیا ہے، نہ توجہ۔

یہ "اسلامی اجتہاد" کا اکثر تذکرہ کرتے ہیں مگر اس کا جو مفہوم ان کے سامنے ہے وہ "تحریف" کا ہم معنی ہے۔ یہ "جدید تقاضوں" کا واسطہ دیتے ہیں بلکہ اس شدت کے ساتھ کہ قرآن اور حدیث کے صریح احکام تک ان جدید تقاضوں کے سیلاب میں بہا دیئے جائیں۔ یہ کہتے ہیں کہ "اسلام متحرک ہے" اور اس نعرے سے ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ ہم اسلام کی طرف چل کر جانے کے لیے تیار نہیں ہیں بلکہ یہ اسلام کا اپنا کام ہے کہ وہ ذرا ترقی پسند بنے اور حرکت کر کے ہمارے مقام تک آ پہنچے۔ ہم اسلام کے لئے نہ بدلیں، بلکہ اسلام ہمارے لئے بدلے!

تیسری آواز ہماری ہے۔

ہم نہ تو اُس گروہ کے لوگ ہیں، نہ اس گروہ کے۔ بلکہ کچھ اُدھر سے بدل کے آئے ہیں اور بیشتر اِدھر سے نکل کے آگے بڑھے ہیں۔ دونوں طرف سے اہلِ اخلاص "اقامتِ دین" کے جذبے سے سرشار ہوتے گئے وہ جوق در جوق دیوں کی شکل میں آئے اور جماعتِ اسلامی کے منظم پلیٹ فارم پر معاملہ نمایاں ہو گئی نہیں بلکہ برابر بھی چلی آ رہی ہیں اور سے نکل رہی ہیں، ایک طرف سے دینی علوم کی لہریں آگے بڑھتی ہیں اور دوسری طرف

جدید علوم کے ریلے چلے آرہے ہیں۔ یہی وجہ ہے ہمارے اندر جہاں اسلام کے قدیم تہذیبی عمودوں کے تحفظ کا سخت جذبہ ہے وہاں دورِ جدید کے تقاضوں کا بھی پورا پورا پاس ہے۔ ہماری تحریک کی دونوں آنکھیں بینا ہیں اور ہماری میزان کے دونوں پلڑے برابر ہیں۔ جدید حالات کے فہم اور اس کے تقاضوں کے احساس کے لحاظ سے مؤخر الذکر طبقے کے ساتھ ہیں، لیکن اسلام کے لئے اخلاص اور اس کے اصولوں کے تحفظ کے جذبے کے لحاظ سے ہم اور قدیم طبقہ باہم اقرب ہیں۔

اب آیئے ہماری پوزیشن ہم سے سنیئے۔ ہم کہتے ہیں کہ :-

(۱) جن معاملات میں خدا اور رسول کی طرف سے امر و نہی کا کوئی منصوص حکم موجود ہے ان میں ہمارا مقام صرف اطاعت کا ہے اور اسی کی دعوت ہم دوسروں کو بھی دیتے ہیں۔ شریعت کے صاف صاف اوامر و نواہی کو بدلنے یا انھیں کالعدم قرار دینے کا اختیار ہم نہ کسی فرد کے لئے تسلیم کرتے ہیں، نہ کسی پارٹی کے لئے، نہ کسی قوم کے لئے، نہ کسی حکومت کے لئے اور نہ پوری کی پوری انسانیت کے لئے!

ہماری ساری رجعت پسندی OR THODOXY اور RIGIDITY جو کچھ بھی ہے وہ یہی ہے۔ ہمارے اس بنیادی مسلک پر چاہے اس سے بڑی پھبتیاں کیوں نہ کسی جائیں ہم خدا کے دین کی طرف سے مجاز ہی نہیں ہیں کہ اسے ترک کریں۔

اپنے اس مسلک پر ہم خدا کے دین سے ٹھوس عقلی دلائل رکھتے ہیں اور ان دلائل کو ہم نے اپنے وسیع لٹریچر میں پوری تفصیل سے پیش کر دیا ہے۔ اگر ہمارے دلائل سے مضبوط تر دلائل کے ساتھ ہماری غلطی کسی معاملے میں واضح کر دی جائے تو ہم اپنے طرزِ عمل میں اصلاح کر سکتے ہیں لیکن بغیر خدا و رسول کی سند سے دلیل دیئے اگر الٹی سیدھی باتیں کی جائیں تو ہم ان کی پیروی کرنے پر تیار نہیں ہیں۔

(۲) خدا و رسول کے واضح احکام —— امر و نہی —— کے فریم میں اندر تمام جدید مسائل کو اجتہاد کے اصول کے تحت فٹ کرنا اور ان پر اصولوں کو منطبق کرنا ہم ضروری سمجھتے ہیں۔ مگر ہمارے نزدیک اجتہاد اور تحریف کے درمیان مشرق و مغرب کا فرق ہے۔

(۳) اسلامی نظام کے قیام و استحکام اور نفاذ و توسیع کے لئے ہم جدید ترین تمدنی ذرائع و وسائل کو بھی اور اداروں کی نو بنو اقسام کو بھی اسلام کی اصولی حدود کے اندر استعمال کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

(۴) اپنے اجتہادی فیصلوں میں بھی اور جدید ذرائع و وسائل اور جدید اداروں کے استعمال کے طریقوں میں بھی ہم اپنے آپ کو دوسروں کی مرعوبیت اور نقالی سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ ہم اسلامی نظام کے مزاج کو رہنما بنا کر اپنے لئے نئی راہیں نکالنے کا جذبہ رکھتے ہیں اور ان راہوں کا تصور نہ اول الذکر طبقہ کر سکتا ہے، نہ ثانی الذکر!

غالباً یہ چوتھی شق بھی واضح کر دیتی ہے کہ ہمارے اندر آرتھوڈکسی کے جن جراثیم کا موجود ہونا ثابت کیا جاتا ہے ان کی اصل نوعیت کیا ہے۔

دوسرے نمبر پر جس جدید طبقہ کا ذکر کیا گیا ہے یہ جب اوپر درج شدہ کلمات ہم پر چسپاں کرتا ہے تو اس حملے کو کامیاب بنانے کے لئے اولاً ہمیں اور قدیم مذہبی طبقہ کو ایک کر دیتا ہے پھر ہماری تصویر یہ کھینچتا ہے کہ کچھ لوگ ہیں جو بسم اللہ کے گنبد میں پڑے ہیں، جنھیں زندگی کے تازہ ترین مسائل سے کوئی واسطہ نہیں، بیٹھے بیٹھے خواب دیکھتے ہیں اور ایک قدیم تمدن کا نقشہ جمائے ہیں اور اگر اقتدار ان کے حوالے کر دیا جائے تو موٹر کاروں اور ریل گاڑیوں کو پھونک ڈالیں اور اونٹ کی سواری لازم قرار دے دیں، توپوں اور ٹینکوں کو سمندر میں گرا کر تلواروں اور تیروں کا انتظام کریں، کوڑے ہاتھوں میں لئے پھریں اور جا بجا اسے لگاتے، دس دس ہاسے رسید کرتے ہوئے ادھر ادھر گھوم رہے ہوں، ہسپتال بند کر دیں اور ان کی جگہ تعویذ گنڈوں کے اسٹیشن قائم کر دیں۔ کسی کے ہاتھ کاٹ رہے ہوں اور کسی کو سنگسار

(بقیہ بر صفحہ ۳۱)

ملّتِ خوابیدہ! جاگ

ضیا محمد ضیا

روزِ روشن پر مسلّط ہو گئی تاریک رات
زندگی سہمی ہوئی ہے گم ہے نبضِ کائنات
موت گاتی پھر رہی ہے اپنا وحشت خیز راگ

ملّتِ خوابیدہ! جاگ

تیرے لیڈر اور حاکم تیرے واعظ اور خطیب
تیرے صوفی اور مفتی تیرے شاعر اور ادیب
ڈس رہے ہیں تیری روحِ مضمحل کو کتنے ناگ

ملّتِ خوابیدہ! جاگ

ناخدا ہیں بے خدا اور اہلِ کشتی بے خبر
راہرو انجان ہیں اور راستہ ہے پُرخطر
سیدھے سادے ہیں عوام اور رہنما ہیں تیرے ٹھگ

ملّتِ خوابیدہ! جاگ

تیری عزت کیلئے ذلت گوارا ہم نے کی !!
تیری خاطر آج ہم نے ہر مصیبت مول لی!
ہم نے چاہا چھین لیں اہلِ ہوس سے تیری باگ

ملّتِ خوابیدہ! جاگ

ہر طرف سے تیرے دشمن ہیں تجھے گھیرے ہوئے
اور اہلِ دیں ہیں دین سے اپنے منہ پھیرے ہوئے
سوزِ ایماں سے لگا دے خرمنِ باطل میں آگ!

ملّتِ خوابیدہ! جاگ

آج پھر بگڑا ہے تیرے پیشواؤں کا مزاج !
ہم بھی جن کو پیش کرتے تھے محبت کا خراج
بات کیا ہے؟ بہہ رہا ہے آج انکے منہ سے جھاگ!

ملّتِ خوابیدہ! جاگ

آسمانی ادب

(آیاتِ الٰہی کے ادبی جمال کا انعکاس)

پاکیزہ اصول اور خبیث اصول

(سورہ ابراہیم ع ۴)

کیا تم نے اس پر غور نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک پاکیزہ اصول کی (حقیقت واضح کرنے کے لئے) کیسی مثال بیان کی ہے؟

کہ ایک پاکیزہ اصول ایک پاکیزہ درخت کی طرح ہے کہ جس کی جڑ زمین میں خوب جمی ہوئی ہے اور جس کی شاخیں آسمانی فضا میں پھیلی ہوئی ہیں۔

وہ (سدا بہار درخت) اپنے رب کے حکم (قانون) کے تحت ہر آن اپنے پھل لا رہا ہے!

—— اور یوں اللہ تعالیٰ لوگوں کے لئے مثالیں بیان کرتا ہے، شاید کہ وہ سبق حاصل کریں!

اور ——

ایک خبیث اصول کی مثال (گھورے کے) غلاظت پودے کی سی ہے جو زمین کے اوپر ہی اوپر سے اچک لیا جائے —— اس کے لئے کوئی ثبات نہیں ہے!

اللہ تعالیٰ (حق پر) ایمان لانے والوں کو پائندار اصولوں کے ذریعے دنیا کی زندگی میں بھی، اور آخرت میں بھی ثبات دیتا ہے —— اور —— (حق سے روگردانی کرنے والے) ظالموں کو انتشار میں مبتلا کر دیتا ہے!

اور اللہ (اپنے قوانینِ حکمت کے تحت) جو چاہے کرتا ہے!

قند و نمک

"اسلام الدین"

جنگ کینے کی سکت انڈیا میں ہے یا وہ صرف رعب گانٹھنا چاہتا ہے، خطرے کا غبار بہرحال مزید افق پر اڑا دیا گیا ہے۔

ادھر یہ غبار اڑا اور ادھر اس سے فائدہ اٹھانے والے مستعد ہو گئے۔ ایک صاحب نے پاکستان ٹائمز مؤرخہ ۱۰ جولائی کے شعبۂ خطوط میں فوراً یہ تجویز داغ دی ہے کہ دفاع کو مضبوط کرنے کے لئے عورتوں کو ایک آرڈی ننس کے ذریعے بے پردہ کر دیا جائے۔

لیکن کسی نئے آرڈی ننس کے بجائے بڑا آسان اور کارگر طریقہ یہ ہے کہ موجودہ سیفٹی ایکٹ میں ایک پردہ کشا دفعہ کا اضافہ کر دیا جائے۔ پردہ جب صحت کے لئے مضر ہے، ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے، زنانے فروغ میں مانع ہے اور عورتوں کے ڈبلیو اے، سی ز، کی شرکت میں حائل ہے تو اس سے بڑھ کر پبلک سیفٹی کا دشمن اور کون ہوگا۔

پولیس کے ہر سپاہی کو اس امر کے اختیارات دے دیئے جائیں کہ وہ ہر رہ چلتی عورت کو غور سے دیکھیں اور جس کو سالم نقاب پوش پائیں اس کا برقعہ بحق اسلامی ریاست ضبط کر لیں، جسے نیم برقعہ پوش، یعنی برقعہ سے شرارت اور دل لگی کرتے ہوئے دیکھیں اسے برقعے سے نجات دلانے کے علاوہ چھ ماہ کی نظر بندی "بلا ثبوتِ جرم" کی سزا بھی مزید دیں ——— کیونکہ اسے دو ہی ماہر کی طرف سے ذوقِ بے پردگی بھی عطا ہوا لیکن پھر بھی وہ ایک رسم کا بُت پوجتی رہی۔ پھر جو کوئی گھونگھٹ نکالنے کی مجرم ہو پولیس کا ہر کارکن اپنے دستِ اصلاح و تادیب سے اسے درست کر دے دوپٹے کو سر سے اتار کر کندھوں پر سے ہوا میں لہرانے کے لئے آراستہ کر دے۔ یہی نہیں بلکہ ہر عورت کے چہرے بشرے کا مطالعہ کر کے کارکنانِ حکومت اس بات کا اندازہ کریں کہ کہاں کہاں ذوقِ حجاب مخفی طور پر موجود ہے جو کسی نہ کسی صورت میں مفادِ عامہ کے لئے خطرہ بن سکتا ہے، اور جہاں ایسے ذوق کے ہونے پر سرکار کے کسی نمائندے کا بجائے خود اطمینان ہو جائے وہاں حراستِ پیش بندی (PREVENTIVE DETENTION) سے کام لیا جائے۔ ایسی تمام نظر بند خواتین کو ببل چودھری اور ان کی بیگم صاحبہ کی تربیت میں رکھنے کے بعد سیدھا خلوطِ مدافعت پر بھجوا دیا جائے۔

آپ نے دیکھا ان جدت پسندوں کا ذوقِ تشدد! ——— اگر کہئے کہ اسلام کی کسی مطلوبہ حالت کو پیدا کرنے کے لئے ذہنی و اخلاقی تربیت کے ساتھ ساتھ آئینی جبر کا محدود استعمال بھی ناگزیر ہے تو یہ آپ پر "کٹھ ملا" ہونے کی پھبتی کس کر فرمائیں گے کہ واہ! یہ بھی خوب اسلام ہوگا کہ لٹھ کے زور سے چلے گا۔ لیکن ان کا اپنا حال یہ ہے کہ فحش لٹریچر کا طوفان اٹھا کر، فحش سینماؤں کی جوالا کا دہانہ کھول کر، فحش گانوں کا سیلاب بہا کر، ببل چوہدری اور اس کی بیگم کے کمالات کا مظاہرہ کر کے، پاکستان کے ایک ایک کونے میں مینا بازار لگوا کر اور ایک ایک کالج اور ادبی مجلس میں بے پردگی کے حق میں مباحثے کرا کر بھی جب ایک فی صدی سے زائد عورتوں کو متاثر نہیں کر سکے تو آخر کار لٹھ کے فلسفے کا سہارا لینے پر مجبور ہو گئے ہیں ——— وہ بھی دفاعی سرگرمیوں کی آڑ میں! یعنی ملک تو زندگی موت کے سوال سے دوچار ہے اور یہ ماؤں بہنوں کے منہ سے نقاب نوچنے کا جہادِ ترقی شروع کریں گے۔

یہ صاحب جنھوں نے ہمارے ترقی پسند حکمرانوں کو "دیوانہ را ہوئے بس است" کی حکمت کے تحت ایک نکتۂ لطیف سوجھایا ہے، آپ جانتے ہیں کہ کس اسم شریف کے مسمّی ہیں؟ ـــــ "اسلام الدین!" اکیلا اسلام کا لفظ بھی کافی نہیں تھا، اوپر سے دین بھی جھونک ڈالا گیا ہے۔ پاکستان ٹائمز جب کبھی کوئی نیا شوشہ دینِ اسلام کے خلاف چھوڑنا چاہتا ہے تو بالعموم یہی "اسلام الدین" صاحب بیڑا اٹھایا کرتے ہیں۔ کیسی حسین ہے نقاب! ـــــ مگر کاش کہ یہ نقاب نوچی جا سکتی اور اس کے لئے بھی کوئی آرڈی نَنس ہوتا۔

نہ معلوم ان لوگوں کو "کفر الدین" نام اختیار کرنے میں کونسی بزدلی مانع ہو جاتی ہے؟ یہ نام نہ صرف خوشنما ہے بلکہ خاصا شاعرانہ اور انقلابی بھی ہے۔ بس وہی پردے کی فرسودہ رسم!

عورت غریب کا پردہ نوچنے والے مرد، کبھی اپنے پردے کی طرف بھی التفات کرتے!

بے پردہ خدمتِ وطن کے جذبے کے تحت محاذ پر کام کرنے کا ایک قابلِ یادگار تجربہ دورِ انگریزی کی W. A. CS کو بھی ہو چکا ہے۔

قارئین کو غالباً رانی جھانسی رجمنٹ کی نئو خواتین کا فریاد نامہ نہ بھولا ہوگا۔

کیا فرماتے ہیں "اسلام الدین" صاحب بیچ اس مسئلے کے!

طاؤس و رباب اول

جنگ بظاہر سر پہ لٹک گئی ہے، اور ادھر جہاد فی سبیل اللہ کا جذبہ ابھر رہا ہے۔ یہ موقع ایسا ہے کہ ملک بھر کی قوتوں کو مدافعت کے فریضے کے لئے بالکل ابھر کے سامنے آ جانا چاہئے۔ چنانچہ جس سے جو کچھ بن آتا ہے وہ اپنی خدمات کی پیشکش کر رہا ہے۔

"پاکستان کلب آف میوزک" نے جب یہ دیکھا کہ اکثریت کی سیاسی جماعتوں اور اقلیت کی تنظیموں کی جہاد آمادگیوں کے ساتھ ساتھ مسجدوں کے اماموں اور خطیبوں کی تنظیمیں وعظ و خطابت کا محاذ سنبھال رہی ہیں تو اس نے سوچا کہ آخر موسیقی کا آرٹ کیوں کام میں نہ آئے۔ سو کل پاڑا سینما کے اوپر ایک کنسرٹ منعقد کیا گیا۔ کنسرٹ نے علامہ اقبال کے مزار کی طرف رخ کر کے جو تانیں اڑائیں تو ان میں یہ پیغام شامل تھا کہ:

"طاؤس و رباب اول، شمشیر و سناں آخر"

پرانے اسلام کے دور میں جہاد فی سبیل اللہ ہوتا تھا تو قوت کے سرچشمے مسجدیں ہوتی تھیں اور اذان و تکبیر کے ہنگامے سے زیادہ گرم ہو جایا کرتے تھے، مگر یہ نیا اسلام ہے کہ قوتِ جہاد کے سرچشمے سینما ہال اور بال روم ہیں، اور چنگ و نے کی صداؤں سے روحوں کو بالیدگی ملتی ہے۔

کہتے ہیں کہ موسیقی کے اثرات بڑے عجیب و غریب ہوتے ہیں۔ نغمہ بیماروں کو تندرست کر سکتا ہے، ہنسا سکتا ہے، رلا سکتا ہے، بےہوش کر سکتا ہے، تڑپا سکتا ہے، بارش برسا سکتا ہے، آگ لگا سکتا ہے، بجلی کوندا سکتا ہے۔ یہ بات ہے تو پھر واقعی طاؤس و رباب کو اول ہونا چاہئے۔ نغمہ کے یہ اثرات تھوڑے سے تھوڑے دشمن کو شکست دینے کے لئے کافی ہیں۔ دشمن آگے بڑھتا ہے اور آپ ایک راگ گا کے بارش برسا دیتے ہیں، ہر طرف دلدل ہو جاتی ہے اور ٹینک، توپخانے اور مشینی گاڑیاں چلتے چلتے رک جاتی ہیں۔ پھر فرض کیجئے کہ پیدل سپاہ مارچ کرتی ہے تو کوئی دوسرا راگ کافی ہے کہ سب کو مجبور کر دے کہ ہنسیں اور اتنا ہنسیں کہ پیٹ میں بل پڑ جائیں، نہ چل سکیں، نہ سوچ سکیں، نہ بوجھ اٹھا سکیں، بس ہنستے جائیں ـــــ اور ہماری "پاکستان کلب آف میوزک" کی مختصر سی رجمنٹ بڑے اطمینان سے ہنسی ہنسی میں، ایک ایک کو گرفتار کرتی جائے ایسی ماکرسی کو ـــــ خصوصاً سکھ رجمنٹوں کو ـــــ [illegible] تو پھر رلانے والا راگ الاپا جائے۔ دشمن بڑھتے بڑھتے رونے لگے اور

(بقیہ بر صفحہ ۳۱)

منکہ ایک بے وقوف ہوں

شریف احسن

دنیا کا ہنگامہ بے وقوفوں کے دم سے قائم ہے اگر بے وقوف نہ ہوتے تو عقلمند بھوکے مر جاتے۔ یہ میں کچھ اس وجہ سے نہیں کہہ رہا ہوں کہ میں خود بھی ایک بے وقوف ہوں اور اس طرح اس گروہ کی اہمیت بڑھانا چاہتا ہوں بلکہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے۔ دنیا میں ہمیشہ بے وقوفوں کی اکثریت رہی لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ اکثریت کے باوجود ان کو کبھی حکومت نصیب نہ ہوئی۔ اور تو اور جمہوریت کی ان دو صدیوں میں بھی ان بے چاروں کا کہیں بس نہ چلا۔ مزید ستم یہ ہے کہ عقلمند لوگ نہ صرف یہ کہ حکومت کرتے ہیں بلکہ ساتھ ساتھ احسان بھی جتاتے ہیں ——— یوں کہنے میں آئے تو خیر انسان زمین آسمان کا بھی انکار کر سکتا ہے۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ ان لوگوں کا احسان ہے بھی۔ اور وہ جو یہ کہتے ہیں بالکل ٹھیک کہتے ہیں کہ انہیں تو نہ حکومت کی ضرورت ہے نہ دولت کی۔ بھلا ایسے قانع اور درویش صفت انسانوں کو حکومت اور اس کے عز و جاہ سے مطلب۔ ان بے چاروں کو تو محض مجھ جیسے بے وقوفوں کی خاطر یہ سارے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ وہ نہ ہوں تو دنیا سے تہذیب و تمدن کو دیس نکالا مل جائے۔ انسان انسان کو پھاڑ کھا جائے، دنیا درندوں کی بستی ہو جائے۔

انسانی حماقتوں کی طویل کہانی جسے کچھ لوگ تاریخ بھی کہتے ہیں شاہد ہے کہ اول تو بے وقوفوں کو قدرت نے حکومت کا موقع ہی کم دیا تاہم جب کبھی دنیا میں عقلمندوں کی کمی واقع ہوئی یا انھوں نے دنیا سے استغنا کنارہ کشی اختیار کی تو لوگ ایک دوسرے کو پھاڑ کر کھا گئے اور دنیا درندوں کی بستی بن گئی ——— یقین نہ آئے تو کسی عجائب خانے میں جا کر دیکھ لیجئے وہاں ان لوگوں کی ہڈیاں آج تک تاریخی عجائبات کے طور پر محفوظ ہیں۔

اسی وجہ سے جو شخص ذرا سا بھی عقلمند واقع ہوا ہے اس کا یہ پیدائشی حق ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ جتنے لوگوں کو بے وقوف بنا سکتا ہے بنا لے۔ اس پر کسی طرح کی کوئی پابندی نہیں۔ اور یہی آزادی ہے جس کی بنا پر بڑے عقلمند چھوٹے عقلمندوں اور چھوٹے بے وقوف بڑے بے وقوفوں کو بھی بے وقوف بنانے سے نہیں چوکتے۔

قسم کھا کر تو خیر میں نہیں کہہ سکتا البتہ مجھے اس پر یقین کامل ہے کہ اگر عقلمندوں کو بے وقوفوں کی صحیح قدر و قیمت معلوم ہو جائے تو وہ چاہے بے وقوف بنیں یا نہ بنیں بے وقوف بننے کی آرزو ضرور کریں۔ یہ واقعہ ہے کہ آج دنیا میں عقلمندوں کی اتنی ضرورت نہیں جتنی بے وقوفوں کی۔ آپ کسی ملک کا بجٹ اٹھا کر دیکھ لیجئے کہیں آپ کو ایسا نظر نہ آئے گا کہ بل ملک کو بے وقوف بنانے کے لئے جو روپیہ مخصوص کیا گیا ہو اس کا دسواں حصہ بھی انہیں عقلمند بنانے کی مد میں رکھا گیا ہو۔

میں بھی ایک پیدائشی بے وقوف ہوں۔ خیر بے وقوف ہوں یا نہیں مجھ سے اب تک سلوک ایسا ہی کیا گیا ہے۔ اس دنیا میں قدم رکھا تو نجانے کن کن امنگوں اور آرزوؤں کے ساتھ لیکن یار لوگوں کے سامنے میری ایک نہ چلی۔ اور محض اس وجہ سے کہ لوگ میری بات سمجھ نہ سکتے تھے مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کی گئی۔ چنانچہ میں اپنی خواہشات کا اظہار مختلف اشاروں سے کرتا۔ لوگ انہیں سننے کا نام نہ لیتے اور تو اور خود میرے والدین نے میری بات سمجھنے کی کبھی کوشش نہ کی بلکہ کبھی تالیاں اور سیٹیاں بجا بجا کر مجھے چپ کرانے کی کوشش کی جاتی اور کبھی میرے ہاتھوں میں جھنجھنا تھما دیا جاتا۔ گویا میری خواہشوں کی قدر و قیمت چٹکیاں، چپتالیاں اور کچھ لوریاں تھی۔ اور میری بڑی سے بڑی آرزو کو ایک جھنجھنے کی رشوت سے دبایا جا سکتا تھا۔

جب میں ذرا بڑا ہوا اور لوگوں نے سمجھ لیا کہ اب زیادہ دیر تک اسے جھنجھنے ایسی چیزوں کا لالچ دے کر بے وقوف نہیں بنایا جا سکتا تو ایک دوسرا حربہ استعمال کیا جانے لگا۔ اور آپ سچ پوچھیں یا جھوٹ مجھے تو بہرحال یہی کہنا ہے کہ یہ حربہ اتنا کامیاب نکلا کہ اس کے زخموں سے میں آج تک جانبر نہیں ہو سکا۔ یہ تھا خوف۔

میں ایک بے وقوف ہوں

ڈنڈا اور دھمکی کا حربہ۔

میں گو بچہ تھا، مگر تھا تو انسان کا بچہ اور انسانی بچے عام طور پر عقل کا خانہ خالی لے کر نہیں آیا کرتے اسی قاعدے کے مطابق میرے پاس بھی گو بہت بڑی نہ سہی، ایک ننھی منی عقل ضرور تھی لیکن بھلا ہو میرے بزرگوں کا کہ انھوں نے مجھے کبھی اس کے استعمال کی زحمت گوارا نہ کرنے دی بسا اوقات یہ ہوتا کہ میں کچھ سوچتا سوچنے کے بعد کچھ چاہتا اور جب دیکھتا کہ اسے ضد کے سوا کسی دوسرے ذریعے سے پورا نہیں کیا جا سکتا۔ تو اس پر سختی سے ڈٹ جاتا۔ کبھی منہ پھلا کر کسی کونے میں دبک کر بیٹھ جاتا اور کبھی اپنے پرایوں سب سے بائیکاٹ کر کے چپ شاہ کا روزہ رکھ لیتا۔ لیکن جو لوگ مجھے بے وقوف بنانے پر تلے ہوئے تھے وہ تو میرے بھی چچا ابا تھے بھلا وہ میرے داؤں میں کیوں آتے۔ ادھر میں نے کوئی ایسی حرکت کی اور ادھر انھوں نے کتوں، بلیوں، سانپوں، بچھوؤں، جنوں، بھوتوں کا ایک ذہنی لشکر میرے اوپر چھاپہ مار رہنے کے لئے چھوڑ دیا ــــ یہاں جملۂ معترضہ کے طور پر اتنا سن لیجئے کہ مجھے بچپن میں ہی اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ دنیا میں سب سے عزیز شے انسان کی جان ہے۔ یہ وہ شاہ حماقت ہے جس کا خمیازہ میں آج تک برابر بھگت رہا ہوں ــــ اب آپ خود تصور فرمائیے کہ میری ننھی سی جان جس کے پاس اپنی مدافعت کے لئے سوائے اماں کی گود یا ابا کے دامن کے اور کچھ نہ تھا اس لشکر کا کب تک مقابلہ کرتی چنانچہ کتے کا کھا جانا اور بھوت کا آ جانا یہ بلائیں میرے ذہن پر ایسے مسلط ہوئیں کہ خواب میں بھی میری روح ان سے لرزتی رہتی۔ اور میں جو کہ دنیا میں اکیلا بے خوف دل لے کر آیا تھا۔ اب ان ذہنی بھوتوں کا شکار ہو کر رہ گیا ــــ اس مسلسل خوف نے مجھے اس نتیجہ پر پہنچا دیا کہ یہ سب بلائیں سوچنے سے آتی ہیں۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کر لیا کہ نہ سوچوں گا نہ یہ بلائیں آئیں گی۔

جب میں عمر کی چھٹی منزل میں داخل ہوا اور پر پرزے نکالنے شروع کئے تو لوگوں نے محسوس کیا کہ گھر کی چار دیواری اس کی احمقانہ تربیت کے لئے کافی نہیں اور انھیں خدشہ ہوا کہ کہیں یہ ٹوٹا ہوا تارہ مدار کامل نہ بن جائے تو مجھے اسکول جا کر بٹھا دیا گیا۔ وہاں میرے اوپر کیا گذری؟ مدرسہ والے جو خود بھی بے وقوف تھے انھوں نے مجھے بے وقوف بنانے کے لئے کیا کیا ہتھکنڈے استعمال کئے، تعلیم کے نام سے مجھے جہالت اور حماقت کے کیا کیا درس دیئے گئے؟ کن کن طریقوں سے میری خوابیدہ قوتوں کو بیدار اور بیدار قوتوں کو خوابیدہ کیا گیا؟ اس کی روداد تو اتنی طویل ہے کہ نہ آپ سن سکیں گے نہ میں بتا سکوں گا۔ البتہ اتنا ضرور سن لیجئے کہ جو کمی تعلیم میں رہ جاتی اسے ماسٹر صاحبان کا حسن سلوک پورا کر دیتا چنانچہ اس حسن سلوک کی ایک صورت یہ تھی کہ وہ پڑھاتے کم اور گالیاں زیادہ دیتے تھے۔

میری ذہنی اور فکری صلاحیتوں کے خلاف یہ ایک ایسی منظم اور طویل سازش تھی کہ جب تک پورے چودہ سال کے بعد میں نے اچھے نمبر لا کر اپنے بزرگوں اور معلمین کو یہ یقین نہ دلا دیا کہ اب میرے بے وقوف ہونے میں کوئی کسر باقی نہیں ہے اس وقت تک اسکول اور گھر دونوں محاذوں سے میری عقل پر پیہم یورش ہوتی رہی۔

خیال تھا کہ اتنی محنت کے بعد جو سند میں نے حاصل کی ہے اس کا احترام کیا جائے گا اور مجھے مزید بے وقوف بنانے کی کوشش نہیں کی جائے گی لیکن واقعہ اسکے خلاف نکلا۔ ادھر میں نے سند لی اور ادھر تحت الثریٰ کی ساری خبیث روحیں پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑ گئیں۔ سیدھی طرح یوں کہئے کہ شادی کی آڑ میں مجھے بے وقوف بنانے کی ایک اور کوشش کی گئی۔

میری شادی ایمان بالغیب سے کسی طرح کم نہ تھی۔ خدا کو پہچاننے کے لئے تو پھر بھی بہت سے قرینے ہیں لیکن یہاں دور دور تک قرینہ ایسی کوئی شے موجود نہ تھی اور وہ نیک بخت یا بدبخت خاتون جس کے ساتھ مجھے عمر قید کی سزا دی جا رہی تھی اس کے متعلق مجھے یہ بھی تو معلوم نہ تھا کہ وہ جن ہے، عورت ہے، چڑیا ہے، کوئی خاتون ہے یا محض ایک فرضی نام ہے ــــ اور بعد میں جب ہم دونوں بے تکلف ہوئے تو معلوم ہوا دوسری طرف بھی معاملہ کچھ ایسا ہی تھا۔ حقیقت تو یہ تھی۔ یوں سمجھ لیجئے کہ وہ مجرم جنھوں نے کبھی کسی جرم میں شرکت کرنا تو درکنار، نہیں ایک دوسرے سے جان پہچان بھی نہ تھی۔ ان کو ایک ہی جرم کے ماتحت ایک دوسرے کا شریک حیات قرار دے کر متاہل زندگی کی جیل میں عمر بھر کے لئے بھجوا دیا گیا لیکن یقین جانئے اس وقت بھی اس حماقت کی اہمیت کا اندازہ نہ تھا

ملک بے عقلاں

وہ تو جب اس نے ہنگ میار بنانا شروع کئے تو معلوم ہوا کہ اس کے نتائج کتنے دور رس ہیں۔

گو اس وقت میں جو بیس برس کے پیٹے میں ہوں مگر اس مختصری زندگی میں میں نے بے وقوفی کے اکثر مراحل کو طے کیا ہے اور اسی وجہ سے اب میرا شمار دنیا کی چوٹی کے بے وقوفوں میں ہونے لگا ہے۔ بلکہ اب تو مجھے یہ گمان ہو چلا ہے کہ اگر مجھ جیسے بے وقوف زیادہ نہ سہی صرف چند دن کے لئے سیاست داں جائیں تو دنیا کے عقلمند بے وقوف بن جائیں۔ موٹروں کی پیں پیں اور کوٹھیوں کی ٹیپ ٹاپ ختم ہو جائے اور حکمرانوں کا نشہ جو کسی ترشی سے نہیں اترتا ایک لمحے کے اندر ٹوٹ جائے۔ کیا آپ جانتے نہیں کہ حکومت کے پیسے کا ٹھاٹ اور حکومت کے پیسے کے فریب ہماری جیبوں اور جانوں ہی سے زندگی حاصل کرتے ہیں۔ سوچئے تو اگر ہم بے وقوف نہ ہوں گے تو یہ تعیش کے نئے نئے سامان خریدنے کے لئے نئے نئے ٹیکس کس پر لگائے جائیں گے۔ جب سڑکیں نہیں گھسیں گی۔ پانی نہیں پیا جائے گا۔ ہوا کھانے والا نہیں ہوگا تو یہ ٹریفک ٹیکس، یہ پانی ٹیکس، یہ ہوا ٹیکس کس سے وصول کیا جائے گا۔ گذشتہ صدی کی بات ہے کہ جب بے وقوفوں پر ٹیکسوں کا بوجھ بڑھ گیا اور پھر بھی حکومت کے اخراجات پورے نہ ہو سکے تو حکومت نے حیات ٹیکس کے نام سے ایک اور ٹیکس لگا دیا جو ہر زندہ بے وقوف پر لاگو ہوتا اور اس کی دو خصوصیتیں تھیں ایک تو یہ کہ عمر کے تناسب سے اس میں بھی اضافہ ہوتا جاتا اور دوسری یہ کہ اسے بے وقوفوں سے لے کر عقلمندوں پر خرچ کیا جاتا۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بے وقوفوں نے احتجاجاً خودکشی کر کے مرنا شروع کر دیا۔ لیکن جیسا کہ ہر زمانے کا دستور ہے اس وقت بھی حکومت تھی عقلمندوں کی۔ انھوں نے خودکشی کو جرم قرار دے دیا اور ایک اور ٹیکس "جائداد ضبطی" یا "موت ٹیکس" کے نام سے لگا دیا۔ مطلب یہ کہ زندہ رہیں تو ٹیکس دیں اور مر جائیں تو ان کی جائداد ضبط ہو۔ اس کا خاطر خواہ اثر ہوا، خودکشی رک گئی۔ اور یہ جو آج یہاں دو چار ہم صورت نظر آتے ہیں تو یہ بھی اسی قانون کی برکت ہے۔

خیر حکمرانوں سے تو پھر بھی انسان بے وقوف بن کر پیچھا چھڑا لے لیکن یہ حکمران سیاست داں ان کی بے وقوف سازی کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہیں مٹی کے مادھو ہیں ادھر تو کسی مقام پر رہنے ہی نہیں دیتے۔ چنانچہ میں ان کے ہاتھوں بالکل ایک کھلونا سا بن کر رہ گیا ہوں۔ دین اور وطن کے واسطے کے بغیر یہ لوگ لقمہ نہیں توڑتے۔ اب کس کی شامت آئی ہے جو ان سے اختلاف کر کے ذرا سی عقلمندی دکھانے کی خاطر عمر بھر کے لئے غداری کا طوق اپنے گلے میں ڈال لے۔ یہ خسارے کا سودا مجھ سے تو نہ ہوگا۔ اور میں تو خیر بے وقوف ہوں ہی، یہاں تو اچھے اچھے عقلمندوں کو بے وقوف بنتے دیکھا ہے۔ اور وہ بھی تو بیچارے مجبور ہیں عقلمندی کا مظاہرہ کریں تو جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں، بے وقوف بن کر کم از کم زندہ تو رہ سکتے ہیں۔

اگر آپ بھی میری طرح بے وقوف ہیں تب تو خطرے کی کوئی بات نہیں لیکن خدانخواستہ اگر آپ کو عقلمندی کا بھی کچھ زعم ہے تو کسی دن یہ دیکھ بیٹھیں گے کہ کل تک جن اصولوں کے حامی آپ بڑے شد و مد سے کہے جاتے تھے آج ان کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور کیوں لگ رہے ہیں۔ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھے جائیے اور کچھ نہ کہئے۔ ورنہ آپ احمق تو ہو ہی جائیں گے۔ غداری کا تمغہ اور مل جائے گا — یہ رموز سیاست ہیں ان کا سمجھنا سمجھانا قائدوں کا کام ہے۔ ہم ایسے بے وقوفوں کو ان سے واسطہ۔

اور سنئے! خدا کی کتاب موجود، خدا کے رسول کی سنت موجود، اور کتاب و سنت کو سمجھنے والے موجود لیکن اسلام وہی ہے، جسے یہ لوگ اسلام قرار دیں، یہ الگ بات ہے کہ خود خدا اور اس کے رسول کو بھی اس سے اختلاف ہو۔ ہماری آپ کی خیر اسی میں ہے کہ چپکے سے بے وقوف بن جائیں اور ان کی ہاں میں ہاں ملا دیں۔ ابھی کل کی بات ہے کہ کچھ لوگ عقلمندی کے زعم میں یہ حرکت کر بیٹھے بس پھر جو ان کی گت بنی کچھ نہ پوچھئے۔ خدا کی ساری زمین ان پر تنگ ہو گئی اور آخر جیل کے دامن میں جا کر کہیں ان کو پناہ ملی۔ وہ تو ان کی خوش قسمتی تھی کہ معاملہ یہاں پر ہی آ کر ختم ہو گیا۔ ورنہ قانون انتشار کی جس دفعہ کے تحت انہیں گرفتار کیا گیا تھا اس کی رو سے تو انہیں پھانسی بھی دی جا سکتی تھی۔

ایک اور واقعہ بھی عبرت کے لئے سن لیجئے۔ ایک صاحب نے انگریزی میں ایک کتاب لکھی اور واہی تباہی ترجمہ میں آیا یک سیا۔ لوگ صاحب کے پیچھے پڑ گئے۔ پہلے تو صاف مکر گئے کہ انھوں نے یہ کہا ہی نہیں جب عبارتیں نکال کر سامنے رکھ دی گئیں تو ارشاد ہوا اس کا وہ مطلب نہیں جو آپ لوگ سمجھتے ہیں۔

مگر ایک بے وقوف ہوں

اب بھلا یہ کوئی سمجھ میں آنے والی بات ہے کہ ایک ملک جس پر کم و بیش سو برس تک انگریزوں نے حکومت کی اور جس میں اب تک ذریعہ تعلیم انگریزی زبان ہے اور جہاں ہزاروں نہیں لاکھوں کی تعداد میں انگریزی زبان سمجھنے والے انسان موجود ہیں۔ وہاں کسی کی سمجھ میں اس زبان کے دو جملے بھی نہ آئیں؟ — لیکن آپ کو معلوم ہے نتیجہ کیا ہوا؟ بحالت جوں کی توں رہی اور اعتراض کرنے والوں کو اتنی رد و کد کے بعد بھی بے وقوف ہی بننا پڑا۔ اس سے تو بہتر یہ تھا کہ وہ شروع سے ہی بے وقوف بن جاتے اور اعتراض نہ اٹھاتے۔ اس سے انہیں کم از کم شرمندگی اور خفت تو نہ اٹھانی پڑتی۔

یہ اخبار نویس تو کم بخت تو مجھے بالکل ہی معصوم سمجھتے ہیں ایک تو ان کا سارا کاروبار چلتا ہی میرے دم سے ہے۔ دوسرے وہ مجھ سے یوں برتاؤ کرتے ہیں جیسے مجھے یہ خبر ہی نہیں کہ اگر میں نہ خریدوں تو ان کا اخبار بند ہو جائے گا۔ اگر یہ لوگ میرے سامنے مٹی کا ایک بت لا کر رکھ دیتے تو بھی شاید مجھے شکایت نہ ہوتی اور میں بڑی خوشی سے بے وقوف بن کر اس کی پرستش شروع کر دیتا۔ لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ یہ بت گر ہر روز ایک نیا بت تراش کر میرے سامنے لاتے ہیں۔ اب مانا کہ میں بے وقوف ہوں، احمق ہوں، سب کچھ ہوں مگر ایسا گدھا تو نہیں ہوں کہ ہر روز نئے سے معبود کے سامنے سر جھکاؤں۔ گدھے کا نام لیتے ہی ایک بات یاد آگئی وہ جو کہتے ہیں نا کہ ضرورت کے وقت گدھے کو بھی باپ بنا لیا جاتا ہے تو باقی دنیا کے متعلق تو معلوم نہیں اکثر اخبار نویسوں کی حد تک تو یہ بات بالکل ٹھیک معلوم ہوتی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ یہ لوگ تو بعض اوقات سچ مچ گدھے بن جاتے ہیں۔

آپ سوچئے تو آخر ایک انسان کب تک بے وقوف بنتا چلا جائے۔ کل ایک صاحب جو ملک بھر کے صحافیوں کو اپنے بعد تبرک دیتے ہیں کالے قانون کے حامی تھے۔ نہ صرف حامی بلکہ محض اس خدشے سے کہ کہیں ان کی صحافت اور سیاست کا کاروبار ٹھنڈا نہ پڑ جائے اپنے دو حریفوں کو اسی قانون کی کند چھری سے ذبح کر دیا لیکن آج جب خود ان کی باری آئی تو بلبلا اٹھے اور پیشانی کے شکنوں میں یہ سطر نمودار ہو گئی۔

'بہترین جہاد جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق کہنا ہے'۔

کچھ ایسا ہی حال مولوی قسم کے لوگوں کا ہے۔ یہ بھی ہمیشہ تاک میں رہتے ہیں اور جہاں ذرا سا موقع بھی ملتے ہیں مجھے بے وقوف بنا جاتے ہیں۔ مگر لطیفہ یہ ہے کہ یہ کم بخت لوگ بے وقوف بناتے بناتے بعض اوقات خود بھی بے وقوف بن جاتے ہیں۔ اس کے باوجود یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ سیاست دانوں یا اخبار نویسوں کا کاٹا جانبر ہو سکتا ہے لیکن ان کے کاٹے کا کوئی علاج نہیں۔ ایک زمانہ تھا جب ایک شخص کو مومن قانت بننے کے لئے عمر بھر جہاد و مجاہدہ کرنا پڑتا۔ وہ دن کو جان ہتھیلی پر رکھ کر خدا کے دشمنوں سے جنگ لڑتا اور رات کو خدا کے سامنے سربسجود رہتا۔ مگر اب یہ ایک جنبش قلم یا ایک ترچھی نظر سے سارے مراحل طے کرا دیتے ہیں چنانچہ کسی بڑے سے بڑے بد باطن منافق کو مومن صالح اور صالح سے صالح مومن کو خبیث، منافق اور کافر بنا دینا ان کے دائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ ان کی حرکتیں مجھے سب سے زیادہ عجیب معلوم ہوتی ہیں۔ اللہ میاں کا نام لیں گے تو یوں جیسے وہ ان کا کوئی قریبی عزیز یا رشتہ دار ہو اور جنت اور دوزخ کا تذکرہ کریں گے تو ایسے گویا یہ ان کی جاگیر کے دو حصے ہوں۔ اور اختیارات اتنے وسیع کہ چاہیں تو دوزخ کو بھی جنت میں لے جا کر ڈال دیں۔ ان کی باتوں سے تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ اصل مختار تو وہ ہیں اللہ میاں کی تو بس آئینی سی پوزیشن ہے۔ جو فیصلہ یہ کر دیتے ہیں اللہ میاں اسی کے مطابق ہاں یا نہ میں سر ہلا دیتے ہیں۔

گو ان سب طبیبوں نے مجھے ہدایت کر رکھی ہے کہ غور و فکر سے پرہیز کرنا چاہیے۔ لیکن میں کبھی کبھی بد پرہیزی کر جاتا ہوں۔ ایک دفعہ ایسی ہی بد پرہیزی سے میری سمجھ میں آیا کہ وہ جو ہماری زبان میں جنت الحمقا کا لفظ موجود ہے اس کا اصل مطلب کیا ہے۔

احسان ناشناسی ہوگی اگر اس سلسلے میں میں مالداروں اور سرمایہ داروں کا تذکرہ نہ کروں۔ مجھے اعتراف ہے کہ مجھے بے وقوف بنانے میں ان کا بھی [illegible] ہے اور وہ بھی تسلیم کریں گے کہ ان کو مالدار بنانے میں مجھے بھی بڑا دخل ہے اور وہ جو کسی نے کہا ہے کہ — چوں احمق در جہاں باقی ست کس مفلس نماند — تو مجھے معلوم نہیں کہ وہ شخص عقلمند تھا یا بے وقوف اور مجھے یہ بھی پتہ نہیں کہ اسے اس بات پر حکومت وقت کی طرف سے سزا ملی تھی یا انعام لیکن اس نے بات بڑی پتے کی کہی اور ساری دنیا کے بے وقوف اور عقلمند مل کر بھی اس کو نہیں جھٹلا سکتے۔ مجھے حیرت ہے کہ گاندھی اور ابوالکلام ایسے لوگوں کی نگاہوں سے یہ عالمگیر سچائی کیونکر اوجھل رہی۔

(باقی صفحہ ۴۴ پر)

انسانیت کے دو نمونے

"قیدی"

مضطر گجراتی

اک طائرِ ملول نشاطِ جہاں سے دور
ہنگامۂ چمن سے الگ۔ آشیاں سے دور

صورت کے اعتبار سے انساں کہیں جسے
آزاد نقشِ عالمِ امکاں کہیں جسے

بیٹھا ہوا ہے گوشۂ تاریک میں اُداس
جیسے کوئی ہراس کے عالم میں بے حواس

چہرے پہ اشتہا کے تقاضوں کی سختیاں
بالوں میں گرد اٹی ہوئی۔ گالوں پہ زردیاں

ہونٹوں پہ کرب و درد کے طوفاں رُکے ہوئے
پلکوں پہ جبر و ضبط کے سائے جھکے ہوئے

بیوی کا غم۔ وطن کی خلش۔ آشنا کی فکر
بچوں کی پرورش کا خیال انتہا کی فکر

تعلیم یافتہ ہے جواں ہے شریف ہے
لیکن باعتبارِ مقدّر ضعیف ہے

مفلس کو کب فراغ بقدرِ نفس مِلا
پاداشِ مفلسی میں ملا تو قفس مِلا

ماخوذ ہے اناج چرانے کے جُرم میں
یعنی شکم کی آگ بجھانے کے جُرم میں

ہرچند تھی تمیز سپید و سیاہ کی
لیکن شکم نے راہ دکھائی گناہ کی

ماتھے کی سلوٹوں میں ندامت کا رنگ ہے
کچھ اعترافِ جُرم۔ کچھ احساسِ ننگ ہے

انساں پہ بند کر دیئے درِ احتجاج کے
کتنے غلط ہیں فیصلے خود بیں سماج کے

مجبورِ وقت بھی ہے یہ مرہونِ وقت بھی
اس پر ستم ظریف ہے قانونِ وقت بھی

طوفانِ زندگی میں کنارا دیا اسے
یہ غرق ہو گیا تو سہارا دیا اسے

تعزیر کا عمل ہے سپید و سیاہ پر
لیکن نظر نہیں ہے بنائے گناہ پر

جب تک محرکاتِ گنہ کا نہ ہو علاج
آسودۂ گناہ نہ ہوگا کبھی سماج

اصلِ شجر کو چھوڑ کے شاخوں کی فکر کیا
ساحل ہی غرق ہو تو سفینوں کا ذکر کیا

سرمایۂ فساد معاشی اصول ہیں
جب تک ہیں یہ۔ سکوں کے تقاضے فضول ہیں

تفریق ناروا یہ غریب و امیر کی
توہین ہے اخوتِ آفاق گیر کی

فطرت جب اوج و پست پہ یکساں محیط ہے
انساں پہ کس کے اذن سے انساں محیط کی

تحریف کر کے مذہبی قدروں کی بے حساب — دُنیا نے خود نظامِ معیشت کیا خراب
قارونیوں کے پاس اجارے نہیں کیے ہیں — زنداں کے سلسلے بھی کرشمے انھیں کے ہیں
ہو انتظامِ ملک جو فطرت کے دین پہ
گنجائشیں نہ جرم کی پھر ہوں زمین پر

"آزاد"

نعیم صدیقی

اک مردِ حق شناس فضا سے ذرا بلند — پستی ملی ہے رزق میں، جذبہ ملا بلند
جانِ ضعیف جانئے کس امتحاں میں ہے — ہر لحظہ کشمکش سی دلِ ناتواں میں ہے
دل جل رہا ہے پیٹ کے دوزخ کی آگ سے — پیہم ضروریات کے ڈستے ہیں ناگ سے
بیماریوں کا زور کہ "تو چل میں آگئی" — لگتا ہے جو موت آئی تو جھگڑا چکا گئی
آتے ہیں حادثات سنانیں لیے ہوئے — کالی بلائیں تیر کمانیں لیے ہوئے
قرضوں کے جال باندھتے ہیں بال بال کو — جنبش کی تاب تک نہیں رہتی خیال کو
تقریب جو بھی آتی ہے "بل" پیش کرتی ہے — غربت بچاری ہدیہ دل پیش کرتی ہے
بیوی کی آرزو کے مسلنے کا دکھ بھی ہے — بچوں کی خواہشوں کو کچلنے کا دُکھ بھی ہے
محنت کے تاجروں کی عنایات! حیف حیف! — جونکوں کی آدمی میں ہیں عادات! حیف حیف!
سرمایے کا وہ کبر! شرافت کا قتلِ عام! — محنت کے دل میں کیوں نہ اٹھے جوشِ انتقام
حالات کا غریب پہ کتنا دباؤ ہے — کتنا محال اپنی خودی کا بچاؤ ہے
شیطاں بچھائے بیٹھا ہے ہر ہر قدم پہ دام — دانہ ہے اس کے دام کا بس "لقمۂ حرام"
سستا یہاں حرام ہے مہنگا ہے یاں حلال — یہ حال ہے کہ جرم و خیانت ہے یاں کمال

یہ فلسفہ کہ آدمی مجبور ہی تو ہے — بھوکا خطا کرے تو وہ معذور ہی تو ہے
ایسے میں اس غریب کو جو حق شناس ہے — اپنے خدا کا، دین کا، سیرت کا پاس ہے!
اتنا نہیں کمینہ کہ جب زور کچھ پڑے — روٹی پہ اپنی دولتِ ایمان بیچ دے
ٹکرا رہا ہے ظلم کے خونیں نظام سے — اندھا نہیں ہوا ہے مگر انتقام سے
بگڑی معاش ضعفِ شعور و معاد سے
بھوکے اگر ہیں پیٹ تو دل کے فساد سے

"میں امن چاہتا ہوں"

اشمہ میرزا

وقت کے پھیلتے ہوئے سایوں میں رینگتی ہوئی کراہیں اور غم ناک سرگوشیاں۔ روٹھی ہوئی بہاروں کا سراغ لگا رہی ہیں۔ تاریک راستوں میں بھٹکی ہوئی امن کی متلاشی روحیں۔ نئے طوفان کی آہٹ سن کر چیخ رہی ہیں۔ گھپ اندھیرا روشنی کی آخری کرن کو بھی نگل گیا ہے بلکتے ہوئے بچوں کو تھپکتے ہوئے فاقہ زدہ والدین کے سینے کی گہرائیوں میں جھنجھلائی ہوئی امیدیں۔ اندھیرے کی تہوں میں سے ابھرتی ہوئی ہولناکیوں کو محسوس کر کے سہمی جا رہی ہیں۔ یہ ہولناکیاں جنھوں نے انسانیت کی برہنہ لاش پر متکبرانہ قہقہے لگائے تھے۔ کتنے ہی مسکراتے ہوئے چہروں پر آنسوؤں کی جھالریں پھیلا دی تھیں، پر رونق بستیوں میں موت کی چیخوں کو جنم دیا تھا، جگمگاتے محلوں کو کھنڈرات بنا کر ان پر بھیانک سناٹوں کو مسلط کر دیا تھا، تاریک کھنڈوں اور ہیبت ناک جنگلات میں انسانی لاشوں کے انبار لگا دیئے تھے، اب پھر اندھیرے کی تہوں سے آزاد ہونے کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ اور یہ امیدیں جو زندگی کی کڑواہٹ کو مٹانے کی خاطر مکارانہ وعدوں کے الجھاؤ میں پھنس گئی تھیں، بیتے ہوئے لمحوں کی سفاکی کو بھول کر امن کے خوشنما نعروں پر جوش میں آ گئی تھیں اب پھر انھیں وعدوں کے نظر فریب کھلونوں سے بہلانے کی کوشش کی جانے لگی ہے۔ بھڑکتی ہوئی آگ کے ٹھنڈا ہو جانے پر ماضی کے پچھتاووں نے حال کی تلخیوں کو اور گھناؤنا بنا دیا تھا۔ زندگی کے کھوکھلے خول میں دراڑیں پیدا کرنے کے بعد بھی امن کا پرتو کہیں پر بھی نظر نہ آیا تھا۔ زندگی کو مٹانے والے خود درندے بن گئے تھے۔ زندگی زندہ تھی، نام بدل دیا گیا تھا۔ اور ماحول چیخ رہا تھا " زندگی نہیں مر سکتی ——— زندگی زندہ رہے گی" ——— اور یا میدیں فسطائیت کی شعبدہ بازی کو جان کر پھر سرگوشیاں کرنے لگی تھیں ——— " زندگی مر سکتی ہے ——— زندگی اب زندہ نہ رہے گی" ——— لیکن بے بس ہاتھوں کو جکڑنے والی زنجیروں کی جھنکار ان سرگوشیوں کو پھیلنے نہ دیتی تھی۔ اور اب یہ جھنکار ——— وقت کے پھیلتے ہوئے سایوں میں آگے بڑھتی ہوئی امن کی متلاشی چیخوں اور کراہوں کا تمسخر اڑانے لگی ہے۔ اور اندھیرے کی تہوں میں سے ابھرتی ہوئی ہولناکیوں کو محسوس کر کے جھنجھلائی ہوئی امیدیں سہمی جا رہی ہیں ——— شاہد میرا دوست کہتا تھا " ساتھی۔ یہ راستہ جس پر تم آگے بڑھ رہے ہو تمہیں کبھی منزل پر نہیں پہنچائے گا۔ واپس پلٹ آؤ۔ دیکھو رنگین اور حسین ہنگامے آغوش وا کیئے تمہارے منتظر ہیں مخمور شباب کے گیت آؤ اس سے انسانیت کے فرسودہ دکھوں کو بھول جاؤ۔ جذبات کی تشنگی کو جھوٹی تسلیوں سے بہلانا موت کو آواز دینے کے مترادف ہے" ———

لیکن ——— وہ نہیں جانتا۔ کہ میں ہزار ہا بار موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اولوالعزمی کے گیت گا چکا ہوں، موت کا خوف میری زندگی کے کسی گوشے میں تھرتھراہٹ پیدا نہیں کر سکتا ہے۔ موت کا خوف شاہد جیسی بزدل زندگیوں کا ہی ورثہ ہے۔ موت ان کے ارادوں کو جامد بنا سکتی ہے جو دوسروں کو خون کی ہولی کھیلنے پر مجبور کر کے خود تہہ خانوں میں رنگ رلیاں مناتے رہتے ہیں۔ موت ان کے لئے ایک کھلونا ہے جو دھرتی پر پھیلی ہوئی سماجی، اقتصادی، معاشی اور تمدنی ابتریوں کو مٹانے کی خاطر ایک نئے عزم سے آگے قدم بڑھاتے ہیں۔ یہ راستہ جس پر میرے قدموں کے نشان پھیلتے جا رہے ہیں اسی منزل کی طرف جاتا ہے جہاں پر امن ہے، سلامتی ہے، خوشحالی ہے، مساوات ہے اور ——— شاہد حد سے زیادہ جذباتی نوجوان ہے۔ وہ ملمع شدہ حسن کے فریب پر آ کر اپنی عارضی مسرتوں کو بدحال مخلوق کے

اُبلتے ہوئے آنسوؤں پر حاوی کردینا چاہتا ہے۔ رقص گاہوں کی سرور انگیز فضاؤں میں رقص کرتے ہوئے وہ ان بیواؤں کو بھول جاتا ہے جن کے سہاگ کو جنگ کے نعروں نے اجاڑ دیا ہے۔ ان معصوم بچوں کو فراموش کردیتا ہے جن کی توتلی زبانیں تاریک کھنڈروں اور بکھرے ہوئے سمندروں کی تہوں میں چھپے ہوئے اپنے باپوں کی یادمیں نوحے گاتی رہتی ہیں۔ اسے تڑپتی ہوئی ماںمتا کے جھلسے ہوئے نوحے سنائی نہیں دیتے۔ ویران آنکھوں کے بےچین شکووں کو وہ نہیں پڑھ سکتا۔ اسے رقص گاہ سے والہانہ پیار ہے۔ اسے اس بات کا یقین ہے کہ جنگ کے شعلوں میں رقص گاہ کی رونقیں بڑھ جاتی ہیں۔ نئی نئی جوان اور خوبصورت لڑکیاں خاکی وردی پہن کر شباب کی سخاوت کرنے میں دلیر بن جاتی ہیں۔ انھیں کوئی ٹوکنے والا نہیں ہوتا۔ اور پھر دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی کو گھٹانے کے لئے اگر جنگ کے نعرے بلند نہ ہوں تو نچلے طبقے کے ذلیل لوگوں کی اکثریت شریف سرمایہ داروں کو آرام سے نہ بیٹھنے دے۔ اب پھر ذلیل لوگوں کی تعداد بڑھ گئی ہے جنگ ضرور ہوگی۔ رقص گاہ کی رونقیں بڑھیں گی۔ اور نئی نئی جوان اور خوبصورت لڑکیاں...... شاہد مجھے بھی تاریک خلاؤں میں رینگتی ہوئی تھکی ہاری نظروں سے دور لے جاکر کسی آوارۂ شباب کی معطر آغوش کے سپرد کردینا چاہتا ہے۔ تاکہ انسانیت کے بگڑے ہوئے خدوخال کو سنوارنے میں کوئی حصہ نہ لے سکوں بلکہ گمراہیوں کی دلدل میں پھنس کر جہنم کا ایندھن بن جاؤں —— زندگی کے چوبیس سال —— ماضی کے ویرانوں میں سسکتے ہوئے دم توڑ گئے ہیں۔ گاؤں کی اجڑی ہوئی گلیوں میں بچپن کی شرارتوں کی ننھی ننھی قبروں کے نشانات مٹ چکے ہیں۔ شہر کے خوشنما بازاروں میں سرمایہ کے پھیلاؤ کی مکروہ چالوں کو دیکھ کر میں اب زندگی کے صحت مند تقاضوں کو مفلوج نہیں بنا سکتا۔ شاہد —— جس کا نام اگر شاہد نہ ہوتا۔ تو کوئی بھی اسے مسلمان نہ سمجھتا —— مجھ سے بدظن ہوگیا ہے۔ وہ مجھے اب اپنا دشمن سمجھنے لگا ہے —— وہ اپنے سرمایہ کی اجارہ داری کو قائم رکھنے کی خاطر جنگ کا خواہشمند ہے —— عوام کے امن کے نعروں کو روندنے کی خاطر وہ ایٹم بم کی پناہ ڈھونڈھ رہا ہے —— ایٹم بم۔ جس نے ہیروشیما پر موت کا ابدی سایہ ڈال دیا ہے۔ جس کی شہ پر یروشلم کی مقدس زمین پر بےگناہوں کے خون کو بےدردی سے بہایا جارہا ہے —— مراکش کی آزادی کے نعروں کو کچلا جارہا ہے۔ کشمیر کی شادابی کو اجاڑا جارہا ہے —— ایٹم بم۔ ذرہ بموں کے پیچھے قوانین کو اب زیادہ دیر تک بھوکے ننگے عوام پر مسلط نہیں رکھ سکتا۔ یہ زنجیریں ٹوٹ جائیں گی۔ آہنی دیواریں پگھل جائیں گی —— اندھیرا گہرا ہوتا جارہا ہے۔ راستہ کے پیچ وخم آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے سے بھی نظر نہیں آرہے ہیں —— راستہ۔ جو جگمگاتے ہوئے ہوٹلوں اور مسکراتی ہوئی رقص گاہوں کی رونقوں کو پیچھے چھوڑ کر۔ ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیوں کی کراہوں کے بوجھ کو اٹھائے میرے پاؤں سے الجھا جارہا ہے۔ راستہ۔ جوان گنت قدموں کے نقوش کو سینے میں چھپائے چپ چاپ لیٹا ہوا ہے —— نئی صبح کی آمد کا حیات بخش پیغام سن کر عنقریب ہی مسکرا اٹھے گا —— نئی صبح کا حیات بخش پیغام بیکراں خلاؤں میں انگڑائیاں لینے لگا ہے —— خوفناک طوفانوں کی باگیں کھینچنے والے جیالے انسانوں کے ہیولے —— میری ہمت بندھا رہے ہیں۔ میں آگے بڑھ رہا ہوں —— اپنی منزل کی طرف —— جہاں پر امن ہے، سلامتی ہے، خوش حالی ہے، مساوات ہے اور —— اور وقت کی اندھی خلاؤں میں کروڑوں انسانوں کی بےکسی تڑپ رہی ہے۔ تاریک راستوں کے مسافر ٹھوکریں کھاتے ہوئے چلا رہے ہیں —— ہم کسی خونی تاریخ کا آغاز نہیں چاہتے۔ ہم جنگ کی ہولناکیوں کو جنم دینا نہیں چاہتے۔ ہم امن چاہتے ہیں —— اور —— یہ کیسی آوازیں آنے لگی ہیں! تاریکی کے سینے میں سُرخ دھاری کہاں سے پیدا ہوگئی ہے!۔ اور وہ —— دو بڑی بڑی سُرخ آنکھیں تاریکی میں خون گھولنے لگی ہیں —— اندھیرا اب سُرخ ہوگیا ہے —— ہر طرف خون ہی خون —— لیکن اس راستہ کے پیچ وخم ابھی تک اندھیرے میں ڈوبے ہوئے ہیں —— ابھی تک مجھے راستہ صاف دکھائی نہیں دے رہا ہے —— ایسا کیوں؟ چیخوں اور کراہوں کا سیلاب سرخ آنکھوں کی طرف بڑھ رہا ہے۔ سُرخ آنکھیں امن کی منزل کی طرف راہنمائی کرنے کا اعلان کررہی ہیں۔ سوکھے سہمے ڈھانچے رقص کرنے لگے ہیں —— وہ دور بلند محلوں کے بُرج لرز رہے ہیں۔ ویران کٹیاؤں میں زلزلے بیدار ہو رہے ہیں —— امن کے نعروں کی گونج بھاگتے ہوئے لمحات کو منجمد کرنے کی جدوجہد کرنے لگی ہے —— لیکن

راستہ جو میرے پاؤں سے الجھا ہوا ہے۔ ابھی تک تاریک ہے۔ سُرخ شعاعوں کا غبار اس راستہ کو منور نہیں کر سکا ——— چیخیں اور کراہیں سرخ آنکھوں کے قریب پہنچ رہی ہیں ——— بہت قریب ——— اور اب یہ جھنجھلا گئی ہیں! ——— اور یہ۔ سوکھے سہمے ڈھانچوں کا رقص کیوں ختم گیا ہے! ——— اسے تو اور زیادہ تیز ہو جانا چاہیئے تھا ——— امن کے نعروں میں یہ کیسی ابتری پھیل رہی ہے ——— کیا یہ نعرے کھوکھلے اور مطلب پرستانہ ہیں۔ گھورتی ہوئی سُرخ آنکھوں میں شعلوں کا ناچ تیز ہو گیا ہے چیخیں اور کراہیں تڑپ تڑپ کر نڈھال ہو رہی ہیں۔ سوکھے سہمے ڈھانچوں کو شعلے نگل رہے ہیں۔ اُف۔ کتنا بھیانک منظر ہے۔ اور اب۔ خونی فضاؤں میں ایک زرد لکیر کسمسانے لگی ہے ——— سرخ آنکھوں میں ناچتے ہوئے شعلے ٹھٹھک کر رہ گئے ہیں۔ زرد لکیر سُرخی پر حادی ہونے کے لئے تیزی سے پھیل رہی ہے ——— امن کے نئے نعروں کی گونج ابھر رہی ہے ——— اونچے محلوں کے برج سنبھلنے لگے ہیں۔ ویران کٹیاؤں میں ابھرتے ہوئے زلزلے سہم گئے ہیں۔ ——— سماں دُھندلا گیا ہے ——— اور ماحول کی دھڑکتی ہوئی رگوں میں "گندا خون اور پیپ" آپس میں ٹکرا گئے ہیں ——— امن کے نعروں کی بجائے جنگ کا بگل بجنے لگا ہے ——— جنگ ——— خون۔ پیپ۔ دھواں۔ آگ۔ دھماکے۔ زہریلے جراثیم ——— ہر طرف ہولناکیاں ——— سفاکیاں ——— رقصاں ہیں ——— عوام کو کیا ہو گیا ہے؟ ——— گھناؤنے نعروں پہ کیوں حیوان بن گئے ——— ان میں کوئی روکنے والا نہیں۔ کوئی ٹوکنے والا نہیں ——— میرے پاؤں ڈگمگانے لگے ہیں ——— راستہ تاریک ہے ——— کہاں جاؤں؟ ——— واپس شاہ کی طرف پلٹ جاؤں شاہ! ——— نہیں۔ میں اب واپس نہیں پلٹ سکتا۔ میں آگے بڑھوں گا ——— یہ کون مجھے سنبھالا دے رہا ہے ——— کون ہے؟ ——— یہ آواز کیسی! "اللہ بہت بڑا ہے" ——— "اللہ بہت بڑا ہے" ——— جنگ کے نعرے کانپنے لگے ہیں ——— نفرت کو اچھالنے والے انسان خوف زدہ ہو گئے ہیں ——— زرد اور سرخ شعلوں پر کیا پیارا نور۔ ابرِ رحمت کی مانند برسنے لگا ہے ——— نور پھیلتا جا رہا ہے ——— نور پھیلتا جا رہا ہے۔ زرد اور سرخ شعلے اس نور میں جذب ہوتے جا رہے ——— چیخیں اور کراہیں ——— سہانے گیت بنتی جا رہی ہیں ——— سوکھے سہمے ڈھانچے۔ زرد اور سُرخ زنجیروں سے آزاد ہو کر مسکرا رہے ہیں ——— تاریک کٹیاؤں میں زندگی بخش اجالا لہرانے لگا ہے ——— اونچے محلوں کے بُرج۔ ویران کٹیاؤں کو چومنے کے لئے جھک رہے ہیں ——— امن کے سچے نعروں سے فضاؤں کی لامحدود وسعتیں گونجنے لگی ہیں ——— ان نعروں میں کوئی رعونت نہیں۔ کھوکھلا پن نہیں۔ خود غرضی نہیں ——— کھلی ہوئی انسانیت بھرپور خلوص سے مسکرا اٹھی ہے ——— نور پھیلتا جا رہا ہے یہ نور ——— وہی ہے جس نے عرب کے تپتے ہوئے ریگستانوں میں ٹھنڈک پھیلا دی تھی جس نے درندگی کی متکبر للکار کو مٹا کر مساوات کے حسین نغموں کو جنم دیا تھا جس نے عوام کے کچلے ہوئے ڈھانچوں پر قائم صنم کدوں کی بنیادیں اکھاڑ کر رکھ دی تھیں ——— نور پھیلتا جا رہا ہے۔ کائنات کا ہر ذرہ چمکا اٹھا ہے۔ راستہ جو میرے قدموں میں سسکتا ہوا تاریکیوں میں کہیں کھو گیا تھا۔ اب منور ہو گیا ہے۔ منزل سامنے کھڑی مسکرا رہی ہے ——— میں منزل کی درخشاں چوٹیوں کو چوم کر امن کا نعرہ لگانا چاہتا ہوں۔

———+———

اعتذار

اس مرتبہ چراغِ راہ کے مستقل خوشنویس نے چونکہ یکایک دوسری جگہ کام کرنا پسند کر لیا اور نئے کاتب کے انتظام میں خاصی دشواری پیش آئی اس لئے مجبوراً رسالہ کی اشاعت چند روز مؤخر کرنی پڑی۔ ایجنٹ حضرات اور قارئین مطلع رہیں۔

"منیجر"

استفسارات

پھر وہی مسئلہ تصویر

آپ کہتے ہیں کہ اصنام و تصاویر کی حرمت کی غایت "بت پرستی کے شیطان" کا سدِ باب کرنا ہے، اور یہیں آپ سے متفق ہوں کہ اس قرنِ منور میں بھی بت پرستی طرح طرح سے رائج ہے لیکن اس خطرے کے باعث مطلق تصویر کشی کی حرمت سمجھ میں نہیں آتی۔ اس اجمال کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

ایک طرف علماء ایک حدیث کی رو سے تصویر حرام ٹھیراتے ہیں، اور دوسری طرف قرآن حضرت سلیمان علیہ السلام کے کارناموں میں ان کے "تماثیل" بنوانے کا ذکر کرتا ہے۔ اس کا ایک جواب تو علماء یہ دیتے ہیں کہ ان کی شریعت میں تصویر کشی جائز تھی، ہماری شریعت میں حرام ہو گئی؛ اور دوسرا یہ کہ تماثیل سے لازماً ذی روح اشیاء کی تصویر مراد نہیں۔ پہلے جواب کی تردید تو عقل اور نقل دونوں کرتی ہیں۔ عقلاً یہ بات بعید ہے کہ تصویر کشی اُس زمانے میں حلال ہو، جب دُنیا کے نسبتاً تاریک تر اور زیادہ توہم پرست ہونے کے سبب بُت پرستی کا زیادہ اندیشہ ہو، اور عہدِ نبوی میں جب اس خطرے کا امکان نسبتاً کم تر ہو، (یا کم از کم اتنا ہی ہو) تصویر کشی حرام ہو جائے ——— اور نقلاً اس طرح مستبعد ہے کہ کوئی نبی ایسا فعل نہیں کرتا جو بعد کی شریعت میں حرام ہو جانے والا ہو، اور اگر بدرجۂ مجبوری کرتا بھی ہے تو خداوند تعالیٰ اسے اس کا کارنامہ نہیں گردانتا کہ کہیں ایک نبی کا فعل بعد والے لوگوں کے لئے حجت نہ بن جائے۔ رہا دوسرا جواب سو وہ بھی شافی نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ اگر تمام ذی روح اشیاء کی تصویر کشی حرام ہو تو اس دنیا میں اور رہ ہی کیا جاتا ہے؟ آج تو پودوں میں بھی حیات کا ہونا ثابت ہو گیا ہے۔ پھر باقی بے جان چیزیں، جن کی تصویر کشی کی جاتی ہے کیا ہیں؟ پہاڑ، دریا، عمارتیں اور اجرامِ فلکی! اور اگر بت پرستی کا اندیشہ ہی حرمتِ تصویر کی اصل غایت ہے تو اکثر غیر ذی روح اشیاء بھی گمراہ قوموں کی معبود تھیں اور آج تک ہیں، مثلاً پیپل، برگد (اگر آپ پودوں کو ذی روح کی تعریف سے خارج کر دیں!) سورج، چاند، ستارے، آگ وغیرہ۔ لیکن کسی عالم نے غالباً آج تک ان چیزوں کی تصویر کشی کی کبھی ممانعت نہ سمجھی۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ مسلمانوں سے ان چیزوں کی پرستش کی توقع ناممکن ہے تو میں عرض کروں گا کہ ایک صحیح اسلامی معاشرہ میں خدا کے سوا کسی ہستی کی پرستش کی توقع غلط ہے۔ اور بگڑی ہوئی سوسائٹی میں تو تصویر کیا معنی، مٹی اور پتھر بلکہ کاغذ اور لکڑی تک پوجے جاتے ہیں۔ مثلاً قبریں، تعزیئے وغیرہ! بس اگر قبر پرستی کے اندیشے سے مسلمان اپنے مُردے قبروں میں دفن کرنا نہیں چھوڑ سکتے تو بُت پرستی کے خطرے سے فوٹو گرافی جیسی مفید ایجاد سے فائدہ اٹھانا کیوں چھوڑ دیں؟ میں ایسے مسلم گھرانوں کو جانتا ہوں جن کے ہاں بے شمار خلافِ اسلام بدعات رائج ہیں، لیکن ان کے مرنے والوں کی یادگار تصویریں ان کے ہاں کسی احترام و تکریم کا درجہ نہیں پاتیں۔ صرف بطور یادگار کے دیواروں پر ٹنگی یا صندوقوں میں بند رہتی ہیں۔ پھر آپ کو اس قسم کی تصویر کشی پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔

ایک بہت واضح اور قطعی ثبوت تصویر کی حلت کا خود آپ کی اسی تحریر سے ملتا ہے۔ آپ سینما کو حلال سمجھتے ہیں کیونکہ اس میں تصاویر "غیر قائم" حالت میں ہوتی ہیں لہٰذا "ان کی نوعیت آئینے یا پانی کے عکس سے زائد کچھ نہیں۔" لیکن یہ بھی تو غور فرمائیے کہ اگر فوٹو گرافی نہ ہوتی تو سینما فوٹو گرافی جو اول الذکر ہی کی ارتقائی شکل ہے کہاں سے آسکتی؟ فرض کیجئے سینما کسی صحیح اسلامی معیاری سوسائٹی میں ایک خدا ترس مسلم سائنس داں ایجاد کرتا، یقیناً اس وقت بھی نہ صرف اسے حلال جانتے، بلکہ اس مفید ایجاد پر اُسے سراہتے بھی! لیکن اس کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ فوٹو گرافی جانے بغیر سینما ایجاد کرسکتا۔ گویا سینما کے موجد سے پہلے فوٹو گرافی کے موجد کا ہونا بھی لازمی تھا۔ پھر تو یہ عجیب اور مضحکہ خیز بات ہوتی کہ سینما کے "گلگلے" تو حلال مانے جاتے اور فوٹو گرافی کا "گڑ" حرام!

دراصل میری رائے میں علمائے حاضر کو اس معاملے میں مزید اجتہاد سے کام لینا چاہئے۔ آپ (اور دوسرے علماء) بالعموم حرمتِ تصویر کے قائل ہیں، صرف چند خاص صورتوں میں (جن کا آپ نے ذکر بھی کیا ہے) اسے جائز قرار دیتے ہیں، حالانکہ میری ناقص رائے میں معاملہ برعکس ہونا چاہئے، یعنی تصویر عام حالات میں جائز سمجھی جائے اور خاص صورتوں میں (جب اس سے بُت پرستی کا اندیشہ ہو) حرام۔ اس سلسلے میں میری تجاویز یہ ہیں:-

۱۔ فوٹو گرافی اور مصوری میں ایک بیّن فرق ملحوظ رکھا جائے۔ یعنی پینٹر سے انسانی تصویر کھنچوانا ممنوع قرار دیا جائے، سوائے (مثلاً) علم تشریح الابدان کی ضرورت کے لئے، یا سادہ پنسل سے کھینچے ہوئے خاکے (OUTLINES) کہ جن میں تفصیلی نوک پلک نہ ہو۔ نیز کارٹون یا مزاحی شاکہ (CARICATURE) بھی جائز سمجھا جائے، کیونکہ ان تمام صورتوں میں انسانی شخصیت سے وہ عنصر دور ہو جاتا ہے جو دلوں میں احترام کے بُت بنانے لگتا ہے۔

۲۔ گھریلو دلچسپی کی تصویروں کی برسرِ عام نمائش ممنوع قرار دی جائے۔ مثلاً کسی عظیم شخصیت کی بچپن یا لڑکپن (یا کسی زمانے) کی تصویریں جو محض گھر والوں نے اس کی یاد تازہ رکھنے کے لئے کھنچوائی ہوں، کسی صورت میں پبلک نہ کی جائیں، کیونکہ گھر والوں کے لئے اس شخصیت کی وہ عزت نہیں ہوسکتی جو عوام کے دلوں میں جڑ پکڑ کر انہیں پرستش کی طرف لے جاتی ہے۔

۳۔ پبلک کے آدمی کے لئے "پوز" بنا کر تصویر کھنچوانا قطعاً ناجائز سمجھا جائے۔ اگر فوٹو گرافر اس کی تصویر کھینچنا چاہے بھی تو ایسی حالت میں کھینچے جب اس کے چہرے اور ادا (GESTURE) سے کسی بشری کمزوری کا اظہار ہو رہا ہو، مثلاً وہ کسی سے باتیں کر رہا ہو اور اس وقت اس کا منہ کھلا ہوا ہو وغیرہ۔ کیونکہ پوز بنانے کی صورت میں لامحالہ وہ اپنے چہرے پر تقدس وغیرہ کی سی فضا پیدا کرنے کی کوشش کرے گا، اور یہی مصنوعی یا فطری تقدس یا جلال وغیرہ عوام کے ماحول میں جذبۂ پرستش و فنائیت پیدا کرتا ہے۔

۴۔ فوٹو گرافی ہو یا مصوری، اور جاندار چیز کی ہو یا بے جان کی، اس مشغلے کو دھن اور خبط تک پہنچنے سے روکنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔ جیسے یہ ہو کہ تصویریں کم سے کم اور لمبے وقفوں کے بعد کھنچوائی جائیں کہ صورت میں خاصا تغیر واقع ہو چکا ہو۔ مثلاً بیس سال کی عمر میں اگر کسی نے تصویر کھنچوائی تو آئندہ دس سال تک اور پھر اس کے بعد پچیس سال تک کوئی تصویر نہ کھنچوائے۔ بہرحال یہ مرزکا ہے کہ یہ شوق اسراف و تبذیر کی حد تک نہ پہنچے۔

مسئلہ تصویر پر اب تک جو کچھ لکھا جا چکا تھا کاش کہ وہ کافی ہوتا، کیونکہ ہمارے حریف کراچی میں بیٹھ کے پیچھے ہی جماعت اسلامی سے دل چسپ

رکھنے والے اسلام پسند غیر ملکیوں کو سوئے ظن میں مبتلا کرنے کے لئے جس ترکش سخن طرازی سے کام لیتے ہیں اس کا ایک تیر ملکہ "شہر تیر" بھی پروپگنڈہ ہے کہ یہ لوگ صدیوں پرانے نظام تمدن کو جوں کا توں لانا چاہتے ہیں اور حکومت کے خلاف ان کا معرکہ جن امور میں ہے ان میں سے ایک بڑا مسئلہ تصویر کا مسئلہ ہے۔ حالانکہ ہم نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں اس مسئلے کو کم سے کم معرکے کا مسئلہ کبھی نہیں بنایا۔ بلکہ ہماری کشمکش بنیادی اصولوں کو بدلوانے کے لئے ہے جن کے نتیجے میں تفصیلی امور خود بخود درست ہو سکتے ہیں۔ اب چراغ راہ میں اس مسئلے پر جس تواتر سے سوالات آرہے ان کے جواب لکھنے سے خواہ مخواہ یہ مسئلہ "معرکۃ الآرا" بن رہا ہے۔ پس اب کی جو کچھ لکھا جا رہا ہے بطور حرف آخر لکھا جا رہا ہے جس کا جی چاہے ہماری رائے سے اتفاق کرے اور جس کا جی چاہے اختلاف کرے۔

مجھے جو امور جواباً عرض کرنے ہیں وہ اجمالاً نمبروار درج ہیں :-

۱۔ حرمت تصویر کا حکم صریح حدیث نبویؐ میں ملتا ہے، لہٰذا جو لوگ اس حکم سے گردن چھڑانا چاہیں ان کے لئے ایک ہی ، ہے کہ وہ حدیث کے دین میں سند ہونے کا انکار کریں "الرسول" کو الگ رکھ کر صرف "الکتاب" کو اختیار کریں اور خدا و رسول جب عطف کے ساتھ آئیں تو حکومت وقت مراد لیں لیکن وہ کہ جن کے نزدیک حدیث نبوی قرآن کے اصولی احکام کے فریم میں شریعت کے تفصیلی احکام نصب کرنے والی سند ہے ان کو ماننا پڑے گا کہ مصوری پر قدغن ہے۔

۲۔ حکم کو مانتے ہوئے اس کی علت و حکمت کا کھوج لگانا اور اپنی عقل کو بھی حکم پر مطمئن کرنے کی کوشش کرنا بجائے خود بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن حکمت و علت کے سامنے نہ آنے پر ترک اطاعت یا قابل اطمینان نہ ہونے پر التوائے اطاعت کوئی صحیح رویہ نہیں ہے۔ چنانچہ حرمت تصویر کے حکم کی حکمت و علت کو اہل علم نے مشخص کرنے کی ایک کوشش کی ہے جس سے بعض لوگ پوری طرح مطمئن ہوں گے اور بعض نہ ہو سکیں گے۔ لیکن جو لوگ مسلم ہوتے ہوئے اس سے مطمئن نہ ہو سکیں ان کا کام یہ ہے کہ وہ ضروری معلومات جمع کر کے حکم کی حکمت و علت کو مزید وضاحت سے متعین کرنے میں دوسروں کے ساتھ تعاون کریں۔ نہ یہ کہ پہلے لوگوں کو مقابل کا ایک فریق بنا کر وہ حکم کو کالعدم یا قابل ترمیم بنانے پر زور استدلال صرف کر دیں۔ آپ خود ہی سوچئے کہ حرمت تصویر کے حکم کی حکمت وعلت اندیشۂ بت پرستی کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے؟

۳۔ سلیمانی تماثیل کے بارے میں دوسری توجیہ بالکل درست ہے کہ مصوری جو کچھ کی گئی ہو گی صحیح حدود کے اندر کی گئی ہو گی نہ کہ مطلقاً۔ آخر لفظ تماثیل سے تو عین بت گری بھی مراد لی جا سکتی ہے لیکن اسے ہم نہیں لیتے کیونکہ حدود شریعت میں اس مفہوم کی گنجائش نہیں ملتی، اسی طرح مصوری کی جس نوعیت کو شریعت اسلامی نے بعہد نبوی ممنوع قرار دیا ہے اسے کسی سابق پیغمبر سے بھی ہم منسوب نہیں کر سکتے جبکہ اس کی حکمت و علت حرمت اس پیغمبر کے دور میں بھی کچھ بڑھی ہوئی نہیں تو عام درجے میں ضرور موجود ہو۔

سابق انبیا کی سرگزشت کے اندر جو باتیں مبہم طور پر یا اشارۃً یا ضمناً بیان کی گئی ہوں ان کے ذریعے شریعت محمدی کی تفسیر کرنے کے بجائے صحیح طریقہ یہ ہے کہ شریعت محمدی کی صراحتوں کی روشنی میں ان کا مفہوم متعین کیا جائے۔ ورنہ بڑی خرابیاں پیدا ہوں گی۔

۴۔ نباتات میں ایک نوعیت کی روح کا ہونا جدید انکشاف ہی نہیں ہے بلکہ قرون ماقبل میں بھی اس کا شعور موجود تھا اور قرآن سے بھی اس کا ثبوت اخذ کیا جا سکتا ہے۔ بعد کے انکشافات نے تجربی دلائل کے ساتھ کچھ تفصیلی حقیقتیں کھول دی ہیں۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ جانداروں اور درختوں کی تصاویر یا ان کے مجسمے بنا بنا کر ان کو پوجنے کا رواج نہیں تھا، نہ اب ہے۔ لہٰذا ان کی تصاویر کی حرمت کی بحث بے کار تھی۔ وہ اشیاء کہ جن کے اصل وجود پوجے جاتے ہیں، مثلاً سورج، چاند، ستارے، درخت، پہاڑ، ہوائیں، برق و باراں، قبریں، آگ، چراغ، وغیرہ تو ان کی تصاویر کی ممانعت سے بے معنی بات کیا ہو سکتی تھی۔ آپ بھی اس نکتے کو سمجھ رہے ہیں اسی وجہ سے آپ پوچھتے ہیں کہ ایسی چیزوں کو شریعت نے مٹا دینے کا حکم کیوں نہ دیا، لیکن آپ یہ سمجھتے ہیں کہ کسی قانون کو ایک خطرے کے سدباب کے لئے

ہر جگہ ہر معاملے میں ایک ہی طریقہ اختیار کرنا چاہیے اور ایک ہی لاٹھی سے ہر صورتِ حالات کو ہانکنا چاہیے۔ یہ ایک بنیادی غلطی فکر ہے۔ قانون ایک ہی خطرے کے گھسنے کے مختلف دروازوں کی ماہیت کے فرق کو متعین کرتے ہوئے ہر ایک کو بند کرنے کے مختلف ذرائع اختیار کرتا ہے۔ مثلاً آگ ترچ سکتی ہے لیکن وہ آگ جلانے کو حرام نہ ٹھہرائے گا کیونکہ یہ ضروریات زندگی میں داخل ہے۔ اسی طرح قبریں ترچ سکتی ہیں لیکن وہ مردوں کو دفن کرنے سے روک کر ان کے جلانے یا پرانی قبروں کے اکھیڑ پھینکنے کے لئے کبھی امر نہ کرے گا بلکہ ان کے سامنے فعل پرستش کو جرم قرار دے گا۔ انسان تو یہاں تک جا سکتا ہے کہ غیر مرئی خیالی وجودوں کو پوجنے ڈالے، یہاں آکر قانون کی حدودِ عمل بالکل ختم ہو جاتی ہیں اور صرف تعلیم و تزکیہ کا میدانِ عمل باقی رہ جاتا ہے۔ یہ ایک بے تکا مطالبہ ہے کہ ہر صورتِ معاملہ سے اسلامی قانون ایک ہی طریق برتے۔ ایسا ہوتا تو یہ قانون ایک مضحکہ ہوتا۔

۵۔ معاشرہ چاہے کتنا ہی صحیح، معیاری اور اسلامی ہو، قانون کا کام ختم نہیں ہو سکتا اور نہ افراد کے بگڑنے کے دروازے کلیۃً بند ہو سکتے ہیں لہٰذا قانون موجود رہے گا۔

۶۔ اگر کسی مسلم گھرانے کا محتاط طرزِ عمل حلتِ تصویر کا دروازہ کھولنے کی دلیل ہو سکتا ہے تو اس شخص کا نمونہ جو شراب پی کر بہکنے نہ پائے شراب کے مباح ہونے کی دلیل بھی بن سکتا ہے۔ ا۔ ایسا سلوک آپ اسلامی قانون ہی سے کیوں کریں؟ آپ اپنے ملک کے مروجہ قانون پر بھی تو کچھ کرم فرمائیے، مثلاً آپ دائیں طرف گاڑی چلا کے دکھا دیجئے کہ آپ اتنے محتاط ہیں کہ کوئی حادثہ نہیں ہوا یا یا جہاں دس میل کی رفتار سے گاڑی چلانا لازم ہے وہاں آپ تیس میل پر چلا کر ثابت کر دیجئے کہ کوئی مفسدہ رونما نہیں ہوا اور پھر کہئے کہ ٹریفک کے ان قاعدوں کی کوئی ضرورت نہیں اور ان کا وجود لایعنی ہے۔

۷۔ فوٹوگرافی کی سائنس اور فوٹوگرافی، بلکہ مصوری کا ہنر بھی بجائے خود ناجائز نہیں ہے، اس کی ایجاد مبارک اور اگر کسی مسلم صالح کے ہاتھ سے ہوئی ہوتی تو مبارک تر! سوال صرف اس کے حدودِ جواز کا ہے۔

یقیناً اگر کیمرہ ایک مسلم معاشرہ میں ایجاد کیا گیا ہوتا تو فوٹوگرافی کے تجربات کا ارتقا شریعت کی حدود میں پابند ہونے کی وجہ سے بالکل دوسری سمت میں ہوتا۔ جیسے کہ خود مصوری کے معاملے میں ہوا کہ مسلمانوں میں ذوقِ جمال کو ذہن کی تخلیقی تحریک نے جب مرئی جامہ پہنانا چاہا تو اس کے لئے نقاشی کی راہیں کھلتی گئیں۔ گڑ کے حلال ہوتے ہوئے گلگلوں سے پرہیز بلاشبہ بے معنی ہے لیکن خمیر کے حلال ہوتے ہوئے شراب حرام ہی رہے گی!

۸۔ آپ کا "اجتہاد کرنا چاہیے" کا مشورہ کچھ اس انداز کا ہے کہ جیسے آپ اسلامی قانون کے علماء کو بجائے خود قانون سازی کے منصب پر فائز سمجھتے ہوں۔ احکامِ شریعت کا معاملہ ایسا نہیں کہ جیسے ایک مالک مکان سے کرایہ دار مطالبہ کرے کہ ذرا اس کی چار دیواری کو اور پھیلا دیجئے اور پھر منت سماجت کر کے زور دے کہ دیکھئے ناں مجھے کیاری بنانی ہے، چمن لگانا ہے، نہانے کے لئے ایک تالاب کی ضرورت ہے۔ کچھ تو اسے وسیع کرا دیجئے۔ اجتہاد یوں ہوا ہی نہیں کرتا کہ پہلے یہ تہیّہ کر کے آدمی چلے کہ کسی معاملے میں حدودِ حلت کو وسیع کرنے جا رہے ہیں اور پھر یوں موہ جائے کہ کہاں کہاں کس کس طرح کی تاویل کام دے سکتی ہے۔ یہ راستہ تجدد کا ہے اور خواہشات پرستی اور عدمِ تقویٰ کے مراحل سے گزرتا ہوا سیدھا تلاعب بالدین کے غار کی طرف جاتا ہے۔ جہاں تک تمدن کی حقیقی اور شدید ضروریات کا تعلق ہے تصویر اور فوٹو دونوں کو استعمال کرنے کے لئے پہلے ہی اجتہادی تعبیر موجود ہے لیکن جو صاحبِ اجتہاد بھی نص کے کھونٹے سے بندھا ہوا ہوگا وہ آخر وہیں تک تو جائے گا جہاں تک رسی جانے دے ——— چاہے کتنی ہی لجاجت سے اسے کہا جائے کہ کچھ تو اور آگے چلئے!

۹۔ آپ کی تجاویز میں بڑی دلچسپیاں موجود ہیں۔ نمبر ایک تو درست ہے۔ مزاحی خاکے مزاح کی حدود سے گزر کر تحقیر اور بیہودگی کی حد تک

استفسارات

جانے چاہئیں۔ نمبر دو حکم صریح کی خلاف ورزی ہے اور اس کی کوئی گارنٹی نہیں کہ ایک گھر کے لوگ اپنے بزرگوں، خصوصاً ایسے بزرگوں کے جو درویش صوفی یا پیر قسم کے ہوں یا کوئی بڑا کارنامہ سرانجام دے گئے ہوں، غیر معمولی جذبۂ احترام نہ پیدا ہو۔ علاوہ بریں جب کسی شخص کی پرستش کا جذبہ ابھرتا ہے تو اس کی تصاویر کی جستجو ہونے لگتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کی تصاویر برسرِ عام نمائش یا فروخت یا آرائش کے لیے نہ رکھی جائیں بلکہ چھپنے بھی نہ پائیں لیکن لوگ اس کے گھر پہنچ پہنچ کر زیارت۔۔۔ سے شاد کام ہونا شروع کر دیں۔ نمبر تین میں تو آپ نے خالص شاعری کر دی ہے، آخر قانون اس امر کا تصفیہ کیسے کرے گا کہ "پوز" بنایا گیا تھا یا سرسری حالت تھی ——— ادھر فوٹوگرافر پر یہ مضحکہ انگیز قانونی پابندی ہو گی کہ وہ اس انتظار میں رہے کہ کب حضرت کا منہ کھلا ہوا ہو یا کوئی اور بے ڈھب پن طاری ہو اکہ وہ کلک کرے۔ پھر یہ بھی سوچیے کہ آدمی کی تصویر بدہیئتی میں لینا آخر فطری جذبۂ جمال کو کہاں تک گوارا ہو گا۔ یہ مذاق انسانی ذوق کہاں تک سہ سکے گا کہ آدمی کی تصویر لیتے ہوئے اس کی بہترین حالت کو چھوڑ کر اس کی بدتر حالت کو اختیار کیا جائے۔ نمبر چار میں تو واللہ آپ نے حد کر دی۔ یہ جو وقفے آپ نے مقرر کر دیئے ہیں، ان کا تقاضا تو یہ ہو گا کہ ہر آدمی کے پاس فوٹوگرافی کا ایک "راشن کارڈ" یا پرمٹ ہونا چاہیے جس میں باقاعدہ اندراج ہو اور فوٹوگرافروں کو لازماً لائسنس ہولڈر بنایا جائے اور اس طرح ایک مستقل محکمہ فوٹوگرافی کی نگرانی کے لئے موجود ہو۔

ایسے مذاق اگر آپ عمل میں لائیں گے تو یقین جانئے کہ ان کی لایعنیت بہت جلد نمایاں ہو جائے گی، لیکن ان سے لوگ بگڑ کر جب گامزن ہوں گے تو پیچھے ہٹ کر حرمت تصویر کے حکم پر نہیں قائم ہوں گے بلکہ آگے بڑھ کر تصویر کی اباحت مطلقہ کا دروازہ کھولیں گے جبکہ جذبات و خواہشات ان کو پہلے ہی ادھر لے جانا چاہتی ہیں اور مغرب کا تصویری تمدن پورا پورا دباؤ ان پر ڈالے رہا ہے۔ ایک مرتبہ حرمت کے حکم کے مقابلے میں ذہنوں کو آزادی کا میدان وسیع کرنے دیجئے، پھر دیکھئے کہ اس حرمت کا جذبۂ احترام جو نہی کمزور پڑا اسار سے بند کھل جائیں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان گزارشات کو اگر آپ حرف بحرف قبول کرنے کے قابل نہ سمجھیں تو بھی ان میں آپ کے طرزِ فکر پر اثر انداز ہونے والا مواد موجود ہے۔ باقی آپ آزاد ہیں کہ دونوں پہلو سامنے رکھ کر اپنے لیے خدا و رسول کی رضا سے اوفق راستہ کس کو قرار دیتے ہیں۔

آج کل تو علماء کی بہت تعامی تعداد تصویر (فوٹوگرافی) کی حلت کی قائل ہو گئی ہے۔ والد مکرم سے معلوم ہوا تھا کہ مصر کے علماء اس کی دلیل اس آیت سے دیتے ہیں الم تر الی ربك كيف مد الظل ولو شاء لجعله ساكنا۔ ان کے نزدیک فوٹو دراصل وہ سایہ (ظل) ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ساکن کر دیا ہے اور اس سے میری اس بات کی تصدیق بھی ہوتی ہے کہ فوٹو اور مصوری میں فرق سمجھا جائے۔ اگرچہ یہ دلیل میرے دل کو نہیں لگتی، کیونکہ بہرحال فوٹو کوئی سایہ (SHADE) نہیں، عکس (IMAGE) ہے۔ نیز مصر کی جماعت اخوان کا آرگن الدعوۃ بھی آپ کی نظر سے بھی گزرا ہو گا۔ اس میں ان کے زعماء کے فوٹو برابر ہوتے ہیں۔ آپ کہیں گے کہ آپ ان کے اجتہاد کے پابند نہیں، لیکن کم از کم اس سے اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلے میں اجتہاد کی گنجائش ہے، ورنہ تحریک اخوان جو خالص اسلامی انقلاب لانے کی مدعی ہے، اس فوٹوگرافی کو اپنے ہاں جگہ نہ دیتی[1]۔

علماء کی بہت اعلیٰ تعداد اس کی بھی قائل ہو چکی ہے کہ گنبدِ سے گندے طاغوتی نظام کی اطاعت و خدمت کی جا سکتی ہے، آیات بھی جا سکتی ہیں، احادیث سے کھیلا جا سکتا ہے، مسلمانوں کی تکفیر کی جا سکتی ہے، اقامتِ دین کی تحریک سے ٹکر لی جا سکتی ہے اور اسلام کے دشمنوں سے سازشیں کی جا سکتی ہیں۔

---

[1] یہ سوال بھی اوپر کے سوال کے مضمون ہی کا ہے اور دونوں کے چند دن کے فرق سے موصول ہوئے تھے۔

رہے مصر کے علماء تو وہ جس "حالتِ اضطرار" میں ہیں اسے کون نہیں جانتا۔ مسلمان ملکوں میں اسلام اور مغربی تہذیب کی کشمکش سے بُرے اثرات قبول کرنے میں، غیر اسلامی افکار و روایات سے مرعوبیت میں اور اخلاقی و ذہنی فساد میں جو ممالک پیش پیش ہیں بدقسمتی سے مصر ان سب کا بھی امام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان ممالک میں متجددین کا تسلط اتنا زیادہ ہے کہ علماء اور دینی تحریکیں تک کسی نہ کسی حد تک ذوقِ تجدد کا مظاہرہ کئے بغیر کوئی کام کرنے کا راستہ نہیں پاتیں۔ معاملہ ایک تصویر ہی کا نہیں، موسیقی، پردے، ڈاڑھی اور بعض دیگر مسائل میں بھی وہاں "سفینۂ اجتہاد" پر تقریباً اجماع ہو چکا ہے۔ اگر یہ چیز بھی وجہ استدلال ہے تو نہ جانے کن کن امور کو "منصوص" کی سطح سے اتار کر "اجتہادی" کی سطح پر لانا پڑے گا ـــــ واضح رہے کہ ہر وہ مسئلہ جس پر کوئی اختلاف کھڑا کر دیا جائے لازم نہیں کہ اسے اجتہادی قرار دے دیا جائے۔

اور اگر مصر والوں کی دلیل وہی ہے جو علمائے مصر نے بیان کی ہے تو پھر تو سبحان اللہ! ـــــ جیسے اجتہاد ویسے دلائل!

سورۂ فرقان نکال کر دیکھئے کہ یہ آیت وہاں کیا بتانے آئی ہے؟ یہ آیت جس پیراگراف کے آغاز میں وارد ہے وہ ان الفاظ پر ختم ہوتا ہے کہ ویعبدون من دون اللہ ما لا ینفعھم ولا یضرھم وکان الکافر علی ربہ ظھیرا۔ یعنی یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر ان کے بندے بنتے ہیں جو ان کو نہ نفع پہنچا سکیں نہ نقصان! یہ بات اللہ تعالیٰ نے اپنے احسانات گنوانے کے بعد کہی کہ تمہاری ساری ضروریات تو ہم پوری کریں اور تم ہمیں چھوڑ کر ان کو خدا بنا ؤ جو بے نفع اور بے نقصان ہیں۔ اب اُس پہلی آیت کو لیجئے کہا گیا ہے کہ اپنے رب کے اس کرشمے پر غور نہیں کرتے کہ کیسے سائے کو پھیلاتا جاتا ہے ـــــ اور اگر ہم چاہتے تو اسے ساکن کر دیتے ـــــ (نہیں بلکہ) اسے ہم آفتاب (کی گردش کے) تابع کئے ہوئے ہیں، سو ہم کس سہولت سے اس کو اپنی طرف سمیٹ لیتے ہیں۔ یہ لطیف ادبی اندازِ بیان جس حقیقت کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے وہ اگلے جملے میں اشارے کا پیرایہ چاک کرتی ہوئی بالکل صاف صاف سامنے آجاتی ہے کہ یہ اللہ ہی کا فضل ہے کہ اس نے تمہارے لئے رات کو ایک طرح کا لباس (حجاب) اور آرام کی نیند کا ذریعہ بنایا اور دن کو (کام کاج کے لئے) پھیل نکلنے کے لیے مخصوص کر دیا۔

اب بات صاف ہے کہ یہ جو اللہ تعالیٰ کا انتظام کہ سایہ پھیلتا ہے اور پھر سمیٹ لیا جاتا ہے اور اس کی حرکت سورج کی حرکت کے تابع کر دی گئی ہے یہ حکیمانہ نظم اس لئے ہے کہ تمہارے اوقات دن اور رات میں تقسیم ہوں اور تم کام کے وقت کام اور آرام کے وقت آرام کرتے ہوئے زندگی کر سکو ـــــ ورنہ اگر ہم چاہتے تو سائے کو ساکن کر دیتے یعنی ایک غیر مختتم رات زمین پر مستطار رہتی ہے اور تمہارے زندہ رہنے بلکہ پیدا ہونے ہی کا کوئی امکان نہ تھا۔

اب ذرا سوچ کر بتائیے کہ اس جگہ سے فوٹو کے لیے کیا دلیل ـــــ اشاراتی دلیل سہی ـــــ اخذ ہوتی ہے۔ کوئی تُک ہے بھی؟

پھر یہ بڑا ہی عجیب قسم کا فرق ہے جو آپ موقلم سے تصویر بنانے اور کیمرے سے بنانے میں پیدا کرنا چاہتے ہیں اور مطالبہ ہے کہ قانون بھی اس فرق کو مانے۔ سوال یہ ہے کہ موقلم کی تصویر میں اگر کوئی فتنہ قابلِ تسلیم ہے تو کیمرے کی تصویر کا اس سے پاک ہونا کس دلیل سے ثابت ہوگا؟ کیا محض "مدّ الظل" اور "سلکنا" کے الفاظ قرآن میں نکال کر دکھا دینے سے؟ ایسے پُرلطف استدلال اگر دین میں معتبر ہوں تو پھر ایک شخص کے سامنے جب وہ حدیث پیش کی جائے گی کہ نبی صلعم نے سود کی تحریروں کو لکھنے سے روکا ہے تو وہ حدیث میں "کتابت" کے لفظ کو پیش کر کے نہی کو محدود کرے گا اور ٹائپ رائٹر سے "سود ناموں" اور سودی حسابات کو ٹائپ کر لینے کو حدیث کی زد سے باہر نکال لے جائے گا۔ یہ مذاق اگر قانون کے ساتھ روا رکھا جائے تو کس قاعدے کو پناہ مل سکتی ہے۔ مثلاً آج آپ کے

ملک میں قانوناً یہ حکم رائج کیا جاتا ہے کہ ملک کی کسی سرکاری عمارت کی تصویر حدودِ ملک سے باہر نہ بھیجی جائے ورنہ اندیشہ ہے کہ دشمن جنگی
مقاصد کے لئے فائدہ اٹھائے ——— تو کیا آپ یہاں بھی یہ سوال پیدا کر دیں گے کہ تصویر موقلم کی ہے یا کیمرے کی؟ پھر اگر شریعت اسلامیہ
میں حرمتِ تصویر کا حکم ہے، اور بت پرستی کے استیصال کے لئے ہے تو اس حکم کی تعمیل کرنے والے کے دل میں یہ سوال کیسے پیدا ہو جاتا
ہے کہ تصویر موقلم کی ہے یا کیمرے کی؟
ادیب کی ایک تحریر کا اقتباس ہے کہ اگر فوٹو گرافی کا مسئلہ نکالنا ہی ہو تو ذرا غور کیجئے کہ خدا تعالیٰ تو یہ کہے کہ اگر ہم چاہتے تو ہم سائے کو ساکن کر دیتے (اور
اس کے بعد محذوف یہ ہے) لیکن ہم نے بڑے اہم مصالح کے پیش نظر ایسا نہیں کیا۔ اس سے تو صراحۃً فوٹو کی ممانعت کا مفہوم اخذ ہوگا۔
دراصل ایسے ہی عجیب قسم کے استدلال تجدد کی ماہیت کو بے نقاب کیا کرتے ہیں۔

تحریکِ اسلامی اور فرقے

قرآن کریم ایک محفوظ کتاب ہے جسے اللہ کی طرف سے محمد رسول اللہ لے کے آئے ہیں۔ اس بنیادی حقیقت کو مانتے ہوئے ہر گروہ کے لوگوں نے اس سے مختلف تعلیمات اخذ کی ہیں۔ آخر یہ مختلف معیاراتِ اخذ و ترک کہاں سے آئے؟

جماعت اسلامی کو جو نظام اسلامی کے قیام کی داعی ہے، ایک ایسی قدرِ مشترک پیش کرنی چاہئے جو سب فرقوں کے نزدیک قابلِ قبول ہو۔ لیکن ایسا نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ جماعت اسلامی میں ایک یا دو فرقوں کے لوگ شامل ہوئے ہیں۔ میرا یقین ہے کہ جب تک ایسی فراخی نہ رکھی جائے کہ ہر ایک فرقہ کا فرد بہ اطمینان اپنے مخصوص اصولِ فکر کے ساتھ ایک ہی صف میں شامل ہو سکے اس وقت تک تحریکِ اسلامی کا کامیاب ہونا مشکل ہے۔

قرآن کریم ایک محفوظ کتاب تو ہے لیکن ہر سینے میں قلبِ سلیم محفوظ نہیں ہوتا۔ بس جو کوئی عالمِ قرآن میں جس نیت کے ساتھ داخل ہوتا ہے اسی نیت کے مطابق اس میں سے حصہ پاتا ہے۔ یہی قرآن ایک طرف کفر و نفور کو تند تر کر دیتا ہے، یہی دوسری طرف قلب میں وہ گداز پیدا کرتا ہے کہ آدمی کی کایا پلٹ جاتی ہے۔ اسی کوثر سے کچھ لوگ خلوص کے کوثر سے اپنا جام بھرتے ہیں اور کچھ وہ ہوتے ہیں کہ بادۂ نفاق کے سوا ان کے پیالے میں کسی اور چیز کی ایک بوند تک نہیں گرنے پاتی۔ ایک دودھاری تلوار کی طرح یہ یضل بہ من یشاء و یہدی بہ من یشاء کے دو متضاد کرشمے بہ یک وقت دکھاتا ہے۔ اہلِ زیغ اس کی طرف لپکتے ہیں تو ان کو اس میں زیغ کے سوا کچھ نہیں ملتا اور طالبانِ ہدایت آگے آتے ہیں تو وہ اس کے لفظ لفظ سے ہدایت ہی پاتے ہیں۔

جماعت اسلامی تو کیا، اللہ کے انبیاء بھی یہ نہ کر سکے کہ دنیا بھر کے، بلکہ خود اپنی قوم کے تمام ہی لوگوں کو ایک معیارِ مشترک پر جمع کر دیں، بلکہ جن کو جمع کیا جاتا رہا ان کو بھی بعد میں بغی و طغیان کے محرکات نے پارہ پارہ کر کے رکھ دیا اور کل حزب بما لدیہم فرحون کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اگر ایک خدا، ایک نبی اور ایک کتاب جیسی ٹھوس "قدرِ مشترک" اور اسلام کا کلمہ سب لوگوں کو ایک نہیں کر سکتا تو اور کونسی قدرِ مشترک ایجاد کیجئے گا کہ وہ اس کمی کو پورا کر دے۔

جماعت اسلامی میں کسی فرقے کے لوگ جمع نہیں ہیں بلکہ اس کے دروازۂ رکنیت سے داخل وہی ہوتا ہے جو فرقہ واریت کی گرد کا ہر ذرہ دامن سے جھاڑ کے آئے۔ ہاں اگر مدعا یہ ہو کہ لوگ کچھ دوسرے فرقوں سے نکل کر آ رہے ہیں تو یہ صورت ایک دو فرقوں کے لئے

خاص نہیں ہے بلکہ قریب قریب ہر فرقے سے ہمیں کچھ نہ کچھ "چندہُ افراد" ملا ہے۔ یہاں ہر پہاڑ سے کی دی ہوئی اینٹیں ہیں جو جماعت اسلامی کے نقشۂ تعمیر میں فٹ ہو رہی ہیں۔ باقی رہی یہ صورت کہ مخالف فرقوں کے افراد کو ان کے مخصوص افکار و اعمال کے ساتھ جمع کیا جائے تو یہ اگر کوئی مفید صورت ہوتی تو یہ پہلے ہی سے موجود ہے کہ ملتِ اسلامیہ کے دائرے میں ہر قسم کے لوگ موجود ہیں اور ماشاء اللہ اس جڑیا گھر کی فراخیاں قابلِ دید ہیں۔

یہ سمجھ لیجئے کہ لوگوں کے انتشار اور فرقہ وارانہ ذہنیتوں کو کلامی اور مناظرانہ سرگرمیاں کبھی بھی ختم نہیں کر سکتیں، اس مرض کا علاج اقامتِ دین کی تحریک کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ یہ تحریک تمام فرقوں کو تین گروہوں میں ڈھالے بغیر نہیں رہتی، ایک وہ جو اہلِ خلوص ہوں سو وہ لپک کے اس کا علم اٹھا لیتے ہیں، دوسرے وہ جو بندگانِ مفاد ہوں یا نشۂ اشکبار کے مست سو یہ اس خطرے کے خلاف مورچہ بندیاں کر کے اعلانِ جنگ کر دیتے ہیں اور تیسرے وہ جو شکوک و شبہات میں مبتلا ہوں یا جمود زدہ ہوں۔ پھر دوسرا مرحلہ وہ آتا ہے کہ مذبذبین بھی آہستہ آہستہ اوپر کے دو گروہوں میں شامل ہو جاتے ہیں اور دو ہی گروہ رہ جاتے ہیں۔ آخری مقام وہ ہوتا ہے کہ یا اہلِ حق پورے غلبہ کے ساتھ باقی رہتے ہیں، یا اہلِ باطل وقتی طور پر اہلِ حق کا قلع قمع کر دکھاتے ہیں۔

جس معنی میں آپ چاہتے ہیں کہ تحریکِ حق ایکا قائم کر دے اس کا کوئی امکان نہیں ہے۔ تحریکِ حق تو بہت سے لیکے توڑنے ہی کے لئے آتی ہیں اور وہ بقول عیسیٰ علیہ السلام ایک ایک گھر کے پانچ افراد میں سے دو کو تین سے اور تین کو دو سے لڑا دیتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک صالح ایکے کی صبح افقِ تاریخ سے ظہور کرے۔

خارج از بحر

اس ماہ کا چراغِ راہ دیکھا۔ شمیم جاوید صاحب کی نظم "پنجاب" (الیکشن کے بعد) پڑھی۔ اس میں چند مصرعے وزن سے خارج معلوم ہوتے ہیں۔ اصل وزن اور بحر جس میں نظم کہی گئی "ہزج مسدس اخرب مقبوض مقصور" ہے۔ اس کا پیمانہ مفعول مفاعلن فعولن (ہر شے پہ جمود سا ہے طاری)

لیکن ان مصرعوں کو دیکھیے :-

ع۔ انسانیت دم بخود پڑی ہے ع اسلامیت کا حسین ہالا ع اک پیرِ مغاں کے ہاں پر بیعت۔

آپ نے جو گرفت فرمائی ہے وہ بالکل درست ہے شمیم صاحب سے بھی کوتاہی ہوئی لیکن چراغ راہ کی کوتاہی شمیم صاحب سے بھی کچھ زیادہ ہی ہے نظم سرسری طور پر دیکھی گئی اور شاعر پر اعتماد ہونے کی وجہ سے کاتب کے حوالے کر دی گئی۔ آپ کے توجہ دلانے پر بہت ہی شکر گزار ہوں۔

نماز میں ترجمۂ قرآن

قرآن ایک انقلابی تحریک کا حامل ہے جس کا نزول اگرچہ عربی زبان میں ہوا لیکن اس کا خطاب تمام اقوام سے ہے۔ افسوس کہ اس کی تعلیم کو دوسری زبانوں میں فروغ دینے کا کما حقہٗ اہتمام نہ ہو سکا۔

اس وقت سوال یہ درپیش ہے کہ پھر جیسا ایک عامی نماز میں شامل ہوتا بھی ہے تو وہ جو کچھ خود پڑھتا ہے اور جو کچھ

اس کا امام پڑھتا ہے اسے جانے بغیر کورس کا کورا ملیٹ آتا ہے۔ مادری زبان میں نماز ادا کرنے کا میں قائل نہیں ہوں۔
قرآنِ کریم زبانِ نزولی میں اصل ہے، باقی ترجمہ۔ اور ترجمہ اصل کے برابر قرار نہیں دیا جا سکتا۔
ماسوائے تلاوت کے باقی اجزائے نماز مستقل حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر ایک مسلمان کو ان اجزا کا ترجمہ یاد کرا دیا جائے اور پھر امام نماز قرآن کا ایک حصہ تلاوت کرنے کے بعد اس کا مفہوم آسان مقامی زبان میں پڑھ دیں تو کیا یہ جائز نہیں؟ اس صورت میں قرآن کا پیغام کیا عام نہ ہو جائے گا۔
میں خود قعدۂ نماز کی حالت میں درود شریف اور دعا کے بعد بسا اوقات بے اختیار اپنی زبان میں دعا بھی کرتا ہوں؟ کیا اس میں کوئی حرج تو نہیں!

یہ صورت اپنی جگہ بجا کہ نماز سمجھ کر پڑھنے کی تدابیر اختیار کی جائیں لیکن نماز کے اندر قرآن کی آیات اور نماز کی مقررہ عبادات کی جگہ ان کے ترجمے داخل کرنا بہت سے خطرات اپنے اندر رکھتا ہے۔ مثلاً قرآن اور نماز کے جن کلمات پر آج کسی فرقے کے مسلمان کو اختلاف نہیں ہو سکتا، انہی کے سامنے جب ایک زاویۂ نگاہ سے کیا ہوا ترجمہ آئے گا تو وہ نماز تو کیا پڑھے گا منہ نوچے گا، مسجدیں دنگل بن جائیں گی۔ اور فرقہ وارانہ حس تیز سے تیز ہوتی چلی جائے گی۔ ہر فرقے کے ہاں نماز کے ترجمے اور آیاتِ قرآن کے مختلف ترجمے رائج ہو جائیں گے اور رہی سہی یکسانی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ بعض اور چیزیں بھی ہیں جن کا تذکرہ کرنا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

آپ جس چیز کو چاہتے ہیں اس کی صحیح صورت یہ ہے کہ ہر مسجد میں اس امر کا اہتمام ہو کہ نمازی نماز اور نمازوں میں پڑھی جانے والی عام سورتوں کا ترجمہ سیکھیں، نیز مساجد میں درسِ قرآن کا انتظام ہو کہ قرآن کے پیغام سے ربط پیدا ہو جائے۔ علاوہ بریں خطباتِ جمعہ کے ذریعے بھی بہت کچھ کام ہو سکتا ہے۔

دوسری طرف کم سے کم تعلیم یافتہ طبقے کے لوگ جو دینی حس رکھتے ہیں وہ بطور خود ذرا سی توجہ صرف کر کے اتنی عربی بآسانی سیکھ سکتے ہیں کہ وہ کلماتِ نماز اور قرآن کا مدعا سمجھ سکیں۔ اگر یورپ اور برطانیہ کے اوسط درجے کے ہر آدمی کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ بطور خود ایک یا ایک سے زائد زبان (فرانسیسی، جرمنی یا فرنچ) محض علمی یا کاروباری مقاصد کے لئے سیکھ لے تو آخر کسی مسلمان کے لئے کیوں یہ مشکل ہے کہ وہ بطور خود اپنی دینی ضروریات کے لئے عربی زبان سے واقفیت پیدا کرے۔

آپ کا قعدۂ نماز میں مادری زبان میں دعا کرنا ایسا فعل ہے جس کے بارے میں میں قطعی بات کہہ نہیں سکتا۔ یہ صورت قطعی ناجائز بھی نہیں معلوم ہوتی اور شرح صدر سے اسے جائز بھی نہیں کہا جا سکتا۔ آپ اس تجربے کو اگر کریں بھی تو براہ کرم نفل نماز کی حد تک کریں لیکن فرض نماز کی صورت میں خاتمۂ نماز پر جیسے جی چاہے دعا مانگیں، بیچ میں گڑبڑ نہ کریں۔

مسائلِ زمانہ

انڈیا کا جنگی ہسٹریا اور پاکستان

وہ دُنیا کہ جس میں کسی اخلاقی معیارِ خیر و شر کو باقی نہ چھوڑا گیا ہو، اور قوت خود ایک اصول بن جائے اس میں آپ بجز اس کے کسی چیز کی توقع کر سکتے ہیں کہ جنگ کا شیطان بار بار اپنا خونی ناچ ناچے، اور امن و سکون کے لاشے گوشے گوشے میں تڑپتے نظر آئیں۔ جہاں اجتماعی زندگی کی باگ ڈور الحاد اور نیشنلزم جیسے عفریتوں کے ہاتھوں میں ہو وہاں اس کے سوا اور ہو گا کیا کہ بات بات پر تلواریں میان سے نکل آئیں۔ آج کرۂ ارضی پر امن ایک نئی جنگ کی تیاریوں کے وقفے کا دوسرا نام ہے اور قوموں کی تمام سیاسی، علمی، مالی اور صنعتی پالیسی جنگی نقطۂ نظر کے سانچے میں ڈھل کر تیار ہوتی ہے۔ جنگ کو بقا کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے، جنگ کو ترقی کا وسیلہ گردانا گیا ہے اور جنگ کو امن برپا کرنے کا سامان قرار دیا جا رہا ہے۔

ہر دماغ جو دورِ حاضر کے نظامِ تعلیم میں ڈھل کے آتا ہے اور بین الاقوامی سیاسی کشمکش کا ماحول جس کی تربیت کا گہوارہ بنتا ہے اس کے تکمیل پذیر ہونے سے قبل اس میں خدا ناشناسی، اخلاقی حس سے دوری، بندگیٔ مفاد، قوم پرستی، زعمِ قوت اور جنگ پسندی کی چڑیلیں خوب اچھی طرح انڈے دے لیتی ہیں۔ پھر ان انڈوں سے بچے نکلتے ہیں اور فضا میں پرفشاں ہوتے ہیں تو ساری دنیا کا سکون ہل جاتا ہے۔ اس قسم کے دماغ ہیں کہ جن کی بظاہر بہت سی غیر جنگی حرکات ہوتی ہیں کہ جن کے اندر جنگ کے کتنے ہی مادے مخفی ہوتے ہیں۔ تاریخ میں ان کے فکری و سیاسی کارنامے سخت زلزلہ انگیز قسم کے ڈائنا مائٹ بچھا دیتے ہیں اور جب وقت آنے پر وہ پھٹتے ہیں تو بمشکل کوئی اس کا اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ کس بزرگ کے بوئے ہوئے بیج برگ و بار لا رہے ہیں۔

اور آج کون حساب لگا سکتا ہے کہ پاکستان اور ہندوستان کے تعلقات کی فضا میں جنگی محرکات کے شیاطین نے کتنے کچھ انڈے دے رکھے ہیں اور ان محرکات کو وجود میں لانے اور پالنے والی تاریخ خود کن کن ہستیوں کی چھاتیوں کا دودھ پی کر پلی ہے۔ بہت سے مہذب لوگ، بہت سے مفکر، بہت سے اہلِ علم، بہت سے سیاسی اکابر، بہت سے ادب و صحافت کے اہلِ فن، بہت سے مذہبی رہنما، بہت سے شعراء، بہت سے سوشل ورکر کہ جن کی بڑی قدر کی جاتی ہے اور جن کے بڑے گُن گائے جاتے ہیں جنگی رجحانات کے اصل کاشتکار اور تصادمی نفسیات کے اصل مالی ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جنھوں نے برِعظیم ہند کی دو قوموں کے مزاج میں جنگی ہسٹریا کا خمیر ملا دیا ہے۔ اس ہسٹریا سے مستقبل کو بچا نکالنے کے لئے کچھ قوتیں بڑے خلوص سے دونوں طرف جد و جہد کر رہی ہیں مگر افسوس کہ اس ہسٹریا کے سمر پرستوں کے سامنے ان کی کچھ پیش نہیں جاتی۔

انڈیا کی حکومت کا دماغ آج کل اس ہسٹریا کی زد میں ہے۔ اور بیٹھے بٹھائے نہ جانے ہمارے پڑوسی ملک کے اکابر کو کیا سوجھی کہ اپنی فوجی قوت کو انھوں نے پاکستان کی سرحد پر منتقل کر دیا۔ پاکستان کے باشندوں تک ہوا کی لہروں کے ذریعہ یکا یک یہ پیغام اُڑتا ہوا آیا کہ ایک خطرہ ان کو چیلنج کر رہا ہے۔ ہندوستان کی حکومت نے دراصل اسی دن ایک جنگ کی کاشت کر دی تھی جس دن اس نے جوناگڈھ اور کشمیر پر جابرانہ تسلط کا نامعقول فیصلہ کیا اور پھر جس روز اس نے حیدر آباد کے حق خود اختیاری کے سینے میں اپنی سنگین

جونک دی۔ پاکستان اسلام کے دئے ہوئے نورِ ضمیر کی وجہ سے انڈیا کو جنگ کے ہسٹریا سے بچانے کے لئے کتنی ہی کوششیں کیوں نہ کرے اور مسائل کے تصفیہ کے لئے پرامن راہیں کھول کھول کے کیوں نہ دکھائے وہاں جن مفاسد کو ایک ایک سینے میں بو دیا گیا ہے اور جن چیرہ دستیوں اور مفاد پرستیوں کے بیج ایک ایک ذہن میں ڈالے جا چکے ہیں وہ کبھی نہ کبھی پھوٹیں گے اور اپنے گل کھلائیں گے۔ آپ نیشنلزم کی فصل کے پھیلنے کو آج سے کل پر ٹال تو سکتے ہیں لیکن یکسر روک نہیں سکتے۔

انڈیا کے جنگی ذوق کو جن چیزوں نے پروان چڑھایا ہے، ناگزیر ہے کہ ان کا ایک جائزہ لے لیا جائے۔ اولین اور اصل بہانے فساد تو بادہ پرستانہ قومی حس ہے۔ یہ قتالہ جہاں بھی پائی گئی ہے وہاں جنگی ہسٹریا کے دورے لازماً پڑے ہیں۔ پھر اس کیفیت کے ساتھ مزید جو فتنہ ہاتھ میں ہاتھ ملائے گامزن ہے وہ پاکستان کے مقابلے میں زمین کی وسعت، آبادی کی کثرت اور ذرائع و وسائل کے زائد ہونے کا کبر ہے۔ اس کبر کے شیطان کو ایشیا کی امامت کی خواہش نے دھتورہ پلا کر مزید بپھرا دیا ہے! دھرم پاکستان کے ذوقِ امن پسندی کو انڈیا کے اس کبر نے کمزوری پر محمول کر کے اپنی عقل و دانش کو بالکل چرخ چڑھا دیا ہے۔

پھر ستم یہ ہوا کہ امریکہ اور برطانیہ میں پنڈت نہرو اور لکشمی پنڈت نے دورِ غلامی میں انڈیا کی جو دھاک بٹھائی تھی وہ گاندھی جی کی وفات کے بعد پیدا ہونے والی صورتِ حالات نے آزادی کے موسمِ بہار میں بالکل ختم کر کے رکھ دی ہے۔ بلکہ الٹا مغرب کے "معشوقِ اسپید" نے "برہمن ہنکل" کے مقابلے میں اس کے رقیب "فرزندِ حرم" کے لئے اپنی آغوش بہ زیادہ شوق سے وا کر دی ہے۔ کیونکہ ادھر کا ذوقِ بت پرستی کچھ زیادہ ہی لذیذ ہے۔۔۔۔۔ اس وجہ سے کہ فرزندِ توحید جب کسی بت کے آگے سجدہ ریز ہوتا ہے تو اسے خداوندی کا پورا پورا مزہ ملتا ہے۔ بہرحال یہ حادثہ چڑچڑاہٹ کے لئے اور زیادہ تازیانہ ثابت ہوا۔

انڈیا کے کچھ داخلی احوال بھی ہسٹریائی کیفیت میں اُبال پیدا کرنے والے ہیں۔ معاشرتی اونچ نیچ کی کھینچ تان، معاشیات کے چمن زاروں میں صیادوں اور گلچینوں کی سرگرمیاں، کمیونزم اور سرمایہ داری کی کشمکش، بھوک اور بے روزگاری کا مسئلہ، نامعقولی، کثرت اور بے بس اقلیت کا معرکۂ جبر و صبر، اور ان سب سے بالا رام راجی نظریئے اور جمہوری فکر میں تصادم ـــــــ یہ وہ حالات ہیں کہ سرزمینِ ہند اپنے باسیوں کے لئے دوزخ بن گئی ہے اور اب اس دوزخ کے دوزخی اس کے کارپردازوں کا منہ نوچنے تک کی جرأت دکھا رہے ہیں۔ حکومت کے پاؤں تلے سے زمین نکلتی جا رہی تھی، قحط اور گرانی نے مزید ستم ڈھایا ہے۔ چنانچہ پنڈت نہرو اس بات کا رونا تو رو ہی چکے ہیں کہ غیر تو غیر، ان کے اپنے بھی اب ان کے لئے آنکھوں میں کوئی نگاہِ عزت نہیں رکھتے۔

جس ملک میں اس طرح کی حالت نمودار ہو چکی ہو کہ حکمران طاقت اپنے تخت کے پایوں کو متزلزل محسوس کرے اور پھر اس کے پاس کوئی ساحرانہ نعرہ بھی ایسا باقی نہ رہے کہ اس کے ذریعہ عوامی جذبات کو مسحور رکھا جا سکے تو ایسے ملک کی حکمران طاقت کے لئے کامیابی کا راستہ ایک ہی رہ جاتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی ملک سے جنگ چھیڑ دے۔

آج اگر پنڈت نہرو جنگی فضا بنا دیں تو نہ صرف وہ عارضی اور نمائشی اتحاد پیدا کر لیں گے بلکہ اپوزیشن کی ہر آواز کو دبانے کے لئے پوری طرح اندھے اختیارات سے مسلح ہو سکیں گے۔ ملک میں نئے نئے سیاسی و معاشی رجحانات کا پنپنا ممکن نہ رہے گا، ان سے اختلاف کرنے والی تحریکوں کا ارتقا رک جائے گا، لوگ راشننگ، پرمٹ سسٹم، قیمت بندیوں، اور ملک سیکورٹی کے سانچے میں ڈھلنے والے ملعون قوانین کے شکنجے میں کس جائیں گے۔ پھر یہ کہ انتخابات کی قضائے مبرم یا تو ٹل جائے گی، یا اگر اس کا موقع باقی رہا بھی تو بازی حکمران طاقت کے ہاتھ رہے گی وہ طاقت کہ جسے امن کی روشنی میں کوئی راستہ نہیں مل سکتا وہ جنگ کی تاریکیوں میں خوب کھل کر اقدام کر سکے گی۔

جنگ کے مذکورہ بالا محرکات کو جس چیز نے تیز تر کر دیا ہے اور انڈیا کے کریلے کو نیم چڑھا بنا دیا ہے وہ کشمیر کا مسئلہ ہے۔ کشمیر پر دستِ تصرف دراز

کرکے اور پھر اس مسئلے میں یو، این، او کے سامنے اپنے طرزِ عمل کا ناخوشگوار مظاہرہ کرکے انڈیا نے بین الاقوامی فضاؤں میں اپنی ساکھ پوری طرح ختم کرلی ہے۔ اب جبکہ یہ بین الاقوامی ادارہ (جس کی سرگرمیوں کی داخلی معنویت چاہے کسی بھی نوعیت کی ہو) خود اپنے ہی مفاد کی خاطر مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کے لئے دونوں ملکوں کو آزادانہ استصواب کے نکتہ پر جمع کرنے کے لئے کچھ سرگرمی دکھا رہا ہے اور اس کے مجاز کردہ کارکن یہاں آچکے ہیں، انڈیا اپنے آپ کو ایک خطرناک موقف پر پا رہا ہے۔ ایسے میں اگر کھسیانی بلی کھمبا نوچنے کے لئے جست کرے تو تعجب کا کیا موقع!

لیکن اگر انڈیا کے اکابر میں عقل و دانش کے کوئی رمق بھی باقی ہے تو ہم سمجھتے ہیں کہ وہ محض فوجی قوت کی چلت پھرت دکھا کر رہ جائیں گے اور بات کو مقطع تک لے جانے کی حماقت نہ کریں گے۔ آخر وہ اتنا تو جانتے ہوں گے کہ پاکستان اگر ان کی طرح جارحانہ اقدامات نہیں کر رہا تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس کے اندر بسنے والی قوم مدافعت کے فرض میں بھی کوئی کوتاہی دکھا سکتی ہے۔ وہ اس حقیقت سے بھی قطع نظر نہیں کرسکتے کہ انڈیا کی فوج بڑی سہی لیکن ——— فتح و شکست کا سارا دارومدار فوجوں کی تعداد اور اسلحہ کی مقدار ہی پر منحصر نہیں ہوتا ——— پاکستان میں جذبۂ صادق اور وجوہِ وحدت انڈیا سے ہزار گنا زیادہ پر زور ہیں۔ اس ملک کا اسلامی ریاست بننے کے لئے خدا اور کائنات کے نام پر وقف ہو جانا اس کے ہر مسلم باشندے کے لئے کٹ مرنے کا ویسا ہی محرک ہے جیسے ایک مسجد کے لئے جذبۂ تحفظ ہوتا ہے۔ یہاں معاشرتی اونچ نیچ کی خلیجیں بھی انڈیا کی طرح حائل نہیں ہیں۔ یہاں اکثریت و اقلیت میں بھی کوئی کشمکش نہیں۔ یہاں سیاسی اختلافات بھی ویسے طوفان خیز نہیں ہیں۔ یہاں معاشی نظم کی ناہمواریاں موجود سہی مگر قحط اور فاقہ کی کیفیت بہرحال نہیں ہے۔ ان حقائق کو خوب اچھی طرح سوچ لیجئے۔

انڈیا کے اکابر اگر جنگ چھیڑنے سے پہلے اس کے نفع و نقصان کا کوئی میزانیہ بنا کر فیصلہ کرنا پسند کریں تو ہم گزارش کریں گے کہ حسبِ ذیل امور کو ضرور نگاہ میں رکھیں۔

اول یہ کہ انڈیا کچھ بھی کرے، اب پاکستان کے وجود کو صفحۂ ہستی سے ناپید کرنا کوئی کھیل نہیں ہے، اور اگر یہ وجود باقی ہے تو اس کے حقوق پر چھاپا ماری کرنا بھی بہت بھاری قیمت آپ سے وصول کرے گا۔

دوم یہ کہ اس طرح کی جنگی حرکات جہاں دوسروں کے لئے آزمائش بنیں گی وہاں خود آپ کے لئے بھی صدیوں تک جینا حرام کردیں گی۔ آپ انصاف اور راستی سے آزاد ہوکر جو گولی بھی چلائیں گے اس کے اندر سے خود آپ کے لئے بھی جنگ کی ایک نئی چڑیل پیدا ہوکے رہے گی۔ آج جو گولیوں کے بیج آپ بوئیں گے کل ان سے ایٹم بموں کی فصل اُگے گی اور وہ فصل آپ کو کاٹنی پڑے گی۔

سوم یہ کہ یقین جانئے آپ جنگ کا دھتورہ پلا کر اپنے عوام کو زندگی کے حقائق سے غافل کرنے کی کتنی ہی کوشش کریں، اس کے عارضی اثرات کے بعد آخر کار آپ کو ان سب خطرات کا استقبال کرنا ہوگا کہ جن کی پیش بندیوں کے لئے آپ بالکل غلط تدابیر اختیار کر رہے ہیں۔

چہارم یہ کہ آپ کی نوخیز مملکت اپنے عہدِ طفلی میں ایسے بحران سے دوچار ہو جائے گی کہ اس کا علمی، سیاسی، صنعتی اور معاشی ارتقا رک جائے گا اور زمانہ آپ کو آگے بڑھا لے جانے کے بجائے اٹھا کے کئی قدم پیچھے پھینک دے گا۔ بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ آپ "آ بیل مجھے مار" کی حماقت عمل میں لانے کے بعد حالات کے دباؤ سے مجبور ہوکر کسی بیرونی طاقت کو اپنی سیاست یا معیشت پر مسلط کرلیں اور اس طرح اپنے لئے بھی اور پورے ایشیا کے لئے بھی مستقبل کی ایک بڑی مصیبت کا سامان کردیں۔

پنجم یہ کہ ہوسکتا ہے کہ آپ جنگ کا جو شعلہ ہوا کی موجوں کے حوالے کر رہے ہیں یہ دنیا بھر کے مجموعی خرمنِ امن کے دامن میں جا گرے، اور تباہی و ہلاکت کے ایک بڑے طوفان کی ذمہ داری آپ کی گردن پر ہو۔

ششم یہ کہ اس بات کو بھی سوچ لیجئے کہ اگر ہندو مسلم کشمکش نے آپ کے جنگی موچوں کے پیچھے "مشرقی پنجاب" کا سا ایک اور معرکہ گرم کردیا یا کمیونسٹ عناصر نے ایک وسیع تر تلنگانہ پیدا کردیا تو پھر آپ کیا کریں گے!

ان امور کو ذہن میں رکھ کر پھر اگر آپ کا جی چاہے تو پھر فرزندِ جنگ کے دیوتا کی بھینٹ چڑھانے کے لئے اپنے جوانوں کی جوانیاں، اپنی عورتوں کے سہاگ، اپنے کھیتوں کی پیداوار میدان میں لے آئیے۔

انڈیا کے وزیرِ اعظم نے بڑی جسارت کر کے پاکستان پر یہ الزام عائد کیا ہے کہ گویا وہ جیرہ دستی کی تیاریاں کر رہا ہے اور اس کی دلیل یہ دی ہے کہ فوجی بھرتی اور اسلحہ کی خریداری خاص طور پر کی جا رہی ہے۔ یہ الزام عائد کرتے ہوئے پنڈت نہرو جیسے آدمی کو یہ ضرور سوچنا چاہئے تھا کہ انڈیا کے مقابلے میں پاکستان بہرحال ایک جدید مملکت ہے اور تقسیم کے وقت اس کے ساتھ بندر بانٹ کرنے والوں نے جیسا کچھ انصاف کیا ہے وہ دنیا بھر کو معلوم ہے۔ ایسے حالات میں پاکستان کو اپنی کمی پوری کرنے کا حق تو آپ دیتے۔ یا پھر کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ پاکستان ہمیشہ کمزور حالت میں رہے کہ آپ جب چاہیں آسانی سے اس پر اپنے دانت تیز کر سکیں۔ ایسا نہیں ہو گا۔

اب چند باتیں اپنے آپ سے کہنے کی بھی ہیں۔

اولاً یہ کہ انڈیا کی حرکات کو ہوشیاری کی نگاہ سے تو ضرور دیکھا جائے لیکن گھبراہٹ سے نہیں۔ اپنے جذبات، خطرہ بینی کو بہت اعتدال پر رکھا جائے۔ زندگی کی سرگرمیاں جوں کی توں رہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ لوگ ہر آزمائش کے لئے تیار رہیں۔

ثانیاً یہ کہ ہمارے حکمران اور ان کے وابستگانِ ارادت اس صورتِ حالات سے کوئی ایسا فائدہ اٹھانے کی مہم نہ شروع کر دیں جیسا کہ بعض تنگ نظر طاقتیں کیا کرتی ہیں

ثالثاً یہ کہ ملک کے وہ تمام عناصر جو وقت آنے پر بیرونی خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے داخلی کشمکش کو پس پشت ڈالنے کے اصول کے علمبردار ہیں ان کو کام کرنے کا پورا پورا موقع دیا جائے اور ایسے تمام عناصر کو اعتماد میں لیا جائے۔

رابعاً یہ کہ ملک میں اسلامی جہاد کے اس جذبۂ صادق کی لہر دوڑانے کے لئے جو فوجوں کی تعداد اور اسلحہ کی مقدار کی کمی کو پورا کر سکتا ہے خدا سے تعلق کو درست کرنے اور فوج اور عوام کے اخلاق کو اسلامی معیار پر لانے کی انتہائی سعی کی جائے۔ اس معاملے میں ہمارے سربراہ کاروں کی ذمہ داریاں دوسرے ہر عنصر کے مقابلے میں زیادہ نازک ہیں۔

ان چار باتوں کا اگر اہتمام کیا جائے تو ہم بڑے سے بڑے خطرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہنستے مسکراتے فتح و نصرت کی طرف اقدام کر سکتے ہیں! وما توفیقنا الا باللہ العلی العظیم۔

[یہ سطور ۱۸ جولائی ۱۹۵۱ء کی صبح کو قلمبند کی گئی ہیں، اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے
کہ ان کی اشاعت تک حالات کس رخ پر ارتقا کر چکے ہوں گے!]

آج ۱۹ جولائی کے اخبارات میں پنڈت نہرو کے اس تار کا متن شائع ہوا ہے جو وزیرِ اعظم پاکستان کو موصول ہوا ہے۔ اس میں پاکستان کی حکومت اور عوام کو یہ اطمینان دلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ جنگ ذنک کی کوئی نیت نہیں، فوجوں کی نقل و حرکت صرف حفاظتی اغراض کے لئے ہے —— ہاں اگر انڈیا پر کسی طرف سے حملہ کیا گیا تو وہ سختی سے جواب دے گا۔ پنڈت جی نے مزید زور اس بات پر دیا ہے کہ ہم سارے باہمی اختلافات صلح صفائی سے چکانے کا فیصلہ کر چکے ہیں لہٰذا کسی جنگی اقدام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ہونا تو یہی چاہئے اور اگر فی الواقع یہ الفاظ دل و زبان کے درمیان کسی خلیج کو چھپانے کے لئے نہیں کہے گئے ہیں تو ہم ان کی قدر کرتے ہیں مگر یہ باتیں پہلے درجے کی ڈپلومیٹک باتیں ہیں۔ یہ چند جملے گھڑے گھڑائے ہیں جنہیں دنیا میں ہر قوم کی حکومت ایسے موقعوں پر استعمال کرتی رہتی ہے۔ ان الفاظ کے معانی ڈکشنریوں کے آئینے میں نہیں دیکھے جایا کرتے بلکہ عملی اقدامات سے دیکھے جاتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ . . . . . .

آپ کی فوجیں کاہے کے لئے متحرک ہیں؟ ـــــ وہی بات تو نہیں کہ دریائے راوی میں نہانے اور تیرنے کا پروگرام مدِ نظر ہے!

یہ تو ہم بھی جانتے ہیں کہ انڈیا کے لئے لڑائی کے میدان میں اترنا ـــــ اور بغیر کسی راستی و انصاف کے اترنا ـــــ موجبِ ہلاکت ہے۔ لیکن فوجوں کی اس نقل و حرکت سے ہمسایہ ملک سے تعلقات کو محض خراب کرنا مطلوب ہے تاکہ گرا ہم کو یہ دکھایا جائے کہ تم تو جھگڑا چکانے آئے ہو اور یہاں تعلقات کا بگاڑ ایک خطرناک انتہا کو پہنچ چکا ہے۔

بہرحال اگر آپ کی نیت درست ہے تو مبارک، اور اگر خدانخواستہ قلب و نظر میں کوئی فتور ہے تو رحم اللہ!

ـــــ (بقیہ سوچ بچار)

کر رہے ہوں۔ عورتوں کو گھروں میں بٹھایا جا رہا ہو اور چار چار شادیوں کا زور ہو۔ اس طرح کی ایک بھیانک تصویر ہمارے "اسلامی نظام" کی کھینچ کر یہ لوگ اپنے دوستوں میں، اپنی بیویوں کے سامنے، اپنی نابالغ اولادوں کے حلقے میں پیش کرتے ہیں۔ اس طرح یہ اپنے دلوں میں بھی اور اپنے ملنے جلنے والوں کے دلوں میں بھی تعصب کی ایک فصل اگاتے ہیں، یہ فصل خوب اگتی ہے، اس کی خوب آبیاری ہوتی ہے، حتیٰ کہ یہ پودے دل و دماغ کو چاروں طرف سے ڈھانپ لیتی ہے۔ اس تعصب کے جنگل میں بیٹھ کر یہ حضرات ہمارے اوپر آرتھوڈکسی کا فتویٰ چسپاں کرتے ہیں۔

ان حضرات کا مقصد اس پروپیگنڈے سے یہ ہے کہ ایک تو اپنے تعصب کے لیے ضمیر اور عقل کا اطمینان فراہم کریں اور ہمارے علم و فکر کے سامنے "عقلِ عجز" کرتے ہوئے حق بجانب بنے رہیں، دوسرے یہ کہ ذہین اور نوجوان عناصر کے جذبات کو مسحور رکھ سکیں، اور اسے تحریکِ اسلامی کا مطالعہ کرنے سے روکیں، تیسرے یہ کہ اسلام کے ابھرنے میں رکاوٹ ڈالیں جو ان کی مغرب پرستیوں اور ان کے اتباعِ ہوا کے لئے ایک مستقل خطرہ ہے، چوتھے یہ کہ قرآن و سنت میں ترامیم کرنے اور ان کو بے جا استعمال کرنے کی آزادی کو بچا سکیں۔

مگر سوال یہ ہے کہ ایک منظم تحریک جب عملاً چل رہی ہو، اس کے افراد سوسائٹی میں پھیل کر کام کر رہے ہوں، اس کی فکر کو وضاحت کے لئے لٹریچر وجود میں آ رہا ہو، اس کی حقیقت کو عیاں کرنے کے لئے ادب کا ایک نیا آفتاب طلوع ہو رہا ہو تو آخر ان روشن شہادتوں پر کہاں تک مٹی ڈالی جا سکتی ہے؟ حقیقت اور پروپیگنڈے کی یہ کشتی دیکھئے کس کی فتح پر منتج ہوتی ہے!

ـــــ (بقیہ فکر و نشاط) ـــــ

اتنا روئے کہ وہی حال ہو کہ:

تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو
رونا ہے یہ کچھ ہنسی نہیں ہے

پہلے آنسو بہیں، پھر خون ٹپکنے لگے، پھر دل و جگر گھل گھل کے بہہ جائیں۔ اور کھیل ختم ہو جائے۔ پھر اگر کوئی نکّا بجائے عین سر پر ہی آ پہنچے تو بیشتر اس کے کہ وہ رائفل یا سنگین کی طرف ہاتھ بڑھائے "پاکستان کلب آف میوزک" کا کوئی سپہ سالار تڑپانے والا راگ چھیڑ دے۔ دشمن منٹوں میں ماہیِ بے آب بن جائے اور ذبح ہوئے بغیر بسمل ہو۔ پھر اگر بارود اور تیل کے ذخائر سے دشمن کو محروم کرنا ہو تو دیپک راگ چھیڑ کر آتش افروز ہوں۔ سے بے نیاز ہو سکتا ہے۔

اگر پاکستان کلب آف میوزک تیار ہو تو پھر پاکستانی فوج کو چاہئے کہ وہ خود اطمینان سے چھاؤنیوں میں پڑی رہے اور ان لوگوں کو آگے جانے دے تاکہ یہ کسی مناسب نقشے پر پاکستان کی پوری سرحد کے ساتھ ساتھ توپوں کی جگہ طاؤس اور مشین گنوں کی جگہ رباب نصب کر دیں۔ رائفل کے بجائے ان کے ہر سپاہی کے پہلو میں ایک بانسری ہو۔ لڑائی اگر کسی پانی میں لڑنے کا موقع نکل آئے تو جلترنگ کا سامان مہیا ہو۔ اس قسم کی فوج کے زخمیوں اور مریضوں کا علاج بھی موسیقی سے ہو، اور ان کے لئے نرسیں اگر بھرتی کی جائیں تو فلم اسٹاروں اور بیسواؤں کی صفوں میں سے! یوں ہو شانِ جہاد فی سبیل اللہ کی!

اے خطائے عاشقی

مصطفیٰ صادق

مصلحت اندیش اہلِ حق تک مسلماں ہو گئے
حق کے جو داعی تھے باطل کے نگہباں ہو گئے

کس قدر بے رحم ہے الحاد و بے دینی کا دور
زھد کے کتنے سفینے نذرِ طوفاں ہو گئے

جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے!
حق سے خود خدامِ حق دست و گریباں ہو گئے

"ادخلوا فی السلم کافہ" کی سنی تفسیر جب
دین کی تفریق کے داعی پریشاں ہو گئے

یہ سزائے ذوقِ پرواز ہے خطائے عاشقی!
برف کے تودے بھی ہم پر شعلہ افشاں ہو گئے

کیف مستعار

آفتاب احمد بی اکام

یہ شادیانۂ عشرت! یہ جشنِ رعنائی!
نہ دے خدا کے لئے کیف مستعار مجھے
کسی یتیم کے دلسوز آنسوؤں کی قسم،
نہ راس آئیگی اے دوست! یہ بہار مجھے

یہ دنیا!

مشکور صدیقی

ہر طرف ظلم کی فراوانی
زندگی مشتعل ہے آہو
خون پینے کو آدمیت کا!
بھیڑیئے منتظر ہیں راہوں پر

دواسازی اور شراب

ڈاکٹر مسعود الدین حسن کیبادی - ایم بی جی ایس۔

اس بیان سے تو شاید کسی کو انکار نہ ہو کہ طب یونانی کو عروج کی انتہائی حدود تک پہنچانے والی یہی مسلم ملت تھی اور موجودہ فن علاج اس فن کی بدلی ہوئی شکل ہے جب تک یہ فن مسلمانوں کے قبضہ اقتدار میں رہا اور مسلمان رائج اس کی رہنمائی کرتے رہے یہ فن بھی مسلمان ہو کے پھلا پھولا۔ لیکن ہماری اجتماعی تنزل نے جہاں ہمارے ہر شعبہ زندگی کو متاثر کیا یہ فن بھی اس کی دست برد سے نہ بچا۔

یہ سب کیوں ہوا، یہ بیان کرنا میرا مقصود نہیں، ہاں یہ قصد ضرور ہے کہ جس قعر ذلت سے مسلمان نکلنے کی کوشش کر رہے ہیں اگر کامیاب ہو گئے تو ہر چیز کو اپنی اصلی حالت پر لانا ہوگا۔ زندگی کا ہر شعبہ اس نئی روح کی تابانی سے منور ہوگا اور ساری قدریں رفتہ رفتہ صحیح اسلامی طرز پر مرتب کرنا پڑینگی۔

مسلمان معالج اور مریض دونوں کے لئے نہایت دشوار ہے کہ وہ شرعی حدود میں رہ کر موجودہ طریق علاج سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکیں۔ مثال کے طور پر موجودہ ادویہ کو ہی لیجئے جو روزمرہ استعمال میں آتی ہیں اور جن کا بیشتر حصہ شراب کی کم یا زیادہ آمیزش سے خالی نہیں ۔ درآنحالیکہ شراب کا ایک قطرہ بھی مسلمان پر حرام ہے اور شراب بیماری تو بن سکتی ہے مگر شفا نہیں لیکن ہم اپنے کو مجبور پاتے ہیں کہ یا تو اس حرام چیز کو استعمال کریں یا سرے سے موجودہ طریق علاج سے بہرہ ور نہ ہوں۔

لیکن جس خدا نے شراب کو حرام کیا ہے اس نے اس کا بدل ضرور پیدا کیا ہوگا۔ یہ یقینی اگر آج کا فرما ہو جائے تو یہ بات کچھ مشکل نہیں کہ ساری ممنوعات سے بچ کر بھی ہم موجودہ علاج سے پورا پورا فائدہ حاصل کر سکیں۔

اس زمانے میں بھی اگر ہم چاہیں تو بڑی حد تک شراب سے بچ سکتے ہیں پہلا طریقہ تو یہ ہے کہ ادویہ جن کا لازمی جزو شراب ہے استعمال ہی نہ کی جائیں۔ یہ بیان حالات کو نہ جاننے والوں کو بہت ہی عجیب معلوم ہوگا مگر ہر وہ ڈاکٹر جو کہ اوسط درجہ کی بھی استعداد رکھتا ہے گواہ ہوگا کہ آج کل کا طریق علاج پرانی ادویہ سے جن کا لازمی جزو شراب ہے بے نیاز ہو سکتا ہے اور قریب قریب ہر دوا بہتر اور قابل اعتبار حالت میں ممنوعات سے پاک دستیاب ہو سکتی ہے۔ یہ طریقہ کار تو ذرا سی محنت اور ایمان باللہ چاہتا ہے جو دشوار نہیں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ادویہ بنانے میں ہم شراب کو استعمال ہی نہ کریں بعض لوگوں کے لئے یہ بیان تعجب انگیز ہوگا۔ انگلستان میں بہت دن پہلے تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ طریق کار ممکن بھی ہے اور مفید بھی۔

سر بی۔ ڈبلیو۔ رچرڈسن (SIR.B.W. RICHARD SON.) نے* انگلستان میں ایک ایسا طریقہ ٹنکچر (TINCTURE.) بنانے کا دریافت کیا ہے کہ شراب کا مطلق دخل نہیں ایسے ٹنکچروں (TINCTURES.) کو صاحب موصوف نے گلیسرین ٹنکچر (GLYCERINE TINCTURE) یا آبی ٹنکچر (AQUEOUS TINCTURE.) کا نام دیا ہے۔ ان کے بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ شراب کی جگہ گلیسرین (GLYCERENE.) سرکہ (ACETIB ACID) اور پانی کے ایک مجوزہ حل کو دواؤں کے جوہر کشید کرنے کیلئے استعمال کرتے ہیں۔ قریب قریب تمام موجودہ ٹنکچر اس طرح سے بنائے جا سکتے ہیں اور خاصیت و پائیداری میں شراب سے بنے ہوئے ٹنکچروں کے ہم پلہ ہوتے ہیں۔ صاحب موصوف نے ایک طویل فہرست ان ٹنکچروں کی

---

* PHARMACEUTICAL FORMULAS (CHEMIST & DRUGGIST LONDON) 1908. PAGE 803-804. طہ

ایں چہ بوالعجبی است؟

معز علی بیگ

"اقبال پر ایک ترچھی نظر" کے عنوان سے ایک تنقیدی مضمون چراغِ راہ کی پچھلی اشاعت میں نظر سے گزرا۔ مضمون کے ایک ایک جملے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہر بات محض اختلاف برائے اختلاف اور برعکس کہی گئی ہے۔ مضمون ایک جذبۂ انتقام کا پتہ دیتا ہے جو علامہ کی ذات سے لیا جا رہا ہے۔ یا پھر اقبال پرستی کے ردعمل کے طور پر لکھا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ ردعمل کبھی توازن کا حامل نہیں ہو سکتا۔ مجھے یہاں پر پورے مضمون کی تردید کرنا مقصود نہیں ہے کیونکہ وہ خود آپ اپنی تردید کے لئے کافی ہے، البتہ چند فاش غلطیوں اور بے بنیاد الزامات کی طرف نشاندہی کرنی ہے جو ممکن ہے بعض حضرات کی نظروں سے اوجھل رہ جائیں۔ شاعری کے متعلق ناقد صاحب فرماتے ہیں۔

"اقبال نے شاعری جیسی خوبرو حسینہ کو عروض کی غلطیوں سے اس بری طرح زخمی کیا ہے کہ کوئی سنجیدہ شاعر یا ادیب ان کو معاف نہیں کر سکتا"

سوال اس بات کا ہے کہ اقبال نے کس دن اپنے شاعر یا ادیب ہونے کا دعویٰ کیا ہے؟ ان کو تو شکایت ہی یہ تھی کہ "مرا یاراں غزل خوانے شمردند" ان کے پیش نظر شعر و شاعری سے ہٹ کر ایک بہت اعلیٰ اور ارفع مقصد تھا۔ انہوں نے شعر کو مقصد کے تابع بنایا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے اور اس گھٹیا مقصد کی خاطر اس بلند مقصد کو قربان کر دیتے تو شاعر و ادیب تو درکنار، اس جرم میں ان کو انسانیت بھی کبھی معاف نہ کرتی۔ یہ الزام اس شاعر پر تو ضرور عاید ہو سکتا ہے جو اس "خوبرو حسینہ" کا دلدادہ ہو لیکن اقبال اس سے بری ہیں۔ ان کے کلام میں عروض کی غلطیاں نکالنے سے پہلے ان کا نظریۂ ادب جاننا ضروری ہے۔

شاعری کے بعد فلسفے کا نمبر آتا ہے، یہاں پھر وہی پرانی بحث چھیڑی گئی ہے کہ اقبال کا فلسفۂ خودی نطشے سے ماخوذ ہے۔ اس غلط نظریئے اور سطحی پر اعتراض تو جب کیا جائے جب خود علامہ نے اس کی تردید نہ کی ہو۔ انہوں نے نظم و نثر دونوں جگہ اس کی تردید کی ہے۔ رہا یہ سوال کہ اقبال نطشے کے مترجم ہیں یا قرآن کے، اس کا جواب خود وہی مثنوی "اسرار و رموز" میں دے چکے ہیں۔ آگے چل کر ناقد صاحب نفسیاتی انداز میں فرماتے ہیں: "اقبال کی ضرب کلیم کے لئے نظام فرعونی اور طلسم سامری ہونا بہت ضروری ہے۔ غلامی کے احساس کمتری کی فضا میں اقبال کی اپنی انفرادی مجبوریاں اور بے کسی اس کا ردعمل بن جاتی ہیں۔ یہ ردعمل ایک جمود اور تعطل کی پیداوار تھی جس کو اقبال اسلام کا نعل بتاتے ہیں۔ دراصل نفسیاتی تصادم کی تمام ذہنی کڑیاں کھلتے ہوئے بھی حیات کا مطمح نظر نہیں بن سکتا اور جب علم حق اور باطل میں تمیز نہیں کر سکتا تو جذبات اس کی عقل پر غالب آ جاتے ہیں۔"

گزارش یہاں یہ ہے کہ ناقد صاحب کو تو اقبال ہی کی "ضرب کلیم" کے لئے "نظام فرعونی" اور "طلسم سامری" کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے یہاں تو خدا کے قانون میں شروع سے لیکر آخر تک ہمیں یہ ضرورت نظر آ رہی ہے، اور چونکہ بقول ناقد یہ کہ مثبت و منفی، متضاد کائنات کے متنوع مظاہر سے فطرت کی وحدت نمایاں ہوتی ہے لہٰذا اسی قانون کے تحت اقبال کی ضرب کلیم کے لئے نظام فرعونی اور طلسم سامری ہونا بھی شدید ضروری ہے۔ اب یہ فیصلہ کرنا تو بڑا مشکل ہے کہ احساس کمتری کی فضا میں اقبال کی انفرادی مجبوریاں کیا تھیں اور ان کی بے کسی کس قسم کی تھی؟ تاہم ہم جانتے ہیں کہ ردعمل کبھی جمود اور تعطل کی پیداوار نہیں ہوا کرتا بلکہ اس کے پہلے ایک عمل کا ہونا ہوا کرتا ہے۔ ناقد سے ہی دریافت کیا جائے کہ جب علم حق و باطل میں تمیز نہیں کر سکتا تو جذبات آخر کس کی عقل پر غالب آ جاتے ہیں؟ علم کی؟ اقبال کی؟ یا کسی اور انسان کی؟ چلئے انسان ہی کی سہی لیکن یہ جملہ ہٹ کر "دقیق نفسیاتی مطالعے" کا پتہ دیتا ہے۔ معاملہ اصل میں بالکل برعکس ہے، ردعمل بذات خود چند جذبات کی پیداوار ہوتا ہے جو بالا سطر یا ماورائے سطر جبلتوں (INSTINCTS.) سے تعلق رکھتے ہیں جس حقیقت پر انجم

آتے ہیں تو انسان کی قوت تمیز (DISCRIMINAJING FACULTY.) کو معطل (NEUTRALIZE.) کر دیتے ہیں اور ایک زبردست ہیجان (TENSION.) کی صورت اختیار کر کے تناسی کے طلبگار ہوں تو ہمیں جیسا کچھ یہ رد عمل کا مظاہرہ دراصل ایک راستے (OUTLET) کا کام انجام دیتا ہے۔ یہ ہے رد عمل کی نفسیات۔ اس کے بعد ناقد صاحب ڈاکٹر جوڈ (جنہیں وہ اپنے نزدیک ماہر نفسیات سمجھتے ہیں) کا حوالہ دیتے ہیں کہ عقل انسانی جذبات کی لونڈی ہوتی ہے" بہت ٹھیک ہے یہ پورا فقرہ خود انہی پر صادق آتا ہے۔ آگے چل کر فرماتے ہیں "اب کیوں نہ ہم فلسفہ خودی کو اقبال کی احساس کمتری کا رد عمل سمجھیں اقبال کی خودی ایک وہم ڈر اور احساس کمتری کی پیداوار ہے" یہاں آ کر میں ناقد صاحب سے چند سوال کرتا ہوں اور توقع رکھتا ہوں وہ اس کا جواب عقل کو جذبات کی لونڈی بنا کر نہ دیں گے۔ جو چیز ایک وہم، ڈر اور احساس کمتری کی پیداوار ہو وہ کبھی ٹھوس، پائیدار اور سنجیدہ نہیں ہوا کرتی، وہ ہمیشہ وقتی اور فوری ہوتی ہے، نیز یہ کہ وہ تعمیری نقطہ نظر سے کچھ وقعت نہیں رکھتی، دوسرے یہ ایک رد عمل جو احساس کمتری کا نتیجہ ہو کبھی بھی حیات کا مطمح نظر نہیں بن سکتا جیسے کہ خود ناقد صاحب ہی کہتے ہیں، تو اقبال کا فلسفہ خودی بھی ناقد کے نزدیک، جیسا کہ اوپر حوالہ دیا گیا ہے کبھی بھی قابل قبول نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ ان تمام عیوب سے خالی نہیں ہو سکتا، لیکن کلام کا بیشتر حصہ اس بات پر شاہد ہے کہ اقبال نے مسلمان کو سب سے پہلے اطاعت اللہ اور رسول کی دعوت دی، اسکی زندگی کے واحد نصب العین یعنی اعلائے کلمۃ الحق، اسکی زندگی کے لازوال قانون یعنی قرآن کی طرف نشاندہی کی، اسے ایک امت وسط کی حیثیت سے خطاب کر کے شہادت حق کا فریضہ یاد دلایا، اسے وطنیت اور قوم پرستی کے دیدہ زیب بتوں کو توڑنے کے لئے تیار کیا، اور مختصر یہ کہ اسے اس خودی کا درس دیا جس کا سر نہاں لا الہ الا اللہ ہے۔ تو کیا یہ سب کچھ ایک وہم، ڈر اور احساس کمتری کی پیداوار ہے؟ کیا یہ تعمیر انسانیت اور تعمیر جہاں کا پروگرام ایک رد عمل ہے؟ فرمائیے تو؟

آگے چل کر عربی فلاسفرز کا ذکر آتا ہے اور یورپ والوں کی جدت طرازی کا (نہ معلوم یورپ والوں سے کون لوگ مراد ہیں اور وہ نئی جدت کیا تھی) پھر فرماتے ہیں کہ حضرت اقبال اپنے ہی ہتھیار سے خود کو شہید ہوتا دیکھ کر۔ خودی کا نعرہ بلند کرنے لگے،، اس پورے جملے کا کوئی سر پیر نظر نہیں آتا۔ اگر ہم حضرت اقبال کے اپنے ہتھیار سے عربی فلسفہ مراد لیں تو قارئین کرام خود ہی فیصلہ کریں کہ حضرت علامہ نے کون سے دن یہ ہتھیار بنا کر عربی فلسفے سے متاثر ہی تھے تو بھلا اس جدید فلسفے سے اور اس سے کیا واسطہ؟ کیونکہ اسکی اسپرٹ سلف سے بالکل مختلف ہے۔ بیکن نے تو قدیم فلسفے کی بساط ہی الٹ دی تھی۔ مزید برآں یہ کہ ایک طرف تو علامہ کو نطشے کا ترجمان بنایا جاتا ہے اور دوسری طرف خوف شہادت سے وہ نعرہ زن نظر آ رہے ہیں۔ غالباً نطشے سے نعرے مانگ مانگ کر لگا رہے ہیں۔ ملاحظہ ہو یہ تنقید کا جدید ترین نمونہ ہے، پھر آگے اقبال کی کتاب (RECEUSTRUCTION OF RELIGIOUS THENGHH.) سے عبارت نقل کی گئی ہے جس میں ان کے خوف و ہراس کا مرقعہ پیش کیا گیا ہے دراصل اسی نے مضمون میں جان بھی ڈالی ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ وہ عبارت غلط نقل کی گئی ہے اور دوسرے بیچ سے ایک پورا جملہ غائب کر دیا گیا ہے جس سے اس کا پورا مفہوم ہی خبط ہو گیا ہے اور جتنا اس کا ترجمہ کیا گیا ہے[1] اس نے اور چار چاند لگا دیئے ہیں مثلاً جہاں پر ناقد صاحب نے (WARD OF ISLAM.) استعمال کیا ہے وہاں علامہ نے (WORD ISLAM.) لکھا ہے آپ کہیں گے کہ یہ چھپائی کی غلطی ہے لیکن ناقد صاحب نے ترجمہ بھی اس کا "نقد اسلام" کیا ہے، علاوہ اس کے اگر اس کو چھپائی کا نقص بھی مان لیا جائے تب بھی اس جملے کا ترجمہ کہ (WORD ISLAM IS SPIRITUALY MOVING TO TE WEST.) یہ ہونا چاہئے "لفظ اسلام روحانیت کے ساتھ مغرب کی جانب بڑھ رہا ہے" لیکن ہمارے ناقد صاحب نے لکھا ہے "لفظ اسلام روحانی جنت[2] سے دنیائے مغرب کی طرف قائم کر رہا ہے۔ نہیں تعجب راہ اگر بجاست تاکہ گو یہ ترجمے کی ایک تازہ ترین طرز ہے، خیر باوجود ان تمام خوبیوں کے اس پوری عبارت کو ناقد صاحب کے اوپر کے جملوں سے کوئی نسبت نہیں اگر ہے

(بقیہ بر صفحہ ۴۰)

---

[1] ترجمے غلط کے مؤلف محترم نے صرف انگریزی عبارت لکھی تھی، ترجمہ کا گناہ مرتب جرائد ماہ کی گردن پر ہے جس نے کہ لفظ بلفظ ترجمہ کر دیا۔ (مرتب)

[2] معاف کیجئے گا، روحانی جنت سے "نہیں۔ "روحانی حیثیت سے"۔ (مرتب)

ایک ویران وادی میں پہلا قافلہ

نعیم صدیقی

یہ نظم ۴۳-۱۹۴۲ء میں کسی وقت لکھی گئی تھی جنوری ۱۹۴۷ء میں نظرثانی اور اضافے کے ساتھ اسے مکتبۂ نشاۃ ثانیہ (حیدرآباد دکن) نے کتابی صورت میں شائع کیا۔ یہ جن حالات میں لکھی گئی ہے وہ آخری سنبھالا لیتے ہوئے پہلے سے شدید ہو کر دوبارہ سامنے آئے ہیں، اس موقع کا تقاضا یہ تھا کہ اسے چراغِ راہ میں شائع کیا جائے، کیونکہ ہمارے سلسل وسیع ہوتے ہوئے حلقہ میں اب اکثریت ایسی ہے جس کے لئے یہ نظم بالکل "تازہ" اور "غیر مطبوعہ" کی سی حیثیت رکھتی ہے۔

(۱)

اجرام وقفِ سیر ہیں، رکتے نہیں کہیں،
زہرہ کہیں، زحل کہیں، ننھی زمیں کہیں
آرام میں ہے کب کوئی خود آفریں کہیں
انساں جس کو فکرِ حیاتِ دوام ہے،
اس کے لئے تو ادھی منزل حرام ہے۔

●

دنیا میں قافلوں کی رو و رد کہاں نہیں
بے تاب زندگی کی تگ و دو کہاں نہیں
جولاں خودی کی تیز قدم ضو کہاں نہیں
افسوس یہ ہے لذتِ تقلید عام ہے!
تقلید کم ہے! عادتِ تائید عام ہے!

●

یہ لوگ! اسیرِ حلقۂ تزویر ہیں یہ لوگ!
یہ تیر خوردہ لوگ ہیں! نخچیر ہیں یہ لوگ!
بس، آپ اپنے پاؤں کی زنجیر ہیں یہ لوگ!
دنیا جدھر چلے، اُدھر چلنا ہے ان کا کام
سانچے میں ہیت رسم کے ڈھلنا ہے ان کا کام

●

اپنے لئے یہ زہر سے بھرتے ہیں جام آپ!
اپنے لئے یہ بیٹھ کے بنتے ہیں دام آپ!
باطل کے بن گئے ہیں یہ بن کر غلام آپ!
اپنے لئے تراش رہے ہیں صلیب خود
اپنے کفن کو سیتے ہیں یہ بدنصیب خود

●

اپنے اصول پاک انھوں نے بھلا دیئے
سارے خزانہ ہائے جواہر لٹا دیئے
مئے بھی لنڈھائی، جام بھی اس میں بہا دیئے
نشے ہرن ہوا مگر یہ پھر بھی مست ہیں
خوابوں کے بادشاہ تو ہمت کے پست ہیں

●

نمرودِ کفر بانٹ رہا ہے! آذر ہے بت فروش!
فرعون کبر مست ہے! شداد عیش کوش!
الحاد حشر خیز! مسلمان ہے خموش!
کافر تو کفر کے لئے محوِ جہاد ہے!
مومن کے پاس اور کیا، اک "زندہ باد" ہے!

(۲)

وادی وہ جیسے خاص زمانوں کی خواب گاہ
ہے گود اس کی پاک فسانوں کی خواب گاہ
خاموش سی فضا! وہ خزانوں کی خواب گاہ
وہ دن گذر گئے کہ گذرتے تھے کارواں
آ آ کے منزلوں پہ اُترتے تھے کارواں

•

راہوں کے نقش وہم کی تصویر ہو گئے
دورِ فنا کے خواب کی تعبیر ہو گئے
اور سنگ میل شکوۂ تقدیر ہو گئے
ہیں قافلوں کی پیاس سے ذرّے جلے ہوئے
لے درد یاس! یاس سے ذرّے جلے ہوئے

•

برسوں ادھر سے کہ نہیں پایا گذر کوئی!
ٹوٹا نہ اوس کا کبھی نازک گہر کوئی!
مسلا گیا نہ گھاس کا یاں برگ تر کوئی!
راہی گئے تو خضر بھی، رہزن بھی سب گئے
ماضی میں بس حیات کے آثار دب گئے

•

بانگِ جرس نے پر یہاں اب پھڑ پھڑائے کب؟
سینئے صدی کے دل یہاں سر سرائے کب؟
اعصابِ وقت اذاں سے یہاں تھرتھرائے کب؟
دن آفتاب لے کے یہاں ڈھونڈتا ہے کیا؟
شب جھانکتی ہے لے کے ستارے، بگڑ چکا؟

•

ہنستی ہے یاں سحر، مگر بالکل اداس اداس!
کھلتی ہے یاں شفق، مگر رہتی ہے غرق یاس!
دم گھٹ گیا نسیم کا! ہے ندیوں کو پیاس!
فطرت ہے لالہ پوش، مگر پھر ملول ہے!
رونق ہے خوب، پر یہ نگاہوں کی بھول ہے!

(۳)

لیکن یہ وقت گردشِ پرکار ہی تو ہے!
رہوار حادثات کا رفتار ہی تو ہے!
تاریخ واقعات کی تکرار ہی تو ہے!
لمحات اپنے آپ کو لوٹ کے لائیں گے!
آ آ کے جائیں گے یونہی، جا جا کے آئیں گے

(۴)

پھر آج شہرِ عشق سے کچھ نوجواں اٹھے!
اٹھے، مثالِ موجۂ سیلِ رواں اٹھے!
اور ساتھ لے کے گرمیٔ شورِ فغاں اٹھے!
آوارہ قافلوں سے یہ آتے ہیں لوٹ کے
چوروں سے اپنے آپ کو لاتے ہیں لوٹ کر

•

تقلید سے، جمود سے، گھبرا کے آئے ہیں
پامال راستوں سے یہ اکتا کے آئے ہیں
بے رہ روی کے ہاتھ سے دکھ پا کے آئے ہیں
مژدہ کہ آج وادیٔ ویراں کی عید ہے!
چھالوں کا عیش! خارِ مغیلاں کی عید ہے!

•

جاگے ہیں سنگِ میل بھی دیرینہ خواب سے
اشکِ سرور بہ اٹھا چشمِ سراب سے!
نغمہ بہا نسیمِ سحر کے رباب سے
یہ صبح نو! کہ ریت کے ذرے چمک اٹھے
مٹی سے کچھ نقوشِ کہن پھر ابل اٹھے

•

ہے گوش "لا الٰہ" کی میٹھی صدا عجیب
ترتیلِ "والضحیٰ" کا ہے کیا مزا عجیب
اے چشم و گوش! کیا ہے قیامت بپا عجیب
آیات کی صدی میں ہے حسرت کا اعلان
یہ لوگ آدمی نہیں! جذبات ہیں رواں!

•

اخلاق نانِ راہ ہیں، طاعت کے توشہ دان

ایمان ان کا خون! عبادت ہے ان کی جان

چھوٹے نال و مال تو چھوٹے میں خان و ان

سب کچھ لٹا کے اپنی خودی کو بچا گئے!

دنیا جسے نہ پا سکی وہ راز پا گئے!

•

انسانیت! غرور سے دیکھ ان کو اور جھوم!

تیرے سپوت ہیں یہی! آ، ان کے گال چوم!

ان پر نثار جرمنی، جاپان، روس، روم!

بس زندگی کی چھاچھ کا مکھن یہی تو ہے!

قارونِ روزگار کا کل دھن یہی تو ہے!

•

اے ربِّ کائنات! زمیں آسماں کی خیر

ان راہیوں کی خیر، اور اس کارواں کی خیر!

زندہ دلانِ دہر کے عشقِ جواں کی خیر!

انسانیت کی نذر ہے! اس کو قبول کر

اے غنچۂ لب، شاخِ تمنا کو پھول کر

•

یوں تو کئی کروڑ تھے تیری سپاہ میں

کچھ میکدے میں رہ گئے، کچھ خانقاہ میں

جانیں یہ چند کل ہیں پھر تیری راہ میں

جو بجلیاں تھیں ابر میں، آخر چمک اٹھیں

چنگاریاں جو راکھ میں تھیں کچھ، بھڑک اٹھیں

(۵)

اس راہِ حق کے دیسے تو عامی تھے چند لوگ

گلہ نہ تھا تو گلہ کے داعی تھے چند لوگ

بس یونہی رہنمائی میں ساعی تھے چند لوگ

کیا بات ہے کہ آج وہی سنگِ راہ ہیں؟

کیوں معترضِ وقت سے یہ داد خواہ ہیں؟

•

کھیتی یہ دیکھیے کہ ہے خود اپنے دین کی

جو تا قلم نے جس کو، زباں سینچتی رہی!

خود آپ ہی کی سعی سے فصلِ عمل اگی

اب اس کو نوچ نوچ کے برباد کیوں کرو؟

اپنے پہ، آہ! اس طرح بیداد کیوں کرو؟

•

ان چند گرم گرم نگاہوں کو دیکھیے!

پھر غور سے ہمارے گناہوں کو دیکھیے!

غیرت سے کچھ گھٹی ہوئی آہوں کو دیکھیے

وہ رہرووں کا دیکھنا مڑ مڑ کے یاس سے!

جھکنا نگاہوں کا وہ بزرگی کے پاس سے!

•

کنکر بچا کے چھاج یہ ضائع کریں اناج!

ان کی جفا پہ صبر ہی واحد ہے احتجاج!

ورنہ بتاؤ ان کے تقدس کا کیا علاج؟

ان داڑھیوں سے شرم نہ کھائیں تو کیا کریں؟

ان صورتوں سے دب ہی نہ جائیں تو کیا کریں؟

•

اس کام کے لئے یہاں کفار کم نہیں!

اپنوں کو کیا پڑی ہے! کچھ اغیار کم نہیں!

وادی خدا نخواستہ پرخار کم نہیں!

بس دیکھیے تو بیٹھ کے "جلتے نماز" پہ

کیا بیتی ہے قافلۂ عشق باز پہ

•

اپنوں کی آہ! طنز اور تحقیر دیکھیے!

اپنے جگر پہ چھوڑتے ہیں تیر! دیکھیے!

کیا کیا دکھا رہی ہے یہ تقدیر! دیکھیے!

بھائی کو بھائی بیچ کے کھائے تو کیا گلہ؟

اپنا چراغ گھر کو جلائے تو کیا گلہ؟

(۶)

ہنس ہنس کے چوٹ کھائیے اپنے بزرگ ہیں!
جوتوں کا لطف اٹھائیے! اپنے بزرگ ہیں!
شکوہ نہ لب پہ لائیے! اپنے بزرگ ہیں!
درکار یاں "مبلغِ طائف" کا صبر ہے!
خدمت کا اجر چاہو تو یاں تیرہ جبر ہے!

مروان کا... کیا ہوا! کچھ بھی نہیں ہوا!
شفقت کا حق ادا ہوا! کچھ بھی نہیں ہوا!
جانے دو... ہوا... کچھ بھی نہیں ہوا!
کانٹے تو میٹھے لگتے ہیں اس رہگزار میں
جنت سمٹ کے بیٹھی ہے ہر نوکِ خار میں

دیکھو نہ مڑ کے اب تو بس آگے بڑھتے چلو!
کہتی ہے موجِ نفس، آگے بڑھے چلو — سنتے ہو نالۂ جرس؟ آگے بڑھتے چلو
آگے نکلیے، کام جو کرنا ہے، کیجیے!
پیچھے جو چھیتے ہیں، انہیں ... دیکھئے

(بقیہ این چہ بوالعجبی ست)

تو خود ہی فرمائیں کہ کیا ہے؟ یہ عبارت کتاب کے صفحہ ۶ پر شروع ہی میں ہے قارئین کرام خود ہی ملاحظہ فرمالیں) "آگے چل کر انسانی سیرت میں نفی و اثبات خودی اور بے خودی، لطافت و کثافت داخلیت اور خارجیت کے امتزاج کا ذکر ہے جس میں سے کسی ایک کو کلی حقیقت نہیں مانا جاسکتا" صحیح ہے اور ہمیں بھی اتفاق ہے۔ لیکن سوال تو اس بات کا ہے کہ آخر اقبال نے کب یہ دعویٰ کیا ہے کہ ان میں صرف ایک پہلو ہی کلی حقیقت ہے؟

جی ہاں! یہ اقبال ہی ہے جس کے یہاں ان سب باتوں کا امتزاج پایا جاتا ہے نہ کہ نطشے، فشتے، اور برگساں وغیرہ کے یہاں۔ جن کا ترجمان علامہ کو قرار دیا گیا ہے اور جن کی صف میں ان کو لا کھڑا کیا ہے۔

آگے چل کر فرماتے ہیں، "اقبال نے اثبات حیات کو وجدانی مانا ہے، وغیرہ وغیرہ۔" تو کیوں نہ ہم اس کو نفسیاتی اصول سے جبلیت کا عکس کہیں"۔ میں ناقد صاحب سے نفسیاتی اصول ہی کی روشنی میں پوچھتا ہوں کہ ذرا بتائیں تو کہ آخر کونسی جبلیت کا عکس ہے؟ (WILLIAM ME. DOUGALL.) اور (WILLIAM JAMES.) وغیرہ نے جو فہرست مرتب کی ہے اسے بیت... کے لئے اسے سامنے رکھ کر ہی نشاندہی فرمائیں۔ پھر یہ تو فرمائیے کہ فرائیڈ اور مارکس وغیرہ کے آسیب آپ نے کا ہے کو نفسیاتی اسکول نہ معلوم کیا ہے؟ پھر فرماتے ہیں۔" اجتماعی فلسفہ نہ جنس پر نہ ہی بھوک پر نہ ہی ہوس قوت پر اور نہ ہی سوز و آرزو پر تعمیر ہوسکتا ہے بلکہ اس میں ایک حد تک بیکار ضرور لاسکتا ہے لیکن انسانی وحدت کو جھٹلا نہیں سکتا، اگر اقبال کی خودی خود سے بن سکتی ہے تو فرائیڈ کی جنس سے بھی دنیا کی تخلیق ہوسکتی ہے"۔ میں پوچھتا ہوں کہ علامہ اقبال نے اجتماعی فلسفے کو محض سوز و آرزو پر کب تعمیر کیا ہے اور انسانی وحدت کو کس دن جھٹلایا ہے؟ ناقد صاحب! محض جملوں کی خوبصورتی سے کام نہیں چل سکتا۔ آپ اپنے دعوے کی پشت پر کچھ دلائل بھی رکھتے ہیں یا نہیں؟

آخر میں جو ناقد صاحب نے پاکستانی، اور طبقاتی کے خطابات سے اقبال کو نوازا ہے انہوں نے جذبہ انتقام کو خوب ہی نمایاں کیا ہے، اور معلوم کم عصبیت واضح ہوگئی ہے، یہ ہے اس تنقید کی حقیقت اور یہ ہے ایک خاص نقطۂ نظر" کا طرۂ امتیاز۔ قارئین خود ہی فیصلہ کرلیں۔

اب میں ناقد صاحب کا تہ دل سے مشکور ہوتا ہوں کہ انہوں نے یہ کہہ کر "حقیقت ایک ایسی مسلمہ صداقت ہے کہ گہرا علم بھی حقیقت کی نقاب کشائی میں حائل نہیں ہوسکتا" میری دلآزردہ پوری کردی، ذرا اس جملے کو اور گہرا کیجیے۔

گلگشت!

(تعارف کتب وجرائد)

(گذشتہ سے پیوستہ)

"تدبّرِ قرآن" کے مبحث اوّل پر ہم پہلے تبصرہ کر چکے ہیں جس میں جناب مولف نے اس بات کو واضح کیا ہے کہ قرآن کے فہم کے لئے تدبّر اور اس کے ساتھ ساتھ حسن نیت کی ضرورت ہے۔ اب دوسرا حصہ پیش نظر ہے، یعنی قرآن کے آسان ہونے کی بحث، جو "تیسیر قرآن" عنوان سے ایک سو سے زیادہ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔

اس بحث کا آغاز اس سوال سے کیا گیا ہے کہ جب قرآن کی تعریف هُدًی لِلنَّاسِ "ولقد یسرنا القرآن" قرآناً غیر ذی عوج تبیاناً لکل شیٔ ۔ کے کلمات سے کی گئی ہے تو پھر اس کے سمجھنے کے لئے عربی زبان کے سوا خارج کی اور کسی چیز۔ یہاں تک کہ حدیث وسنت نبوی اور ارشادات صحابہ۔ وغیرہ سے مدد لینے کی کوئی حاجت نہیں ہو سکتی۔

یوں اصلاحی صاحب نے اپنے دور کے ایک خطرناک فتنہ کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ اس کے بعد وہ فرماتے ہیں کہ یہ فتنہ کسی عارضی یا ہنگامی غلط روی کا نتیجہ نہیں بلکہ تفسیر و تاویل کا جو طریقہ مسلمانوں میں نشو ونما پاتا رہا ہے یہ اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ لوگوں میں شکوک وشبہات پیدا ہوں۔ اور پھر کتاب الٰہی کے متعلق آزادی ومطلق العنانی کا ایک ایسا فتنہ اٹھے جو پچھلے فتنوں سے شدید تر ہو۔

اس اجمال کی شرح کے لئے مولینا اصلاحی نے تاریخ تفسیر و تاویل پر ایک نظر ڈالی ہے۔ آپ کے نزدیک پہلا وسیع اور معیاری دورِ تفسیر عہد نبوی ہے جس میں قرآن کے تعلیم وتعلّم کے تمام ضروری شرائط واحوال بدرجۂ کمال موجود تھے۔ پھر اسلامی تعلیمات کے زوال کے ساتھ جب عجمیت آ گھسی اور بدعتوں کا فتنہ اٹھ کھڑا ہو تو اس کے تیشوں کی اولین ضربیں قرآن ہی پر پڑیں۔ اس فتنہ کے سدباب کے لئے اہل حق نے یہ مسلک اختیار کیا کہ تفسیر قرآن کے باب میں تمام قیل وقال سے علیحدہ ہو کر حتی الامکان صرف رسول اللہ صلعم اور صحابہ وتابعین رضی اللہ عنہم کے اقوال وآثار پر اعتماد کیا جائے تاکہ اصحاب بدعت کو کتاب الٰہی میں دراندازی کا موقع نہ ملے۔

اس اصول پر سب سے اہم اولین کتاب علامہ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر ہے۔ لیکن اس تفسیر میں ایک موقعے سے متعلق تمام روایات اقوال اور آثار بلا کسی جرح ونقد کے جمع ہیں اس کے بعد اسی تفسیر کا ایک خلاصہ تفسیر ابن کثیر کی صورت میں سامنے آیا جس میں محدثانہ طرز پر روایات پر تنقید کی گئی ہے، لیکن قرآن کے فہم وتدبر کے دوسرے اصولوں سے اسمیں بھی کوئی تعرض نہیں کیا گیا۔

پھر مولف علی الترتیب مختلف مرکزی کتب تفسیر کا تعارف کراتے ہوئے نتیجۃً یہ فرماتے ہیں کہ:-

"اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ دورِ اوّل کے بعد تفسیر قرآن کی راہ میں جو پہلا ہی قدم اٹھایا گیا وہی غلط تھا" ———— کہا جا سکتا ہے کہ ایک فتنہ کا دروازہ بند کرنے کی کوشش کی گئی اور ساتھ ہی ایک دوسرے فتنہ کا دروازہ کھول دیا گیا[1]

---

[1] دیوبند اور سہارنپور کی حسِ شامہ کو خدا زندہ رکھے تو ان الفاظ میں توہین اکابر کی بو سونگھی جا سکتی ہے۔

گلگشت

یعنی:-

"اہل بدعت اور اصحابِ باطل کی مطلق العنانیوں اور فتنہ آرائیوں سے بچنے کے لئے روایات و آثار کو اہمیت دی گئی، لیکن پھر روایات میں اس درجہ انہماک بڑھ گیا کہ ان کے بارہ میں نقد و تمیز کی آنکھیں بند ہو گئیں اور آہستہ آہستہ صحیح روایات کے ساتھ قصوں اور اسرائیلیات کا ایک بڑا حصہ بھی تفسیر کی کتابوں میں داخل ہو گیا"

بعد کے دور میں فلسفہ و کلام میدان میں کود پڑے اور ذہنی انتشار پیدا ہو گیا۔ مولف لکھتے ہیں کہ:-

"اب تک خیریت تھی کہ قرآن مجید کی تاویل صرف روایات پر منحصر تھی۔ ہر بات کا سلسلہ صحیح یا غلط طور پر ابن عباس، مجاہد، قتادہ وغیرہم تک پہنچتا تھا لیکن اب وہ لوگ بھی شریکِ بزم ہو گئے جو نقل سے زیادہ عقل کے دلدادہ تھے اور قرآن مجید کی ہر آیت کو اپنے قالب میں ڈھالنے کے شائق تھے"

اب کیا ہوا؟

"روایات و آثار کے وافر ذخیرہ میں سے ہر گروہ نے اتنا لے لیا جتنا اس کو اپنے مذاق اور اپنی خواہشوں کے مطابق نظر آیا۔ باقی کو بغیر ہاتھ لگائے اپنے حریفوں کے لئے چھوڑ دیا گیا۔ جو انہیں اپنے قرار دادہ مذہب کے موافق معلوم ہوئیں ان کو اپنی تائید میں استعمال کر لیا۔ اور جو بظاہر کسی قدر مخالف نظر آئیں ان کو آیاتِ متشابہات کی فہرست میں داخل کر دیا۔ ______ منسوخات کے سلسلہ میں قرآن کا ایک بڑا حصہ امت کے لئے بے مقصد ہو ہی چکا تھا۔ اس فرقہ وارانہ تقسیم نے ایک اور بڑے حصہ کو آیاتِ متشابہات کی فہرست میں داخل کر دیا"

اب مزید ترقی کا قدم اٹھتا ہے:-

"اس اختلاف و نزاع نے آگے بڑھ کے ایک اور فتنہ اٹھایا۔ یعنی سرے سے تمام نقلی دلائل کی قطعیت ہی مشتبہ و مشکوک ہو گئی اور لوگوں میں یہ خیال پھیل گیا کہ چونکہ زبان اور کلام کی بنیاد تمام تر نقل پر ہے اور نقل ایک ظنی چیز ہے اس لئے الفاظ کی دلالت قطعی نہیں ہو سکتی"

اس فلسفۂ تفسیر کے بیٹے امام رازی کے ہاں جو دلچسپ استدلال پایا جاتا ہے اسے جناب مولف نے نقل فرما دیا ہے۔ یہ ہے ہماری وہ پچھلی تاریخ تفسیر جس کے ردِ عمل کے طور پر ایک گروہ نے روایات و احادیث کے خلاف اعلان جنگ کر دیا ہے۔ یہ پورا پس منظر فراہم کرنے کے بعد مولانا اصلاحی اس گرہ کو کھولتے ہیں کہ کسی کلام کے مشکل اور آسان ہونے کا مفہوم کیا ہو سکتا ہے۔ کلام کے مشکل اور آسان ہونے کے تین پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ خود کلام باعتبار الفاظ و اسلوب مشکل یا آسان ہو، دوسرے یہ کہ باعتبار نوعیت مضامین وہ غور و تدبر کا محتاج ہو یا نہ ہو۔ تیسرے یہ کہ کلام اپنے مخاطبین کی ذہنی سطح سے زیادہ بلند یا برابر ہو۔

جہاں تک اولین پہلو کا تعلق ہے قرآن کے آسان ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ لیکن دوسرے اور تیسرے پہلو کا سوال ذرا پیچیدہ ہے۔

باعتبار مضامین قرآن کی نوعیت کلام کو سمجھنے میں جو بڑی غلط فہمی حائل ہوتی ہے وہ مولف کی نگاہ میں یہ ہے کہ مسلمانوں میں یہ خیال پھیل گیا کہ قرآن محض احکام و قوانین کا ایک مجموعہ ہے۔ آج علماء اور جدید تعلیم یافتہ دونوں طبقوں میں یہ غلط فہمی عام ہے۔ چنانچہ بہت سے دین دار عمل کے لئے فقہ کی کوئی کتاب پڑھ لینا کافی سمجھتے ہیں۔ اور قرآن کو محض تبرکاً پڑھ لیتے ہیں۔ علم و یقین بیدار کرنے اور ذہن و فکر کی تربیت حاصل کرنے کے لئے انھوں نے قرآن سے کبھی دلچسپی نہیں لی۔ اس مقصد کے لئے ہمارے پچھلے لوگوں نے یونانی فلسفے

گلگشت

سانچے میں ڈھلا ہوا علم کلام خوب خوب قبول ہوا۔

باعتبار مخاطبین لوگوں میں بڑی غلط فہمی پیدا کرنے والا خیال یہ ہے کہ عرب ایک جاہل قوم تھی۔ اور جب اس نے قرآن کو بہ سہولت سمجھ لیا تو پھر کسی اور کو کیا مشکل پیش آسکتی ہے۔ حالانکہ عرب زبان اور کلام کی رمز شناسیوں اور نکتہ سنجیوں میں اپنے دور کی دوسری اقوام سے فرسنگوں آگے تھے۔

ان غلط فہمیوں کو صاف کرنے کے لئے اصلاحی صاحب نے مقصدِ نزول قرآن پر بڑی مدلل گفتگو کی ہے۔ کہ یہ کتاب صرف مجموعہ احکام و قوانین نہیں بلکہ دراصل رزمِ خیر و شر میں انسان کے لئے تریاق بلکہ سرچشمۂ قوت ہے۔ قصۂ آدم و حوا کی روشنی میں یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ :-

"شیطان کے بھیس ان گنت اور اس کے داؤں بے شمار ہیں۔ انسان کے اندر جتنی ظاہری اور باطنی قوتیں ودیعت ہیں، سب کی گھاٹیاں اس کو معلوم ہیں۔ وہ ہر دروازے سے گھستا اور ہر راستہ سے نکلتا ہے وہ خون بن کر رگوں میں دوڑتا ہے۔ جذبات و شہوات کی صورت میں ہیجان میں آتا ہے۔ حسن بن کر لبھاتا ہے۔ عشق بن کر چٹکیاں لیتا ہے، امید و تمنا کے سبز باغ دکھا کر اچھالتا ہے، پھر مایوسی کی کمند ڈال کر پچھاڑ دیتا ہے۔ اس کے پاس طرح طرح کے واعظانہ لطیفے اور حکیمانہ نکتے ہیں۔ وہ منطقیوں کی طرح صغریٰ و کبریٰ تراشتا ہے، فلسفیوں کی طرح حقائق عالم اور اسرار کائنات کا درس دیتا ہے اور ماہرین سیاست کی طرح سیاست اور فرماں روائی کے نکتے بیان کرتا ہے، اور جب ان تمام تدبیروں سے بھی بنی آدم کی مخالفت اور دشمنی کا جوش ٹھنڈا نہیں پڑتا تو کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مدعی نبوت بن کر نبوت کرنے لگ جاتا ہے۔ ایسے ہوشیار دشمن کے فتنوں سے انسان کو بچانے کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کتاب دی جائے وہ اگر محض چند قوانین اور چند نصیحتوں کا سیدھا سادہ مجموعہ ہو تو غور کیجئے کہ ایسا معمولی ہتھیار اتنے خوفناک دشمن کے مقابلہ میں کیا کام دے سکتا ہے ؟"

پس قرآن تلاوتِ آیات، تزکیہ اور تعلیم کتاب کے سہ گونہ اہتمام کے ساتھ نازل ہوا ہے۔ ان حقیقتوں کی تفصیل اصل کتاب ہی میں دیکھی جا سکتی ہے۔ یہاں ان کا خلاصہ بھی عرض کرنا مشکل ہے۔ اسی طرح حکمت و موعظت کی معنویت پر مولف کی تحقیق بڑی اہم ہے۔

بحث کے ان سارے مراحل سے گذر کر مولف قاری کو اس حقیقت کے اعتراف تک لے آئے ہیں کہ قرآن مجید محل تدبر ہے۔ یہاں صرف "عربی زبان دانی ہی کافی نہیں ہے بلکہ تدبر کی بھی ضرورت ہے۔ صرف پیرنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ غوطہ لگانا بھی پڑتا ہے۔ راہ چلتوں کی طرح صرف گذر ہی نہیں جانا چاہیئے بلکہ لفظ لفظ پر رک کر ایک ایک گوشہ کی تفتیش بھی کرنی چاہیئے"

یہی وہ ضرورت تدبر تھی کہ صحابہ حلقے قائم کر کے قرآن کے اسرار و غوامض پر غور و فکر اور بحث و نظر سے کام لیتے تھے اور ایسے حلقوں کو نبی صلعم نے خود بڑی اہمیت دی۔

مولف فرماتے ہیں :-

"سوچنے کی بات ہے کہ آخر صحابہ کس چیز پر غور و تدبر کرتے تھے ؟ زبان ان کی تھی، اس کے اسالیب و قواعد ان کے غور و بحث کی چیز نہ تھے۔ قرآن جن حالات و واقعات پر اترتا تھا وہ تمام تر ان کے دیکھے ہوئے تھے۔ ان کے جاننے کیلئے ان کو کوئی کاوش نہیں کرنی تھی۔ تلمیحات و اشارات کا تعلق ایسی باتوں سے تھا جن کی تفصیلات پر وہ روزانہ گفتگو کیا

کرتے تھے، خیالات، عقائد، اعمال و افعال اور معروف و منکر ۔۔۔ پر قرآن بحث کرتا تھا وہ سر تا سر خود ان کی اپنی سرگذشت تھی "

"پھر ایسی کیا چیز تھی جس پر ان کو غور کرنا تھا !"

اور یہی سوال دراصل تیسیر قرآن کے غلط مفہوم کے داعیوں کا جواب ہے۔ آیت " ولقد یسرنا القرآن للذکر" کی تفسیر کے تحت لفظ تیسیر اور ذکر کا صحیح مفہوم واضح کر کے جس طرح مولف نے ہمارے متجدد مفسرین کی گرہ کھولنے کی کوشش کی ہے وہ بڑے تدبر و تحقیق کا ثبوت ہے۔

پھر تیسیر قرآن کی حقیقت کے مختلف پہلوؤں کی تفصیل کی ہے اور وہ پہلو یہ ہیں:۔

(۱) قرآن مجید کا عربی مبین میں نازل ہونا۔ (۲) قرآن کا ایک حکیمانہ تدریج سے نازل ہونا۔ (۳) پہلے محکمات دین اور کلیات دین کا ذہن نشین کرانا اور پھر ان کی روشنی میں جزئیات اور تفصیلات سامنے لانا۔ (۴) تصریف و تکرار سے بات کو اچھی طرح کھولنا۔

" قرآن مجید کی مشکلات باعتبار مخاطب" بھی بڑی کار آمد ذیلی فصل ہے اس فصل کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ صحابہ کے مقابلہ میں آج ہمارے لئے قرآن کو سمجھنے میں کیا کیا نئی ضروریات پیدا ہوگئی ہیں۔

آخر میں سلف کے "طریقہ تفسیر" پر علامہ سیوطی کے ایک حوالے سے گفتگو شروع کی گئی ہے۔ جس کا ماحصل یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر کرنے والے کو اولاً قرآن کے مجمل مقامات کی تفصیل خود قرآن ہی کے دوسرے مقامات میں تلاش کرنی چاہئیے پھر اگر حقیقت نہ کھلے تو سنت میں اس کی تفسیر تلاش کرے، اگر سنت میں بھی نہ پائے تو صحابہ کے اقوال کی طرف متوجہ ہو۔

مولف اسی کو فطری طریق تفسیر مانتے ہیں، اور اپنے الفاظ میں وہی بات یوں پیش فرماتے ہیں:۔

"اس سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ جو لوگ آنحضرت صلعم کی تشریحات اور صحابہ کے اقوال کی روشنی میں قرآن مجید کو سمجھنا چاہتے ہیں وہ قرآن کے الفاظ کی حکومت باطل نہیں کرنا چاہتے ۔۔۔۔۔۔۔ ہاں اگر کوئی بات ایسی ہے جو خود قرآن مجید سے صاف نہیں ہو رہی تو اس کے لئے آدمی کہاں جائے؟ ایک آزاد خیال سے آزاد خیال آدمی بھی اس سوال کا جواب یہی دے گا کہ ایسی مشکلات میں بہترین رہنمائی سنت رسول اور اقوال صحابہ کی رہنمائی ہی ہو سکتی ہے۔ اس لئے کہ جس پر قرآن اترا اور جن لوگوں کی اصلاح و تربیت کے لئے اترا وہ اس کو جس قدر بہتر سمجھ سکتے ہیں دوسرے اس قدر بہتر نہیں سمجھ سکتے۔ لیکن اس رہنمائی کی صورت کیا ہوگی؟ یہ ہوگی کہ ایک آیت پر اس کے الفاظی روشنی میں پوری طرح غور کر لیا قرآن مجید میں جو آیات اس کی مماثل ہیں ان کی روشنی میں بھی اس کو ہر طرح دیکھ لیا، سیاق سباق اور عمود و نظم کے پہلو سے بھی اس پر نگاہ ڈال لی، لیکن ان تمام باتوں کے بعد بھی پوری تشفی نہیں ہوتی۔ الفاظ کچھ چاہتے ہیں لیکن صاف نہیں معلوم ہوتا کہ کیا چاہتے ہیں؟ اب ہم احادیث اور اقوال صحابہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اور کوئی ایسی بات پا لیتے ہیں جس سے اس آیت کا تمام عالم روشن ہو جاتا ہے۔ الفاظ کو اس کے بعد کسی بات کا انتظار نہیں رہ جاتا، نظم اور سیاق کلام سب کا حق ادا ہو جاتا ہے ۔۔۔ تو اس بات کو اگر وہ صحیح طریقے سے منقول ہو گی قبول کر لیں گے۔ یہ نہیں کریں گے کہ آیت کے الفاظ کسی توضیح و تشریح کے منتظر ہوں یا نہ ہوں لیکن ایک بات جو روایات کے ذخیرہ میں ہم نے دیکھی ہے خواہ مخواہ اس پر چسپاں کر دیا گو نظم و سیاق، آیات مماثل اور نصوص کتاب و سنت سب اس کے علانیہ مخالف ہوں "

اسکے بعد شان نزول کے بارے میں غلط فہمیوں کو صاف کرتے ہوئے کتاب اپنے انجام تک پہنچی ہے آخری صفحات میں پوری بحث

کا خلاصہ چند اشارات کی صورت میں درج کردیا گیا ہے۔

جہاں ہم مولف کے اس کارنامۂ علمی کا استقبال پورے جذبۂ اعتراف کے ساتھ کر رہے ہیں، وہیں ہمیں مکتبۂ یثرب سے شکایت ہے کہ اس نے ۲۰۴ صفحے کی کتاب کو جس کا گرد و پوش سادہ ہے اور جلد اتنی کمزور ہے کہ اس تبصرے کی تکمیل سے قبل اس کے ٹانکے ٹوٹ چکے ہیں، اڑھائی روپے میں بیچنے کا فیصلہ کیا ہے۔ دنیائے کتابیات کو بلاشبہ گرانی اور دوسری مشکلات کا سامنا ہے، مگر نہ اتنا کہ جتنا تدبرِ قرآن کی قیمت سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ کتاب زیادہ سے زیادہ دو روپے میں خریدار کو ملنی چاہیئے تھی۔!

تعارف و تبصرہ کے لئے جن مصنفین اور ناشرین کی طرف سے متعدد کتب و جرائد ہمیں موصول ہیں، ان سے ادارہ معذرت کرتا ہے کہ "تدبرِ قرآن" کے تفصیلی تبصرے نے جولائی اور اگست کی اشاعتوں میں کوئی جگہ باقی نہیں چھوڑی۔ انشاء اللہ جمع شدہ کتب و جرائد پہ ستمبر نمبر میں تبصرہ درج کردیا جائے گا۔ (ادارہ)

جاری کردہ:- دفتر مسواک ۵۸ لکشمی بلڈنگ بندر روڈ۔ کراچی

"چراغ راہ" کا شعر نمبر

ان سوالوں کا ایک ٹھوس جواب دینے کے لئے کہ:-

شعر کی دنیا میں کفر و اسلام کی تفریق کیا معنی رکھتی ہے!

اسلام پسند شعرا کی راہیں کس مقام پر دوسروں سے الگ ہو جاتی ہیں؟

وہ نئے راستے بناتے ہوئے کس رفتار سے پیشقدمی کر رہے ہیں؟

انھوں نے نظریہ و تخیل اور جذبات و حسیات کے کیسے کیسے نئے نمونے پیش کر دیئے ہیں؟

ان کی کمزوریاں کیا ہیں اور ان کی معذوریاں کیا ہیں!

ہم یکم اکتوبر ۱۹۵۱ء کو چراغ راہ کا شعر نمبر پیش کر رہے ہیں!

اس نمبر میں کیا ہو گا؟ ——————

ا - اسلام پسند شعرا کی بہترین تازہ نظمیں۔

ب - اسلام پسند شعرا کی نظموں کا ایک جامع انتخاب بہ ترتیب ذیل:-

اگست ۱۹۴۷ء تک

اگست ۱۹۴۷ء تا اگست ۱۹۴۸ء

اگست ۱۹۴۸ء تا اگست ۱۹۴۹ء

اگست ۱۹۴۹ء تا اگست ۱۹۵۰ء

اگست ۱۹۵۰ء تا اگست ۱۹۵۱ء

ج - اس انتخاب پر تعارفی تبصرے —————— چند ذمہ دار اصحاب کے قلم سے!

د - ایک جامع افتتاحیہ مرتب کے قلم سے!

ایجنٹ حضرات اپنی ضرورت سے بروقت مطلع کریں - کاروباری حضرات اشتہار دینے کیلئے ابھی سے خط و کتابت کریں

ہمارا پتہ:-

—— انتظامی اور مالیاتی امور کے لئے ——

دفتر "چراغ راہ" - ۹، لوٹیا بلڈنگ آرام باغ روڈ
کراچی

—— ادارتی امور کے لئے ——

نعیم صدیقی، مدیر چراغ راہ - ۱۲، شاہ جمال - اچھرہ
لاہور

شربتِ روح افزا

گرمی ہو یا برسات آپ کے لئے

ضروری ہے

ساختہ

ہمدرد دواخانہ کراچی

دماغی کمزوری

دماغ افروز

حافظہ کی کمزوری - قوتِ سوچ بچار کی کمی - اعصاب کی کمزوری - تحریر و تقریر کے دوران خیالات کی آورد میں رکاوٹ کے لئے

ہمارا خاص تحفہ ہے جو مجرب اور آزمودہ ہے ،

فل کورس ۳۰ یوم ۲۰-۰-۰ ۱۰ یوم ۶-۰-۰

خمیرہ گاؤزبان عنبری باضافہ جواہرات

اعصاب کی کمزوری - اعضائے رئیسہ - دل دماغ اور عام جسمانی کمزوریوں کا مجرب علاج

لمبی بیماریوں کی کمزوری کا خصوصی علاج ہے - عنبر - زعفران اور جواہرات کے

اضافہ سے تیار کردہ ، فل کورس ۳۰ یوم ۱۴-۸-۰۰ ۱۰ یوم ۵-۴-۰

دواء المسک معتدل باضافہ جواہرات

دل کی دھڑکن اور کمزوری - خون کی کمی اور جسم کی عام کمزوری کے لئے بیش بہا نسخہ ہضم

کی خرابی، جگر کی کمزوری کا خصوصی علاج ہے - جسے کستوری عنبر زعفران اور جواہرات

کے اضافہ سے تیار کیا گیا ہے ، ۳۰ یوم فل کورس ۱۴-۸-۰۰ ۱۰ یوم ۵-۴-۰

اشرف میڈیکل ہال لائل پور

مکتبہ اشرف العلوم بالمقابل مولوی مسافر خانہ کراچی

فتاویٰ دار العلوم دیوبند

جو ہندوستان و پاکستان کے علماء اور عوام میں نہایت مقبول و مستند ہیں۔ اکثر فتاویٰ میں دلائل مع عبارات فقہ موجود ہیں۔ عوام کے لئے ایک ماہر مفتی اور طلباء کے لئے محقق استاذ کا کام دیتے ہیں۔ پہلے آٹھ جلدوں میں طبع ہوئے تھے۔ مگر اس میں تبویب و ترتیب نہ ہونے کے سبب اس کے مسائل کا معلوم کرنا مشکل تھا اس مرتبہ ترتیب و تبویب کے ساتھ عمدہ طبع کرایا گیا ہے۔ جلد اول و دوم طبع ہو چکی ہے جس کی قیمت مع عمدہ جلد کے چھ روپے ہے۔ بلا جلد [illegible]۔

سو وعظ اور سو مقالات حکمت

حضرت حکیم الامت تھانوی کے مواعظ و ملفوظات نے تجربہ سے اصلاح خلق کے لئے اکسیر ثابت ہوئے ہیں جو وعظ کا ایک سلسلہ دعوات عبدیت کے نام سے نو جلدوں میں شائع ہو تھا۔ اب اس کی پہلی جلد جس میں دس وعظ اور سو ملفوظات میں جمع کی گئی ہے۔ خوبصورت رنگین چھپی ہوئی جلد کے ساتھ۔ قیمت تین روپے۔

پردہ شرعی کے تین رسالے

مصنفہ حضرت حکیم الامۃ تھانویؒ۔ یعنی القول الصواب، ثبات الستور، آغار السکینہ۔ مجلد عمدہ ایک روپیہ چار آنہ۔ بلا جلد پندرہ آنہ [illegible]

بارہ مہینے کیلئے تمام احکام پر مشتمل خطبے

یعنی خطبات الاحکام مصنفہ حضرت حکیم الامۃ تھانوی۔ جن میں تمام ضروری احکام اسلامیہ کو قرآن و حدیث کے الفاظ میں جمع کر دیا گیا ہے۔ عوام کے نفع کیلئے آخر میں خطبات کا ترجمہ اردو بھی لگا دیا گیا ہے۔ اس مرتبہ نہایت عمدہ اعلیٰ طباعت اور رنگ کی چھپی ہوئی جلد کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ قیمت مجلد دو روپے بارہ آنہ۔ بلا جلد دو روپے چار آنہ۔

احکام اسلام عقل کی نظر میں

تمام احکام شرعیہ کی عقلی حکمتیں باب وار اس میں جمع کر دی گئی ہیں۔ مصنفہ حضرت حکیم الامۃ قدس سرہ عرصہ سے نایاب تھی۔ حال میں چھوٹی تقطیع پر خوبصورت طبع کی گئی ہے۔ قیمت مجلد عمدہ تین روپے چار آنہ [illegible]

حقانیت اسلام غیروں کی زبان پر

تمام غیر مسلم مذہب عیسائی یہودی، ہندو، آریہ سکھ وغیرہ کے مشاہیر اہل قلم کے مضامین جس میں اسلام کے فضائل اور حقانیت کا اقرار ہے۔ جمع کئے گئے ہیں۔ مصنفہ حضرت حکیم الامۃ قدس سرہ۔ مجلد عمدہ ایک روپیہ آٹھ آنہ۔

خلاصۃ تصانیف حضرت حکیم الامت

یعنی بوادر النوادر حضرت قدس سرہ کی اکثر زیر دہ تصانیف کا خلاصہ [illegible] روپے

امداد الفتاویٰ مبوب

حضرت حکیم الامۃ کی تصانیف میں بڑی اہم چیز ان کے فتاویٰ ہیں جو امداد الفتاویٰ و فتاویٰ شرفیہ کے نام سے چار مستقل جلدوں اور چھ ضمیموں کی صورت میں شائع ہوئے تھے لیکن ان میں ترتیب و تبویب نہیں تھی جس کی وجہ سے مسئلہ نکالنے میں دشواری تھی۔ اس مرتبہ ادارہ نے از سر نو تبویب کرائی ہے دو جلدیں تیار ہیں قیمت فی جلد [illegible] جلد کا نام درج رجسٹر کرا لیں۔

آداب زندگی

یعنی حضرت حکیم الامت کے چار رسالے حقوق الاسلام حقوق الوالدین، آداب المعاشرت، اغلاط العوام کا مجموعہ مجلد عمدہ۔ قیمت ایک روپیہ چار آنہ [illegible]

آداب النبی

مصنفہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب جس میں آنحضرت کے شمائل، اخلاق، عادات اور معجزات کو بحوالہ احادیث معتبرہ لکھا گیا ہے۔ مجلد عمدہ مع گرد پوش رنگین۔ ایک روپیہ

سیرت خاتم الانبیاء

مصنفہ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب آنحضرت کی سیرت طیبہ پر ہزاروں کتابیں لکھی جا چکی ہیں لیکن اس کی خصوصیت یہ ہے کہ مختصر ہونے کے باوجود کوئی اہم واقعہ نظر انداز نہیں ہوا۔ اس کی ساتھ مسئلہ جہاد، تعدد ازواج، واقعہ معراج پر سیر حاصل بحث اور شبہات کے محققانہ جوابات بھی ہیں۔ بنگال پنجاب وغیرہ کے بہت سے مدارس میں داخل درس ہے۔ ۵۰ ہزار سے زیادہ شائع ہو چکی ہے۔ قیمت [illegible] مجلد [illegible]

ختم نبوت

مصنفہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب پہلا حصہ ختم النبوۃ فی القرآن ہے جس میں قرآن کی ایک سو آیات سے ختم نبوت کا ثبوت اور تحریفات مرزا کا جواب ہے۔ دوسرا حصہ ختم النبوۃ فی الحدیث ہے جس میں دو سو سے زائد احادیث معتبرہ سے اس مسئلہ کو واضح کیا گیا ہے۔ اور تحریفات و تاویلات باطلہ کی حقیقت کھول دی گئی ہے۔ تیسرا حصہ ختم النبوۃ فی الآثار ہے جس میں سینکڑوں صحابہ و تابعین و ائمہ دین اور علماء امت کے اقوال تصریحات اس مسئلہ کے متعلق پیش کئے گئے ہیں۔ قیمت کامل سہ حصہ مجلد [illegible]

گناہ بے لذت

مصنفہ مفتی اعظم پاکستان مولانا محمد شفیع صاحب اس رسالہ میں تمام گناہوں کی فہرست اور ان کے متعلق احکامات ہیں جن کے کرنے میں نہ کوئی دنیاوی فائدہ اور نہ کوئی لذت ہے۔ قیمت مجلد اعلیٰ گرد پوش کے ساتھ ایک روپیہ [illegible]

نیک بیبیاں

از قلم ربانی مولانا سید اصغر حسین۔ امہات المومنین۔ یعنی ازواج رسول حلیمہ سعدیہ، حضرت فاطمہ، حضرت خدیجہ، حضرت عائشہ کی مختصر مگر نہایت جامع و مستند سوانح حیات تحریر بہت ہی نہایت سلیس۔ مجلد مع گرد پوش [illegible]

گناہوں کا کفارہ

یعنی "نجات المسلمین" اس رسالہ میں اعمال اور اذکار جن سے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے احادیث صحیحہ سے جمع کئے گئے ہیں۔ اس موضوع پر اردو میں کوئی رسالہ نہ تھا۔ مفتی محمد شفیع صاحب نے سلیس اردو میں تحریر فرمایا ہے اسکو اگر حیوۃ المسلمین کا دوسرا حصہ کہا جائے تو مناسب ہے۔ قیمت [illegible]

تبلیغ دین

[illegible] غزالیؒ کے رسالہ کا ترجمہ اصلاح کے لئے اکسیر ہے۔ طبع جدید مجلد عمدہ تین روپے [illegible]

ادارہ اشرف العلوم کراچی کی مطبوعات جدیدہ

Only Title Printed at SHAN ELECTRIC PRESS Arambaugh Road, Karac[hi]
Printer & Publisher Ghulam Mohammed, M. Chaudhri

ماہنامہ **چراغِ راہ** کراچی

جلد ۴ ——— شمارہ ۹

۹۔ لوٹیا بلڈنگ ——— آرام باغ روڈ

فہرست

اگلا نمبر ''شعر نمبر'' ہوگا

سالانہ چندہ

قیمت فی پرچہ

ادارۂ تحریر

۱۲۔ شاہ جمال۔ اچھرہ ——— لاہور

غلام محمد پرنٹر پبلشر نے ناظر پریس کراچی سے طبع کروا کر ۹۔ لوٹیا بلڈنگ، آرام باغ روڈ۔ دفتر چراغِ راہ کراچی سے شائع کیا۔

سوچ بچار

ہماری داخلی اور خارجی پالیسی

پاکستان کے مسلمانوں کے لئے اس وقت سب سے بڑا خطرہ انڈین یونین کی افواج کا اس کے ملک کی سرحدوں پر اجتماع ہے۔ اس کا
پس منظر خواہ کچھ ہی ہو لیکن ہم جانتے ہیں کہ اس نقل و حرکت کے پیچھے جارحانہ عزائم کارفرما ہیں ــــ ان حالات میں انڈین یونین کی
بدعہدیوں اور کم ظرفیوں اور خرمستیوں پر ہمارا غصہ بجا۔ انگریزوں کے غدارانہ رویہ پر ہماری شکایت درست۔ اقوام متحدہ کی بدنیتی پر ہمارا
غیظ و غضب برحق۔ مگر ہم کبھی ان خطرات کو ٹال نہیں سکتے جب تک کہ خود اپنی ان غلطیوں کو محسوس نہ کریں جن کی بدولت پے در پے
ہمیں زکیں اٹھانا پڑ رہی ہیں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ حوادث سے دوچار ہونے سے پہلے ہم کبھی اپنی آنکھیں نہیں کھولتے اور مصیبت گزر جانے کے
بعد ہم پھر مستی کی پینگ میں سو رہتے ہیں۔ کسی باہر والے کی دشمنی اور کسی گھر والے کی غداری ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی اگر ہماری ہی کمزوریاں
اس کی مدد نہ کریں۔ اس وقت پاکستان کے عوام نے اپنے سارے اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر جس یک جہتی کا ثبوت دیا ہے وہ قابل
صد ستائش ہے اور حکومت کو اس پر بجا طور پر ناز کرنا چاہیئے۔ لیکن اسے اپنی داخلی اور خارجی پالیسی پر پھر ایک دفعہ ٹھنڈے دل سے غور
کرنا ہے کہ کہیں اس میں تو کوئی ایسا سقم نہیں رہ گیا جو مستقبل قریب میں ہمارے لئے کسی نقصان کا باعث بنے۔ اس لئے جہاں ہم حکومت
پاکستان کو یہ یقین دلاتے ہیں کہ ہم اسلام کے اس گھر کی پوری طرح حفاظت کریں گے اور تمام دفاعی معاملات میں ہر طرح کا تعاون کرینگے
وہاں حکومت کو بھی اس امر کی دعوت دیتے ہیں کہ وہ اینٹ اور پتھر کے قلعہ کی جانچ پڑتال کے ساتھ ساتھ اپنے اس طریق کار کا بھی محاسبہ
کرے جس پر اب تک وہ گامزن رہی ہے اور جس کی وجہ سے دشمن کو بار بار سر اٹھانے کی جرأت ہوتی ہے۔ بیرونی خطرے کا ڈر بلا شبہ
ایک قوم کو متحد کر سکتا ہے، اس کے اندرونی اختلافات کو دبا سکتا ہے، اس کی خفتہ قوتوں کو بیدار کر سکتا ہے اور اس کے اندر بہت
سے اُن اوصاف کو ابھار سکتا ہے جو تعمیر و استحکام کے لئے درکار ہوتے ہیں مگر جہاں تک تاریخ ہماری رہنمائی کرتی ہے ہمیں یہی پتہ چلتا
ہے کہ ڈر فی الحقیقت کوئی تعمیری طاقت نہیں بلکہ وہ ایک وقتی و ہنگامی چیز ہے، اس پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے انحصار نہیں کیا جا سکتا
ہے کہ اس سے ہمارے اندر وہ صلاحیتیں پیدا نہیں ہو سکتیں جو اپنی حیات قومی کی تکمیل کے لئے ہمیں مطلوب ہیں۔ تاریخ انگلستان میں
ٹیوڈر کا عہد اس کی بہترین مثال ہے۔ بیرونی خطرات نے اس قوم کو یقیناً متحد کر دیا۔ اس کے مائل بہ انتشار اجزا کو کچھ دیر جوڑے
رکھا لیکن وہ ان کمزوریوں کو دور نہ کر سکے جو اس قوم میں فی الحقیقت پائی جاتی تھیں۔ چنانچہ جونہی یہ ڈر ختم ہوا تو وہ ساری خامیاں اور
وہ ساری رقابتیں جو اس قوم میں پائی جاتی تھیں وہ سطح پر ابھر آئیں اور سٹورٹ کا پورا عہد انہیں میں صرف ہوا۔ اس لئے بیرونی خطرہ
فی الواقع ہمارے سروں پر منڈلا رہا ہے اپنی فطری حد تک ہی رہے تو بہتر ہے۔ ہمیں ایک استحکامی اور تعمیری طاقت کی حیثیت سے
اس پر تکیہ نہیں کرنا چاہیئے اس کام کے لئے تو ہمیں کسی ایجابی چیز کی ضرورت ہے جو دائمی اور مستقل ہو۔ ہاں جو کچھ ہم کہہ سکتے ہیں وہ یہ ہے
[illegible] خطرات میں گھر کر ہم اپنے نصب العین تک پہنچنے کے لئے اپنی رفتار کو تیز کرنے پر مجبور ہو جاتے۔ ان کی حیثیت قومی زندگی
میں جوار بھاٹے کی سی ہوتی ہے جو قوم اس کے تیور کو اچھی طرح جانچ کر اپنی زندگی کا سفینہ اس کے سپرد کر دے وہ ساحلوں اور [illegible]

کی مسافت دنوں میں طے کر لیتی ہے۔ مگر سمندر کی یہ لہریں کسی طرح بھی منزلِ مقصود نہیں بن سکتیں۔ یہ بہر حال ایک ذریعہ ہے منزلِ مقصود تک پہنچنے کا!

مسلمانوں کی جگہ کوئی دوسری قوم ہوتی تو اس کے لئے یہ امر بجائے خود کافی پریشان کن تھا کہ وہ نصب العین کہاں سے لائے لیکن مسلمانوں کا معاملہ اس سے بالکل جداگانہ ہے ان کے پاس اسلام کی شکل میں یہ مقصد موجود ہے کہ صدہا سال کی روایات پہلے ہی اس کی جڑیں ہماری زندگی میں پھیلا چکیں اور گہری اتار چکیں۔ اسی مقصد کی تکمیل کے لئے ہم نے ایک علیحدہ خطۂ ارضی کا مطالبہ کیا ہے۔ اور اسی مقصد کے حصول کے لئے قوم نے آگ اور سمندر تک میں سے گزرنے سے گریز نہ کیا۔ اس گہرے ربط کے ہوتے ہوئے اس مقصد کو صحیح معنوں میں اپنا لینے میں ہمارے لئے دوسری اقوام کے مقابلے میں کوئی زیادہ قوت اور محنت درکار نہ تھی ضرورت صرف یہ تھی کہ اسلام کے ساتھ ہمیں جو جذباتی اور غیر شعوری سا لگاؤ ہے اس کی عمارت کو فکر اور شعور کی بنیادوں پر تعمیر کیا جاتا لیکن سوچیں کہ کیا اس سمت کوئی قدم بھی اٹھایا گیا ہے۔

ہر منصف مزاج انسان جانتا ہے کہ مسلمانوں میں عمل کا جو جوش، اپنے مقصد سے جو دل بستگی، مزاج میں جو دل سوزی اور دلوں میں جو خلوص قیامِ پاکستان کے وقت تھا وہ اب نہیں رہا۔ ہم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اس وقت بڑے بڑے راشیوں نے رشوت سے توبہ کی، بڑے بڑے ظالموں نے ظلم سے ہاتھ روکے، بڑے بڑے مستبد اور جابر اپنے جور و جفا سے باز آئے لیکن با اختیار لوگوں نے ان کی قطعاً کوئی پروا نہ کی، ان کی نیکی کے ابھرنے کے مواقع بہم نہ پہنچائے فسق و فجور پوری شان سے دندناتا رہا اور اس کو روکنے کا کوئی سامان نہ کیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بھلائی کو دوام اور اس کے ارتقا و استحکام نصیب نہ ہو سکا۔ اگر حکمران طبقہ کچھ معمولی بیدار مغزی اور جوکسی کا ثبوت دیتا تو قوم کی تربیت کا اس سے بہتر کوئی موقع نہ تھا۔ عوام جس طرح اسلام کے شیدائی تھے اس سے نہایت ہی معمولی محنت سے قوم کو اجتماعی تخیل عطا کیا جاتا اور آج قوم میں بحیثیت مجموعی سیرت و کردار کی زیادہ پختگی نظر آتی۔
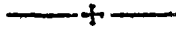
حق و باطل سے قطع نظر مقصد کی لگن اور اس میں جذب و استحکام خود ایک عظیم الشان طاقت ہے۔ دنیا میں اگر کسی مقصد کے حصول میں قابلِ ذکر کامیابی ہو سکتی ہے تو وہ اسی دلبستگی اور یکسوئی کے ذریعہ ممکن ہے۔ کفر بھی اگر فرد اور قوم کے دل و دماغ کا احاطہ کر لے اور اگر ایک شخص یا قوم اس کے سارے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے صحیح جرأت کا ثبوت دے تو کفر اگرچہ کفر ہے اور خدا کو سخت ناپسند ہے لیکن استقلال اور یکسوئی کے ساتھ اس کا اختیار کرنا بھی قوم کو بڑی بڑی کامیابیوں سے ہمکنار کر دیتا ہے۔ قانونِ فطرت یہی ہے کہ تاریخ بھی اس ٹھوس حقیقت کی تصدیق کرتی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا ہماری قوم کسی ایسے اجتماعی تخیل سے آشنا ہے کیا اسے اس کے ساتھ اتنی ہی دلچسپی ہے جتنی کہ چاہیئے، کیا قراردادِ مقاصد نے جس منزل کی نشان دہی کی ہے اسی طرف بڑھنے میں ہماری قوتیں صرف ہو رہی ہیں؟ جو لوگ تھوڑی بہت بھی بصیرت رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ حالات اس کے الٹ ہیں۔ ہمارے ذہن کفر اور اسلام کی کشمکش کی آماجگاہ بن گئے ہیں "متضاد نظریات" کی اسی جنگ نے قوم کی اکثریت سے یکسوئی کی نعمت کو چھین لیا ہے۔ ایک طرف اگر اس قوم کے سامنے پورے زور شور سے اسلام کا نعرہ بلند کیا جاتا ہے تو دوسری طرف اسی قوت سے بالکل زبردستی اس کا اٹھایا ہوا قدم کفر کی طرف دھکیل دیا جاتا ہے کہ اس طرح اس غریب قوم کو دوراہے پر تذبذب اور بے یقینی میں مبتلا کر دیا گیا ہے۔ ہمیں سب سے پہلے اپنی اس کمزوری کو دور کرنا ہے کہ پوری قوم کو عدم یکسوئی، تھڑدلا پن اور بزدلی سے نجات دلانا ہے۔ مگر اس کے لئے محض بیانات دے کر تالیاں پٹوا لینا یا تقریریں کر کے نعرۂ تکبیر لگوا لینا کافی نہیں ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ نصب العین تک پہنچنے کے لئے ہماری

قوم کے سربراہ کار بذاتِ خود اسلام کے زندگی بخش اصولوں کا مظاہرہ کریں اور اپنے اندر انقلابی لیڈروں کے سے اوصاف کا نمونہ پیش کریں تاکہ قوم میں وہ حرارت پیدا ہو جس کی اس وقت ہمیں ضرورت ہے۔
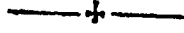
نصب العین کے ساتھ عشق کے اسی فقدان نے ہماری خارجی پالیسی کو بھی متاثر کیا ہے۔ اس بے یقینی کی وجہ سے ہمارے سامنے کوئی واضح پروگرام نہیں رہا۔ مختلف حالات میں ہم یہ نہیں جانتے کہ ایک بااصول اور حق پرست قوم کے نمائندہ ہونے کی حیثیت سے ہمارا موقف اور منصب کیا ہے۔ ہم پر کونسے فرائض عائد ہوتے ہیں۔ ہم کو کن لوگوں کا ساتھ دینا ہے اور کن کو چھوڑنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اپنی خارجی پالیسی کی وضاحت میں بھانت بھانت کی بولیاں بولنے کے عادی ہو چکے ہیں اور خود تو کیا بلکہ اللہ کے دین کی تذلیل کا باعث بنتے ہیں۔ کامن ویلتھ کے ہاتھ پر بیعت کر لینے کی وجہ سے ہماری پوزیشن بساطِ سیاست پر مہروں کی سی ہو گئی ہے جن کے ساتھ امریکی اور انگریز شاطر جس طرح چاہتے ہیں کھیلتے ہیں۔ اور ہم ارادہ و اختیار جو ایک آزاد قوم کا طرۂ امتیاز ہوتا ہے اس سے تہی دامن ہو رہے ہیں۔ کس قدر مقامِ افسوس ہے کہ وہ قوم جو خدا کے سہارے کے علاوہ کسی سہارے پر جینا گوارا نہیں کرتی تھی اور اس کو اپنے ایمان کے منافی خیال کرتی تھی وہ آج امریکہ اور انگریز کے ابروئے چشم کی ہر جنبش پر اپنی قومی پالیسی کو بدلتی رہتی ہے۔ آخر وہ کونسی قومی مصلحت تھی جس کی لگن ہمیں امریکہ میں تو لے گئی لیکن روس کی دعوت کے باوجود ہم نے وہاں جانے سے گریز کیا۔ آخر وہ کونسا ملکی مفاد ایسا ہے جو ہمیں کامن ویلتھ کے ساتھ جڑے رہنے پر مجبور کر رہا ہے۔ ہم خیر کے اُن پہلوؤں کو ابھی تک سمجھنے سے قاصر ہیں جن کی بنا پر ہم نے شاہی خانوادے کے ایک فرد کی آمد پر اپنے ملک کے کروڑوں روپے بلا دریغ خرچ کر دیئے۔ مگر جب اُسی شہزادے کے عوام پر مصیبت آن پڑی تو ہماری زبان فیض ترجمان سے ہمدردی کا ایک لفظ نہ نکلا۔ غور کیجیئے کہ کیا یو۔ این۔ او کی بے اعتدالیوں کے خلاف ہم نے پوری جرأت سے آج تک کوئی آواز بھی اٹھائی ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ جب امریکی مفاد پر ذرا سی زد پڑے تو امن کے اس ادارے کی پوری مشینری ساری قوت سے حرکت میں آجائے اور ایک قوم کے خلاف دوسری قوم کے جارحانہ عزائم کو مبنی برحق ٹھیرا کر دوسری اقوام کو مجبور کیا جائے کہ وہ بھی اُس کے خلاف صف آرا ہوں۔ مگر اس کے برعکس کشمیر پر ہندوستان کے جور و جفا کو نہایت ٹھنڈے پیٹوں گوارا کیا جائے اور ہمدردی کی کوئی خفیف سے خفیف تحریک بھی نہ پیدا ہو۔ بلکہ معاملہ کو اتنا الجھا دیا جائے کہ اُس کے امن پسندانہ طریق سے سلجھنے کی کوئی امید باقی نہ رہے۔ اگر اس مسئلہ کا آخری حل صرف تلوار کی نوک ہی ہے تو آخر کامن ویلتھ اور اقوام متحدہ کس مرض کی دوا ہیں۔
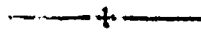
ہماری خارجی پالیسی میں ایک اور سقم جو پایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ سراسر مدافعانہ ہے۔ اس کی وجہ سے ہمیں بارہا عظیم سے عظیم نقصان اٹھانے پڑے مگر ہم اس معاملہ میں ٹس سے مس نہ ہوئے۔ دراصل مدافعانہ پالیسی میں دشمن کو یہ موقع ہاتھ لگتا ہے کہ وہ پہلی کوشش میں ہی اپنے مدمقابل کے ذہن پر اپنی برتری کا نقش ثبت کر دے۔ ہندوستان کا رویہ اس وقت ہمارے سامنے موجود ہے۔ جوناگڈھ پر جس آسانی سے ہاتھ صاف کر لیئے اور پاکستان کی طرف سے سوائے احتجاج کے کوئی مؤثر عملی قدم نہ اٹھایا گیا تو اسے یہ جرأت ہوئی کہ وہ حیدرآباد میں بھی ڈائرکٹ ایکشن کرے۔ یہ سارا کام جس منصوبہ بندی کے ماتحت ہوا وہ ہمیں چونکا دینے کے لیئے کافی ہے۔ اس ملک نے سب سے پہلے دھمکی دے کر مخالفوں کے ردِ عمل کو معلوم کرنے کی کوشش کی۔ پاکستان جو حیدرآباد کی حمایت میں پیش پیش تھا اس میں بھی اخبارات نے سرخ نشہ آور تقریریں پھیلانے کے سوا کوئی کام نہ کیا۔ ملک کے اندر صرف حیدرآباد کی

روز افزوں طاقت کے متعلق افسانے ہی گھڑے گئے کبھی اس کے زبردست ہوائی بیڑے کے متعلق افواہیں گرم ہوتی رہیں اور کبھی دنیائے اسلام کے گوشے گوشے میں اس کی تیاریوں کی خبریں گشت کرنے لگیں۔ چنانچہ ہندوستان نے یہ دیکھنے کے لئے کہ کیا کسی ملک کی مشنری بھی حرکت میں آتی ہے۔ اس ڈائرکٹ ایکشن کا اعلان کر دیا مگر جب اسے یہ اطمینان ہوگیا کہ سوائے نعروں اور قرار دادوں کے اور کچھ نہیں کیا جائے گا تو اس نے پوری ریاست کو ہڑپ کرلیا۔ اور یہ سارا کام اس اعتماد سے سرانجام دیا کہ جس طرح اسے باہر کا کوئی خطرہ لاحق نہیں۔ جب ہندوستان کی بیشتر افواج حیدرآباد میں مصروف تھیں اور کشمیر میں صرف اس کا بھرم ہی باقی تھا پاکستان کے لئے کشمیر حاصل کرنے کا اس سے کوئی بہتر موقع نہ تھا۔ اگر اس وقت پوری قوت کے ساتھ کھل کر مقابلہ کیا جاتا تو آج ہم جن مصائب میں گرفتار ہیں ان سے کبھی کے نمٹ چکے ہوتے۔ لیکن ہم نے اس وقت بھی اپنے عمل کو نعروں اور تقریروں تک ہی محدود رکھا۔ اور سوائے یو۔این۔او میں احتجاج کرنے کے کوئی عملی قدم نہ اٹھا سکے ہم آج تک انھیں کمزور سہاروں پر جی رہے ہیں۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ دنیا اس وقت جن حالات سے گزر رہی ہے اُن میں دو تہذیبیں سرمایہ داری اور اشتراکیت ایک دوسرے سے برسرپیکار ہیں اور دونوں اپنے مخالف کو نیست و نابود کر دینے کا عزم کر چکی ہیں۔ آج رفاقتوں کے سودے اس معیار پر طے ہوتے ہیں کہ کوئی ملک "تہذیب" کے ان درندوں کو اپنے مخالفین کو ختم کرنے میں کہاں تک مفید ہو سکتا ہے وہ اینگلو امریکن بلاک جس کے آستانۂ عالیہ پر ہم ابھی تک جھکے ہوئے ہیں اس کے لئے اس کارِ خیر میں ہم سے زیادہ بھارت کار آمد ہے۔ ذرائع وسیع ہونے کی وجہ سے یہ اشتراکیت کے خطرہ کو ان کی نظر میں بہترین طریق پر روک سکتا ہے۔ ان حالات میں ہندوستان خواہ کتنی ہی غیر معقول بات کرے لیکن یہ بلاک اس ملک کو ناراض کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ وہ لوگ جو ان روشن حقائق کے ہوتے ہوئے بھی اصل حالات سے آنکھیں بند کرکے صرف خیال و خواب کی دنیا میں بسنا چاہتے ہیں وہ بے شک بسیں لیکن ملک کے لئے یہ روش کسی پہلو سے بھی نفع بخش اور کسی جہت سے بھی احسن و اکمل نہیں مسلمان کا شیوہ یہ ہے کہ وہ ہر شر سے بھی خیر کو اخذ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ خدا کرے کہ بھارت کی یہ سخت نازیبا حرکت ہماری آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی ہو اور ہم اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کی کوشش کریں ؎

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے

(بقیہ مارکسیت یا اسلام)

جہاں تک کہ کتاب کے اندازِ بیان کا تعلق ہے ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ بیان واضح اور زوردار ہے۔ البتہ کہیں کہیں فلسفہ کی "بیولت" زبان میں بھی نمایاں ہو جاتی ہے۔ اور پڑھنے والا طبیعت پر ایک گرانی سی محسوس کرتا ہے۔ آخری تین ابواب میں تو یہ رنگ کافی گہرا دکھائی دیتا ہے۔ ایک شکایت ہمیں کتاب کی کتابت اور طباعت سے متعلق ہے کتاب میں بہت اغلاط ہیں۔ اغلاط نامہ بھی کتاب کے ساتھ درج ہے مگر افسوس ہے کہ اس کے باوجود کافی تعداد میں غلطیاں ایسی رہ گئی ہیں جن کو اس فہرست میں جگہ نہیں مل سکی۔ اور تو اور بعض حوالے تک غلط ہیں۔ کاغذ اور ٹائپ بھی اعلیٰ نہیں۔ ایسی بلند پایہ تصنیف کے لئے ان باتوں کے خاص اہتمام کی ضرورت ہے۔ ہمیں اپنے حیدرآبادی رفقا کی دقتوں کا پورا احساس ہے۔ ہمیں اس کا بھی علم ہے کہ اُن بیچاروں کی راہ میں کونسی رکاوٹیں ہیں لیکن متانت کے اس دور میں یہ چیز بڑی ہی اہمیت رکھتی ہیں۔ اور نظامِ حق کے برپا کرنے والوں کو ان معاملات میں کمزوری نہیں دکھانا چاہیئے۔ راستے کی مشکلات تو آتی ہی اس لئے ہیں کہ انھیں راستہ سے ہٹا دیا جائے۔

بحیثیت مجموعی یہ کتاب نہایت ہی بلند پایہ تصنیف ہے۔ اور مصنف کے گہرے مطالعہ اور غور و فکر کی آئینہ دار ہے۔ اس میں مارکسزم پہ نہایت سنجیدگی اور قابلیت سے تنقید کی گئی ہے۔ ہم تمام اہلِ علم سے جو ہر نئے عقیدے پر بلا سوچے سمجھے ایمان نہیں لاتے بلکہ تدبر اور تفکر کے بعد کسی چیز کو قبول یا رد کرتے ہیں۔ اس کے مطالعہ کی پر زور سفارش کرتے ہیں۔

یہ بے انصافی ہوگی اگر کتاب کے ناشران کا دلی شکریہ ادا نہ کیا جائے جنھوں نے ان پُر آشوب حالات میں اس کی طباعت کا انتظام کیا۔

گلگشت!

(تعارف کتب و جرائد)

کتابیں بہت جمع ہیں، صفحات کا دامن تنگ ہے اس وجہ سے تبصرہ کا حق تو کیا ادا ہوگا بس ایک گونہ تعارف ہی ممکن ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ان علماء و ائمہ میں سے ہیں جن کی کتابیں اسرار و رموزِ دین کے مختلف گوشوں کو سمجھنے میں مدد دے سکتی ہیں۔ مولینا عبدالرحیم صاحب، پروفیسر اسلامیہ کالج پشاور نے شاہ صاحب کی کتاب "خیر کثیر" کا ترجمہ پیش کیا ہے۔ اس کتاب کے مباحث بیشتر متشابہات سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور انداز صوفیانہ کلامیات کا ہے، اگرچہ حکمت آمیز۔ ہمارا دور ان مباحث کے مقابلے میں دوسری چیزوں کا زیادہ محتاج ہے۔ پھر شاہ صاحب اپنے دور کے جس مخصوص طرز فکر و استدلال اور جس خاص زبان کے ساتھ بات کرتے ہیں افسوس ہے کہ مترجم اس کو آج کے ذہن کے سانچے میں نہیں ڈھال سکے۔ اتنا ہی نہیں اصطلاحات کو بیشتر جوں کا توں منتقل کر دیا گیا ہے اور الفاظ کا اغلاق بھی نمایاں ہے۔

کتاب کو شائع کرنے والے ابناء مولوی محمد بن غلام رسول، سورتی ہیں۔ نمبر ۱۳۲، ۱۳۴، حاجی محلہ بمبئی ۳ سے تین روپے آٹھ آنے فی جلد کے حساب سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی ایک اور کتاب "البلاغ المبین" کا ترجمہ بھی ہمارے سامنے ہے۔ اس کے مترجم جناب محمد علی صاحب مظفری ہیں مترجم نے موضوع کے لحاظ سے بھی نسبتہً زیادہ اہم کتاب منتخب کی ہے اور پھر ترجمہ بھی خاصا اچھا کیا ہے۔ اس ترجمہ کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں اور بعض لوگوں نے بڑی تعداد میں اسے مفت تقسیم کیا ہے۔ اس کتاب کا زورِ استدلال شرک و بدعت کے دروازوں کو بند کرنے والا ہے۔ ۱۰۶ صفحے کی کتاب سادہ سی جلد کے ساتھ ۱۲؍ آنے میں اگر دی جا رہی ہے تو اس سے ظاہر ہے کہ اس کی اشاعت تجارتی مقاصد سے آلودہ نہیں ہے۔ مکتبہ تبلیغ، آدم کے ناگرہ (براستہ جاکی) ضلع سیالکوٹ نے اس کا تازہ ایڈیشن نکالنے کا شرف حاصل کیا ہے۔

کمیونسٹ مذہب سے دلچسپی رکھنے والے ملکوں میں جب تبلیغ کرتے ہیں تو بالعموم لوگوں کو یہ مغالطہ دیتے ہیں کہ کمیونزم صرف روٹی کا سوال حل کرتا ہے، مذہب سے کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کرتا خصوصاً جب سے مسلم ممالک میں اشتراکیت کام کرنے لگی ہے یہ فریب اور زیادہ وسعت پذیر ہے۔ ادھر کچھ سادہ لوح ہیں کہ اس دام فریب کو سینے سے لگائے لگائے پھرتے ہیں۔ ہمارے قلمی دوست نذر محمد خالد نے "اشتراکیت اور مذہب و اخلاق" کے عنوان سے ایک جامع کتاب لکھ کر سادہ لوحوں کی آنکھیں کھولنے کا سامان کر دیا ہے۔ موصوف خود کوچۂ اشتراکیت کی گردش کر کے لوٹے ہیں، اس لئے انہوں نے ایسے مآخذ سے دلائل لے کر اشتراکیت کی نظری اور عملی مذہب دشمنی کی حقیقت واضح کی ہے جنہیں کوئی اشتراکی دشمن کے پروپیگنڈے کا نام دے کر رد نہیں کر سکتا۔ جو بات بھی کہی ہے مارکس اور لینن اور دوسرے مومنین و حامیانِ اشتراکیت کے حوالوں سے

گلگشت

ماہنامہ الصدیق کے حج نمبر میں جس خلا کا تذکرہ ہم نے کیا ہے اسے سید حامد علی صاحب نے اپنے پمفلٹ "حج کیا ہے" میں پورا کر دیا ہے۔ یہ چھوٹا سا پمفلٹ پڑھنے سے ایک سچے حاجی کو معلوم ہو جاتا ہے کہ حج کا اصل زاد راہ کیا ہے اور حج سے کیا کمائی کر کے لانا اصل مطلوب ہے حامد صاحب نے جو باتیں کہی ہیں قرآن و حدیث سے استدلال کر کے کہی ہیں۔
مرکز جماعت اسلامی (ہند) رام پور (یو۔پی) سے ۲ر میں ملے گا۔

بانگ درا کا اقبال اپنے شعر کی نوک پلک بنانے میں جو کاوشیں کرتا رہا ہے، وہ اگر آپ کے سامنے آجائیں تو اس سے بالیقین متعدد فوائد حاصل ہوں گے۔ یہی خدمت ہے جو بشیر الحق صاحب عظیم آبادی نے "اصلاحات اقبال" کے عنوان سے سرانجام دی ہے۔ اس کتاب میں بانگ درا کی بہت سی نظموں کے اشعار کی ابتدائی حالت اور اصلاح شدہ حالت متقابلاً پیش کی گئی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ متعلقہ رسالوں کا حوالہ دیا گیا ہے۔
مکتبہ دین و دانش بانکی پور پٹنہ، نے اسے شائع کیا ہے اور قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے رکھی ہے۔

عالم عرب کی جماعت الاخوان المسلمون کو سمجھنا اس ملک کے ہر مسلمان کے لئے ضروری ہو گیا ہے جس میں جماعت اسلامی اقامت دین کی جدوجہد میں مصروف ہے۔ مگر کسی جماعت کو اس کے مخالفین (خصوصاً ایسے مخالفین جو بالفاظ قرآن حَلَّافٍ مَّهِينٍ، هَمَّازٍ مَّشَّاءٍ بِنَمِيمٍ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ، عُتُلٍّ بَعْدَ ذَٰلِكَ زَنِيمٍ کی تعریف کے مصداق ہیں) کے واسطے سے سمجھنے کی کوشش کرنا بڑی حماقت ہے۔ پس جو لوگ اخوان المسلمون کی بات خود ان کی زبان سے سننا چاہتے ہوں وہ رسالہ "ہماری دعوت" کا مطالعہ فرمائیں۔ یہ رسالہ عربی میں "الیٰ ای شئی ندعو الناس" کے نام سے شیخ حسن البنّا شہید نے اپنے قلم مبارک سے پیش فرمایا تھا۔ ترجمہ قاضی خلیل الرحمان صاحب نعمانی مظاہری نے کیا ہے پیش لفظ ماہر القادری کے قلم سے ہے۔
مکتبہ آفاق - ۱۲/۱۸ بندر روڈ مقابل وائی، ڈبلیو، سی، اے کراچی نے اسے شائع کیا ہے (قیمت درج نہیں)

بچوں کے لئے سائنٹفک اصولوں پر مرتب کئے ہوئے۔ اور خصوصاً مسلم فکر پر مبنی۔ لٹریچر کی بڑی کمی ہے۔ بھلا ہو ادارۂ الحسنات (رام پور) کا کہ اس نے اس میدان میں قدم بڑھایا ہے۔ ادارۂ الحسنات کے بعد مکتبہ فلاح انسانیت (لوٹیا بلڈنگ کراچی) کو اللہ نے یہ توفیق دی ہے کہ اس نے ابن احمد قرنی کے چار رسالے (۱) جنت سے زمین پر (۲) پہلا خون (۳) خوفناک طوفان اور (۴) خدائی معمار شائع کر کے ارتقا کے چند اپنچ اور طے کر لئے ہیں۔

ان رسالوں میں قرآن کے بیان کردہ وہ چند اہم واقعات جس سے اسلام کی فکر کے بعض گوشے بے نقاب ہوتے ہیں۔ بڑی سادہ اور معیاری زبان میں پیش کئے گئے ہیں۔ انداز دلچسپ ہے۔ کتابت، طباعت اچھی اور سرورق بہت ہی نفیس۔ قیمتیں بالترتیب ۸ر، ۶ر، ۴ر اور ۸ر ہیں۔
ان رسالوں کو دیکھ کر مکتبۂ فلاح انسانیت سے ہماری بڑی توقعات وابستہ ہو گئی ہیں۔

مناظر خودی کے نام سے ۱۶ صفحے کے ایک رسالہ میں محمد سراج الحق صاحب نے اقبال کی مثنوی "اسرار و رموز" اور مولانا روم کی "مثنوی مولوی معنوی" سے خودی کی حقیقت کے متعلق کچھ اجزا کو منتخب کر کے ان کا منظوم اردو ترجمہ متقابلاً پیش فرمایا ہے۔ شاعر کا مدعا یہ بتانا ہے کہ اقبال کی خودی اور رومی کی بیخودی کے ڈانڈے آخر کار ایک جگہ پر مل جاتے ہیں۔ کاغذ، کتابت، طباعت معمولی قیمت ۲ر۔ مطبع اسرار کریمی الہ آباد نے اسے شائع کیا ہے +

گلگشت

گیا ہے۔ فی الواقع یہ ایک کامیاب خدمت ہے۔
ایک روپے دو آنہ میں مکتبہ چراغِ راہ، ۹ وٹیا بلڈنگ آرام باغ روڈ کراچی علا سے طلب فرمائیں۔

ہر سال حج کے موقع پر ہمارے بھائیوں کی ایک بڑی تعداد برعظیم ہند کے دونوں ملکوں سے زیارتِ حرم کے لئے روانہ ہوتی ہے۔ اس موقع پر سفرِ حج اور مناسکِ حج اور دوسرے متعلقہ امور میں رہنمائی بہم پہنچانے کے لئے کچھ نہ کچھ تازہ لٹریچر شائع ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ ماہنامہ الصدیق (ملتان) کا حج نمبر ہمارے سامنے ہے۔ اس میں اچھی نظمیں بھی ہیں، اچھے اداریے بھی ہیں، سفرِ حج کے لئے ضروری معلومات بھی ہیں اور مناسکِ حج کے متعلق مبتدیانہ اور منتہیانہ سطح کی رہنمائی بھی ہے۔ لکھنے والے معمولی لوگ نہیں ہیں، اچھے اچھے علماء ہیں۔ پھر موضوع سے تعلق رکھنے والی آیات و احادیث مع شرح مقالات کے اندر پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ نمبر ہر مسلمان کے لئے اور خصوصاً حاجیوں کے لئے قابلِ مطالعہ ہے۔ عربی حصہ بھی بڑا دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔

کمی ہے تو صرف ایک۔ وہ یہ کہ ہر سال دنیا کے لاکھوں مسلمان حج کرآتے ہیں مگر معمارِ حرم کی سیرت اور حج کی بنا رکھنے والے کے جذبات اور قربانی کی طرح ڈالنے والے کے انقلابی اسوہ کی لہریں کہیں نہیں اٹھتیں۔ نمارِدۂ وقت کے دعوائے ربوبیت کو کوئی چیلنج نہیں کرتا، کافرانہ اصولوں کے بت کدوں میں تبرلے کر کوئی داخل نہیں ہوتا، حق کے لئے حق کی مخالفت کرنے والے والدین کو کوئی الوداعی سلام نہیں کہتا، دین کا جھنڈا اٹھا کر کوئی گھر بار وطن چھوڑ کر دنیا کے کونے کونے میں مارا مارا نہیں پھرتا، اپنے بچوں کی کوئی قربانی نہیں دیتا، دلوں اور دماغوں کی غیر ذی زرع وادیوں میں کوئی خدا کے گھر تعمیر نہیں کرتا! ـــــ یہ جو حج کی مقصدیت برباد ہو کر رہ گئی ہے اسے پورا کرنے کے لئے جس روحانی و ذہنی تحریک کی ضرورت ہے کاش کہ الصدیق اس کا اہتمام بھی کرتا۔

یہ خاص نمبر دو روپے میں بیرون بوہڑ دروازہ ملتان کے پتے سے ملے گا۔

جمعہ کا اجتماع دین میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے افراد کے اجتماعیت میں ڈھلنے کے ساتھ ساتھ تعلیم کتاب و حکمت، تزکیہ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی نتیجہ خیز مہم جاری رہ سکتی ہے۔ لیکن بے مقصدی کا دور جب سے اہلِ دین پر آیا ہے، جمعہ اپنی بہت سی برکات کھو بیٹھا ہے اور جمعہ کے خطبے رسمی سی چیز ہو گئے ہیں کہ نہ خطیب کچھ دیتا ہے نہ سامعین کچھ پاتے ہیں۔ ہمارے سامنے اس وقت "سیاسی خطبات" کے نام سے جناب سید ودود الحق صاحب ندوی کے چند خطبوں کا مجموعہ ہے جو تقسیم ہند کے بعد کے حالات میں بمبئی کی مسجد سنی خوجہ کے منبر سے نشر کئے گئے ہیں۔ ان خطبات کا اندازِ بیان موثر ہے اور الحمدللہ کہ ان کی مرکزی روح اسلام کا صحیح تصور ہے۔ ہر خطبے کے آخر میں خلاصہ مضمون درج ہے۔

ناشر دائرۃ العلم والعرفان بمبئی ہے۔ قیمت درج نہیں۔

معلم العربیہ (حصہ اول) جسے جناب قاضی عبدالرزاق صاحب معلم عربی ایس ہجے، وی گورنمنٹ ہائی اسکول کراچی نے مرتب کیا ہے تعلیم نوجوانی کے جدید اصولوں کے مطابق ایک اچھی درسی کتاب ہے۔ اساتذہ اور پرائیویٹ طور پر عربی سیکھنے کی کوشش کرنے والے اصحاب اس کا تجربہ کریں تو توقع ہے کہ بہت سی کتابوں سے بہتر پائیں گے۔

ایک روپیہ چار آنے میں اقبال بک ڈپو، اقبال روڈ، ٹرام جنکشن، صدر کراچی سے طلب فرمائیے۔

آسمانی ادب

قرآن کے ادبی جمال کا انعکاس

جہاد فی سبیل اللہ

قرآن کے بہت سے احکام ایسے ہیں کہ ان کا صحیح مفہوم اسی وقت سمجھ میں آتا ہے جب کہ ایک خاص ذہنی ماحول مہیا ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نجماً نجماً نازل ہوا اور اس کا ہر خطاب ایک "شانِ نزول" رکھتا ہے۔ اس اصول کے پیشِ نظر موجودہ صورتِ حال قرآن کے خطاباتِ جہاد کو سمجھنے کے لئے اور ان کے ادبی زور کو محسوس کرنے کے لئے بہت ہی سازگار معلوم ہوئی۔ چنانچہ ارادہ تھا کہ جہاد کے موضوع پر قرآن میں جتنے خطابات ہیں ان سب کو آسمانی ادب کے زیرِ عنوان باقاعدہ مرتب کر کے پیش کر دیا جائے، لیکن جگہ کی قلت کی وجہ سے بالآخر صرف چار ہی خطبے درج کرنے پر اکتفا کرنا پڑا۔ یہ سلسلہ علیحدہ مکمل کر کے انشاء اللہ "آسمانی ادب" کے کتابی مجموعے میں شامل کر دیا جائے گا۔

جو خطبے اس وقت درج کئے جا رہے ہیں ان کو اگر غور سے پڑھا جائے تو مطالب کی ایسی ایسی گہرائیاں اور حکمتِ دین کے ایسے ایسے اصول سامنے آتے ہیں کہ قرآن کی محبت میں ایک گونہ اضافہ ہوتا ہے۔ یہ راقم الحروف کا اپنا تاثر ہے۔ خدا اس کام کے صحیح جز پر جزائے خیر عطا فرمائے اور غلطیوں پر عفو فرمائے۔

(۱)

اجازت ہے ان لوگوں کو (جنگ کی) جن سے (دشمنانِ حق) لڑتے ہیں، کیونکہ ان پر ظلم کیا جا رہا ہے ——— اور قطعی طور پر اللہ ان (مظلوموں) کی مدد کرنے پر قادر ہے ——— یہ وہ ہیں جو اپنے گھروں سے کسی جائز وجہ کے بغیر محض اس لئے نکال دیئے گئے کہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ ہی (پوری زندگی کے لئے) ہمارا رب ہے۔

(پس) اگر اللہ بعض (ظالم) لوگوں کو کچھ دوسرے (بہتر) لوگوں کے ذریعے (اقتدار سے) برطرف نہ کر دیا کرتا تو (نتیجہ یہ ہوتا کہ) فلاح کے ادارے، مدارس، عبادت گاہیں اور مسجدیں برباد ہو جاتیں جن میں کہ زور شور سے اللہ (اور اس کے دین کی تعلیم) کا ذکر ہوتا ہے ——— اور جو لوگ بھی اللہ (کے دین) کی مدد کریں ان کی مدد اللہ بھی ضرور کرے گا ——— اللہ قطعی طور پر زور آور اور صاحبِ تسلط ہے!

(پھر) یہ ایسے لوگ ہیں کہ اگر (دشمنانِ حق پر فتح پانے کے بعد) ہم ان کو زمین میں اقتدار دیں تو یہ (عیاشیاں اور دھاندلیاں کرنے اور فتنے پھیلانے کے بجائے) نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور بدی سے روکیں گے! ——— اور تمام معاملات کا آخری فیصلہ اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے!

(۲)

کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم بآرام جنت میں جا پہنچو گے، حالانکہ ابھی تم پر وہ کچھ بیتا ہی نہیں جو تم سے پہلے لوگوں پر بیت چکا ہے (ان کا حال یہ ہوا کہ) ان پر (اللہ کی راہ میں جدوجہد کرتے ہوئے) سختیاں اور مصیبتیں آئیں اور ان کو اتنا جھنجھوڑا گیا کہ

(وقت کا) رسول اور اس کے ساتھ ایمان لانے والے چیخ اٹھے کہ ہائے! کب آئے گی اللہ کی مدد؟ (اس وقت ہم نے ان کی ہمت بندھائی
اور مژدہ سنایا کہ) سنو! اللہ کی مدد اب بالکل قریب آ گئی ہے!

[مسلمانو! اگر تم واقعی جنت میں جانا چاہتے ہو تو پھر تم کو بھی ان مشکل گھاٹیوں سے گزرنے کے لئے تیار ہو جانا چاہئے]

تمہارے لئے لازم کر دی گئی جنگ، اور یہ تمہیں ناگوار ہے۔ حالانکہ ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں ناپسند ہو لیکن (دراصل) وہی
تمہارے لئے نفع بخش ہو، اور ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ایک شے کو تم پسند کرو لیکن درحقیقت وہ تمہارے لئے نقصان دہ ہو۔
اور اللہ (اپنے احکام و قوانین کے نفع و نقصان کو) جانتا ہے، لیکن تم (پوری طرح) نہیں جانتے!

اے محمد! ـــــ یہ لوگ آپ سے ماہِ حرمت میں لڑنے کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔ آپ کہہ دیجئے کہ ماہِ حرمت میں
جنگ کرنا (واقعی) بڑا گناہ ہے ـــــ لیکن ـــــ اللہ کی راہ پر چلنے سے لوگوں کو روکنا اور اللہ سے کفر کرنا اور لوگوں کو
مسجدِ حرام میں آنے سے روکنا اور اس کے شہریوں کو نکال باہر کرنا اللہ کی بارگاہ میں اس سے بھی بڑا گناہ ہے۔ اور (یہ بھی جان لو
کہ) دین سے ہٹانے کی کوششیں قتل سے زیادہ ناپاک گناہ ہیں۔ اور (تمہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ) دشمنانِ حق تم سے اس وقت
تک برابر لڑتے رہیں گے جب تک یہ تم کو تمہارے دین سے پلٹا نہ دے جائیں، بشرطیکہ ان کا بس چلے! اور (ان کی اس کوشش
کے نتیجے میں) تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھرے، اور مر جائے اس حال میں کہ وہ کافر ہو، تو ایسے لوگوں کے کئے کرائے
نیک اعمال دنیا و آخرت میں اکارت گئے۔ اور ایسے لوگ دوزخی ہیں اور وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔

[پس جہاد کی تلوار کا حرکت میں آنا نہ صرف اس لئے ضروری ہے کہ جنگ و جدل کے مقابلے میں جو بہت ہی بڑے درجے
کے مفاسد ہیں ان کا قلع قمع ہو، بلکہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ تم اس طریق سے اپنے دین و ایمان کو اور اپنی دنیا
و عاقبت کو بچا سکتے ہو۔]

بلاشبہ وہ لوگ جو ایمان لائے، جنھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا، تو وہی اس کے مستحق ہیں کہ خدا کی رحمت کے
امیدوار ہوں، اور (ایسوں کے لئے) اللہ لغزشوں کو معاف کرنے والا اور عنایت فرمانے والا ہے۔ (البقرہ = ۲۱۳ تا ۲۱۸)

(۳)

کیا اے محمد! آپ نے ان لوگوں پر غور کیا جو ہزاروں کی تعداد میں ہوتے ہوئے اپنے گھروں سے باہر نکل رہے تھے محض
اس وجہ سے کہ موت سے ڈرتے تھے! پھر اللہ نے ان سے کہا کہ (موت کا ہول دل سے نکال کر) مرنا سیکھو۔ چنانچہ اللہ نے ان کو
از سرِ نو زندگی عطا کی۔ بلاشبہ اللہ لوگوں پر بہت ہی عنایت کرنے والا ہے، لیکن لوگوں کی اکثریت (اس کی عنایات کی) قدر شناس نہیں۔

اور اے مسلمانو! اب تم بھی (موت کا خوف چھوڑ دو اور مارنے مرنے کا عزم لے کر) اللہ کی راہ میں جنگ کرو۔ اور یہ جان لو کہ اللہ
(تمہاری گفتگوؤں کو) سننے والا اور (تمہارے داخلی جذبات کو) جاننے والا ہے۔

کون ایسا ہے جو (جہاد کی اس نازک گھڑی میں) اللہ کو (اپنے مال میں سے) قرض دے ـــــ قرضِ حسن! ـــــ تاکہ اللہ اسے
کئی گنا بڑھا کر لوٹائے ـــــ اور اللہ ہے جو (مال و دولت کو) سکیڑتا اور پھیلاتا ہے (ورنہ اس کی راہ میں خرچ کرنے سے کوئی
گھاٹا نہیں آتا)! ـــــ اور (یہ بات بھی نہ بھولو کہ) اسی کی بارگاہ میں لوٹ کر تم کو (جواب دہی کے لئے) حاضر ہونا ہے!

کیا اے محمد! آپ نے غور کیا بنی اسرائیل کی اس جماعت (کی روش) پر جو موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد ہو گزری ہے؟
ذرا یاد کیجئے اس موقع کو جب کہ انھوں نے اپنے نبی سے مطالبہ کیا کہ ہمارے لئے ایک امیرِ جہاد مقرر کر دیجئے تاکہ ہم اللہ کی راہ میں

جہاد کریں۔ نبی نے (اُن کی بعض کمزوریوں کے پیشِ نظر) جواب دیا کہ تم کہیں ایسا تو نہ کرو گے کہ جب تم کو جنگ کا حکم مل جائے تو پھر جنگ سے گریز کرو۔ وہ بولے کہ آخر کیا ہو گیا ہے ہم کو کہ ہم اللہ کی راہ میں جنگ کرنے سے پہلو تہی کریں جب کہ حال یہ ہے کہ ہمیں اپنے گھروں اور اپنے بچوں سے باہر نکال دیا گیا ہے۔
لیکن ——— پھر جب (واقعی) لڑائی کے لئے ان کو حکم دے دیا گیا تو اُن میں سے تھوڑے سے لوگوں کے سوا باقی سب نے منہ موڑ لئے ——— اور اللہ اس قسم کے ظالموں کو خوب جانتا ہے۔
تو خیر ان کے نبی نے ان سے کہا کہ (تمہارے مطالبے پر) اللہ نے طالوت کو تمہارا امیر جہاد مقرر کر دیا ہے۔ وہ کہنے لگے کہ ہمارے مقابلے میں امارت کا حقدار وہ کیسے بن گیا حالانکہ ہم اس کے زیادہ مستحق تھے، کیونکہ اسے مال و دولت کے لحاظ سے خوش حالی نصیب نہیں ہوئی۔ نبی نے جواب دیا کہ (بس) اللہ نے اس کو تم سب کے مقابلے میں چن لیا ہے اور علم اور جسم کی قوتوں کے لحاظ سے اسے زیادہ حصہ دیا ہے ——— اور اللہ اپنی طرف سے جسے چاہتا ہے اختیارات دے، اور اللہ (صلاحیتوں میں) فراخی دینے والا بھی ہے اور (صلاحیتوں کو) جاننے والا بھی ہے۔ پھر اُن کے نبی نے اُن سے کہا کہ (اگر اس سے پھر بھی اطمینان نہ ہو تو) طالوت کے اس منصب و اختیار (کے من جانب اللہ ہونے) کی ایک علامت یہ ہے کہ وہ تابوت تم کو واپس مل جائے گا جس میں تمہارے رب کی عطا کردہ دولتِ تسکین ہے اور وہ جو کچھ آلِ موسیٰ و ہارون کا بچا کھچا (دینی) ترکہ ہے ——— ملائکہ اسے اٹھائے لائیں گے! بلاشبہ اِس (ہونے والے واقعہ) میں تمہارے لئے ایک خاص نشانی ہے، بشرطیکہ تم ایمان لانے والے ہو!
پھر جب طالوت اپنی فوجیں لے کر نکلے تو انھوں نے (اپنے سپاہیوں سے) کہا کہ اللہ (سامنے کے) دریا کے ذریعے تم کو جانچنا چاہتا ہے۔ سو وہ جانچ یہ ہے کہ جس کسی نے اُس کا پانی پیا تو پھر وہ میرے کام کا نہیں ہے اور جس کسی نے نہ پیا تو وہ میرا ہے۔ ہاں! اگر کوئی ہاتھ سے ایک چلّو بھر لے تو لے لے! ——— چنانچہ چند ایک کو چھوڑ کر باقی سب نے (اس انتباہ کے علیٰ الرغم) پانی پی لیا۔
پھر جب طالوت اور ان کی رفاقت کرنے والے اہلِ ایمان نے دریا پار کر لیا تو وہی لوگ (جن کا کارنامہ اوپر بیان ہوا ہے) کہنے لگے کہ (بس جناب!) جالوت اور اس کے لشکروں کا مقابلہ کرنا آج تو ہمارے بس میں نہیں ہے۔ اُن لوگوں نے جو یہ خیال کرتے تھے کہ ان کو ایک دن) اپنے رب سے جا ملنا ہے (جواب میں) یہ کہا کہ کتنے ہی قلیل التعداد لشکر ہوتے ہیں جو اللہ کے قانون کے تحت کثیر التعداد لشکروں پر غالب آجاتے ہیں ——— اور اللہ ہمیشہ (اخلاق اور نظم کے تقاضے پورے کرنے والے) صبر کیشوں کے ساتھ ہوتا ہے۔
اور جب یہ لوگ جالوت اور اس کی فوجوں کے مقابلے میں آ کھڑے ہوئے تو پکارے: "اے ہمارے آقا! ہمیں زیادہ سے زیادہ مضبوطی عطا فرما اور ہمارے قدم (اس معرکے میں) جما دے اور کافروں کی قوم کے مقابلے میں ہماری مدد فرما!"
سو انھوں نے قانونِ الٰہی کے تحت مخالفوں کو شکست دے دی اور داؤد نے جالوت کو قتل کر ڈالا، اور اللہ نے داؤد کو سلطنت دی، حکمت سکھائی اور جو کچھ چاہا علم عطا کیا ——— اور اللہ اگر (اس طرح) ایک قسم کے لوگوں کے ذریعہ دوسرے لوگوں کو اقتدار سے ہٹانہ دیتا رہے تو زمین پر سارا اخلاقی نظام درہم برہم ہو جائے لیکن اللہ تعالیٰ اہلِ عالم کے لئے بڑا عنایات فرمانے والا ہے۔ (البقرہ ۲۴۳ تا ۲۵۱)

(۴)

اور (اے محمدؐ!) یاد کیجئے وہ موقع جب کہ آپ اپنے گھر سے تڑکے نکل کر اہلِ ایمان کو جنگ کے مورچوں پر جما رہے تھے ———

اور اللہ جو کچھ کہا گیا اسے سننے والا، اور جو کچھ کیا گیا اسے جاننے والا ہے!

ہاں ـــــ وہ موقع کہ جب تم میں سے دو گروہوں نے بزدلی کا مظاہرہ کرنے کا تہیہ کر لیا ـــــ حالانکہ (انہیں سمجھنا چاہئے تھا کہ) اللہ خود ان کا پشت پناہ تھا، اور چاہئے یہ کہ ایمان لانے والے اللہ ہی کے اوپر بھروسہ کریں!

اور اللہ تو (واقعۃً) تمہاری مدد کر چکا ہے بدر (کے میدان) میں جب کہ تم تعداد میں کم تھے۔ سو (بزدلی سے بچنے کے لئے) اللہ سے ڈرو ـــــ شاید کہ تم خدا کے احسانات کا حق ادا کر سکو!

ہاں! قابلِ توجہ ہے وہ موقع جب کہ (اے محمدؐ!) آپ اہلِ ایمان سے کہنے لگے کہ "کیا یہ تمہارے لئے کافی نہیں ہے کہ تمہارا رب تین ہزار فرشتوں کو اتار کر تمہاری پشت پناہی کرے؟" ـــــ (ہم کہتے ہیں) کیوں نہیں! اگر تم ثابت قدم رہو اور تقویٰ کی روش پر چلو، پھر وہ تم پر اسی لمحے آ پڑیں تو تمہارا آقا پانچ ہزار گھوڑے سوار فرشتوں کے ذریعے تمہاری پشت پناہی کرے۔ اللہ نے یہ صورت صرف اس لئے پیدا کی کہ تمہارے لئے خوشخبری ہو اور تمہارے دلوں کو اطمینان حاصل ہو ـــــ اور (یہ ذہن نشین کر لو کہ) کوئی مدد نہیں ہے بجز اس کے کہ جو اللہ کی طرف سے بہم پہنچے۔ وہ اتنا حکیم بھی ہے کہ یہ فیصلہ کرے کہ اس کی مدد کا مستحق کون ہے اور وہ اتنا مقتدر بھی ہے کہ جسے مدد دینا چاہے اس کی مدد کر کے دکھا دے۔

یہ مدد اللہ تعالیٰ تمہیں اس لئے دے رہا ہے کہ کفر کرنے والوں کی قوت کو کسی پہلو سے توڑ دے یا ان کو ذلیل کرے، سو وہ نامراد ہو کر لوٹیں۔ ان لوگوں کے معاملے میں آپ کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہے، اللہ چاہے تو ان کو معاف کرے اور چاہے تو عذاب دے کیونکہ وہ برسرِ ناحق ہیں!

اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ کہ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ کہ زمین میں ہے، وہ (مختار ہے کہ) جس سے چاہے چشم پوشی کرے اور جس کو چاہے سزا دے ـــــ لیکن اللہ خطائیں معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے!

اے اہلِ ایمان! بڑھوتریاں لگا لگا کر سود کھانا چھوڑ دو، اور اللہ (کی گرفت) سے ڈرو ـــــ شاید کہ تم فلاح پاؤ! اور ڈرو اس آگ سے جو تیار کی گئی ہے کفر کرنے والوں کے لئے۔ اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو ـــــ شاید کہ تم پر رحم کیا جائے! اور لپکو اپنے آقا کی بخشش کی طرف اور اس جنت کی طرف کہ جس کی وسعتیں آسمان و زمین جتنی ہیں، اور جو آراستہ کی گئی ہے اہلِ تقویٰ کے لئے۔ یہ ایسے لوگ ہیں کہ خوشی کی حالت میں بھی اور تکلیف میں بھی برابر (اللہ کی راہ میں) اپنے مال صرف کرتے ہیں، اور (حدود اللہ کی پاسداری کے جذبے سے) اپنے اشتعال پر قابو رکھتے ہیں اور لوگوں کی خطاؤں سے درگزر کرتے ہیں ـــــ اور اللہ (اسی طرح کے) احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے ـــــ پھر یہ ایسے لوگ ہیں کہ جب کوئی فحش حرکت کر بیٹھیں یا اپنے نفوس پر زیادتی کر گزریں تو (اس پر فوراً نادم ہو کر) کثرت سے اللہ کا ذکر کرتے ہیں، پھر اپنے گناہوں کے لئے (اللہ سے) معافی چاہتے ہیں ـــــ اور اللہ کے سوا کون ہے کہ جو گناہوں کی معافی دے سکے ـــــ اور یہ جو (غلطیاں) کر بیٹھیں ان پر جانتے بوجھتے جم نہیں جاتے۔ یہی لوگ ہیں کہ جن کا انعام ان کے آقا کی طرف سے مغفرت ہے، اور اس کے ساتھ وہ باغات کہ جن میں نہریں رواں ہیں، وہاں وہ ہمیشہ رہیں گے ـــــ اور کیا ہی خوب انعام ہے کچھ کر دکھانے والوں کے لئے!

تم سے پہلے زندگی کے سارے ہی چلن برتے جا چکے ہیں، لہٰذا زمین میں گھوم پھر کر اور پھر غور کرو کہ (سچائی کو) جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا!

یہ باتیں لوگوں کے لئے حقیقت کی ایک تصریح ہیں، اور (خاص طور پر) اہلِ تقویٰ کے لئے رہنمائی اور نصیحت ہیں!

اور (اے اہلِ ایمان!) نہ تم ڈھیلے پڑو، نہ ملال کرو جبکہ (پیش آمدہ معرکوں میں) تم ہی غالب رہنے والے ہو ـــــ بشرطیکہ تم (صحیح معنوں میں) ایمان والے بنو! اور اگر تمہیں کچھ چوٹ لگی ہے تو آخر دشمن قوم کو بھی تو ایسی ہی چوٹ پڑ چکی ہے ـــــ اور یہ جو (فتح و شکست کے) ایام ہیں ان کو ہم لوگوں کے درمیان برابر گردش دیتے رہتے ہیں۔ اور اس کا مقصد یہ ہے کہ اللہ (عمل کے میدان میں) دیکھ لے کہ واقعی ایمان لانے والے کون ہیں اور یہ کہ ان میں سے دعوتِ حق کے سچے علمبرداروں کو چھانٹ لے ـــــ اور اللہ (کھوٹے ثابت ہونے والے) ظالموں کو ناپسند کرتا ہے ـــــ اور گردشِ ایام کا ایک مقصد یہ ہے کہ اللہ ایمان والوں کو نکھارے اور کفر کرنے والوں کو مٹا دے۔

کیا تم نے یہ امیدیں باندھ رکھی ہیں کہ (بس یونہی) تم جنت میں جا داخل ہوگے، درانحالیکہ وہ موقع نہیں آیا کہ اللہ یہ دیکھے کہ تم میں سے (عمل کے میدان میں) جہاد کرنے والے کون ہیں اور یہ دیکھے کہ مصائب کے سامنے ڈٹ کر رہنے والے کون ہیں!

اور (سوچو تو سہی کہ) مرنے کا اصل موقع آنے سے پہلے تو تم موت کی تمنائیں کرتے تھے (کہ کب دشمنوں کے خلاف جان لڑانے کی گھڑی آئے گی) سو اب تم نے دیکھ لیا اس کو بالکل آنکھوں کے سامنے!

اور محمد (اللہ کے) رسول ہونے سے زائد کچھ نہیں ہیں (کہ تم ان کے بارے میں کوئی فوق الفطرت تصورات باندھ لو) ـــــ پھر کیا اگر وہ مر جائیں یا قتل کر دئیے جائیں تو تم (دین اور اس کے معرکوں سے) الٹے پاؤں واپس ہو جاؤ گے؟ ـــــ اور جو کوئی الٹے قدموں پھر جائے تو (اسے جان لینا چاہئے کہ) وہ اللہ کا ہرگز کچھ نہیں بگاڑ سکتا، اور احسان شناسوں کو (جو اقامتِ دین کی جدوجہد سے کسی حادثے پر قدم نہ ہٹائیں) اللہ تعالیٰ یقیناً جزا دے گا۔

اور (اگر تم موت سے ڈرتے ہو تو یہ بھی جان لو کہ) کسی جان کو موت نہیں آسکتی بغیر اللہ کے حکم کے کہ وہ ایک وقتِ مقرر کے لئے قلمبند کیا ہوا ہے۔ تو جو کوئی دنیا کے مفاد کا تہیہ کرے تو ہم اسے دنیوی مفاد میں سے حصہ دیں گے، اور جو کوئی آخرت کی بھلائی کو پسند کرے تو اس کو ہم آخرت کی بھلائی دیں گے ـــــ اور احسان شناسوں کو ہم دیں گے ان کا انعام!

اور کتنے ہی نبی ہوئے ہیں کہ جن کے ساتھ ہو کر خدا پرست کثیر تعداد میں لڑے، تو پھر ان کو اللہ کی راہ میں جو جو کچھ پیش آیا اس کی وجہ سے وہ نہ ہمت ہار کے بیٹھ رہے، نہ ڈھیلے ہوئے اور نہ (مخالفین سے) دبے ـــــ اور اللہ (اسی طرح کے) ثابت قدم لوگوں کو پسند کرتا ہے۔ اور ان کی پکار اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ انھوں نے کہا کہ "اے ہمارے آقا! ہماری خطاؤں سے اور اپنی ذمہ داریوں میں ہم سے جو زیادتیاں ہوتی ہیں، ان سے درگزر فرما اور ہمیں ثابت قدم رکھ اور کفر کرنے والوں کے گروہ کے مقابلے میں ہماری مدد فرما! چنانچہ اللہ نے ان کو (جزا کے طور پر) دنیا کی کامیابی بھی دی، اور (ان کے لئے) آخرت کی کامیابی تو خوب ہی ہے ا ـــــ اور اللہ احسان شناسوں ہی کو پسند کرتا ہے!

اے اہلِ ایمان! اگر تم (جنگ سے بچنے کے لئے) کفر کرنے والوں کی مان لو تو وہ تم کو (خدا کے دین سے) الٹے پاؤں پھیر لے جائیں، پھر تم گھاٹا کھانے والوں میں جا پہنچو گے! ہاں ہاں! (یوں سوچنے کی کوئی وجہ نہیں) تمہارا مولا تو اللہ ہے اور وہی سب سے اچھا حمایتی ہے!

اب ہم خود کفر کرنے والوں کے دلوں میں (تمہاری) ہیبت بٹھا دیں گے، کیونکہ (ان کی اصل کمزوری یہ ہے کہ) وہ اللہ کے ساتھ ایسوں کو شریک ٹھیراتے ہیں کہ جن کے لئے اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی، اور ان کی آخری منزل آگ ہے ـــــ

اور وہ بہت ہی بُرا ٹھکانا ہے ظلم کیشوں کے لئے!

اور (سمجھ لو نہیں کہ) اللہ نے تو تم سے اپنا وعدہ پورا کر دیا تھا جب کہ اس کے قانون کے تحت (میدانِ احد میں) تم کفار کو کاٹ رہے تھے، یہاں تک کہ (فتح کا) وہ منظر دیکھ لینے کے بعد تم نے خود ہی بزدلی کا مظاہرہ کیا اور اپنی ذمہ داریوں اور اختیارات میں تم نے کشمکش شروع کر دی اور جو حکم دیئے گئے تھے ان کی تعمیل میں کوتاہی کی ——— (اور اپنی کمزوری سمجھ لو کہ) تم میں کچھ ایسے بھی ہیں جو دنیا بنانا چاہتے ہیں اور کچھ وہ ہیں کہ جن کی نگاہ آخرت پر ہے ——— پھر اللہ نے تم کو کفار پر غالب ہونے کے مقام سے (تھوڑی دیر کے لئے) ہٹا دیا تا کہ وہ تمہارے کھوٹے کھرے کو تپا کے چھانٹے۔

اور اب وہ تمہاری اس کوتاہی سے درگزر کر چکا ہے۔ اور اللہ ایمان والوں کے لئے بڑا کرم فرما ہے! (ذرا یاد رہے وہ وقت) جبکہ تم (فتح کے نشے میں) بھرے جا رہے تھے اور کسی کو پیچھے پلٹ کر نہ دیکھتے تھے، اور رسول تم کو پیچھے سے بلا رہا تھا (اور تم اُس کی بھی سُن کر نہیں دے رہے تھے) ——— تو پھر اللہ نے تم کو اسی طرح کرب دیا جیسے کہ تم نے (رسول کو) کرب دیا تھا!

اس (آزمائش) کا مقصد یہ تھا کہ (خدا و رسول کے احکام کی اطاعت کرنے میں) تمہارے ہاتھ سے جو کچھ جاتا رہے اور تم کو جو کچھ پیش آئے اس پر کبھی رنج نہ کرو۔ اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے!

پھر اللہ نے (اس موقع پر یہ نوازش کی کہ) تمہارے ایک گروہ کو مصیبت کے بعد سکون نصیب کیا ایک غنودگی کی سی کیفیت کے ساتھ، اور ایک دوسرا گروہ تھا جن کو اپنی جانوں کی پڑی تھی، اور وہ اللہ کے بارے میں جھوٹی بدگمانیاں کر رہے تھے ——— جاہلانہ بدگمانیاں! کہنے لگے کہ ہمارے اختیار میں بھی ہے کچھ (یا کہ ہمارا کام اندھا دھند حکم مانتے رہنا ہی ہے)؟ ——— اے نبی! ان کو بتا دیجئے کہ حکم دینے کا پورا اختیار اللہ کو حاصل ہے۔ یہ لوگ اصل بات جسے تم سے نہیں کہہ رہے، اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں۔ ان کا کہنا (اصل میں) یہ ہے کہ اگر (جنگ اور صلح کے، قدم آگے بڑھانے اور پیچھے ہٹانے کے، اور حسب موقع کوئی مصلحتی اقدام کر لینے کے) اختیارات میں سے کچھ حصہ ہمیں بھی ملا ہوتا (اور یہ کڑا ڈسپلن نہ ہوتا) تو ہم یہاں اس طرح مارے نہ جاتے! ان سے کہئے (اے نبی!) کہ اگر تم گھروں ہی میں ہوتے تو جن کے لئے اپنے بستروں پر بھی قتل ہو جانا مقدر تھا وہ تو بہرحال نکلتے۔

اور اللہ کو تپانا تھا وہ کھوٹ جو تمہارے سینوں میں ہے، اور نکھارنا تھا وہ خلوص جو تمہارے دلوں میں ہے! ——— اور سینوں کے اندر جو کچھ ہے، اللہ اسے جاننے والا ہے!

بلاشبہ جو لوگ (اسلام اور کفر کے) دو لشکروں کے معرکے کے دن پیچھے ہٹے تھے ان کے قدموں کو متزلزل کرنے میں شیطان ان کی کسی نہ کسی شامتِ اعمال کی وجہ سے کامیاب ہوا تھا، لیکن اللہ ان کو معاف کر چکا ہے ——— بلاشبہ اللہ خطائیں معاف کرنے والا اور عالی ظرف ہے۔

اے اہلِ ایمان! تم ان لوگوں جیسے نہ ہو کہ جنھوں نے (مسلمان ہو کر) کافرانہ ڈھنگ اختیار کیا کہ اپنے بھائیوں کے بارے میں کہنے لگے جبکہ وہ زمین میں سفر کے لئے نکلے یا وہ جہاد میں تھے! "اگر وہ (بھی گھر میں) ہمارا ساتھ دیتے تو نہ مرتے نہ مارے جاتے"۔ ان باتوں کا نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ اللہ ان کے دلوں میں (خواہ مخواہ کی) ایک حسرت بھر دے ——— اور اللہ ہی ہے جلانے والا اور مارنے والا ——— اور اللہ ان تمام حرکتوں کو دیکھنے والا ہے جو تم کرتے ہو! اور اگر (اے اہلِ ایمان!) تم اللہ کی راہ میں مارے گئے یا مر گئے تو (دیکھو گے کہ) اللہ کی مغفرت اور رحمت اُس (مالِ دنیا سے) کہیں زیادہ بہتر ہے جسے وہ لوگ سمیٹتے ہیں۔

سو یہ کچھ اللہ ہی کی مہربانی ہے کہ اے محمدؐ! (ایسی ایسی ناخوشگوار باتیں سن کر بھی) آپ ان کے لئے نرم خو ہیں، ورنہ کہیں اگر آپ تلخ کلام اور سخت دل ہوتے تو یہ آپ کا ساتھ چھوڑ کر منتشر ہو جاتے۔ پس ان کی کوتاہیوں سے درگزر کیجئے، ان کے لئے مغفرت طلب کیجئے، اور معاملات میں ان سے مشورہ لیجئے، اور پھر جب آپ کسی معاملے کو طے کر لیں تو اللہ پر بھروسہ کیجئے، یقیناً اللہ (اپنے اوپر) بھروسہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

(اے اہلِ ایمان!) اگر اللہ تمہاری پشت پناہی کرے تو کوئی تم پر غالب نہ ہوگا اور اگر (تمہاری شامتِ اعمال کی وجہ سے) وہ تمہیں بے یار و مددگار چھوڑ دے تو پھر اس کے بعد اور کون ہے جو تمہاری مدد کر سکے؟ —— اور اہلِ ایمان کو چاہیئے کہ وہ اللہ ہی پر بھروسہ کریں۔

اور کسی نبی کا کام یہ نہیں کہ وہ کچھ چھپا کے رکھے، اور جو کوئی چھپائے گا تو اس نے جو کچھ چھپایا ہو قیامت کے دن لا حاضر کرے گا۔ پھر سارے متنفس اپنی پوری پوری کمائی پائیں گے اور ان کے ساتھ کوئی بے انصافی نہ ہوگی۔

بھلا وہ شخص جو اللہ کی رضا کے پیچھے (قربانیاں دیتا ہوا) چلے اس شخص جیسا ہو سکتا ہے جو (اپنی نفسانیت کی وجہ سے) اللہ کی ناراضی کے گھیرے میں آ گیا ہو —— دوزخ اس کا ٹھکانا ہے اور وہ بہت ہی بری جائے قیام ہے۔ اُن کے لئے (جو اللہ کی رضا کے پیچھے جاں بکف ہیں) اللہ کی بارگاہ میں بڑے اونچے درجات ہیں! اور جو جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھنے والا ہے۔

اللہ نے بڑا احسان فرمایا ہے ایمان والوں پر کہ اس نے خود انھیں میں سے ایک رسول کھڑا کیا جو ان کے سامنے اللہ کی آیات تلاوت کرتا ہے، اُن کا (ذہنی و اخلاقی) تزکیہ کرتا ہے، اور ان کو الکتاب کی اور (دین کی) حکمت کی تعلیم دیتا ہے، حالانکہ اس سے پہلے وہ صریح گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔

(اس احسان کا شکریہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ اب اس نبی پر ایمان لا کر دنیا کی راہ میں مشکلات و شدائد سہنے پر تیار رہو)

اب جب تم کو (احد کے میدان میں) ایک تکلیف پہنچی ہے —— باوجودیکہ تم (مخالفین کو) پہلے (بدر میں) دگنی تکلیف پہنچا چکے ہو —— تو کیا اب یہ پوچھتے ہو کہ (اللہ ہمارے ساتھ تھا تو) یہ کہاں سے آئی؟ اے محمدؐ! ان سے کہہ دیجئے کہ یہ تمہاری اپنی ہی طرف سے ہے۔ اور دونوں فوجوں کے تصادم کے دن جو کچھ تمہیں پیش آیا وہ اللہ کے قوانین کے تحت تھا اور اس سے غرض یہ تھی کہ اللہ (عمل کے میدان میں) حقیقی ایمان داروں کو بھی جانے اور (دوسری طرف) ان کو بھی جانے جو (مسلمان کہلا کر) نفاق میں مبتلا ہوئے۔ اور اُن (اہلِ نفاق) سے کہا گیا کہ آؤ لڑو اللہ کی راہ میں یا یہ کہ دشمن کی مدافعت کرو۔ کہنے لگے کہ اگر ہمیں لڑائی کا یقین ہو جائے تو ہم ضرور تمہارا ساتھ دیں گے —— اُس دن یہ لوگ ایمان کے مقابلے میں کفر سے زیادہ قریب تھے! —— یہ لوگ زبانوں سے وہ کچھ کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہے۔ اور اللہ جانتا ہے جو کچھ کہ یہ چھپائے ہوئے ہیں۔ یہ ایسے لوگ ہیں جو خود (موقع جنگ پر) گھروں میں بیٹھ رہے اور اپنے دوسرے بھائیوں کے بارے میں کہنے لگے کہ وہ بھی اگر ہمارا طریقہ اختیار کرتے تو میدانِ جنگ میں مارے نہ جاتے! —— اے محمدؐ! ان سے کہہ دیجئے کہ اچھا تم سچے ہو تو اب ہٹا دکھاؤ اپنی جانوں سے موت کو!

اور آپؐ اللہ کی راہ میں مارے جانے والوں کو (عام مرنے والوں کی طرح) مردہ نہ سمجھیں، بخلاف اس کے وہ زندہ ہیں، اپنے رب کے حضور سے روزی پاتے ہوئے، وہ مسرور ہیں ان احوال و مقامات پر جو اللہ نے اپنے فضل سے ان کو عطا کئے ہیں، اور وہ اپنے ان ساتھیوں کی جو ابھی ان کے ساتھ آ نہیں ملے ہیں، یہ خوشخبریاں سنتے ہیں کہ ان کے لئے نہ کسی طرح کا خوف ہے، نہ وہ رنجیدہ ہوں گے۔ شہدا کے لئے مژدہ ہے اللہ کی نعمتوں اور نوازشوں کا اور اس حقیقت کا کہ اللہ اہلِ ایمان کا

کا اجر ضائع نہیں کرتا —— وہ ایمان والے کہ جنھوں نے اس کے بعد بھی کہ ان کو گھاؤ لگ چکے تھے اللہ اور رسول کے بلاوے پر
لبیک کہی۔ اُن میں سے جنھوں نے بھی بھلائی کی اور تقویٰ سے کام لیا ان کے لئے بڑی جزا ہے —— ہاں یہ وہ ہیں کہ لوگوں نے
جب اُن سے کہا کہ تمہارے خلاف لوگوں نے بڑے ساز و سامان جمع کر لئے ہیں اس لئے اُن سے خوف کرو تو ان کے ایمان میں
اور اضافہ ہوا اور انھوں نے (جواب میں) یہ کہا کہ ہمارے لئے اللہ کافی ہے اور کیا ہی خوب ہے وہ کارساز! چنانچہ وہ اللہ کی
نعمت اور اس کی عنایت کی بدولت چلے آئے، ان کو کوئی گزند نہیں پہنچا، اور انھوں نے اللہ کی رضا کی پیروی کی ——
اور اللہ بڑی بھاری عنایات کرنے والا ہے۔
یہ تو بس شیطان ہے کہ جو (ایسے ایسے اندیشوں سے) اپنے رفیقوں کو ڈراتا ہے، سو تم ان (شیطان اور اس کے رفیقوں) سے
ڈرا ہی نہ کرو، بلکہ مجھ سے ڈرو —— اگر تم واقعی ایمان والے ہو!
اور (اے محمدؐ) آپ کے لئے وہ لوگ وجہ ملال نہ ہوں جو کفر میں پیش پیش ہیں، یہ اللہ کا قطعاً کچھ نہیں بگاڑ سکتے، اللہ نے فیصلہ
کیا ہے کہ ان کو آخرت (کی بھلائی) میں سے کوئی حصہ نہ دے، اور ان کے لئے دردناک سزا ہے۔ جن لوگوں نے ایمان بیچ کر کفر
خریدا ہے وہ قطعاً اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، اور ان کے لئے دردناک سزا ہے! اور کفر کا مسلک اختیار کرنے والے یہ نہ سمجھیں کہ
ہم ان کو جو کچھ ڈھیل دے رہے ہیں یہ اُن کی جانوں کے لئے کوئی بہتری ہے —— ہم ان کو اس لئے ڈھیل دے رہے ہیں
کہ وہ اپنے جرائم میں اور اضافہ کر لیں، اور (اس ڈھیل کے پیچھے) ان کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔
اللہ ایمان والوں کو یوں نہ چھوڑے رکھے گا جس حال پہ کہ تم اس وقت ہو (بلکہ وہ ان کو آزما کے چھوڑے گا) یہاں تک کہ کھوٹ
میل کو خالص مال میں سے الگ کر دے۔
اور اللہ کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ تم کو غیب (کی مذکورہ بالا حقیقتوں) سے (براہِ راست) آگاہ کر دے، ہاں مگر یہ کہ وہ اس
مقصد کے لئے چھانٹ لیتا ہے اپنے رسولوں میں سے جسے چاہے —— پس (جب براہِ راست غیب آشنا ہونے کا امکان
نہیں ہے تو) ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر۔ اور اگر تم ایمان لاؤ اور روشِ تقویٰ اختیار کرو تو تمہارے لئے بڑی جزا ہے۔
اور وہ (نادان) لوگ کہ جو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے وقت) بخل کرتے ہیں، یہ نہ سمجھیں کہ اللہ نے اپنا جو رزق ان کو
دے رکھا ہے وہ ان کے لئے کوئی سودمند چیز ہے، وہ تو ان کے لئے سخت موجبِ نقصان ہے، کیونکہ جس مال میں انھوں
نے بخل کیا ہے قیامت کے روز اس کا طوق بنا کر اس کے گلے میں ڈالا جائے گا۔ اور (ان بخیلوں کو جاننا چاہیے کہ) آسمانوں اور
زمین کی میراث درحقیقت اللہ ہی کی ہے —— اور عملاً جو کچھ کہ تم کر رہے ہو اللہ اس سے باخبر ہے! (آل عمران = ۲۱ — ۱۸)

اعتذار

اس مرتبہ صرف اٹھائی کا پیوں کا تصحیح ہو سکا ہے بقیہ کی نظرِ ثانی اور تصحیح کا
کام بوجہ مصروفیات نہیں ہو سکا۔ سو غلطیاں بکثرت ہونگی۔ مگر مجبوری ہے۔
"ادارہ"

اسلام کا فلسفۂ معاشیات

پروفیسر عبدالحمید صاحب ایم۔اے

اسلامی علوم سے متعلق ایک بُنیادی غلط فہمی اور اُس کا ازالہ

وحی و الہام کی طرف سے جو تغافل کی وجہ سے نسلِ انسانی نے "سواء السبیل" کو کھو دیا۔ اور پھر تباہی اور بربادی کے راستوں پر بھٹک نکلی۔ چنانچہ مختلف ادوار میں زندگی کے اکثر پہلوؤں میں سے کوئی ایک پہلو۔ زندگی کی بیشتر ضرورتوں میں سے کوئی ایک ضرورت۔ اور کئی حل طلب مسائل میں سے صرف ایک مسئلہ انسان کے دل و دماغ پر اس طرح حاوی ہو گیا کہ دوسرے پہلوؤں۔ ضرورتوں۔ اور مسئلوں کے ساتھ وہ بالارادہ یا بلاارادہ بے انصافی برتنے لگا۔ فطرتِ انسانی کے وہ داعیات جن سے سب سے زیادہ بے انصافی ہوئی وہ بغاوت پر اتر آئے اور ایک طویل کشمکش کے بعد ذہنوں پر چھا گئے۔ پھر وہ داعیات اپنے مخصوص مقتضیات کے مطابق پوری زندگی کو اُس رُخ پر بہالے گئے جس میں پھر دوسرے پہلوؤں اور ضرورتوں اور مسئلوں کے ساتھ بے انصافی ہونے لگی۔ اور پوری انسانیت اس طرح کبھی حقیقی فلاح و کامرانی سے ہمکنار نہ ہو سکی۔

کے ان دھکوں نے علوم و فنون پر بھی گہرا اثر کیا۔ وہ بھی انسانی زندگی کے ساتھ ساتھ غلط خطوط پر بڑھتے چلے گئے۔ اور انسانی زندگی کے صحیح ارتقا میں ممد و معاون ہونے کے بجائے اس راہ میں برابر رکاوٹ بنے رہے۔

تاریخ انسانی کی یہی کشمکش اب ہمیں ایک ایسے مقام پر لے آئی ہے جہاں بالشت بھر پیٹ نے زندگی کی ساری وسعتیں گھیر لی ہیں۔ عالمِ خیال میں کتابیں تصنیف کرنے والے خوش فکر مصنفین جو چاہیں لکھیں۔ مگر عملی زندگی میں اس وقت ایک قوتِ محرکہ اور ایک زندہ حقیقت پائی جاتی ہے اور وہ پیٹ یا جیب ہے۔

مسٹر جوڈ کا مندرجہ ذیل قول صرف یورپ کے متعلق ہی صحیح نہیں بلکہ ساری مغرب زدہ دُنیا کے متعلق صحیح ہے۔

"جو نظریۂ حیات اس زمانے پر مستولی اور غالب ہے وہ اقتصادی ہے اور ہر مسئلہ اور معاملہ پیٹ یا جیب کے نقطۂ نظر سے دیکھا اور جانچا جاتا ہے۔"[1]

"معاشی ہمہ اوست" کے اسی فلسفہ نے علمِ معاشیات کو بھی غیر معمولی اہمیت دی ہے۔ اور اب یہ مضمون تمام دوسرے مضامین پر اس طرح چھایا ہوا ہے کہ باقی سارے اسی کی راہنمائی میں مرتب کئے جاتے ہیں۔

تاریخِ انسانی جہاں انسانیت کی اس "بے راہ روی" کی نشان دہی کرتی ہے وہاں اس حقیقت کی بھی شاہد ہے کہ ہر عہد اور ہر زمانہ میں اللہ کے لاتعداد بندوں نے بحرِ ظلمات میں غوطہ زن لوگوں کی توجہ "نورِ مبین" کی طرف مبذول کرائی۔ ان حضرات نے وقت کے تقاضوں کو سمجھ کر حالات و واقعات کی دھڑکنوں پر کان لگا کر اور زمان و مکان کے مطالبات جان کر لوگوں کو "افراط و تفریط" کے مہلک نتائج سے آگاہ کیا۔

سلہ A GUIDE TO MODERN WICKEDNESS BY C.E.H. JOAD.

انھوں نے صرف آگاہ ہی نہیں کیا۔ بلکہ وحی الٰہی کے پیش کردہ راستوں کی طرف نوعِ انسانی کی راہنمائی بھی کی۔
چونکہ وقت کے ڈھانچوں کے بدلنے کے ساتھ فتنے بھی جزئیات میں متغیر ہوتے گئے اس لئے ان پاکبازوں نے اپنے اصلاح کے اوزاروں میں بھی زمانہ کی ضرورت کے مطابق مناسب ردوبدل کر لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگر فلسفہ میں غلط رجحانات پیدا ہوئے تو وہ اسی مضمون کی ساخت کے مطابق ساز و سامان لے کر آگے بڑھے اور اس قصرِ "شیطنت" کو بنیادوں سے اکھاڑ کر رکھ دیا، اگر ادب میں بگاڑ رونما ہوا تو وہ اس میدان میں نکلے اور اس کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوئے، اگر لوگوں کے دل کی انگیٹھیاں خدا سے غافل ہونے کی وجہ سے سرد پڑ گئیں تو انھوں نے اُن کو خدا کی یاد سے گرمایا اور اگر قانون و سیاست غلط ڈگر پر چل پڑے تو انھی بندگانِ خدا نے پوری قوت اور پوری جرأت سے ان کو روکا اور ان کو صحیح راہ پر لگانے کی کوشش کی۔ اس مزاحمت میں اگر انھیں جان کی بازی بھی لگانی پڑی تو اس سے بھی دریغ نہ کیا۔
اس ظاہری تغیر کو دیکھ کر بعض انجان لوگوں نے نادانستہ اور بعض عیاروں نے دانستہ طور پر یہ کہنا شروع کیا کہ "اسلام کا کوئی واضح اور لگا بندھا قانون نہیں[۵۱]۔ بلکہ ہر دور کے علما اپنے ذاتی میلانات کے مطابق اسلام کی تعبیر کر کے اس کو وحی الٰہی کی حیثیت سے پیش کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی اسلامی فلسفہ کا دور دورہ ہوا۔ تو کبھی اسلامی سیاست کے چرچے ہونے لگے، اور اب جبکہ دنیا کی بازی معاشیات کے ہاتھ میں آئی تو یہ سرپھرے، اسلامی معاشیات کا غلغلہ بلند کر رہے ہیں"۔
اگر ہم ان "سادہ لوح لوگوں" کے دماغ کا تجزیہ کر کے اُن اسباب و علل کا کھوج لگائیں جنھوں نے اس غلط فہمی کو جنم دیا تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اس کی اصل وجہ قرآن حکیم کی ترتیب سے ناواقفیت ہے۔ فاطرِ کائنات نے نوعِ انسانی کی ہدایت کے لئے سرورِ دو عالم پر اپنا "آخری پیغام" نازل فرمایا مگر یہ پیغام اُس نے بیک وقت لکھ کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دے دیا، بلکہ اسے "دعوت" کے ساتھ ساتھ تدریجاً اتارنا شروع کیا۔ چنانچہ وہ دعوت اپنے آغاز سے لے کر اپنی انتہائی تکمیل تک تئیس (۲۳) سال کی مدت میں جن جن مراحل سے گزرتی رہی ان کی مختلف النوع ضرورتوں کے مطابق قرآن کے مختلف حصے بھی نازل ہوتے رہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی کتاب میں تصنیفی ترتیب نہیں ہو سکتی پھر اس دعوت کے ارتقا کے ساتھ ساتھ قرآن حکیم کے جو چھوٹے اور بڑے حصے نازل ہوئے وہ بھی رسالوں کی شکل میں شائع نہیں کئے جاتے تھے۔ بلکہ تقریروں کی شکل میں بیان کئے جاتے۔ اور اسی شکل میں اُن کی اشاعت ہوتی۔ اس لئے ان کا اسلوب بیان بھی تحریری نہ تھا بلکہ خطیبانہ تھا۔ پھر یہ خطابت بھی ایک پروفیسر کے لکچروں کی سی نہیں بلکہ ایک داعی کے خطبوں کی سی تھی جسے دل و دماغ اور عقل و جذبہ ہر ایک سے اپیل کرنا ہوتا اور ہر قسم کی ذہنیتوں سے سابقہ پیش آتا۔ ظاہر ہے اس کتاب میں ایک متعین موضوع پر معلومات، خیالات اور دلائل کو ایک خاص کتابی ترتیب کے ساتھ پیش نہیں کیا جا سکتا[۵۲]۔ نتیجہ یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبے سے متعلق "طالبینِ حق" نے حکمت کے اصول اور لاتعداد موتی ضرورت کے مطابق جمع کئے، اور پھر انھیں وقت کے تقاضے کے مطابق باہم ایک دوسرے سے پیوست کر دیا۔
انسانی زندگی چونکہ ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے۔ اس لئے ہدایتِ الٰہی بھی "کُل" کی شکل میں پیش کی گئی ہے۔ کلامِ ربانی میں اعتقادی مسائل۔ اخلاقی ہدایت۔ شرعی احکام۔ دلائل و شواہد۔ تاریخ و تمدن۔ منطق و فلسفہ۔ معیشت و معاشرت سب کو یکجا سمو دیا گیا ہے۔ اب یہ ہمارا اپنا کام ہے کہ جس شعبۂ زندگی سے متعلق ہمیں راہنمائی مطلوب ہو اُس کے لئے ہم اس کی "مشعل" تھام کر آگے بڑھیں۔

---

[۵۱] چندریگر صاحب گورنر صوبہ سرحد نے پولیٹکل سائنس کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے اسی قسم کے خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ پاکستان ٹائمز۔ ۱۰۔ اپریل ۱۹۵۰ء۔
[۵۲] ماخوذ۔ ترجمان القرآن۔ مرتبہ سید ابوالاعلیٰ مودودی۔

یہ دعویٰ کہ اسلام تو صرف اخلاقی پیغام ہے جس کا معاشیات سے کوئی تعلق نہیں۔ بہت بڑی جسارت ہے۔ زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح معاشیات میں بھی اسلام کا ایک واضح اور مخصوص نقطۂ نظر ہے۔ جن کی اساس قرآنِ پاک اور سنتِ رسول ہے۔ یہ دو بنیادیں ایسی محکم اور غیر متزلزل ہیں کہ زمانے کے ہزاروں انقلابات اور بے شمار تاثرات اور ذہنی رجحانات ان کے اندر کوئی تغیر پیدا نہیں کر سکتے۔ ہاں ان کے اندر اتنی گنجائش ضرور رکھی گئی ہے کہ زمان و مکان کی تبدیلی کے ساتھ جزئیات اور فروعات میں مناسب ردوبدل کیا جا سکے۔ مگر اس کے لئے بھی ایک اہم شرط ہے اور وہ یہ کہ یہ تفصیلات اسلام کی روح کے کسی طرح منافی نہ ہو۔

اس طرزِ فکر پر سوچنے والے احباب اس حقیقت کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں کہ اگر اسلام کے اصول بھی حتمی۔ آخری اور قطعی نہیں۔ تو آخر کفر اور اسلام میں فرق ہی کیا ہے۔ اسلام تو غیر اسلام سے ممیز ہی اس بنا پر ہے کہ وہ زندگی کی اُن ابدی و ازلی اقدار کو پیش کرتا ہے جن کی حیثیت ایک بے لاگ عدالت کی سی ہے۔ جو ہر دور میں اور ہر مقام پر ہر قسم کے خارجی حالات میں لوگوں کو حق اور راستی کا فیصلہ سناتی ہے۔ اس کے اصول و مبادیات کی حیثیت مرغِ بادنما کی سی نہیں جن کے رخ کو واقعات کا ہر جھونکا بدل کر رکھ دے۔ اگر تعبیر کے پردے میں اسلامی اقدار کی مفروضیت کو ختم کر دیا جائے تو اسلام کا پورا ڈھانچہ بے روح ہو جاتا ہے۔ اور اللہ کا یہ دین ایک حرکی۔ انقلاب انگیز۔ اور تخلیقی قوت کی بجائے ایک ایسی نقش بن جاتا ہے جس کو دفن کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اور اگر بالفرض طبیعت محض جذباتیت کی بنا اسے دفن کرنا گوارا نہ کرے تو اسے اپنے پاس رکھنے کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ اسے دماغ کے عجائب گھر میں دوسرے عجائبات کے ساتھ ایک عجوبہ روزگار کی حیثیت سے محفوظ رکھا جائے۔

—— + ——
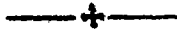
علمِ معاشیات کا نفسِ مضمون

انسان کی پوری کی پوری زندگی احتیاج کے محور پر گھومتی ہے۔ اُس کو بھوک سے بچنے کے لئے روٹی، تن ڈھانکنے کے لئے کپڑا، رہنے کے لئے مکان، سانس لینے کے لئے ہوا اور پرورش کے لئے شفقت کی ضرورت ہے۔ ان ساری ضروریات پر اگر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہو گا کہ ضروریات کو دو اقسام میں منقسم کیا جا سکتا ہے :۔ مادّی[1] اور غیر مادّی۔ معاشی نقطۂ نظر سے مادّی ضرورت وہ ہے جسے دولت[1] کے صرف سے پورا کیا جا سکے۔ انسانی زندگی کا ایک معتدبہ حصہ ایسی مادّی ضرورت کے پورا کرنے میں خرچ ہو جاتا ہے۔ انسان کو اپنی آرزوؤں کے پورا کرنے کے لئے جن مادّی چیزوں کی ضرورت ہے، وہ محدود ہیں اور اس کی آرزوؤں کی کوئی انتہا نہیں۔ قدرت نے اُس کی فطرت میں سیری نہیں دی۔ اس کا ذہن اور اس کا دل ہمیشہ ہر وقت نئے نئے مقاصد، نئی نئی آرزوؤں کا مولد ہے۔ اسی لئے انسانی زندگی بھی پیہم جدوجہد میں صرف ہوتی ہے۔ ہر فرد اسی "کوششِ ناتمام" میں منہمک رہتا ہے کہ وہ لاتعداد ضروریات کو محدود وسائل سے پورا کرے۔ یہی درحقیقت معاشیات کا اصل موضوع ہے۔ بھوک اگر تکلیف دہ اور مہلک نہ ہوتی، جسم اگر سردی اور گرمی پر فتح پا سکتا ہے، اور اس کے ساتھ شرم و حیا کا طبعی جذبہ بھی مردہ ہو جاتا تو علوم کی فہرست سے معاشیات کا لفظ بالکل ناپید ہوتا۔

تکمیلِ ضرورت اور تخلیقِ ضرورت کا برابر ایک چکر انسانی زندگی میں چل رہا ہے جس کا محیط ہر گردش کے بعد وسیع تر ہوتا جاتا ہے۔ اس حقیقت کا تصور ذیل کی شکل سے اخذ کیا جا سکتا ہے :۔

---

[1] علمِ معاشیات میں دولت کی تعریف یہ ہے کہ جو چیز بازار میں خریدی اور فروخت کی جا سکے۔
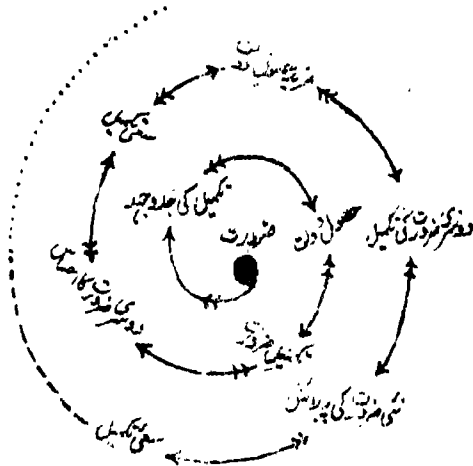
ماڈی ضرورت اس کی تکمیل کے لئے جدوجہد اور جدوجہد کے نتیجے میں دولت کا حصول اور پھر اس دولت سے ضرورت کا پورا کرنا ——— یہ ہے وہ چکر جس میں انسان تا دمِ زیست گرفتار رہتا ہے۔ اس بنا پر علمِ معاشیات اتنا ہی پرانا ہے جتنا کہ انسانی زندگی کی تگ و دو۔ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ جب دُنیا کے افکار بدلے تو مضمون کی اہمیت میں بھی کمی بیشی ہوتی رہی مگر نفسِ مضمون میں کوئی تغیر رونما نہیں ہوا، یہ اپنی جگہ جوں کا توں قائم ہے۔ ہاں اس کے متعلق لوگوں کی آرا میں نمایاں تبدیلی ہوتی رہی۔ کبھی تو مادی ضروریات کے لئے سعی وجہد کو انتہائی ذلیل اور قابلِ مذمت قرار دیا گیا اور اس راستے میں معمولی کوشش کو بھی روحانیت کی ضد خیال کیا گیا۔ اور کبھی فکر کا رقاص دوسری سمت اس حد تک جا پہنچا کہ مادی ضروریات میں استغراق ہی انسانی زندگی کا کعبۂ مقصود قرار پایا اور اس سلسلے میں معمولی سے معمولی حرکت کو بھی وہ تعیین حاصل ہوئی کہ اُس پر روحانیت کے بلند سے بلند مراتب کو بھی بآسانی قربان کیا گیا ؎

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا

کہاں مادی ضرورت کے حصول کے لئے ایک ادنیٰ سی جنبش بھی قابلِ صد ملامت اور کہاں زندگی کا "سارا سرمایہ" یہی " مادیت "!
انسانیت کی اسے بد بختی سمجھئے کہ اس کے افکار و اعمال کی ناؤ ان دو انتہاؤں کے درمیان ہی ہچکولے کھاتی رہی۔
اگر ہم علمِ معاشیات کی تاریخ کا ایک سرسری سا مطالعہ بھی کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ یہ مضمون کتنے پُر پیچ اور عجیب و غریب راستوں سے گزر کر ہمارے سامنے آیا ہے۔

علمِ معاشیات کا سفرنامہ

یونانی فلاسفہ کے نزدیک انسان کی سب سے بڑی خوبی سچائی، پُر تفکر و تدبر اور نیکی کی راہ پر گامزن ہونا ہے۔ افلاطون اور ارسطو دونوں کی نظر میں دولت کی حیثیت محض حصولِ مقصد کے ذریعے کی سی تھی۔ اصل مقصد اس سے بدرجہا ارفع و اعلیٰ تھا۔ دولت کی ایک کم سے کم مقدار کو اگرچہ وہ زندگی کے لئے ناگزیر سمجھتے تھے، مگر یہ متعین تھی اور سماج کی نگاہ میں دولت افزائی اخلاق کے انحطاط کا ایک بیّن ثبوت تھا۔ مادی ضروریات کی تکمیل کے لئے جدوجہد روحانی نقطۂ نظر سے کوئی قابلِ قدر فعل قرار نہیں کیا جاتا تھا۔ اُن کا نظریہ یہ تھا کہ سماج میں جوں جوں روحانیت کی ترقی ہوگی مادیت کے لئے کشش اسی نسبت سے گھٹتی چلی جائے گی۔ اُن کی معاشی لغت میں افلاس و دولت کی کمیابی نہیں بلکہ آرزوؤں اور ضروریات کے بڑھنے کا دوسرا نام تھا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ سماج میں کسی حد تک "عدمِ مساوات" کا پایا جانا بالکل فطری اور طبعی سی چیز ہے۔ لیکن اس کی انتہائی اور بھیانک شکل سے سوسائٹی کو ہمیشہ محفوظ رکھنا چاہئے۔ کسی شہری کا صنعت و حرفت میں انہماک برداشت نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ شہریت اُن کی نظر میں ایک ایسا فن تھا جس کا

مقصد صرف وسیع مطالعہ اور مختلف علوم و فنون کی تحصیل ہی تھا۔ سود کی کلی طور پر ممانعت تھی۔

اپیکیوریننر (EPICUREANS) اور سٹوئکز (STOICS) کے نظریات کا چونکہ معاشیات سے کوئی ایسا تعلق نہیں تھا جس کو زیرِ بحث لانا ضروری ہو۔ لہٰذا ان کو نظر انداز کرتے ہوئے ہم آگے بڑھتے ہیں۔

ان کے بعد دنیا میں جن چیزوں کو عروج حاصل ہوا وہ اہلِ روما تھے۔ معاشیات کے بارے میں اُن کا رویّہ یونانیوں سے کسی طرح مختلف نہیں تھا۔ اُن کی تہذیب کے تین سب سے بڑے فلاسفر (CICERO, SENECA & PLINY) عیش پرستی کے شدید مخالف تھے۔ اور اس معاملے میں ہم خیال تھے کہ اصل خوبصورتی سادگی میں مضمر ہے۔ انھوں نے اپنی تصانیف میں دولت کے صحیح استعمال پر بہت زیادہ زور دیا ہے۔ سینا کا (SENECA) کہنا ہے "روپیہ تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ اور رشک و حسد تمام ناانصافیوں کا منبع۔ (PLINY) اپنی کتاب (NATURAL HISTORY) میں لکھتا ہے "انسانیت کے خلاف سب سے بڑا جرم اُس شخص نے کیا جس نے سب سے پہلے سونے کی انگوٹھی پہنی۔ سونے کی دریافت کی غایت انسان کی بربادی ہی تھی۔" تجارت اور صنعت و حرفت اُن کے نزدیک کوئی قابلِ ستائش کام نہیں تھے۔ اور اس سلسلے میں معمولی سے معمولی کوشش بھی عام شہریوں کے معیارِ شرافت سے فروتر تھی۔

اہلِ کلیسا کا دولت کے متعلق نظریہ جڑسے لے کر شاخوں تک وہی تھا جو افلاطون اور ارسطو کا تھا۔ جاگیرداری کی اساس بحیثیت نظام کے اگرچہ زراعت اور فوج پر تھی مگر عسکری پہلو دوسرے پہلو پر حاوی اور غالب تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس دور میں بھی معاشی قدریں غیر معاشی قدروں کی محکوم اور غلام رہیں۔[1]

عہدِ جدید کا آغاز سولھویں صدی عیسوی کی قوم پرستی کی تحریک سے ہوا۔ مختلف اسباب کی بنا پر عیسائی طرزِ فکر میں تبدیلی آنے لگی۔ تین صدیوں یعنی گیارھویں سے تیرھویں صدی عیسوی تک عیسائیت کو بڑا عروج رہا۔ مگر اس کے بعد یہ ترقی تھک کر آغوشِ تنزل میں سو گئی اور عیسائیت کے تابوت میں آخری میخ اصلاحِ مذہب نے گاڑ دی۔ قرونِ وسطیٰ کے یورپ کا نعرہ "خوش نصیب ہیں غریب (BLESSED ARE THE POOR) عہدِ حاضرہ کی ہماہمی اور گہماگہمی میں گم ہو کر رہ گیا اور اس کی جگہ اہلِ ثروت و دولت خدا کی نعمتوں اور رحمتوں کے مستحق خیال کئے جانے لگے۔ ایسپیناس (ESPINAS) اس عظیم تغیر کی مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

"مذہب تو بس ایک رکاوٹ تھا جس کا مقصدِ وجود یہی تھا کہ اسے ترقی کے راستے سے ہٹا دیا جائے، یا یہ ایک آلہ کار تھا جسے وقتاً فوقتاً استعمال کیا جاتا رہا۔"

فرانس میں کلیسا ریاست کا ایک جزو تھا۔ تاریخِ انسانی اب سونے اور لوہے کے دور میں قدم رکھ رہی تھی۔ یورپ ایک میدانِ کارزار تھا جس میں تمام انواع و اقسام کی ہوس کاریاں باہم ایک دوسرے سے دست و گریبان تھیں۔

وہ اسباب جنھوں نے عیسائیت کی بنیادوں کو متزلزل کیا، انھوں نے ہی درحقیقت جدید عقلیت کو جنم دیا۔ اس عہد سے پیشتر (PRIVATE ECONOMY) کا چرچا تھا۔ مگر اس کی جگہ اب (STATE ECONOMY) نے لے لی۔ معیشت و سیاست اخلاقی بندھنوں سے آزاد ہونے لگے۔ اور وقت کے گزرنے کے ساتھ انسانی افعال و اعمال پر اخلاق کی معمولی سے معمولی گرفت بھی غائب ہو گئی۔

اس امر میں سب کا اتفاق ہے کہ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام نشاۃِ جدیدہ کے عہد میں پیدا ہوا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی پیدائش میں زیادہ دخل اصلاحِ مذہب کی تحریک کو تھا یا جغرافیائی معلومات کو۔ مگر یہ بات مسلم ہے کہ اس کے بعد قدروں کے ترازو یا خیر و شر کے پیمانے

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھو THE CRISIS OF OUR CIVILIZATION BY HILAIRE BELOC.

جانچنے جانے کے معیار یکسر بدل گئے۔ لوتھر اور کالون (CALUIN) کی سعی نے پولیٹیکل اکانومی کا روحانیت سے رشتہ استوار کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عہدِ ماضی کے برعکس تقویٰ اور منافع ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو گئے اور ان کے درمیان جو مغائرت تھی وہ بظاہر دور کر دی گئی۔ زیادہ نفع اندوزی خدا کی نظر میں اب مرغوب ٹھیری۔ دنیا سے بیزاری اور جدوجہد سے فرار کی جگہ معاشی کشمکش نے لے لی۔ ان حالات میں "تجارتی نظریۂ زر (MER CANTALISM) مقبول ہونے لگا۔ اور وقت کے سیاسی رجحانات اور اقوامِ عالم میں جذبۂ مسابقت اور رقابت معاشی کنٹرول کا تقاضا کرنے لگے۔

اس کے بعد فطری حکومت (PHYRIOCXRACY) کا دور آیا۔ لوگوں کی توجہ تجارت اور تبادلہ سے ہٹ کر زراعت پر مرتکز ہونے لگی۔ عالم المعیشت کو علمی بنیادوں پر تعمیر کیا جانے لگا۔ اور قومی جدوجہد کا نصب العین اجتماعی خوشحالی قرار پایا۔ علم معاشیات میں ایک اساسی تبدیلی رونما ہوئی۔ تجارتی نظریہ زر میں یہ علم سیاست کا محکوم تھا۔ مگر اس دور میں اس نے محکومیت کی زنجیروں کو کاٹ کر سیاست کی ہمسری کا دعویٰ کیا۔ اب ملک کی سیاسی تنظیم صرف دفاع کے لئے ہی مقصود نہیں تھی بلکہ معاشی ترقی کی بھی ضامن تھی۔

علم المعیشت کی اس مختصر سی تاریخ کا آپ اگر جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ علم ارتقا کے باوجود ابھی اس منزل پر نہیں آیا تھا کہ اسے سائنس کہا جاسکے۔ اس کی حیثیت زیادہ تر فن کی سی تھی۔ سر جیمز سٹوریٹ نے بالکل صحیح کہا تھا " اکانومی ایک فن (ART) ہے جو ہمیں یہ بتاتا ہے کہ ایک فرد سماج کے رکن ہونے کی حیثیت سے کس عاقبت اندیشی اور کفایت شعاری سے اپنی گھریلو ضروریات پوری کر سکتا ہے۔ پرائیویٹ اکانومی کی جو حیثیت گھر کی چار دیواری میں تھی وہی حیثیت ریاستی اکانومی کی ریاست میں ہے"۔ اس علم کے نفسِ مضمون کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ یوں رقمطراز ہے" اس علم کا سب سے بڑا مقصد ریاست کے باشندوں کے لئے ذرائع معاش کا تلاش کرنا ہے"۔

معاشیات کے اندر تدبر و تفکر ابھی اس منزل تک ہی پہنچا تھا کہ دنیا کے افکار و نظریات میں ایک عظیم انقلاب پیدا ہوا۔ اہلِ فکر کی نظریں دوسری جوانب سے سمٹ سمٹا کر صرف حسیات اور عالم مادی پر جم کر رہ گئیں۔ مادی وسائل کی کثرت نے یہ عقیدہ لوگوں کے دل و دماغ میں پیوست کر دیا کہ کائنات میں جو کچھ بھی ہے صرف مادہ ہے۔ نمو، حرکت، احساس، شعور، فکر سب اسی ترقی یافتہ مادّہ کے خواص ہیں۔ انسان اور حیوان میں قطعاً کوئی فرق نہیں ——— اول الذکر مؤخر الذکر کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ دونوں کے دونوں قانونِ طبعی کے پابند ہیں۔ انسان میں کوئی ارادہ و اختیار نہیں۔ دنیا کی ہر چیز پر جبریت فرمانروائی کر رہی ہے اور اس کے قوانین میں کسی رد و بدل کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ نتائج ناگزیر ہیں کیونکہ وہ طبعی اسباب سے میکانکی طور پر پیدا ہوئے ہیں۔ سائنس کے اس بحران کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر وہ عالم جس کا تعلق انسان کی آزادیٔ رائے (FREEWILL) اور اختیار سے تھا اُس کی بنیادیں متزلزل ہونے لگیں۔ ہر وہ عقیدہ جسے سائنس کے پیش کردہ پیمانوں سے ناپا نہیں جاسکتا تھا۔ ہر وہ اصول جو علم طبیعات کے دوسرے اصولوں کی طرح قطعی اور حتمی نہیں تھا اور ہر وہ فن جس کا کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ تعلق بھی اخلاق سے تھا وہ دم توڑنے لگے۔ ان کے بقا کی صرف ایک صورت ہی باقی تھی کہ وہ یا تو انسان کے بس میں جو اختیار دیا گیا ہے اس کی یکسر نفی کر دیتے یا اس کو بالکل نظر انداز کر کے اُس کے خالص حیوانی پہلو پر غور و فکر کرتے اور پھر ایسے قوانین وضع کئے جاتے جن کی مدد سے علت و معلول کے ایسے ناقابل تغیر اصول مرتب ہوتے جن میں علم طبیعات کی سی قطعیت پائی جاتی۔

اسے بدبختی کہئے یا خوش قسمتی کہ علمِ معاشیات بھی اسی طوفان میں بہہ گیا اور اس کا اس رُخ بہہ جانا کوئی زیادہ مشکل نہیں تھا کیونکہ اس کا مرکزی نقطہ اول روز سے ہی انسانی زندگی کی مادی ضروریات کی تکمیل تھا۔ چنانچہ اس نے سائنس کا روپ دھارنے کے لئے مندرجہ ذیل رویہ اختیار کیا۔

(۲) انسان میں آزادیٔ رائے کا جو جوہر ہے اور جس کی وجہ سے اسے خلیفہ چنا گیا تھا اس کا عملاً انکار کرتے ہوئے انسان کے خالص حیوانی پہلو کو زیرِ بحث لایا گیا۔ کیونکہ اس سے اسباب و نتائج کے وہ روابط قائم ہو سکتے ہیں جن کو مادیت کی کسوٹی پر پرکھا جاسکتا ہے۔

(ب) کوشش یہ کی گئی کہ علم معاشیات کے ایسے اصول مرتب کئے جائیں جن میں قوانین طبعی کی سی قطعیت ہو۔

(ج) علم المعیشت کے اصولوں کا اخلاق سے کوئی خفیف سے خفیف رشتہ بھی اگر کوئی تھا تو اسے منقطع کر دیا گیا۔ وہ اصول اخلاقی نقطۂ نظر سے اچھے ہوں یا برے علم معاشیات کو ان سے سروکار نہ تھا۔

معاشیات کا اخلاق سے خلع

میری ان گزارشات کو ذہن میں رکھ کر دیکھئے کہ یہ مضمون کس طرح اپنی سمت سائنس کی طرح بدل رہا ہے۔ سب سے پہلے جدید معاشیات کے باوا آدم الفرڈ مارشل کی نفس مضمون سے متعلق کچھ تصریحات ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔ ان سے ہوا کے رُخ کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

"پولیٹیکل اکانومی یا معاشیات زندگی کے روزمرہ کے کاروبار میں انسانی اعمال و افعال کا مطالعہ ہے۔ اس مضمون میں اس امر کی چھان بین کی گئی ہے کہ ایک فرد سماج کے رکن ہونے کی حیثیت سے کس طرح دولت کماتا اور خرچ کرتا ہے۔ چنانچہ علم المعیشت جہاں ایک طرف دولت سے متعلق بحث کرتا ہے۔ وہاں دوسری طرف۔ جو اول الذکر سے کسی صورت میں کم نہیں بلکہ کئی حیثیتوں سے زیادہ اہم ہے ـــــ وہ انسانی زندگی کے ایک خاص شعبہ کے متعلق بھی تحقیق و تجسس کرتا ہے"۔ ...... علم معاشیات ہمیں یہ نہیں سکھاتا کہ انسان کو کس طرح دولت کمانا اور خرچ کرنا ہے۔ اس کا کام صرف یہ ہے کہ وہ لوگوں کو اس بات سے آشنا کرے کہ افراد سوسائٹی میں دولت کس طرح کماتے اور خرچ کرتے ہیں۔ وہ صرف "ہے" اور "ہیں" کو زیر بحث لاتا ہے۔ "چاہیئے" اس کے دائرہ سے یکسر خارج ہیں"۔

اور ملاحظہ ہو:-

"علم المعیشت مقاصد کے بارے میں بالکل غیر جانبدار ہے۔ اُسے اس سے کوئی غرض نہیں کہ مقاصد اچھے ہیں یا برے۔ اگر ان مقاصد کے حصول کا ذریعہ "صرف دولت ہے" تو یہ معاشی ہیں۔ بصورت دیگر معاشیات سے ان کو کوئی تعلق نہیں"۔

جدید معاشیات سے متعلق جن خیالات کا اظہار اس عظیم المرتبت معاشی مفکر نے کیا ہے۔ وہ تاریخ معاشیات میں سنگِ میل کی سی حیثیت رکھتے ہیں اور ہر "دیدہ ور" یہ دیکھ سکتا ہے کہ علم معاشیات کن خطوط پر ترقی کر رہا ہے۔

سب سے نمایاں چیز جو سرسری جائزہ لینے کے بعد ہی منکشف ہو جاتی ہے وہ یہ ہے کہ اس مضمون کا محور انسان کے وہ اعمال و افعال ہیں جن کا محرک صرف دولت کا حصول ہے۔ اس طرزِ فکر کی افادیت کا ذکر کرتے ہوئے مارشل کہتا ہے کہ دولت کے اس پیمانے نے اس مضمون کو کسی حد تک قطعیت عطا کی ہے۔ اور اسی بنا پر یہ مضمون دوسرے تمام ایسے مضامین سے جو انسان سے متعلق بحث کرتے ہیں زیادہ قطعی ہے۔

ذرا اور سوچیئے۔ "چاہیئے" کا لفظ کسی اخلاق کی غمازی کرتا ہے، اور اخلاق اس حقیقت کو بطور اساس کے تسلیم کرتا ہے کہ انسان کے اندر آزادئ رائے (FREEWILL) موجود ہے۔ اگر فعل و عمل کی آزادی سے ہی نوع انسانی محروم ہو تو اخلاق کا لفظ بالکل بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ سائنس کے مباحث چونکہ زندگی کے مادی پہلوؤں پر حاوی ہیں جن پر جبریت حکمران ہے اور آزادی نام کو بھی نہیں اس لئے علم معاشیات کو بھی آزادئ رائے اور اخلاق سے آنکھیں بند کر کے صرف انسان کے اُس پہلو پر غور کرنا ہے جن میں جبریت ہی کا قبضہ ہو۔ اس تغیر کے بغیر یہ مضمون سائنس کی طرح حتمی اور قطعی بننے سے قاصر رہے گا۔ معاشیات کے اس باوا آدم نے ہوا کے رُخ کو دیکھ کر انسان کے صرف اُس شعبۂ زندگی پر بحث کی ہے جن میں کسی طرح قطعیت کا دعویٰ کیا جا سکتا ہے۔

پھر مقاصد کی اچھائی یا برائی ذرائع کے اندر تبدیلی کا تقاضا کرتی ہے اچھے مقاصد ایک خاص طرزِ فکر اور ایک الگ طرزِ عمل کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اور برے مقاصد تک پہنچنے کا ایک الگ راستہ اور ذریعہ ہے۔ چونکہ اچھے اور برے مقاصد کا حصول ایک خاص قسم کی سیرت و کردار کے ذریعے ہی

ممکن ہے جس کی تعمیر میں ایک مخصوص فلسفہ و نظام اخلاق کی ضرورت ہے، اور اخلاق جیسے کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے آزادئ رائے کے بغیر بالکل فضول ہے لہذا وہ مضمون جسے سائنس کی طرح قطعی اور حتمی ہونے کا شرف حاصل ہو وہ انسان کے آزادارادے یا بالفاظِ دیگر انسان کی انسانیت سے متعلق کوئی بحث نہیں کرسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ "مقاصد" کو معاشیات کی سرزمین سے بالکل بن باس دیدیا گیا ہے۔

اکیلا مارشل ہی نہیں بلکہ کینن (CANAN) پیگو (PIQOU) ایلئز (ELAY) اور فشر (FISHER) بھی سب اسی راستے کے مسافر ہیں۔

اس ضمن میں ایک بات عرض کر دینا نہایت ضروری ہے اور وہ یہ کہ علم المعیشت نے اپنی انتہائی ترقی کے باوجود ابھی تک مادّی فلاح (MATERIAL WELFARE) کا سررشتہ ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔ ان تعلقات کی بنا پر یہ شبہ گزر سکتا ہے کہ "اندرونِ خانہ" علمِ معاشیات کی اخلاق سے کوئی ساز باز ہے۔ چنانچہ (LIONEL ROBBINS) جو لندن کے مدرسۂ معاشیات (LONDON SCHCOL OF ECONOMICS) کے روحِ رواں ہیں، علمِ معاشیات کی ایک بالکل انوکھی تعریف پیش کر کے اس علم کی حدود پر ایسے معقول پہرے بٹھا دیئے ہیں کہ اس میں فلاح کا طائرِ خیال بھی پرواز نہیں کر سکتا۔ اس بنیادی تبدیلی سے (LIONEL ROBBINS) نے وہ کارِ نمایاں سرانجام دیا ہے جس کی وجہ سے علمائے معاشیات کی بہت دیرینہ آرزوؤں کی تکمیل ممکن ہوئی ہے۔ اور اب علمِ معاشیات بھی سائنس کی صفوں میں نہایت ہی فخر کے ساتھ خود کو کھڑا کر سکتا ہے۔ اور قطعیت اور حتمیت کے لحاظ سے یہ اپنے آپ کو کسی سے ہیٹا نہیں سمجھتا۔ صاحب موصوف علمِ معاشیات کی اُس تعریف پر جس کا کوئی علاقہ بھی فلاح سے ہے تنقید کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

"فلاح کے تصور کی معاشیات میں قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔ کیونکہ فلاح ماپی اور تولی نہیں جا سکتی۔ اور جو چیز پیمانے کی کیفیت سے باہر ہو اسے علم کا درجہ حاصل نہیں ہو سکتا۔" یہی وجہ ہے کہ وہ (   ) استقرائی طرزِ فکر کو نظر انداز کرتے ہوئے اور استخراجی طریقِ تحقیق کا سہارا لے کر معاشیات کی ایسی تعریف کرتا ہے جس میں ہمہ گیری کہیں زیادہ نمایاں ہے چنانچہ وہ کہتا ہے۔

معاشیات مطالعہ ہے انسانی رویہ کا (HUMAN BEHAVIOUR) کا بحیثیت ایک رابطہ کے جو مقاصد اور محدود ذرائع ہیں، جبکہ ان ذرائع کے متبادل استعمالات موجود ہوں، پایا جاتا ہے۔[۵۱]

اس تعریف سے ایک نمایاں تبدیلی جو معرضِ وجود میں آئی ہے وہ یہ ہے کہ پہلے مفکرین چونکہ مادی فلاح کو نظر انداز نہیں کرتے اس لئے ہر وہ فعل جس کا تعلق مادّی فلاح سے نہیں ہے وہ معاشیات کی بحث سے خارج ہے۔ مگر معاشیات کا جو تصور رابنز نے پیش کیا ہے وہ تحلیل ہونے کی وجہ سے انسانی رویّہ کی خاص اقسام کو زیرِ مطالعہ نہیں لاتا بلکہ اُس کے خاص پہلو پر اپنی توجہ مرتکز کرتا ہے۔ اس تغیر کا طبعی نتیجہ یہ ہے کہ ہر قسم کا رویہ معاشیات میں داخل کیا جا سکتا ہے۔ اب ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ گندم کا بونا معاشی فعل ہے اور فلسفہ کی تخلیق معاشی نہیں ہے۔ بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ ہر وہ فعل جس کی وابستگی محدود ذرائع اور لامحدود مقاصد سے ہے وہ معاشی ہے۔ اس کا قطعاً کوئی تعلق اخلاق سے نہیں۔ یہ ایجابی (POSITIVE) سائنس تو حقائق کے غیر جانبدارانہ بیان پر اپنی ساری عمارت تعمیر کرتی ہے۔ مسئلہ قدر (VALUE) پر پسند و ناپسند کا کوئی دھندلے سے دھندلا سایہ بھی نہیں" توازن صرف توازن ہے[۵۲]۔ علمِ معاشیات کا فلاح سے کوئی رشتہ نہیں اور نہ ہی اور نہ ہی اسے رکھنا چاہئے۔ اس

ECONOMICS IS THE SCIENCE WHICH STUDIES HUMAN BEHAVIOUR AS A RELATIONSHIP BETWEEN ENDS & SCARCE MEANS WHICH HAVE ALTERNATIVE USES. (AN ESSAY ON THE NATURE & SIGNIFICANCE OF ECONOMIC SCIENCE, BY LIONAL ROBBINS, PG-16) [۵۱]

THERE IS NO PNEUMBRA OF APPROBATION ROUND THE THEORY OF VALUE. EQUILIBRIUM IS JUST EQUILIBRIUM (LIONEL ROBBINS). [۵۲]

سلسلہ کی ہر کوشش اُسے ایجابی سائنس کے درجے سے گرا دے گی۔ اور اس کے اصولوں کی قطعیت ساقط ہو جائے گی۔ معاشی قوانین انسانی رویہ کے حالات حاضرہ سے متعلق بحث کرتے ہیں اور انھی وجوہ کی بنا پر وہ ہمہ گیر ہیں۔

بادی النظر میں رابنز کا اپنے پیروؤں سے کافی بعد نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں یہ اُس راستے کی جس طرف کہ معاشیات جا رہا ہے اہم منزل ہے۔ ان سب میں مشترک یہ ہے کہ سب کے سب "فلسفہ" کے مقابلہ میں "علم" کے حامی ہیں۔ یعنی جو کچھ "ہے" اس سے بحث کرنا چاہتے ہیں "ا زرجہ" ہونا چاہیئے" اس سے سروکار نہیں رکھتے۔ تمام ما فوق التجربہ اور مابعد الطبیعی عناصر سے اپنے علم کو پاک اور صاف رکھنا چاہتے ہیں اور معاشیات میں اخلاقی احکام کے سختی سے مخالف ہیں۔ ان سب کے نزدیک علوم طبیعی زیادہ مکمل علوم ہیں۔ انھیں سے تمام دوسرے علوم میں خصوصاً معاشیات میں نمونہ کا کام لینا چاہیئے۔

"رابنز کی فکری لغزشیں" اور ناقدین کی آرا

جب ہم اس مضمون کو رابنز کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں تو یہ ہمیں چند مجرد قوانین کا ایک بے روح ڈھانچہ دکھائی دیتا ہے جس کا کوئی تعلق انسان کی عملی زندگی سے نہیں۔ چنانچہ ڈربن (DURBIN) نے ایک جگہ اظہار خیال کرتے ہوئے کہا ہے "ہمارا تجریدی نظریہ نہایت ہی سرعت سے نا قابل فہم اور پیچیدہ اصولوں اور ریاضی کے مبہم اور نا قابل ادراک نشانات میں تبدیل ہو رہا ہے"۔ ایل۔ ایم۔ فرالراس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتا ہے "معاشیات صرف قدر یا توازن کی تعلیل سے ہی مرکب نہیں ہے۔ بلکہ اس کا احاطہ اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ علم معاشیات انسانی زندگی کا مطالعہ ہے اور اس کا مقصد فلاح انسانی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا"۔ باربرہ ووٹن (BARBRA WOOTON) اپنی کتاب (LAMENT FOR ECONOMICS) میں معاشیات کے اس پہلو پر اظہار افسوس کرتی ہوئی کہتی ہے "ہم اپنا زیادہ اور قیمتی وقت صرف نظریات کے اوزار بنانے میں صرف کرتے ہیں۔ اور عملی میدان میں ان اوزاروں سے کام نہیں لیتے"۔ چنانچہ وہ ماہرین معاشیات سے پر زور اپیل کرتی ہے کہ وہ اپنی آنکھوں سے علمی تعصبات کی پٹیاں اتار کر اپنے بنائے ہوئے قید خانے کی کوٹھریوں سے نکلیں اور کھلی ہوا اور روشنی میں سانس لینا سیکھیں جہاں وہ انسان کی راہنمائی کا فرض سر انجام دے سکیں"۔

ELY ایلے بھی ان کی ہمنوائی میں کہتا ہے "معاشیات اگرچہ سائنس ہے مگر سائنس سے کہیں زائد۔ یہ وہ سائنس ہے جو انسانی زندگی کی لامحدود اور گوناگوں صورتوں سے متعلق بحث کرتی ہے۔ اور یہ نہ صرف ایک مربوط اور منظم فکر ہی کی دعوت دیتی ہے بلکہ انسانی ہمدردی کی طرف بھی توجہ دلاتی ہے"۔ HOWEREY ہاؤرے کا دعوی ہے کہ "معاشیات کو اخلاق سے کسی صورت میں بھی علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ لہذا یہ علم مقاصد کے معاملے کبھی غیر جانبدار نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ انسان بحیثیت انسان کے ذرائع اور مقاصد دونوں کو متاثر کرتا ہے۔ اخلاق ہی کو ہمارے اعمال کی سربراہی کرنا ہے اور اگر وہ یہ کام سر انجام نہیں دیتا تو یہ نسل انسانی کے لئے انتہائی تباہ کن ہے ہم سب کے سب ایک ہی وقت میں اشیا پیدا کرنے والے اور پھر ان کو صرف کرنے والے ہیں۔ ان دونوں حیثیتوں سے ہمارے مفاد ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ بحیثیت صرف کرنے والے کے ہم چاہتے ہیں کہ اشیا ہمیں سستے داموں ملیں۔ اور بحیثیت اشیا کے پیدا کرنے والے کے ہم منڈی میں کمیابی کے خواہاں ہیں تاکہ قیمتیں بڑھیں اور ہم زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کر سکیں۔ اپنی زندگی کے معاشی شعبہ میں ہر فرد کی یہ آرزو ہوتی ہے کہ بازار میں سکے کا عام چلن ہو، اشیا کی قیمتیں کم ہوں، درآمد کم اور برآمد زیادہ ہو، تاکہ توازن تجارت ہمارے حق میں رہے۔ اشیا نہایت ہی وسیع پیمانے پر تیار کی جائیں اور مزدوری جس قدر بھی ممکن ہو کم دی جائے تاکہ ہمارے منافع میں معتدبہ اضافہ ہو سکے۔ ان متضاد اور متباین مقاصد کو اگر کوئی قوت ہم آہنگ کر سکتی ہے تو وہ صرف اخلاق ہے" ——— مگر وہ اخلاق نہیں جس کے اصول و مبادیات سیمابی ہوں۔ اور قوت اور دبدبہ کی خفیف سے خفیف حرارت بھی انھیں اپنی جگہ سے بدل کر رکھ دے۔ یا غلبہ جس رخ چاہے انھیں بہالے جائے۔

اور ان کی حیثیت سوائے ظالموں کے ہاتھ میں آلہ کار بننے کے اور کوئی نہ رہے۔ انسانیت کے لئے اخلاق کا اگر کوئی ڈھانچہ کارآمد ہو سکتا ہے تو وہ صرف وہی جس کے بنانے میں ان معروضی قدروں (OBJECTIVE VALUES) کو سب سے زیادہ دخل ہو۔ جن کو "دینِ حق" نے ابتدائے آفرینش سے نوعِ انسانی کے درمیان عدل و انصاف پیدا کرنے کے لئے نہایت واضح طور پر پیش کیا ہے۔

معاشیاتِ اسلام

حق تعالیٰ نے انسان کو دنیا میں مبعوث فرمایا اور پھر اسے ارادہ و اختیار کی قوتوں سے نوازا۔ اسے یکسر آزاد نہیں چھوڑ دیا کہ وہ گمراہیوں کی جن وادیوں میں چاہے بھٹکتا پھرے۔ اُس نے انسان کو صاحبِ ارادہ بنا کر اُس کی ہدایت کا انتظام بھی اول روز سے ہی فرما دیا تاکہ وہ اپنے ارادے اور اپنی رضا سے اُس راستے پر گامزن ہو جس کی طرف خداوندِ قدوس نے اُس کو دعوت دی ——— کیونکہ اسی راستے پر چل کر وہ کائنات کی دوسری مخلوق کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکتا ہے اور اسی طریق سے کائنات سے خوش ترتیبی پیدا ہو سکتی ہے۔

ہدایت اسی کی غایتِ اولیٰ جس طرح انسانوں اور دوسری مخلوق میں ایک ترتیب پیدا کرنا ہے اسی طرح اُس کا مقصدِ وحید انسانوں کے درمیان عدل قائم کرنا ہے۔ لہٰذا خدا کی طرف سے جو "تعلیم" انسان کے لئے بھیجی گئی ہے اس میں انسانی زندگی پر ایک متوازن نظر ڈال کر اُس کی ساری قوتوں کے ساتھ انصاف برتا گیا ہے۔ اس کے سارے جذبات و رجحانات میں توازن قائم رکھا گیا ہے۔ اور اس کے سب اندرونی اور بیرونی تقاضوں کو نہایت ہی احسن طریق سے یوں پورا کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ان میں نہایت ہی عمدہ تناسب پیدا ہو سکے۔ یہاں نہ فرد اجتماعیت کے طوفان میں بالکل گم کر دیا گیا ہے اور نہ اجتماعیت کو انفرادیت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھایا گیا ہے۔ یہاں فرد کو یہ سکھلایا جاتا ہے کہ وہ اپنے تئیں آئینِ الٰہی کا پابند بنا کر "غیرِ خود" کی خدمت کو اپنا شعارِ زندگی بنا لے۔ اسی طرح اجتماعی زندگی کا مقصد بھی انفرادی زندگی کی ترقی کے سامان مہیا کرنا ہے تاکہ انسان فکر و عمل کی جس بام بلند تک پہنچنا چاہیں۔ پہنچیں اور ان کی راہ میں کوئی چیز مزاحم نہ ہو۔ اسی متوازن اصول پر اسلامی معاشیات کی تشکیل کی گئی ہے۔ یہاں نہ تو بیٹ کے مطالبات کو حرفِ غلط کی طرح مٹا کر ایک غیر فطری راہبانہ زندگی کی طرف دعوت دی گئی ہے۔ اور نہ ہی معدے کے تقاضوں کو یکسر آزاد چھوڑ کر اتنا پھیلنے دیا ہے کہ پوری کی پوری زندگی احاطہ کر لیں اور زندگی محض خود غرضی۔ اور نفس پرستی کی مجنونانہ جدوجہد بن جائے۔ اسلام نے ان دونوں انتہاؤں کے درمیان ایک اعتدال کی راہ اختیار کی ہے۔ دینِ حق میں کارزارِ حیات سے گریز اور زندگی کے ہنگامے سے فرار کی قطعاً کوئی گنجائش۔ یہاں ساری نیکی اور ساری بھلائی زندگی کے سمندر کی تلاطم خیز موجوں سے نبرد آزما ہونے میں ہے۔ وہ شخص جو کشمکشِ حیات سے منہ موڑتا ہے وہ دوسرے مذاہب کی نظر میں تو ممکن ہے ایک اعلیٰ اور ارفع مقام رکھتا ہے۔ مگر اس کا یہ طرزِ عمل اسلام کی نظر میں کسی لحاظ سے بھی قابلِ ستائش نہیں۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:—

رھبانیۃ ابتدعوھا ما کتبناھا علیھم۔ — رہبانیت جسے انہوں نے خود تراش لیا۔ نہیں فرض کیا ہم نے اس کو ان پر۔ (الحدید)

اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ حق تعالیٰ کی طرف سے علم و عمل کا جو نظام بنی آدم کو مذہب اور دین کے نام سے ملتا رہا ہے۔ اس میں غیر فطری نظریۂ حیات کا کبھی مطالعہ نہیں کیا گیا۔ اس جزء سے صرف اسلام ہی کی رہبانیت سے برأت ثابت نہیں ہوتی بلکہ مذہب کی پوری تاریخ اس کی بے تعلقی کا اظہار کیا گیا ہے۔ قرآن حکیم نے پھر ھوالذی خلق لکم ما فی الارض جمیعا فرما کر انسان کی رفعت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ جو کچھ اس کائنات میں پھیلا ہوا ہے وہ صرف انسان کے لئے ہے۔ انسان کا اب یہ اپنا کام ہے کہ وہ خدا کی پیدا

چیزوں سے پورا پورا استفادہ کرے۔ فطرت میں تصرفات کرکے اپنی جد وجہد کا میدان تلاش کرے۔ اور قدرت آفرینی سے خود اپنے ذاتی تحقق اور اپنے اخلاقی وجود کے استحکام کا سامان بہم پہنچائے۔ فطرت کے دل کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ انسان کو اپنے فیضِ نظر سے باقدر بنائے یہی اس کی علتِ غائی ہے۔

انفرادی مسائل معیشت میں سب سے پہلی منزل کسبِ معیشت اور ابتغاء رزق کی منزل ہے۔ قرآن عزیز کہتا ہے کہ ہر انسان کو اپنی استعداد کے مطابق معیشت کے لئے جد وجہد کرنا ضروری ہے۔ دنیا میدانِ عمل ہے۔ یہاں جمود و خمود موت کے مرادف ہے! اس کارگاہِ ہستی میں خداوند تعالیٰ نے سامانِ رزق کے ذخائر جمع کر دئیے ہیں مگر تلاش وسعی شرط ہے۔

فاذا قضیت الصلوٰۃ فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللّٰہ۔

جب نماز پوری ہوجائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللّٰہ کے فضل (رزق) کو تلاش کرو۔

ان الذین تعبدون من دون اللّٰہ لایملکون لکم رزقا فابتغوا عند اللّٰہ الرزق۔ (عنکبوت)

جن کو تم اللّٰہ کے سوا پوجتے ہو وہ تمہاری روزی کے مالک نہیں ہیں۔ سو تم تلاش کرو اللّٰہ کے پاس سے روزی۔

وآخرون یضربون فی الارض یبتغون من فضل اللّٰہ۔ (مزمل)

اور کتنے اور لوگ ہیں جو پھرتے ہیں ملک میں اللّٰہ کے فضل (روزی) کو تلاش کرتے ہیں۔

پھر "الطیبات من الرزق" اور "زینت اللّٰہ" سے گریز کی بجائے اُن کے استعمال کی ترغیب دی گئی ہے۔

کلوا من الطیبات ما رزقنٰکم۔

کھاؤ پاکیزہ چیزوں سے جو کہ ہم نے تم کو دی ہیں۔

کلوا واشربوا من رزق اللّٰہ ولا تعثوا فی الارض مفسدین۔

کھاؤ اور پیو اللّٰہ کے رزق سے اور زمین میں فساد نہ پھیلاتے پھرو۔

قل من حرم زینۃ اللّٰہ التی اخرج لعبادہ والطیبات من الرزق۔

بولئے کس نے حرام کیا ہے اللّٰہ کی آرائش کو جسے اللّٰہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا۔ اور صاف ستھری روزی کو۔

یاایھا النبی لما تحرم ما احل اللّٰہ لک۔ (التحریم)

اے نبی! کیوں حرام کرتے ہیں آپ اس چیز کو جسے حلال کیا اللّٰہ نے آپ کے لئے۔

قرآن حکیم کی ترغیبات کے بعد ہم دنیا کے سب سے بڑے ہادی سید الانبیا علیہ الصلوٰۃ کے چند اقوال نقل کرتے ہیں۔

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کسب الحلال فریضۃ بعد الفریضۃ۔

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم اذا صلیتم الفجر فلا تنوموا عن طلب ارزاقکم

جب تم فجر کی نماز پڑھ لو تو اپنے رزق کی جد وجہد کے بغیر نیند (آرام) کا نام نہ لو۔

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من الذنوب ذنوبٌ لایکفرھا الا الھمّ فی طلب المعیشۃ۔

رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے فرمایا بعض گناہوں میں ایسے گناہ ہیں جن کا کفارہ صرف طلبِ معیشت کی فکر اور جد وجہد میں کاوش سے ہی ہوسکتا ہے۔

اسی بنا پر حضرت عبداللّٰہ بن مسعود فرمایا کرتے تھے کہ میں "یہ ناپسند کرتا ہوں کہ کسی شخص کو بیکار بیٹھا ہوا دیکھوں جو نہ دنیا کا کام کرے اور نہ آخرت کا

آیات اور اقوالِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں اب دیکھئے کہ کیا اسلام میں زندگی سے فرار کی کوئی راہ ہے۔ چنانچہ خلیفۂ ثانی رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے "تم میں کوئی شخص بھی طلبِ رزق کی جدوجہد میں پست ہو کر نہ بیٹھ جائے۔" انھیں کے عہدِ خلافت میں ایک قوی ہیکل نوجوان یہ کہتا ہوا مسجد میں داخل ہوا کہ جہاد کرنے میں کون میری مدد کرتا ہے۔ عمر فاروقؓ نے اس کو اپنے پاس بلایا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر مجمع سے فرمانے لگے کہ اپنی زمین پر کام کرانے کے لئے اس شخص کو مزدوری پر کون لیتا ہے۔ کسی انصاری نے کہا کہ میں لیتا ہوں۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا تم اس کو ماہانہ کتنی اجرت دوگے۔ انصاری نے اجرت بتائی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اچھا تم اس کو نوکر رکھ لو۔ چند مہینے گزرنے کے بعد حضرت عمرؓ نے انصاری سے پوچھا کہ میرے رکھائے ہوئے نوکر نے کیا کیا۔ انصاری نے عرض کیا ٹھیک ہے۔ اے امیر المومنین۔ حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ اس کی جمع شدہ اجرت کے ساتھ میرے پاس لایا جائے۔ مزدور حاضر کیا گیا۔ راوی کا بیان ہے کہ مزدور حاضر ہوا اور اس شکل میں حاضر ہوا کہ درہموں سے بھری ہوئی تھیلی بھی اس کے ساتھ تھی۔ فاروقِ اعظمؓ نے اس نوجوان سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ لو یہ تھیلی! اب جی چاہے جہاد کرو جی چاہے گھر بیٹھو۔

اسلامی تعلیمات میں زندگی سے گریز کی کوئی گنجائش نہیں۔ روحانیت کے بلند سے بلند مقام میں بھی خدا کی حلال چیزوں سے پرہیز جنھیں قدرت نے معاشی استفادہ کے لئے پیدا کیا ہے اسلامی نقطۂ نظر سے مفید تر کیا ہوگا۔ بلکہ ناشکری ہے۔ علامہ ابوبکر بن الجصاص اسی بنیاد پر فرماتے ہیں:۔

ان لا فضيلة فی امتناع اكلها۔ — جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ حلال فرما چکے ہیں ان کے کھانے سے پرہیز کرنے میں کسی قسم کی کوئی وجہ فضیلت نہیں ہے۔

مگر رزق کے لئے یہ ساری تگ و دو مقصود بالذات نہیں۔ زندگی کی اصل غایت اپنے خالق کی بندگی اور عبادت ہے۔ رزقِ حلال کی تلاش اور اس سلسلے میں سعی و جہد تو اسی بڑے مقصد کے حصول کا ایک ذریعہ ہے۔ ایک مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی توجہ اصل مقصد سے ہٹنے نہ دے۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے کس بلیغانہ انداز میں اصل مقصد کی عظمت اور اہمیت بیان فرمائی ہے۔

من جعل الهموم همًّا واحدًا همّ الذين كفى الله همّ الدنيا والآخرة۔ — جو شخص اپنے کل افکار کو ایک فکرِ آخرت میں تبدیل کر دے۔ اللہ تعالیٰ خود اس کے دنیا و آخرت کے سارے افکار دور کرنے کے لئے کافی ہو جاتا ہے۔

ہدایت یہ ہے کہ فکرِ آخرت و معاد اصل فکر ہے۔ اور فکرِ معاش اس کے تابع۔ یہ بھی رہے۔ مگر اس طرح نہیں کہ اصل یہی بن جائے۔ اسی درجے میں رہے جس کی وہ مستحق ہے۔ اور اسی مقدار میں رہے جس کی نظامِ معاشرت میں باقی رہنے کے لئے ضروری ہے۔ فکر و نظر کی اس بنیادی تبدیلی نے "اسلامی معاشیات" کو بالکل ایک جداگانہ حیثیت دے دی ہے۔ یہاں انسان صرف کمانے والا حیوان ہی نہیں جس کے پیشِ نظر سوائے کام و دہن کی لذت کے اور کوئی مقصد نہ ہو۔ یہاں مدارِ بحث وہ انسان ہے جس میں جبر و سخاوت ایثار۔ ہمدردی۔ قناعت اور سیر چشمی جیسی الٰہی صفات بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ حرص و ہوا کے شعلے اگر کبھی بھڑک بھی اٹھتے ہیں تو "فکرِ قیامت" انھیں سرد کر دیتی ہے۔ لہٰذا ایک مسلم سوسائٹی رقابت۔ خود غرضی اور بے جا تصرف کے گرداب سے ہمیشہ محفوظ رہتی ہوئی اپنے معاشی توازن کو کبھی بگڑنے نہیں دیتی۔ اس سماج کے افراد کو یہ فکر دامنگیر نہیں ہوتی ہے کہ وہ دنیا کی پونجی میں سے اپنی ذات کے لئے کتنا کچھ لے سکتے ہیں، بلکہ وہ یہ سوچتے ہیں کہ دنیا کو اپنی ذات کی اتاہ دولت اور ممکنات سے کیا کچھ انھیں دینا چاہئے۔ ان کے ہاں اصل راحت مال و دولت اسباب و سامان۔ قوت۔ حکومت۔ غرض مختلف چیزوں کے جمع کرنے اور ان پر تصرف پانے سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ تعلق باللہ سے

حاصل ہوتی ہے۔ اسلام کے پیش کردہ نظامِ معیشت میں "بلا شبہ زیادہ سے زیادہ کمانے والے افراد موجود ہوں گے کیونکہ سعی وکسب کے بغیر کوئی مومن زندہ نہیں رہ سکتا۔ لیکن جو فرد جتنا زیادہ کمائے گا اتنا ہی زیادہ انفاق پر مجبور ہوگا۔ اور اس لئے افراد کی کمائی جتنی زیادہ بڑھتی چلی جائے گی اتنی ہی زیادہ جماعت بحیثیت جماعت کے خوش حال ہوتی چلی جائے گی۔ قابل اور مستعد افراد زیادہ سے زیادہ کمائیں گے لیکن صرف اپنے لئے نہیں کمائیں گے تمام افرادِ قوم کے لئے کمائیں گے۔ یہ صورت پیدا نہیں ہوسکے گی کہ ایک طبقہ کی کمائی دوسرے طبقوں کے لئے محتاجی و مفلسی کا پیغام ہو جائے۔[1]

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ[2] سَوَآءٌ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ۔

اللہ تعالیٰ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں برتری دی ہے پھر ایسا نہیں ہوتا کہ جن کو زیادہ سے زیادہ روزی دی گئی ہے وہ اپنی روزی کو زیر دستوں پر لٹا دیں۔ حالانکہ اس روزی میں وہ سب میں سب کے برابر حقدار ہیں۔ پھر کیا کہ اللہ کی نعمتوں کے صحیح منکر نہیں ہو رہے ہیں۔

اسلام نے درحقیقت انفرادی ملکیت کو ختم کرنے کے بغیر ہی سرمایہ داری کو دفن کر دیا ہے۔

دینِ حق نے اصل اہمیت انسان کو دے کر فکر و عمل کے دھارے کو بالکل بدل دیا۔ یہاں نظامِ سرمایہ داری کی طرح زندگی کے بازاروں میں ذی روح انسانوں کی قیمت گرا کر بے جان دھاتوں کی قیمتوں میں اضافہ نہیں کیا جاتا۔ بلکہ "دولت" جس کو اس وقت مقامِ کبریائی حاصل ہے وہ انسان کی غلام اور خدمت گار کی حیثیت سے زندہ رہتی ہے۔ اور انسان ہی کی فلاح و بہبود کے لئے کمائی اور صرف کی جاتی ہے۔ چنانچہ اس نظام میں چھین جھپٹ جو موجودہ اقتصادیات کی نامبارک بنیاد ہے یہاں نام کو بھی نہیں پائی جاتی۔ آپ خود ہی غور کریں کہ جب "اصل" کو ثانوی حیثیت دے کر زندگی کے ایک شعبہ کو اتنا پھیلا دیا جائے کہ دوسرے سب شعبے اس کی اوٹ میں آجائیں تو لامحالہ توازن قائم ہو جائے گا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں دنیا کی جن اقوام نے چاندی اور سونے کے حصول کو اصل مقصد سمجھ کر دنیا کے ہر معاملہ کو نفع اور سود دے کی اسپرٹ میں دیکھا تو وہ اپنے لئے تو کیا بلکہ دنیا کی دوسری اقوام کے لئے بھی باعثِ عذاب بن گئیں۔ جب معاش کی تلاش میں مسابقت دیوانگی کی حد تک نہیں پہنچ سکے گی بلکہ مقاصد کی محبت اسے اپنے فطری اعتدال میں رہنے پر مجبور کرے گی۔ تو فاضل پیداوار کا مسئلہ سرے سے پیدا ہی نہیں ہوگا۔ جب زر معبود ہو تو اس معبود کی رضا جوئی کے لئے پیداوار میں اضافہ کرنا ایک فطری سی بات ہے۔ کیونکہ دولت کے بت کے پوجنے کا یہی سب سے بہتر طریق ہے۔ پیداوار میں یہ برق رفتار ترقی اور اس کے نتیجے کے طور پر دولت کا چند ہاتھوں میں سمٹاؤ پیداوار اور صرف کے مابین توازن کو بگاڑ دے گا۔ جس سے "معاشی بدحالی کے چکر" کا ظہور ہوگا اور یہ چکر ایک قوم کو کیا بلکہ دنیا کی ساری اقوام کو اپنے لپیٹ میں لے کر دم لے گا۔

سرمایہ دارانہ نظام میں اس کے سدِ باب کی صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ صرف معاشی منصوبہ بندی جس کو مؤثر طریق سے عمل

---

[1] ترجمان القرآن مولانا آزاد۔ جلد ۲۔

[2] اس آیت کا ترجمہ بالکل غلط کیا گیا ہے۔ یہ ترجمہ صرف اس صورت میں صحیح ہوسکتا تھا جبکہ "فھم فیہ سواء" کے بجائے "وھم فیہ سواء" کے الفاظ ہوتے۔ علاوہ بریں سیاق و سباق کے اندر اس ترجمہ کے ساتھ آیت بالکل بے ربط ہو جاتی ہے۔ اس آیت کے لئے اس ترجمہ کا ایک غلط العام کی طرح رائج ہو جانا بہت افسوسناک ہے (مرتب)

پیدا کرنے کے لئے زندگی کے سب شعبوں کو ایک پلان کے تحت لانا پڑتا ہے اور یہ قومی ملکیت کے بغیر کسی طرح ممکن نہیں۔ لیکن اگر آپ ذرا غور سے دیکھیں تو اسلام کا معاملہ اس سے جدا ہے۔ وہاں نہ تو نفع کا جذبہ اس قدر ترقی کرتا ہے کہ لوگ پیدائش ہی مقصود بالذات سمجھ کر پیداوار اور صرف میں اعتدال کھو دیں۔ اور نہ ہی وہ کشمکش حیات سے یوں دست کش ہو جاتے ہیں کہ ان کی زندگی پر موت کا دھوکہ ہونے لگے۔ زندگی کے یہ سب ہنگامے لحد میں روپوش ہو جائیں۔ اور یہ زندگی فساق و فجار کے فتنوں کی ایک آماجگاہ بن جائے۔ مسلمان فرد ہو یا قوم کا مرن ایک ہی رہتا ہے اور وہ رضائے الٰہی۔ جوں جوں یہ مقصد ان کی زندگی کو گرماتا ہے تو ان کے سب اعمال و افکار خود بخود ایک نظم کے تحت آتے چلے جاتے ہیں اور زندگی کے ایک شعبہ میں نہیں بلکہ سارے شعبوں میں بغیر کسی بیرونی دباؤ کے توازن قائم ہو جاتا ہے۔

جب خالق اور مخلوق کے درمیان روابط حق کی بنیاد پر استوار ہو جائیں تو مخلوق کے آپس میں تعلقات فطری طور پر خود بخود انصاف کی اساس پر تعمیر ہو جاتے ہیں۔ اور اس طرح زندگی سے ظلم و عدوان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ یہ بات خوش فہمی کی بنا پر نہیں بلکہ پورے دلائل اور براہین کے ساتھ بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ نظام اسلامی میں بغیر وسائل پیداوار کو قومی ملکیت بنائے۔ پیداوار اور صرف میں توازن قائم کیا جا سکتا ہے اور اس طرح معاشی بدحالی کی لعنت سے پوری نوع انسانی کو نجات مل سکتی ہے۔

علم المعیشت اور اخلاق

حیاتِ انسانی کی وسعت اپنے دامن میں کئی ایک پہلوؤں کو سمیٹے ہوئے ہے۔ زندگی کے یہ مختلف پہلو باہم ایک دوسرے میں اس طرح پیوست ہیں کہ ان کے درمیان کوئی واضح خط امتیاز کھینچنا مشکل ہی نہیں بلکہ قریب قریب محال ہے لیکن اس سے کہیں یہ نتیجہ اخذ نہ کر لیا جائے کہ یہ پہلو ایک دوسرے سے مل کر اپنی انفرادیت سے بھی دست کش ہو گئے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان کے درمیان کوئی حد فاصل قائم نہیں کی جا سکتی مگر ان کی اپنی اپنی الگ کیفیات کی بنا پر ہم انھیں ایک دوسرے سے تمیز کر سکتے ہیں۔ اور ان قوانین کا بھی ادراک کر سکتے ہیں جو ان پر فرمانروائی کر رہے ہیں۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کے مادی وجود کا تانا بانا عناصر طبعی کے مجموعے تیار کیا گیا ہے اور وہ عالم طبیعات کے میکانکی قوانین کا پابند ہے۔ اسی طرح انسان کی نشو و نما زندگی کے حیاتیاتی قانون کے تحت خود بخود ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور انسانی زندگی کا خالص حیوانی پہلو جس سے زندگی میں حرکت پیدا ہوتی ہے وہ جبلت کے دربار میں سر نیاز جھکائے کھڑا دکھائی دیتا ہے۔ زندگی کے ان مختلف پہلوؤں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب کے سب جبریت کے آہنی شکنجہ میں گرفتار ہیں۔ جہاں سے انھیں کبھی مفر نہیں۔ ان میں سے کوئی اپنا ارادہ و اختیار نہیں رکھتا۔ سب کے سب علت و معلول کے رشتوں میں جکڑے ہونے کے سبب سے بے بس ہیں۔ اس حیثیت سے لوہے۔ جانور۔ درخت۔ اور انسان میں کوئی حقیقی فرق نہیں۔ سب کی طرح انسان بھی وہی کچھ کر رہا ہے جس کی قانون طبعی کے تحت اجازت دی گئی ہے۔ "جبریت" سے نہ ان کو چھٹکارا ہے نہ انسان کو۔ لہذا شہد کی مکھی کا چھتہ بنانا اور انسان کا ریلوے لائن تیار کرنا۔ دونوں میں چاہے درجے کا فرق ہو۔ مگر نوعیت کا کوئی فرق نہیں ۔۔۔ لہذا انسان بھی دنیا کی دوسری چیزوں کی طرح مجبور محض ہونے کی بنا پر اپنے افعال کا قطعاً ذمہ دار نہیں۔

اگر غور کریں تو معاملہ یہاں ختم نہیں ہوتا۔ انسان۔ پتھر۔ پودے اور بیل سے بدرجہا ارفع اور اعلیٰ ہے۔ اور اس کی یہ رفعت اور سربلندی آگہی اور شعور کی بنا پر ہے۔ اس کے پا لینے سے اس کو آزادی اور اختیار کے دو گوہر نایاب ہاتھ لگے ہیں۔ اور اسی منزل میں قدم رکھنے سے اُسے اُس دور سے نجات حاصل ہوئی ہے جس میں وہ "مجبور محض" تھا اور اس کی حیثیت طبعی قوانین کے ایک کھیل سے زیادہ کوئی نہ تھی۔ مجھے اس وقت اس امر سے بحث نہیں کہ "شعور" جس کے نتیجہ میں انسان کو اختیار ملا ہے۔ مادہ ہی کی ترقی یافتہ شکل ہے یا خالق کائنات نے

ابتدائے آفرینش سے ہی انسان کو اس نعمتِ غیر مترقبہ سے نوازا تھا۔[1] مجھے جو کچھ کہنا ہے وہ یہ کہ علم المعیشت جس کا سکہ آج کل عام جاری ہے اُس کے پیشِ نظر وہ انسان نہیں جس میں عقل و شعور اور اختیار و ارادہ ایسی قوتیں پائی جاتی ہوں۔ بلکہ اس کے سامنے وہ انسان ہے جس میں حیوانی پہلو کا غلبہ ہے۔ اور جو محض جبلتوں کے اشارے پر مصروفِ کار ہے۔ رابنز کی تعریف کہ علم المعیشت مطالعہ ہے انسانی رویّہ کا بحیثیت ایک رابطہ کے جو مقاصد اور محدود ذرائع میں پایا جاتا ہے۔ اسی رویّے کی صاف طور پر غمازی کر رہا ہے۔

اکیلا رابنز ہی کیا مارشل۔ اینے۔ کینز۔ پیگو اور عہدِ حاضر کے اشتراکی مفکرین مارکس اور اس کے متبعین سب کے سب انسان کے حیوانی پہلو کے متعلق بحث کرتے ہیں۔ اشتراکی اور غیر اشتراکی علما کے طرزِ استدلال میں بظاہر کتنا ہی فرق ہو مگر انسان کو وہ ایک ہی زاویۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ دونوں زندگی کے حیوانی مقاصد سے بلند تر کسی مقصد اور کسی نصب العین کا تصور نہیں کر سکتے۔ دونوں کے نزدیک علم معاشیات کا اخلاق سے کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ رشتہ بھی نہیں۔ کیونکہ حیوانوں کے لئے اخلاق اور سیرت و کردار کے الفاظ بالکل بے معنی ہیں۔ انسان نفع پرست اغراض کا بندہ۔ اور جذبات کا غلام رہنے پر مجبور ہے۔ ان سے اسے کسی صورت میں بھی رہائی نہیں مل سکتی۔ جبلّی محرکات سے مغلوب یہ آوارہ و سرگرداں حیوان اگر "من و تو" کی حدود کو پامال کرتا ہوا۔ دنیا کے سبزہ زاروں میں اودھم مچاتا ہے تو اس میں اس بیچارے کا کیا قصور؟ وہ تو محض اپنی فطرت کے جبلّی تقاضے کو پورا کر رہا ہے۔ اس پر کسی اخلاقی قدغن کے کیا معنی۔ ہاں سوسائٹی اگر اس کی دستبرد سے بچنا چاہتی ہے تو اس کو وہی طریقہ اختیار کرنا چاہئے جس سے حیوانوں کو اُن کی جائز حدود کے اندر رکھا جاتا ہے۔ یعنی ان کو زنجیروں میں جکڑ کر تمدن کی مختلف گاڑیوں اور ہلوں اور کولھوؤں میں سلنٹے کے زور سے جوت رکھا جائے اور شام کو نپا تلا چارہ ڈال دیا جائے[2]
اس کے بغیر اس سے کسی بھلائی کی توقع سب۔۔۔ خام خیالی ہے اور یہ فطرت کو کھلا اور زبردست چیلنج ہے۔

اسلام اس کے برعکس اُس انسان کی معاشی جد و جہد کا تذکرہ کرتا ہے جو جانوروں کی طرح صرف جبلتوں کے سہارے پر ہی جی نہیں رہا۔ بلکہ حیوانیت سے بہت بلند شعور اور آگہی۔ ارادہ اور اختیار کی قوتیں رکھتا ہے۔ حق و باطل میں اپنی عقلِ سلیم سے تمیز کر سکتا ہے۔ اُس میں ذمہ داری کا احساس موجود ہے۔ اس لئے بھلائی اور برائی کے دوگونہ رجحانات کے زیرِ اثر رکھنے کے باوجود اُسے خیر کی طرف زیادہ آسانی سے مائل کیا جا سکتا ہے[3]۔ اسی بنا پر اسلام نے تمدن کے نظام کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ اور اُس کا فلسفۂ حیات اپنے سانچے میں ایسے افراد ڈھال سکتا ہے جو بغیر کسی خارجی دباؤ کے حق و انصاف پر قائم رہیں۔ اور اگر بفرضِ محال کچھ لوگ اس کی روح کو پوری طرح جذب نہ کر سکیں تو ان میں کم از کم قانونی حد بندیوں کو توڑنے کی جسارت باقی نہ رہے۔

اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسی علم اور ارادہ کی کارفرمائی کی بدولت نوعِ انسانی کے سب سے پہلے فرد کو ملائکہ پر فوقیت حاصل ہوئی۔

---

[1] اسلام کا نقطۂ نظر اس معاملہ میں بالکل واضح ہے۔ شعور اور اختیار اول روز سے ہی انسان کو عنایت کئے گئے۔ ورنہ جزا و سزا۔ یا حق و باطل کی تمیز بالکل بے معنی ہو جاتی ہے۔

[2] اس کا مہذب نام منصوبہ بندی اور ریشنلائزیشن ہے۔

[3] انسان سے متعلق اس بنیادی نقطۂ نظر کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے غیر مسلم تو کیا مسلمان بھی یہ سمجھنے لگے ہیں کہ نظام سرمایہ داری میں اخلاق کا کچھ اضافہ کر لے تو اسلامی نظام ہو جاتا ہے۔ یہ خام خیالی اسلام کے فلسفۂ حیات کی عدم واقفیت کا نتیجہ ہے۔ صرف ذاتی ملکیت کے استحقاق کی بنا پر یہ اندازہ لگانا کہ اسلامی نظام سرمایہ دارانہ نظام سے ملتا جلتا ہے علم کی توہین ہے۔ نقطۂ نظر کے اسی اختلاف کی وجہ سے اسلامی نظام اشتراکیت اور سرمایہ داری سے بنیاد سے لے کر جزئیات تک مختلف ہے۔

اسلام مغربی فلسفۂ زندگی کی طرح انسان کو مجبورِ محض نہیں سمجھتا کیونکہ اگر اسے یہ سمجھ لیا جائے تو وہ کسی کے سامنے مسئول اور ذمہ دار نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا موت کے بعد کسی دوسری زندگی کا تصور بالکل عبث ہے۔ مگر اسلامی تمدن کی فلک بوس عمارت تو اٹھائی ہی ان دو تصورات پر جاتی ہے۔ اور ان بنیادوں میں اگر ذرا بھی تزلزل پیدا ہو تو یہ سر بفلک عمارت ایک لمحہ کے اندر پیوندِ خاک ہو جاتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اسلام میں اخلاق کو اس قدر دخل ہے۔ اور یہ وہ اساسی اختلاف ہے جو مغربی نظریۂ معاشیات اور اسلامی فلسفۂ معیشت میں نمایاں طور پر پایا جاتا ہے۔
مغربی نقطۂ نظر سے ایک انسان کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ ترقی یافتہ حیوانوں کے ریوڑ میں جسے عام اصطلاح میں سوسائٹی کہتے ہیں ——— ایک حیوان ہے۔ اور اس کا کام صرف اسی قدر ہے کہ وہ گلہ کی افزائش کا سبب بنے۔ لہٰذا انسانی زندگی میں جو چیز اہمیت رکھتی ہے وہ ایک فرد کی اخلاقی سربلندی نہیں بلکہ قوم کی عمرانی ترقی ہے۔ جب اس نظریۂ حیات کو عملی زندگی کے سانچوں میں ڈھالا جائے گا تو اخلاق کا خود بخود گھٹ جائے گا۔ کیونکہ جس قدر اور جس حد تک ایک فرد اپنے آپ کو سماج میں مدغم کر دیتا ہے اسی نسبت سے انسان کا اپنے پیدا کرنے والے کے ساتھ رشتہ کمزور ہو جاتا ہے اور خداوند تعالیٰ کی اطاعت و بندگی کی جگہ دلوں میں قوم پرستی سما جاتی ہے۔
ایک مسلم بنی نوع انسان کا سب سے بڑا خادم اور محب ہوتا ہے۔ مگر اس کی اس خدمت اور محبت کے محرکات دنیاوی نہیں بلکہ سراسر دینی ہوتے ہیں۔ زندگی کا کوئی میدان نہیں جس میں ایک مومن خدا کی یاد سے غافل ہو کر سرگرمِ عمل ہو۔
حدیث شریف میں ہے جعلت لی الارض مسجدا (میرے لئے تمام زمین مسجد ہے) یعنی تمام دنیاوی اعمال بھی اخلاقی نوعیت رکھتے ہیں۔ انسانی عمل کی کوئی شق بھی اخلاقی اور روحانی عنصر سے خالی نہیں ہو سکتی۔ معاشی مسائل کو حل کرنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ انھیں اخلاقی اعمال سے علیحدہ تصور نہ کیا جائے۔ ایسا کرنے سے ہمارے معاشی اعمال کا معیار کس قدر بلند ہو جائے گا۔ جو لوگ اپنے ارادہ اور سعی و جہد سے معاشی اقدار کی تخلیق کرتے ہیں وہ ضرور ہے کہ اعلیٰ اخلاقی اصول پر عمل پیرا ہوں۔ تمدنی توازن اسی وقت ممکن ہے جبکہ خالص افادی معاشی اعمال بھی اخلاق کے تحت آجائیں۔ معاشی اور اخلاقی عمل میں اگر کوئی فرق ہے تو صرف اتنا کہ اول الذکر میں اکثر اوقات انفرادی عنصر غالب رہتا ہے۔ اور ثانی الذکر میں انسانی نیکی کا مقصد یہ ہے کہ انفرادی عمل میں انسانی عنصر پیدا کرے۔ جدید سرمایہ داری آج دنیا کے لئے وبال اسی سبب سے بن گئی ہے کہ اس میں اخلاقی اور انسانی عنصر مفقود ہو گئے ہیں۔ وہ انسان کو محض ایک حیوان مانتی ہے جس کی زندگی کا مقصد سوائے پیٹ کی فکر کے اور کچھ بھی نہیں۔ انسان اپنے اس مقصد کو مسابقت کے ذریعہ حاصل کر سکتا ہے۔ ان اصولوں پر عمل کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ آج جدید انسان کی زندگی میں ایک زبردست خلا پیدا ہو گیا ہے۔ جسے پورا کرنے والی کوئی چیز نہیں وہ سکون و امن سے محروم اور خود اپنے آپ سے نبرد آزما ہے۔ وہ تیز چلا جا رہا ہے۔ لیکن نہیں معلوم کہ اس کی منزل کدھر ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ جب تک اخلاقی اور معاشی مقاصد ہم آہنگ نہ ہوں اس وقت تک زندگی میں ربط و وحدت نہیں پیدا ہو سکتی۔ انسانی خواہشات کی حقیقی تکمیل صرف اس وقت ممکن ہو گی جبکہ وقتی کے ساتھ ابدی مقاصد ہمارے عمل میں شامل ہوں۔ کہ یہی مسرت کا سرچشمہ ہیں۔ ہماری انفرادی زندگی عالمگیر نظام مقاصد کے حصول کا ایک ذریعہ ہے۔ یہ نظام مقاصد منشائے الٰہی کا مظہر ہے۔ جس کی وساطت سے کائنات اور زندگی میں ربط و معنی پیدا ہوتے ہیں۔[1]
اگر حقیقت میں دیکھا جائے تو اسلام کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ اس نے عام انسانی زندگی کے دو اَن میل شعبوں کو ایک دوسرے میں تحلیل کر دیا۔ روحانیات کی دنیا اور معاشیات کی دنیا میں بظاہر کوئی میل نہیں۔ ایک سراسر سماوی ہے اور دوسرا سراسر دنیاوی۔ حیات

---

[1] "روحِ اقبال" از ڈاکٹر یوسف حسین خاں۔

انسانی کے دو واضح طور پر علیحدہ کارخانے ہیں جن کی صفت کے نمونے اپنی اپنی امتیازی خصوصیات رکھتے ہیں۔ معاشیات کا مبدا مادی احتیاج کا وجود ہے۔ لیکن جب فاطرِ کائنات نے قرآن پاک میں اس مادی احتیاج کی تکمیل کے طریق کو اپنے مخصوص رنگ میں بیان فرمایا تو وہ حیوانی نفس سے بہت ماورا ایک خالص روحانی وظیفہ بن کر ہمارے سامنے آیا۔ اصل میں دین اور دنیا کی دوئی کا مٹا دینا ہی اسلام کے معجزات میں سے ہے۔

زندگی اور علم معاشیات کا باہمی رابطہ

آخر مجھے ایک بات جس کی طرف میں پہلے بھی اشارہ کر چکا ہوں زندگی اور علم معاشیات کے باہمی تعلق سے متعلق کہنا ہے۔
جن لوگوں نے بھی عالم طبیعات کے آثار اور جملہ مظاہر پر کبھی غور و فکر کیا ہے۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس کائنات میں کوئی شے عبث اور بیکار نہیں۔ ہر وہ شے جو موجود ہے وہ اپنا ایک مدعا اور مقصد بھی رکھتی ہے۔ اور فطرت کے بظاہر مختلف شواہد میں ایک مقصدی ترتیب پائی جاتی ہے۔ قرآن حکیم کا ارشاد ہے :-

افحسبتم انما خلقناکم عبثا۔
کیا تم خیال کرتے ہو کہ ہم نے تمہیں یونہی فضول پیدا کیا ہے۔

وما خلقنا السموٰت والارض وما بینہما لٰعبین۔
اور ہم نے آسمانوں کو اور زمین کو اور جو کچھ کہ ان کے درمیان ہے کھیل تماشے کے طور پر پیدا نہیں کیا۔

وما خلقنا السماء والارض وما بینہما باطلا۔
ہم نے آسمان و زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اس کو بے مقصد پیدا نہیں کیا۔

ان فی خلق السموٰت والارض واختلاف اللیل والنہار لاٰیٰت لاولی الالباب۔ الذین یذکرون اللّٰہ قیاما وقعودا وعلیٰ جنوبہم ویتفکرون فی خلق السموٰت والارض ربنا ما خلقت ھٰذا باطلا۔
بے شک آسمانوں اور زمین کی ساخت اور دن اور رات کے الٹ پھیر میں بڑی نشانیاں ہیں عقلمندوں کے لئے جو اللہ کو یاد کرتے رہتے ہیں کھڑے اور بیٹھے اور کروٹیں لیتے ہوئے اور غور کرتے ہیں آسمانوں اور زمین کی ساخت میں (اور ان کو دیکھ کر پکار اٹھتے ہیں) کہ ہمارے پروردگار! تو نے یہ سب کچھ بے معنی طور پر نہیں پیدا کیا ہے۔

ایحسب الانسان ان یترک سدیٰ۔
کیا انسان سمجھتا ہے کہ وہ آزاد و بیکار چھوڑ دیا جائے گا۔

اسلام کا جو نظریہ مظاہر فطرت کے متعلق ہے وہی نقطۂ نظر علوم و فنون کے بارے میں بھی ہے۔ اس کی نظر میں ہر وہ فن اور ہر وہ عمل جو حیات انسانی کے لئے مفید اور کارآمد نہیں بالکل عبث ہے۔ اس نے مرکزی اہمیت انسان کو دے کر سب علوم و فنون کو اس کی خدمت کے لئے مختص کیا ہے۔ وہ علوم جن میں سوائے فلسفیانہ موشگافیوں کے اور کچھ بھی نہیں جن کا دامن صرف لاطائل بحثوں سے بھرا پڑا ہے جن کی تعلیم انسانوں پر سالہا سال طاری رہ کے انھیں زندگی کے حقائق سے دور کر دیتی ہے وہ دراصل بربادی کا اور موت کا پیغام ہیں۔ سرور دو عالم نے ارشاد فرمایا ہے :-

العلم بدون العمل وبالٌ والعمل بدون العلم ضلال۔
علم بغیر عمل کے وبال ہے اور عمل بغیر علم کے گمراہی ہے۔

اس جواہر پارے پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ علم جو انسانی اعمال میں سرایت کر کے زندگی کو مثمر نہیں بناتا۔ وہ علم جو انسان کی خفتہ قوتوں کو بیدار کر کے انھیں سرگرم عمل نہیں کرتا وہ بجائے سودمند ہونے کے مضرت رساں ہے اور ایسے علم سے جہاں تک ممکن ہو پرہیز

کرنا چاہئے۔ اسی لئے خدا کے سب سے محبوب بندے اور بندوں کے سب سے افضل راہنما صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔

اللھم انی اعوذ بک من العلم لا ینفع۔ اے خدا میں اس علم کی بابت تجھ سے پناہ مانگتا ہوں جو فائدہ نہ دے۔

کیونکہ انسان کے لئے تو وہی چیز کار آمد ہے جو ان کو ابدی مسرت سے ہمکنار کرسکے۔ اور اسی چیز کو پائیداری اور دوام نصیب ہو سکتا ہے۔

فاما الزبد فیذھب جفاء واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض۔ پس جھاگ تو سوکھ کر ضائع ہو جاتا ہے اور جو کچھ لوگوں کے لئے کار آمد ہوتا ہے وہ زمین میں باقی رہتا ہے۔

اسلام کا یہ نظریہ جتنا دوسرے علوم وفنون کے متعلق صحیح ہے اتنا ہی معاشیات کے لئے کار آمد ہے۔ کیونکہ معاشیات بھی اس "کل" کا ایک ضروری جزو ہے۔

بد قسمتی سے پچھلے دو سو سال سے مغربی فلسفہ اور معاشیات نے جس ماحول میں پرورش پائی ہے۔ اس میں مقصدیت ناپید تھی۔ اور اس نے لامرکزیت کو جنم دیا۔ منتشر ذہنوں سے جو افکار بھی اٹھے اُن میں سوز یقین مفقود تھا۔ اس لئے انھوں نے زندگی کی گتھیوں کو سلجھانے کی بجائے انھیں اور الجھا دیا۔ معاشیات کی اس افسوسناک حالت پر باربرہ ووٹن (WOOTTEN) کی کتاب (LAMENT FOR ECONOMICS) سے چند اقتباسات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔ تاکہ حالات کا ایک معمولی سا اندازہ لگایا جاسکے۔

"ہم اپنے قیمتی وقت کا زیادہ حصہ صرف اوزار بنانے میں صرف کرتے ہیں۔ جس سے عملی زندگی میں کوئی کام نہیں لیا جاتا۔"

"علم المعیشت جو آج کل عام لوگوں کے زیر مطالعہ آتا ہے اس سے سماج کو کوئی فائدہ نہیں اور نہ یہ عام انسانوں کے لئے قابل فہم ہے۔"

"علمائے معاشیات کبھی بھی ایک نقطہ پر متفق نہیں ہوتے اور نہ ہو سکتے ہیں۔ علم معاشیات کا عملی زندگی سے کوئی واسطہ نہیں۔"

اسلامی معاشیات کی راہ مغربی معاشیات سے بالکل الگ ہے یہاں جتنا زور صحیح خیالات کے اپنانے پر دیا گیا ہے۔ اس سے کہیں زیادہ تاکید اُن کو عملی جامہ پہنانے پر کی گئی ہے۔

فبشر عبادی الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ اولئک الذین ھدٰھم اللہ واولئک ھم اولوا الالباب۔

سو آپ میرے ان بندوں کو خوشخبری سنا دیجئے جو اس کلام کو کان لگا کر سنتے ہیں۔ پھر اس کی اچھی اچھی باتوں پر چلتے ہیں یہی ہیں جن کو اللہ نے ہدایت کی اور یہی ہیں جو اہل عقل ہیں۔

یا ایھا الذین امنوا لم تقولون ما لا تفعلون ۰ کبر مقتا عند اللہ ان تقولوا ما لا تفعلون (الصف)

اے ایمان والو! ایسی بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو۔ خدا کے نزدیک یہ بات بہت ناپسندیدہ ہے کہ ایسی بات کہو جو کرو نہیں۔

مثل الذین حملوا التورٰۃ ثم لم یحملوھا کمثل الحمار یحمل اسفارا۔

جن لوگوں کے کندھوں پر توراۃ رکھی گئی تھی پھر انھوں نے اس کی ذمہ داری کو نہیں اٹھایا ان کی حالت اس گدھے کی سی ہے جو بہت سی کتابیں لادے ہوئے ہے۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو "نظریہ" اور "عمل" کی یہی تفریق اسلام اور جاہلیت کے درمیان بنائے نزاع ہے۔ عرب کے مشرک خدا کی بنیادی صفات میں کسی صفت کے منکر نہ تھے۔ وہ صرف خدا کے وجود کو ہی تسلیم نہیں کرتے تھے بلکہ اُسے زندگی بخشنے والا۔ روزی دینے والا اور زندگی لینے والا خیال کرتے تھے۔ اپنی تمام قوتوں کو اسی کا عطیہ جانتے تھے۔ اس کائنات کا انتظام والانصرام اس کے دست تصرف میں سمجھتے تھے جب کچھ

تھا وہ اس بات پر تھا کہ انھیں اس محدود کی اپنی دنیاوی زندگی میں دخل اندازی کسی صورت گوارا نہ تھی۔

قل من یرزقکم من السماء والارض ؟ امن یملک السمع والابصار ومن یخرج الحی من المیت ویخرج المیت من الحی ومن یدبر الامر فسیقولون اللّٰہ فقل افلا تتقون۔ فذالکم اللّٰہ ربکم الحق فماذا بعد الحق الا الضلال ؟ فانی تصرفون۔

پوچھو کون تم کو روزی دیتا ہے آسمان سے اور زمین سے؟ کون قدرت رکھتا ہے کان پر اور آنکھ پر اور کون نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے اور کون عالم کا انتظام کرتا ہے؟ جواب دیں گے، اللہ تو کہو کیا اس سے ڈرتے نہیں۔ وہی اللہ تو تمہارا حقیقی مالک ہے پھر کہو اس سچائی کے سامنے بجز گمراہی کے سوا اور کیا رہ جاتا ہے؟ تو پھر کدھر بہکائے جا رہے ہو؟

قل لمن الارض ومن فیہا ان کنتم تعلمون۔ سیقولون اللّٰہ۔ قل افلا تذکرون۔ قل من رب السموات السبع ورب العرش العظیم۔ سیقولون اللّٰہ قل افلا تتقون۔ قل من بیدہ ملکوت کل شیئ وھو یجیر ولا یجار علیہ ان کنتم تعلمون سیقولون اللّٰہ قل فانی تسحرون۔

کہو کس کی ہے زمین اور جو کوئی اس میں ہے، اگر تم جانتے ہو؟ وہ یہی کہیں گے اللہ کی۔ کہو پھر کیوں نہیں سوچتے۔ کہو کون مالک ہے ساتوں آسمان کا اور مالک ہے اس بڑے عرش کا؟ وہ کہیں گے اللہ! کہو پھر کیوں نہیں ڈرتے؟ کہو کس کے ہاتھ میں ہے حکومت وہ (سب) کو بچاتا ہے لیکن اس کے مقابلے میں کسی کو بچانے والا کوئی نہیں؟ وہ کہیں گے اللہ! کہو پھر یہ کیسا جادو ہوا جا رہا ہے تم پر؟

افغیر دین اللّٰہ یبغون ولہ اسلم من فی السموات والارض طوعا وکرھا والیہ یرجعون۔

کیا اللہ کی تابعداری کے سوا کچھ اور ڈھونڈتے ہیں حالانکہ اس کے سامنے سر افگندہ ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے، برضا و رغبت یا بہ مجبوری اور سب اس کی طرف لوٹائے جائیں گے۔

قرآن حکیم کا استدلال یہ ہے کہ جب اللہ ہی تمہارا خالق، مالک، پروردگار اور رب ہے تو پھر دنیا میں بھی حکم اُسی کا چلنا چاہئے۔ بندگی پھر اُسی کے لئے مخصوص ہو۔ فکر و عمل کا کوئی شعبہ ایسا نہ ہو جس میں اُس کی راہنمائی حاصل نہ کی جائے۔

یاایھا الذین امنوا ادخلوا فی السلم کافۃ۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو۔ پورے کے پورے دین کے اندر داخل ہو جاؤ۔

قل یاایھا الناس انی رسول اللّٰہ الیکم جمیعا الذی لہ ملکوت السموات والارض لا الہ الا ھو یحیی ویمیت فامنوا باللّٰہ ورسولہ النبی الامی الذی یومن باللّٰہ وکلمتہ واتبعوہ لعلکم تھتدون۔

اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہو کہ انسانوں میں تم سب کی طرف خدا کا رسول ہوں۔ اس خدا کا جو آسمانوں و زمین کی بادشاہی کا مالک ہے جس کے سوا کوئی خدا نہیں جو مارنے اور جلانے والا ہے پس ایمان لاؤ خدا پر اور اس کے رسول پر جو نبی امی ہے اور جو خدا اور اس کے فرامین پر ایمان رکھتا اور اس کی پیروی کرو امید ہے کہ تم راہ راست پاؤ گے۔

راہِ راست پانے کے لئے جتنا اللہ اور اس کے فرامین پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اتنا ہی اُن پر عمل پیرا ہونا بھی لازمی ہے۔

انا انزلنا الیک الکتاب بالحق لتحکم بین الناس بما اراک اللّٰہ۔

اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے تم پر حق کے ساتھ کتاب نازل کی ہے تاکہ تم اللہ کے بتائے ہوئے قوانین کے مطابق لوگوں کے فیصلے کرو۔

اسلام کا مقصد وحید لوگوں کی دنیاوی زندگی کو دین کے مطابق ڈھالنا ہے۔ اور یہی وہ غایت تھی جس کے لئے خدا کے نیک بندے دنیا میں آکر اہل دنیا کے ہاتھوں ہر قسم کی جفائیں سہتے رہے۔ مگر اپنے اصلی مشن سے ایک لمحہ کے لئے بھی غافل نہ ہوئے۔ دنیا والے بھی اسے شعندکر

بیٹوں قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ وہ ہر قسم کی قربانی کے لئے آمادہ تھے۔ مگر یہ چیز ان پر شاق گزرتی تھی کہ اُن کی دُنیاوی تگ و دو میں سوائے اُن کی ذاتی خواہشات کے کوئی دین کے پیش کردہ اوامر و نواہی کسی طرح حائل ہوں۔ سورۂ ہود میں خداوند قدوس نے اس کشمکش کو نہایت ہی دلاویز طریقے سے بیان فرمایا ہے۔ خدا کے برگزیدہ پیغمبر علیہ السلام پر جو اعتراض اُن کی قوم کی طرف سے کیا جاتا وہ صرف یہی نہیں تھا کہ وہ اُن کو جھوٹے خداؤں کی پرستش سے باز رہنے کی تلقین فرماتے بلکہ اُن کا سب سے سنگین جرم یہ تھا کہ وہ اپنی قوم کے مال میں اُس کے مالکان کے غیر مشروط حق کو سلب کرنا چاہتے۔ یہ تھے کہ اسے خدا کی ہدایت کے مطابق صرف کیا جائے۔

قالوا یشعیب اصلٰوتک تامرک ان نترک ما یعبد آباؤنا او ان نفعل فی اموالنا ما نشٰؤا انک لانت الحلیم الرشید۔

کہا انہوں نے اے شعیب کیا تمہاری نماز تم کو یہ سکھاتی ہے کہ ہم چھوڑ دیں وہ سب کچھ جس کی عبادت کیا کرتے تھے باپ دادا ہمارے یا اس بات کو چھوڑ دیں کہ ہم اپنے مال میں جو چاہیں تصرف کریں۔ تم آدمی تو بڑے بھلے مانس اور سمجھ دار ہیں۔

اس آیت سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ زندگی کو مذہبی اور دنیوی دائروں میں الگ الگ تقسیم کرنے کا تخیل آج کوئی نیا تخیل نہیں۔ بلکہ آج سے ساڑھے تین ہزار برس پہلے حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کو بھی اسی تقسیم پر ایسا ہی اصرار تھا جیسا کہ آج یورپ اور اس کے شاگردوں کو ہے۔ یہ فی الحقیقت کوئی نئی روشنی نہیں جو آج انسان کو ذہنی ارتقا کی بدولت نصیب ہوئی ہے بلکہ یہ وہی پرانی تاریک خیالی ہے جو ہزارہا برس پہلے کی جاہلیت میں بھی اسی شان سے پائی جاتی ہے۔ اسلام اصل میں دین اور دنیا کی اس تفریق کو یا بالفاظ دیگر "نظریات اور عمل" کے اس اختلاف کو مٹانا چاہتا ہے۔ لہذا اسلام کے نزدیک جہاں انسان کا یہ فرض ہے کہ وہ نظریات سے اہل دنیا کو روشناس کرائے وہاں اس پر یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے کہ وہ ان نظریات کی روشنی میں اپنے زمانے کی خرابیوں اور خامیوں کا احساس کر کے ایک سیل دست حکیم سرجن کی طرح ان فساد کے مرکزوں کو ٹٹول کر صاف کرنے کی جد و جہد کرے جو بنی نوع انسان کے جسم کو بیمار اور اس کے خون کو گندا کر رہے ہیں۔ ایک مسلم صرف اسلام کے معاشی نظریات کی اشاعت کرنے والا ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ ان نظریات کو عملی جامہ پہنانا بھی وہ اپنا فرض منصبی سمجھتا ہے۔ اسلام کا فلسفۂ معاشیات اسی اصول کی تفسیر ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اس میں ہماری جہلم اصطلاحوں اور مسحور کن افکار کی ظاہری چمک دمک نہ ہو۔ مگر اسی کے اپنانے سے انسانوں کو حقیقی فارغ البالی اور قلبی سکون و اطمینان نصیب ہو سکتا ہے۔

اس مضمون کو ختم کرنے سے پہلے ایک گزارش کر دینا ضروری ہے کہ اسلام کے فلسفۂ معاشیات پر تنقید یا معاشیات کے دوسرے فلسفوں کے ساتھ اس کا تقابل کرنے سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ یہ فلسفہ ایک الگ فلسفہ نہیں۔ بلکہ پورے فلسفۂ حیات کا ایک ضروری جزو ہے۔ اس جزو کو جب تک آپ "کل" کے ساتھ نہیں دیکھتے اس وقت تک اس کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ اور اسی بنیادی حقیقت کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے "دانش فروشانِ عصر حاضر" اسلام کے متعلق طرح طرح کی غلط فہمیوں کا شکار رہیں۔
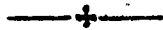
ہمیں آپ شاید نہیں جانتے ہیں!

نعیم صدیقی

بڑی کاوشوں، کوششوں سے تغیر کا جذبہ دلوں میں مچلنے لگا تھا
وہ دیں جس کو بھلا ہی چکے خود اہلِ دیں نے بصد مشکل اب وہ سنبھلنے لگا تھا
سیاست کا دھارا بڑی جنتیں صرف کرنے پہ اب رخ بدلنے لگا تھا
یہاں حق کی قوت جو بکھری پڑی تھی مسلسل سمٹتی چلی جا رہی تھی
چراغوں کی اک اک کرن بڑھ کے آگے فضاؤں میں ظلمت سے ٹکرا رہی تھی
مگر دیکھتے ہو فتنوں کے لشکر قیامت نئی اک اٹھانے کو آئے
یہ بزدل بہادر کی پی کر شرابیں شجاعت کا سکہ بٹھانے کو آئے
یہ نامرد جذبات انگیز نعروں سے مردوں کے جوہر دکھانے کو آئے
شیاطینِ جنگ و جدل ناچتے جذبۂ امن کا منہ چڑانے کو آئے
فرشتے جو تہذیب کے بن رہے تھے، نقابیں اتارے چلے آ رہے ہیں
بڑے جو محافظ بنے امن کے، ان پہ ارد پے ہمارے چلے آ رہے ہیں
تشدد کی منطق کے ہتھیارے کر دلائل میں ہنستے چلے آ رہے ہیں
شرافت کے گردوں سے بے نور ہو کر جو ٹوٹے وہ تارے چلے آ رہے ہیں
جو فتنے کہ ماضی میں بوئے گئے ہیں، وہ آخر اگیں گے، وہ آخر اگیں گے!
وہ پودے لہو سے جو سینچے گئے ہیں، وہ آخر پھلیں گے، وہ آخر پھلیں گے؟
نتائج کے لمحے کہ جو ہیں معلق کہاں تک ٹلیں گے، کہاں تک ٹلیں گے
جو آندھی تغیر میں بجا تی اٹھی ہے یہ تحریک و تغیر کو روک دے گی
قیامت جو تخریب کی آ رہی ہے یہ تنظیم و تعمیر کو روک دے گی
ہلاکت جو یوں دندنانے لگی ہے، ترقی کی تدبیر کو روک دے گی
مگر امن کی آرزو تھی جب تو بجز جنگ پھر چارہ کار کیا ہے!
کرے کوئی تلوار سے بات جب تو جواب اس کا پھر غیر پیکار کیا ہے!
اگر جنگ واجب ہی کر دی گئی ہو تو اے غازیو، پھر انکار کیا ہے؟

زمیں، وہ مقدس زمیں جس کی خاطر بتانے کہ کتنے گلے کاٹ دیے گئے ہیں
زمیں، وہ مقدس زمیں جس کی قیمت میں ہم نے کئی لاکھ لاشے دیئے ہیں
کہ حفاظت میں جس سرزمیں کے ہم اپنوں سے دست و گریباں ہی رہے ہیں
یہ اسلام کے نام پر وقف ہے اب ہم اس کے لئے پاسباں بن چکے ہیں
یہ اک بازی کھیلتی ہے قسمت سے ہم نے! ہمیں جانتے ہیں کہ کیا کچھ سہے ہیں
ہے صدیوں کے خوابوں کی تعبیر یہ گھر! جو حملہ ہوا اس پر تو ہم کس لئے ہیں؟
ہمیں نرم چارہ جو سمجھے ہوئے ہیں، خدا جانے کس تنزیر پہ سوچتے ہیں
ہے تاریخ شاہد کہ قلت میں ہو کر کئی بار کثرت کو پٹخے دیتے ہیں
نہتے بھی جب ہم بپھر کر اٹھے ہیں تو سامان پرستوں کے منہ پھر گئے ہیں
کسی کے مٹائے نہیں مٹ سکے ہیں، کسی کے دبائے نہیں دب سکے ہیں
ہمیں آپ شاید نہیں جانتے ہیں کہ اک بار پھر آزمانے چلے ہیں!
وہ دیکھو کہ درندگی بڑھ رہی ہے سمیٹے ہوئے اپنے غارتگروں کو
جہالت اٹھی پاؤں میں روندنے کو ادب گھروں، علم کے مرکزوں کو
چلا ابرہہ لے کے ہاتھی پھر اپنے کہ ویراں کرے معبدوں، مسجدوں کو
خدا ناشناسی کمر میں بنا یا دے کہ روندے وہ قرآن کی آیتوں کو
رذالت نے بیچ کر دیا قوم کی عصمتوں، حشمتوں، عزتوں کو
خباثت نفیریں بجانے لگی ہے! پھر اکسا دیا ہے ہوئی غیرتوں کو
مرے فن کی بستی کھڑی ہے خطر میں، مرے شعر کی جان پہ بن گئی ہے!
یہ بغداد میرے ہنر کا کہ چنگیز کی تیغ جس کے لئے تن گئی ہے،
مرے خامہ کی راہ خنجر نے روکی تو مجبور فقرہ کا اب ٹھن گئی ہے،
قلم والے تیغ جہاد، وقت آ گیا ہے کہ وہ ہاتھ ہو جائیں تیغ آزما بھی
پکاری اذانیں جن لبوں سے، اٹھی ہے اب بننے لگی اب رجز کی صدا بھی

ہمیں آپ شاید نہیں جانتے ہیں!

جنھیں جاں شوق میں کوتر لواتھے، ہمیں وہ رزم گاہوں کی آتش نوا بھی
جنھیں تھا بھی جو عزت کا جینا مسلسل، ہیں وہ شہادت کی مے کا مزا بھی
ہم اولاد ان غازیوں کی ہیں لوگو! کہ دنیا جنھیں آج تک جانتی ہے
جنھوں نے لڑائی کو اخلاق دے کر خدا کی عبادت سرانجام دی ہے
لہو سے وضو اور شہادت کا سجدہ! ذرا سوچو کس شان کی بندگی ہے
یہ مانا کہ ہم وہ نہیں ہیں، مگر ہاں! نظر تو ہمیشہ انھی پر جمی ہے
روایات بدر و احد جیسی دولت وراثت میں آبا سے ہم کو ملی ہے
ہماری ہی آنکھیں ہیں جو دیکھتی ہیں کہ پہلو میں تائید یزداں کھڑی ہے
جئیں گے تو غلبہ، مریں گے تو جنت، ادھر زندگی ہے، ادھر زندگی ہے!

مقاصد کی مسجد پہ ہم مرنے والے، مادیت کے صنم کے پجاری نہیں ہیں
فدائے حقیقت ہیں ہم سب پہ واضح، سپاہی ہیں ہم کوئی شکاری نہیں ہیں
اصولوں کی کھیتیں لگے ہم گنوانے، دو چہرگانی بساطوں کے پجاری نہیں ہیں

ہو ایمان اور کفر کا معرکہ تو شہادت کے جذبے سے عاری نہیں ہیں
سنو اے دیں بیزارو! وہ لمحہ کہ جس میں ترے خانے سارے جل کر رہیں گے
ہزاروں کی تعداد پر اس کے اوپر ایک چھینٹے پہ ہم مسکرا کر مریں گے
بڑے سے غیر تو بس ہمارے کئی لاکھ لاشوں پہ ہی پاؤں رکھ کر بڑھیں گے!
یہ سر جن کے سجدے خدا کے لئے ہیں، کسی اور کے سامنے کیوں جھکیں گے؟
کچھ چند سانسوں کی قیمت میں کیا اپنے ایمان کو بازار میں بیچ دیں گے!
نہیں زندگی جب رہے گی رہی ہو تو سینے پہ ہر وار سہتے بڑھیں گے!

جسے چاہے اے مالک الملک تو خود اٹھا دے، گرا دے، جتا دے، ہرا دے!
جو قوت کی مٹھی کے اندھے ہوئے ہیں، انھیں اپنا کوئی کرشمہ دکھا دے!
وہ ملت کہ جس کا بھروسہ ہے تجھ پہ زمانے میں اس کے قدم پھر جما دے
جو کچھ ہو کہ حق ہار سر نو اٹھی ہے اسے ارتقا کے لئے راستہ دے
جسے چاہے اے مالک الملک تو خود اٹھا دے، گرا دے، جتا دے، ہرا دے

مارکسیّت یا اسلام[1]

(تنقید و تبصرہ)

پروفیسر عبدالحمید۔ ایم۔ اے

مارکس نے اپنی زبردست شخصیت اور انقلاب انگیز طرزِ تحریر سے نہ صرف اپنے دور کو متاثر کیا۔ بلکہ مستقبل کی پیشانی پر بھی ایک گہرا اثر ثبت کیا۔ اس کی زندگی میں ہی اس کے متعلق اچھا خاصا تنقیدی سرمایہ جمع ہو گیا۔ مگر اس کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد یہ رفتار اور تیز ہو گئی۔ یہ بات بہت حد تک صحیح ہے کہ دوسرے مفکرین کی طرح مارکس اور اُس کے افکار بھی افراط و تفریط کا شکار رہے۔ اُس کے حامیوں نے جو کچھ لکھا محض عقیدت اور دھڑے بندی سے متاثر ہو کر لکھا اور اس کی ذات اور خیالات افسانہ بن گئے۔ اس کے مخالفین میں سے بھی اکثر نے اُس کے ساتھ انصاف نہ برتا۔ انھوں نے بھی تنقید صرف مخالفت کے لئے کی اور اس کی تحریروں کو غیر جانبداری سے مطالعہ نہ کیا۔

پرستش اور عناد کی ان دو انتہاؤں کے درمیان بعض ذی علم لوگ ایسے بھی تھے جنھوں نے اس "انقلابی" پر سنجیدہ اور متوازن تبصرے کئے۔ مگر ان کی تعداد بہت کم ہے۔ حال میں مولانا مظہرالدین صاحب کی کتاب (MORCISM OR ISLAM) اس فہرست میں قابلِ قدر اضافہ ہے۔

اس میں جو خوبی سب سے نمایاں ہے وہ یہ ہے کہ اس میں منطقی طور پر نہ صرف مارکسی فلسفۂ حیات پر بے لاگ تبصرہ کر کے اس کی تردید کی گئی ہے۔ بلکہ ایجابی طور پر ایک ایسے فلسفۂ حیات کا خاکہ بھی پیش کیا گیا ہے جس کو "اسلام" کہتے ہیں۔

یہ کتاب گیارہ ابواب پر مشتمل ہے جس میں پہلے آٹھ ابواب میں مارکسی فلسفہ کے مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل بحث درج ہے۔ اور ان میں جو جو خامیاں ہیں ان کی نشاندہی نہایت ہی سلجھے ہوئے انداز میں کی گئی ہے۔ نویں باب میں فاضل مصنف نے ایک بے لاگ مبصر کی طرح ان تمام پہلوؤں کا تذکرہ کیا ہے جس میں اسلام اور اشتراکیت ایک دوسرے سے متفق ہیں اور آخری دو میں آئیڈیالوجی کی اخلاقی بنیادیں اور اسلامی سوسائٹی کی معاشی ساخت کو بیان کیا گیا ہے۔ شروع میں ایک عالمانہ مقدمہ ہے جس میں عہدِ حاضر کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام ہماری کس طرح راہنمائی کرتا ہے۔ مولانا موصوف نے نہایت ہی دردمندانہ طریق سے یہ واضح کیا ہے کہ اسلام دراصل ایک انقلاب انگیز اور حرکی قوت ہے جس میں محض ایک فرد کا نہیں بلکہ ساری انسانیت کی نجات کا حل موجود ہے۔ اسلام کو ایک نظامِ حیات کی حیثیت سے جو نظر انداز کیا جاتا ہے اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اسلام کے ساتھ مسلمانوں کا رشتہ محض غیر شعوری سا ہو گیا ہے۔ اب اگر مسلمان اس قعرِ ذلت سے نکلنے کے خواہاں ہیں۔ اب اگر وہ صدیوں کے جمود کو توڑنے کا عزم رکھتے ہیں۔ تو اس کی ایک صورت ہے کہ وہ اسلام کی تعلیمات کے ساتھ شعور کی اساس پر اپنے تعلقات کی عمارت کو پھر سے استوار کریں۔ اس کی پیش کردہ ہدایت کو صرف مسجد کی چار دیواری میں ہی نہیں۔ بلکہ کارزارِ حیات میں بھی مشعلِ راہ بنا دیں۔ جب تک وہ دین اور دنیا کی تفریق کو مٹا کر پورے کے پورے اسلام کو اپنانے کے لئے تیار نہیں ہو جاتے اس وقت تک اسلام کو ایک متحرک نظامِ فکر و عمل بنانے کا خیال صرف ایک خواب ہی رہے گا اور کبھی شرمندۂ

---

[1] مصنفہ مولانا مظہرالدین صاحب صدیقی۔ طباعت ۲۱۲ صفحے۔ زبان انگریزی قیمت مبلغ پانچ روپے شائع کردہ مکتبہ نشاۃ ثانیہ۔ حیدرآباد دکن۔

مارکسیت یا اسلام

تعبیر نہیں ہو سکے گا۔ اسلامی تعلیمات کی اسی ہمہ گیری کے سبب سے توقع یہ ہے کہ مستقبل میں اسلام کا اگر کوئی حریف ہو سکتا ہے تو وہ صرف اشتراکیت ہے جو صرف چند فلسفیانہ نظریات کا مجموعہ ہی نہیں بلکہ ایک پورا نظام زندگی ہے۔ پھر جس طرح اسلام کا اپنا ایک پیغام ہے اسی طرح مارکسیت اپنی ساری خامیوں کے باوجود مستقبل کے لئے ایک پیغام دیتی ہے۔ اور ان تدابیر کا بھی تذکرہ کرتی ہے جن کو ہم کام میں لا کر موجودہ سیاسی اور معاشی مشکلات پر کسی حد تک غالب آ سکتے ہیں۔ اس وجہ سے یہ ہمارے لئے اشد ضروری ہے کہ ہم مارکس اور اس کے معتقدات پر ایک گہری نگاہ ڈالیں اور دیکھیں کہ اس میں کونسی کونسی لغزشیں ایسی ہیں جو ہماری توجہ کی خاص مستحق ہیں۔ اور اسلام ان کے مقابلے میں کیا طریق فکر اختیار کرتا ہے۔

مارکسیت میں بنیادی فلسفہ "تاریخ کی مادی تعبیر" ہے اور مارکسی فلسفہ کی سر بفلک عمارت اسی اساس پر تعمیر ہوتی ہے۔ مارکس نے یہ فلسفہ دراصل ہیگل سے مستعار لیا اور اس کے ڈھانچے میں اپنی مرضی کے مطابق روح پھونک دی۔ چنانچہ ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم چند الفاظ میں ہیگل کے فلسفہ کو بھی بیان کریں۔ ہیگل کے نزدیک تاریخ کا ہر دور ایک وحدت۔ ایک کل، یا استعارہ کی زبان میں اگر کہنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ گویا ایک زندہ نظام جسمانی ہوتا ہے۔ اس دور میں انسان کے سیاسی، معاشی، تمدنی و اخلاقی، علمی، و عقلی اور مذہبی معتقدات ایک خاص مرتبہ پر پہنچتے ہیں۔ ان سب کے اندر ایک ہم آہنگی ہوتی ہے اور ان سب میں اس دور کی روح رواں دواں ہوتی ہے۔ جب تاریخ کا قافلہ بڑھتا ہے تب خود ہی اس دور کے بطن سے پرورش پا کر اس کا ایک حریف ظاہر ہوتا ہے۔ یعنی کچھ نئے افکار، نئے رجحانات، نئے نظریات اور نئے اصول خود اسی روبزوال دور کے طبعی تقاضے سے پیدا ہو جاتے ہیں اور پرانے افکار سے ان کی لڑائی شروع ہو جاتی ہے۔ کچھ مدت تک قدیم اور جدید باہم ایک دوسرے سے دست و گریباں رہتے ہیں۔ بالآخر کسر و انکسار کے بعد قدیم و جدید میں امتزاج پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اسی امتزاج سے ایک نئی تہذیب کا خمیر اٹھایا جاتا ہے۔ اور پھر اس کے ساتھ بھی یہی حشر ہوتا ہے۔ اور انسانی تہذیب اس طرح سفر کرتی ہے۔ اسی عمل ارتقا کو ہیگل اپنی اصطلاح میں جدلی عمل (DIALETICAL PROCERS) کہتا ہے اس فلسفہ کی نظر میں جو چیز حقیقتاً موثر اور فیصلہ کن ہے وہ افکار کا یہ جدلی عمل ہے۔ تاریخ کے تمام واقعات و حوادث میں کارفرمائی اگر کسی قوت کی ہے تو وہ صرف افکار و تصورات کی قوت ہے۔ عالم خارجی بذات خود کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اس کی اہمیت صرف اتنی ہے کہ وہ روح مطلق کے سفر ارتقا کے لئے نشان منزل کا کام دیتا ہے۔

کارل مارکس نے ہیگل کے اس فلسفیانہ نظریے میں سے جدلی عمل کا خیال تو لے لیا مگر روح یا فکر کا تصور جو ہیگل فلسفہ کی جان تھا اس سے الگ کر دیا۔ فکر کے بجائے اس نے مادی اسباب یا معاشی محرکات کو تاریخ ارتقا کی بنیاد قرار دیا۔ اس نے کہا کہ انسان کی زندگی میں سب سے اہم چیز معیشت ہے اور اسی پر انسان کے اخلاقی اور مذہبی معتقدات اور اس کے تمدن اور اس کے علوم و فنون کی بالائی عمارت قائم ہوتی ہے مادی زندگی کے حوائج و ضروریات ہر زمانے میں آفرینش دولت کے مخصوص طریقے وجود میں لاتے ہیں دولت پیدا کرنے کے مخصوص طریقے اس دور کی ذہنی اور سیاسی زندگی کا ہیولیٰ تیار کرتے ہیں۔ انسان کا طرز معاشرت اور طریق معیشت اس کے ذہن و [illegible] کے ارتقا سے متعین نہیں ہوتا بلکہ اس کے برخلاف انسانی ذہن و شعور کی حالت اس کی معاشرت اور طرز معیشت کی آئینہ دار ہی نہیں بلکہ مخلوق ہوتی ہے۔ یہ ہے مختصر الفاظ میں مارکس اور اس کا بنیادی فلسفہ۔ یہی درحقیقت اصل ہے اور باقی سب فروع۔ اس نظریہ پر غور کرنے سے ہم دو نتائج اخذ کر سکتے ہیں۔

(۱) مارکس کی رائے میں انسانی اعمال میں سب سے محرک قوت معاشی ہے۔

(ب) ایک خاص طریق آفرینش کو اس دور کے افراد میں ایک ہی طرح کے افراد کو پرورش کرنا چاہئیے۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ عملی زندگی میں یہ چیز عنقا ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص جو افلاس کا شکار ہے ان تینوں متبادل راستوں میں جو راستہ

چاہے اختیار کر سکتا ہے۔ وہ اپنے افلاس کو دور کرنے کے لئے چوری کر سکتا ہے۔ ڈاکہ ڈال سکتا ہے خودکشی سے اپنی زندگی کو ختم کر سکتا ہے لوگوں کے سامنے دستِ سوال دراز کر سکتا ہے اور اگر طبیعت کا میلان ہو تو سیاسی جماعت میں شرکت کر کے اپنے اور اپنے جیسے ہزاروں بھائیوں کے غصب شدہ حقوق کے حصول کے لئے لڑ کر جان کی بازی بھی ہار سکتا ہے۔ ان مختلف راستوں میں سے وہ کونسا راستہ اختیار کرے گا اس کے متعلق ہم صرف معاشیات کی عینک سے دیکھ کر کوئی حتمی و قطعی فیصلہ نہیں کر سکتے اس کا انحصار اس کے ذاتی مزاج اور اخلاقی احساس پر ہے۔ اس میں معاشی عنصر کو یکسر نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ مگر یہ سب کچھ اسی کا کرشمہ نہیں۔ اس میں دوسرے عوامل بھی اسی طرح زبردست ہیں جس طرح کے معاشی۔ یہی حال وسیع پیمانے پر قوموں کی زندگی کا ہے۔ یونانی ریاستوں کو ۶۲۵ قبل مسیح سے لے کر ۳۲۵ قبل مسیح تک کثرتِ آبادی کا سامنا کرنا پڑا۔ جب یہ دباؤ بہت زیادہ بڑھ گیا۔ تو مختلف ریاستوں نے اس پیچیدگی کو سلجھانے کے مختلف طریقے نکالے بعض ریاستوں نے اپنی زائد آبادی کو سمندر پار زمینوں میں دھکیل دیا۔ دوسروں نے اپنے پڑوسی یونانیوں کی زمینوں پر ہی قبضہ جمایا۔ تیسرے نے اپنے اس مسئلہ کو زرعی پیداوار کی برآمد کو حکومت کی تحویل میں دے کر حل کیا۔ ایک معمولی سمجھ بوجھ رکھنے والا انسان بھی جانتا ہے کہ ایک ہی دور کے افراد یا اقوام کے خیالات میں یک رنگی کا پایا جانا قریب قریب ناممکن ہے۔ اور چشم فلک نے آج تک اس کو اس آب و گل کی دنیا میں نہیں دیکھا۔ مارکس اور اس کے متبعین دور از کار دلائل لا کر بھی اپنے اس دعوے کی تصدیق ——— جسے تصدیق کہا جا سکتا ہو نہیں کر سکے اور آج تک تاویلات کی الجھنوں میں گرفتار ہیں۔ تاریخ انسانی کے ہزاروں واقعات اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ وطن کی محبت قومی روایات سے وابستگی۔ اور ایک ہی نسل و قوم ہونے کا احساس معاشی محرکات سے کہیں زیادہ مؤثر ثابت ہوئے ہیں۔ پھر اگر غور سے دیکھا جائے تو معاشی محرکات بھی عملی میدان میں ایک مبہم اور غیر واضح اصطلاح ہے۔ مارکس کا دعویٰ یہ ہے "حالات پیداوار اور پیداواری قوتوں کے مابین ایک فطری مناسبت ہوتی ہے۔ یعنی پیداواری قوتیں جس منزل پر ہوتی ہیں۔ حالات پیداوار بھی اسی منزل تک ترقی کر جاتے ہیں۔ پیداواری قوتوں سے مارکس وہ ایجادیں یا انکشافات مراد لیتا ہے جو آفرینش دولت کے طریقوں کو بدل کر سماج کی معاشی تنظیم پر اثر ڈالتی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس ترقی میں آخر وہ کونسے لمحات ایسے ہیں جو فیصلہ کن ہوتے ہیں۔ کیا وہ وقت جب کوئی ایجاد معرضِ وجود میں آتی ہے یا جب اس کو پہلی مرتبہ استعمال میں لایا جائے یا جب اُس کا عام استعمال شروع ہو جائے اور اس کا سماج پر ایک نمایاں اور محسوس اثر ظاہر ہونے لگے۔ مارکس کی تحریروں سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُس کے ذہن میں یہی دور رہتا۔ لیکن ایک بات جو سوچنے کی ہے وہ یہ کہ آخر کوئی ایجاد عام کس طرح ہوتی ہے۔ دنیا کے سارے مارکسی اس بات پر متفق ہیں کہ ایک ایجاد کو عام کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ حالات پیداوار میں ایک خاص معیار تک ترقی کر لی جائے۔ مثال کے طور پر سٹیم انجن کے استعمال کو عام کرنے کے لئے یہ بات بے حد ضروری ہے کہ سرمایہ کافی مقدار میں پہلے سے موجود ہو اور اس کے ساتھ ساتھ اس کام کو جاننے والوں یا ایسے ذہین اشخاص کی کافی تعداد ایسی ہو جو اس کام کو جلد از جلد سیکھ سکیں۔ اس حقیقت کے تسلیم کر لینے سے مارکسی فلسفہ کی ساری عمارت پیوندِ خاک ہو جاتی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے جب ہم حالات کا مشاہدہ کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ حالاتِ پیداوار کا انحصار پیدائشی قوتوں کی ترقی پر نہیں بلکہ پیدائشی قوتوں کا تعین حالاتِ پیداوار کی ایک خاص منزل کرتی ہے۔[1]

یہ تو مسئلہ کا ایک پہلو تھا۔ اس کے دوسرے پہلو اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہیں۔ "جب یہ تسلیم کر لیا جائے کہ تمدنی نظریات بھی علوم طبعیہ کی سی نوعیت رکھتے ہیں تو انسانی افکار و اعمال میں بھی جبریت کو ماننا پڑتا ہے۔ اور انسان کی خود مختاری کا انکار ناگزیر ہو جاتا ہے۔ جب

---

[1] یہ بات اس کتاب میں مذکور نہیں ہے اگر تفصیل دیکھنا ہو تو (THE MATERIALIST CONCEPTION OF HISTORY BY KARL FEDERN) ملاحظہ فرمائیں۔

انسانی افکار و تصورات کی حیثیت معاشی ماحول کے عکس کی سی ہے جس میں انسانی ذہن کو قطعاً کوئی دخل نہیں اور وہ ایک پردۂ فلم ہے جس پر مادی دنیا کی رنگ برنگ تصویریں منعکس ہو رہی ہیں۔ تو پھر اس استدلال کی بنا پر کیا ہر قسم کے معاشرتی مظالم، سیاسی جبر اور معاشی استحصال کو جائز نہیں ٹھیرایا جا سکتا۔ اگر انسان خارجی احوال اور گرد و پیش کے اثرات کا مجبور بندہ ہے اور اس کی ذہنیت و سیرت بالکلیہ خارجی اثرات سے تشکیل پاتی ہے جن پر اسے کسی طرح کا اختیار یا قدرت نہیں ہے۔ تو پھر سرمایہ دار اپنی معاشی لوٹ کھسوٹ۔ سامراج کے نمائندے اپنے سیاسی ظلم و ستم اور فاسشی آمر اپنے جابرانہ طرزِ حکومت پر اسی طرح مجبور ہیں جس طرح اشتراکی حضرات اپنی انقلاب انگیزی پر اور حیوانات اپنی بہیمانہ سرشت پر۔ کائنات کا ہر ذرہ مقہور و مجبور ہے۔ اور انسانی ارادہ و اختیار ایک زعم باطل ہے۔ جب ہر طبقہ اور ہر گروہ خارج کا بے بس آلہ ٹھیرا تو اس کی برائیوں اور ناانصافیوں کی ذمہ داری اس پر کیونکر عائد کی جا سکتی ہے۔ یہ سارا ظلم و نست اس عمل ارتقا اور تاریخی وجوب کے تحت رونما ہو رہا ہے جس کے نام پر اشتراکی حضرات اپنی تحریک چلا رہے ہیں۔ ایسی صورت میں اگر اشتراکی تحریک کامیاب بھی ہو جائے تو اس کی کامیابی نہیں بلکہ زورِ قوت کی کامیابی ہوگی کیونکہ حق و صداقت کا اطلاق ان اعمال و افکار پر نہیں کیا جا سکتا جو انسان سے اضطراراً بلا اختیار و ارادہ اور خارجی ماحول کے دباؤ سے سرزد ہوں۔

تاریخ کے اس نظریہ میں صریح تناقض اور عدم تطابق کا ایک دوسرا ثبوت یہ ہے کہ جب انسانی افکار و تخیلات اور علمی نظریات معاشرتی ماحول اور خارجی احوال سے پیدا ہوتے ہیں تو ان کی صداقت اس معنی کر کے اضافی ہوتی ہے کہ جب وہ دور ختم ہو جاتا ہے جس کے مادی اور معاشرتی ماحول نے ان نظریات و افکار کو جنم دیا۔ تو ان افکار و نظریات کی صداقت اور سودمندی بھی ساتھ ہی دفن ہو جاتی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ہر نظریہ اور فکر اپنے معاشی ماحول کی پیداوار ہے تو آخر تاریخ کے اسی نظریہ کو کیوں ایک ابدی صداقت کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔ کیوں نہ ہم اسے صرف انیسویں صدی کے لئے ہی صحیح سمجھیں جس کے معاشی حالات اس کی پیدائش کا سبب بنے۔ مگر مارکس اور اس کے متبعین اس کو تسلیم کرنے کے لئے کبھی تیار نہیں ہوتے اور اس پر ایک ازلی حقیقت کے طور پر ایمان لاتے ہیں۔ تضاد کے اس گرداب سے مارکس کے ماننے والے آج تک نہیں نکل سکے۔ تھوڑا سا غور و فکر بھی یہ بات واضح کر دیتا ہے کہ مادی دنیا اور انسانی ذہن میں اصل طاقت مؤخر الذکر کو حاصل ہے۔ خارجی دنیا تو ہمارے ہاتھ میں آلہ ہے جس سے ہم جس طرح چاہیں کام لیں۔ مادی اشیا کو جس طریق پر ارادہ ہو استعمال میں لائیں۔ مارکس نے اصل کو فرع اور فرع کو اصل کی حیثیت دے کر معاملہ کو بالکل الٹ دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ چونکہ مادہ کا وجود انسان سے پیشتر موجود تھا اس بنا پر مارکس اور اس کے معتقدین نے یہ فرض کر لیا کہ اصل اہمیت مادہ کو حاصل ہے۔ لیکن کسی چیز کی عمر اس کی اہمیت کا معیار نہیں بن سکتی۔ بلکہ اس کا اصل معیار کسی چیز کی قوت۔ اثر آفرینی اور سب سے بڑھ کر اس کی افادیت ہے۔ بے جان مادہ اور جاندار اور باشعور انسان میں جب ہم موازنہ کرتے ہیں۔ تو ہم انسان کو ان صفات کا زیادہ حامل پاتے ہیں۔ اس لئے اس کی اہمیت بھی بہت زیادہ ہے۔ یہ تسلیم ہے کہ ذہن کی ساخت میں مادی عنصر کو بڑا دخل ہے لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ اگر وہ مادہ سے عبارت ہے تو مادہ نے ہی اس کو پیدا کیا ہے۔ انسان ایک بچے سے نشو و نما کا آغاز کرتا ہے لیکن اس سے اگر یہ نتیجہ اخذ کر لیا جائے کہ بچے نے انسان کو پیدا کیا ہے تو یہ حد درجہ مضحکہ خیز ہوگا۔ لیکن مارکس نے اس کو بالکل محسوس تک نہ کیا۔ انسان کو یقیناً مادہ سے ہی پیدا کیا گیا ہے۔ لیکن اس کو پیدا کرنے والا ہاتھ کوئی دوسرا ہی ہے جس کو مذہب میں خدا یا پرماتما کہتے ہیں۔

تاریخ کی مادی تعبیر کا سب سے افسوسناک اثر اخلاق پر ظاہر ہوا ہے۔ جب ہم یہ مانتے ہیں کہ انسان خارجی ماحول اور ارتقائی عمل کا غلام ہے تو اس کے لئے نہ حق و انصاف کوئی چیز ہو سکتی ہے اور نہ عدل و انصاف کوئی معنی رکھتا ہے۔ جو کچھ ہے، ہے۔ خواہ وہ ظلم یا عدل، مساوات ہو یا عدم مساوات۔ اس کے سوا نہ کچھ ہو سکتا ہے نہ ہو سکتا تھا۔ انسانی تاریخ میں وجوب ہی وجوب ہے۔ اس نقطۂ نظر سے

اصولی مبادیات کی حیثیت محض مقیاس الحرارت کے سیماب کی طرح ہو جاتی ہے جن کو معاشی ماحول کی تبدیلی ہمیشہ تغیر کے تابع رکھتی ہے۔ وہ کوئی حتمی، آخری اور قطعی معیار تو نہیں جن کے مطابق انسان اپنے اعمال و افکار کو جانچ سکیں۔ ان کی اہمیت صرف اسی حد تک ہے کہ ہر قول اور ہر فعل کے لئے وہ وجہ جواز فراہم کریں۔ انسان جس رخ چاہے جا سکتا ہے جس سانچے میں چاہے ڈھل سکتا ہے۔ جو کام کرنا چاہے آزادی سے کر سکتا ہے اور اصول و مبادیات اسے ہر راہ پر اور ہر کام میں خوش آمدید کہنے کے لئے دل و جان سے حاضر ہیں۔ کوئی اصول اگر قابل التفات ہے تو وہ مصلحتِ وقت ہے۔ اس اصول کے پیشِ نظر دیکھئے کہ انسان محض اپنی ہوائے نفس کا بندہ نہیں بن جاتا۔ کیا ایثار، ہمدردی، عہد کا پاس، دیانت داری، سب وہ صفات جو انسان کا طرۂ امتیاز ہیں، بالکل بے معنی اور لغو نہیں ہو جاتیں۔

غالباً یہی وجہ ہے اُس تبدیلی کی جو روس کی خارجی اور داخلی پالیسی میں رونما ہو رہی ہے۔ آج ہر اشتراکی کو اس بات پر غور کرنا چاہئے کہ روس کا دوسری جنگِ عظیم کے بعد رومانیہ اور فن لینڈ سے تاوانِ جنگ وصول کرنا کہاں تک جائز ہے۔ جب کہ یہی ملک پچھلی جنگِ عظیم میں اس بات کا زبردست حامی تھا کہ شکست خوردہ ممالک سے کسی قسم کا تاوان وصول نہ کیا جائے۔ آخر وہ کون سے اصول تھے جن کا سہارا لے کر اشتراکی روس کے راہنماؤں نے جاپان کے خلاف جنگ کی جب کہ یہ ملک پہلے ہی بازی ہار رہا تھا۔ کیا جاپان نے اس کے کسی عہد کو توڑا تھا۔ کیا اس نے کسی معاہدہ کی خلاف ورزی کرنے کی جسارت کی تھی۔ کیا دم توڑتا ہوا جاپان اشتراکی روس کے لئے خطرے کا باعث تھا۔ غور کریں کہ فسطائی اٹلی کے فرانس پر بزدلانہ حملہ اور اشتراکی روس کے جاپان پر حملے میں آخر کیا فرق ہے۔ کیا وجہ ہے کہ ایک طرف تو روس برطانیہ کے خلاف مصریوں کے مطالبات کی پرزور حمایت کرتا ہے اور دوسری طرف وہ عربوں کے برخلاف فلسطین کی تقسیم کا حامی ہے۔ کیا اس سے کھلا ہوا تضاد کہیں پایا جا سکتا ہے۔

پھر ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ اگر اخلاق معاشی ماحول کی پیداوار ہے تو اس دنیا کو اخلاقی اعتبار سے پہلے سے کہیں زیادہ بہتر ہونا چاہئے تھا کیونکہ پیدائش دولت میں انسانیت نے محیر العقول ترقی کی ہے۔ مارکس نے اخلاقی ترقی کو علوم و فنون کی ترقی کے ساتھ خلط ملط کر کے حقیقت کو مسخ کر دیا ہے۔ ایک عامی بھی اس حقیقت کو جانتا ہے کہ اخلاق اور علوم و فنون ہم معنی الفاظ نہیں ہیں۔ اخلاق کا تعلق انسان کے ارادہ و اختیار اور اس کے ضبطِ نفس سے ہے۔ اور علوم فنون اُس کے دماغ سے وابستہ ہیں۔ علوم نے جس برق رفتاری سے پچھلے چند سالوں میں ترقی کی ہے۔ اس سے یہ مستلزم ہے کہ ہمدردی، ایثار، دیانت داری کے افق بھی وسیع ہوتے۔ لیکن عملی دنیا میں حالات اس کے الٹ ہیں۔ علم کی ترقی کے باوجود اخلاقی انحطاط اس عہد میں نمایاں ہے۔ ممکن ہے کہ اخلاق کے جس معیار پر ایک قوم پہنچی ہے اُس کے بعد آنیوالی نسل اُس معیار سے گر جائے۔ اخلاقی ترقی میں ارادہ و اختیار کو دخل ہے اور اسے جب قوم کی خواہش ہو استعمال میں لایا جا سکتا ہے۔ لہذا اخلاق میں ترقی کبھی مستقل اور دائمی نہیں ہو سکتی اور یہ ہمیشہ قوم کی خواہش کے مطابق بدلتی رہتی ہے۔ تاریخ کے اوراق اس امر کی پوری پوری شہادت دیتے ہیں۔ دورِ اول کے مسلمان رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کی قیادت میں اخلاق کے اس بلند معیار پر پہنچے جو اس قوم کو اس کے بعد آج تک کبھی نصیب نہ ہوا۔ ان کا معاشرتی اور معاشی نظام انصاف اور مساوات کے اعلیٰ اصولوں پر استوار تھا اگرچہ علوم و فنون میں وہ اپنی بعد کی آنیوالی نسلوں سے کسی قدر کمزور تھے۔ رفتارِ زمانہ کے ساتھ جب عربی تہذیب نے ترقی کی تو مسلمانوں کے علم کا احاطہ بڑھتا چلا گیا۔ لیکن اخلاق کے اعلیٰ معیار یعنی تقویٰ، انصاف اور مساوات میں وہ لوگ گرتے چلے گئے اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ دورِ عباسیہ جو علمی اعتبار سے بہت ہی ترقی کا زمانہ تھا اخلاقی لحاظ سے عہدِ انحطاط تھا۔

جب ہم اخلاق کو معاشی ماحول کا پر تو سمجھتے ہیں تو اس سے یہ لازم ہے کہ ایک ہی قسم کے معاشی ماحول میں اخلاق میں بھی بہت حد تک ہم رنگی ہو۔ لیکن تاریخ کے صفحات اس کی تردید کرتے ہیں۔ مارکس نے تاریخ انسانی کو جتنے ادوار میں منقسم کیا ہے اس کے مطابق دورِ

اور دوپراول کے مسلمان جس معاشی ماحول میں رہتے تھے وہ ایک تھا ـــــ یعنی غلامی کی ملکیت کا دور۔ پیدائش دولت کے طریقوں میں کافی حد تک یکسانیت تھی۔ اور تقسیم کا طریق بھی کبھی قریب قریب ایک جیسا ہی تھا۔ مارکس کے نظریہ کے مطابق دونوں اقوام کو اخلاق کی بھی ایک ہی سطح پر ہونا چاہئے تھا لیکن تاریخ کے واقعات اس میں ہمنوا نہیں۔ تاریخ کا ایک ادنیٰ طالب علم بھی جانتا ہے کہ مسلمانوں کے اخلاق رومیوں سے بہت ہی مختلف تھے۔ مثال کے طور پر رومیوں اور مسلمانوں اپنے غلاموں کے ساتھ سلوک کو ہی لیجئے اگرچہ غلامی دونوں قوموں میں جائز تھی لیکن اس کے باوجود اس میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ اسلام نے اخلاقی تربیت اور قانونی مشینری کو کام میں لاکر غلاموں پر ظلم و استبداد کے سب راستوں کو مسدود کر دیا۔ اُن کو حیوانیت کے پست درجے سے اٹھا کر انسانیت کے زمرے میں داخل کیا۔ لیکن رومیوں نے انھیں ستم کے ان شکنجوں میں کس کر رکھا جس کی یاد سے آج بھی جسم لرز جاتا ہے۔ سماج کی ایک ہی پر معاشی ساخت میں۔ ایک ہی طرح کے لِق آفرینش کے استعمال میں۔ اور ایک ہی قسم کے ملکیتی تعلقات کی حدود میں رہتے ہوئے بھی۔ اس عظیم اختلاف کی وجہ اگر کوئی ہو سکتی ہے تو وہ صرف یہ کہ انسان دنیا میں ایک فعال شخصیت ہے اور وہ اپنے ماحول کا مجبور اور بے بس بندہ ہی نہیں۔ وہ ماحول کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال سکتا ہے اور ڈھالتا رہتا ہے اور معاشی ماحول کی غیر مشروط غلامی میں خاموش زندگی بسر نہیں کرتا۔ افراد یا اقوام کا محرک ایک ارادہ ہے۔ ایک ارادہ یا فکر ایک ایسی قوت ہے جس سے بعض اوقات دھارے کا رُخ بالکل بدل دیا جاتا ہے۔ ایک نہیں تاریخ کے بے شمار واقعات ایسے دیکھنے میں آئے ہیں جن میں ایک شخص کی قوتِ فکر و عمل نے تاریخ کے رُخ کو بالکل ایک دوسری سمت میں پھیر دیا۔ دورِ جدید ہی میں دیکھئے شدید قسم کی طبقہ داریت سایہ کی طرح اُن ممالک میں پہنچی جہاں وسیع پیمانوں پر اشیا مشینوں کی مدد سے تیار کی جاتی ہیں۔ اور انھیں ممالک میں طبقاتی جنگ کی آگ سب سے تیز ہوتی ہے۔ اس کلیہ کے پیش نظر اشتراکی انقلاب کے لئے زمین سب سے زیادہ ہموار جرمنی۔ فرانس اور برطانیہ کی تھی۔ اور توقع بھی یہی تھی کہ اشتراکیت کا ڈرامہ سب سے پہلے انھیں ملکوں میں کھیلا جائے گا۔ واقعات کا دھارا بھی بالکل اسی سمت میں بہہ رہا تھا۔ مگر آنیوالے واقعات نے ایسی سب توقعات کو خیالِ خام ثابت کیا۔ اشتراکیت کے رہنماؤں کی بصیرت نے جب یہ دیکھا کہ زار کی افواج کمزور ہو چکی ہیں اور زار بذاتِ خود بھی کوئی مؤثر قدم اٹھانے کی بجائے ابھی تک یہ سوچ رہا ہے کہ دولیوں کی ہڈیوں کو کسی محفوظ مقام پر کس طرح پہنچایا جا سکتا ہے۔ تو انھوں نے فوراً لپک کر اس موقع سے فائدہ اٹھایا۔ زار کی بددل افواج کو شکست دے کر یہ انقلاب دفعتاً روس جیسے زرعی ملک میں خلافِ توقع برپا کر دیا۔ اور دیکھئے اشتراکیت جس کی زندگی کا ساز بین الاقوامی تاروں پر چھیڑا گیا تھا اور جس سے یہ امید وابستہ تھی کہ وقت کے گزرنے کے ساتھ اس سے بین الملّی نغمے بلند ہوں گے۔ اب سٹالن کی تدبر سے اپنی تان نیشنلزم پر توڑ رہا ہے اور مارکس کی پیشگوئی کی حیثیت ایک خوابِ پریشاں سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ روس کی خارجی پالیسی اس کی بہترین دلیل ہے۔ اس کی آپ لاکھ توجیہات کریں لیکن روس کی بین الاقوامی اہمیت کو کسی طرح ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ ایک سامراجی سلطنت اور سوویٹ ریپبلک میں الفاظ کا فرق تو ضرور ہے مگر ذہن میں کوئی اختلاف نہیں۔ دونوں "جوع الارض" کے جذبہ سے مغلوب ہیں۔ اور ظلم و ستم کے ایک ہی جیسے ہتھیار استعمال کر رہے ہیں۔ مارکسی نظریات میں سب سے زیادہ ظلم اور ناانصافی مذہب کے ساتھ کی گئی ہے۔ اشتراکیت کے نزدیک مذہب نے ہمیشہ فرماں روا طبقے کو ظلم و ستم، ناانصافی اور معاشی استحصال میں مدد پہنچائی ہے۔ مذہب اس کی نظر میں عوام ان کے لئے افیون ہے۔ یہ خیال بنیادی طور پر لغو اور مہمل ہے۔ یا تو اس کے پیش کرنے والے طور پر مذہب کی تاریخ سے ناواقف ہیں۔ یا پھر وہ واقعات کی صورت کو اپنی خواہشات کے مطابق عمداً مسخ کر کے غلط طریقے سے پیش کرتے ہیں پوری تاریخ ان کی اس غلط بیانی کی تردید کرتی ہے۔ تاریخ میں جہاں کہیں کسی دینی تحریک کی ابتدا ہوئی ہے اس نے ہمیشہ مظلوم انسانوں کا ساتھ دیا ہے۔ ظالم، غاصب اور ذاتی اغراض و منافع پیش رکھنے والے ہمیشہ مذہب کے شدید دشمن رہے ہیں۔ تاریخِ اسلام بتاتی ہے کہ کلمہ طیبہ کے بلند ہونے پر سب سے

زیادہ خوشی جس طبقہ نے محسوس کی وہ غلاموں اور کمزوروں کا طبقہ تھا۔ یہ آواز ان کے کانوں میں پڑتے ہی ان کے دلوں میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ انھوں نے اس اعلان کو آزادی کا چارٹر سمجھ کر اس کی آواز پر پہلے لبیک کہی۔ حکمرانوں اور بادشاہوں کے گھروں میں اس کا چرچا ہوتے ہی صفِ ماتم بچھ گئی۔ اس کی سب سے زیادہ چوٹ بھی اس گروہ نے محسوس کی۔ اُن کے خدائی کے قصر متزلزل ہونے لگے۔ اور ان سب نے اپنے باہمی اختلافات کو ختم کر کے تحریکِ اسلامی کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کیا۔ انبیاء کو کفار کی طرف سے ایک عام طعنہ یہ دیا جاتا تھا کہ دنیوی وجاہت کا مالک کوئی انسان تمہارے ساتھ نہیں ہے۔ تمہارے متبعین سب کے سب ایسے ہیں جنھیں سوسائٹی میں کوئی قدر و منزلت حاصل نہیں۔ ان کے اندر صحیح قوت فیصلہ ہی موجود نہیں ہے۔ قریش آخر دم تک مسلمانوں سے برسرِپیکار رہے اس لئے کہ اسلام اس معاشرتی اور سیاسی تفوق کو مٹا رہا تھا جو انھیں معاشرے میں حاصل تھے۔ مارکس نے بدقسمتی سے جس مذہب کا مطالعہ کیا وہ اس کے اپنے دور کی روبہ انحطاط عیسائیت تھی۔ اس عہد میں مادیت لوگوں کے دل و دماغ پر چھا رہی تھی اور زندگی کی بہتر قدریں انسان کے مادّی فوائد و لذائذ کی تابع فرمان ہو رہی تھیں۔ تاریخ کے اوراق اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ مذہبی بیداری کے دور قوموں کی اخلاقی اور معاشرتی سربلندی کے زرّیں عہد تھے۔ اور وہ زمانہ جس میں دنیا کے ظالموں اور سفاکوں کو یہ موقع ملا کہ وہ دستِ ظلم دراز کریں وہ مذہبی تنزل کے دور تھے۔

مولانا مظہرالدین صاحب نے ایک حق پرست عالم کی طرح پوری غیر جانبداری سے مارکسی نظریہ کی صداقت کو تسلیم کیا ہے جو بیک وقت اس کی زندگی اور قوت کا باعث ہے اور پھر بتایا ہے کہ اسلام اور اشتراکیت کن کن اصولوں میں ایک دوسرے کے ہمنوا ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مارکسزم نے اپنی ساری فکری لغزشوں کے باوجود سرمایہ داری نظام میں جو ایک تضاد ہے اُس کو نہایت ہی زوردار پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ اور آج ظالمانہ نظام کے خلاف غم و غصہ کی جو ایک عام لہر دوڑ رہی ہے اس میں مارکس کی تحریروں کو خاص دخل ہے۔ اسلام نے بھی طبقاتی تقسیم کی پورے زور کے ساتھ مخالفت کی اور اپنی پوری قوت سے اس کا قلع قمع کرنا چاہا۔ دونوں اس امر میں متفق ہیں کہ کوئی معاشرہ زندہ نہیں رہ سکتا جو اپنے افراد کی کثیر تعداد کو ان وسائلِ حیات سے محروم رکھے جن سے کم از کم ایک اوسط درجے کی آسائش کی زندگی بسر کی جاسکے۔ نیز یہ کہ اگر سوسائٹی میں آپ مذہب، اخلاق اور دیگر اعلیٰ اقدار کی کارفرمائی چاہتے ہیں تو آپ کو طبقاتی اقتدار ختم کرنا ہوگا اور ایک ایسے اجتماعی نظام کے قیام کی کوشش کرنا ہوگی جو سوسائٹی کے ہر مرد و زن کے لئے کم از کم وہ ضروریاتِ زندگی فراہم کرنے کا ذمہ لے جن سے جسم و جان کا رابطہ بآسانی قائم رکھا جاسکے۔ ان دونوں میں البتہ جو اختلاف ہے وہ ان کے مخصوص طریق کار میں ہے۔ اشتراکیت معاشی مساوات کے حصول کے لئے وہی طریقے کام میں لاتی ہے جن پر ایک فاشسٹ ریاست عمل درآمد کرتی ہے۔ یہ دونوں "ادیان" سماج کی اصلاح بیرونی دباؤ کے زور سے کرتے ہیں۔ اور اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ وہ تبدیلی جو صرف بیرونی ہوگی اور جس کا آخر صرف "قانون سازی" تک ہی محدود ہو وہ کسی پائیداری اور مستقل فلاح کی کبھی ضامن نہیں ہو سکتی۔ ایک خوشگوار انقلاب کے لئے یہ ضروری ہے کہ اصلاح کا جذبہ دل کے گوشوں میں موجزن ہو۔ اور انسان کے قلب و دماغ میں نیکی کی ایسی تحریک پیدا ہو جس کی لہریں اس کی بیرونی زندگی کو بھی متغیر کر دیں۔ اسلام نے اصلاح کے لئے یہ طریق اختیار کیا ہے۔ اس نے اندرونی اصلاح اور بیرونی تغیر کو ایک ساتھ اس طرح پیش کیا ہے کہ ان کے درمیان بعض اوقات امتیاز کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ قریب قریب محال ہو جاتا ہے۔

دوسرا پہلو جس میں اشتراکیت اور اسلام ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں وہ یہ ہے کہ دونوں نے اس دنیا کے مسائل سے بحث کی ہے اور اسی دنیا کو اپنی تعلیم کی عملی تعبیر کے لئے تجربہ گاہ بنایا ہے۔ مارکس نے ایک جگہ لکھا ہے کہ فلاسفہ نے دنیا کی صرف تعبیر ہی کی ہے لیکن اصل مسئلہ اس کو تبدیل کرنے کا ہے۔ اسلام اس معاملہ میں اشتراکیت کا ہم آواز ہے۔ یہ دینِ حق صرف مافوق الطبعی نظریات اور

ناقابلِ فہم عقائد کا ایک بے جان مجموعہ ہی نہیں۔ بلکہ یہ ایک انقلاب انگیز اور متحرک نظامِ فکر و عمل ہونے کی حیثیت سے جتنا مافوق الطبعی مسائل سے گفتگو کرتا ہے اسی قدر وہ اس کارزارِ حیات میں بھی ہدایت دیتا ہے۔ اسلام اور اشتراکیت کے راستے جہاں ایک دوسرے سے جدا ہیں وہ یہ کہ مارکس مافوق الطبعی نظریات کی نفی کر کے اپنی تنظیم کا محور صرف اس دنیا کو ٹھیرایا ہے لیکن اسلام اپنی ساری تعلیم کی اساس خدا اور احساسِ آخرت پر رکھ کر اس دنیا میں انقلاب لانا چاہتا ہے۔ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ اس وقت کسی فلاح کا خیال ہی عبث ہے جب تک کہ افراد میں خدا ترسی اور احساس جواب دہی موجود نہ ہو۔ یہ دونوں عقائد اسلامی نظام کی جان ہیں اس کے علاوہ مارکسی نظریات میں خلا ہے۔ وہ پیٹ کے تقاضوں کو اتنا ہمہ گیر بنا دیتا ہے کہ روح کے مطالبات اس کی اوٹ میں آجاتے ہیں اور انسانی زندگی دنیاوی لذائذ کے حصول کے لئے ایک مجنونانہ جدوجہد بن کے رہ جاتی ہے۔ اسلام دینِ فطرت ہونے کی وجہ سے روح اور جسم کے مطالبات میں ایک توازن پیدا کر کے اُن کو یوں پورا کرتا ہے کہ انسانیت ہر لحاظ سے سربلند ہو سکے۔

تیسرے جہاں اسلام اور اشتراکیت ایک دوسرے سے قریب ہیں وہ یہ دونوں انسانی زندگی کو ایک ناقابلِ تقسیم وحدت مانتے ہوئے زندگی کے سارے شعبوں کے لئے قوانین دیتے ہیں۔ علم الانسان ہمیں بتاتا ہے کہ زندگی کو مختلف حصوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ انسانی ذہن پر جس نظریۂ حیات کی فرمانروائی ہوگی انسانی اعمال کے زاویے اُسی سے متعین ہوں گے۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ ذہن میں دو نظریات بیک وقت حکمراں ہوں اور انسان ترقی کی منازل بھی طے کرتے رہیں۔ اس حقیقت کو ذہن میں رکھ کر دونوں نے اپنے قوانین کے دوائر کو بہت وسیع کیا ہے۔ اشتراکیت نے البتہ جو ٹھوکر کھائی ہے وہ یہ کہ اس نے مادیت کو لوگوں کے دل و دماغ میں اس طرح پیوست کر دیا ہے کہ نقشۂ حیات کے خالص مذہبی خانے بھی اس کے زیرِ اثر آ کر بالکل اسی رنگ میں رنگے گئے ہیں اور اشتراکیہ کا ہر شعوری اور ارادی فعل اسی مادیت کے اجمال کا شارح دکھائی دیتا ہے۔ اسلام نے اس کے برخلاف تقویٰ۔ پرہیزگاری۔ خدا ترسی کے دائرہ کو اس قدر وسیع کیا ہے کہ اس میں سماج کی معاشی اور سیاسی زندگی بھی آجاتی مسلمانوں سے صرف اس بات کا تقاضا نہیں کیا کہ وہ اپنی انفرادی اور عائلی زندگی میں نیکی کی راہ پر چلیں۔ بلکہ اُن پر یہ فرض بھی عائد کیا گیا ہے کہ وہ سماج سے بے انصافی۔ ظلم و ستم کا بھی استیصال کریں۔

اس کے نزدیک انفرادی تقویٰ تو ایک اساس ہے جس پر پورے سماج کی نیکی کا پرشکوہ محل تعمیر ہوتا ہے۔ وہ شخص جو زندگی کے چھوٹے چھوٹے معاملات میں حق و انصاف کی راہ پر قائم نہیں رہ سکتا۔ اُس سے یہ کس طرح توقع کی جا سکتی ہے وہ بڑے بڑے اور اہم معاملات میں راست بازی کا دامن اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑے گا۔

اسلام اور اشتراکیت میں ایک اختلاف ایسا ہے جس کا ذکر کر دینا یہاں اشد ضروری ہے اشتراکیت کی کامیابی معاشی ماحول کے ناگزیر تغیر کا ایک لازمی نتیجہ ہے لہٰذا مارکسیوں کی نظر میں ان کی فتح بالکل یقینی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ سرمایہ داری اپنے بطن سے اشتراکی انقلاب کو جنم دے گی اور معاشی ارتقا دنیا کو ناگزیر طور پر اشتراکی سانچوں میں ڈھال دیں گے۔ مگر اسلام کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ اس کا محرک ایک ارادہ ہے جو اسلام کو ماننے والے اس کو سربلند کرنے کے لئے رکھتے ہیں۔ "انتم الاعلون ان کنتم مومنین" اس بات پر دلالت کرتا ہے۔ کامیابی مسلمانوں کی گھٹی میں نہیں لکھی۔ بلکہ یہ مشروط ہے خدا کی رضا سے جو اہلِ اسلام کی اسلام کی محبت اور اس کی پیروی سے حاصل ہوتی ہے۔"

یہ ہے وہ مختصر تبصرہ جو فاضل مصنف نے مارکس کے نظریات پر فرمایا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ مارکسی نظریات بالکل چیستاں ہیں۔ اُس نے اپنے افکار کو علمی بنیادیں فراہم کرنے کے اندھے جوش میں روز روشن کی طرح واضح حقائق کو بھی نظر انداز کیا۔

نتیجہ یہ ہے کہ اُس کے نظریات کا بالکل دیوالیہ نکل چکا ہے۔ اس کے فلسفۂ تاریخ سے جو اس کے فلسفہ کی جان ہے اس کے یار غار اینجلز تک نے بھی تفصیلات میں اختلاف کیا ہے۔ اُس کی بیشتر پیش گوئیاں پوری نہیں ہو سکیں۔ اور یہ ایسے حقائق ہیں جن کی اُس کے اپنے ماننے والوں تک نے بھی تائید کی ہے۔ مثال کے طور پر مسٹر بیر BEER کو لیجئے۔ اس نے کہا ہے "مارکس کے نظریۂ قدر اور زائد قدر کی اہمیت صرف ایک معاشرتی اور سیاسی نعرہ کی سی ہے۔ معاشی اعتبار سے ان میں صداقت کی تلاش خام خیالی ہے۔" اُس کے زبردست معتقد ہیرلڈ لاسکی نے اس کے نظریہ قدر کو ماننے سے انکار کر دیا ہے۔ اور خود اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ مارکس کا یہ نظریہ تنقید کی تاب نہیں لا سکا۔ پروفیسر الگزینڈر گرے (ALEXZANDER GRAY) نے اپنی مشہور کتاب "معاشی افکار کا ارتقا" (THE DEVELOPMENT OF ECONOMIC DOCTRINE) میں کہا ہے کہ مارکس "ان مفکرین میں سے ہے جن کے معاملہ میں کسی قسم کی تردید یا تنقید بے سود ہے۔ اُس کے نظریات دلکش افسانے ہیں۔ ان افسانوں میں حقیقت کی تلاش عبث ہے۔ جب تک ان افسانوں میں انسان کی خواہشات کا سامان مل جاتا ہے۔ جب تک کہ یہ قصص انسانی اعمال کو ابھارنے کا ایک کامیاب ذریعہ ہیں ——— یہ مفید اور کارآمد ہیں۔" مسٹر بیر نے مارکسی معاشیات کو ایک سیاسی نعرہ کے طور پر تسلیم کرتے ہوئے کہا ہے "ان جنگ پسندانہ فلسفوں کے لئے ضروری نہیں کہ وہ صحیح ہوں۔ ضرورت جو کچھ ہے وہ صرف اسی قدر کہ یہ جدوجہد کرنے والے عوام کے جذبات کی زیادہ سے زیادہ ترجمانی کریں۔" مارکس کے نظریات کی حیثیت ایک دلکش جھوٹ سے کچھ بھی زیادہ نہیں۔ اور اس جھوٹ کو اس کے ماننے والوں تک نے تسلیم کیا ہے۔

مسٹر MANS نے مارکسی نظریات پر نہایت ہی عمدہ بحث کی ہے۔ اُس کا کہنا ہے کہ مارکس نے اشتراکیت کو سائنٹفک بنیاد والی تعمیر کرنے کے زعم باطل میں اُس کا رشتۂ ہمدردی۔ ایثار اور راست بازی سے یکسر منقطع کر دیا ہے۔ دوسرے مارکس کی تعلیم میں محبت سے زیادہ نفرت کا پہلو نمایاں ہے۔ مارکس سے پہلے کے اشتراکی جذبۂ محبت اور ہمدردی سے سرشار تھے۔ لیکن اُس کے بعد نفرت، حسد اور بغض کے جذبات سے مغلوب ہو کر انھوں نے طبقاتی تقسیم کی آگ ساری دنیا میں بھڑکا دی ہے۔ اس کی تعلیم میں "رجائیت" سے کہیں زیادہ "یاسیت" ہے۔ اُس نے زندگی کو کبھی بھی اعلیٰ اور ارفع اقدار سے نہیں دیکھا۔ بلکہ اس کی نگاہ ہمیشہ انسان کے سفلی جذبات تک ہی محدود رہی۔ تیسرے مارکسی سوشلزم اب ایک فرقہ کا مذہب بن کر رہ گیا ہے۔ پہلے اشتراکیوں میں بڑی ہی وسعت قلب تھی۔ ان کی دعوت بڑی ہمہ گیر تھی۔ لیکن مارکس کے نظریات مقبول ہونے کے بعد ایک طبقہ کے لئے اس "جنت" کے دروازے ہمیشہ کے لئے بند ہو چکے ہیں۔ وہ ازل سے ہی مغضوب اور معتوب ہیں اور اس لئے ان کی اصلاح کا کوئی موقع نہیں دیا جا سکتا۔ مختصر طور پر اگر ہم مارکس کی تعلیم کا تجزیہ کریں تو ہم بلا خوفِ تردید کہہ سکتے ہیں کہ یہی وہ شخص تھا جس نے اشتراکی یا مساوات کی تحریک کا تصوریت سے رشتہ منقطع کر کے اس میں تعصب اور نفرت ایسے جذبات بھر دیئے۔ اس نے اس کی ہمہ گیری کو پیوندِ خاک کر دیا۔ یہ سفلی جذبات کہاں تک مارکس کی اپنی شخصیت کے پرتو ہیں۔ یہ ایک نہایت ہی دلچسپ بحث ہے۔ جو لوگ اس میں دلچسپی رکھتے ہیں انھیں چاہیے کہ وہ مارکس کے ایک ناقد MR. W. RUHL کی کتاب دیکھیں۔

"مارکسزم یا اسلام" کے دو آخری باب اسلامی آئیڈیالوجی کی اخلاقی بنیادیں اور اسلامی سوسائٹی کی معاشی ساخت پر مشتمل ہیں ان میں اجمالی طور پر نظامِ اسلامی کے دو اہم شعبوں سے متعلق بحث کی گئی ہے۔ کتاب کے پڑھنے سے معلوم یوں ہوتا ہے کہ فاضل مصنف نے شاید تنگیٔ دامانی کے خوف سے ان حصوں کا وہ حق ادا نہیں کیا جس کے یہ مستحق تھے۔ اور جس کی ہم سب کو توقع تھی۔ بیان میں بھی وہ پہلا سا زور دکھائی نہ دیتا۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ اسلام کے ان دونوں پہلوؤں کے صرف خدوخال بیان کرنے کی بجائے ان پر پوری تفصیل سے بحث کی جاتی۔ (بقیہ بر صفحہ ۵)

کے مسائل بیان کئے جائیں، یا حمد و نعت کے مضامین بیان کر دیئے جائیں۔ بلکہ اسلامی شعر و ادب وہ ہے جس میں زندگی کے وہ اصول سموئے گئے ہوں جن کو اسلام نے انسانیت کے لئے موجبِ فلاح گردانا ہے اور جس میں اُن تمام نظریات کی تردید کی گئی ہو جن کو اسلام نے انسانیت کے لئے موجبِ خسران شمار کیا ہے۔ اسلامی شعر و ادب وہ ہے جس میں انسانی سیرت و کردار کے اُن نمونوں کو اُجاگر کیا گیا ہو جن کو قرآن نے "انسانِ مطلوب" کا نقشہ کھینچتے ہوئے واضح کیا ہے اور اُن نمونوں کو پستی میں گرایا گیا ہو جن کو قرآن نے "انسانِ نامطلوب" کا نقشہ کھینچتے ہوئے ہمارے سامنے رکھا ہے۔ اسلامی شعر و ادب وہ ہے جو اخلاق کی غیر اسلامی قدروں سے ہٹا کر انسانیت کو اسلامی قدروں کی طرف دعوت دے۔ پھر اسلامی شعر و ادب وہ ہے جس کے پیچھے کام کرنے والی فکر نے اُن حدودِ فکر کو قبول کیا ہو جن کو اسلام نے عائد کیا ہے، اور اسالیبِ کلام کو اُن اخلاقی ضابطوں کا پابند بنایا ہو جن کو اسلام نے واجب ٹھہرایا ہے۔ اور ہاں، پھر اسلامی شعر و ادب وہ ہے کہ جو عام انسانی جذبات و حسیات کو اصل فطری رنگ میں اس انداز سے سامنے لائے کہ وہ ایک صالح زندگی کی تعمیر میں مدد دینے والے ہوں۔ مزید یہ کہ اسلامی شعر و ادب وہ ہے جو انسانی زندگی کے داخلی و خارجی مظاہر کو قرآن کے معیار پر رکھ کر دیکھے اور ان میں معروف و منکر کی چھانٹ کرے اور جس کے خلق کرنے والے اپنے ذہنوں کے دیدبان بن کر یہ محاسبہ کرتے رہیں کہ جو الہام ان پر اوس بن کر برستا ہے اس میں سے کیا بارگاہِ حق سے آ رہا ہے اور کیا کچھ شیطان کا نازل کردہ ہے!

ہم نے اسلامی شعر و ادب کے لئے جو اساسی کلمہ (SLOGAN.) مرتب کیا ہے وہ یہ ہے:-

"ایک خدا ——— ایک انسان ——— ایک نظام"!

ہمارے اس کلمہ کو سمجھ لینے پر ہی ہمارے نظریۂ شعر و ادب کو سمجھنے کا دار و مدار ہے! آیئے اس کی مختصر توضیح ہم آپ کی خدمت میں عرض کر دیں۔

"ایک خدا" کہنے سے ہماری مراد یہ ہے کہ ہم زندگی کے تمام مسائل پر اس شعور کے ساتھ نگاہ ڈالتے ہیں کہ اس کائنات کا اور خود انسانی زندگی کا ایک خدا ہے، اور وہ ایک ہے۔ ایک خدا اس معنی میں کہ وہ خالق و مالک ہی نہیں ہے، بلکہ حاکم و قانون ساز بھی ہے۔ وہ مسجد ہی کا خدا نہیں بلکہ کھیت، کارخانے، منڈی اور ایوانِ حکومت کا بھی خدا ہے، اور اس کے ضابطے جیسے نماز روزے کے لئے ہیں ویسے ہی سیاست و معیشت کے لئے بھی ہیں! پھر وہ کسی ایک زمانے اور ایک ملک اور ایک قوم کا خدا نہیں بلکہ سارے زمانوں، سارے ملکوں اور ساری قوموں کا تنہا وہی ایک خدا ہے اور اس کی خدائی اور حاکمیت اور قانون سازی سب کے لئے ایک ہی جیسی ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳) اقبال ہمارا ہے۔ اور ایک اقبال کو دیکھ کر قوم پرست کہتے ہیں کہ اقبال ہمارا ہے اور ایک اقبال کو دیکھ کر ہم کہتے ہیں کہ اقبال ہمارا ہے۔ اور آخرکار اسلام پسند اقبال نے بازی جیت لی۔ یہ فاتح اقبال اسلام پسند ادیبوں اور شاعروں کا امام ہے! اقبال نے مغرب کی مرعوبیت سے نوجوانوں کو نکالنے، اسلام سے فرار کو روکنے، اسلامی قدروں پر دلوں کو جمانے اور حرکت و گرمی کا درس دینے کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ کبھی اپنی قدر و قیمت نہیں کھو سکتیں۔

لیکن جو کام باقی تھا وہ یہ تھا کہ اسلامی اصولوں اور قدروں کو غیر اسلامی اصولوں اور قدروں کے ساتھ عملی میدان میں کشمکش کرنے کے لئے جس جذبے کی ضرورت ہے وہ فضا میں موجزن ہو اور یہ کام ہمارے حصے میں آیا ہے۔

"ایک انسان" کہنے سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ ہم زندگی کے تمام مسائل اس حقیقت کو مان کر اپنے سامنے رکھتے ہیں کہ انسانیت ایک خانوادہ ہے اور جغرافی اور نسلی تقسیمیں ان اصولوں کو تقسیم نہیں کر سکتیں جن سے انسانیت کی فلاح اور انسانیت کا بگاڑ وابستہ ہے۔ "ایک انسان" اس معنی میں کہ ہر دور، ہر ملک میں انسان کی اخلاقی و تمدنی زندگی کے زوال و ارتقا کے بنیادی اصول ایک ہیں اس کے اندر خیر و شر کے نفسیاتی سرچشمے بہرحال ایک ہیں اور ماحول کی ہزار تبدیلیوں میں بھی اس کے بنیادی مسائل ایک ہی ہیں۔ وسائل بدلتے ہیں مسائل نہیں بدلتے! مسائل کا قالب بدل سکتا ہے، ان کی حقیقت نہیں بدل سکتی۔ ایک انسان اس معنی میں کہ انسانی زندگی کے لئے ہر زمانے اور ہر ملک میں فطرت کے قوانین اور تمدن کے اچھے اور بُرے اصولوں کے نتائج ایک ہی ہیں۔ ایک انسان اس معنی میں کہ تمام ادوار اور اقوام کے لئے خدا کی طرف سے اخلاق کی جو بنیادی قدریں مقرر کی گئی ہیں وہ لازماً ایک ہی ہیں۔

"ایک نظام" کہنے سے ہمارا مقصود یہ ہے کہ ہم اپنے فکر و کلام کا آغاز اس سچائی کے ادراک سے کرتے ہیں کہ نوعِ انسانی کی ساری پیچیدگیوں کی مرکزی گرہ گوناگوں من گھڑت نظاموں کا اختیار کرنا ہے جو بہرحال محدود فکر و نظر کے ساتھ ایسے لوگوں کے بنائے ہوئے ہوتے ہیں جو انہیں اپنے مفاد کے سانچے میں ڈھالے بغیر کچھ اور کر ہی نہیں سکتے، لہٰذا انسانی فلاح کا دارومدار خدا کے اس واحد ضابطہ و نظام کی اطاعت پر ہے جسے انبیاء نے پیش کیا ہے۔ یہ نظام اپنے اصولوں کے لحاظ سے ہر دور اور ہر قوم کے لئے ہر قسم کے حالات میں بہترین ذریعۂ فلاح و ارتقاء ہے! "ایک نظام" اس معنی میں کہ اسلامی نظام کے سوا کوئی اور ایسا نظام نہیں ہے جس پر تمام اقوام کے جمع ہونے کا بعید سے بعید عقلی امکان بھی موجود ہو، کیونکہ ہر نظام کسی قوم، کسی طبقے اور کسی ملک کے مخصوص مفاد کے سانچے میں ڈھلتا ہے۔

یہ ہے ہمارے "کلمۂ شعر و ادب" کی مختصر شرح! ہمارے نیک نیت ناقدین اگر اس کلمہ کو سمجھ لیں اور وہ اسی کو معیار بنا کر ہمارے خیالات کو پرکھیں تو پھر وہ کسی صحیح نتیجہ پر پہنچ سکیں گے۔ کہنے کا مدعا یہ ہے کہ اس کلمہ سے آپ کو جو اختلاف ہو، وہ ہو! اور اس پر آپ جتنی بحث کرنا چاہیں، کریں، لیکن یہ صحیح نہ ہوگا کہ آپ اسلام پسند مکتبِ شعر و ادب کی نگارشات کا جائزہ کسی دوسرے مکتبِ ادب کی عینک سے لیں! اس سے آپ خود اُلجھیں گے اور پھر وہ اُلجھن پھبتیوں کی شکل میں ڈھل ڈھل کے سامنے آئے گی۔

اسلام پسند رفقائے شعر کی کاوشوں کے چند سالہ حاصل میں سے جو انتخاب یہاں پیش کیا جا رہا ہے وہ آپ کو بتلائے گا کہ ان لوگوں کے کچھ مخصوص اصولِ فکر ہیں، ان کے سامنے کوئی مقصد ہے اور نصب العین ہے۔ یہ انتخاب یہ بھی بتلائے گا کہ ان لوگوں نے قافیہ پیمائیاں ہی نہیں کی ہیں، انسانیت کے مسائل کو سوچا ہے، انہوں نے الفاظ کے خیالی تاج محل نہیں کھڑے کئے ہیں بلکہ واقعیت کو قریب سے محسوس کیا ہے اور حواسِ خمسہ سے محسوس کیا ہے! انہوں نے ماحول کا بھی جائزہ لیا ہے اور نفسیات کا بھی تجزیہ کیا ہے۔ پھر انہوں نے پٹی ہوئی راہوں پہ گامزنی نہیں کی بلکہ اپنے اصولوں کے چراغ جلا کر یہ جب وادیٔ تخلیق میں نکلے ہیں تو انہوں نے نئی راہیں بھی نکالی ہیں، نئے موضوعات اور نئے اسالیب بھی پیدا کئے ہیں۔ انہوں نے تشبیہات و استعارات کے سانچوں کو توڑ کر اپنی ضرورت کے مطابق بدل لیا ہے۔ پھر انہوں نے ہوائی باتیں نہیں کہی ہیں بلکہ ان کے ہر شعر کے اندر عوامی احساسات اور وقت کی روح بول رہی ہے!

یہ ایک شاندار ابتدا ہے جو ایک امید پرور مستقبل کی طرف اشارہ کر رہی ہے! کم از کم اس چند سالہ سرمایۂ شعر نے ہماری جداگانہ شاہراہِ فکر کے نقوش واضح کر دیئے ہیں!

اب مختصر طور پر ان موضوعاتِ فکر سے آپ کا تعارف کرا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے جو اسلام پسند شعراء کے ہاں ایک خصوصی نہج پر ارتقا کر رہے ہیں! ہمارا ایک موضوع تو اسلام کے اساسی اصول ہیں یعنی توحید، رسالت، معاد! ان اصولوں کو شعر میں ایک نئے انداز

سے سمو کر پیش کرتے ہوئے ہیں ماحول سے بڑی جنگ لڑنی پڑی ہے — جو اس طرح کی باتوں پر آدمی کے پیچھے تالی پیٹ دیتا ہے — لیکن آج تالیوں اور گالیوں دونوں کو روند کر مسلم شاعر آگے بڑھ گیا ہے۔ ہم نے بنیادی اصولوں کو ایک فلسفۂ حیات کی فکری بنیادوں کے طور پر پیش کیا ہے، نہ کہ حمد و نعت کے پرانے انداز میں!

ہمارا دوسرا موضوع "اسلامی تحریکِ انقلاب" ہے جو ہمارے سامنے بپا ہے اور جس کے ہم خود سپاہی ہیں۔ اس تحریک سے الگ ہو کر ہم کچھ بھی نہیں سوچ سکتے۔ یہ اسی تحریک کا فیضان ہے کہ ہمارے شعر و ادب میں حرکت، اقدام اور ارتقا کارفرما ہے۔ تحریک جس طرح "مطالبۂ نظامِ اسلامی"، "قراردادِ مقاصد" اور "انقلابِ قیادت" کے مختلف مراحل سے گذر رہی ہے اسی طرح ہمارا کاروانِ شعر و ادب بھی انہی مراحل سے ہو کے آگے بڑھ رہا ہے۔

ہمارا تیسرا موضوع انسانی سیرت و اخلاق ہے۔ یعنی ایک طرف اسلام پسند شعراء تاریخ کے حوادث کے اندر کام کرنے والے اخلاقی اصولوں کو نمایاں کر رہے ہیں، دوسری طرف موجودہ اخلاق سوز ماحول کے مفاسد سے پردے ہٹا رہے ہیں، اور تیسری طرف اسلام کے اخلاقی اصولوں کی شمعیں جلا رہے ہیں۔

ہمارا ایک موضوع معاشی مفاسد ہیں جن کو ہم روزمرہ کی زندگی میں محسوس کرتے ہیں اور جن کو ہم اسلام کے قانون اور مزاج کے خلاف پلتے ہیں۔ یہ وہ معرکتہ الآرا موضوع ہے کہ جس میں اشتراکی فکر ترقی پسندوں سے ہمارا اختلافِ فکر نمایاں ہو جاتا ہے۔ ہماری نظمیں بتائیں گی کہ اشتراکیوں کے بخلاف ہمارے نزدیک "روٹی" لازمۂ حیات ہے مگر صرف روٹی ہی نہیں، اس کے سوا کچھ اور بھی مطلوب ہے۔ ہم سرمایہ و محنت کی کشمکش کو انسانیت کا ایک خطرناک روگ قرار دیتے ہیں، مگر یہ نہیں مانتے کہ ساری تاریخ اسی کشمکش کی بنائی ہوئی ہے۔ ہمارے نزدیک تاریخ کا اصل معرکہ اسلام و جاہلیت یا خیر و شر کے تصادم پر منحصر ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہمارا چوتھا مستقل موضوع اشتراکیت ہے۔ ہم اس کے اصولوں، اشتراکی نظام کے طریقِ کار، اور اشتراکی تحریکِ انقلاب کی تکنیک سے جو اختلافات رکھتے ہیں ان کو نمایاں کرنے کے لئے یہ موضوع ہمارے لئے ناگزیر ہے۔ اسلامی تحریک وہ پہلی تحریک ہے جو اشتراکی تحریک کے سپاہیوں کو توڑ کر اپنے جھنڈے تلے لانے میں کامیاب ہوتی ہے، اس طرح کے سلیم الطبع نوجوان شعر کی زبان میں آپ کو اپنے ذہنی انقلاب کی تاریخ بتا کر یہ واضح کرتے ہیں کہ اسلام اشتراکیت کے مقابلے میں کیوں انہیں پسند آیا! یہ موضوع اس لئے بھی ضروری ہے کہ آئندہ انقلاب جس کی گواہی حالات دے رہے ہیں اس کی باگ ڈور ہاتھ میں لینے کے لئے اب یہی دو طاقتیں میدان میں رہ گئی ہیں اور ان کو باہم دگر بہت کچھ کہنا ہے۔

ہمارا پانچواں موضوع "عورت" ہے، اور اس وجہ سے ہے کہ ہم عورت کو نظامِ تمدن و معاشرت کی کل میں اس سے بالکل مختلف انداز پر فٹ کرنا صحیح سمجھتے ہیں جس انداز میں موجودہ مادی نظام اس کو نصب کرتے ہیں! عورت کو موضوع بنا کر جو کچھ ہمارے ہاں لکھا گیا ہے وہ آپ کو بتائے گا کہ جس نظامِ معاشرت کو ہم بہترین سمجھتے ہیں اس کے اصول کیا ہیں، اور اس کے بخلاف مغرب نے جو نظامِ معاشرت ہمیں دیا ہے اس کے مفاسد کیا ہیں!

ہمارا چھٹا موضوع ہمارا اپنا ماحول ہے — سب سے پہلے ملکی ماحول اور پھر بین الاقوامی ماحول! ماحول ذہنی و فکری حیثیت سے بھی، سیاسی و معاشی حیثیت سے بھی، اور اخلاقی حیثیت سے بھی! یہ ماحول ہمارے فکر سے تضاد رکھتا ہے، اس کے سانچے میں ہم کسی کروٹ فٹ نہیں ہو پا رہے، لہٰذا ہم اسے مجروح کرتے ہیں اور یہ ہمیں جگہ جگہ سے چبھتا اور کھٹکتا ہے۔ یہ چبھن اور کھٹک ہمارے

افسانوں اور شعروں میں برابر نمایاں ہوتی رہتی ہے۔

اب مستقل موضوعات کو بیان کر دینے کے ساتھ ساتھ یہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اپنے شعر و ادب کا مزاج بھی ہم واضح کر دیں۔

ہمارے شعر و ادب کے مزاج میں ایک طرح کا "تحریکی" یا حرکتی انداز کارفرما ہے یعنی یہ ایک دعوتِ انقلاب ہے نہ کہ سکون بخش نغمہ! پھر یہ زندگی اور ماحول میں پائے جانے والے "تضاد" کا ــــ اور تضاد پال رکھنے میں ہمارے مسلمانوں سے کوئی سبقت نہیں لے جا سکتا ــــ دشمن ہے! دشمن ہی نہیں، "اضداد" میں کشمکش پیدا کرتا ہے اور اسے مسلسل ہوا دیتا ہے! ــــ چاہے تضاد کسی دائرے میں ہو اور کسی بھی شکل میں ہو! اس سلسلے میں اس تضاد کو بڑی اہمیت حاصل ہے جو ہماری قیادت کے دعوائے اسلام اور اس کے طرزِ عمل میں ہے! دوسرا بڑا تضاد اسلامی نظام کا اعلان کرنے اور پھر اغیار کی ذہنی غلامی میں مبتلا رہنے اور خارجہ اثرات کو قبول کرنے کا تضاد ہے! تضاد کی ان دونوں صورتوں پر اسلام پسند شعراء نے جان توڑ حملے کئے ہیں!

پھر ہمارے شعر کا مزاج وطن پرستانہ نہیں، بلکہ اصول پسندانہ ہے اور قوم پرستانہ نہیں بلکہ انسانیت گیر ہے۔

پھر اسلام پسند مکتب، شعر کے نغمے محض جذباتیت کے نمونے نہیں بلکہ ان نغموں میں شعور کام کر رہا ہے۔

پھر اسلام پسند شعر کی نگاہ میں ایک "روشن مستقبل" ہے اور اس کی رگ رگ میں رجائیت بلکہ یقین و ایمان کارفرما ہے۔

پھر ہمارا شعر ترقی پسندوں کی مصنوعی ابہام پسندی کے بجائے اتنی سادگی رکھتا ہے کہ صحیح معنوں میں عوامی بن سکے!

اس مزاج کو سمجھ کر اگر اس مجموعۂ انتخاب کا مطالعہ کیا جائیگا تو اس کی قدر و قیمت متعین کرنے میں آسانی ہو گی۔

یہ بات ہم خود تسلیم کرتے ہیں کہ ہمارا شعر و ادب ابھی ابتدائی مراحل سے گزر رہا ہے، ہم میں سے اکثر نو مشق ہیں اور جو کہنہ مشق تھے وہ بھی اپنا فکری میدان بدلنے کی وجہ سے کچھ نو مشق سے بن کر رہ گئے ہیں۔ علاوہ بریں ہمارے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ ہم صرف چند لکھنے والوں کو لیتے اور مبتدیوں کو بالکل چھوڑ دیتے تاہم اپنی کمزوریوں کا شعور رکھتے ہوئے بغیر کسی فخر کے ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہماری کوششوں کا ماحصل ہماری توقعات سے زیادہ ہے اس انتخاب کے مرتب کو اپنے شعراء کے کارناموں پر نظر ڈالتے ہوئے پہلی مرتبہ یہ اندازہ ہوا ہے کہ ہماری متاعِ شعر بہت حوصلہ افزا ہے ــــ اتنی کہ جس کی توقع نہ تھی!

انتخاب کا کام بیشتر تنہا ایک فرد کو اپنی گوناگوں مصروفیات کے ساتھ کرنا پڑا ہے۔ اس لئے اس میں بھی کوتاہیاں ہو سکتی ہیں تاہم جہاں تک نگاہ پہنچ سکی ہے گلچینی میں دراز دستی نے کوئی کوتاہی نہیں کی۔ اسلام پسند شعراء کے علاوہ بعض ایسے اصحاب کی نگارشات بھی شامل کر لی گئی ہیں جو چاہے اسلام کی طرف نہ بڑھا اور عملاً یکسو نہ ہوں لیکن ان کے دل سے جو آواز نکلی ہے وہ اسلام کی آواز ہے۔ اس معاملے میں کسی جماعتی تعصب سے کام نہیں لیا گیا۔

ؔ واضح رہے کہ اسلامی شعر اور کافرانہ شعر کے درمیان "شعر جائز" کا ایک وسیع میدان ہے۔ شعر جائز دنیا کی ہر زبان میں [illegible] کے ہر شاعر کے ہاں پایا جاتا ہے۔ . . . . بلکہ شعر جائز ملحد اور کافر کے ہاں بھی پایا جا سکتا ہے [illegible] آتا ہی تھی ہے جتنا کسی دوسرے کا! ہم نے اپنے مجموعۂ انتخاب میں شعر جائز کو اس وجہ سے نہیں لیا کہ اس طرح میدان اتنا وسیع ہو جاتا ہے کہ ہم اس کا احاطہ نہیں کر سکتے۔

اس بات کا افسوس ہے کہ ضخامت کے ظرف نے بعض اہم اچھی نظموں کو خارج کر دینے پر مجبور کر دیا اور مزید افسوس اس پہ کہ بعض رفقا کے لئے جو جگہ نکالی گئی تھی وہ مرے سے ان سے چھن گئی۔ خواتین میں سے صرف دو کو جگہ مل سکی ہے۔

ایک اور چیز جس پر افسوس ہے وہ یہ ہے کہ "نقوش کہن" کے عنوان سے حالی، شبلی، اقبال، اکبر اور جوہر کی چند نظموں کو مرتب کیا گیا تھا جس کا منشا یہ تھا کہ قارئین کو اندازہ ہو کہ ہم سے پہلے لوگ اسلامی شعر کے میدان میں کتنا کام کر گئے ہیں۔ لیکن اس کے لئے بھی جگہ نہ نکل سکی!

پھر جناب ماہر القادری کا مقالہ "جائزہ" کے عنوان سے بہت بروقت موصول ہوا، لیکن وہ بھی شریک اشاعت نہ ہو سکا۔

اب تو ممکن یہی ہے کہ ہمارے چند اچھے تبصرہ نگار شعر نمبر کی اشاعت کے بعد اس پر تفصیلی تعارفی تبصرے لکھیں اور وہ دسمبر نمبر میں شائع ہوں۔

چراغ راہ کے مرتب کو جو لوگ اچھی طرح نہ جانتے ہوں اُن سے کسی تصنّع کے بغیر یہ گذارش ہے کہ اُس کے دل کو شہرت پسندی کے انتہائی کمینہ جذبے سے اللہ تعالیٰ نے پاک کر دیا ہے۔ وہ شہرت کو اپنے لئے ایک فتنہ اور روح کی ہلاکت کا سامان سمجھتا ہے۔ لہٰذا براہ کرم یہ بدگمانی نہ کریں کہ اس کی نظموں کی تعداد اس وجہ سے کچھ زیادہ ہے کہ وہ چراغ راہ کا مرتب ہونے کا فائدہ اٹھا رہا ہے۔ یہ بات نہیں! واقعہ صرف یہ ہے کہ راقم الحروف نے اتفاق سے اپنے اکثر رفقا کے مقابلے میں زیادہ لکھا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ بعض ایسے موضوعات کو ایسے اسالیب کے ساتھ چھیڑا ہے کہ ان کو اگر پیش نہ کیا جاتا تو شعر نمبر اسلام پسند مکتب شعر کی ترجمانی پوری طرح نہ کر سکتا۔ میں نے اپنی نظموں کو نعیم صدیقی کی نظموں کی حیثیت سے نہیں دیکھا بلکہ اسلام پسند مکتب شعر و ادب کی نظموں کی حیثیت سے دیکھا ہے۔

جس بدگمانی کے اندیشے سے یہ الفاظ لکھے گئے ہیں اس کے پیش نظر بعض تازہ اور اہم نظموں کو چھوڑ دینا پڑا ہے، ساتھ ہی اس کا بھی لحاظ تھا کہ دوسروں کے لئے جگہ کم نہ ہونے پائے۔

ادارۂ "چراغ راہ" رفقائے دار العروبہ کا ممنونِ احسان ہے کہ ان حضرات نے اپنی اہم ترمصروفیات میں سے ہمارے شعر نمبر کے لئے وقت نکالا اور عربی شاعری کی ایک جھلک دکھانے کے لئے ایک قابلِ قدر چیز مرتب کر دی لیکن افسوس کہ اس کے لئے بھی جگہ نہ نکل سکی۔

آخر میں ایک بات اور قابلِ ذکر معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ دینداری اور ادب و شعر میں بعض حالات نے مدت سے تفریق کرا رکھی ہے۔ حالانکہ وہ شعر جو مسلم ہو اس سے خود نبی صلعم نے دلچسپی لی ہے، اور حضرت عمرؓ کا تو ذوقِ شعر و ادب اپنے دور میں بہت ہی اونچا تھا۔ ذوقِ شعر سے بُعد تو بعد کے تقدس مآب حضرات نے لازمۂ دینداری سمجھا ہے!

شعر انسانی احساسات میں تحریک پیدا کرتا ہے، تخیل و تفکر کی قوتوں کو جلا دیتا ہے، استدلال کو معجزانہ اجمال کا رنگ دیتا ہے، زندگی کے تلخ حقائق اور خشک مسائل کو خوشگوار پیرائے میں پیش کرتا ہے، ذہنوں میں خیالات کے نفوذ کے لئے "وعظ" کے مقابلے میں زیادہ آسانی سے راستے پیدا کرتا ہے، اور عقلی استدلال سے مطمئن ہو جانے کے بعد جب آدمی فرائض کے سمندر کے کنارے کھڑے کا کھڑا رہ جاتا ہے تو شعر اس میں بے خطر کود پڑنے کے لئے جذبہ و وجدان کو ابھار دیتا ہے۔

بدنصیب ہیں وہ لوگ جو ذوقِ شعر سے محروم ہیں — اور مزید بدنصیب ہیں وہ جو اپنی اس بدنصیبی کو مقامِ عظمت و تقدس سمجھتے ہیں۔

نعیم صدیقی

۱۷ ستمبر ۱۹۵۱ء

۱۲۔ شاہ جمال۔ اچھرہ۔ لاہور

آسمانی ادب

(قرآن کے ادبی جمال کا انعکاس)

شعرائے جاہلیت

کیا میں تمہیں بتاؤں کہ کن لوگوں (کے دلوں) پر شیطان (اپنے پیغام لے کر) اترتے ہیں؟ ——— وہ ہر بہتان تراش معصیت زدہ پر اترتے ہیں (وہ اپنا پیغام ان لوگوں کے پردۂ سماعت پر ڈالتے ہیں، چنانچہ یہ لوگ (اپنے افکار ونظریات کے لحاظ سے) اکثر جھوٹے ہیں!

اور یہ (جاہلی) شعراء، تو ان کے پیچھے تو بہکے ہوئے لوگ ہی چلتے ہیں! کیا تم نہیں دیکھتے کہ وہ (اپنے بے اصول کیریکٹر کی وجہ سے) ہر وادی میں سر مارتے پھرتے ہیں، اور پھر یہ لوگ (کہنے کو) ایسی باتیں کہتے ہیں کہ جن کو خود عمل میں نہیں لاتے ——— سوائے ان کے کہ جو (کائنات کی بنیادی صداقتوں اور ان صداقتوں کی بنیاد پر قائم ہونے والے فکر وقانون پر) ایمان لائے ہیں، جنھوں نے (خدا کی ہدایت کی روشنی میں) نیکی (کے اصولوں) پر عمل کیا، جنھوں نے (عملی زندگی کا ہر ہر قدم اٹھاتے ہوئے) خدا کو (اور اس کے قانون کو) یاد رکھا اور جنھوں نے (ایمان اور عملِ صالح پر قائم رہنے کے لئے) ظلم سہنے کے بعد اس کی (عملاً) مدافعت کی!

سو وہ وقت دور نہیں جبکہ ظلم کرنے والے (خود) دیکھ لیں گے کہ وہ کس کروٹ گرتے ہیں!

(الشعراء ——— ۲۲۱ تا ۲۲۷)

——— + ———

شعر و شاعر

●

سید ابوالاعلیٰ مودودی

اقبال مرحوم

باقی صدیقی

احمد ریاض

الطاف حسین حالی

اسد ملتانی

شفیق فتحپوری

ماہی کرنالی

نعیم صدیقی

●

شعر!

سید ابوالاعلیٰ مودودی

"شعر اگر ناپاک جذبات سے خالی ہو اور جمالِ فطرت سے لطف اندوز ہونے کی حد تک رہے تو ناجائز نہیں ہے۔ البتہ جہاں سے حسن و عشق کے جھگڑے شروع ہوتے ہیں، عدم جواز کی سرحد آجاتی ہے۔ کیونکہ یہ چیز اپنے اندر محض لطف نہیں رکھتی بلکہ غیر اخلاقی رویہ کی طرف اس کا رجحان واضح ہے، خواہ اس پر کتنے ہی لطیف پردے ڈالے جائیں۔"

(جوابِ خط بنام عبدالقیوم فاروقی صاحب۔ کراچی
(مورخہ ۱۱ جولائی ۱۹۵۰ء)

اپنے شعر سے

اقبال

ہے گلہ مجھ کو تری لذتِ پیدائی کا
تو ہوا فاش تو ہیں اب مرے اسرار بھی فاش
شعلے سے ٹوٹ کے مثلِ شررِ آوارہ نہ رہ
کر کسی سینۂ پرسوز میں خلوت کی تلاش

ہنروران ہند

اقبال

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیّل ان کا
ان کے اندیشۂ تاریک میں قوموں کے مزار
موت کی نقش گری ان کے صنم خانوں میں
زندگی سے ہنر ان برہمنوں کا بیزار
چشمِ آدم سے چھپاتے ہیں مقاماتِ بلند
کرتے ہیں روح کو خوابیدہ، بدن کو بیدار!
ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ! بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

شعر!

اقبال

میں شعر کے اسرار سے محرم نہیں لیکن
یہ نکتہ ہے تاریخِ امم جس کی ہے تفصیل
وہ شعر کہ پیغامِ حیاتِ ابدی ہے
یا نغمۂ جبریل ہے یا بانگِ سرافیل!

مشاعـــــرہ!

باقی صدیقی

یہ کس شان سے ہال میں جلوہ فرما ہیں فن کے پرستار سارے
کہ جیسے ستارے
نکل آئیں خم ٹھونک کر دشتِ گردوں میں شب کو
حسیں ساڑھیاں بھی نگاہوں کو گرما رہی ہیں
گھنی داڑھیاں بھی نظر آ رہی ہیں
شگفتہ نظر بھی ہیں، بدحال بھی ہیں
جواں بخت بھی ہیں، کہن سال بھی ہیں
سکولوں کے لڑکے بھی آئے ہوئے ہیں۔
کوئی خوش ادا ہے۔
کوئی خوبرو ہے
غرض دیکھتا ہوں جدھر تو ہی تو ہے

+

وہ تالی بجی اور اک شاعرِ نوجواں نے
کیا عرض مطلع
غزل! اور اسٹیج پر کوئی پڑھ کر سنائے!!
ہتک یہ سخن پروروں کی
کسی نے حقارت سے کولھے ہلائے
کوئی خواب سے چونک کر جھجھلایا
کوئی مسکرایا
کوئی دق کے بیمار کی طرح کھانسا
کسی نے وہ فقرہ کہا خونِ دل تک نچوڑا
کسی نے گلا پھاڑ کر داد کا دل پہ مارا ہتھوڑا
کسی نے شرارت سے ٹیبل بجائی
غرض بات بگڑی کچھ ایسی کہ صدرِ مکرم سے بھی بن نہ آئی
دہائی مذاقِ سخن کی دہائی

+

وہ پھر ہال میں مکھیاں بھنبھنائیں
تبسم کی موجیں دلوں سے اٹھیں اور ہونٹوں تک آئیں
وہ پھر ایک شاعر بچارا
ترنم کا مارا
سخن آشنائی کے شعلوں میں گم ہے

+

وہ اسٹیج پر ایک استاد تشریف لائے
سخن میں مسلّم
خیالات پختہ، زباں بھی شگفتہ
غزل اپنی مطلع سے مقطع تلک ساری فرفر سنائی
مگر چھینک تک فن کے شیدائیوں کو نہ آئی
چلو خیر گزری
رہے چپ یہ کیا کم شرافت ہے ان کی

+

وہ اک شاعرِ خوش ترنّم نے مخصوص انداز سے مُسکرا کر
غزل اپنی گائی
ملی فن کے شیدائیوں کو خدائی
گھنی داڑھیاں لہلہائیں
حسیں ساڑھیاں مسکرائیں
جوانوں کے جذبات میں آگ بھڑکی
رگِ ذوق پھڑکی
اِدھر تان ٹوٹی
اُدھر داد کی نہر پھوٹی

+

میں قربان ذوقِ سخن پروری کے
بجا ہے اسے جس قدر داد دیجئے
انوکھے خیالوں کی تعریف کیجئے
ہر اک شعر کو غم کی تصویر کہیئے
اسے "داغ" کہیئے
اسے "میر" کہیئے
یہ فن ہے تو فکرِ روایات کیا ہے
اجی بات کیا ہے
بڑا خوبرو ہے
بڑا خوش گلو ہے

(ادبی دنیا)

—+—

طوائف اور شاعر

احمد ریاض

جہاں کا ذوقِ طوائفیت ہر اک حسیں شے خریدتا ہے
تجھے بھی مجبوریٔ طلب ہے تو زلف و رخسار بیچتی ہے
ترا تقدس، مری شرافت، نہ تیرے بس میں نہ میرے بس میں
تری حمیت کا مول چشمِ ہوس کا اک آتشیں تبسم
نہ تیرے وعدوں کی کوئی قیمت، نہ میری قسموں کی کوئی اجرت
تری جوانی لُٹی لُٹی سی، مری جوانی گُھٹی گُھٹی سی
تو نیشِ تہذیب سے ہے چھلنی میں جورِ آداب سے ہوں زخمی
تری دکاں میں ہیں تیرے اجداد کی وراثت کے تیر و نشتر

تو کیفِ نغمات بیچتی ہے میں حُسنِ افکار بیچتا ہوں
مجھے بھی مجبوریٔ طلب ہے میں اپنے اشعار بیچتا ہوں
تو روحِ مغرور بیچتی ہے، میں ذہنِ خوددار بیچتا ہوں
میں اپنی حُرمت کے موتیوں کو درونِ بازار بیچتا ہوں
تو عہد و پیمان بیچتی ہے میں قول و اقرار بیچتا ہوں
تو حُسن اور جسم بیچتی ہے میں عشق اور پیار بیچتا ہوں
تو لذتِ درد بیچتی ہے، میں لطفِ آزار بیچتا ہوں
میں اپنے ماضی کی سازشوں کے رموز و اسرار بیچتا ہوں

تو اپنے ماحول کی بھکارن میں اپنے حالات کا بھکاری
تو اپنا کردار بیچتی ہے، میں اپنا کردار بیچتا ہوں

(چٹان)

—+—

شعر کی طرف خطاب

حالی

اے شعر دلفریب نہ ہو تو تو غم نہیں — پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہو دل گداز تو
صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام — ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو
جوہر ہے راستی کا اگر تیری ذات میں — تحسینِ روزگار سے ہے بے نیاز تو
حُسن اپنا گر دکھا نہیں سکتا جہان کو — آپ کو دیکھ اور کر اپنے پہ ناز تو
تو نے کیا ہے بحرِ حقیقت کو موج خیز — دھوکے کا غرق کر کے رہے گا جہاز تو
وہ دن گئے کہ جھوٹ تھا ایمانِ شاعری — قبلہ ہو اب اِدھر تو نہ کیجو نماز تو
اہلِ نظر کی آنکھوں میں رہنا ہے گر عزیز — جو بے بصر ہیں اُن سے نہ رکھ ساز باز تو
ناک اوپری دوا سے تری گر چڑھائیں لوگ — حذو رجبان اُن کو جو ہے چارہ ساز تو
چُھپ جا اپنی سچ سے کئے جا دلوں میں گھر — او دنیا ابھی نہ کر عَلَم امتیاز تو
جو نا بلد ہیں ان کو بتا چور بن کے راہ — گر چاہتا ہے خضر کی عمر دراز تو
عزت کا بھید ملک کی خدمت میں ہے چُھپا — محمود جان آپ کو گر ہے ایاز تو
اے شعر راہِ راست پہ تو جب کہ پڑ لیا — اب راہ لے نہ دیکھ نشیب و فراز تو
کرنی ہے فتح گر نئی دُنیا تو لے نکل — بیڑوں کا ساتھ چھوڑ کے اپنا جہاز تو
ہوتی ہے سچ کی قدر پہ بیقدریوں کے بعد — اس کے خلاف ہو تو سمجھ اس کو شاذ تو
جو قدرداں ہو اپنا اُسے مغتنم سمجھ — حالی کو تجھ ناز ہے کر اس پہ ناز تو

—— + ——

جو چھپاتے ہیں حق اندیشۂ رسوائی سے — گھات میں اُن کے لگی بیٹھی ہے رسوائی بھی
+
بات سچی کہی اور انگلیاں اٹھیں سب کی — سچ میں حالی کوئی رسوائی سی رسوائی ہے

(حالی)

—— + ——

یہ شاعر ہمارے!

حالی

وہ شعر اور قصائد کا ناپاک دفتر
عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بدتر
زمیں جس سے ہے زلزلے میں برابر
مَلک جس سے شرماتے ہیں آسماں پر

ہوا علم و دیں جس سے تاراج سارا
وہ علموں میں علمِ ادب ہے ہمارا

بُرا شعر کہنے کی گر کچھ سزا ہے
عبث جھوٹ بکنا اگر نا روا ہے
تو وہ محکمہ جس کا قاضی خدا ہے
مقرر جہاں نیک و بد کی سزا ہے

گنہگار واں چھوٹ جائیں گے سارے
جہنّم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے

زمانے میں جتنے قلی اور نفر ہیں
کمائی سے اپنی وہ سب بہرہ ور ہیں
گوئیے امیروں کے نورِ نظر ہیں
ڈفالی بھی لے آتے کچھ مانگ کر ہیں

مگر اس تپِ دق میں جو مبتلا ہیں
خدا جانے وہ کس مرض کی دوا ہیں

جو سقّے نہ ہوں، جی سے جائیں گزر سب
ہو میلا جہاں، گم ہوں دھوبی اگر سب
بنے دم پہ گر شہر چھوڑیں نفر سب
جو بھٹ جائیں بہتر تو گندے ہوں گھر سب

پہ کر جائیں ہجرت جو شاعر ہمارے
کہیں مل کے "خس کم، جہاں پاک" سارے

عرب جو تھے دنیا میں اس فن کے بانی
نہ تھا کوئی آفاق میں جن کا ثانی
زمانے نے جن کی فصاحت تھی مانی
مٹا دی عزیزوں نے ان کی نشانی

سب ان کے ہنر اور کمالات کھو کر
رہے شاعری کو بھی آخر ڈبو کر

ادب میں پڑی جان اُن کی زباں سے
جِلا دین نے پائی اُن کے بیاں سے
سناں کے لئے کام اُنھوں نے زباں سے
زبانوں کے کوچے تھے بڑھ کر سناں سے

ہوئے اُن کے شعر دل سے اخلاق صیقل
پھری اُن کے خطبوں سے عالم میں ہل چل

خلف ان کے یاں جو کہ جادو بیاں ہیں — طوائف کو ازبر ہیں دیوان اُن کے
فصاحت میں مقبولِ پیر و جواں ہیں — گویّوں پہ بے حد ہیں احسان اُن کے
بلاغت میں مشہورِ ہندوستاں ہیں — نکلتے ہیں تکیوں میں ارمان اُن کے
وہ کچھ ہیں تو لے دیکے اس گون کے یاں ہیں — ثنا خواں ہیں ابلیس و شیطان اُن کے
کہ جب شعر میں عمر ساری گنوائیں — کہ عقلوں پہ پردے دیئے ڈال انھوں نے
تو بھانڈ ان کی غزلیں مجالس میں گائیں — ہمیں کر دیا فارغ البال انھوں نے

(مسدسِ حالی)

معیارِ شعر و ادب

(اسد ملتانی)

ادب کے حُسن کا معیار ہے مذاقِ سلیم — عبث ہے اس میں جدید و قدیم کی تقسیم
جو شعر زندہ و روشن ہے، جاودانی ہے — نیا ہے وہ نہ پُرانا، جدید ہے نہ قدیم
سخن وہ کہنہ کہاں جو رہا حیات انگیز — ادب نیا ہی وہ کیا جس کی جدّتیں ہوں عقیم
ظہورِ ہر گُلِ تازہ، نمودِ ہر سرِ نَو — کوئی بتائے یہ جلوے جدید ہیں کہ قدیم
حقائقِ ابدی پر جو ہو مدارِ سخن — کسی زمانے میں اُس کی نہ ہو سکے ترمیم
ہے دل کُشا اُسی انداز سے کلامِ لطیف — کلی کو کھولتی ہے جس ادا سے موجِ نسیم
وہ عام فہم تو ہو جائے، عامیانہ نہ ہو — بڑا کمال ہے مضمونِ خاص کی تعمیم
مزا تو جب ہے کہ مضمون بھی ہو پاکیزہ — فقط زباں ہی میں کیا لُطف کوثر و تسنیم
نگاہ پاک ہو کیونکر، نہیں جو آنکھ میں نم — کہاں سے آنکھ میں نم ہو جو دل نہیں ہے دو نیم
ہے کیمیا وہ ادب، جس سے زندگی بدلے — ہے سیمیا جو نظر میں رہے فقط زر و سیم

جو ہے مفیدِ خلائق وہی ادب ہے صحیح
جو مہرِ نفعِ مصنف ہو وہ کتاب سقیم

شاعرِ حق سے!

شفیق فتحپوری

شاعرِ حق! تو ذرا رفعتِ گردوں پہ اُبھر
گل و بلبل سے نکل، پست فضاؤں سے نہ کھیل

نطقِ رنگیں سے جوانوں کا لہو گرما دے
ماہ پاروں کی سکوں بخش اداؤں سے نہ کھیل!

اٹھ! ذرا حسنِ عمل، ذوقِ یقیں پیدا کر
کوچۂ یار کی مسموم ہواؤں سے نہ کھیل۔

حلقۂ گیسوئے جاناں کا گرفتار نہ بن!
ہاں گہر بار نگاہوں کی عطاؤں سے نہ کھیل

اپنے نغموں سے تو آوازِ درا پیدا کر
قائدِ دہر! تو کوئل کی صداؤں سے نہ کھیل

عالمِ نو تجھے تعمیر ابھی کرنا ہے!
جورِ محبوب سے، ساقی کی اداؤں سے نہ کھیل!

اٹھ! رفعنا لک ذکرک کا دکھا دے منظر!
شاعرِ دہر! تو بے روح دعاؤں سے نہ کھیل!

خالد و حیدر و فاروق سے لے درسِ حیات
قیس و فرہاد کی وارفتہ اداؤں سے نہ کھیل!

شاعرِ حق ہے تو مقصد متعین کر لے!
چھوڑ بے راہ روی! پست نواؤں سے نہ کھیل!

تو بھی اٹھ وقت کا پیغام بلاتا ہے شفیق!
ساقی و ساغر و صہبا کی فضاؤں سے نہ کھیل

(الانصاف)

"پیمبرانِ ادب"

عاصی کرنالی

وہی چمن، وہی منظر، وہی بہار و طرب
ہے دوستوں کی طبیعت کا ماجرا بھی عجب

نہ غم، نہ ذہن میں حالات کا پسِ منظر
بہار و گوشۂ آبِ رواں، خدا کا غضب!

وہ بجلیاں کہ جو انسانیت پہ ٹوٹی تھیں
نظر نے اُن کی چمک کو بھلا دیا یا رب!

دل و نگاہ کے عشرت کدے میں سوتی ہے
وہ آرزو کہ ہے معراجِ زندگی کا سبب

کہیں نقاب و تجلّی، کہیں رُخ و گیسو
بھٹک رہے ہیں ابھی وادیوں میں اہلِ طرب

وہ لوگ دور رہیں ماحول کے تقاضوں سے
ہے جن کی فکر کا مرکز "ادب برائے ادب"

وہ گوشِ عیش جو آسودۂ ترنم ہے
اُسے کسی کی فغانِ شبی سے کیا مطلب

وہ چشمِ مست جو ہے جنتِ بہار و جمال
الجھ سکے گی خزاں کے مشاہدات میں کب

جو لوگ میکدۂ رنگ و بو سے پیتے ہیں
اُنھیں کہو کہ بدل دیں مذاق کا مشرب

ہوئے ہیں سرد شراب و قدح کے ہنگامے
نہ اب وہ سرخوشیٔ صبح ہے، نہ عشرتِ شب

ہوا تمام وہ پروانہ و چراغ کا دور
وہ قصۂ دو نفس، وہ فسانۂ یک شب

حدودِ لالہ و گل سے گزر چکی دنیا
بدل چکا ہے مزاجِ عوام کا مذہب!

رباب و چنگ کی جنت میں اونگھنے والو
اٹھو کہ دہر میں تیغ و سناں کا دور ہے اب

جبینِ وقت کے ابھرے ہوئے نقوش پڑھو
تمام دہر ہے آتش بہ جاں فغاں بر لب

اک انقلاب کے ماحول میں ہیں غرب کہ شرق
اک اضطراب کے طوفان میں ہیں عجم کہ عرب

بگڑ رہا ہے کچھ ایسا معاشرے کا نظام
کہ زندگی کو شب و روز ہے اجل کی طلب

تمہارا فرض ادیبو! پکارتا ہے تمہیں　　اگر ملا ہے تمہیں فکر و شعر کا منصب
تلاش میں ہے زمانہ سکون و راحت کی　　تھکی تھکی سی نگاہیں، اُداس اُداس سے لب
تم اِن کو حق و صداقت کی راہ پر لے جاؤ　　کہ دور دور رہیں عرفان و آگہی سے یہ سب
جہاں کی کشمکشِ مستقل کا حل ہے یہی　　کہ ہو زمیں پہ خُدا کا نظام سب کا سب
تم اپنے فن سے زمانے کو روشنی دکھلاؤ
تمہارا فرض یہی ہے پیمبرانِ ادب

—+—
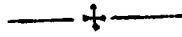
اے شعر!

نعیم صدیقی

قلب و نظر کو والۂ ایماں بنا دیا　　فکر و نظر کو تابعِ قرآں بنا دیا !

گلیوں میں خُم بہا دیئے حرمت کے حکم پر　　مے خانے کو غبارِ پریشاں بنا دیا

رندی کے مشغلے کی گرائی ہے ہم نے قدر　　اور حُبّ دیں کو فخر کا ساماں بنا دیا

راہِ سخن پہ چھائے تھے ابہام کے غبار　　اُن کو اڑا کے راستہ آساں بنا دیا

جنگل تھے فلسفوں کے ہر سُو اگے ہوئے　　کن محنتوں سے ان کو گلستاں بنا دیا

ہاں وہ حریم فن جہاں عورت کے بُت تھے　　پھر اُس کو ایک معبدِ یزداں بنا دیا

"فکرِ مریض" وہ کہ رہی "جنسیت زدہ"　　اس کے ہنر کو عار کا ساماں بنا دیا

پھر عشق کی نظر کو حجابِ حیا دیا　　عصمت میں حسن کو مہِ کنعاں بنا دیا

فرہاد و قیس کو نئی تہذیبِ عشق دی　　کتنے جنونیوں کو پھر انساں بنا دیا

حیوانیت کے تُند تقاضوں کو دی لگام　　انسانیت کو اُن پہ نگہباں بنا دیا

کتنے قصیدہ خواں تھے ہر چلتے راج کے　　پیکار گہ میں جن کو رجز خواں بنا دیا

چھیڑی ہی ہم نے کھل کے یہاں رزم کفر و دیں　　جمہور کو مقابلِ سلطاں بنا دیا

اُس لا الٰہ کو جس سے بچھڑی گئی تھی جاں　　افسانۂ حیات کا عنواں بنا دیا

پھر عصمتِ خیال کو دی زندگی نئی　　اس کے کفن کو نوچ کے داماں بنا دیا

ستر حجاب دین و سیاست میں آپڑے　　ان کو اٹھا کے دونوں کو یک جاں بنا دیا

مہریں لگی تھیں نطق پہ قانونِ جبر کی　　اور ہم نے خامشی کو بھی گویاں بنا دیا

اے شعر! تجھ پہ اپنا یہ احساں کم ہے کیا؟
کافر سے ہم نے تجھ کو مسلماں بنا دیا

(غیر مطبوعہ)

نوائے تازہ تر

(اگست ۱۹۵۱ء کے بعد)

ماہر القادری

عرشی بھوپالی

عبدالکریم ثمر

اعظم ادیب

ضیاء محمد ضیاء

شمیم جاوید

ارشد کاظمی

احمد نسیم

طالب حجازی

ناشر حجازی

ابوالرضا حجازی

ایم۔ زیڈ دل

رئیس احمد شبنم

کوثر نیازی

مسعود جاوید

آفتاب احمد

صادق القادری

سرور انبالوی

عاصی کرنالی

سرکار محمود طوروی

اسرار احمد

غلام نبی حیرت

سرمد قدیر ہاشمی

نعیم صدیقی

اُدب! اَے جوشِ غم!

ماہر القادری

محبت عرش و گردوں ساز بھی ہے
محبت فرشِ پا انداز بھی ہے!

خموشی پردہ دارِ راز بھی ہے!
یہی ظالم مگر غماز بھی ہے!

ادب اَے جوشِ غم! جوشِ تمنّا!
حریمِ دل، حریمِ ناز بھی ہے!

یہی انجام کا مارا ہوا دِل،
ہلاکِ عشرتِ آغاز بھی ہے!

سکوتِ لالہ و گل پر نہ جانا
اسی میں شعلۂ آواز بھی ہے

عزم و عمل

ماہر القادری

اسلام کا پرچم نہ جھکا ہے نہ جھکے گا
پھونکوں سے یہ فانوس بجھا ہے نہ بجھے گا

ایمان کی خاموش زبانی پہ نہ جانا
یہ شعلۂ بے باک دبا ہے نہ دبے گا

کیا لشکرِ اسلام کو اندیشۂ کثرت
خاشاک سے طوفان رکا ہے نہ رکے گا

سیلابِ حوادث ہی نہ کیوں سر سے گذر جائے
دامانِ محمد تو چھٹا ہے نہ چھٹے گا

ہے عرصۂ ہستی میں عمل ہی سے تو سب کچھ!
باتوں سے کوئی کام بنا ہے نہ بنے گا

باطل جو صداقت سے الجھتا ہے تو الجھے
ذروں سے یہ خورشید چھپا ہے نہ چھپے گا

جز ذاتِ خداوند کہ ہے دائم و باقی،
دنیا میں سدا کوئی رہا ہے نہ رہے گا

جدلی ارتقاء

عرشی بھوپالی

یہ راہی تمدّن کا یہ ارتقا کا مسافر
کبھی جہل کی تیرگی میں
کبھی علم کی روشنی میں
بڑھا اپنی منزل کی جانب
کبھی قیصریت کی تلوار بن کر
کبھی مردِ مومن کا کردار بن کر
زمیں کو مسلسل سنوارا ہے اُس نے
کبھی جنگ کی آرزو میں
کبھی امن کی جستجو میں
کبھی پیٹ کر ڈھول طبقات کا
کبھی جائزہ لے کے جذبات کا
تمدن کو پیہم نکھارا ہے اس نے
پہن کر کبھی بیڑیاں نسل اور قومیت کی
کبھی مشعلیں ہاتھ میں لے کے آفاقیت کی
ستاروں کو چھونے چلا ہے
مگر اس کا اخلاق ہر دَور میں
بدلتا رہا کروٹیں
دکھاتا رہا حال کو
یہ ماضی کی گذری ہوئی ساعتیں
بلتسر نہ آیا اِسے ارتقائے مسلسل
بدل کر نیا بھیس اُبھرتا رہا
یہ ماضی کا نقشِ قدم حال پر ثبت کرتا رہا
اسی طرح تاریخ اپنے کو دُہرا رہی ہے
یونہی حشر تک خود کو دُہرائے گی
یہ کفر اور اسلام کی کشمکش
ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی
اسی سے تو تخریب و تعمیر کا
ہے دنیا میں ہنگامہ سا اک بپا
اِسی سے مرتب ہے تاریخ ماضی و حال
اِسی سے زمانے میں جاری عروج و زوال
اِسی سے ظہورِ تمدن ہُوا
اِسی سے بیاباں گلستاں بنے
اِسی سے زمیں رشکِ جنّت بنی
اسی پر عناصر کا ہے انحصار
اسی پر نظامِ جہاں کا مدار
یہ قانونِ تکرارِ تاریخ کی جان ہے
یہی تجربات مسلسل کی پہچان ہے

نئے ہیروشیما جنم لے رہے ہیں

عرشی بھوپالی

نئے ناگاساکی کی ہے دھوم ساتھی
نئے ہیروشیما جنم لے رہے ہیں
پرانے جواری نئے داؤ لے کر،
نئی جنگ کی گھات ہیں
نکلتے ہیں میدان میں
بہت ہی سلیقے سے پانسے پھینکے ہیں
بڑی ہی قرینے سے بازی لگی ہے
خدا جانے کون اس کو جیتے
خدا جانے کون اس کو ہارے
بلا کے ہیں شاطر یہ دونوں کھلاڑی
غضب ان کی باتیں
قیامت کی گھاتیں
کوئی نام لیتا ہے جمہوریت کا
کوئی دعویٰ کرتا ہے آفاقیت کا
حقیقت میں ورنہ
، یہ ہیں نیشنل کیمپ کے نام لیوا
، یہ ہیں اپنے اپنے وطن کے پجاری
دو طبقوں میں انساں کو بانٹا انہوں نے
خدا کی زمیں کو کیا ٹکڑے ٹکڑے
انہی نے تو اڈّے بنانے کی خاطر
نئی جنگ کے
حقیقت میں، اپنی سی ترمیم کر دی
مرے ایشیا اور یورپ کی تقسیم کر دی
یہ دشمن ہیں جمہوریت کے
یہ رہزن ہیں آفاقیت کے
فرنگی فراست نے انڈے دیئے ہیں
تبہ کار، خونخوار ایٹم بموں کے
یہ انڈے سیاست نے پیہم سیئے ہیں
اب ان میں سے بچے نکلنے لگے ہیں
نئے ہیروشیما جنم لے رہے ہیں
نئے ناگاساکی کی ہے دھوم ساتھی!

★

شاہ فاروق کا جشنِ عروسی

عرشی بھوپالی

یہ کس نے پکارا کہ جشنِ بہاراں مناؤ
ہر اک موڑ کو آج دولہن بناؤ
ابھی تو خدا کا مذاق اڑ رہا تھا
ابھی آدمیت تھی نوحہ کناں

ابھی زندگی چیختی تھی
ابھی تو فضا خون برسا رہی تھی
ابھی ہر طرف موت منڈلا رہی تھی
ابھی تو نئے جیل خانے
کراہوں سے گونجے ہوتے تھے
ابھی تو نئی پھانسیاں
شہیدوں کا خوں چاٹتی تھیں
ہزاروں جیالے جوانوں کے سینے
چمکتی ہوئی برچھیوں سے ابھی چھد رہے تھے
ابھی کتنے منصور و شبلی
اجل سے گلے مل رہے تھے
ہر اک موڑ پر یہ چراغاں ہے کیسا
ہر اک گام جشن بہاراں ہے کیسا
یہ مینار کیوں جگمگانے لگے
یہ کیوں بام و در مسکرانے لگے
اندھیرا غریبی کا کیا چھٹ گیا ہے
جہنم وہ فاقے کا کیا بجھ گیا ہے
نکل آئی کیا زندگی موت کے چنگلوں سے
جیالے جوانوں کے سینوں سے نیزوں کی نوکیں
ہٹا لی گئیں کیا
سسکتی ہوئی آدمیت کی لاشیں
اٹھا لی گئیں کیا

شہیدوں کی بہنوں کا سینہ درکیا چھٹ گیا ہے
شہیدوں کی ماؤں کے ناسور کیا بھر گئے ہیں
بتاؤ خدارا بتاؤ مجھے

مرے ساتھیو!
یہ بستی ہے کیا احمقوں کی
یہ دنیا ہے کیا پاگلوں کی
جہاں زندگی کی ہنسی اڑ رہی ہے
جہاں آدمی کا مذاق اڑ رہا ہے
ابھی تو ہر اک گام پر
سسکتے ہیں انسانیت کے جنازے
ابھی تو ہر اک موڑ پر
بلکتی ہیں فاقہ کشوں کی براتیں
ابھی تو بہت سخت ہے معرکہ زندگی کا

ہزاروں بہادر جواں
بغاوت کی شمشیر کھینچے
لیے ہاتھ میں سبز پرچم
اجل پر بس اک آخری وار کرنے
بڑی شان سے آج نکلے ہیں رن میں
بھلا کس کی ہمت مقابل جو آئے
بھلا کس کی جرأت جو آنکھیں ملائے
سلگتے ہوتے خواب دم توڑتے ہیں
چراغ آج آندھی کا رُخ موڑتے ہیں

چراغ جلتے ہیں

عبدالکریم ثمر

چمن میں لالہ و گل کے چراغ جلتے ہیں — دلوں کے ساتھ ہمیشہ دماغ جلتے ہیں

ہے انتظارِ تپش ہی میں زندگی کی جلن — کسے دکھاؤں کہ سینے کے داغ جلتے ہیں

دل و دماغ کی حدت سے ہے نگہ روشن — سرِ مزارِ تمنا چراغ جلتے ہیں

تری نگاہِ کرم کو دعائیں دیتا ہوں — مگر غریب سے اہلِ فراغ جلتے ہیں

میں کارواں کو کسی اور سمت لے جاؤں — کہ مہر و ماہ کے اب تک چراغ جلتے ہیں

مقامِ شوق میں قدسی بھی رہ گئے جل کر — نظر سے دل نہیں جلتے دماغ جلتے ہیں

جلا رہا ہوں ابھی تک خیال کی قندیل — نفس نفس میں مگر دل کے داغ جلتے ہیں،

دمِ سحر مجھے شبنم کا انتظار رہا — چمن میں آج بھی لالے کے داغ جلتے ہیں،

ہماری شاخِ تمنا بھی جل گئی ہے ثمر
خزاں میں دیکھا گیا ہے کہ باغ جلتے ہیں

اشتراکیت کی پری

آعظم ادیب

میری خلوت میں وہ چپکے سے چلی آئی تھی اجنبی اجنبی خوشبوؤں کا دھارا بن کر
تنگ حالی کا لرزتا ہوا بازو تھامے
میرے دکھ درد کا معصوم سہارا بن کر
جب مرے دکھتے ہوئے جسم کو سہلاتی ہے خرمنِ روح پہ گرتی ہے شرارا بن کر
ایک احساس بجھا دیتا ہے اس کو آخر
میری نمناک سی آنکھوں کا ستارا بن کر

(۲)

ہوسِ خام کو راس آیا نہ فطرت کا لباس ہوسِ خام کو سَو روپ بدلتے دیکھا
ابھی دھارس کی ہے لوری، ابھی خونیں سازش کبھی اک ساغرِ سرشار میں ڈھلتے دیکھا
ابھی اک جوئے رواں ہے، ابھی سیلابِ عظیم کبھی آتش، کبھی لاوے میں پگھلتے دیکھا
جب بھی پایا، اسے کھنڈروں میں بھٹکتے پایا
جب بھی دیکھا تو کفِ یاس ہی ملتے دیکھا

(۳)

میرے دکھ درد میں جمہور کا دکھ درد بھی ہے مجھے احساس ہے، دکھ درد کا گہوارہ ہوں میں

آس اور پاس کے نظاروں میں کھو جاتا ہوں
اپنے ماحول کے غم سے دلِ صد پارہ ہوں میں

ہوسِ خام مگر درد کا درماں تو نہیں،
یہ غلط ہے کہ خیالات میں آوارہ ہوں میں

مجھے دکھ درد مٹانا ہے، بڑھانا تو نہیں،
اختلاطِ سحر و شام کا نظارہ ہوں میں

آنے والوں کو مبارک ہو وہ آئینِ ہستیں!
جس کے روپوش مہ و سال کا کفارہ ہوں میں

ذکر و فکر

اعظم ادیب

تری سلطنت کے نشاں اور بھی ہیں
زمیں اور بھی۔ آسماں اور بھی ہیں

تری نکہتیں عام سے عام تر ہیں
روش در روش بوستاں اور بھی ہیں

مجھے بھا گیا ہے کلی کا تبسم!
یہ مانا کہ طرزِ بیاں اور بھی ہیں

نہیں ایک تو، اور معیشت کی الجھن!
دماغ اور بھی، چیستاں اور بھی ہیں

ذرا ایک فردا کا پردہ اٹھا دے
حکایاتِ سود و زیاں اور بھی ہیں

تم اپنی حفاظت کا سامان کر لو
حرم کے لیے پاسباں اور بھی ہیں

چلو، کربلا نے پکارا ہے ہم کو
سرِ انجمن سوز خواں اور بھی ہیں

تکبیر

ضیاء محمد ضیاء

ہر بے خطا کو لائقِ تعزیر کیجیے
اہلِ جنوں کے قتل کی تدبیر کیجیے

ایمان حق پہ جن کے زمانہ گواہ ہو
دُنیا میں اُن کے کُفر کی تشہیر کیجیے

اہلِ نظر کی دہر میں تذلیل چاہیے
ہر بوالہوس کی عزت و توقیر کیجیے

اہلِ خرد ہیں میری اسیری پہ مطمئن
پھر کیوں سزائے عشق میں تاخیر کیجیے

باغی ہوں میں حوالۂ زنداں کرو مجھے
مُجرم ہوں مجھ کو بستۂ زنجیر کیجیے

میرے گلو پہ بُرّشِ خنجر کو دیکھیے
ہاں امتحانِ جوہرِ شمشیر کیجیے

حاجت نہیں ہے میری خطا کے ثبوت کی
بس میری فردِ جُرم کو تحریر کیجیے

ہر روز اک نیا ستم ایجاد کیجیے
ہر روز اپنے عدل پر تقریر کیجیے

رکھیے دیارِ پاک میں عزمِ نظامِ کفر
ارضِ حرم میں دیر کی تعمیر کیجیے

کہیے کہ میرا علم جہالت ہے سربسر
میرے ہُنر کو عیب سے تعبیر کیجیے

میداں میں بات کرنے سے پہلو بچایئے
مسند پہ بیٹھ کر مری تکفیر کیجیے

قسمت پہ چھوڑ دیجیے انجامِ کار کو
خود کو ضیاء حوالۂ تقدیر کیجیے

ردّ و قبول

ضیاء محمد ضیاء

دِل بے نصیب جلوۂ جاناں نہیں قبول
یا رب مجھے یہ خانۂ ویراں نہیں قبول

اہلِ خرد کی بات سے انکار ہے مجھے
دیوانگی کو عقل کا فرماں نہیں قبول

وحشت پہ میری عرصۂ صحرا ابھی تنگ ہے
شوریدگی کو گوشۂ زنداں نہیں قبول

اس زخمِ جاں گداز کا مرہم نہ چاہیے
ہاں دردِ عشق کا مجھے درماں نہیں قبول

توہین اس سے اہلِ جنوں کی ہے ہم نشیں!
مجھ کو رفوئے چاکِ گریباں نہیں قبول

سینہ مرا ہے داغِ تمنا سے لالہ زار
عاشق کو تیرے سیرِ گلستاں نہیں قبول

دیکھا ہے مَیں نے تیرا چلن باغباں اب مجھے
کانٹے قبول ہیں گل و ریحاں نہیں قبول

ہے فکر مجھ کو خانۂ تاریک کی ضرور
لیکن ضیائے مہر کا احساں نہیں قبول

آیا ہوں انحراف کی راہوں سے لوٹ کر
جز جادۂ اطاعتِ یزداں نہیں قبول

دل کو طوافِ درگہِ سلطاں نہیں پسند
گردن کو بارِ منتِ درباں نہیں قبول

بے زاد و راحلہ ہے ہمارا نیا سفر
اِس راہ میں ہمیں سر و ساماں نہیں قبول

گُل چیں کی دستبرد سے غنچے بھی ہیں ہلاک
کیوں نالہائے بلبلِ نالاں نہیں قبول

مجھ کو جفائے گردشِ دوراں قبول ہے
جانِ حزین و قلبِ پریشاں قبول ہے

قسمت میں میری چہرۂ خنداں نہیں تو کیا
میرے غنا کو دیدۂ گریاں قبول ہے

جلووں کو صبحِ عیش کے ٹھکرا کے آیا ہوں
میری سحر کو شامِ غریباں قبول ہے

آسودگانِ دامنِ ساحل ہیں بے مذاق
ناؤ کو میری خطرۂ طوفاں قبول ہے
آزادیاں مری ہیں زمانے کو ناگوار
یوں ہے تو مجھ کو حلقۂ جولاں قبول ہے
آتش نوا ہوں مجھ کو چمن سے نکال دو
دل کو مرے ہوائے بیاباں قبول ہے
میری زباں کو جرمِ صداقت کی دو سزا
لاؤ کہ اس کو تیغۂ بُرّاں قبول ہے
نمرود کو بھی میری بغاوت کی دو خبر
مجھ کو سزائے آتشِ سوزاں قبول ہے
جنگاہِ حق میں موت کی پروا نہیں مجھے
پہلو کو زخمِ ناوک و پیکاں قبول ہے
بازارِ عشق میں نہیں ہر بوالہوس کا کام
آئے وہ جس کو جان کا نقصاں قبول ہے

لعل و گہر کے ڈھیر لگاؤ نہ میرے پاس
مومن ہوں مجھ کو دولتِ ایماں قبول ہے

منشور

ضیاء محمد ضیاء

ساتھیو! آؤ علاجِ دیدۂ گریاں کریں
چارۂ دردو مداوائے غمِ پنہاں کریں
پاس ہے جب نوعِ انساں کے مصائب کا علاج
اس دکھی انسانیت کے درد کا درماں کریں
موت کی سرحد پہ آکر رک گیا ہے کارواں
آؤ اس کو آشنائے چشمۂ حیواں کریں
شاہراہِ زندگی پر پھر اندھیرا چھا گیا
اس اندھیرے میں طلوعِ صبح کا ساماں کریں
زرد ہے پھولوں کی رنگت اڑ گیا کلیوں کا روپ
آؤ مل کر اہتمامِ زینتِ بستاں کریں
مدتوں نظارۂ بربادیٔ انساں کیا
آج فکرِ رونقِ کاشانۂ انساں کریں
آؤ گائیں آج مل کر وحدتِ انساں کے گیت
احترامِ آدمی کا چار سُو اعلاں کریں

لائیں نفرت کے اندھیروں میں محبت کے چراغ
کفر کی ظلمت میں روشن مشعلِ ایماں کریں

کب تلک مستور ہوگا پردۂ ہائے سازِ دیں
نغمۂ توحید کو ہر گوش پر عریاں کریں

طالبانِ دید کو دیں مژدۂ دیدارِ عام
تشنگانِ حق کو مستِ بادۂ عرفاں کریں

آج ہے جن کی زبانوں پر مقدر کا گلہ
آؤ ان کو رازدانِ گردشِ دوراں کریں

پہلے کانٹوں سے نمٹنے کی ادائیں سیکھ لیں
اور پھر دل میں تمنائے گل و ریحاں کریں

پھر جگائیں سینۂ مسلم میں احساسِ خودی
ذرّے کو صحرا بنائیں قطرے کو طوفاں کریں

بزم کی رنگینیوں میں آج تک کھویا رہا
پھر دلِ مومن میں پیدا رزم کا ارماں کریں

لشکرِ حق بڑھتا آتا ہے رجز گاتا ہوا
اس کی راہوں میں متاعِ جان و دل قرباں کریں

ہاں قدم آگے بڑھاؤ اے رفیقانِ سفر
دانش و ہمت سے ہر دشوار کو آساں کریں

موڑ ڈالیں وقت کے بہتے ہوئے دھارے کا رخ
آج یعنی امتحانِ ہمتِ مرداں کریں

نعرۂ تکبیر سے ڈالیں فضا میں زلزلے
ہیبتِ حق سے دلِ ابلیس کو لرزاں کریں

مدتوں جو آستانِ غیر پر جھکتی رہیں
ان جبینوں کو شناسائے درِ یزداں کریں

رندِ بادہ مست کے چہرے سے بھی الٹیں نقاب
اور فقیہِ شہر کی صورت کو بھی عریاں کریں

عام کر دیں دولتِ دردِ جگر کو دہر میں
جوہرِ انسانیت کو آج پھر ارزاں کریں

لذتِ غم سے دلوں کو بہرہ ور کرتے چلیں
سینوں کو سرمایہ دارِ سوزشِ پنہاں کریں

٭ اب تلک شاہد ہے جس پر کوہِ فاراں کا سکوت
ساتھیو آؤ دلوں میں یاد وہ پیماں کریں

فرضِ صدارت

شمیم جاوید

(ہر اس بیگم سے معذرت کے ساتھ جس کو اس آئینہ میں اپنی شکل نظر آئے)

★

آج جلسہ میں مجھے جانا ہے
بن سنور لوں تو چلوں!
آئینہ سے ذرا دو ہاتھ ہی کر لوں تو چلوں

★

کوئی رنگین لباس آج نہیں پہنوں گی
سادہ ملبوس ہی بہتر ہوگا
یہی ساٹن کا نیا سوٹ (سفید)
آخرش۔ فرضِ صدارت ہے کوئی کھیل نہیں

★

اوہ! ڈیرسٹ ڈیرا! چلے پیو!
مجھ کو جلسہ کے لئے دیر نہ ہو جائے کہیں!
اور تم جانتے ہو!!
آخرش فرضِ صدارت ہے کوئی کھیل نہیں
زیادہ باتیں نہ کرو!!
ہاں یہ موضوع سیاست بھی بہت خوب ہے لیکن اس وقت
مجھکو جلسہ کیلئے دیر ہوئی جاتی ہے
کیا کہا "بھوک کا موضوع حسین"
آج تقریر میں بہتر ہوگا
مجھ کو احساس ہے۔ بھوکے ہیں عوام
آہ۔ بیچارے عوام!
چار۔ پینتیس ۔۔ ارے!
کٹلس کھاؤ۔ بٹر ہے۔ وہ ہے روسٹ مٹن
بیرا۔ کچھ اور سلائس لاؤ!
ہاں تو پھر بھوک کا موضوع حسین
آج تقریر میں بہتر ہوگا

★

ارے۔ یہ کیا؟ ابھی آئی ہے مجھے ترش ڈکار!
بیرا ۔۔ "ڈائجسٹ ایلیشن" لانا
مجھ کو جلسہ میں۔ ابھی جانا ہے
آخرش فرضِ صدارت ہے کوئی کھیل نہیں

(بشریہ)

نوائے تلخ

(ارشد کاظمی)

کبھی اسیرِ آشیاں، کبھی رہینِ باغباں
اسے میں زندگی کہوں، نہیں یہ زندگی نہیں

ترے نثار ساقیا! فریب خوش نما دیا
ہیں میگسار مجتمع، مگر گھٹا اٹھی نہیں

چمن میں ہے فسردگی اداس ہے کلی کلی!
بہار ناتمام ہے ابھی خزاں گئی نہیں

جو منزلوں سے بےخبر، جو راہ سے بھٹک گیا
اسے میں رہنما کہوں، کبھی نہیں کبھی نہیں

مری زباں تو کاٹ لی انہوں نے تیغِ جور سے
مری نوائے تلخ میں مگر ذرا کمی نہیں

امیرِ کارواں سنبھل کہ اب فریب کھل گیا
تری سخن طرازیوں میں کوئی دلکشی نہیں

★

فرصتِ عشق ہے کسے؟

احمد نسیم

آہیں بے سود، التجائیں فضول
زندہ رہنے کے اور ہی ہیں اصول

میری آنکھوں میں جل رہے ہیں چراغ
اُن کے ہونٹوں پہ کھل رہے ہیں جو پھول

فرصتِ عشق ہے کسے! اے دوست
ہم بھی مصروف، آپ بھی مشغول

داستانِ فراق رہنے دے
داستانِ حیات کو دے طول

تھا وہ ماضی کہ کھل رہے تھے گلاب
حال یہ ہے کہ اُگ رہے ہیں ببول

پھر براہیم کوئی پیدا کر
بن رہے ہیں نئے خدا و رسول

مردِ مومن بدل دے تیرہ نظام
اب نہ زلفوں کی نرم چھاؤں میں جھول

برق کیا ہے تری نظر کا جلال
کہکشاں کیا ہے تیرے پاؤں کی دھول

آ رہا ہے نظامِ اسلامی
اب نہ ہوگا نسیمؔ کوئی ملول

ضعفِ ایماں

طالب حجازی

راہِ یقین و صدق میں ہم پیچھے رہ گئے
جو بات منہ سے کہہ نہ سکے دل میں کہہ گئے

اتنے مقامِ شوق سے ہم گر گئے ندیم!
"توہینِ یار" سامنے آنکھوں کے سہہ گئے

جذبات سرد ہو گئے عشقِ حبیب کے
کروٹ بدل کے ولولے دل ہی میں رہ گئے

اعلان جن کے لب سے ہوا تیرے نام کا
وہ مشکلات دیکھ کے گھبرا کے رہ گئے

حاصل ہوا قرار جنہیں تیرے ذکر سے
وہ حادثاتِ دہر کی ہر چوٹ سہہ گئے

اس دور کے عجیب ہی دیکھے ادب نگار
آئی جو کوئی لہر تو سب اس میں بہہ گئے

طالب شعارِ اہلِ نظر ہے دلاوری!
دل کو لگی جو بات اُسے ڈٹ کے کہہ گئے

کارکنانِ تحریکِ اسلامی

ناشر حجازی

اربابِ ستم مشقِ ستم کرتے رہیں گے
جو کام ہمارا ہے وہ ہم کرتے رہیں گے

ہر شعبے میں سر کفر کا خم کرتے رہیں گے
ایثار جو اربابِ ہمم کرتے رہیں گے

کٹ جائیں گے ہم حرمتِ اسلام کی خاطر
مٹ مٹ کے فزوں شانِ حرم کرتے رہیں گے

جب کفر کا جی چاہے ہمیں آن پکارے
ہم دیں کے لئے تیغ علم کرتے رہیں گے

میدان میں ہے توحید تو اس دور کے آذر
تخلیق نئے اور صنم کرتے رہیں گے

لازم ہے یہاں جاریٔ دستورِ شریعت
رد اس کو بہت قیصر و جم کرتے رہیں گے

ہم نقش گرِ صورتِ احساس ہیں ناشر
محسوس جو ہوتا ہے رقم کرتے رہیں گے

خونِ تمنّا

ابوالوفا حجازی

ہمیں بہار کے نغمے سناتے جاتے ہیں!
خزاں کے طور چمن سے تو پائے جاتے ہیں
گلاب چاک گریباں ہے، لالہ نفتہ جگر!
چنار آگ میں غم کی جلاتے جاتے ہیں
کہاں کے سرو و صنوبر کہاں گلاب و سمن؟
ابھی زقوم و مغیلاں اُگاتے جاتے ہیں
روِش روِش پہ بسیرا لیئے ہیں زاغ و زغن
قفس میں قمری و بلبل بٹھاتے جاتے ہیں
جُھلس رہی ہے مسلسل سموم کلیوں کو
یہ باغباں مگر مسکرائے جاتے ہیں
ہمارا خونِ تمنّا یہ رنگ لایا ہے
سرور و کیف کے ساغر لنڈھائے جاتے ہیں
تلاش کرتے ہیں جو رنگ و بو یہاں اُن کو
اُفق پہ خون کے دھبّے دکھائے جاتے ہیں
یہ مان جاؤ بہاریں ہی جلوہ گستر ہیں
حقیقتوں کے فسانے بنائے جاتے ہیں
وہ جیسے شاطر و ساحر ہم ایسے ہی سادہ
فریب اُن سے لگاتار کھائے جاتے ہیں

کمالِ ضبط

دِل

وہ میرے گھر میں گریہ جو ہو گئے ہوتے
تو ہر نگاہ میں موتی پرو گئے ہوتے[1]
کمالِ ضبط نے ہم کو بچا لیا ورنہ
ہمارے اشک ہمیں کو ڈبو گئے ہوتے
جو قسمتوں سے کیا اس نے خواب کا وعدہ
نصیب سے نہ ہوا یہ کہ سو گئے ہوتے
تمہارے پردہ میں پردہ ہے ضبط کا ورنہ
ہزاروں وادیٔ حسرت میں کھو گئے ہوتے
دعائیں کرتے ہیں گھائل تمہارے ناوک کے
کہ جتنے زخم ہیں ناسور ہو گئے ہوتے
وہاں پہ گرمیٔ محشر سے ہم نہ گھبراتے
یہیں سے بیج جو نیکی کا بو گئے ہوتے

---

[1] شاعر کا اصل مصرع یہ ہے: "تو بال بال میں موتی پرو گئے ہوتے" (ادارہ)

حسنِ مستور

رئیس احمد شبنم اکبرآبادی

تیری جراٴت نے مجھے اُسے پردہ در حیراں کیا — نفسِ امّارہ پہ تُو نے ہوش کو قرباں کیا
کر کے قرآں کو نثارِ مصحفِ رُوئے بتاں — چاک بدبختی سے تو نے پردۂ نسواں کیا

دستِ قُدرت نے کہیں بھی حُسن کو عُریاں کیا؟ — ابر میں پانی تو پتھر میں شرر پنہاں کیا
مُشک کو نافے میں رکھا اور بُو کو پھول میں — پھول کو کانٹوں میں رکھ کر حفظ کا ساماں کیا
رکھا گوہر کو صدف میں سیم و زر کو کان میں — جب کبھی باہر نکالا در بدر حیراں کیا
ایک کو پیپا کھرل میں سنگدل عطّار نے — ایک کو زرگر نے لے کر نذرِ آتش داں کیا
چادرِ شب میں لپیٹا نازنینِ ماہ کو! — خیمۂ افلاک میں سُورج کو آویزاں کیا
استخواں کو پوست میں رکھا رگوں میں خون کو — قلب کو سینہ کے اندر مرکزِ ایماں کیا
کاسۂ سر کو بنایا مسکنِ فہم و ذکا — مردمِ دیدہ کو قیدِ پردۂ مژگاں کیا
لفظ میں معنی کو رکھا اور زباں میں نطق کو — راگ کو باجہ میں رکھ کر کیف کا ساماں کیا
وانۂ بے پردہ سے کی تیز منقارِ ہوس — بیج کو مٹی میں ڈالا سنبل و ریحاں کیا
صانعِ قدرت نے غافل! خود بھی اپنے حُسن کو — برگ میں، گُل میں، شجر میں، شاخ میں پنہاں کیا
دیدۂ مخلوق سے مستُور رکھا نورِ ذات — طالبانِ دید کو وقفِ غمِ حرماں کیا

حُسن کی ہر اک ادا جب اس طرح مستور تھی — حُسنِ زن کو تو نے ظالم کس لیے عُریاں کیا
رکھ دیا بازار میں لا کر جمالِ حُور کو — معنیٔ پنہاں کو تُو نے زینتِ عنواں کیا

باز آ! برباد مت کر غیرت و ناموسِ قوم
تو نے جنسِ بے بہا کو کس قدر ارزاں کیا

بغاوت

کوثر نیازی

(ایک طاغوتی ملازمت چھوڑنے کے بعد)

لوگ کہتے ہیں کہ کم عقل ہوں مجنوں ہوں میں
مَیں نے کیوں اتنے زر و مال پہ یوں ٹھوک دیا
مَیں نے کیوں راحت و آرام پہ لعنت بھیجی
مَیں نے کیوں غربت و افلاس کو خود مول لیا

میری رگ رگ میں ہے اربابِ غرض سے نفرت
مَیں رہوں اُن کا وفادار یہ کیسے ہو گا؟
میرے اسلام کا ہر وقت اُڑائیں جو مذاق
مَیں رہوں اُن کا نمک خوار یہ کیسے ہو گا؟

اے! اِس راز سے واقف ہے نہ مُلّا نہ فقیہہ
عہدِ طاغوت میں جینے سے ہے مرنا اچھا
جس میں اسلام کا حلقوم ہو زیرِ خنجر
ایسے ماحول میں تو جیت سے ہرنا اچھا

میرا اعلان ہے اَے حرص و ہوا کے بندو!
اب سے مَیں ظلم کا دربار نہ ہونے دونگا
دینِ احمدؐ کے قوانین سے چڑنے والو!
جانبِ کفر تگ و تاز نہ ہونے دونگا

ابنِ آدم کو ڈسیں ہر سُو زر و سیم کے ناگ
اور میں سکوں کی جھنکار میں کھویا ہی رہوں
میری بہنوں کا لٹے ملک میں ہر سمت سہاگ
اور مَیں لطف سے آرام سے سویا ہی رہوں

مَیں جہاں بھر کی مشقت کو سہوں گا لیکن
آستانوں پہ کروں گا نہ جبیں فرسائی
مجھ کو منظور ہے افلاس میں جاں دے دینا
ابنِ آدم کی نہ مانوں گا مگر میں شاہی

وہی ساغر، وہی مینا

مسعود جاوید

"ابھی تک ہے وہی مطرب، وہی ساقی
وہی ساغر، وہی مینا، وہی قلقل ہے
وہی محفل، وہی شانِ تغافل ہے
ابھی تک ہے وہی تشنہ لبی باقی
کبھی تو بے قراری کو قرار آئے
نگاہ مول کی آخر خامیاں کب تک
خرد کی پے بہ پے ناکامیاں کب تک
کبھی تو روئے گیتی پر نکھار آئے

ابھی باطل کو دنیا سے مٹانا ہے
شرارہائے جنوں سے کھیلنا ہوگا
رہِ حق میں بہت کچھ جھیلنا ہوگا
ابھی اَے دوست، پاکستاں بنانا ہے
وہ پاکستاں کہ جس کی لَے حجازی ہو
فرنگی ہو، نہ رُوسی ہو، نہ نازی ہو

حُسنِ سیرت کے بغیر

مسعود جاوید

زندگی، بے چارگی ہے عزم و ہمت کے بغیر
عزم و ہمّت بھی ہیں بے معنی صداقت کے بغیر

تو گرفتارانِ آزادی، یہ آزادی نہیں
امن و آزادی ہیں اک دھوکا خلافت کے بغیر

درد و داغ و اضطراب و اشک ہیں میرے رفیق
زندہ ہوں غیروں میں اپنوں کی رفاقت کے بغیر

رودِ موسیٰ کے کناروں کی وہ شادابی کہاں
دِل، لبِ راوی پہ تشنہ ہے محبت کے بغیر

باوجودِ نزہت و رنگ و نزاکت جیسے پھول،
دلکش و جاذب نہیں ہوتا ہے نکہت کے بغیر

بس یونہی اَے تاجدارِ ناز و حسنِ بے مثال
حسنِ صورت بے نمک ہے حسنِ سیرت کے بغیر

تیرہ صدیوں کے بعد

مسعود جاوید

بھولنے والے یاد آتے ہیں —— تارے پلکوں پہ جھلملاتے ہیں

جو نگاہوں میں آ نہیں سکتے —— وہ مرے دل میں کیوں سماتے ہیں

کیا ستم ہے کہ کوئی مرتا ہے —— اور وہ ہیں کہ مُسکراتے ہیں

رہروِ رہگذارِ عشق و جنوں! —— چوٹ کھا کر بھی مسکراتے ہیں

میکدے کی روش بدلنی ہے —— خُون پیتے ہیں، مے پلاتے ہیں

تیرہ صدیوں کے بعد اہلِ نظر
پھر سے ہم انقلاب لاتے ہیں

اُتار پھینک!

آفتاب احمد۔ بی کام

(۱)

بجھے بجھے سے ہیں دنیائے رنگ و بُو کے چراغ — کہ جبر و ظلم سے ہے سرد زندگی کی بہار
کسی کے رُخ پہ مچلتی ہے عشرتوں کی کرن — کسی کی رُوح کو ڈستے ہیں سسکیوں کے شرار!

(۲)

اُتار پھینک یہ ذلت کا طوقِ پارینہ — کمینہ کیش خداؤں کی بندگی کب تک!
شکستِ رُوح کی ذلت سے موت اچھی ہے — گھٹی گھٹی سی فضاؤں میں زندگی کب تک!

وہ فقر اور یہ فقر!

سرور انبالوی

(تضمین بر اشعار علامہ اقبالؒ)

(۱)

اک فقر سے آتی ہے لادینی و بے پیری — اک فقر ہے نامردی، اک فقر صنم گیری
اک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری — اک فقر سے کھلتے ہیں اسرارِ جہانگیری

(۲)

اک فقر ہے کرداری، اک فقر ہے تقدیری — اک فقر حق اندیشی، اک فقر ہے تزویری
اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری — اک فقر سے مٹی میں خاصیتِ اکسیری

(۳)

اک فقر ہے تخریبی، اک فقر ہے تعمیری — اک فقر سکھاتا ہے بندے کو جہانگیری
اک فقر ہے شبیری اس فقر میں ہے میری — میراثِ مسلمانی سرمایۂ شبیری!

ایک راہی اور ستارہ

صادق القادری

اے کہ گردوں پہ چمکتا ہوا تارا ہے تو
کتنی ہی ڈوبتی نبضوں کا سہارا ہے تو

صدفِ چرخ کے سینے میں چمکتا ہے تو
ظلمتِ شب کی نگاہوں میں کھٹکتا ہے تو

آسماں پر تری تنویر سے رعنائی ہے
تیرے پرتو سے مجھے راہ نظر آئی ہے

تو نہ ہوتا تو یہیں رات بسر ہو جاتی
اپنی منزل کی تمنا میں سحر ہو جاتی

کاش میں بھی یونہی اک نور سراپا ہوتا!
میرے بھی دم سے زمانے میں اجالا ہوتا

میں بھی گردوں پہ چمکتا ہوا تارا ہوتا
کسی بھٹکے ہوئے راہی کا سہارا ہوتا

سن کے یہ بات ستارے نے کہا اے ناداں
سب سے افضل ہے تری ذات کہ تو ہے انساں

آ کہ تجھ پر ترے اسرار کو ظاہر کر دوں
نور جو تجھ میں ہے پنہاں وہ اجاگر کر دوں

شب کا محتاج ہوں میں دن سے مجھے کام نہیں
اور تیرے لئے قیدِ سحر و شام نہیں

مجھ پہ ظلمات کا سایہ بھی تو چھا جاتا ہے
کانپ اٹھتا ہوں جو بادل کا خیال آتا ہے

زندگی یہ تو بتا کیسے بسر کی تو نے؟
کیا کبھی اپنی حقیقت پہ نظر کی تو نے؟

دل وہ ذرہ ہے اگر اس میں چمک آ جائے
اس کے انوار سے خورشید بھی شرما جائے

ہاں مقدر سے ترے دل جو ترا دل بن جائے
تیرا ہر نقشِ قدم رہبرِ منزل بن جائے

پھر زمانہ تری رفتار کی تقلید کرے
تیری باتوں پہ چلے تیرے اشاروں پہ پھرے

آپ بیتی!

نہ کام دیگا تَحمُّل، نہ نالۂ شب گیر
کہ ہے بہت سے مسائل کا حل فقط شمشیر

جہاں میں کشمکشِ کفر و دیں ضروری ہے
کہ جاگتے ہیں اسی طرح اُمتوں کے ضمیر

اثر تو قلب کی آواز کا نتیجہ ہے
خروشِ بانگِ اذاں ہو، کہ نعرۂ تکبیر

تم ایک فلسفۂ زندگی پہ غور کرو
کلی کے خون سے ہوتی ہے باغ کی تعمیر

ہمارے فکر کا معیار کس قدر ہے بلند
یہ شاعری، یہ فلسفے، یہ شوخیٔ تحریر

گلوں کے ساتھ تعاون کیا ہے کانٹوں نے
چمن کی ورنہ مکمل نہ ہو سکی تصویر

یہ زندگی کے اندھیرے، یہ عقلِ بے توفیق
اُلجھ گئی ہے زمانے کے خواب کی تعبیر

اگر ہو ملتِ خالد، تو نوکِ خنجر سے
جبینِ وقت پہ کچھ فیصلے کرو تحریر

ہے تیغ میری نظر میں وہ آخری منطق
جو دم میں کھول کے رکھ دے گی عقدۂ کشمیر

عاصی کرنالی

چلا قافلہ

ضیا محمد دہلوی

(۱)

چلا وادیٔ شوق میں قافلہ
نیا جوش لے کر نیا ولولہ
اُٹھا بحر در بحر وہ چھاتا چلا
زمانے کو ٹھوکر لگاتا چلا
دیے ہر قدم پر جلاتا چلا
نئی رہگذر اک بناتا چلا
نیا جوش لیکر، نیا ولولہ
بڑھا وادیٔ شوق میں قافلہ

(۲)

چلا وادیٔ شوق میں قافلہ
بڑا ہی جگر ہے بڑا حوصلہ
حوادث کے طوفاں سے لڑتا ہوا
مصائب کی زد سے گذرتا ہوا
عزائم کے بل پر اُبھرتا ہوا
سوئے منزلِ شوق بڑھتا ہوا
بڑا ہی جگر ہے بڑا حوصلہ
بڑھا وادیٔ شوق میں قافلہ

(۳)

چلا وادیٔ شوق میں قافلہ
پڑا عالمِ پیر میں زلزلہ
وہ دیکھو زمانے میں ہلچل مچی
پڑی قصر و ایوان میں کھلبلی
بتوں کی خدائی کی جڑ ہل گئی
وہ تقدیر پانسہ پلٹنے لگی
پڑا عالمِ پیر میں زلزلہ!
بڑھا وادیٔ شوق میں قافلہ

حسنِ ازل

اسرار احمد

جانا پڑا تھا جن کے لیے در بدر مجھے — آخر کو اپنے دل میں ہی آئے نظر مجھے

میں بھول جاؤں کون و مکاں کی تجلیاں — کیسا غمِ حیات وہ مل جائیں گر مجھے

آنکھیں کھلی ہوئی ہیں پہ آتا نہیں نظر — دنیا سمجھ رہی غلط دیدہ ور مجھے

اُن کو میرا خیال ہو آتا نہیں یقیں! — دھوکا نہ دے رہا ہو دلِ خیرہ سر مجھے

وہ برقِ حسن اور سیہ خانہ نیاز — یہ کیا دکھا رہا ہے فریبِ نظر مجھے

تا شاد چشمِ دل پہ لٹا دوں غمِ مآل
آئے نظر جو حسنِ ازل جلوہ گر مجھے

دعوتِ حق

غلام نبی حیرت

نہ خنجر ادا ہم معنیٔ پیغام کرتے ہیں — رہ و رسمِ شہیدِ کربلا کو عام کرتے ہیں

شرف انساں کو مخلوقات میں بخشا گیا اتنا — کہ مہر و ماہ و انجم اس کی خاطر کام کرتے ہیں

اقامت دین کی مقصد ہو جن کی زندگانی کا — وہ مردانِ خدا دنیا میں کب آرام کرتے ہیں

ڈرا سکتی نہیں دار و رسن کی سختیاں اُن کو — شہیدانِ وفا تو زیرِ خنجر کام کرتے ہیں

ذرا میرے حریمِ ذوق میں آ کر تماشا کر — رہِ اُلفت کا یُوں آغاز کون انجام کرتے ہیں

عجب دستور سازی ہے عجب آئیں طرازی ہے — نظر ہے کفر پر یا ورد دعویٔ اسلام کرتے ہیں

کہو اربابِ باطل سے نہ روکیں راہِ دینِ حق — غلامانِ محمد بحر و بر کو رام کرتے ہیں

بھلا اُمید کیا ہو اُن خداوندانِ ملت سے — جو میخانہ میں صبح اور رقص گاہ میں شام کرتے ہیں

امامت اہلِ باطل کی نظامِ حق میں کیا معنی — نتیجہ کچھ بھی ہو لیکن ہم اپنا کام کرتے ہیں

اگر کشمیر لیتا ہے حریرِ و پرنیاں چھوڑو! — مجاہد آتشِ نمرود میں آرام کرتے ہیں؟

اِدھر خطرے کی گھنٹی بج چکی محرابِ مسجد سے — اُدھر دیر و کلیسا شور بے ہنگام کرتے ہیں

اذاں تو ہو چکی ہے اب نمازِ عشق کی حیرت
مجاہد سر بکف ہو کر صلائے عام کرتے ہیں

کوہِ یورال سے جاپان تلک

احمد ندیم قاسمی

دیکھ لو سرخ سویرا جاگا
اور دنیا کا المناک اندھیرا بھاگا
مل گئی ظلم سے آدم کو نجات
کوہِ یورال سے جاپان تلک
جنتِ سُرخ کی اک وادی ہے
جنت سرخ سے بھی اور پرے
یعنی اُتر کے بیابانوں میں
برف زاروں میں کہستانوں میں
اک جہنم بھی بنایا ہم نے
جہاں انگارے نہیں، یخ کی سلیں جلتی ہیں
آگ کے شعلے نہیں، برف کے طوفاں ہیں جہاں
بورژواؤں پہ جہاں ہوتا ہے پر ہول عذاب
اس طرح جنت فردوس و جہنم، دونوں
رحم اور قہر کی تصویریں ہیں
کوہِ یورال سے جاپان تلک

~~~

وہ جہنم جو بنایا ہم نے
برف زاروں میں کہستانوں میں
جنتِ سُرخ کے آگے کیا ہے
سرد و خاموش بیاباں ہیں تو ہے امن و اماں
بورژوا چین سے آلام سہے جاتے ہیں
کوئی ہنگامہ نہیں، موت ہے، خاموشی ہے
جنتِ سُرخ میں رونق کا سماں ہے انہیں سے ورنہ

زندگی تو کبھی خاموش نہیں رہ سکتی
جنتِ سرخ کوئی سرد جہنم تو نہیں
جہاں انگارے نہوں، برف کی چٹانیں ہوں!
آگ کے شعلے نہوں، برف کے طوفاں ہوں جہاں!
جنتِ سرخ تو ہنگاموں کی اک دنیا ہے
”ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی“

~~~

اس کو تم سُرخ جہنم نہ کہو
زندگی تو کبھی خاموش نہیں رہ سکتی
نغمۂ ٹینک ہے، موسیقیٔ بم ہے ہر سُو
آگ اور خون کے گلزار سجائے ہم نے
ساحلِ وانگا پہ ”واڈکا“ کا دور چلے
بورژواؤں کے بدن آگ میں بھونے جائیں
نغمۂ ٹینک ہو، موسیقیٔ بم ہو ہر سُو
اور آبادیوں کو راکھ بنایا جائے
آگ اور خون کے گلزار سجائے جائیں
کوہِ یورال سے جاپان تلک

~~~

اور چیچم کا وہ فاعدن، وہ ”ڈالر“ کا سخی
جس کی برکت سے زمیں اپنی ہے جنت سے بلند
اس کا آئینِ جہاں باقی تو اک نعمت ہے
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خوں میں!

گر جہاں پر نہ ہو طاری طبقاتی بحران
سرخ جنت کے لئے صور نہ پھونکا جائے
ایسے قارون تو نعمت ہیں ہمارے حق میں
ہے جو فتنہ تو وہی ایک نظامِ اسلام
مسجدوں میں رہے محبوس یہ اسلام تو خوب
زندگی کا یہ نظامِ ہمہ گیر
ایشیا کے کسی گوشے میں کہیں جی اُٹھے
وہ حقیقت کہ جو ڈالر کے عوض بک نہ سکی
جنتِ سُرخ کو اک خواب بنا سکتی ہے
مسجدوں میں رہے محبوس یہ اسلام تو خوب!

~~~

شکر ہے، اٹھے ہیں کچھ لوگ قیادت کے طفیل
تاکہ اسلام کو محبوس ہی رکھا جائے
شکر ہے لرزہ براندام ہیں ڈالر کے اسیر
کہیں اسلام نہ بن جائے نظامِ ہمہ گیر
شکر ہے شکر کہ اسلام رہے گا محبوس
جنتِ سرخ کبھی خواب نہیں بن سکتی
نغمۂ ٹینک ہو، موسیقیٔ بم ہو ہر سُو!
اور آبادیوں کو راکھ بناتے جاؤ!
آگ اور خون کے گلزار سجاتے جاؤ
کوہِ یورال سے جاپان تلک

~~~

(رشا یمن)
~~~

کہاں گئی وہ حمیّت؟

نعیم صدیقی

اُڑی وہ گرد، وہ حرکت ہیں آئے کچھ سائے — بکھر رہے ہیں فضاؤں میں بجھے بجھے چہرے

بلاکشوں کا نیا قافلہ نکل آیا — خود اپنے دیس کے کچھ رہزنوں کے نرغے سے

یہ بوڑھے باپ، یہ مائیں، یہ بیٹیاں، بیٹے! — یہ تشنگی سے ہیں بیتاب بھوک کے مارے

گھروں کو چھوڑ کے، لُٹ پٹ کے، بچ کے آئے ہیں — کہ موت بیت گئی اِن پہ زندگی کے لیے

حدودِ کفر سے ایماں بچا کے لائے ہیں — بغیر اس کے جو کچھ تھا وہ سب لُٹا آئے

اِک ایک اشک نچوڑ آئیں آنکھیں صلیبوں کی — غنیمت! اِن کے تنوں پر جو رہ گئے کپڑے

عدو کے جبر کے مظہر، یہ صبر کے پیکر! — یہ آدمی ہیں کہ بربادیوں کے افسانے

کسی کی سانس میں گرہیں، کسی کی آنکھ میں اشک — کوئی زبان سے چیخے، کوئی نگاہوں سے!

وہ ایک دخترِ ملّت کہ جس سے پوچھتے تو — بہاتے اشک مگر مُنہ سے کچھ بھی کہہ نہ سکے

غریب ماں نے بالآخر کہا تو اتنا کہا — "وہ لے گئے اسے زیور اُتارنے کے لیے

تمام رات تلاشی میں اِسکی بیت گئی — ستارے شرم سے آنکھوں کو میچتے ہی رہے

قسائیوں نے کیا قیمہ رات بھر اس کا — اُگل دیا اسے مذبح نے صبح پانچ بجے"

وہ آبرو کہ جو اسلام کی امانت تھی — اسے وہ زخم لگے ہیں کہ جن سے خون رسے
معاملہ یہ نہیں اک جوان بچی کا! — اُڑے ہیں پُرزے تو نسوانیت کے آنچل کے
تمام قوم کی توہین کی ہے وحشت نے — تمام قوم کی عصمت پہ آئے ہیں چرکے
بڑے غیور جو بنتے تھے اُن سے عرض کروں — کہ مر گئے ہیں کدھر آج آپ کے نعرے؟
کہاں گئی وہ حمیت کہ ناز تھا جس پر؟ — ہزار سال سے جس کے یہاں رہے چرچے
دوبارہ جاگ اُٹھی رُوح راجہ داہر کی — کدھر گئے کہ جو وارث تھے ابنِ قاسم کے؟
تمہارے عہدہ و منصب کی خیر ہو، یارب! — تمہاری جیبوں کی رونق بنے رہیں سکّے!
تمہارے رقص گھروں کی ہما ہمی قائم — تمہاری محفلِ بادہ میں یونہی جام چلے
جئیں تمہارے سنیما گھروں کے ہنگامے — تمہارے ریڈیو گھر سے رواں رہیں نغمے
کسی کی دخترِ معصوم کی فغانِ خموش — ہے ایک حشر، تمہاری مگر بلا جانے!
بہت ہے اتنا نکلیے گلے میں ڈال کے ہار — خطاب کیجیے، یا اک بیان دے دیجے
خدا کا شکر کہ ایسے نہیں عوام کہ جو — پکڑ کے آپ کا دامن محاسبہ کرتے
اِک اور شے ہے جسے کہتے ہیں خدا کی گرفت — مگر یہ بات ہے مُلّا کی، کون اسے سوچے!

یہ بات رہتی ہے آخر میں غور کے قابل!
عدو کے سامنے کیسے اٹھاؤ گے دیدے؟

سیفٹی راج کے کارپردازوں کے نام

نعیم صدیقی

(ہفتہ وار "جہانِ نو" کراچی کی اشاعت معطل کرنے پر)

میرے افکار سے
میری گفتار سے
میرے اشعار سے

امن کی یہ فضا ساری خطرے میں ہے — مملکت کی بقا ساری خطرے میں ہے
ضبط، نظم اور قانون خطرے میں ہے — پوری تہذیبِ موزون خطرے میں ہے

صاف کہہ دوں اگر
تو ہے شکلِ دگر

جانے کیوں میر و سلطان خطرے میں ہیں — جانے کیوں ظلِ سبحان خطرے میں ہیں
عیش و عشرت کے ایوان خطرے میں ہیں — کبر و شوکت کے سامان خطرے میں ہیں
اُن کی عزت کے اہرام خطرے میں ہیں — ان کی عظمت کے اصنام خطرے میں ہیں
میری "مقبول" سرکار خطرے میں ہے — جانے کیوں تخت، دربار خطرے میں ہے
ہر جگہ چور بازار خطرے میں ہے — سارا ہی کالا بیوپار خطرے میں ہے
کتنا صیاد و گلچیں کو احساس ہے — آج پورا چمن زار خطرے میں ہے
میری رجعت پسندی کے چرچے ہوئے — نغمہ و زخمہ و تار خطرے میں ہے
بے حیائی کے ارمان نکلے کہاں! — مجھ سے تہذیبِ بدکار خطرے میں ہے
اپنی تاریک ذوقی کی کھالوں قسم — حُسن کا رقصِ پُرکار خطرے میں ہے

میرے افکار سے
میری گفتار سے

میرے اشعار سے

شیشۂ و بادہ و جام خطرے میں ہے
جنتِ بادہ آشام خطرے میں ہے

میری آواز میں ہے بغاوت کی بُو
پنجرہ و دانہ و دام خطرے میں ہے

اک قیامت ہوا نعرہ لا الٰہ
لذتِ عشقِ اصنام خطرے میں ہے

میرے قرآن و سنت کے اسلام سے
حکمرانوں کا اسلام خطرے میں ہے

تاج خطرے میں ہے
راج خطرے میں ہے
باج خطرے میں ہے
جانے کیا اور کیا
آج خطرے میں ہے

مصلحت بن گئی حکمراں کی زباں
کتنا جادو بھرا ہے طریقِ بیاں

میرے اذکار سے
میری گفتار سے
میرے اشعار سے

امن کی یہ فضا ساری خطرے میں ہے
مملکت کی بقا ساری خطرے میں ہے

ضبط، نظم اور قانون خطرے میں ہے
پوری تہذیبِ موزون خطرے میں ہے

اس لئے میر و سلطاں سے یہ عرض ہے
جبر و قہر و ستم آپ کا فرض ہے

میری یہ کائنات مداد و قلم
ایک فتنہ ہے، اس کو دبا دیجئے

مثلِ سقراط میرے خیالات کو
جامِ زہرابِ مہلک پلا دیجئے

میرے اشعار مجرم ہیں اے قاضیو!
آیئے ان کو سولی چڑھا دیجئے

میرے افسانے بیشک گنہ گار ہیں
اُٹھ کے ان سب کی گردن اُڑا دیجئے

میرے تمثیلچوں کو پکڑ لیجیے — ان کو زنداں کے اندر بٹھا دیجیے
مار کر کاٹھ میرے حسیں طنز کو — چوک میں تازیانے لگا دیجیے
میرے ناول کو پہنائیے بیڑیاں — اور پھر اس پہ پہرے بٹھا دیجیے
میرے تندروں کی ہاں! شہ رگیں کاٹیے — ان کا خوں کر کے ہمت بہا دیجیے
مل کے میرے مقالوں پہ کالک انہیں — شہر کی ہر گلی میں گھما دیجیے
میرے احساس کو، میرے جذبات کو — ایک آلاؤ میں بس جلا دیجیے
میرے یہ استعاروں کے رنگیں چمن — ان پہ اک بار بجلی گرا دیجیے
میری تشبیہوں کی یہ حسیں بستیاں — اینٹ سے اینٹ ان کی بجا دیجیے
میں جلاتا رہا ہوں ادب کے دیئے — اپنی پھونکوں سے ان کو بجھا دیجیے
میرے گیتوں کے چشمے رواں کیوں رہیں — پاٹ دیجے انہیں! ہاں سکھا دیجیے
میری فریاد کی کاٹ دیجیے زباں — مجھ کو گھل گھل کے مرنا سکھا دیجیے
شوخ ہوتا چلا جا رہا ہے قلم! — اس پہ للہ! خنجر چلا دیجیے
میرے دفتر میں چنگاریاں پھینکیے! — راکھ اس کی ہوا میں اڑا دیجیے

جُرم کردہ نہیں کوئی تو کیا ہوا
جرمِ ناکردہ کی تو سزا دیجیے
میرے افکار سے
میری گفتار سے
میرے اشعار سے
امن کی یہ فضا ساری خطرے میں ہے — مملکت کی بقا ساری خطرے میں ہے
ضبط، نظم اور قانون خطرے میں ہے
ساری تہذیبِ موزون خطرے میں ہے

تو آئے تو ڈالر! —— نعیم صدیقی

(۱۹ ستمبر ۱۹۵۱ء کو لکھی گئی)

ڈالر! مرے اس دیس کو ناپاک نہ کرنا!
تو ظلم کا حاصل!
تو سحرِ ملوکانہ کا اک شعبدۂ خاص!
سرمائے کی اولاد!
تو جیبِ تراشوں کے کمالات کا اک کھیل!
تو سُود کا فرزند!
افلاس کی رگ رگ سے نچوڑا ہوا خوں ہے!
بیواؤں کی فریاد!
ہے کتنے یتیموں کی فغانِ خاموش!
تو ضعف کی اک چیخ!
تو کتنے شبابوں کا ہے اک نوحۂ دلگیر!
تو کتنی تمناؤں کی اک قبرِ سنہری!
تاریخ کا اک اشک!
تو جنگ کی پُر ہول نفیروں کا مجسّم!
تو موت کی پریوں کا فسوں کار ترنّم!
تو برقِ جہاں سوز کا خونخوار تکلم!
لاشوں سے کمائی ہوئی دولت!
تہذیب کو تو زخم لگانے کی ہے اُجرت!
اُف کتنی ہی اقوام کے نیلام کی قیمت!
بچھو کا ترا ڈنک!
سانپوں کا ترا زہر!
انگاروں کا ہے سوز
ہے سونے کے لفظوں میں لکھی تلخ حقیقت!
ڈالر! مرے اس دیس کو ناپاک نہ کرنا!

اے سونے کے ڈالر!
اس فاقہ و افلاس پہ تو رحم نہ فرما!
بھوکے ہیں یہاں پیٹ!
ننگے ہیں یہاں جسم!
پھر روگ ہیں، اور درد ——
جو چارہ گری کے تہیں شرمندۂ احسان!
یہ ٹھیک! "چچا سام" کے اے راج دلارے!
لیکن مری اس بات سے ناراض نہ ہونا!
بھوکے ہیں اگر پیٹ، تو ہم بھوکے ہی اچھے!
ننگے ہیں اگر جسم، تو ہم ننگے ہی اچھے!
بیمار ہیں بے چارہ، تو ہم مرتے ہی اچھے!
ڈالر! مرے اس دیس کو ناپاک نہ کرنا!

تو آئے تو ڈالر!
تن عیش تو ہوں گے
سکھ چین اڑیں گے!
زرخیز ہیں گو کھیت
پر قحط اُگیں گے
کھتے تو بھریں گے
ہم فاقے کریں گے
جامے تو سلیں گے
تن کم ہی ڈھکیں گے
آمد تو کرے گی
اور بھاؤ چڑھیں گے
ڈالر! مرے اس دیس کو ناپاک نہ کرنا!

اِس دیس میں تُو آئے تو آ۔ے سونے کے ڈالر!
آئے گا ربُو بھی!
پھیلے گا جُوا بھی!
پھلے گا زنا بھی!
اُڑ جائے گا ہر پھول سے پھر رنگِ حیا بھی
اخلاق پہ منڈلائے گی ہر گندی وبا بھی
تو آئے تو ڈالر!
یاں لائے گا اک اور ہی افتاد یقیناً!
یاں پھیلے گا نظریۂ الحاد یقیناً!
ہو جائیں گے ایمان تو برباد یقیناً!
انساں کو بنا دے گا تو جلّاد یقیناً!
بِس جائے گی یہ ملّتِ آزاد یقیناً!
عبرت کا بنا نقش ترے فیض سے ہی چین!
ترکی ہے تو مظلوم!
برباد فلسطین!
ڈالر مرے اس دیس کو ناپاک نہ کرنا!

تُو آئے تو پھر ہم میں محبّت نہ رہے گی!
اِس قوم میں، اس دیس میں غیرت نہ رہے گی!
اشراف میں کچھ بوئے شرافت نہ رہے گی!
رِشتوں میں کہیں روحِ اخوت نہ رہے گی!
ڈرتا ہوں میں اسلام کی عزت نہ رہے گی!
تو آئے تو ڈالر!
تسلیم کی خُو آکے رہے گی!
تقلید کی بُو آکے رہے گی!
احساس کی آواز رُکے گی!
افکار کی پرواز رُکے گی!
تُو آئے تو ڈالر!
کچھ اور عنایات بھی ساتھ آئیں گی!
کچھ خفیہ ہدایات بھی ساتھ آئیں گی!
مغرب کی روایات بھی ساتھ آئیں گی!
اغیار کی عادات بھی ساتھ آئیں گی!
ادبار کی آیات بھی ساتھ آئیں گی!
ڈالر! مرے اس دیس کو ناپاک نہ کرنا!

یہ خاکِ مقدس!
اک قوم کا گھر ہی تو نہیں!
اسلام کا گھر ہے!
یہ حق کے لئے وقف ہے مسجد کی طرح!
اِک تجربہ گاہ!
مخصوص جو قرآں کے اصولوں کے لئے ہے!
اللہ کے لئے، اس کے رسولوں کے لئے ہے!
کانٹوں کے لئے کب ہے؟ یہ پھولوں کے لئے ہے!
اس دیس میں اب بزم نئی ایک سجے گی
اس دیس سے تہذیب نئی ایک اُٹھے گی
یہ تجربہ گاہ ایک نیا دَور جنے گی
انساں کو نئی روشنی اب یاں سے ملے گی
پھر مطلعِ خورشید
ہے شعلہ بداماں!
رنگوں کے یہ گرداب!
کرنوں کے یہ طوفان!

اِک صبح کے سامان!
یہ آدمِ خاکی کے لئے آخری اُمید!
یہ جنّتِ اخلاق کی تاسیس، یہ تمہید!
مستقبلِ انسان کی تاریخ کی تسوید
یہ آخری اُمید!
ڈالر! مرے اس دیس کو ناپاک نہ کرنا!

فریب کھا رہا ہوں میں

نعیم صدیقی

ہوئی سفر کی ابتداء لطیف سے گناہ سے
پلٹ کے آ گئے ہیں ہم ندامتوں کی راہ سے

تمہارے ایک جلوہ کی طلب کے ذوق و شوق نے
بچا رکھا ہے آنکھ کو خیانتِ نگاہ سے

یہ وادیاں، یہ گھاٹیاں، یہ پیچ و خم، یہ ٹھوکریں!
ہزار رہنما تھے جو بھٹک گئے ہیں راہ سے

جو دل کے بجھ گئے دیئے تو بھیک مانگنے سے پھر
کوئی کرن نہ مل سکی نجوم و مہر و ماہ سے

یقینِ بے عمل پہ ہے مدارِ دین آج کل
فریب کھا رہا ہوں میں صدائے لا الٰہ سے

جو فرطِ ذوق و شوق کی ملی تھی داد یا مہے
تجھے میں دیکھنے گیا کلیم کی نگاہ سے

عجیب سادہ لوگ ہیں کہ ساحروں پہ ہیں فدا
کھٹک اگر انہیں ہے کچھ تو اپنے خیر خواہ سے

انتخاب (۱)

—— اگست ۴۷ء تک !

ماہر القادری

سید شبیر بخاری

نعیم صدیقی

برطانوی مشن

ماہر القادری

ہر روز نئی موج اٹھتی تھی، طوفان نئے لہراتے تھے
امید کی نازک کشتی نے ہر بار جھکولے کھائے تھے
کچھ آزادی کی شرح بھی کی کچھ رازِ دروں سمجھائے تھے
جو بات دلوں کے اندر تھی وہ بات زباں پر لائے تھے
اس ہمدردی کی کوشش کا یہ بھید بھی آخر کھل ہی گیا
کچھ اہلِ سیاست لندن سے اِک فلم دکھانے آتے تھے

(کوثر)

ایک ملحد انقلابی شاعر سے

ماہر القادری

آزادیٔ افکار کے گن گاتا ہے | بوجہل کی عظمت کی قسم کھاتا ہے
تو شعر کے دامن سے ہوائیں لے کر | لعنت کے جراثیم کو پھیلاتا ہے
کانوں میں پیالوں کی کھنک آتی ہے | آنکھوں میں تیری مے سے چمک آتی ہے
پیتا ہے جو تو آگ کو پانی کر کے | منہ سے ترے دوزخ کی بھبک آتی ہے
اخلاق سے اجتناب، سبحان اللہ | کانٹوں پہ رگِ گلاب، سبحان اللہ
انسان کو حیوان بنانے کی فکر | یہ دعوتِ انقلاب، سبحان اللہ
یہ جو مئے ناب کی فراوانی ہے | مزدور کے خون ہی کی ارزانی ہے
او بادہ کشی کا درس دینے والے! | اس نغمہ کی "نے" میں صوتِ شیطانی ہے

(کوثر)

اعلانِ تنفّر

سیّد شبیر بخاری

(۱)

جس جگہ، نُدرتِ افکار کی دولت ہی نہ ہو!
جس جگہ، جوہرِ کردار کی قیمت ہی نہ ہو!!
جس جگہ، باہمی پیکار سے مُہلت ہی نہ ہو!
جس جگہ، جذبۂ ایثار کی وقعت ہی نہ ہو!
جہاں سرمایۂ ایمان ہو، حرصِ زر و سیم مجھکو اُس دیس کے ہر ذرے سے نفرت ہے ندیم!

(۲)

جسمِ تہذیب جہاں زرد ہو مانندِ زریر
چند سکوں کے عوض بکتا ہو، انسان کا ضمیر
چادرِ فقر ہو، دریوزہ گرِ تابِ حریر!
دُختِ رز سے جہاں اُٹھتا ہو جوانی کا خمیر!!
جہاں فرعون کی محکوم ہو تقدیرِ کلیم مجھکو اُس دیس کے ہر ذرّے سے نفرت ہے ندیم!

(۳)

جس جگہ ناز ہے انساں کو ریاکاری پر
جس جگہ زیست کی بنیاد ہو عیّاری پر
سرفرازی ہو جہاں، قوم سے غدّاری پر
سربلندی ہو جہاں دیں سے بیزاری پر
جہاں بے راہ و سگ گام ہوں ملت کے زعیم مجھکو اُس دیس کے ہر ذرّے سے نفرت ہے ندیم!!!

(کوثر)

زنانہ فوج

نعیم صدیقی

(ڈبلیو، اے، بیٹر کی تنو خواتین کے مشہور فریاد نامے کے زیر اثر)

"عورت کو بھی مردوں سے مساوات کا حق ہے"! — شبنم کے جو آنسو ہیں تو کلیوں کے تبسم
"عورت کو بھی اظہارِ کمالات کا حق ہے"! — شیطان کے جذبے ہیں، تو حوروں کا تکلم
"عورت کو بھی پیکار میں خدمات کا حق ہے"! — ہے شرم ان احوال میں بیٹھی ہوئی گم سم

حق یہ ہے کہ مُلاؤں کی ایجاد ہے پردہ — وہ ترکشِ مژگاں میں سجے تیر تو دیکھو
دام و قفسِ جذبۂ آزاد ہے پردہ — چتون کی تڑپتی ہوئی شمشیر تو دیکھو
خاتون پہ ہاں، مرد کی بے داد ہے پردہ — ہونٹوں پہ وہ ہنستی ہوئی تقدیر تو دیکھو

یہ صنف ترقی کی بھلا فکر نہ کرتی؛ — چھڑتی ہے بری طرح کلب گھر میں لڑائی
ہوتی ہے دفاتر میں خواتین کی بھرتی! — آغوشِ ہوس پر ہے غضب کی یہ چڑھائی
میدان میں اک فوج زنانہ ہے اُترتی — عصمت ہوئی مجروح، وہ کانپی ہے خدائی

لو، اسلحۂ نو سے مسلح ہے سپاہن — کی فتح خواتین نے تہذیب کی اقلیم
سُرخی ہے، یہ غازہ ہے، یہ پوڈر ہے، یہ منجن — اب جیت ہے اور مالِ غنیمت کی ہے تقسیم
کیا اب بھی کوئی دیر ٹھہر جائے گا دُشمن — بٹوے میں ہے ایک ایک سپاہن کے زر و سیم

تمغے کہیں عصیاں کے ہیں وردی پہ سجائے
جی! راہِ ترقی کے مراحل ہی یہی ہیں

لائی ہے کوئی لوٹ کے "امراض" پرائے
اس وادیٔ جدّت کی منازل ہی یہی ہیں

اور ہانپ کے بڑھتی ہے کوئی "بار" اٹھائے
اس بحر کے تو موجۂ و ساحل ہی یہی ہیں

فقرے ہیں اب اوباشی بھی بازار میں کستے
اب تلخ نتائج پہ یہ فریاد ہے بیکار

اب دل کو ہر اک سمت سے سو داغ ہیں ڈستے
تہذیب سے اب شکوۂ بے ولد ہے بیکار

آرام کی اب نیند کو دیدے ہیں ترستے
عصمت کے لُٹے شہر کی اب یاد ہے بیکار

نیّت کہیں بگڑی ہے تو قسمت کہیں پھوٹی!
اب عیش کی راہوں پہ لپک! اور لپک جا!

اُلفت کہیں چھوٹی ہے تو منگنی کہیں ٹوٹی!
اب شرم کے جادہ سے بھٹک! اور بھٹک جا!

ماتھا کہیں پیٹا ہے تو چھاتی کہیں کوٹی!
اے دخترِ تہذیب! بہک! اور بہک جا!

کر فخر کہ مغرب کے عطیات یہی ہیں!
افرنگ کے قرآن کی آیات یہی ہیں!

امپیریلزم

نعیم صدیقی

ابلیس! ترے کھیل! شیطان تری شان

یہ راز کا ایوان! یہ حاجب و دربان!
کچھ بانٹ کی ہے بات! کچھ لوٹ کے سامان
بیکار ہے یہ آہ! دنیا نہیں نادان

ابلیس ترے کھیل!
شیطان تری شان!

سڑنے لگے مردار! ہر لاشہ ہے بودار!
گدھوں کی تو ہے فوج، پہلے سے نمودار!
اے جنبشِ چنگال! اے حرکتِ منقار!
نچتا ہے وہ المان! اڑتا ہے وہ جاپان

ابلیس! ترے کھیل!
شیطان! تری شان!

اونٹوں کا ہے یاں ناچ! ہیں مست شتربان
روندا ہوا قالین ہے دولت ایران
کچلا ہوا معصوم ہے آذر بے جان
یہ تیل کے تالاب! یہ خون کے طوفان!

ابلیس! ترے کھیل!
شیطان! تری شان!

یہ سحر! یہ نیرنج! یہ چین کی شطرنج
اس کھیل میں ہو ہار تو رنج ہے بیلے گنج
اس کھیل میں ہو جیت تو گنج ہے بے رنج
شاطر بڑے عیار! مہرے بڑے انجان!

ابلیس! ترے کھیل!
شیطان! تری شان!

پاپا یہ نیا راگ! باجی یہ نئی تانت
ایران پہ ادھر آنکھ! ترکی پہ اُدھر دانت
تنور ہے یا پیٹ؟ نل ہے کوئی یا آنت
چٹنی ہے تری قارص! تر لقمہ ہے اردھان

ابلیس! ترے کھیل!
شیطان! تری شان!

جادائیں ہیں پُر ترد، مغرب کی عنایات!
توپوں کی تقاریر، گولوں کی ہدایات

پستول کا قانون! بارود کی آیات!
سنگین کا اعلان! تلوار کا فرمان!
ابلیس! ترے کھیل!
شیطان! تری شان!

ہشیار فلسطین! ٹپکے ہیں یہود اور!
بازار میں ٹکسال لاتی ہے نقود اور!
افلاک سے آفات کرتی ہیں ورود اور
بن جانے کے احباب! بن پوچھے کے مہمان
ابلیس! ترے کھیل!
شیطان! تری شان!

کعبے کے خداوند، گرجاؤں کے اصنام
اک صیدِ زبوں نجد! ظلمت میں گھر اشام
روتے ہیں لبِ نیل، اُف مصر کے اہرام
افسردہ ہے بغداد! دلگیر ہے سوڈان
ابلیس! ترے کھیل!
شیطان! تری شان!

سہمے ہوتے محکوم! جھپٹے ہوتے قہار!
مظلوم، یہ مظلوم! جبار، وہ جبار
معصوم، یہ معصوم! عیار، وہ عیار
انصاف ہے انصاف! احسان ہے احسان
ابلیس! ترے کھیل!
شیطان! تری شان!

واں ٹھاٹھ ہیں اور عیش! یاں فاقہ و افلاس
انسان کو یہ نظم آتا ہے کہاں راس
الحاد کی تہذیب! سنڈاس ہے سنڈاس
اشراف ہیں خدام! دیوث ہیں پردھان
ابلیس! ترے کھیل!
شیطان! تری شان!

دیتے ہیں وہ "تہذیب" بدلے اڑتے ہیں "پھرنان"!
دیتے ہیں ادھر "نان"! اور لیتے ہیں ایمان!
بھوکا ہے اُدھر جسم، بھوکی ہے ادھر جان
ہو سُرخ کہ اسپید! شیطان ہے شیطان
ابلیس! ترے کھیل!
شیطان! تری شان!

فتنوں کی کھلی نیند، راحت کا پڑا کال
یہ "جورج"! یہ "ناجورج"! یہ بھوت! یہ دجال!
ہر دیس ہے بدحال! ہر قوم زبوں حال
بیدار ہے طاغوت! خوابیدہ مسلمان!
ابلیس! ترے کھیل!
شیطان! تری شان!

مالِ تجارت

نعیم صدیقی

یہ مرے ایک پڑوسی کا پھلتا بچہ!
روز اسکول میں آتا جاتا!
کبھی روتا، کبھی گاتا جاتا!
مجھے آداب بھی کہتا ہے کبھی
اور کبھی یونہی اچھلتا یہ گذر جاتا ہے
میرے بچوں سے کبھی چھیڑ بھی کر جاتا ہے
آہ! یہ گنجینۂ فطرت کا گُہر
یہ مشیت کا ہے شہ کارِ ہنر
وقت کی شاخِ تمنا کا اثر
کتنی ہی بار اسے دیکھ کے سوچا میں نے
ہائے اس طفلکِ معصوم پہ کیا گذرے گی!
اِن فضاؤں میں ہے طاغوت کی چھریوں کی چمک
ہائے معصوم کے حلقوم پہ کیا گذرے گی!

اپنے اس شہر میں بچوں کے ہزاروں ریوڑ
ایک مقتل کے لیے پلتے ہیں!
ایک منڈی میں انہیں بکنا ہے
چند لقموں کے لیے
چند پیسوں کے لیے
میرے ہمسائے کا معصوم بھی بِک جائے گا
اور پھر خود مری اولاد بھی بک جائے گی!

کیا ہے تہذیب؟ یہ منڈی ہے بنی آدم کی
اور طاغوت ہے سیٹھ!
سیٹھ کے کتنے ہی دلّال ہیں، کارندے ہیں!
کوئی دفتر میں محرر ہوگا!
کوئی مکتب میں مُدرّس ہوگا
کوئی جلسے میں مقرر ہوگا!
منصفی ان کی ہے، جیل ان کے ہیں!
ان کے کولھو ہیں تو تیل ان کے ہیں!
مکر و افسون کے ہر رنگ کے کھیل ان کے ہیں!
بنک بھی ان کے ہیں ٹکسالیں بھی!
ناچ گھر ان کے سنیما گھر بھی
انہیں ہر رنگ کی آتی ہیں کئی چالیں بھی!
کھولے بیٹھے ہیں یہ میخانے بھی
ان کی مینائیں بھی، پیمانے بھی
ان کے اشعار بھی افسانے بھی!

کتنے تن روز یہاں بیچ دیے جاتے ہیں
کتنے من روز یہاں نذر کیے جاتے ہیں
کتنے اخلاق یہاں بِکتے ہیں روٹی کے لیے
کتنے ایمان یہاں لوٹ لیے جاتے ہیں
عصمتیں بیچ کے جاتے ہیں شباب!

غیرتیں بیچ کے جاتے ہیں جوان!
بال و پر بیچ کے جاتے ہیں عقاب!
دے کے قصّاب کو پالے ہوتے بچّے اپنے
باپ تن جاتے ہیں، ماؤں کو خوشی ہوتی ہے!
آدمیت کی خودی جانے کہاں سوتی ہے!

کاش ان ماؤں کی گودیں نہ ہری ہو سکتیں
چھاتیاں ان کی نہ یوں دودھ بھری ہو سکتیں!
کاش! باپوں کو نہ جوڑے ملتے!
آرزوؤں کے نہ غنچے کھلتے!
راکھ میں دفن شرارے رہتے!
عمر بھر مرد کنوارے رہتے!
کاش اتنا سا تو بے باک یہ انساں ہوتا!
اپنے بچوں کا گلا گھونٹ کے نازاں ہوتا!
لوگ اولاد کو زندہ ہی اگر گاڑتے آتے
آدمی دہر میں اتنا تو نہ ارزاں ہوتا!

لیکن اب کیا ہو کہ ہر ماں تو جنے جاتی ہے
نسل پر نسل اُبلتی ہی چلی آتی ہے
اور میں سوچ رہا ہوں پیہم
ہائے اس طفلکِ معصوم پہ کیا گذرے گی!

یہ ہے اِک مالِ تجارت! اسے معلوم نہیں!
اسے معلوم ہی کیا!

کل کسی ظلم کی رکشا میں اسے جُتنا ہے
کل یہ کھینچے گا غلاظت کے کسی چھکڑے کو
کل یہ لگ جائے گا ابلیس کی مزدوری میں
کل گناہوں کا سپاہی اسے بن جانا ہے
جی میں آتی ہے کہ خُونی بن کر
جی میں آتی ہے کہ لے کر خنجر
اس پہ اک وار کروں!
ایک ہی وار فقط ایک ہی وار!
اور پھر ایک پکار!
ایک مظلوم سی چیخ!
اور پھر خون کی دھار!
اُسوۂ خضر کی تجدید کروں!
یہ فرشتہ ہے تو طاغوت کے کام آئے کیوں!

ساتھ ہی یہ بھی تو آتا ہے خیال!
اپنے ہمسائے کے بچے سے مجھے کیا مطلب؟
زندگانی کے قضیے سے مجھے کیا مطلب؟
جیسے چلتی ہو یہ گاڑی، یونہی چلتی جائے
بیٹھ کر سوچتا رہتا ہوں میں اکثر یونہی
سوچ ہی سوچ میں صدیاں گذریں!
سوچ ہی سوچ میں نسلیں بیتیں!
یونہی اپنی بھی تو کٹ جائے گی عمر
چند بیکار سے سال!

ایک سوال، چار جواب!

نعیم صدیقی

تاریخ نے پوچھا۔ اے لوگو! یہ دنیا کس کی دنیا ہے؟
شاہی نے کہا ———— یہ میری ہے!
اور دنیا نے یہ مان لیا
پھر تخت بچھے، ایوان سجے، گھڑیال بجے، دربار لگے!
تلوار چلی اور خون بہے! انسان لڑے، انسان مرے
دنیا نے بالآخر شاہی کو
پہچان لیا، پہچان لیا!

تاریخ نے پوچھا پھر، لوگو! یہ دنیا کس کی دنیا ہے؟
دولت نے کہا ———— یہ میری ہے!
اور دنیا نے یہ مان لیا
پھر بنک کھلے، بازار سجے! بازار سجے، بیوپار بڑھے!
انسان لٹے، انسان بکے! آرام اٹھے، سب چیخ اٹھے!
دنیا نے بالآخر دولت کو
پہچان لیا، پہچان لیا!

تاریخ نے پوچھا پھر، لوگو! یہ دنیا کس کی دنیا ہے؟
محنت نے کہا ———— یہ میری ہے!
اور دنیا نے یہ مان لیا!
پھر روح دبی، پھر پیٹ بڑھے! افکار سڑے، کردار گرے!
ایمان لٹے، اخلاق جلے! انسان نرے حیوان بنے۔
دنیا نے بالآخر محنت کو
پہچان لیا، پہچان لیا!

تاریخ نے پوچھا پھر، لوگو! یہ دنیا کس کی دنیا ہے!
مومن نے کہا ———— اللہ کی ہے!
اور دنیا نے یہ مان لیا
پھر قلب ونظر کی صبح ہوئی! اک نور کی نے سی پھوٹ بہی!
ایک ایک خودی کی آنکھ کھلی! فطرت کی صدا پھر گونج اٹھی
دنیا نے بالآخر آقا کو
پہچان لیا، پہچان لیا!

انتخاب (۲)

اگست سنہ ۴۷ تا اگست سنہ ۴۸

●

آسد ملتانی

یعقوب طاہر

نعیم صدیقی

قابل اجمیری

عقیلہ خاتون شاہین

●

عزمِ حرم

اسد ملتانی

پھر دیکھ لے عالم ذرا بے تابیٔ رفتار کا
حُسنِ مآلِ کار کا دل سے کوئی قائل تو ہو

اغیار سے یاری سہی، اتنی رواداری سہی
ذہنِ مسلماں میں مگر فرقِ حق و باطل تو ہو

یہ بات بھی دُشوار ہے، وہ بات بھی دُشوار ہے
آسان ہونے کے لیے آخر کوئی مشکل تو ہو

مانا کہ مدت چاہیے قطعِ سفر کے واسطے
دل طالبِ محمل تو ہو رُخ جانبِ منزل تو ہو

یُوں ٹھوکریں کھاتے رہیں کیوں راہِ "ترکستان" میں
ہم قبلہ رُو تو ہو چلیں، کعبہ مُرادِ دل تو ہو

آجائے گی منزل کی حد، کٹ جائے گا صحرا اسد
عزمِ حرم سے کاروانِ شوق میں شامل تو ہو

(طلوعِ اسلام)

قُم باذنِ اللہ

یعقوب طاہر

وہی نمائشِ عصیاں ہے قُم باذن اللہ
وہی نفاق ہے طغیاں ہے قُم باذن اللہ

کمال جس کو سمجھتی ہے دانشِ حاضر
زوالِ حضرتِ انساں ہے قُم باذن اللہ

زوال کو جو تو سمجھا ہے گردشِ دوراں !
تو یہ بھی گردشِ دوراں ہے قُم باذن اللہ

تو انقلاب سمجھتا ہے اس کو اے ناداں؟
یہ آزمائشِ انساں ہے قُم باذن اللہ

بھٹک گئی ہے رہِ مستقیم سے دنیا
فساد اس کا نمایاں ہے قُم باذن اللہ

سنیما، ناچ، زنا، رشوت اور یہ لوٹ کھسوٹ
یہ جام و مئے "یہ مسلماں" ہے قُم باذن اللہ

جلا رہی ہے زمانے کو آتشِ نمرود
ترا وجود "گلستاں" ہے قُم باذن اللہ

یہ مجلس اور یہ حکمِ خدا یہ ردّ و قبول
یہی بغاوتِ قرآں ہے قُم باذن اللہ

ہیں کس سے دین و شریعت کی تجھ کو اُمیدیں
یہ بھوت لات کا خواہاں ہے قُم باذن اللہ

تو غیر ہی کو سمجھتا ہے موردِ الزام
یہ سوچ تو بھی مسلماں ہے قُم باذن اللہ

اُٹھ اور اُٹھ کے اُڑا دھجیاں خداؤں کی
تو اک خدا کا مسلماں ہے قُم باذن اللہ

یہ اشتراکی و جمہوریانِ دہر تمام
بس ایک ضرب کا ساماں ہے قُم باذن اللہ

بُرا منائیں اسے لاکھ "مشرکینِ وطن"
تجھے ظہور کا فرماں ہے قُم باذن اللہ

تمام اہلِ جہاں، رو رہے ہیں جس کے لیے
وہ ایک نسخۂ قرآں ہے قُم باذن اللہ

اب اُٹھ کہ ہاضمۂ دہر ٹھیک ہے طاہر
تو ہی امامِ حکیماں ہے قُم باذنِ اللہ

(تسنیم)

تعمیرِ تاریخ

نعیم صدیقی

وقت:۔

یہ حادثہ کیا گذر گیا ہے! یہ کیا قیامت بپا ہوئی ہے
فضا یہ آخر وطن کی کیونکر مہیب خونیں ادا ہوئی ہے
شقاوتوں نے وہ ناچ ناچے کہ چرخ کا دل دہل گیا ہے
عداوتوں نے وہ گیت گائے زمین کی راحت ہوا ہوئی ہے

روحِ معین الدین اجمیری:۔

فضاؤں میں ہیں بوم و خفاش پرّاں
ہمارے مزاروں کی خاک اڑ رہی ہے!
بڑا فیصلہ کُن ہے یہ موڑ کوئی
کہ تاریخ جس موڑ سے مڑ رہی ہے

تاج محل:۔

کسے معلوم تھا مغلوں کا ترکہ
کبھی اس طرح سے نیلام ہوگا
نقوشِ یادِ ماضی مٹنے کو
تباہی! تجھ کو اذنِ عام ہوگا

روحِ نظام الدین دہلوی:۔

ہماری تبلیغ نے دلوں میں جو گھر بنائے اُجڑ چکے ہیں
ہمارے ایمان کے جو جھنڈے گڑے ہوئے تھے اکھڑ چکے ہیں
وہ باغ جس کے شجر شجر کو بڑی ہی محنت سے ہم نے سینچا
بہار اب اس پہ رو رہی ہے کہ برگ و بار اسکے جھڑ چکے ہیں

ایک مسجد:۔

خون آلود یہ منبر ہے، نظر تو ڈالو
زخم خوردہ ہے یہ محراب اسے دیکھو تو
آہ ملبہ ہے یہ ٹوٹے ہوئے میناروں کا
کتنا پُرہول ہے یہ خواب اسے دیکھو تو

غدر ۵۷ء:۔

بے مدعا نہیں ہے یہ طوفانِ حادثات
یہ میری روح کا ہی نیا اک ظہور تھا
یہ ذوقِ حریت کے تقاضوں کا تھا ہجوم
جس کے طفیل دہر میں شورِ نشور تھا
اس سیلِ انقلاب کے پیچھے جو دیکھئے
جذباتِ دیں کے ساتھ سیاسی شعور تھا

آزادی:۔

میں آئی، میں آئی
ہنگاموں کو لائی
کرنوں کے لشکر سے اُف ظلمت ٹکرائی
بکھرے لاکھوں خنڈے چنگھاڑے بلوائی
اُٹھو اُٹھو جاگو کر لو صف آرائی
میں آئی، میں آئی

مسلم لیگ:۔

ہر تھپیڑا گو قیامت خیز ہے
انقلابِ وقت کے طوفان کا
گو لگایا قوم نے گہرا بہت
آہ! جان و مال کا نقصان کا
پر تقاضا عین فطری تھا یہی
غلبۂ اسلام کے ارکان کا

خونِ مظلومی کے قطروں سے ہی تو
بن رہا ہے نقش پاکستان کا

روحِ تحریکِ خلافت :-

اگر آزادیٔ ملّت سے احیائے خلافت ہو
تو آزادی گراں ہو کر بھی ہر قیمت پہ ارزاں ہے
اگر اک خطۂ محدود میں قرآن ہو غالب
تو پورا عالمِ خاکی بھی اس خطّے پہ قرباں ہے

روحِ سیّد احمدؒ شہید :-

ہیں بالاکوٹ کی مٹی کے ذرّے
ہماری آرزوؤں کے مزارات
ہیں ہر ذرّے کی پیشانی پہ محفوظ
ہمارے عزم کے خونیں اشارات

شہیدانِ رہِ ملّت! مبارک!
تمہارا خون رنگ اب لا رہا ہے
زمیں پہ غلبۂ قرآن کا دور
پس از مدّت پلٹ کر آ رہا ہے

جشنِ آزادی :-

میں ناقوس بجاتا ہوں — تم سب ناچو گاؤ
فرحت کی مے لاتا ہوں — کھل کر عیش مناؤ
یہ منصب یہ عہدے — لُوٹو، آگے آؤ
یہ عزّت کے تمغے — بٹتے ہیں، لے جاؤ
تم ٹھہرے قوم کے لیڈر — محنت کا پھل پاؤ
آؤ محل سجاؤ — اونچے تخت بچھاؤ

مہاجرین :-

تم نے اے عیش کی تقریب منانے والو!
خون آلود جبینوں کو تو دیکھا ہوتا
تم نے عہدوں پہ جھپٹتے ہوئے ظالم گِدھو!
زخم کھائے ہوئے سینوں کو تو دیکھا ہوتا

آہ! عصمت کے خزینے جو چھنے ہیں ہم سے
تم نے اِن لٹتے خزینوں کو تو دیکھا ہوتا
وہ زمینیں کہ جو لاشوں سے پٹی ہیں اب تک
جھانک کر ایسی زمینوں کو تو دیکھا ہوتا
لبِ ساحل پہ ہوئے انجمن آرا تم لوگ
ڈوبنے والے سفینوں کو تو دیکھا ہوتا
"مسندیں" تم کو مبارک ہوں دعاگو تھے ہم!
تم نے ہم خاک نشینوں کو تو دیکھا ہوتا
حق تو تھا تم کو کہ اظہارِ مسرّت کرتے
وقتِ نازک کے قرینوں کو تو دیکھا ہوتا

عوامی روح :-

ہم نے خون بہائے — تُم نے جشن منائے
ہم نے مال لٹائے — تُم نے مال اڑائے
ہم نے گھر پھنکوائے — تُم نے محل بنائے
ہم نے تخت بچھائے — تُم نے ٹھاٹھ جمائے
ہم نے کھیت اگائے — تم نے حاصل پائے

اقتدار :-

اسلام پہ جو قربانی دی — اب اُس پہ پھول پچھتاؤ نہیں
اک یورش کی ہے دُکھوں نے — پُر دکھوں سے گھبراؤ نہیں
جو چوٹیں تم نے کھائی ہیں — اُن چوٹوں کو گنواؤ نہیں
اسلام کی خاطر صبر کرو! — ہم کو ملزم ٹھہراؤ نہیں

عوامی روح :-

اسلام؟ تو اسلام کی خاطر یہ بتاؤ
انگریز کے قانون کا سکّہ تو رواں ہے
اسلام کہاں ہے؟
ہر دفتر و ایوان یہ دیتا ہے گواہی
اخلاق کا گلزار ابھی نذرِ خزاں ہے
اسلام کہاں ہے؟
باہر درِ مسجد سے ہے الحاد کی شاہی

مسجد میں ضرور آج بھی کچھ شورِ اذاں ہے
اسلام کہاں ہے !
خدمت کی تڑپ کم ہی کسی دل میں ہے باقی
پھیلا ہُوا خواہش کا فضاؤں میں دھواں ہے
اسلام کہاں ہے ؟

اسلام :-

ہاں مرے لشکر کے سالار دلیں اب
میرے تخت و تاج مجھ کو سونپ دو
غاصبوں نے مجھ سے چھینا تھا جسے
اس وطن کا راج مجھ کو سونپ دو

مغربیت :-

باطل کے پہرہ دارو!   کچھ ہاتھ پاؤں مارو
یوں وقت مت گذارو
اب وقت کیا رہا ہے   اسلام آرہا ہے
منصب پرستیوں کو   خواہش کی مستیوں کو
خطرہ ہے سخت خطرہ
ایک ایک رقص گہ کو   ہر مرکزِ گُمشدہ کو
خطرہ ہے، سخت خطرہ
"کالی تجارتوں" کو   خونیں امارتوں کو
خطرہ ہے سخت خطرہ
تم ہو کہ سو رہے ہو   بس وقت کھو رہے ہو
اسلام آرہا ہے !
طوفان لا رہا ہے!

اقتدار :-

چوکنے ہیں، ہشیار ہیں ہم
گر کوئی خطرہ آتا ہے
تو صف بستہ تیار ہیں ہم
قانون کے پہرے کہتے ہیں
لوہے کی اک دیوار ہیں ہم
اور جیل ہمارے کہتے ہیں
ذلت کے گہرے غار ہیں ہم
سنگینیں اپنی تان چکے
بیدار ہیں ہم ، بیدار ہیں ہم

قرآن :-

مرے احکام کی تذلیل کی حد بھی ہے کچھ
مری آیات کی تحقیر کہاں تک ہو گی؟
کوئی بتلاؤ کہ یاں خاکِ حرم سے آخر
یہ صنم خانوں کی تعمیر کہاں تک ہو گی
اپنے اعمال کے فتووں کی زباں سے آخر
قوم اخود اپنی یہ تکفیر کہاں تک ہو گی؟
کفرِ افرنگ کا سکّہ یہ چلے گا کب تک
دین کے پاؤں میں زنجیر کہاں تک ہو گی!
سنتِ پاکِ نبوت کی یہ پامالی کیوں؟
زندگی کفر کی جاگیر کہاں تک ہو گی!
اب تو اس اُمتِ مرحوم پہ کچھ رحم کرو
فکرِ مغرب کی یہ تنجیر کہاں تک ہو گی!
تم نے اک سال یونہی زیر کیا ہے، لیکن
غلبۂ دین میں تاخیر کہاں تک ہو گی!

جماعت اسلامی :-

اپنے وعدوں کو یاد فرماؤ   کچھ بھی احساس ہو تو فرماؤ
اب تو انگریز ہے، نہ ہندو ہے   "ارضِ موعود" مل چکی اب تو
نعرہ ہائے "نظامِ اسلامی"
تم سے اب کچھ سوال کرتے ہیں   کچھ تو ان کے جواب میں لاؤ

اقتدار :-

مصائب کی کالی گھٹاؤں کو دیکھو
مسائل کی وحشی بلاؤں کو دیکھو
وطن کو جو برباد کرنے اُٹھی ہیں
کبھی غور سے ان وباؤں کو دیکھو
کوئی وقت کا راگ چھیڑو خدارا

زمانے کی چالوں، اداؤں کو دیکھو
ابھی سے یہ اسلام کا ذکر کیسا؟
حوادث کی غمگین فضاؤں کو دیکھو
ابھی ڈالنے دو ہمیں چند پانسے
ابھی اپنی بازی کو، داؤں کو دیکھو
ابھی دورِ قرآں سے ہے دُور کافی
سیاست کی اس دھوپ چھاؤں کو دیکھو
ہمیں ڈر ہے یہ غلبۂ دینِ قرآں
کہیں سلطنت کی نہ لُٹیا ڈبو دے
بچاتے ہوئے اپنے جذبات دیں کو
مسلماں کہیں اپنی دنیا نہ کھو دے
ذرا دیر اسلام کو روک رکھو
ابھی دین کے کام کو روک رکھو!

اقبال :۔

دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملت
ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارا

وقت :۔

وہ دین تم جس سے ڈر رہے ہو — "مطالبہ" بن کے آ رہا ہے
ملی ارادوں کو اس سے گرمی — دلوں کے جذبے جگا رہا ہے
پکار گونجی ہے اس کی ہر سُو — نفیرِ پیہم بجا رہا ہے
تمہاری محکوم بستیوں میں — وہ اپنا پرچم اُڑا رہا ہے
اسے نہ روکو کا سے نہ ٹوکو
حیاتِ ملت کو لا رہا ہے

اقتدار :۔

نہیں نہیں، کبھی نہیں — شکست ہم نہ کھائیں گے
مطالبوں کو روند کر — جدھر چلے ہیں جائیں گے
یہ نظم چل رہا ہے جو — اِسے تو اب بچائیں گے

ارواحِ تحریک مجاہدین :۔

اربابِ اقتدار غلط فیصلہ نہ دو
اُمت کی مدتوں کی اُمیدوں کو واسطہ
اسلام کا یہ ملک نہ افرنگیت کو دو
دینِ محمدی کے شہیدوں کا واسطہ

روحِ مجدد الف ثانی

حیف صد حیف! کہ ناپاک سے کچھ عہدوں پر
تم نے اس قوم کا احساسِ خودی بیچ دیا
آنے والی کئی نسلوں کی خریدی لعنت
تم نے بازار میں ناموسِ نبی کو بیچ دیا
تھا ہی کیا اور یہاں جذبۂ ایماں کے سوا
آہ اے قوم! اکابر نے وہی بیچ دیا
پاس تھا اپنے روایات کا ترکہ جو کچھ
بن کے خواہش کے غلاموں نے سبھی بیچ دیا

عوامی طاقت :۔

آہ اپنی کوششوں کا کیا یہی انجام تھا
اس قدر کیا کھو کھلا یہ نعرۂ اسلام تھا

شاعر :۔

تمہیں نہیں یاد یہ کہ تم نے خود اپنے ہاتھوں سے بت بنائے
پھر ان بتوں کو خدائیاں دیں
تمہیں نے ساتھ ان کے ہو کے نعرے لگائے تم نے علم اُٹھائے
پھر ان کو اپنی کمائیاں دیں
اب ان بتوں سے گلا ہی کیوں ہو
تم آخر ان سے خفا ہی کیوں ہو

غولِ غیر مرئی :۔

انتقام اے انتقام
انتقام اے انتقام
پیس دو تہذیب کو — نظم کو ترتیب دو
پھونک دو یہ قصر و بام
انتقام اے انتقام

شاعر:۔

کیا تم کو اپنے مجرم یاں　　آسانی سے مل جائیں گے؟
جو تم سے سب کچھ لوٹ چکے　　وہ ڈاکو ہاتھ بھی آئیں گے؟
تم جن لوگوں کے جویا ہو　　وہ اس بستی کے والی ہیں
یاں اُن کا سکہ چلتا ہے　　یا اُن کے درجے عالی ہیں
وہ قانونوں کے پہرے میں　　مے پیتے، نغمے گاتے ہیں
وہ قوت کی مستی میں　　مظلوموں کو ٹھکراتے ہیں

تم اُن تک کیسے جاؤ گے
جاؤ تو مُنہ کی کھاؤ گے

غولِ غیر مرئی:۔

اگر ہم اُن تک نہ جا سکیں گے
اگر ہم اُن کو نہ پا سکیں گے
تو پوری انسانیت سے کہہ دو کہ بوٹیاں اسکی نوچ لیں گے
ہمارے جذبوں کے تیز پنجے اک اک گلے کو دبوچ لیں گے

پیس دو تہذیب کو
نظم کو ترتیب کو
پھونک دو یہ قصر و بام
انتقام اے انتقام

شاعر:۔

اندھے جذبات سے تعمیر نہیں ہو سکتی
اس طرح نظم میں تغییر نہیں ہو سکتی

غولِ غیر مرئی:۔

ہمیں نہ پوچھو، ہمیں نہ روکو
ہمیں نہ پوچھو کہ ہم ہیں لاشے　　نکل کے قبروں سے آ رہے ہیں
جلو میں اپنے لہو کے قطروں کا　　ایک سیلاب لا رہے ہیں

وہ خون جو رائگاں گیا ہے
وہ خون جو خاک میں ملا ہے
وہ خون جو ظلم نے پیا ہے
وہ خون جو خوں بہا ہے

ہمیں نہ پوچھو، ہمیں نہ روکو
مہیب خونخوار بھوت ہیں ہم
ہمارے پیچھے لٹی ہوئی عصمتوں کا لمبا سا کارواں ہے
کٹی ہوئی چھاتیوں کو لے کر
کرودھ عل بچوں کی بوٹیاں بھی
ہزاروں ماؤں کی ماتما ہے　　جو بن کے اک سیلِ غم رواں ہے
یہ آہ و شیون کا ایک جھکڑ　　یہ لشکرِ نالہ و فغاں ہے

ہمیں نہ پوچھو شرار ہیں ہم
ہمہ تن اک اضطرار ہیں ہم
جلے ہوئے شہرِ زندگی کا
دھواں ہیں، گرد و غبار ہیں ہم

ہمیں نہ پوچھو، ہمیں نہ روکو　　کہ جوششِ انتقام ہیں ہم
شقاوتوں کا ہجوم ہیں ہم　　قیامتوں کا خرام ہیں ہم

شاعر:۔

جو آگے تاریخ آ رہی ہے یہ اسکی ادنیٰ سی اک جھلک ہے
مواد جو پک رہا ہے اندر یہ اسکی سلگی ہوئی بھبک ہے
عذاب کا سیل آئیگا جب تو اس کو روکا نہ جا سکے گا
نجات کا راستہ پھر انساں کسی طرف سے نہ پا سکے گا
خلا کے بند وا ابھی ہے مہلت ذرا تو سوچو ذرا تو چونکو
ایمں ہو تم جس کتاب حق کے خود اُس کو یوں پھاڑ کر نہ پھونکو
خدا ہی جانے کہ اس خطا کی سزا ملے گی تو کیا ملے گی
فلک گرے گا سروں کے اوپر کہ کپکپا کر زمین پھٹے گی

(چراغ راہ)

نظامِ زمانہ بدل دو!

قابل اجمیری

دلوں میں حمیت مچلنے لگی ہے
حرارت نگہ سے اُبلنے لگی ہے
حیات اپنا عنواں بدلنے لگی ہے
حقیقت بدل دو، فسانہ بدل دو!
جوانو! نظامِ زمانہ بدل دو!

نشیب و فرازِ جہاں سے نہ کھیلو
فریبِ بہار و خزاں سے نہ کھیلو
دل و دیدۂ باغباں سے نہ کھیلو
بدل دو، بدل، ترانہ بدل دو!
جوانو! نظامِ زمانہ بدل دو!

دعاؤں کو ہم بے اثر پا چکے ہیں
فرنگی خداؤں سے اُکتا چکے ہیں
جبینوں پہ سجدوں کے داغ آ چکے ہیں
بدل دو، بس اب آستانہ بدل دو
جوانو! نظامِ زمانہ بدل دو

حکومت کے جوہر! ہنر کے خزینے
تمدن کی شمعیں! ترقی کے زینے
یہ مغرب زدہ زندگی کے قرینے
بصد قدرتِ ناقدانہ بدل دو
جوانو! نظامِ زمانہ بدل دو

دل و جاں پہ بیچارگی چھا رہی ہے
سیاست کی جنت پہ مُرجھا رہی ہے
خدائی خدا کے قریب آ رہی ہے!
یہ رسم و رہِ کافرانہ بدل دو!
جوانو! نظامِ زمانہ بدل دو!

دکن

کوئی تو ہے!

عقیلہ خاتون شاہیں

بوستانِ رنگ و بو میں نغمہ زا کوئی تو ہے
عقل و حس کی دسترس سے ماورا کوئی تو ہے

کون نا اُمیدیوں میں بن کے آتا ہے اُمید؟
بے کسوں کی زندگی کا آسرا کوئی تو ہے!

کس کی جانب بار بار اُٹھتی ہے چشمِ آرزو؟
بے بسی کی التجاؤں کا خدا کوئی تو ہے!

کس سہارے پر رواں ہیں کارواں در کارواں؟
دشتِ گمراہی میں آوازِ درا کوئی تو ہے!

داستانِ بلبل و گل کا کوئی موجد تو ہے!
قصہ ہائے درد کی تہ میں چھپا کوئی تو ہے

بے حسی، افسردگی، بے لطفیٔ سازِ حیات
منکرِ خالق کے حق میں بد دعا کوئی تو ہے!

حُسن سے اُلفت اگر ہے مدعائے زندگی
مدعائے زندگی کا مدعا کوئی تو ہے!

زندگی ہر لحظہ سرگرداں ہے کس کے شوق میں؟
اِن مسلسل گردشوں کی انتہا کوئی تو ہے!

عالمِ ہستی کی صورت ہے بجائے خود سوال
سیکڑوں تشنہ سوالوں کی ندا کوئی تو ہے

عقل ہے کھوئی ہوئی تاریکیٔ شبہات میں
دل کی لامحدود دھڑکن کی صدا کوئی تو ہے

صبر و مجبوری و مظلومی کا ہے بھی کچھ صلا؟
ظلمِ بے حد کو کہیں پر بھی سزا کوئی تو ہے!

کامراں ہو کر جو رہتی ہے تمنا تشنہ لب
یعنی تکمیلِ تمنا کی بھی جا کوئی تو ہے!

کیوں طبیعت بے سکوں ہے؟ کیوں ہے دل بے چین سا؟
جد و جہد زندگی کا ارتقا کوئی تو ہے!

موت آجاتی ہے لیکن زندگی مٹتی نہیں
موت کے پردے میں پیغامِ بقا کوئی تو ہے

خود بخود پردہ سے اُٹھ جاتے ہیں شاہیں کس طرح؛
میرے ذوقِ جستجو کا رہنما کوئی تو ہے!

(کوثر)

انتخاب (۳)

(اگست ۴۸ء تا اگست ۴۹ء)

•

ملکِ عزیز

ماہرالقادری

شفیق صدیقی

یعقوب طاہر

ارشد کاظمی

احمد نسیم

طالب حجازی

•

•

بہاء الدین احمد

عاصی کرنالی

اسد ملتانی

فروغ احمد

بشیر احمد ارشد

نعیم صدیقی

•

إن الحكم إلا لله

ملک عزیز

اَے انفس و آفاق کے دیرینہ خداوند — اِن تازہ خداؤں سے ہے بیزار زمانہ

اپنے لیے بندوں کی جبینوں کو جُھکا کر — کرتے ہیں یہ تیرے لیے سجدوں کا بہانہ

افسانوں کو دیتے ہیں حقیقت کے مراتب — اور جو ہے حقیقت اسے کہتے ہیں فسانہ

چڑھتے ہوئے سُورج کے پُجاری ہیں یہ ظالم — باپ اِن کا زمانہ ہے یہ ہیں ابنِ زمانہ

مَیں نے دلِ بے تاب کو ہر بات بتائی — وارفتۂ اسلام کسی طرح نہ مانا

مَیں نے کہا اس عہد میں بندے ہی خدا ہیں — اُس نے کہا بندوں کو ہے پھر بندہ بنانا

مَیں نے کہا یہ مصلحتِ وقت نہیں ہے — اُس نے کہا مومن کو یہ باتیں نہ سُنانا

یہ مصلحتِ وقت بھی ہے وقت کی مانند — اِک آن میں آنا اِسے اک آن میں جانا

قائم ہے خداوندِ زمینی و زمانی — فانی ہیں زمینی و زمانی و زمانہ

اِن جھُوٹے خداؤں کی خدائی کو مٹا کر

معبودِ حقیقی کا ہے پھر تخت بچھانا

جماعتِ اسلامی

ملک عزیز

یہ عاجز، یہ خاطی، گنہ گار بندے — یہ تیری رضا کے طلبگار بندے

یہ سارے خداؤں سے بیزار بندے — فقط ایک تیرے پرستار بندے

خداؤں کے باغی! زمانے سے سرکش! — یہ تیرے سوا سب سے بیزار بندے

ترے دینِ حق کی حمایت کے مجرم — یہ ہر اک منکر کے سزاوار بندے

یہ پابندِ حق اور باطل کے منکر! — یہ مجبور بندے! یہ مختار بندے!

یہ دنیا سے غافل! یہ عقبیٰ کے طالب! — یہ نادان بندے! یہ ہشیار بندے!

یہ باطل کی خدمت کے نااہل یکسر — یہ شیطاں کے نزدیک بیکار بندے!

ترے دین ... کرنے اٹھے ہیں — تری نصرتوں کے طلبگار بندے

درِ فوز و نصرت کو پھر باز فرما!

اِن اسلامیوں کو سرافراز فرما!

فقط تجھ سے عہدِ وفا کرنے والے — ترے دین ہی کو بپا کرنے والے

ترے دینِ حق کی شہادت کے مجرم — اور اس جرم کو برملا کرنے والے

محمدؐ کی رحمت کے یہ خوشہ چیں ہیں — عدو کے بھی حق میں دعا کرنے والے

ہمیں غلبۂ حق سے مسرور فرما!

ہمیں حق سے اے آشنا کرنے والے

ذکر شہا

قراردادِ مقاصد سے متاثر ہو کر

ماہر القادری

جبرِ باطل سے گذرنے کا زمانہ آیا
صرف اللہ سے ڈرنے کا زمانہ آیا

زُلفِ گیتی کے سنورنے کا زمانہ آیا
آدمیت کے نکھرنے کا زمانہ آیا

قافلے جن کے اُجالے میں چلا کرتے تھے
اُن ستاروں کے اُبھرنے کا زمانہ آیا

ایک مُدّت سے جو بے آب تھی حق کی کھیتی!
اُس کے اب پُھولنے پھلنے کا زمانہ آیا

خواہ افسر ہو کہ مزدُور، مکاں ہوں کہ محل
سب کے انداز بدلنے کا زمانہ آیا

اب معیشت بھی عبادت ہے سیاست بھی ثواب
خانقاہوں سے نکلنے کا زمانہ آیا

اطلس و مخمل و کمخواب کی نرمی کو سلام
راہِ پُرخار میں چلنے کا زمانہ آیا

غیر مُسلم کو بھی مُژدہ کہ بہ فیضِ اسلام
اُن کے حالات سنبھلنے کا زمانہ آیا

(تسنیم)

سوزِ ناتمام

شفیق صدیقی

بے خود رہے ہزار برس انجمن ابھی
جاتا نہیں سرورِ شرابِ کہن ابھی

لے جا نہ گھر کی سمت ہوائے وطن ابھی
باقی ہے کچھ مزاج میں دیوانہ پن ابھی

ابرِ بہار لاکھ برستا رہے مگر
نم ہو گی آنسوؤں سے زمینِ چمن ابھی

بجھنے کو شمعِ خسرو پرویز ہے مگر
ہے انقلاب منتظرِ کوہ کن ابھی

کچھ پھول کھل گئے ہیں تو خوش ہو نہ باغباں
تقدیرِ اس بہار پہ ہے خندہ زن ابھی

اے ہمرہانِ قافلہ منزل سے ہوشیار
شب خوں کے انتظار میں ہیں راہزن ابھی

تہذیب شرمسار ہے اخلاق سرنگوں
باقی ہے حریت کی جبیں پہ شکن ابھی

ہر چند آفتاب نمودار ہو چکا
تھرا رہی ہے صبح کی پہلی کرن ابھی

بجلی کے قمقمے بھی ہیں شمع و چراغ بھی
محرومِ روشنی ہے مگر انجمن ابھی

کہتا ہے بے خبر کہ ترقی پسند ہوں
اور اشتراکیت میں وہی ما و من ابھی

دنیا پہنچ رہی ہے کہاں سے کہاں شفیق
تم ہو شریکِ محفلِ شعر و سخن ابھی

(فاران)

یومِ اقبال منانے والوں سے!

یعقوب طاہر

سُن اقبالؒ کے نام پر مرنے والے | سُن اے محفلیں منعقد کرنے والے
تو اقبالؒ کی یاد میں رو رہا ہے | تو اقبالؒ سے سُرخرو ہو رہا ہے
مگر یہ بھی سوچا؟ کہ اقبال کیا ہے | وہ کیا کہہ گیا ہے، وہ کیوں کہہ گیا ہے
وہ مومن، خودی کا پرستار مومن! | وہ مومن، وہ فطرت کا شہکار مومن
وہ گہرائیوں میں اُتر جانے والا | نہ افلاک سے بھی گذر جانے والا
زمانے کا ہر فلسفہ چھان مارا | نہ حاصل ہوا زندگی کا سہارا
مگر جب محمدؐ کے دامن میں آیا | فلاحِ جہاں کا یہیں راز پایا
حقیقت جب اس پر ہوئی آشکارا | تو بے خوف ہو کر یہ اس نے پکارا
کہ آؤ فلاحِ زمانہ یہیں ہے! | اخوت کا رنگیں فسانہ یہیں ہے
فقط ایک مومن ہے وارث جہاں کا | زمیں کا، دریاؤں کا، آسماں کا
مگر شرط یہ ہے مسلماں بنے تو | خود اک زندہ تصویرِ قرآں بنے تو
اُٹھ اور غالب اس کو زمانے پہ کر دے | اُٹھ اور ہمتوں سے فضاؤں کو بھر دے

مگر چھوڑ کر چند اہلِ خودی کو
مسلماں غلط کر چکے زندگی کو

کوئی مرتشی ہے تو کوئی ہے راشی | اِدھر بد معاشی اُدھر بد معاشی!
کوئی چور بازاریاں کرنے والا | کوئی لوٹ سے اپنے گھر بھرنے والا
شرابی کوئی، کوئی زن کا شکاری! | جوا ہے کہیں اور کہیں سود خواری
کوئی بیچے ناں عزتیں لینے والا | کوئی لے کے جان عزتیں دینے والا
کوئی اشتراکی کوئی اشتمالی! | غلامِ شکم، دردِ انساں سے خالی
یہ جاگیرداری یہ سرمایہ داری | یہ انساں کے انسانیت کے شکاری
غریبوں کی ہمدردیوں کے ترانے | غریبوں سے ہیں کھیلنے کے بہانے
کوئی ان میں ہے دین و ایماں سے عاری | ہوس کا کوئی بن چکا ہے پجاری!
کہے کوئی دیں کو قدامت پرستی | کوئی دین مُلّا، کوئی دین پستی
کہیں دین کے چرچے سے شرمندگی ہے | کہیں ذکرِ قرآن بیہودگی ہے
کوئی بیچ کر دیں کو گھر بھرنے والا | کوئی اس سے بازیگری کرنے والا
کچھ ایسے بھی ہیں دین سے بیزار ہیں جو | ہیں ایسے بھی، شک میں گرفتار ہیں جو

کچھ ایسے بھی ہیں، دشمنی میں نبیؐ کے
جو ہیں دو قدم بولہب سے بھی آگے
یہ اقبال کا دن منانے چلے ہیں!
یہ اُس کا تمسخر اڑانے چلے ہیں!!

(تسنیم)

اَے مجلسِ دستُور!

یعقوب طاہر

اُٹھ دیکھ فضا دین کے نعروں سے ہے مستوُر
اُٹھ دیکھ کہ ہر دل ہے پھر ایمان سے پُر نور
اَے مجلسِ دستور!

اُٹھ دیکھ کہ ہر سمت یہی دُھوم مچی ہے!
ہر فرد ہُوا ہے مئے توحید سے مخموُر
اَے مجلسِ دستور!

اُٹھ اور سپر ڈال دے اللہ کے آگے
بنیاد میں رکھ سنت و قرآن کا دستوُر
اَے مجلسِ دستور!

تُو اور ترا قوم کی آواز سے اِغماض؟
تو اور وہی مکر ترا، اَور وہی زُور؟
اَے مجلسِ دستور!

بنتے ہی رہیں کیا ترے ہاتھوں میں کھلونا
جو مرد ہیں، قربانی و ایثار میں مشہوُر
اَے مجلسِ دستوْر!

جو لاکھ سر اس راہ میں کٹوا کے ہیں آئے
یونہی ترے ہاتھوں میں وہ ہو جائیں گے مجبوُر
اَے مجلسِ دستور!

کیا حق ہے، غلط فائدہ" ووٹوں" کا اُٹھائے
وہ شخص بنا ہے، جو نمائندہ جمہور!
اَے مجلسِ دستور!

حیرت ہے کہ جمہور تو نالاں ہیں پٹے دیں
اور تُو ہے کہ ہر بات میں اسلام سے ہے دُور
اَے مجلسِ دستور!

"کرسی" یہ خدا ہی کی اطاعت سے ہے مشروط
ہٹ جا جو خدا کی یہ اطاعت نہیں منظور
اَے مجلسِ دستور!

ورنہ تجھے معلوم رہے "قول کے غازی"
تلوار اُٹھانے پہ بھی ہو جائیں گے مجبوُر
اَے مجلسِ دستور!

پیغامِ سحر

آرشد کاظمی

اے مری زیست تجھے دھارے کو بدلنے والے میرے افکار بدلتے ہیں بدل جانے دے
میرے ماحول سے آوازِ فغاں اٹھتی ہے میرے محبوب مجھے اب تو سنبھل جانے دے

تیری افسردہ نگاہوں سے بھی واقف ہوں میں اپنے افکار کی تکمیل بھی کرنا ہے مجھے
یاد ہیں تیری محبت کے ترانے لیکن اپنے ماحول کو تبدیل بھی کرنا ہے مجھے

ان محبت کے ترانوں سے نہ بہلا مجھ کو بارہا میں نے محبت کے ترانے گاتے
دیکھ یہ مردہ و افسردہ و بیکس انساں میرے نالوں کی خبر سُن کے ہیں دوڑے آتے

یہ ستم خوردہ یہ انسانوں کی زندہ لاشیں ان بچاروں کو تو احساسِ زیاں تک بھی نہیں
آہ یہ بےبس و مظلوم و پریشاں صورت کیسے خاموش ہیں گویا کہ زباں تک بھی نہیں

یہ فلک پاش صدائیں یہ سسکتی آہیں لب پہ فریاد ہے آنکھوں سے لہو بہتا ہے
نیم عریاں سا بدن چیتھڑے میلے میلے کون ظالم ہے جو یہ دیکھ کے چپ رہتا ہے

یہ جگر دوز نظارے نہیں دیکھے جاتے واسطہ اپنی محبت کا مجھے جانے دے
دیکھ اب پیر و جواں دیکھ رہے ہیں مجھ کو پھر کلیم اللہ کی تاریخ کو دہرانے دے

اپنے ارمان بھرے دل کو کچل سکتا ہوں عمر تو یونہی گذرتی ہے گذر جائے گی
میں اگر محو رہا تیری محبت میں تو پھر زندگی موت کے شیشے میں اُتر جائے گی

تیرہ سو سال مجھے پیچھے پلٹ جانے دے تاکہ اس بےبس و بیکس کا سہارا ڈھونڈوں
ابنِ آدم کے سفینے کو بچانے کے لیے سیلِ بےباک میں دریا کا کنارا ڈھونڈوں

عشق مایوس نہیں زیست کے ہنگاموں سے اس کے دوار ترے دل کی خبر دیتے ہیں
ٹوٹتے دیکھے سرِ شام جو تارے تو نے اے مرے دوست یہ پیغامِ سحر دیتے ہیں

(تسنیم)

مُطالبہ اَور جائزے

طاؔلب حجازی

وقت نے چھانٹ دیئے اپنے پرائے سارے — ہم نے آزادیٔ افکار پہ جب دل باندھا

جب تھپیڑوں سے لگی ڈوبنے کشتی اپنی — چشمِ تخیل کے ہر موج پہ ساحل باندھا

کٹ گیا وقت بہر کیف ہمارا لیکن — خوب اپنوں نے ترے نام پہ رستہ روکا

سر جو طاغوت کے خدام سے ہوتا نہ کبھی — "دینِ فطرت" کے نگہداروں نے وہ کام کیا

نام اسلام کا لے لے کے جو آگے آئے — راہ اسلام کی روکی تو انہوں نے روکی

اڑ گئے غیر سے مذہب کا لگا کر نعرہ — آج خود اپنے لئے کفر سے نیت باندھی

ہم طلبگار حکومت کے نہیں ہیں تم سے — اقتدار او رمناصب کی نہیں دل میں امنگ

چاہتے ہم ہیں مسلماں" ہو ریاست اپنی — صِبغۃ اللہ کا چڑھ جائے ہر اک فرد پہ رنگ

سُرخ مملکت کا مزدُور

طالب حجازی

اپنے ماحول کے فرہاد مجسم انساں! — وقت کے ماتھے پہ ہے سرخ سکوں تیرا وجود

ہے بجا چھینا ترا فاقہ کشی نے ایماں — تیری ہستی سے ہوا معرکۂ سرخ وکبود

تونے روٹی کے لئے دامن مذہب چھاڑا — تونے سرمائے کے ہمراہ پچھاڑا اخلاق

مسئلہ پھر بھی تری زیست کا حل ہو نہ سکا — تونے زہرابہ ہستی کا نہ پایا تریاق

تونے زردار کو مقہور بنایا لیکن — خود بدستور ہی مزدور کا مزدور رہا

تونے انصاف کا نعرہ تو لگایا لیکن — اپنے بنیادوں سے تو اس کا نہ مطلب سمجھا

آہ! جاگا نہ ترا بخت گراں خواب ابھی — ٹھیک ہے رنگ بھرا ہے نئے عنوانوں میں

روح محروم سکوں تیری بدستور رہی — نہ بھرا زخم ترا سرخ شفا خانوں میں

کہنہ زردار نے گرحاصل محنت لوٹا — سرخ زردار نے لی دولت انکار بھی لوٹ

قوم کے نام پہ ہے تیرے گلے میں پھندا — قوم کے نام پہ جائز ہے یہاں لوٹ کھسوٹ

تیرے جذبات کی نفرت سے ہوئی تھی تحریک
عدل کی کاش تجھے ملتی کہیں سے تعلیم
اتنا ماضی سے ترا حال نہ ہوتا تاریک
کاش کچھ تجھ کو مساوات کی ہوتی تفہیم

(جہان نو)

کمیونزم سے واپسی پر

بہاءالدین احمد

اپنے معبود سے منہ پھیر کے سمجھا تھا کہ میں
عیش و آرام کی دنیائیں بسا سکتا ہوں
نوچ کر خانۂ کعبہ کے مقدس پردے
قصرِ عشرت کے در و بام سجا سکتا ہوں

ہوس و آز کا مارا ہوا انساں تھا میں — آپ اپنے ہی پہ رازق کا گماں کرنے لگا
اوڑھ کر اُلفتِ مزدور کی رنگیں چادر — اپنے افکار و توہم کو جواں کرنے لگا

اپنی کمزوری بہر طور چھپانی تھی مجھے — اور، معبودِ حقیقی سے بغاوت کیا تھی؟
بشریت کے تقاضے تھے گراں بار بہت — ورنہ انکار مرا، میری جسارت کیا تھی؟

میں نے گھبرا کے حقائق سے پنہ چاہی تھی — ذہن و ادراک کے نادیدہ شبستانوں میں
لے گیا جذبۂ آسائش ہستی مجھ کو — روس کے آہن و فولاد کے زندانوں میں

غم و آلام کی پُر ہول فضاؤں میں، ندیم! — سُرخ پرچم کے سہاروں کی دعائیں کی تھیں
یہ نہ معلوم تھا معصوم نگاہی نے مری — بھول کر صبحِ اسیری کی بلائیں لی تھیں!

کفر و الحاد کی دنیا میں سبھی کچھ ہوا ہے مگر — صرف روٹی مرے زخموں کا مداوا تو نہیں
خوش خیالی میں حقائق کو تڑپتا چھوڑوں؟ — اس قدر ذوقِ تمنا مرا رسوا تو نہیں

پیٹ کی آگ جُدا، روح کا مقصود جُدا — جنس کی بھوک کہاں، اور کہاں کلیوں کا نکھار
زندگی چند کھلونوں سے بہل جائے گیا؟ — کیا یہ خوابوں کے چمن! کیا یہ خیالوں کی بہار!

ہاں بتاؤ تو مجھے ذوقِ ہوس کے بندو! — نکہت و نغمہ و انوار کی دنیا کیا ہے؟
گر فقط بھوک ہے مقصودِ حیاتِ آدم! — پھر یہ دل کیا ہے؟ دلِ زار کی دنیا کیا ہے؟

یہ مہکتی ہوئی کلیاں، یہ شفق اور سحر!
کیسے بتلاؤں کہ ان سب کا گنہ گار ہوں میں
جس نے بخشا ہے انہیں حُسن، مجھے ذوقِ طلب
اُس خداوندِ دو عالم کا خطاوار ہوں میں!

(الانصاف)

سرمایۂ گلشن

عاصی کرنالی

یہ خواب، یہ ظلمت کا فسوں، یہ شبِ تاریک!
جتنا بھی اُلجھتا ہوں نظر ہوتی ہے باریک

رستے میں کئی عرش، کئی فرش پڑیں گے
حالانکہ وہ منزل ہے رگِ جاں سے بھی نزدیک

ایسی بھی کوئی موج ہے دریا کی حدوں میں
دے سکتی ہو طوفان کی نبضوں کو جو تحریک؟

قرآں کو اک غازی کردار سے پوچھو
مُلّا تو سمجھتا ہے فقط "ھدیۂ تبریک"

دریاؤں کی خواہش کے لیے ظرف ہے درکار
پھولوں کے لئے قطرۂ شبنم ہے بہت ٹھیک

غازی کے کرشمے ہیں، نہ مُلّا کی کرامات!
تصویر کے جس رُخ پہ نظر ڈالئے تاریک

خوددار نہ ہو ذوق تو کچھ بھی نہیں ملتا
مانگی ترے جلووں سے نگاہوں نے بڑی بھیک

چُبھتے ہیں جو اربابِ تماشا کی نظر میں
سرمایۂ گلشن ہیں وہ کانٹے مرے نزدیک

جو شعر کہ تفسیرِ حقیقت نہیں ہوتا
عاصی میں سمجھتا ہوں کہ ہے فکر کی تضحیک

قراردادِ مقاصد

اسد ملتانی

اب پھر کسی کے حُسن کا چرچا ہُوا تو ہے
اس دَور میں بھی عشق کا دعویٰ ہُوا تو ہے

تُو مضطرب کہ جلوہ ابھی عام کیوں نہیں
مَیں اِس پہ مطمئن کہ تقاضا ہُوا تو ہے

تصویر صاف ہو گی نمودار عنقریب
دُھندلا سا ایک نقش ہویدا ہُوا تو ہے

پھر ہو چلی ہے جرأتِ پرواز کی اُمید
رُوئے نگاہ سوئے ثریا ہُوا تو ہے

آثارِ سربلندیٔ اسلام ہیں عیاں
دُنیا و دیں کا سلسلہ یکجا ہُوا تو ہے

انجام کے لیے بھی خدا کارساز ہے
آغازِ کار حسبِ تمنّا ہوا تو ہے

پڑتی ہے جس سے وحدتِ کردار کی بِنا
اُس وحدتِ نظر کا نظارا ہُوا تو ہے

غیروں کے اعتراض مبارک کہ ہم میں پھر
تائیدِ حق کا ولولہ پیدا ہُوا تو ہے

آنے کو ہے دوبارہ فروغِ حرم کا دَور
باطل طلسمِ دیر و کلیسا ہُوا تو ہے

افرنگ سے حجاز کی جانب پھرا ہے رُخ
قبلہ بنانے قوم کا سیدھا ہُوا تو ہے

(قندیل)

ڈاکٹر واروناف اور ڈاکٹر اقبالؒ

فروغ احمد

اُس نے دُنیا کو دیا نسخۂ تجدیدِ شباب — اس کی تحقیق کا سرمایہ ہیں بندر کے غدود
اُس کے دارو سے مگر روح جواں ہو نہ سکی — من جو بوڑھا ہو تو پھر تن کی جوانی بے سُود
من جواں ہو تو ضعیفی کا گذر ناممکن! — تن کی دو روزہ جوانی تو ہے پھر بھی محدُود

ہم مسیحائی اقبالؒ کے قائل ہیں فروغ
من کو کرتا ہے جواں بندۂ مومن کا سرود

(سلسبیل)

بیگانہ ماحول

بشیر احمد ارشد

کیا کہا تم نے کہ "بیگانہ ماحول ہوں میں — مرے افکار سے ہوتی نہیں تعمیرِ حیات
میرا اندازِ نظر پست و پسِ وقت ہے آج — میرا سرمایہ وہی ماضی کے فرسودہ نکات"
"قرن ہا قرن کا پارینہ تمدن کیوں کر — عصرِ حاضر کے افق پہ ہو کبھی جلوہ نما"
زندگی راہیٔ فردا ہے بہ زنجیری دوش — وقت کے راگ کی تفہیم سے بیگانہ رہا
"تنگ دل، تنگ نظر، تیرہ جبیں، کہنہ پسند — پیہم اوہام پرستی ہے فقط میرا شعار
ایک اَن دیکھے جہاں کا ہوں سدا میں شیدا — جو معمے نہ سلجھتے ہوں میں ان میں سرشار
اے مرے دوست یہ تنقید، تری تلخ سہی — قلب پر اس کا تاثر مرے کچھ بار نہیں
زندگی چند اصولوں کی ہے پابند مگر — مجھ کو ہے جن کی صداقت پہ ہمہ گیر یقیں
محکِ دہر نے سو بار جنہیں پرکھا ہے — جن میں مضمر رہی بہبودِ زمانے کی صدا
مرے اس ذہنِ پریشاں کو ملا ان سے سکوں — اور یہی ہیں تاریک فضاؤں نے ضیاء
تشنگی سارے زمانے کی بجھائیں گے یہی — روح کی جسم کی ہر بھوک مٹائیں گے یہی
"پیٹ سے" پیٹ کے افکار سے بڑھ کر کے بلند — نوعِ انسان کو انسان بنائیں گے یہی

(تسنیم)

مستقبل کے دروازے پر

نعیم صدیقی

ایک دنیائے نَو کی سرحد پر — آرُکا آج کاروانِ وجود
دھڑکنیں دل کی بن گئیں تسبیح — ہے نفس ہمہ ثنا و درود
موجزن راہیوں کی آنکھوں سے — بے صدا سا سرورِ جنبشِ سرود

زور و زر کی وہاں خدائی ہے — حق وہاں دم کبھی نہ مار سکا
ساری باگیں ہیں دستِ قوت میں — ضعف کب واں جُوا اتار سکا
تن پرستوں کی مُہرہ بازی میں — من بچارا تو داؤں ہار سکا

ہم نے راہِ دراز طے کی ہے — جس میں ساتھی بہت سے چھوٹ گئے
ٹھوکریں ہم نے کھائی ہیں پیہم — شیشہ ہائے خیال پھوٹ گئے
رہ میں کتنوں نے دم ہی توڑ دیا — حوصلے سینکڑوں کے ٹوٹ گئے

فلسفے گھڑ کے نت نئے ابلیس — لاکے میداں میں ڈال دیتا ہے
اک نئے نام سے نظام نیا — اپنے سانچوں میں ڈھال دیتا ہے
ذوقِ جدت کے خاص حیلے سے — فتنۂ نو اچھال دیتا ہے

اپنے احباب کے، عزیزوں کے — چپے چپے پہ لاشے چھوڑے ہیں
اس روا رو میں جو حساب تو کیا — موت نے کتنے رشتے توڑے ہیں
کیا بتائیں کہ کتنے کھیت رہے — بچ کے جو آرہے ہیں تھوڑے ہیں

بٹ گیا خانوادۂ آدم! — خون کی منحنی لکیروں سے
شورشیں اٹھ کے روز ٹکرائیں — قومیت کے دو صد جزیروں سے
گونجتا ہے تمام کرۂ ارض — جنگ کی آتشیں نفیروں سے

کچھ نہ پوچھو وہ کیسی دنیا تھی — جس کو ہم سب نے خیرباد کہا!
آدمی اس دہکتی دوزخ میں — آدمیت سے بے نصیب رہا
اک خوشی آئندکل کی مستی میں — آج کے ہر ستم کو ہم نے سہا

امن کے خوشنما بلاوے پر — واں "مجاہد" بلائے جاتے ہیں
قتلِ آدم کشی میں پھر لشکر — مدتوں تک سدھائے جاتے ہیں
جنگ میں جھونکتے ہیں پھر ان کو — جیسے مینڈھے لڑائے جاتے ہیں

سازشیں، جبر، لوٹ، مکر و فسوں! زندگی کاروبار کرتی ہے
مسکراتی اداؤں سے ظالم! عین موقع پہ وار کرتی ہے
ڈستی ہے جب کسی کو ناگن پہلے پُرشوق پیار کرتی ہے

معصیت کے ترازو میں وہاں ہم نے تقویٰ کو تُلتے دیکھا ہے
بارہا زاہدوں کے جوہر کو بزمِ رنداں میں گُھلتے دیکھا ہے
بارہا مرتبوں کو گھوڑے پر اپنی دُنیا میں رُلتے دیکھا ہے

بوکے آنسو یتیم بچوں کے آہ! ڈالر اُگائے جاتے ہیں
بیوگی کی فغانِ مضطر سے واں تبسم بنائے جاتے ہیں
چور بازار کی کمائی سے تر نوالے اڑائے جاتے ہیں

آخر اسلام کا ظہور ہوا ایک تحریکِ نَو اذاں گونجی
آدمی کی خودی کے سینے سے عزم انگیز سی فغاں گونجی
ایک ہنگامۂ قیامت سے کُل فضا زیرِ آسماں گونجی

مصلحت کے بدلتے سانچوں میں روز ایمان ڈھلتے رہتے ہیں
فائدے کے فریم میں اخلاق روز شکلیں بدلتے رہتے ہیں
ہر گھڑی اک نیا اصولِ ضمیر رات دن واں اُگلتے رہتے ہیں

آخر اس شعلہ زار سے ہم لوگ بن کے اک سیلِ آرزو نکلے
یہ جسارت کی انتہا ہی تو تھی پہرہ داروں کے روبرو نکلے
جنتِ گم شُدہ تری خاطر لے کے اک دردِ جستجو نکلے

اُس دیارِ خراب میں یوسف قید میں بے قرار دیکھے ہیں
اُس دیارِ خراب میں عیسیٰ زینتِ میخ و دار دیکھے ہیں
اور اخلاق باختہ کچھ لوگ بر سرِ اقتدار دیکھے ہیں

عالمِ نو! کواڑ کھول اپنے ہم بصد احترام کہتے ہیں
تیرے در پر کھڑے ترے والی تجھ پہ دل سے سلام کہتے ہیں
بول! شہرِ نظامِ اسلامی! کیا ترے سقف و بام کہتے ہیں

(تسنیم)

انتخاب (۴)

اگست ۴۹ء تا اگست ۵۰ء

•

ملکِ عزیز
ماہر القادری
حفیظ جالندھری
عاصی ضیائی
تسکین علیگ
اسد ملتانی
یعقوب طاہر
لالہ صحرائی
عاصی کرنالی
منظور حسین منظور
روش صدیقی
اثر صہبائی
سیماب اکبر آبادی
امین حزیں سیالکوٹی
احمد نسیم
اعظم ادیب
ابوالبیان حماد

•

سجاد شاہد
نقش صحرائی
طالب حجازی
شمیم جاوید
ارشد کاظمی
گوہر گیلانی
عروج قادری
اکمل یزدانی
مصطفیٰ شاہین
آباد شاہ پوری
عبدالعزیز قاضی
نازش پرتاپگڈھی
انور اعظمی
شاہد نقوی
ابوالاشرف شبیر بخاری
مشکور صدیقی
نعیم صدیقی

•

جائزہ

یہ کیا ہو رہا ہے

ماہر القادری

قوم کی قوم ہی آسودۂ غفلت ہے ابھی
کیا کسی اور تباہی کی ضرورت ہے ابھی؟

سنگ و آہن کے بھی سینوں میں شرر جاگ اٹھے
چشم انساں ہے کہ محروم بصیرت ہے ابھی

قصر و ایواں کی بہاروں کا وہی عالم ہے
جھونپڑوں کی وہی اجڑی ہوئی حالت ہے ابھی

خواہ دفتر کے ہوں ایواں کہ تصوف گاہیں
وہی حلوے وہی مانڈے وہی رشوت ہے ابھی

یہ بھی اک مصلحتِ وقت کا ہے لطف و کرم
شیخ کے سر پہ جو دستارِ فضیلت ہے ابھی

وہی شاہانہ تجمل، وہی محلوں کا شکوہ
وہی جلوت، وہی خلوت، وہی نخوت ہے ابھی

لب پہ وہ مہرِ خموشی کہ الٰہی توبہ!
دل کا یہ حال کہ لبریزِ شکایت ہے ابھی

وہی قبروں کی پرستش وہی عرسوں کی بہار
شرک من جملۂ ارکانِ عبادت ہے ابھی

وہی قانونِ فرنگی ہے وہی دستورِ عمل
وہی خود ساختہ آئینِ سیاست ہے ابھی

ہم نے مانا کہ ہیں آزاد زمینوں کے حدود
نگہ و دل پہ تو غیروں کی حکومت ہے ابھی

آنکھ پھر منتظرِ صبحِ قیادت ہے ابھی
ایک فاروقؓ کی دُنیا کو ضرورت ہے ابھی

(تسنیم)

چلو!

ماہر القادری

بھٹکے ہوؤں کو راہ دکھاتے ہوئے چلو ایقان کے چراغ جلاتے ہوئے چلو
جن کو مٹا سکے نہ کوئی دورِ انقلاب کچھ ایسے نقش بھی تو بناتے ہوئے چلو
جاگے ہوؤں کو گرمئ رفتار بخش دو سوتے مسافروں کو جگاتے ہوئے چلو
انکار نے دلوں کو بہت سرد کر دیا سوزِ یقیں سے آگ لگاتے ہوئے چلو
ضامن ہے عافیت کی سلامت روی کی چال کہتا ہے کون حشر اٹھاتے ہوئے چلو
دل میں خدا کا خوف نہیں ہے تو کچھ نہیں یہ بات ہر کسی کو بتاتے ہوئے چلو
شایانِ التفات فقط پھول ہی نہیں کانٹوں کی تشنگی بھی بجھاتے ہوئے چلو

اب وقت ہے کہ شعر و ادب کی زبان سے
مفہوم لا الٰہ بتاتے ہوئے چلو

(فاران)

آج بھی!

ماہر القادری

فتنے اسی طرح سے ہیں بیدار آج بھی
میں دیکھتا ہوں حشر کے آثار آج بھی

اقرار پر ہے سایۂ انکار آج بھی
تسبیح میں ہے رشتۂ زنار آج بھی

سرمایہ خود پسند ہے افلاس خود فروش
باقی نہیں ہے عظمتِ کردار آج بھی

دل میں اُسی طرح سے ہیں تالے پڑے ہوئے
کھلتے نہیں ہیں ذہن پہ اسرار آج بھی

انسان ہی کی سعیٔ مسلسل کے باوجود
انساں ہے بندِ غم میں گرفتار آج بھی

اہلِ ہوس کی سازشیں بر روئے کار ہیں
رسوا ہیں اہلِ دل سرِ بازار آج بھی

کچھ پاسِ احتیاط ہے کچھ خوفِ داروگیر
ہیں بند بند سے لبِ اظہار آج بھی

صحن زمیں ہے تنگ غریبوں کے واسطے
ملتا نہیں ہے سایۂ دیوار آج بھی

اللہ! یہ تمدن و تہذیب کا فروغ
انسانیت ہے خستہ و بیمار آج بھی

آنکھوں میں شرم ہے نہ دلوں میں خدا کا خوف
سڑکوں پہ ہے نمائشِ رخسار آج بھی

زردار کے حضور جبینیں جھکی ہوئیں
دنیا ہے ظالموں کی طرفدار آج بھی

مٹ جائیگا جہان سے وہ ہو فرد یا کہ قوم
اسلام سے ہے جو کوئی بیزار آج بھی

(فاران)

تحریکِ اسلامی کے معترض!

ماہر القادری

کچھ مصلحت شناس ہیں، کچھ کشتۂ فرنگ — کچھ دیکھتے ہیں اپنے زمانے کے رنگ ڈھنگ
ان میں بہت سے لوگ سیاست گزیدہ ہیں — جن کے تخیلات ابھی نارسیدہ ہیں
کچھ ہیں فسونِ پیری و شاہی کے پھیر میں — کچھ اس خیال میں ہیں کہ چونکیں گے دیر میں
کتنوں کے سامنے عجمی رہگزار ہے — تقلیدِ پیر و شیخ و آب وجد شعار ہے
کتنوں کو ربط ہے فقہی رخصتوں کے ساتھ — وابستہ کتنے لوگ ہیں کچھ نسبتوں کے ساتھ
کچھ بے خبر ہیں ان میں کچھ اہلِ خبر بھی ہیں — کچھ سادہ لوح بھی ہیں کچھ اہلِ نظر بھی ہیں
کچھ صاحبانِ جبہ و دستار و دلق ہیں! — جو اپنے آستانوں پہ "معبودِ خلق" ہیں
کچھ اس غرور میں ہیں کہ ہم اہلِ ذکر ہیں — آگاہِ سرِّ دین ہیں ارباب فکر ہیں!
ہمت تراش ان میں ہیں اور کچھ ہیں بے یقیں — کچھ فطرتاً شریر ہیں، کچھ ہیں مذبذبیں
کچھ چاہتے ہیں صرف دعاؤں سے انقلاب — کچھ کھا رہے ہیں آپ ہی بے وجہ پیچ و تاب
جو چاہتے ہیں راہ میں بکھرے ہوئے ہوں پھول — وہ آزمائشوں کے تصور سے ہیں ملول

مارے ہوئے ہیں ان میں بہت خانقاہ کے
سمجھے نہیں ہیں بھید ابھی لا الٰہ کے

(جہانِ نو)

—+—

آج وہ انداز ہے کہاں ؟

ملک نصراللہ خاں عزیز

استادِ غائبانہ کا انداز ہے کہاں
شعروں میں رنگِ حسرتِ سربازی کہاں
مسلم کا ادعائے محبت ہے اک فریب
دیں کے لئے وہ پہلا سا جاں باز ہے کہاں
جو محتسب کے در پہ لگائے ہوئے ہیں آس
ان میکشوں پہ عقل کا در باز ہے کہاں
ہم بھی چلیں طوافِ صنمخانہ کو مگر
مائل وفا پہ وہ بُتِ طنّاز ہے کہاں
کفر و ستم کے وعدوں پہ کرتے ہیں جو یقیں
ایماں کا اُن میں سوز کہاں ساز ہے کہاں
اسلام معترف ہے بقا کے صلاح کا
مسلم میں لیکن آج وہ انداز ہے کہاں
مرنے ہی کا نہیں ہے سلیقہ جسے عزیز
اس میں حیاتِ تازہ کا اعجاز ہے کہاں

(یثرب)

—— + ——

ناخداؤ خوش رہو!

حفیظ جالندھری

قافلے برباد ہو کر رہ گئے تو کیا ہوا؟
مطمئن ہیں قافلہ سالار اپنے کام سے
عہدہ و منصب کی بازی جیت کر گھوڑ دوڑ میں
تھان پر ہیں درشنی گھوڑے بڑے آرام سے

رہنماؤں کو سجا کر منزلِ مقصود پر
ٹھوکریں کھاتا ہے تاریکی میں امت کا جلوس
جن بہشتی مقبروں پر ہو گئے روشن چراغ
ملتِ بیضا یہی تھے چند گنتی کے نفوس!

چند تقریروں، بیانوں اور تصویروں کے ساتھ
عیش و عشرت ہے بپا ہر قصر ہر ایوان میں
رتبۂ عالی پہ رقصاں کیوں نہ ہوں وہ مومنین
انتم الاعلون کی آیۃ ہے جس کی شان میں

کیوں گروہ عام کی ذلت کا غم کھائیں خواص؟
جن کو اس ذلت میں عزت کے ذخیرے مل گئے
کشتیاں گرداب میں چھوڑو خدا حافظ کہو!
ناخداؤ خوش رہو، تم کو جزیرے مل گئے!

قافلے برباد ہو کر رہ گئے تو کیا ہوا!

(نمکداں)

چالان

عاصی ضیائی ایم۔ اے

(میں نظم آزاد کا قائل نہیں لیکن بعض اوقات خیال یہ ہوتا ہے کہ یہ بھی اظہارِ خیالات کا ایک اچھا اور مؤثر ذریعہ بن سکتی ہے، اس ذیل میں میری یہ پہلی کوشش ہے، اس میں یہ دکھانا چاہا ہے کہ نیشنلزم کا بھوت انسان پر سوار ہو کر اسے کس انتہا تک پہنچا دیتا ہے)

(۱)

بادلو ٹھیرو، کدھر بڑھتے چلے آتے ہو؟
کیا اسے تم نے گزرگاہ سمجھ رکھا ہے؟
تم کو معلوم نہیں؟
بے اجازت کسی سرحد کو کوئی پار نہیں کر سکتا؟
نہیں۔ فطرت کے قوانین کی پابندی کوئی عذر نہیں!
ہم نے فطرت کے یہ فرسودہ قوانین بدل ڈالے ہیں
اور تم کو بھی بدلنے ہوں گے۔

(۲)

ہم نے دھو ڈالی ہیں اب ل سی پرانی قدریں۔
اپنے اجداد کی وحشت کا بھیانک ورثہ
اب "جہانگیر اخوت" کا وہ کہنہ کابوس،
کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

(۳)

نسل و جغرافیہ و رنگ و زباں و تہذیب
ناپے جاتے رہے انسان انھی پیمانوں سے
اور انھی خانوں میں شطرنج کے مہروں کی طرح
وحدتیں بٹ کے نمایاں ہوئیں آج
زندگی کے لئے میدانِ "تنازع" میں ہزاروں نکل آئیں راہیں
پوری قوت سے اُجاگر ہوا قانون "بقائے اصلح"

(۴)

یہ وہی فطری تقاضے ہیں کہ جن کی خاطر
نوعِ انسان — یہ زمانے کے حوادث کی چہیتی اولاد
اپنے آبا کی پیمانہ روایات کی پرجوش امیں —
بٹ گئی — اور اسے بٹنا تھا —
واحد الخلیہ ذی روح "امیبا"[۱] کے تناسل کی طرح
زندگی سے مزین ہوئی اب ہم آہنگ
آج تقسیم کی یہ دیواریں
ہو گئیں سدِ سکندر کی طرح مستحکم
آج ہر قوم کی نظروں میں سوائے اپنے
دوسری قومیں ہیں یاجوج و ماجوج کی مانند اغیار
آج انسان کا کیا ذکر چرند اور پرند
سرحدیں پھاند کے دو ملکوں میں
بے اجازت نہیں آجا سکتے
پھر بتاؤ تمہیں ہم کیسے گزر جانے دیں
(ابھی اغیار کو سیراب کیا ہے تم نے)

(۵)

لاؤ پروانہ دکھاؤ
راہداری[۲] کے بغیر آئے ہو؟ — واپس جاؤ!
خوب یاد آیا — تمہیں پھسلا کر
لائی ہو گی وہی سرکش وہی غدار — ہوا!
اس نے تو ملک میں اودھم سا مچا رکھا ہے
خیر اب بچ کے کہاں جائے گی،
اس کا چالان بھی کرنا ہو گا!

—+— چراغِ راہ

---

[۱] حیوانات میں زندگی کا سب سے پہلا مستقل نمونہ۔ اس میں نر و مادہ نہیں ہوتے اس لئے اس کا تناسل سیدھی سادھی تقسیم کے اصول پر ہوتا ہے یعنی ایک حیوانی بیج میں سے دو اور دو سے چار ہو جاتا ہے۔

[۲] پاسپورٹ۔

اَلحُکمُ لِلّٰہِ وَ المُلکُ لِلّٰہِ!

عاصی ضیائی

ایک زیرِ تصنیف ڈرامے کا افتاحیہ (PROLOGUE)

[ذیل کا دیا ہوا پارہ اگر نظم میں شمار نہ کیا جا سکے تو کم از کم یہ نثر بھی نہیں۔ اس قبیل کی چیزیں اردو میں اتنی کم ہیں کہ میری نظر سے ابھی تک نہیں گزریں۔ اس میں میں نے انگریزی ڈرامے کا اسلوب (TECHNIQUE) اختیار کیا ہے جو ہمارے ہاں نامانوس ہے۔ اس لئے اس کو پڑھتے وقت چند باتوں کا خیال رکھا جائے: ایک یہ کہ اردو نظم کی عام روایات کے برخلاف اس میں نثری عبارت کا تسلسل ملحوظ رکھا گیا ہے، یعنی اگر ایک مصرع میں ایک بات پوری نہیں ہوئی تو دوسرے مصرع تک بلا تکلف بڑھا دی گئی ہے اور بیچ مصرع میں ختم ہو جانے والی بات وہیں ختم کر کے اگلی بات وہیں سے شروع کر دی گئی ہے۔ اس لئے اس میں لگے ہوئے اوقاف (PUNCTUATIONS) خاص طور پر اہم ہیں اور ان کو ہرگز نظر انداز نہ کیا جائے۔ یہ اوقاف بھی انگریزی اوقاف کے مقابل استعمال ہوئے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ڈراما اپنے مخصوص اسلوب کی بنا پر اپنی زبان و الفاظ بھی عام عبارت یا بول چال کی زبان سے جدا رکھتا ہے، اس لئے اس میں بھاری بھرکم الفاظ کے استعمال کو میری مشکل پسندی پر محمول نہ کیا جائے۔ دو ایک الفاظ مجھے ایسے بھی لانے پڑے ہیں (مثلاً فرّانا) جو آج کل تقریباً متروک ہیں یا جو "ایجادِ بندہ" کی ذیل سے متعلق ہیں (مثلاً ممثّل، متّاد)، لیکن ان کا لانا ناگزیر سمجھا گیا۔ تیسرے یہ کہ اس کو آج کل کی "نظمِ آزاد" سے کوئی واسطہ نہیں۔ نظمِ آزاد قافیے کے علاوہ بحر سے بھی عاری ہوتی ہے، صرف وزن رکھتی ہے جو ہر مصرع میں گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ اس کے برخلاف اس میں میں نے بحر اور وزن کی سختی سے پابندی کی ہے۔ عاصی ضیائی]

[منظر: ایک "اسلامی حکومت" کے صدر مقام کی ایک بارونق سڑک۔ سب سے قریب کی عالی شان عمارت پر حکومت کا جھنڈا لہرا رہا ہے، جس پر الحکم للّٰہ والملک للّٰہ لکھا ہوا ہے۔ عمارت کے پھاٹک کی لوح پر ایک طرف ۱۳۶۸ھ اور دوسری طرف ۱۹۴۹ء لکھا ہوا ہے۔ بیچ میں وہی الفاظ ہیں جو جھنڈے پر لکھے ہیں۔

ڈھنڈورچی داخل ہوتا ہے۔ ساتویں صدی ہجری کے زمانے کا ادنیٰ لباس پہنے ہے۔ گلے میں ڈھول اور داہنے ہاتھ میں لکڑی ہے]

(ڈھنڈورچی (ڈھول بجا کر سامعین سے)

سننے والو! سنو، ہشیار! خبردار! سنو:

خلق اللہ کی، فرمانِ خداوندِ زمیں ....

(اک دم گھبرا کر رک جاتا ہے)

نہیں، اُف ٹھیرو، نہیں ...... پھر غلطی کی میں نے

جس کا کفارہ ادا کرنے یہاں آیا تھا۔

ہاں مرے دوستو، یہ بھول نہ جانا کہ میں ہوں

ایک ناکارہ سے فن کار کی ذہنی تخلیق،

جس کو ورثہ میں ملا صدیوں کا روندا ہوا دل،

اور کچلا ہوا مشلول، اپاہج سا دماغ؛

جس کا آدرش سسکتا ہے پڑا ملبے میں

سیکڑوں سال سے ڈھہتی ہوئی دیواروں کے؟

جس کی شریانوں میں سیّال لہو کا دوران
محض اک ضابطۂ قدرت کی پابندی ہے :
اس کی جو بخال حرارت کو جھٹکنے والی
اَن گنت سانسیں ہیں جو اس کی شہادت دیں گی
داورِ حشر کے آگے، کہ بجھایا تھا اُنھیں
زمہریروں میں غلامی و گراں خوابی کے
لاکھوں ہی "شعلۂ توحید کے پروانوں" نے۔

میرے اقوال اور افعال کی ساری باگیں
اس ممثّل ہی کے ادراک سے وابستہ ہیں،
صاف کرنے کی غرض سے جو یہ ملبے کا پہاڑ ——
(تہ بہ تہ کتنی ہی قرنوں کا یہ انبارِ عظیم)
—— لڑکھڑا جاتا ہے یکبارگی ڈھہتے ڈھہتے

(آسمان کی طرف منہ کر کے)
ربِّ اکبر! ترے دریائے ترحّم کے لئے
لغزشیں میرے ممثّل کی، مزاحم نہ بنیں!

(۲)

(پھر ڈھول بجا کر)
صاحبو! پھر سنو دُہراتا ہوں اپنا اعلان:
خلق اللہ کی، سماوات و زمیں اللہ کے،
داوری، حکم، قوانین، شریعت، فرمان،
سب سزاوار ہیں خلّاقِ دو عالم کے لئے۔
عرصۂ کون و مکاں میں کوئی سلطان نہیں،
کوئی آقا نہیں، خواجہ نہیں، سرکار نہیں،
عالیجاہ، نہ جہاندار، نہ اعلیٰ حضرت،
نہ خداوندِ سلامت، نہ ولیِ نعمت ——
سب اُسی ذاتِ معظّم کو ہیں زیبا یہ خطاب

جس کے اقطارِ شہنشاہی سے ناچیز و حقیر
ابنِ آدم کی رعونت نے نکلنے کے لئے
بدوِ تخلیق سے امروز تلک سر پھوڑا
اور درماندہ و ناکام سدا ہو ہو کر،
کی ہے دارائے دو عالم کی حکومت محبوس
خانقاہوں میں، مساجد میں، کلیساؤں میں،
جن کے باہر، زرہِ سرکشی و خیرہ سری،
اپنے پندار و تبختر کے علم گاڑے ہیں۔
خود فریبی نے غلاموں کو بنایا مولیٰ:
"پیر و مرشد" کی عطا کی کبھی دستارِ بزرگ،
خلعتِ فاخرہ" خاقانِ تر و خشک" کبھی،
"شاہِ شاہانِ جہاں" کا کبھی چترِ زریں،
اور کبھی ہالۂ نورانیِ "ظلّ اللّٰہی"۔
"بے بسی" ردِّ عمل سے بنی "عالمگیری"،
جس نے کوسِ لِمَنِ الْمُلْکُ کے آوازوں سے
عبد کو ڈھال دیا قالبِ یزدانی میں۔
کہتری کے دبے احساس نے شخصیت کا
لوتھڑا، جھوٹی امیدوں کا سہارا دے کر،
لات و عزّیٰ کے سنگھاسن پہ سرفراز کیا!

(۳)

ایہا الناس! مجھے دیکھ کے حیراں نہ ہو:
میری آنکھوں نے وہ افسانۂ خونیں دیکھا
جس کو، تم میں سے کوئی مدعیٔ فکر و نظر،
سُن کے ہرگز مجھے ملزم نہیں ٹھیرا سکتا
کہ میں کیوں وقت کی سنگین حدیں پھاند آتا
آن پہنچا ہوں یہاں دوشِ تخیّل پہ سوار۔
آج تم لوگوں کی چشمِ متحیّر کے لئے
سیمیا گر کے فسوں کا میں ہیولیٰ ہی سہی،

آہ لیکن کبھی اس باغِ جہاں کا میں بھی،
گل و نسریں نہ سہی، سبزۂ بیگانہ تھا
راس آئی نہ جسے آب و ہوائے گلشن۔
میرا جسمانی وجود آج سے صدیوں پہلے
صحنِ گیتی کے لئے وجہِ گراں باری تھا!
تب ہوئی تھی مجھے یہ خدمتِ مناد سپرد:
(یکایک افسردہ ہو جاتا ہے)
میں نے شدّادوں کے مندر کا پجاری بن کر
ان کی یکتائی کے ناقوس بجائے برسوں؛
یعنی ہر ضرب دُہل تھی مری مُہرِ توثیق
کسی فرعون صفت بندے کی "سلطانی" پر! (وقفہ)

عصرِ تاریک سے میں اپنے ہراساں ہو کر
بھاگ نکلا تھا، کہ اس "قرنِ منوّر" کی حسین
جگمگاہٹ نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا
(ٹھنڈی سانس بھر کر)
مگر اے وائے، تصنّع کا یہ رنگین فریب!
(اسٹیج کی روشنیاں مدّھم پڑ جاتی ہیں)
دیکھتا ہوں کہ تمہاری یہ مہذّب دنیا،
عہدِ وحشت سے نکل جانے کا دعویٰ ہے جسے،
آج تک پردۂ ظلمات میں سرگرداں ہے،
اور سمجھتی نہیں یہ رمز کہ آبِ حیواں
کوئی حاصل نہیں کر سکتا سکندر بن کر!

(۴)

(ایک دم مڑ کر عمارت پر لکھی ہوئی عبارت پڑھتا ہے)

حبذا! خوب! یہ جملے تو بڑے دلکش ہیں!
ان کی سچائی سے کافر کو بھی انکار نہیں:
لیکن اے "دورِ ذکاوت" کے پلے ہم جنسو،
(ہاتھ سے اشارہ کر کے)
ان صداقت بھرے الفاظ کا آخر مقصد
در و دیوار کی تزئین کے سوا کچھ بھی نہیں؟
حیف، صد حیف بریں بوالعجبیِ دانش؛
"حکم اور ملک خدا کے ہیں"، مگر اس کے گواہ!
طاق و ایواں ہیں، مسلمان کے اعمال نہیں! (وقفہ)

جاہلیت زدہ تہذیب کے اے فرزندو،
سادہ لوحی نے تمہاری تمہیں گمراہ کیا۔
منترفیں میرے زمانے کے بھی کہتے تھے یہی،
بلکہ اُس وقت تو قانونِ الٰہی کا نفاذ
زیست کے سیکڑوں شعبوں میں ہوا کرتا تھا:
لیکن اس پر بھی اگر کوئی خدا کا بندہ
اس کی تکمیلِ تسلّط کا طلبگار رہوا،
اس کا کیا حشر ہوا —— آؤ دکھاؤں تم کو،
چیر کر وقت کے پردوں کا اک افسانۂ غم
بارِ تاریخ کے اوراق میں جو پا نہ سکا۔
(ہاتھ سے اشارہ کرتا ہے۔ یکے بعد دیگرے
کئی پردے، جن میں سے ہر پردہ ایک
صدی منصور ہے، اٹھتے جاتے ہیں
ڈھنڈورچی آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتا
ہوا باہر چلا جاتا ہے)

(انجمن تعمیر پسند مصنفین سیالکوٹ میں پڑھا گیا)

—— + ——

قلبِ ماہیت

تسکین (علیگ)

فلسفہ ڈھونڈھ نکالے گا کوئی راہِ نجات
عقل و دانش کے سہارے میں چلا ہوں برسوں
مل ہی جائے گی کبھی منزلِ مقصود مجھے
میں اس امید پہ اے دوست جیا ہوں برسوں

زندگی اور الجھتی ہی چلی جاتی ہے
دیکھتا ہوں کبھی مڑ کر تو کھٹک جاتا ہوں
سوئے منزل بھی نہیں منزلِ مقصود کجا
پھر بھی دانستہ کسی سمت بھٹک جاتا ہوں

یہ الگ بات ہے معلوم نہ ہو سمت مجھے
میں وہ راہی ہوں جو منزل کو تو پہچانتا ہے
شوقِ وارفتہ و بے راہ روی کے باوصف
وہ مسافر ہوں جو انجامِ سفر جانتا ہے

کاروانِ نگہ و دل جو بھٹکتا ہی رہے
فلسفہ، عقل و خرد، حکمت و دانش بے سود
ہے اگر تلخیٔ انجام ہی تقدیرِ حیات
تو یہ احساس یہ فکر اور یہ کاوش بے سود

دامنِ عشق اگر سوزِ یقیں سے ہو تہی
زیست اک لذّتِ بے جا کے سوا کچھ بھی نہیں
عشق اگر حُسن کے سانچے میں نہ ڈھل جائے تو
عشق اک تہمتِ بے جا کے سوا کچھ بھی نہیں

فلسفہ، علم و ہنر، نغمہ و مے، نقش و نگار
سب کے سب ہیں نگہِ حسنِ طلب کے مسجود
زندگی حُسن سے خالی ہے اسی باعث تو
گھڑ لئے ہیں نگہِ حُسنِ طلب نے معبود

حُسن بکھرا ہے زمانے میں مگر اے ہمدم
نگہِ حُسن طلب حُسن سے مانوس نہیں
اک اندھیرا سا خلاؤں میں اُمڈ آیا ہے
کون ہے آج جو اس دور سے مایوس نہیں

سوچتا ہوں کہ اندھیرے میں بھٹک جاؤں گا
شمعِ ایمان ذرا پھر سے جلا کر دیکھوں
فلسفہ ڈھونڈھ نہ پائے گا کوئی راہِ نجات
لاؤ وجدان کو سینے سے لگا کر دیکھوں

ریڈ کراس

اسد ملتانی

ذرا تو سوچ مسلمانِ ملکِ پاکستان!
کہ آج نسبتِ دیں بھی ترے نصیب میں ہے
یہ کیا کہ تجھ پہ مسلّط ہے ریڈ کراس اب تک
جو کارِ خیر بھی ہے سایۂ صلیب میں ہے

فریبِ نفس ہے یہ کارِ خیر و خدمتِ خلق
تری فلاح کا موجب شعارِ غیر کہاں
ترے لئے ہے فقط دیں سے خیر و شر کی تمیز
نہ ہو جو دیں سے تعلق تو کارِ خیر کہاں

عیاں ہے نسبتِ حق کا اثر ذبیحے میں
یہاں درست خدا ہی کا نام ہوتا ہے
جو وقتِ ذبح لیا جائے نامِ غیراللہ
حلال جانور اس سے حرام ہوتا ہے

کسی کے زخم کا مرہم کسی کے دُکھ کی دوا
ہر ایک قوم یہ کارِ ثواب کرتی ہے
یہ کام خوب ہیں لیکن نگاہِ مسلم میں
انھیں صلیب کی نسبت خراب کرتی ہے

بوقلمونیاں

اسد ملتانی

لئے غریب سے چندے میں چندہ آنے بھی
ضیافتِ امرا میں لٹے خزانے بھی

تمام قوم کی صحت کا بھی خیال رہا
بنے بناسپتی گھی کے کارخانے بھی

حقیر و پست بھی جانے ہم ان کے کلچر کو
اُنھی کے فلم ہوں رائج انھی کے گانے بھی

اٹھے حجابِ زناں اور طوائفیں نہ رہیں!
کہیں نئے بھی ہیں ہم اور کہیں پرانے بھی

نظر فروز ہیں جلوے جو عصرِ حاضر کے
تو دلفریب ہیں گزرے ہوئے زمانے بھی

جو دینِ حق کے محاسن کا اعتراف ہوا
تو مصلحت کے تراشے گئے بہانے بھی

درِ حرم کا تو سجدہ ہے ناگزیر مگر
جبیں نواز ہیں کچھ اور آستانے بھی

لگے ہوئے تو ہیں محنت میں رات دن لیکن
یہ دیکھنا ہے کہ محنت لگے ٹھکانے بھی

غضب یہ ہے کہ ابھی تک نہ ہم کو ہوش آیا
پڑے اگرچہ حوادث کے تازیانے بھی

وہ جس نے خاص عنایات سے نوازا ہے
عجب ہے کیا جو لگے ہم کو آزمانے بھی

اسدؔ بتوں کی وفا کا تو رنگ دیکھ لیا
کہاں پناہ جو ٹھکرا دیا خدا نے بھی

نظامِ اسلام آرہا ہے

یعقوب طاہر

اٹھو غریبو خوشی منائیں، نظامِ اسلام آرہا ہے
اٹھو محبت کے گیت گائیں نظامِ اسلام آرہا ہے

خدا کے بندے جو امن اور چین کو جہاں میں ترس رہے ہیں
اٹھو یہ مژدہ انھیں سنائیں نظامِ اسلام آرہا ہے

+

دھڑکتے سینو، اداس چہرو، نڈھال روحو، سسکتی لاشو
وہ راحتوں کا پیام لے کر نظامِ اسلام آرہا ہے

تمہارے غم کا، تمہاری آہوں کا، مفلسی کا زمانہ بیتا
مئے سکینت کا جام لے کر نظامِ اسلام آرہا ہے

+

بساطِ دنیا کے مہرہ بازو تم ابنِ آدم سے خوب کھیلے
مگر اب اپنی بساط اٹھاؤ نظامِ اسلام آرہا ہے

تمہارے ہاتھوں اجڑ چکا ہے بھٹک چکا ہے زمانہ برسوں
اب اپنی چشمِ کرم ہٹاؤ نظامِ اسلام آرہا ہے

+

سنو غریبوں کے بادشاہو، نظامِ باطل کے سربراہو
گئی جہاں سے تمہاری باری نظامِ اسلام آرہا ہے

یہ زر پرست اور وہ اشتراکی، نہ یہ مسلماں نہ وہ مسلماں
اب اٹھنے والے ہیں یہ شکاری نظامِ اسلام آرہا ہے

+

شکم کا، تعلیم کا، مکاں کا، لباس کا اور دوا کا ضامن — وہ عدل و انصاف لانیوالا نظام اسلام آرہا ہے
حیا کا، ایماں کا، آدمیت کا، اور آدم کا بھی محافظ — وہ سب کو انساں بنانیوالا نظام اسلام آرہا ہے

+

سپاہی بننے سی کیا یہ اچھا نہیں، سپاہی جنیں یہ بہنیں؟ — کہ اب ضرورت ہے خالدوں کی نظام اسلام آرہا ہے
تم اور جلوہ فروشیاں یہ چمن چمن میں، گلی گلی میں — فضا سنوار دو اٹھو گھروں کی نظام اسلام آرہا ہے

+

یہ کر دو اعلان رنگ و خوں کا نہیں ہے اب امتیاز باقی — گئے وہ قوم و وطن کے نعرے، نظام اسلام آرہا ہے
وہ ابنِ آدم پہ ابنِ آدم کی حاکمیت کا دور گزرا — وہ گونجے نغمے اخوتوں کے نظام اسلام آرہا ہے

+

موافقوں نے جو نغمہ چھیڑا، وہ اب مخالف بھی گا رہے ہیں — جو خانقاہوں میں بند تھا، اب وہ قصر و ایواں پہ چھا رہا ہے
عروج پہ ہے جو بربریت، جو خبثِ تہذیب ہے نمایاں — بھڑکتا شعلہ ہے بجھنے والا، نظام اسلام آرہا ہے

—+—

تقریبِ جشنِ استقلال

لالۂ صحرائی

خوشا نصیب بہاروں کے رنگ پھر چھائے
روش روش پہ نئے غنچے پھر سے مسکائے
رِدا اندھیروں کی غمگیں فضاؤں سے سرکی
سیاہ وادی میں وہ چاند کی جبیں چمکی
وہ ساعتیں کہ گریزاں تھا جن سے نور و سرور
مرصع کرنوں کی شادابیوں سے ہیں معمور
بجھے بجھے سے مناظر میں قمقمے چھوٹے
وہ اجڑی اجڑی سی راہوں پہ پھیلے گل بوٹے
وہ تپتی تپتی فضاؤں میں لہکی پروائی
حسیں گھٹاؤں نے چاندی زمیں پہ برسائی
وہ روندی روندی سی راہوں کو آئی انگڑائی
بساط سبزے نے ویرانیوں پہ پھیلائی
رکے ہوئے وہ صدی بھر کے دل دھڑک اٹھے
وہ مردہ نبضوں میں آہنگِ نو دھمک اٹھے
اجاڑ راہیں نئے قافلوں سے سج سی گئیں
دمک دمک سی اٹھی میری روکھی روکھی زمیں

وہ قافلے کہ شکستہ و ماندہ تھے اب تک
ہویدا اُن کی جبینوں پہ نور کی ہے دمک
جمودِ صدیوں کا جاں سے جھٹک کے پھر ہیں رواں
وہ دیکھ سامنے اُن قافلوں کے چند جواں
عَلَم اٹھائے، رفل تانے، بڑھتے آتے ہیں
نگہ سے اُن کے شرارے سے جھڑتے آتے ہیں
عزائم اُن کے جو دیکھیں تو بجلیاں کانپیں
جو سینہ تانیں تو شانوں کی مچھلیاں ہانپیں
چمکتے ماتھوں سے مانندِ لعل نور افشاں
تہور اور شجاعت کی جھلکیاں ہیں عیاں
ستارہ گیر نگاہیں، فلک شکار عَلَم
پڑے جو سابقہ کھل جائے دشمنوں کا بھرم
جہاں میں شوکتِ اسلام پھر ہوئی زندہ
جبینِ وقت کی ہے غازیوں سے تابندہ
نصیب جاگ اٹھے خفتہ بختِ ملت کے
ارادے ہو گئے کچھ اور ہی مشیت کے

مگر یہ کوتو، یہ تلخی سی کیسی پھیل گئی ؟
فضائیں ہو گئیں کڑوی، ہوائیں کچھ میلی !
وہ پرشکوہ پریڈ اور جلوس کے پیچھے
یہ کیسے شعلے اُگلتے ہیں کچھ ہیولے سے
ہیولے ہیں کہ یہ جلتا چنار ہستی ہے ؟
نظر کا رشتہ سلگتا ہے روح تپتی ہے
فضائیں کروٹیں لیتے ہیں غیظ سے جھونکے
کہ جیسے سینۂ گیتی میں زمزمہ ہو کے

صدائیں آتی ہیں اے پاک سرزمیں والو
خبیث روحیں سمجھ کر ہمیں نہ دھتکارو
بہت غلیظ ہیں ہم اور بہت ہی پاک ہو تم
رہینِ خاک ہیں ہم، اور تابناک ہو تم
مگر یہ دیکھو ثبوت اپنی اونچی آنوں کے
ہیولے آئے ہیں ہندوستاں سے بہنوں کے
جو چاند تاروں سے بڑھ کر ہیں پاک وہ بہنیں
پڑی ہیں گھوروں پہ مانندِ خاک وہ بہنیں
جو بہنیں تھیں کبھی انمول موتیوں کی طرح
ہوئی ہیں خاک بسراب وہ کوڑیوں کی طرح
نکل رہے ہیں جنازے تمہاری عزت کے
کدھر چلے ہو جوانو! یہ ٹینک توپ لئے

شجاعت اور تہوّر کے، مانا تم ہو امین
دھمک رہی ہے تمہارے قدم کے نیچے زمیں
یہ مانا تم ہو مجاہد، یہ مانا تم ہو دلیر
یہ مانا بیشۂ جنگاہ کے تمہیں ہو شیر
مگر دلیرو، جوانو، مجاہدو، شیرو،
رُخِ توجہ حقیقت کی سمت تو پھیرو
اِدھر غرور سے تم اینڈ اینڈ کر اُچھلو،
اُدھر بلکتی ہیں بہنیں کہ تم ہو کہاں بیرو؟
اِدھر ہے چہروں پہ رقصاں جلال کی سُرخی
اُدھر بھنچی ہوئی روحوں سے زندگی بچھڑی
اِدھر ہیں نغمہ فشاں ارغنوں مسرت کے
اُدھر ہمارے گلے رندھ چکے ہیں چیخوں سے
حسین محلوں میں یاں عیش کر رہے ہو تم
اُدھر درندوں کے بھٹ میں ہیں بہنیں وقفِ ستم
اِدھر پھریرے اڑاتے ہو جاہ و عظمت کے
اُدھر جنازے نکلتے ہیں قومی عصمت کے
منا رہے ہو ادھر تم یہ جشنِ آزادی
اُدھر وحوش نے کی ہم پہ ختم جلادی
چراغاں کرتے ہو یاں تم بنامِ پاکستاں
اُدھر بہشت کی شمعیں ہیں دھول میں غلطاں

(ہمایوں)

شعلہ نوا!

عاصی کرنالی

وہی چمن کے عنادل، وہی گلاب کے پھول!
ہم اس فسانے کو دیتے رہیں گے کب تک طول؟

تری نظر بھی ہے اے دوست کس قدر مقبول
کہ ایک جنبشِ ارزاں پہ بک رہے ہیں اصول

خدا کرے تری دنیائے گوش تک پہنچے
وہ ایک نامہ کہ ہے میری آرزو کا رسول

جمالِ یار اور اتنا دراز دست و حریص
کہاں بچیں گے مری عصمتِ نگاہ کے پھول

زنانِ انجمن آرا نے اک سبق تو دیا
کہ اِن حدوں سے بہت دور ہے مقامِ بتول

تری نگاہ بدستور ہے نگاہ نواز
مری نظر نے تو کب کے بدل دیئے ہیں اصول

بہت بلند ہے مقصودِ مردِ مومن کا
کرو نہ چاند ستاروں کی منزلوں کو قبول

فسونِ لالہ و گل کی حدیں کہاں تک ہیں
وہی نگاہ، وہی جستجو، وہی معمول

نہ تیرے شعر میں مستی نہ کیفیت عاصیؔ
مزاجِ بزم نہ ہو جائے سوگوار و ملول

"رگِ و نشتر"

عاصی کرنالی

نظر میں ذوقِ نظر نہیں ہے، جگر میں سوزِ جگر نہیں ہے
اور اس پہ شاعر کو کہہ رہے ہو، تری زباں میں اثر نہیں ہے
نفاقِ ملّت کو آگ سمجھو، یہاں سے دامن بچا کے گزرو
اس آگ کو تم ہوا نہ دینا، یہ فتنہ کچھ مختصر نہیں ہے
ہم اپنی جدّت سے آسماں کو ہزار حدِّ نظر بنالیں
بلند تر ہوں اگر نگاہیں تو کوئی حدِّ نظر نہیں ہے
عجب عجب اپنے چاکِ داماں کو تم مرے پاس لا رہے ہو
خرد کی تعظیم کرنے والو مرا جنوں بخیہ گر نہیں ہے
تمام افراد پہ برابر ہے حفظِ ملّت کی ذمّہ داری
اُنھیں یہ کشتی نہ سونپ دینا جنھیں خود اپنی خبر نہیں ہے
یہ عشرتِ یک نفس کہاں تک، خیالِ فردا بھی کیجئے گا
ہزار پھولوں میں ایک کانٹا بھی آپ کی سیج پر نہیں ہے
نہیں نہیں! آپ اپنی مجبوریوں کو خود دے رہے ہیں دعوت
میں اس کا انجام جانتا ہوں جو ہاتھ تلوار پر نہیں ہے
تمہارے ہر چاکِ جیب و دامن سے اک تکلّف سا ہے نمایاں
اگر مری رائے پوچھتے ہو، ابھی جنوں معتبر نہیں ہے
کمالِ آدم کے راستے میں بڑے بڑے مرحلے ہیں عاصیؔ
ہر آنکھ کو تم صدف نہ سمجھو، ہر ایک آنسو گہر نہیں ہے

(فاران)

اے قوم خبردار!

منظور حسین منظور

دولت کی ردا اوڑھ کے ووٹوں کے بھکاری — باطل کے پرستار۔ حکومت کے پجاری
بہروپ کے نئے دام یہ دیرینہ شکاری — کرتے ہیں تری عقل کے طائر کو گرفتار

اے قوم خبردار! خبردار! خبردار!
اے قوم خبردار!

ہرگز نہ یقین ان کی کسی بات کا کیجئے — ہم دیکھ چکے جن کی قیادت کے نتیجے
پاتے رہے اعزاز اگر ان کے بھتیجے — کیا خدمتِ قومی کا یہی چیز ہے معیار؟

اے قوم خبردار! خبردار! خبردار!
اے قوم خبردار!

وہ دل کہ جسے درد کا احساس نہیں ہے — اور قوم کی عزت کا جسے پاس نہیں ہے
آزاد فضا اس کے لئے راس نہیں ہے — دیتی ہے یہ پیغام تجھے وقت کی رفتار

اے قوم خبردار! خبردار! خبردار!
اے قوم خبردار!

گو آیا ہے آزادیٔ ملت کا زمانہ — کچھ لوگوں کے لب پر ہے غلامی کا ترانہ
بھاتا ہے جنھیں عہد گزشتہ کا فسانہ — پروردۂ افرنگ ہیں جو قوم کے غدار

اے قوم خبردار! خبردار! خبردار!
اے قوم خبردار!

وہ لوگ غریبوں کے مددگار نہیں ہیں — دکھ درد میں جمہور کے غمخوار نہیں ہیں
وہ پیکرِ بیدار ہیں خوددار نہیں ہیں — کس منہ سے بھلا ہوتے ہیں ووٹوں کے طلبگار

اے قوم خبردار! خبردار! خبردار!
اے قوم خبردار!

گر چاہو کہ ہو سلسلۂ جور و جفا بند — توڑ دو یہ سبھی عہدِ غلامی کے خداوند
"جو زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکے قند" — وہ دل ہے فقط مسندِ قومی کا سزاوار

اے قوم خبردار! خبردار! خبردار!
اے قوم خبردار!

سمجھ کر سوچ کر!!

سروش صدیقی

ہوس کو آ گیا ہے گُل کھلانا
ذرا، اے زندگی! دامن بچانا
خلوصِ زندگی ہے کج کُلاہی
فریبِ مصلحت ہے سر جھکانا
انھیں مسند نشین دل بنا کر
مبارک دو جہاں کو بھول جانا
ہزار افسردگی چیں بر جبیں ہو
نہ چھوٹے گا کلی کا مُسکرانا
تمہیں دیر و حرم میں ڈھونڈتے ہیں
ذرا، اہلِ نظر کا دل بڑھانا
جہاں خود موت رقصاں ہو بصد ناز
وہاں بھی زندگی کے گیت گانا
فسونِ زندگی کی انتہا ہے
کسی افسردہ دل کا مسکرانا
غنیمت ہیں مری بربادیاں بھی
سکھایا ہے تمہیں دامن بچانا
سروشؔ! دیوانہ گر ہے چشمِ ساقی
سمجھ کر، سوچ کر، ساغر اٹھانا

سرودِ نو

اثر صہبائی

گونج اٹھا ہے صبح آزادی کے نغموں سے وطن
جاگ اٹھیں اب باغباں، بیدار ہوں اہلِ چمن

دستِ فطرت کر رہا ہے بزمِ نو کا اہتمام
لالہ و گُل اب بدل ڈالیں پُرانے پیرہن

کاش! پالیں اس حقیقت کو ہمارے باغباں
نرگس و شمشاد سے کچھ کم نہیں خارِ وطن

اہلِ زر کی تربتیں بھی زر نگار و لالہ پوش!
اور ناداروں کی لاشیں بھی ہیں بے گور و کفن!

کیا یہی آدم ہے اسرارِ خلافت کا امیں؟
دشمنِ حق! دشمنِ یزداں!! حلیفِ اہرمن!!!

ہے نہاں حسنِ عمل میں عظمتِ انساں کا راز
تو سمجھتا ہے کمالِ زندگی ہے مکر و فن!

خاکِ پاکستاں میں کیوں ہے نورِ یزداں کی کمی؟
شعلہ افشاں کیوں ہے ہر سو اہرمن ہی اہرمن؟

کیوں نہیں میرے وطن میں ایسے مردانِ خدا
جن کی تکبیروں سے ہو ہنگامۂ باطل شکن؟

کاش! پھر صدیقؓ و فاروقؓ و علیؓ ہوں جلوہ گر
وہ غلامانِ محمدؐ، وہ سلاطینِ زمن!!

وہ جہاں بین و جہاں باں! وہ جہانگیر و فقیر!!
وہ خدا آگاہ! وہ غارت گرانِ اہرمن!!

اہرمن کو ختم کر سکتے نہیں، لیکن اثرؔ
اہرمن کو زیر کر سکتے ہیں اربابِ وطن

(ہمایوں)

—+—

اے جنّتِ کشمیر!

سیماب اکبر آبادی مرحوم

تو روزِ ازل سے نظر و دل کی ہے جاگیر ——— اے جنّتِ کشمیر!
انسان کے اک گم شدہ فردوس کی تصویر ——— اے جنّتِ کشمیر!

ماضی میں ترے دفن ہے اک عالمِ اسباب　　تہذیب کے آثار۔ مساوات کے آداب
عشرت کا کم و کیف۔ محبّت کا تب و تاب　　تیری ہی طرب گاہِ نگاریں کے ہیں دو خواب
کوثر کدۂ نور جہاں، جامِ جہانگیر ——— اے جنّتِ کشمیر!

لبریز ترے چشمۂ فیضاں کا پیالہ　　تیری ہی ہواؤں سے ہے بالیدہ ہمالہ
صورت گرِ فردوس، شگفتِ گل و لالہ　　ذرّہ ہو رم آمادہ، تو بن جائے غزالہ
اب تک ہے تری خاک میں تخلیق کی تاثیر ——— اے جنّتِ کشمیر!

ہے خواب گہِ فطرتِ صد رنگ یہیں پر　　سجدے ہیں ستاروں کے شگوفوں کے جبیں پر
پردے ہیں تقدس کے ہر اک نقشِ حسیں پر　　پھولوں کے ہیں پھیلاؤ تری پاک زمیں پر
یا ہے خطِ گلزار میں کشمیر کی تفسیر؟ ——— اے جنّتِ کشمیر!

صحرا ترے آزاد تھے، تیرے چمن آزاد　　دریا ترے آزاد تھے کوہ و دمن آزاد
تھیں صنعتیں آزاد تری، اور فن آزاد　　اخلاق و محبت کے تھے سارے چلن آزاد
اب پاؤں میں پیچیدہ سیاست کی ہے زنجیر ——— اے جنّتِ کشمیر!

وہ تاجروں کا غول جو یورپ سے چلا تھا | تھا اس کے لئے ہند میں تو جنتِ یغما
آدم نے تو ایک گیہوں پہ تھا خُلد کو بیچا | اک جَو پہ کیا اہلِ ہوس نے ترا سودا

سرزد بنِ آدم سے ہوئی پھر وہی تقصیر ——— اے جنّتِ کشمیر!

انسان کی قوت ہو مشیّت کے مقابل | اور فتح بھی پا جائے یہ اک بات ہے مشکل
ہوتی ہے کہیں جبر سے نعمت کوئی حاصل | میں "جنگ" کا قائل نہیں "جذبے" کا ہوں قائل

فردوس کہاں اور کہاں خنجر و شمشیر ——— اے جنّتِ کشمیر!

مسجد ترے دامن پہ بنا لیں کہ شوالا | محفوظ رہے گا حرمِ معنوی تیرا
ممکن ہے ترے ظاہری ماحول پہ قبضا | باطن ترا آزاد ہے، آزاد سراپا

لاریب تری روح ہے ناقابلِ تسخیر ——— اے جنّتِ کشمیر!

ہر گنج میں سامانِ اذاں دیکھ رہا ہوں | ہر پھول کو تسبیح کناں دیکھ رہا ہوں
ناقوس کو بھی محوِ فغاں دیکھ رہا ہوں | میں تیرے سب آثارِ نہاں دیکھ رہا ہوں

ہر چند تری نشأۃِ ثانی میں ہے تاخیر ——— اے جنّتِ کشمیر!

کشمیر! ترا نقشِ جواں مٹ نہیں سکتا | کتنے ہی پڑیں گُرز گراں مٹ نہیں سکتا
جب تک نگراں ہے، نگراں مٹ نہیں سکتا | دُنیا سے ترا نام و نشاں مٹ نہیں سکتا

ہے قبضۂ قدرت میں ترا کتبۂ تقدیر ——— اے جنّتِ کشمیر!

اب طولِ امل میں بھی ہیں تکمیل کے انداز | اک آخری نغمے کے لئے جوش میں ہے ساز
انجام طلب ہے ترے افسانے کا آغاز | وہ دیکھ! کہیں پھر ہوئی "جے کارے" کی آواز

وہ جیشِ مجاہد نے کہا۔ "نعرۂ تکبیر" ——— اے جنّتِ کشمیر!

اے جنّتِ کشمیر!!!

(ہمایوں)

یقین !

امین حزیں سیالکوٹی

مجھے یقین ہے کل مجھ کو مر کے رہنا ہے
جبھی تو دیدۂ و دل پر ہے احتساب مرا
جبھی تو "بابِ ملامت" نہیں شباب مرا
جبھی تو مجھ سے ہوس دور دور رہتی ہے
جبھی تو روح مری پُر سرور رہتی ہے
جبھی تو مجھ کو محبت ہے چاند تاروں سے
گلوں سے وادیوں سے گاتے آبشاروں سے
حسد کسی سے نہیں اور کسی سے بیر نہیں
جبھی تو میری نگاہوں میں غیر غیر نہیں
بھلا کسی کا، اگر ہو سکے، تو کرتا ہوں
بدی کے سائے سے بھی طفل وار ڈرتا ہوں
مری سرشت میں جذباتِ انتقام نہیں
بغل میں پھندا نہیں زیبِ دوش دام نہیں
کہ آج کرنا ہے جو، کل کو بھر کے رہنا ہے !

(ہمایوں)

—+—

۱۵۔ اگست ۱۹۵۰ء

احمد نسیم

سنا ہے جشنِ مسرت کا روز آیا ہے
مگر دلوں پہ تو رنج و الم کا سایا ہے
قدم قدم پہ وہی بُت پرستیاں ہیں ندیم
ابھی تو صرف چراغِ حرم جلایا ہے

یہی وہ دن تھا کہ جب اپنا کارواں لے دوست
چلا تھا خون کی راہوں سے جانبِ منزل
ہزاروں سُرخ بگولے فضا میں رقصاں تھے
دبی دبی تھی تمنا سلگ رہا تھا دل

یہ لرزاں تھے ہر طرف سائے
مگر بڑھے ہی چلے جا رہے تھے دیوانے
جلا کے عزم کی قندیل اپنے سینوں میں
لحد میں سو گئے خاکِ وطن کے پروانے

زباں پہ پہلے تھے محکومیت کے افسانے
نظر سے آج بھی مایوسیاں ٹپکتی ہیں
مقامِ منزلِ ہستی ابھی نہیں آیا
کہ شاہراہوں پہ روحیں کئی بھٹکتی ہیں

ابھی تو کفر کی، الحاد کی نمائش ہے
ابھی تو نامِ خدا لب پہ آ نہیں سکتا
نئی بہار نئے پھول تو کھلے ہیں مگر
کوئی بھی گیت مسرت کے گا نہیں سکتا

ابھی تو شب کی وہی ظلمتیں ہیں عالم پر
ابھی سحر کا کہیں بھی نشاں نہیں ملتا
چمن ہے اپنا گُل اپنے ہیں باغباں اپنا
مگر کسی کو کہیں آشیاں نہیں ملتا

کہیں اناج کے انبار ہیں ذخیروں میں
کہیں پہ بھوک کی شدت سے آگ جلتی ہے
کہیں تو گرم لبادے ہیں زیبِ آرائش
کہیں پہ ٹھنڈ سے انسانیت ٹھٹھرتی ہے

یہ دوڑتی ہوئی کاروں میں سیمگیں پیکر
قدم قدم پہ جو برق و شرر گراتے ہیں
انھی کے حُسنِ تبسّم کی نرم کرنوں سے
یہ اونچے اونچے شبستاں جگمگاتے ہیں

مگر میں جشنِ بہاراں منا نہیں سکتا
کہ میری زیست کا ماحول خوشگوار نہیں
یہ کیسا نظمِ گلستاں ہے اے چمن والو
کہ باغبانوں پہ غنچوں کو اعتبار نہیں

وہ وقت دور نہیں ہے کہ جب مرے ساتھی
جہان والوں کو پیغامِ حق سنائیں گے
روش روش پہ چمن کو سنوارنے کے لئے
نئے شگوفے نئے پھول مسکرائیں گے

مجھے تو آج بھی محسوس ہو رہا ہے دوست
خدائی لاکھوں خداؤں کے اختیار میں ہے
یہ تیرگی جو مسلّط ہے آسمانوں پر
شعاعِ مہرِ اخوت کے انتظار میں ہے

"رنگ محل میں آگ لگی"

اعظم ادیب

اک اور جام، ابھی کچھ خمار باقی ہے
انڈیل انڈیل کہ ساغر چھلک چھلک جائے
ان اودی اودی گھٹاؤں کی آرزو ہے یہی
کہ حورِ شعر کا آنچل ڈھلک ڈھلک جائے

ہمارا قافلہ رک جائے ——— ہو نہیں سکتا
یہ سنگلاخ چٹانوں سے ہو کے گزرا ہے
تو غم نہ کھا مری شہناز! اٹھا وہ جام اٹھا
مگر یہ شور ——— ٹھہرنا! یہ شور کیسا ہے

قراردادِ مقاصد کا ذکر رہنے دے
دلِ جواں کو مری جان! داغدار نہ کر
نہ چھیڑ، وقت کی سرگوشیوں کا ذکر نہ چھیڑ
مری حسین بہاروں کو سوگوار نہ کر

مہاجرین کا تازہ جلوس، ارے توبہ!
ذلیل تر ہیں یہ بھوک اور پیاس کے نعرے
تم ان سے کہہ دو کہ باغِ بہشت منتظر ہیں
خطابِ عام سے کل رات ہم نوازیں گے

وہ سوکھے ہونٹ، وہ نرم و نحیف آوازیں
حریفِ شان و شکوہِ قلندری تو نہیں
وہ لڑکھڑاتے قدم اور مرتعش باہیں
ہماری راہ میں سدِّ سکندری تو نہیں

ابھی اترسوں کسانوں کے ایک جلسے میں
معاشیات کا اسلامی حل بتایا تھا
مگر یہ لوگ تو صبر و سکوں سے خالی ہیں
انھیں تو بوالہوسی نے تباہ کر ڈالا

یہ بدحواس عناصر ابھر نہیں سکتے
محیط ہے مرے خطبات کی فسوں کاری
ہماری جیلوں کے دروازے نیم باز نہیں
بہت شدید ہے زنجیر کی گراں باری

قراردادِ مقاصد ہمارا تحفہ تھا
مگر وہ تحفہ گزاری ہمارا جرم سہی
ہمارے کام کی عظمت سے بے خبر ہیں عوام
اگرچہ سہل شعاری ہمارا جرم سہی

اٹھا وہ جام! مرا ذہن کچھ پریشاں ہے
کچھ آندھیاں سی مری سمت بڑھتی آتی ہیں
اٹھا وہ جام اٹھا! مجھکو غرقِ مے کر دے
مہیب و لرزہ فگن لہریں چڑھتی آتی ہیں

(کوثر)

یادداشت

مجاہد کے نام!

اعظم ادیب

صدیوں سے تری راہگذر دیکھ رہی ہے افسردہ و غمناک نگاہوں کی قطاریں
پھر تیری طلب گار ہیں اے مردِ مجاہد زنجیر میں جکڑی ہوئی باہوں کی قطاریں

مظلوم کی آہوں کا غبار اٹھ نہیں سکتا نغموں کی پھواروں سے ہیں نمناک فضائیں
کب تک دلِ مجبور ستم سہتا رہے گا گھُٹ گھُٹ کے نہ مر جائیں گی خاموش نوائیں

تخریب کی راہوں میں گل و لالہ کی بارش تخریب کے کھنڈروں پہ تحفّظ کا ہے پہرا
تعمیر کی راہوں میں یہ کانٹوں کی نمائش تعمیر کا جُرم ــــ اور عدالت کا کٹہرا

کیا مسند و منبر سے یہی نشر ہوا ہے اے جانِ سخن! حاصلِ تقریر یہی ہے؟
کیا معنی و الفاظ کا یہ حشر ہوا ہے کیا عدل و مساوات کی تعبیر یہی ہے؟

یہ رُشد و روایت کی ریا پوش تلاوت جلتے ہوئے ماحول کا درماں تو نہیں ہے
یہ قہر، یہ آئینِ پیمبر سے بغاوت ہر دیدہ و دل سوختہ ساماں تو نہیں ہے

اٹھ نظمِ جہانِ ہوس و کبر بدل دیں پتھر بھی اگر راہ میں آئے، تو پگھل جائے
یوں جھوٹے خداؤں کی خدائی کو کچل دیں انسانیت آدم کے رگ و ریشہ میں ڈھل جائے

(جہانِ نو)

لمعات!

ابوالبیان حمّاد

تو اقتدار کو پھولوں کی سیج سمجھا ہے — یہ اقتدار تو کانٹوں کا تاج ہے ہمدم
ہے جس کے قبضۂ قدرت میں کائنات تمام — اسی خدا کا زمیں پر بھی راج ہے ہمدم

جنھیں خبر ہی نہ تھی دین کس کو کہتے ہیں — وہ انقلاب کے سانچے میں ڈھلتے جاتے ہیں
نظامِ حق کا زمانے کو انتظار ہے پھر — نظامہائے کہن اب بدلتے جاتے ہیں

تقاضا ہائے زمانہ جو ٹال دیتے ہیں — زمانہ ان کا کبھی ساتھ دے نہیں سکتا
اصول بھی ہو صحیح اور طریقِ کار درست — سفینہ کوئی بھی خشکی پہ کھے نہیں سکتا

نظامِ نو کے یہ خاکے ہیں سادہ و بے رنگ — جگر کے خون سے اب ان میں رنگ بھرنا ہے
کٹھن ہے گرچہ محبت کی رہگزار بہت — اسی میں جینا ہے ہم کو اسی میں مرنا ہے

شبابِ ظلمتِ ہستی کا ڈھل چکا آخر — اُفق سے نیّرِ تاباں اُبھرنے والا ہے
وہ شاہراہ کہ سنسان تھی زمانے سے — اُدھر سے قافلۂ حق گزرنے والا ہے

شبِ دراز مُسلّط تھی زندگانی پہ — مگر وہ آج سحر بن کے جگمگاتی ہے
ہیں انقلاب میں تعمیر کے نئے انداز — نوید باد کہ فطرت بھی مسکراتی ہے

مذاقِ عدل کا کب تک اڑایا جائے گا — چلیں گی جبر و تشدد کی آندھیاں کب تک
یہ سوچتا ہوں کہ پھر کب بہار آئے گی — چمن ہو نذرِ ستم رانیٔ خزاں کب تک

مرے ضمیر کی آواز دب نہیں سکتی — یہ ظلم جذبۂ حق کو مٹا نہیں سکتا
ہزار بار ستم ڈھائے گرچہ وہ مجھ پہ — میں سر کو کفر کے آگے جھکا نہیں سکتا

(یثرب)

ایک افسانہ نگار خاتون سے

سجاد شاهد

(جس نے جاہلی ادب کی ترقی زندگی کو نادانستہ قبول کیا ہے)

زندگی صرف فسانے میں مقید تو نہیں؟
زندگی ایک حقیقت ہے! حقیقت کو سمجھ!
فحش افسانے کے کردار کی تخلیق نہ کر
اپنے کردار کے جوہر کی حقیقت کو سمجھ!

تو نے شب تاب اجالوں کے فسانے لکھے
خود کسی روح کی ظلمت کا ستارا نہ بنی
روس کے سُرخ سویروں کے تصور میں رہی
اپنے کردار کی عظمت کا سہارا نہ بنی

+

یہ تری روح کی آواز کچل دیتے ہیں!
پھر کبھی تاریک خیالوں میں گرفتار ہے تو
اپنی ہستی کی حقیقت کو نہ سمجھا تو نے
قلبِ کونین پہ اک بوجھ ہے، اک بار ہے تو

دیکھ باطل کے اندھیروں میں بھٹکنے والی!
تیری نبضوں میں تڑپتا ہے کسی قوم کا خوں!
تو کسی بھائی کی عزت ہے، کسی ملک کی آن!
تو کسی باپ کی راحت ہے، کسی ماں کا سکوں!

+

مسلمہ بن کے سمجھ پھر سے تقاضائے حیات
دیکھ اس جوہرِ تابندہ کو کھو دے نہ کہیں!
دیکھ! دنیا کی ہوائیں ہیں بہت زہریلی
نامِ رخشندۂ اسلاف ڈبو دے نہ کہیں!

+

شاہین بچّوں سے!

سجاد شاھد

میں نے دیکھا ہے کہ فیشن میں الجھ کر اکثر
تم نے اسلاف کی عزّت کے کفن بیچ دیئے
نئی تہذیب کی بے روح بہاروں کے لئے
اپنی تہذیب کے شاداب چمن بیچ دیئے

الاماں! مدرسۂ نو کا طریقِ تعلیم!
بچے اجداد کے اندازِ کُہن بھول گئے
کر گئی خیرہ نگاہوں کو فرنگی کی روش
اس کو اپنا لیا، اپنوں کا چلن بھول گئے

پھر سے تاریخ نے بھیجا ہے شہادت کا پیام
نغمہ و رنگ کی موجوں سے گریزاں ہو جاؤ
رقص کرتی ہوئی کرنوں سے مچلنا سیکھو
بحرِ ہستی میں بپھرتا ہوا طوفاں ہو جاؤ!

(کاروانِ نو)

فکرو احساس

مشکور صدیقی

بڑھیں جو حد سے ہوس رانیاں تو کیا ہوگا؟
ہوا پکڑ گئیں چنگاریاں تو کیا ہوگا؟
"سپید و سُرخ" کی اس کشمکش میں اے ہمدم!
الٹ گئی یہ بساطِ جہاں تو کیا ہوگا؟
نشانِ راہ سے ہٹ کر چلے تو ہو لیکن
بھٹک گیا جو کہیں کارواں تو کیا ہوگا؟

کچھ احتساب کیا اپنے دل کا بھی مشکور!
یونہی جو بڑھتی رہیں خامیاں تو کیا ہوگا؟

(الانصاف)

مہاجر کا خط

(بھارت کے احباب کے نام)

نقش صحرائی

کبھی ہم یاد آ جاتے تو ہوں گے
ہمارے آپ گُن گاتے تو ہوں گے

اٹھانے والے مجھ کو انجمن سے
کئے پر اپنے پچھتاتے تو ہوں گے

مری بے وجہ بربادی کا ماتم
منا کر آپ شرماتے تو ہوں گے

وفا کے بیج جو بوئے تھے میں نے
وہ پودے بن کے لہراتے تو ہوں گے

مرے اخلاص کے سچے فسانے
وہاں کے لوگ دہراتے تو ہوں گے

کھجوروں اور آموں کے وہ جھرمٹ
مری ہجرت کا غم کھاتے تو ہوں گے

مرے اشعار بن کر سرد آہیں
لبوں پر آپ کے آتے تو ہوں گے

مرے احباب اب بھی میرے گھر کے
کئی چکّر لگا جاتے تو ہوں گے

وہ جمنا کے کنارے بڑ کے سائے
مجھے بھی یاد فرماتے تو ہوں گے

نشیلے اودے نیلے ابر پارے
اُداسی بن کے چھا جاتے تو ہوں گے

در و دیوار گاؤں کے ابھی تک
مرا کچھ حال بتلاتے تو ہوں گے

اور "انسانی ادب" کی محفلوں میں
مرے نغمے جگہ پاتے تو ہوں گے

(کاروانِ نو)

قطعہ

طالب حجازی

جو آرزوئیں تڑپتی ہیں خانۂ دل میں
بیاں کروں تو پڑیں داغ ماہِ کامل میں

جو تخت و تاج میں شاہوں کو مل سکی نہ کبھی
وہ بات پائی فقیروں نے مستیٔ دل میں

(شرب)

شیطان کا پیغام

اربابِ تخریب کے نام

شمیم جاوید

اے ظلمتِ شب تار کے پرہول اندھیرو! کچھ اور بھی ماحول کو تاریک بنا دو
"اسلام" کے ساغر میں "شرابِ خمِ افرنگ" بھر بھر کے ہر اک رند و مجاہد کو پلا دو
جمہور کے سینے میں جو بھڑکے ہیں شرارے فردا کے دلاسوں سے انھیں جلد بجھا دو
مجبور کے لب وا ہوں جو فریاد کی خاطر! الفاظ کے انبار ہی انبار لگا دو
سرکش ہے طبیعت کا اگر کوئی مجاہد اس شخص کو تم قوم کا غدار بتا دو
اللہ کا قانون جو پھیلائے جہاں میں محبوس اسے آہنی جیلوں میں کرا دو
مفلس اگر افلاس کا دکھ درد سنائے افلاس کے اسلام میں اوصاف گنا دو
"علماؤں" کو دو محل میں پُرلطف ضیافت اسلام تمہارا ہے، بگاڑو کہ مٹا دو
گرماؤ لہو قوم کا نعروں کے اثر سے ہر شخص کو بیہودہ مشاغل میں لگا دو
دو بھوک کے خوگر کو عقیدوں کے کھلونے اور بھوک کے شاکی کو ہمیشہ کو سلا دو
ہاں حاکم و محکوم میں حائل رہیں پردے قانون کی دیوار کو کچھ اور اٹھا دو
اک سمت کہو "حسن فروشی" کو مخرب ور ایک طرف "حُسن کا بازار" لگا دو
جس طرح بھی ممکن ہو، خدائی کو خدا کی اپنے ہی ہر ایک حکم کا پابند بنا دو

جاوید کوئی "شاعرِ اسلام" نہیں ہے
کافر ہے یہ کافر۔ اسے سولی پہ چڑھا دو

(جہانِ نو)

فردا کے معمار

شمیم جاوید

آج بھرتی ہوئے دفتر میں نئے اور کلرک / رزق لینے کے لئے اور غلام آپہنچے
اپنی نوخیز جوانی کو مٹانے کے لئے / نوجوانانِ حسین، برق خرام آپہنچے

بک گئے آج سبک ذہن، شہابی رخسار / ایک دانے کے عوض جس سے ملے مرگِ دوام
زندگی بن گئی ناکام امیدوں کا مزار / لب تک آیا بھی نہ تھا چھوٹ گیا ہاتھ سے جام

یہ چمکتی ہوئی آنکھیں، یہ دمکتے چہرے / آج مسرور سہی۔ کل تو فسردہ ہوں گے
اور ذہنوں میں عزائم کے یہ مبہم سے نقوش / آج زندہ ہی سہی کل تو یہ مردہ ہوں گے

یہ گھسے جائیں گے دفتر میں مشینوں کی طرح / دب کے "مثلوں" کے مزاروں میں جئے جائینگے
زندگی یوں بھی گزرنی ہے، گزر جائے گی / "مئے غم" "جامِ تبسم" میں پئے جائیں گے

مجھ کو حیرت ہے کہ شاہین بچوں نے کیسے / دانۂ رزق کو سمجھا ہے حیاتِ ابدی
آہ! کیوں بن گئے اس طرح یہ زنداں کے اسیر / کس لئے؟ اس کو یہ سمجھے ہیں نجاتِ ابدی

کیا گلہ ان سے کہ جب جبرِ معیشت کا ہے عذر! / "ظلم کی چھاؤں میں دم لینے پہ مجبور ہیں ہم"
نہ تو افکار ہمارے، نہ ارادے اپنے / لاکھ آزاد سہی، پھر بھی تو رنجور ہیں ہم

چند روز اور یہ ظلمات گوارا کر لیں / اک نئی صبح کے آثار نظر آتے ہیں
سینۂ پاک سے پھوٹی ہیں سنہری کرنیں / وہ جہاں، مطلعِ انوار نظر آتے ہیں

(نثرت)

انتظار اور ابھی ـــــ

ارشد کاظمی

رہنما کہتے تھے چھٹ جائے گی شب کی ظلمت ـــ اور ہر سمت ضیا پاشں اُجالا ہوگا
گیت گائیں گے یہ مرغانِ چمن خوشیوں سے ـــ رات سو جائے گی بیدار سویرا ہوگا

روزِ روشن میں نہ لوٹیں گے لٹیرے ہم کو ـــ اور اگر لوٹیں تو وہ اس کی سزا پائیں گے
عبرت انگیز ملے گا انھیں اس کا بدلہ ـــ جُرم کرتے ہوئے ہر لحظہ وہ گھبرائیں گے

آج رائج ہے جو دستور، بدل جائے گا ـــ جُراُتِ گردشِ پیمانہ پہ بندش ہوگی
تندیٔ مے سے نہ ٹکرائیں گے جام و مینا ـــ ساقی و ساغر و میخانہ پہ بندش ہوگی

تختِ شاہی پہ جمالیں گے جب اپنا قبضہ ـــ ختم الحاد کا پُرپیچ فسانہ ہوگا
ٹوٹ جائے گا شیاطین کا طلسمِ رنگیں ـــ "اور قانونِ الٰہی کا زمانہ ہوگا"

گردشِ وقت نے دکھلایا انوکھا منظر ـــ رہنماؤں نے حکومت کی عناں تھامی ہے
دعویٰ کرتے تھے جو کل اپنی صلاحیت کا ـــ آج ان کے لئے رسوائی و ناکامی ہے

انقلاب آیا بصد جنگ و ہلاکت لیکن ـــ ظلمتِ شب بھی وہی اور لٹیرے بھی وہی
زندگی آج بھی واماندہ و افسردہ ہے ـــ گمرہی، شامِ الم، اور اندھیرے بھی وہی

بزمِ میخانہ میں رقصاں ہیں چھلکتے ساغر ـــ نشۂ مے میں سرابور ہے "سرکار" ابھی
کفر و الحاد کے بے نور دیئے جلتے ہیں ـــ شمعِ اسلام سے "یہ لوگ" ہیں بیزار ابھی

جبر کے سائے تلے جنسِ وفا کا سودا ـــ پاک خطے میں شرافت کی ردا بکتی ہے
عصمتیں چیختی ہیں کوئی محافظ پہنچے ـــ "مینا بازار میں عورت کی حیا بکتی ہے"

لوگ دہراتے ہیں وعدے تو جواب آتا ہے ـــ "اعتبار اور ابھی اور ابھی اور ابھی"
ہم تو فی الحال مصائب سے نہیں ہیں فارغ ـــ انتظار اور ابھی اور ابھی اور ابھی

(یثرب)

تلخ و شیریں!

غلام نبی حیرت

تاریکیٔ ماحول میں کیا دیکھ رہا ہوں؟ — ملت کے مقدر کی فضا دیکھ رہا ہوں
مسلم کی ادا کفر نما دیکھ رہا ہوں — تقدیر کے ہیٹے کی قضا دیکھ رہا ہوں
آئینِ محمدؐ سے گریزاں ہیں مسلماں — بربادیٔ ملت کی بنا دیکھ رہا ہوں
"تجویزِ مقاصد" کے تقاضوں سے تغافل — اربابِ قیادت کی خطا دیکھ رہا ہوں
گم کردۂ منزل ہے تو اے قافلہ سالار! — حسرت سے تری لغزشِ پا دیکھ رہا ہوں!
صد حیف! ترے حال پہ اے دخترِ ملت! — آنکھیں تری محرومِ حیا دیکھ رہا ہوں
محرومِ نظر آنکھ ہے، دل فکر سے عاری — ملت کے جوانوں کی ادا دیکھ رہا ہوں
انساں ہے گرفتارِ فسوں کاریٔ انساں — بنتے ہوئے بندوں کو خدا دیکھ رہا ہوں
پیرانِ حرم دیر و کلیسا کے نگہباں! — منظر میں یہ کیا ہوش ربا دیکھ رہا ہوں

ان تلخ حقائق پہ بھی مایوس نہیں ہوں
اک بات میں امید فزا دیکھ رہا ہوں
اٹھا ہے قدم سوئے حرم اہلِ وفا کا
ہر گام پہ اک نقشِ وفا دیکھ رہا ہوں
حیرت! ہے یہ اعجاز ترے سوزِ دروں کا
دل میں رمقِ عزمِ وفا دیکھ رہا ہوں
اور مطلعِ امید سے اس تیرہ شبی میں
آثارِ سحر شمسِ ضحیٰ دیکھ رہا ہوں

ایک اور تضاد

گوھر گیلانی

میرے عزیز مکرم سید آلِ رسولؐ صاحب قطبی جو ایک سحر آفریں قلم رکھتے ہیں۔ کچھ روز پہلے بہت بُری طرح "ترقی زدہ" تھے، نہ جانے کیوں مجھے ان کی ترقی زدگی سے شدید اختلاف ہونے کے باوجود ان کی ذاتِ گرامی سے اس وقت بھی بے انتہا محبت تھی۔ ذیل کے چند اشعار اُنھی ایام کی یادگار ہیں۔ اب تو وہ بفضلہٖ تعالیٰ انجمن تعمیر پسند مصنفین مالیر کے لئے سرمایۂ افتخار ہیں اور اسلام کے ایک مخلص سپاہی ہیں۔ (گوہر)

مسکراتے ہیں دہر کے شیطاں
آلِ طاغوت گنگناتی ہے
ایک "آلِ رسولؐ" گُم رَہ ہے
زندگی پیچ و تاب کھاتی ہے

دم بخود آج کائنات تمام!
اشتراکی ہے سیدِ قطبی
شمعِ وحدت کو اپنی پھونکوں سے
خود بجھاتی ہے آج آلِ نبیؐ

روحِ شبیر مضطرب سی ہے آج
اس کی اولاد، اور عشقِ یزید؟
ایک سید کے دستِ اطہر سے
ایک جرمن[1] یہود کی تائید؟

آپ کے پاک ذہن کی تخلیق
آج ہے اشتراکیوں کے نصیب
جیسے سورج ہو شپروں پہ نثار
جیسے ہو نور ظلمتوں کا نقیب

پھر سے اسلام کے عساکر میں
کروٹیں انقلاب لیتا ہے
آپ سے آپ کی مساعی کا
ایک سید حساب لیتا ہے

[1] کارل مارکس۔

(جہاں نما)

اَلمُلکُ لِلّٰہِ وَالحُکمُ لِلّٰہِ!

عروج قادری

یہ چاند، سُورج، بے داغ تارے کہتے ہیں مجھ سے سارے کے سارے
الملک للّٰہ والحکم للّٰہ

کوہِ ہمالہ ساکت کھڑا ہے چُپ چاپ شاید یہ سوچتا ہے
الملک للّٰہ والحکم للّٰہ

چوٹی جو اس کی اونچی ہے سب سے کہتی ہے سب سے کیا کہیے کب سے
الملک للّٰہ والحکم للّٰہ

سینے سے اس کے پھوٹی ہے ندّی یہ گیت گاتی، دُھوم مچاتی
الملک للّٰہ والحکم للّٰہ

موّاج دریا، پرجوش دھارے سادہ کنائے! شوخ اشارے!
الملک للّٰہ والحکم للّٰہ

یہ گُل فروشی! یہ لالہ کاری کہتی ہے مجھ سے بادِ بہاری
الملک للّٰہ والحکم للّٰہ

گُل پوش وادی گُل ریز گلشن کہتی ہے مجھ سے بے باک سوسن
الملک للّٰہ والحکم للّٰہ

بیلا بھی لہکا، چمپا بھی مہکی کوئل بھی کوکی بُلبُل بھی چہکی
الملک للّٰہ والحکم للّٰہ

تو نے سُنا کیا مالی، رے مالی جُھک جُھک کے تجھ سے کہتی ہے ڈالی
الملک للّٰہ والحکم للّٰہ

(یثرب)

ایک سوال!

تہذیب حاضر کے معمار سے

اکمل یزدانی

زیست کی راہ جو ہموار تھی آساں تھی بہت!
پرخطر اور کٹھن اس کو بنایا کس نے؟
لالہ و گل سے سجایا تھا اسے فطرت نے!
فرش کانٹوں کا بتا آج بچھایا کس نے؟
سوچ اور سوچ کے تہذیب کے معمار! بتا!
کون ہے موردِ الزام بتا "تو" کہ خدا؟

کیا ترے کھیت اُگاتے نہیں دانے اب بھی؟
مینہ لٹاتا نہیں کیا اپنے خزانے اب بھی؟
شام پھیلاتی نہیں تجھ پہ سکوں کی چادر؟
صبح آتی نہیں کیا تجھ کو جگانے اب بھی؟
جبکہ عالم ہے وُہی، صبح وہی شام وُہی!
میکدہ ہے وہی ساغر ہے وہی جام وہی!
پھر یہ دنیا میں بتا بھوک کی لعنت کیوں ہے؟
قتل و خوں کیوں ہے یہ بیکاری یہ وحشت کیوں ہے؟
دانے دانے کو ترستا ہے بتا کیوں دہقاں؟
ہر طرف جور و جفا کیوں ہے، قیامت کیوں ہے؟
سوچ اور سوچ کے تہذیب کے معمار! بتا!
کون ہے موردِ الزام بتا "تو" کہ خدا؟

(ضرب)

مستور حقائق

مصطفیٰ شاہین

(۱)

اے مرے دوست بتا
تو نے سوچا ہے کبھی زیست کا مقصد کیا ہے
یہ شب و روز کے ہنگامے۔ یہ محفل یہ سکوت
زندگی راگ کی مانند اُبھرتی۔ دبتی
اور بہتے ہوئے دریا کی طرح نیز خموش
یہ حبابوں کی نمائش کہیں موجوں کا خروش
کہیں گرداب کے خونخوار دہانے کی نمو
اس بہاؤ کے کنارے پہ کھڑے ہو کے رفیق
تو نے دیکھے ہیں کبھی زیست کے دھاروں کے نقوش

(۲)

ایک ماحول کی بجھتی ہوئی دُھندلی سی لکیر
یہ ہے معبود تری ؟
یہ حوادث کے تھپیڑوں سے مٹی جاتی ہے
موت، خونخوار و سیہ کار اندھیرے کی طرح
جس کی ہر صبح پہ منڈلاتی ہے اٹھلاتی ہے
جس کی مٹتی ہوئی تاریخ کے مبہم سے حروف
ہر بدلتے ہوئے سائے میں نظر آتے ہیں
ہاں وہ ماحول کی بجھتی ہوئی دُھندلی سی لکیر
وہی منزل ہے تری!

(۳)

راہ گُم کردہ مسافر۔ تری منزل کے نشاں
ایک آشفتہ پپیہے کی طرح
جستجو تیری کیا کرتے ہیں
یہ ستاروں کے کنائے، یہ ضیائے مہتاب
یہ شب و روز کی حرکت یہ حوادث کی نمو
یہ حرارت یہ برودت یہ بہار اور خزاں
یہ ترے قلب کی دھڑکن کے نمایاں پہلو
یہ اشارے ہیں تجھے راہ دکھانے کے لئے
یہ سہارے ہیں تجھے پار لگانے کے لئے

(یثرب)

ماسکو کے دعوت نامہ پر

اباد شاہ پوری

ماسکو سے ہمارے وزیراعظم کو دعوت نامہ آیا ہے۔ پاکستان کے عوام اور خواص سبھی خوش ہیں کہ دُنیا کے بازار میں ہماری بھی مانگ ہے۔ مگر شاعر اس دعوت نامے کی خبر سُن کر کسی اور سوچ میں پڑ جاتا ہے۔ یہ تین شعر اسی سوچ کا نتیجہ ہیں۔ کاش ہمارے اربابِ اقتدار کو پتہ چل سکتا کہ اس دیس میں اس انداز سے بھی سوچنے والے لوگ ہیں ـــــ ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ سوچ کا یہی انداز اس دن کی صحیح ترجمانی ہے۔

بیدار رہے ہشیار رہے مومن کی فراست
پہچانتی ہے خوب ہے کیا زہر ہے کیا قند

جو قوم ہو فرمانِ "اِنِ الحُکمُ" کی پیرو
طاغوت کو وہ مان لے کس طرح خداوند

اے ملّتِ خوں رنگ! مسلماں کے جگر میں
تازہ ہے ابھی زخمِ بُخارا و سمرقند

(یثرب)

—— + ——

فن کار!

اباد شاہ یوری

میرے کچھ دوست عیش گاہوں میں
خُم لنڈھاتے ہیں زر لٹاتے ہیں

حُسنِ عُریاں کی تھام کر باہیں
رقص کرتے ہیں گیت گاتے ہیں

کھیل کر "نوجوان غریبی" سے
تشنگی نفس کی بجھاتے ہیں

اور جس وقت عیش گاہوں سے
بن کے فن کار باہر آتے ہیں

دردِ مزدور دل میں اٹھتا ہے
شعر کہتے ہیں بیچ کھاتے ہیں

(رحیل)

—— + ——

پیمان!

عبدالعزیز قاضی

اپنے اللہ سے پیمان کیا تھا میں نے
ابنِ آدم کو پھر انسان بنا دینے کا
اس کے قرآن کی عظمت کا سہارا لے کر
دھجیاں کفر کے پرچم کی اڑا دینے کا

چھوڑ یہ ساغر و مینا کے فسانے اے دوست
مجھ کو شمشیر و سناں بڑھ کے اٹھا لینے دے
میں نے مایوس اندھیروں میں ضیا دیکھی ہے
پھر مجھے عظمتِ ماضی کو بُلا لینے دے

یہ ترے دیر و کلیسا کے فلک بوس ستوں
ایک ہی نعرۂ تکبیر سے ہل جائیں گے
حق کا سیلاب جہانگیر جو میں لاؤں گا
اس سے ٹکرائے تو سب خاک میں مل جائیں گے

زرد ہونٹوں پہ مچلتی ہوئی غمناک آہیں
دیکھنا میں انھیں گیتوں میں بدل ڈالوں گا
اور زردار کے ناپاک ارادوں کے طلسم
ایک ہی ضربِ کلیمی سے مسل ڈالوں گا

زندگی درد و غم و یاس کا ویرانہ سہی
اس میں ایمان کی قندیل جلاؤں گا میں
اور توحید کے پھولوں سے سجا کر اس کو
ایک پُر کیف چمن زار بناؤں گا میں

اپنے اللہ سے جو پیمان کیا تھا میں نے
اب عمل میں اُسے لانے کا زمانہ آیا
ابنِ آدم کو جو تخریب پہ اکساتا ہے
اس تمدن کو مٹانے کا زمانہ آیا

چھوڑ اب ساغر و مینا کے فسانے اے دوست
مجھ کو شمشیر و سناں بڑھ کے اٹھا لینے دے
اور وہ راہیں جو ہیں صدیوں سے ویراں سنساں
وقت کو پھر انھی راہوں پہ چلا لینے دے

کھوج !

نازش پرتاب گڈھی

میں ہوں اک افلاس زدہ میں دمن دولت سے دور
میں دُنیا کا دھتکارا ہوں، میں ہوں اک مزدور
آج تری چوکھٹ پہ آیا ہوں میں آس لگائے
تو ہمدرد غریبوں کا ہے، تو منصف کہلائے
اس دُنیا میں کہیں نہیں ہے "قُرانی سرکار"
یہ کنگلے دُکھ درد سُنائیں اب کس کے دربار
ڈھونڈھ رہا ہوں ایسا مالک جو دُکھ درد اٹھائے؛
خود پیدل ہو اور سواری پہ نوکر کو بٹھائے؛
اک ایسا دربار کہ جس میں شوکت ہو نہ شان؛
اک ایسا دھنوان کہ جس کی دولت ہو ایمان؛
اک ایسا مُہاراج کہ آئے دُکھیاروں کے کام؛
اور بٹھائے اک آسن پہ آقا اور غلام؛
ڈھونڈھ رہا ہوں ایسا آقا جو دُکھ درد اٹھائے؛
جو سرکار کہ حبشی زادے کو آقا بتلائے؛
جس کی نیائے پسندی کا گُن گائے یہ سنسار؛
ٹوک سکے اک مفلس جس کو بیچ دربار؛

آیا ہوں ترے شہر لوں میں بن کر اک فریادی
اب تو پوری ہو بھی چکی ہم کنگلوں کی بربادی
اب تو ضرورت ہے کہ پھر فاروق سا بندہ آئے
تیری شرابِ ناب کے ہم کو بھر بھر جام پلائے
میری آس اے آنکھوں کے اجیارے ٹوٹ نہ جائے
کہیں میری تقدیر خدایا پھر سے پھوٹ نہ جائے
چھوڑ کے تیری چوکھٹ کنگلا کہاں کی ٹھوکر کھائے
تو ہمدرد غریبوں کا ہے تو منصف کہلائے
میں ہوں اک افلاس زدہ میں دمن دولت سے دور
میں دُنیا کا دُھتکارا ہوں، میں ہوں اک مزدور

ماسکو پوچھتا ہے

مفکر ادیب جواب دیں

انور اعظمی

زندگی شعلۂ خاکی کا دھواں ہے شاید
سایۂ سلسلۂ ابرِ رواں ہے شاید

گنبدِ ذوقِ تجدد سے پھسل جاتی ہے
گود میں عقل کی آتی ہے نکل جاتی ہے

دھوپ کی طرح ابھرتی ہے تو ڈھل جاتی ہے
زیست اک کشمکشِ وہم و گماں ہے شاید

جذبِ بیدار امنگوں میں توانائی ہے
خونِ انساں سے زمانے میں بہار آئی ہے

ملک گیری ہے جفاکاری ہے دارائی ہے
زندگی جوہرِ شمشیر و سناں ہے شاید

گیسوئے لیلیٔ افکار پریشاں کیوں ہے؟
جادوئے نرگسِ تحقیق گریزاں کیوں ہے؟

آدمی شعلۂ احساس سے لرزاں کیوں ہے؟
سایۂ زیست کوئی جنسِ گراں ہے شاید!

آہ مزدور نے تخلیق جو کی سرخ سحر
اُس کے سورج نے دیا تحفۂ صد برق و شرر

پھر وہی نالۂ بے تاب، وہی دردِ جگر
زندگی شیوۂ فریاد و فغاں ہے شاید!

حسنِ بے باک کے جلوے میں لپک ہے پیدا
گردشِ جام کی محفل میں کھنک ہے پیدا

رخِ ہستی پہ ہوس کا رجھلک ہے پیدا
زیست اک غمزۂ ناہید رخاں ہے شاید

شمعِ تحقیق کی خاموش ہوئی جاتی ہے
زیست اک خوابِ فراموش ہوئی جاتی ہے

پردۂ مرگ میں روپوش ہوئی جاتی ہے
زندگانی کا کوئی اور جہاں ہے شاید

جلوۂ زیست نگاہوں سے گریزاں کیوں ہے؟
موت کی دھند کا امڈا ہوا طوفاں کیوں ہے؟

فکرِ اندیشۂ انجام سے لرزاں کیوں ہے؟
ہے کوئی راز جو پردے میں نہاں ہے شاید

ختم یہ کشمکشِ آہ و اثر کب ہوگی؟
موجیں بے تاب ہیں تخلیقِ گہر کب ہوگی؟
رات کے پنجے سے آزاد سحر کب ہوگی؟
سحرِ زیست ہی محرومِ اذاں ہے شاید

—— + ——

میں خاموش نہیں رہ سکتا!

شاہد نقوی

میرے معبود! میں خاموش نہیں رہ سکتا!

میں نے اس باغ کی تعمیر میں کیا کچھ نہ دیا
اپنے آبا کے نقوش! اپنے بڑوں کی عزت!
اپنے بھائی کا شباب! اپنی بھتیجی کا سہاگ!
اپنے بچوں کا لہو، اپنی بہن کی عصمت!

میں بھی انسان ہوں، جذبات و زباں رکھتا ہوں!
تابکے ضبط کروں پیکرِ سنگیں بن کر؟
پاسباں اپنے گلستاں کا بنایا تھا جنھیں
لوٹے لیتے ہیں وہی باغ کو گلچیں بن کر!

بے نیازی تو کوئی اہلِ جفا کی دیکھے!
جیسے اب ان کو مری کوئی ضرورت ہی نہیں
میں نے اس باغ کو سینچا تھا لہو دے دے کر
کیا مرے خون کی یارب! کوئی قیمت ہی نہیں!

سوچتا یہ ہوں کہ ظالم سہی گلچیں، لیکن
یہ اجازت، یہ عنایت، یہ عطا کس کی ہے؟
کس نے خوں بخش دیا ان کو جواں پھولوں کا؟
یہ بہاریں اگر اجڑیں، تو خطا کس کی ہے؟

آہ خود میں نے انھیں باغ میں در آنے دیا!

دعاء!

ابوالاشرف شبیر بخاری

نہادِ عصر میں طاغوت کا بسیرا ہے!
جمایا ظلم نے دنیا میں پھر سے ڈیرا ہے!
چراغِ "امن" کو پھر آندھیوں نے گھیرا ہے!
ہجوم یاس ہے اور چار سو اندھیرا ہے!

مرے کریم! اندھیرے میں پھر اجالا کر!
قرار دادِ مقاصد! کا بول بالا کر!

معاشیات' پہ آپس میں پھٹ گئیں قومیں!
ترے نظام محبت سے کٹ گئیں قومیں!
دغا نصیب گروہوں میں بٹ گئیں قومیں!
مقامِ عدل و دیانت سے ہٹ گئیں قومیں!

مرے کریم! اندھیرا ہے! پھر اُجالا کر!
قرار دادِ مقاصد! کا بول بالا کر!

ترے جہاں میں ہیں برگشتۂ ستم جمہور!
ذلیل و پست و زبوں، کشتۂ الم جمہور!
ستم شکار و گرفتارِ بیش و کم جمہور!
قتیلِ عشوۂ صد کیقباد و جم جمہور!

مرے کریم! اندھیرا ہے! پھر اُجالا کر!
قرار دادِ مقاصد! کا بول بالا کر! ۔

تضاد ــــــ!

نعیم صدیقی

"قراردادِ مقاصد" کے تم مصنف تھے ! یہ صور پھونک کے اب کھو گئے کہاں آخر؟
زمانے بھر کی امامت کے مدعی بن کر رہِ حیات میں گُم ہو گئے کہاں آخر؟
نمازِ عشق اقامت کی منتظر ہے ابھی اذاں پکار کے تم سو گئے کہاں آخر؟

+

عجیب طُرفہ تماشا ہے قبر کے مُردے حیاتِ نو کا پیامِ لطیف لائے ہیں
الٰہی خیر! خطرناک ہیں یہ اندھیرے! کہ چاند تارے قباؤں پہ خود سجائے ہیں
چمن میں چل کے ذرا دیکھئے تو یہ اعجاز! خزاں کی روحِ فسردہ نے گُل کھلائے ہیں!

+

لگایا داؤں میں دینِ نبیؐ کی عصمت کو ہمارے چند سیاسی قمار بازوں نے
"متاعِ صدق وصفا" کا لگا دیا تختہ دکانِ کذب کے باہر زمانہ سازوں نے
لباسِ دیں میں ہے رقصاں سیاستِ افرنگ کمال فن یہ دکھایا فسوں طرازوں نے

+

شکاریوں نے بُنا مل کے دامِ "حَبلِ اللہ" عوامِ سادہ منش کے شکار کرنے کو
چلے میں ڈال کے جیبوں میں دین کے سکّے یہ لوگ حرص کا پھر کاروبار کرنے کو
متاعِ حرمتِ کعبہ کو لے چلے کچھ لوگ بتانِ دیر کے آگے نثار کرنے کو

+

قرار دادِ مقاصد کی لگ چکی میزان ! زمانہ آپ کی سیرت کو اس پہ تولے گا
تمام کھوٹ عیاں ہوں گے اس کسوٹی پہ ہوا کہیں کوئی جو ہر تو آپ بولے گا
تمہارے قول و عمل میں اگر تضاد رہا یہ چیرہ دست زمانہ ہے راز کھولے گا

+

یہ لفظ اٹھ کے جو بولے گئے ہیں محفل میں ہم اُن کے معنیٰ کا پورا حساب مانگیں گے
یہ جس سوال کو چھیڑا گیا ہے برسرِ عام عوام قوم اب اس کا جواب مانگیں گے
جو "سبز باغ" دکھایا گیا ہے لوگ اس میں نوائے بُلبُل و بوئے گلاب مانگیں گے

+

خدا ہی جانے! یہ وعدہ برائے ایفا ہے کہ محض وقت گزاری کا اک بہانہ ہے
ہزار بار مبارک ہماری جانب سے اگر یہ آپ کا اعلان مخلصانہ ہے
ہم اس طلسم کے پرزے اڑا کے چھوڑیں گے اگر یہ سحرِ سیاسی کا شاخسانہ ہے!

+

مُڑا ہے قافلۂ شوق اب حرم کی طرف! یہ راہ اور ہے، اب رہنما بدل جائیں
چلا ہے اپنا سفینہ نئے سمندر میں! ہے التماس کہ اب ناخدا بدل جائیں
ہوا ارادۂ ترکِ نظامِ طاغوتی نظامِ نو کے لئے پیشوا بدل جائیں

+

نئے اصول، نیا فلسفہ، نظام نیا! ڈرو نہیں جو نئی قوتیں ظہور کریں!
وہ ہاتھ پاک ہیں، بڑھ بڑھ کے چومئے ان کو بُتانِ کہنہ کو جو ہاتھ چُور چُور کریں!

+

—+—

لبّیک!

نعیم صدیقی

غم نہ کر، اے آدمیت!
میں ترے کام آؤں گا!

+

جو صداقت مان لوں گا دہر سے منواؤں گا
اُلٹے سیدھے فلسفوں کی گردنیں جھکواؤں گا
زندگانی کو رہِ اسلام پر دوڑاؤں گا
غم نہ کر، اے آدمیت!
میں ترے کام آؤں گا!

+

دیکھنا، توراتِ ہستی کا ورق اُلٹاؤں گا
زندگی کی تُند رو کا رُخ معاً پلٹاؤں گا
روک لوں گا حال کو، ماضی کو میں لوٹاؤں گا
غم نہ کر، اے آدمیت!
میں ترے کام آؤں گا!

+

فکرِ نو کے نور میں تہذیب کو نہلاؤں گا
عاشقی کی آنچ سے تاریخ کو کھولاؤں گا
نغمۂ جذبات سے ماحول کو تڑپاؤں گا
غم نہ کر، اے آدمیت!
میں ترے کام آؤں گا!

+

آسمانی لے میں جب جنگی ترانے گاؤں گا
اک نوا میں بھیڑیوں چیتوں کے دل دہلاؤں گا
سونے والی غیرتوں کو چھیڑ کر اُکساؤں گا
غم نہ کر، اے آدمیت!
میں ترے کام آؤں گا!

+

جب دلوں پر اپنے شعروں کے شرر برساؤں گا
آگ اک سُلگاؤں گا، دہکاؤں گا، بھڑکاؤں گا
پھر اُسے دامن سے دے دے کر ہوا پھیلاؤں گا
غم نہ کر، اے آدمیت!
میں ترے کام آؤں گا!

+

صبحِ حق بن کر زمانے بھر پہ میں چھا جاؤں گا
فلکِ تازہ کی شعاعیں ہر طرف برساؤں گا
تیرگی کا سینہ چھید دوں گا جگر برماؤں گا
غم نہ کر، اے آدمیّت!
میں ترے کام آؤں گا!

+

اس طرح احساسِ قوّت ضعف کو دلواؤں گا
آبگینوں کو کُہساروں سے جا ٹکراؤں گا
قطرۂ شبنم سے جوئے خوں بہا دکھلاؤں گا
غم نہ کر، اے آدمیّت!
میں ترے کام آؤں گا!

+

تیری یہ نسل و وطن کی بیڑیاں کٹواؤں گا
تیرے یہ ذلّت کے زیور نوچ کر گلواؤں گا
تیرے زنداں کی ہر اک دیوارِ سنگیں ڈھاؤں گا
غم نہ کر، اے آدمیّت!
میں ترے کام آؤں گا!

+

اس چمن میں دیکھنا، کلیاں نئی چٹکاؤں گا
اُن کی بوئے جانفزا سے باغ کو مہکاؤں گا
بلبلوں کو آتشیں انداز سے چہکاؤں گا
غم نہ کر، اے آدمیّت!
میں ترے کام آؤں گا!

+

تیری خاطر ہر جگہ چوٹوں پہ چوٹیں کھاؤں گا
تیرے بچوں کے ستم سہتے ہوئے اتراؤں گا
کیا جفا ہوگی کہ جس کو میں نہیں سہ پاؤں گا
غم نہ کر، اے آدمیّت!
میں ترے کام آؤں گا!

+

تخت میں فاسد قیادت کا اُلٹنے جاؤں گا
آج جو نیچے گرے ہیں اُن کو اوپر لاؤں گا
جن کی حق ماری ہوئی ہے، اُن کو حق دلواؤں گا
غم نہ کر، اے آدمیّت!
میں ترے کام آؤں گا!

+

سر کچل دوں گا جہاں "منکر" کو رقصاں پاؤں گا
ہر طرف "معروف" کا فرمان بن کر چھاؤں گا
حق کی خاطر کشمکش کرتے فدا ہو جاؤں گا
غم نہ کر، اے آدمیّت!
میں ترے کام آؤں گا!

+

زلزلوں کی کچھ نئی لہروں کو یاں لہراؤں گا
دہر کو لرزاؤں گا، افلاک کو برماؤں گا
غم نہ کر سوئی ہوئی روحوں کو پھر تڑپاؤں گا
غم نہ کر، اے آدمیّت!
میں ترے کام آؤں گا!

+

انتخاب (۵)

اگست ۵۰ء تا اگست ۵۱ء

•

ماہر القادری
عبد الکریم ثمر
جگر مراد آبادی
عرشی بھوپالی
عاصی کرنالی
تسکین (علیگ)
عبد الرحمٰن طارق
ضیا محمد ضیا
سجاد شاہد
یوسف ظفر
اسد ملتانی
اعظم ادیب
ارشد کاظمی

•

•

شمیم جاوید
حفیظ میرٹھی
نجم الاسلام
ابو المجاہد زاہد
افسانہ گو
عذرا ناہید
مسعود جاوید
ابو البیان حمّاد
عروج قادری
تاب اسلم
حسان کلیمی
سہیل زیدی
نعیم صدیقی

•

حسن البنّا

ماہر القادری

مراکش، الجزائر کی بہاریں یاد کرتی ہیں
ابھی تک قاہرہ کی رہگزاریں یاد کرتی ہیں
ترے اخوان اب تک منتظر ہیں تیری آمد کے
کہ تجھ کو تیری زندہ یادگاریں یاد کرتی ہیں

★

عراقی مرغزاروں کی فضائیں یاد کرتی ہیں
فلسطیں کے اُفق کی بھی گھٹائیں یاد کرتی ہیں
ترا سینہ کہ اک آتشکدہ تھا سوزِ ملّت کا
تجھے لبنان کی ٹھنڈی ہوائیں یاد کرتی ہیں

★

کہیں خارا شگافی کی، کہیں آئینہ سازی کی
کہ تو میداں کا غازی بھی تھا مسجد کا نمازی بھی
ترے کردار میں تھا امتزاجِ شعلہ و شبنم
سراپا سعیٔ پیہم تھا مجسم پاک بازی بھی

★

یقیں کی آتشِ خاموش کو بھڑکا دیا تو نے
کہ مصری نوجوانوں کا لہو گرما دیا تو نے
خرد کہتی رہی ٹھیرو! بہت نازک زمانہ ہے
سفینے کو مگر طوفان سے ٹکرا دیا تو نے

اگر یہ واقعہ ہے مذہبِ اسلام زندہ ہے
تو پھر کیا ڈر ہے تو زندہ ترا پیغام زندہ ہے

(فاران)

ماہرالقادری

اِن کو پہچانیئے

رقص کے جلسوں کے یہ امام — قوم کو دیں گے کیا پیغام !
دل میں بُت خانے پنہاں — لب پر ہے "اسلام اسلام"
کوئی مرے مرجانے دو — ان کو اپنے عیش سے کام
بیوی، شوہر کے آگے — نامحرم سے گرم کلام
ان کے گھر کیوں آئے گا ! — یہ بے چارہ ماہِ صیام
ان کی بوتل قوس و قزح — ان کے ساغر ماہِ تمام
روح کہاں، بس ڈھانچے ہیں — تیغیں کیسی! صرف نیام
سچی بات بتانے پر — دارو رَسن کا دیں انعام
اہلِ صداقت پر رکھ دیں — غدر و بغاوت کا الزام
راج محل میں ناچ اور رنگ — پرجا کے گھر میں کہرام
جام و سبُو اور قوم کا غم — پھُول کی سیجیں فکرِ عوام
جشنِ آزادی کی قسم — فکر و نظر اب بھی ہیں غلام

(قاصد)

غزل ——— اور گیت بھی!

ماہرالقادری

کیسی موجیں کیا منجدھار — اب کے کشتی آر کہ پار
جتنے دیکھے دُنیا دار — تن چنگا اور مَن بیمار
عشق کہاں تک روکے گا — حُسن کے اوچھے اوچھے وار
اُمیدوں کے تاج محل — ارمانوں کے شالامار
ایک نہیں، دو چار نہیں — لاکھوں نظریں اُن پہ اُدھار
دنیا کیا اُمیدیں کیا! — کاغذ کے پھُولوں کے ہار
یہ بھی زمانہ دیکھ لیا — چور بنے ہیں چوکیدار
اُجلا ہے من کا درپن — پھر بھی اس کو اور نکھار

مُورکھ ہے وہ پاپی ہے
فرض کو جو سمجھے بیگار!

(یثرب)

آبگینے

ماہرالقادری

مفلسی ہے اور بیکاری کہاں ہے — رشوتوں کی گرم بازاری بھی ہے

حق پرستوں کے لئے ہے قید و بند — اہلِ باطل کی طرفداری بھی ہے

شیخ کو حاصل ہیں دو دو نسبتیں — خانقاہی بھی ہے، درباری بھی ہے

ڈھول، تاشے، پھول، باجہ، کھیل کود — اس پہ دعوئے عزاداری بھی ہے

تجھ کو اے جرمِ محبت کیا کہوں! — دل کہ انکاری بھی اقراری بھی ہے

ہو رہی ہیں زندگی کی کوششیں — خودکشی کا سلسلہ جاری بھی ہے

دل کی سچائی پہ ہے دار و مدار — عشق صحت بھی ہے بیماری بھی ہے

تیرے ساتھ اے مجلسِ[1] دستور ساز — جہل بھی ہے اور غلط کاری بھی ہے

اہلِ دنیا سے ہے بس اتنا سوال — آخرت کی کوئی تیاری بھی ہے؟

موت ہی کو زندگی کہتے ہیں لوگ — خواب ہی کا نام بیداری بھی ہے

داد دے، اے مُلک! اس تخئیل کی

لیگ قومی بھی ہے سرکاری بھی ہے

(یثرب)

[1] پاکستان کی مجلس دستور ساز جس نے سرتاپا غیر اسلامی دستور مرتب کیا اور اصرار اس پر کرتے ہیں اسے اسلامی سمجھو۔ (م)

باغباں بدلتے ہیں!

عبدالکریم ثمر

رہِ حیات کے کہنہ نشان بدلتے ہیں — قدم قدم پہ یہاں کارواں بدلتے ہیں
محیطِ زیست میں پھر انقلاب کے آثار — اُٹھو اسیرِ نیند کے ماتو جہاں بدلتے ہیں
گلہ یہ مجھ کو خدایانِ باد و خاک سے ہے — زمیں بدلتے نہیں آسماں بدلتے ہیں
بدل سکے نہ مری زندگی کے سفر و ضے — یقیں بدل نہیں سکتے گماں بدلتے ہیں
مری وفاؤں کو مشکوک جاننے والو — نئے تقاضے کبھی ناگہاں بدلتے ہیں
حقیقتوں کو جو کہتے ہیں آج افسانہ — وہ خود بدلتے نہیں داستاں بدلتے ہیں
نظامِ نو بھی چمن کا ہے قابلِ ترمیم — کہ گُل بدل نہ سکے باغباں بدلتے ہیں

بیانِ حق میں یہاں کٹ گئی زباں لمنے ثمر
مگر یہ کہہ نہ سکے ہم بیاں بدلتے ہیں

(چٹان)

ضبطِ محبّت شرطِ محبّت

جگر مرادآبادی

جہلِ خرد نے دن یہ دکھائے — گھٹ گئے انساں بڑھ گئے سائے
ہائے وہ کیوں کر جی بہلائے — غم بھی جس کو راس نہ آئے
حُسن یہی ہے عشق جو ظالم — ہاتھ لگائے، ہاتھ نہ آئے
نغمہ وہی ہے نغمہ کہ جس کو — رُوح سُنے اور رُوح سُنائے
کارِ زمانہ جتنا جتنا — بنتا جائے بگڑتا جائے
ضبطِ محبت، شرطِ محبت — جی ہے کہ ظالم اُمڈا آئے
جھوٹی ہے ہر ایک مسرت — روح اگر تسکین نہ پائے

راہِ جنوں آسان ہوئی ہے
زلف و مژہ کے سائے سائے

(یثرب)

کوریا

عرشی بھوپالی

ایٹمی طاقتوں کے سائے میں
امن کے بج رہے ہیں نقارے
موت کے دیوتا کے جبڑوں سے
مل رہا ہے حیات کا پیغام
دونوں جانب سے آج ایٹم بم
دھمکیاں دے رہا ہے انساں کو
منڈیوں کے سفید بیوپاری
سرد بازاریوں سے گھبرا کر
کارخانے نئے سجاتے ہیں
ڈھیر فولاد کے لگاتے ہیں
روس کے آہنی کٹہروں سے
امنِ عالم کی آ رہی ہے صدا
اور دیوارِ چین کے پیچھے

جنگ کے بندھ رہے ہیں منصوبے
یہ درندے خدا کی دھرتی کو
کوریا کی غریب بستی کو
ناگا ساکی بنا کے چھوڑیں گے
ہیروشیما بنا کے چھوڑیں گے
ساتھیو مشعلوں کو تیز کرو
جنگ بازوں کا مُلک گیروں کا
موت کے سر پھرے نقیبوں کا
قافلہ تیز گام ہے کتنا
اور بھی قافلوں کو تیز کرو
جنگ کے دیوتا کے سینے پر
چڑھ کے لہرا دو امن کا پرچم

(یثرب)

فرقہ پرست!۔۔۔۔۔!!

عرشی بھوپالی

مرے شہر کے نوجواں
مجھے مشورہ دے رہے ہیں
یہاں بات اسلام کی مت کہو
یہ ہندوستاں ہے
یہاں ہندو فاشزم چھانے کو ہے
یہاں زندگی موت سے مات کھانے کو ہے
خدا جانے کیا ہو گیا ہے انہیں
کہ فرقہ پرستی کی مجھ پر لگاتے ہیں تہمت
بس اتنی خطا پر
مجھے قوم پرور سمجھنے لگے ہیں
کہ میں بات کہتا ہوں اسلام کی
میں تنقید کرتا ہوں الحاد پر
مجھے ان سے کیونکر شکایت نہ ہو
یہ اچھی طرح مجھ کو پہچانتے ہیں
مری زندگی میری تاریخ کو جانتے ہیں
کہ میں سرخ جمہوریت کا پجاری رہا ہوں
اندھیرے میں برسوں سسکتا رہا ہوں
یہ تاریکیاں مجھ سے چمٹی رہی ہیں
کہ انکے لئے میں نے جھیلیں سہی ہیں
یہ سب راگ میرے الاپے ہوئے ہیں
یہ سب فاصلے میرے ناپے ہوئے ہیں
مگر میں اجالے کا شیدا
اندھیرے میں کب تک بھٹکتا
کہاں تک دکھاتیں مجھے راستہ
لہو میں یہ بھیگی ہوئی مشعلیں
میں انسانیت کا پجاری
یہ جنگ اپنی فطرت سے کب تک میں کرتا
دو طبقوں میں انسان کو
کہاں تک میں تقسیم کرتا
میں سودائی آفاقیت کا
مجھے رنگ اور نسل سے کیا تعلق
کہاں تک بھلا
وطن اور قوموں کی تفریق کرتا
میں دنیا کا شہری
کہاں تک بھلا
نیشنل کیمپ کا ساتھ دیتا
صدا اُن کے اسلام کی چونک اٹھا
جھنجوڑا ہو جیسے کسی نے
مری رُوح کی بیکراں خامشی نے
جگایا ہو جیسے کسی نے مجھے
سُلگتے ہوئے خواب سے
نکالا ہو جیسے کسی نے
بھیانک اندھیرے سے مجھ کو
اُجالے کی جانب
اُجالے کی جانب میں بڑھتا گیا
اُجالے کی جانب میں بڑھتا گیا ہوں
اُجالے کی جانب میں انسانیت کو
ہمیشہ بُلاتا رہوں گا

(مشیر)

نیا سامراج

عرشی بھوپالی

نئے جام و صہبا نئی چھاگلیں ہیں
نئے چنگ و بربط نئی پائلیں ہیں
مسافر نئے ہیں نئی مشعلیں ہیں!
نئی کروٹیں لے رہا ہے سماج
جنم لے رہا ہے نیا سامراج

نئے برہمن ہیں نئے بُت کدے ہیں!
نئے محتسب ہیں نئے میکدے ہیں
نئے ماہ و انجم نئے غمکدے ہیں
اُجالے اندھیروں سے لیں گے خراج
جنم لے رہا ہے نیا سامراج

نئی نوابگی ہے نئے آستانے
نئی برچھیاں ہیں نئے تازیانے
نئی پھانسیاں ہیں نئے جیلخانے
نئی آمریت نئے تخت و تاج
جنم لے رہا ہے نیا سامراج

نئی گھاٹیاں ہیں نئے مرحلے ہیں
نئے راہزن ہیں نئے قافلے ہیں
یہ سب ایک زنجیر کے سلسلے ہیں
کہ الحاد ہے بربریت مزاج
جنم لے رہا ہے نیا سامراج

جیالے کسانوں نے چھیڑا کاہی خول
بہادر جوانوں کا اُبلا جنون
تو لوٹا کہیں زرگری کا فسوں
ہوا ختم سرمایہ داری نراج
جنم لے رہا ہے نیا سامراج

دلوں کو صداقت سے پُر نور کر!
محبت سے سینوں کو معمور کر!
ہر اک مرد مومن کو منصور کر!
زمانے میں پھیلا دے اسلام راج
جنم لے رہا ہے نیا سامراج

(الانصاف)

"پھولوں کا ہار"!

صہبا کرنالی

شمیم نے مجھے پھولوں کا ایک ہار دیا ! — متاعِ گلشن و سرمایۂ بہار دیا
بس ایک ایک لڑی رنگ و بُو کا طوفان تھی — میری نگاہ تو رنگینیوں میں ڈوب گئی
کسی نے ہار میں سمٹا لیا تھا تاروں کو — پرو دیا تھا چمکتے ہوئے نظاروں کو
مہک رہی تھیں گلوں کی لطافتیں اسمیں — دمک رہی تھیں شگوفوں کی عصمتیں اسمیں
عطا ہوا تھا تبسم انہیں فرشتوں کا — تھے چند پھول خلاصہ کئی بہشتوں کا
وہ تازگی، وہ لطافت، وہ رنگ و شادابی — وہ پھول تھے کہ بہاروں نے شاعری کی تھی
شگوفے نازک و مربوط، پھول وابستہ — تمام ہار تھا فطرت کا شعر برجستہ
کہا یہ نذر ہے لے میری زندگی کے شریک — کہ کوئی آپ سے بہتر نہیں مرے نزدیک
قبول میری طرف سے یہ پیشکش کیجے — اور آپ اپنے سے بہتر کو نذر کر دیجے!
اسیر دیکھ کے اپنی نوازشوں میں مجھے — کسی نے ڈال دیا آزمائشوں میں مجھے

کبھی کبھی وہ اگر مہرباں بھی ہوتے ہیں
کرم بھی ہوتے ہیں اور امتحاں بھی ہوتے ہیں

•

میں اپنے گھر سے وہ پھولوں کا ہار لے کے چلا — میں اپنے باغ سے فصلِ بہار لے کے چلا
سڑک کے موڑ سے جس دم مڑا سفر میرا — تو اک مزار کی جانب ہوا گذر میرا
غلافِ قبر پہ پھولوں کی چادریں دیکھیں — مری نگاہ نے دنیا میں جنتیں دیکھیں
حجابِ شام میں کلیوں کو لے کے آتی ہے — یہاں بہار جوانی لٹا کے جاتی ہے
یہاں گلوں کو ہوس کے اثر سے دیکھتے ہیں — اور اپنے اپنے مذاقِ نظر سے دیکھتے ہیں

لحد پہ پھول چڑھاؤں یہ اشتیاق نہیں
میں معتقد تو ہوں لیکن میں بد مذاق نہیں

•

کہ اتنی دیر میں گاڑی کے ایک ڈبے سے — پلیٹ فارم پہ دو چار آدمی اترے
اور ان میں ایک سپاہی مجھے نظر آیا — مرا ستارۂ تقدیر اوج پر آیا !
دلیر و حوصلہ مند و مجاہد و غازی — ہر اک نگاہ میں جذبات دل کی غمازی
چمک رہی تھیں چہرے پہ بجلیاں رقصاں — جبینِ قدس پہ ملت کی عظمتوں کے نشاں

نفس نفس سے نمایاں تھی مستیٔ کردار — مرے وطن کا محافظ، مرے چمن کی بہار
نشانِ جادۂ تقدیر اس سے تاباں ہے — کہ قافلے کے لیے مشعلِ فروزاں ہے
نقابِ ظلمتِ شبگوں کا چاک ہے اس سے — ہماری صبحِ وطن تابناک ہے اس سے
یہ فرد جو کہ ہے فوجی لباس میں ملبوس — اس ایک فرد سے قائم ہے قوم کا ناموس
وہ ایک قطرہ پسینہ جبینِ غازی کا — چمک رہا تھا ہمارے جلال کا تارا
قدم بڑھے تھے کہ محشر اٹھا دیا جیسے — مری نگاہ سے پردہ ہٹا دیا جیسے
نظر اٹھی تھی کہ تلوار چل گئی گویا — ذرا سی دیر میں دنیا بدل گئی گویا

میں اپنی پوری عقیدت کے ساتھ آگے بڑھا
اور اس سپاہی کے قدموں میں ہار ڈال دیا

★

خاتونِ حرم کی خدمت میں!

عاصی کرنالی

تو اپنی قوم کی عصمت ہے دخترِ اسلام — ہے بزمِ لالہ و گل سے بلند تیرا مقام!
تری نگاہِ مقدس کا مرتبہ یہ ہے — کہ تجھ کو عظمتِ جبریل نے کیا ہے سلام
جہاں پڑے ہیں تری طاعت و رضا کے قدم — وہ ارضِ پاک فرشتوں کی بوسہ گاہِ دوام
کوئی تو چیز ہے آخر حریمِ قدس ترا — کہ آفتاب کی کرنوں سے دور ہے یہ مقام
تری بہار ہے قائم وفا کے پھولوں سے — وہ ایک حسن جو ہوتا ہے زینتِ در و بام

•

نہ اس میں جلوۂ عرفاں، نہ اس میں نورِ یقیں — وہ ایک چہرہ کہ ہے داغدارِ بادہ و جام
ضمیر و روح کی پاکیزگی سے خالی ہے — وہ جسم جو سرِ بازار ہو گیا نیلام
تو شکر کر، کہ ہیں بے داغ خلوتیں تیری — مری نظر میں ہے جلوت گروں کی رنگیں شام
تو شکر کر، تیری سیرت ہے مطلعِ انوار — ہے ورنہ اہلِ ہوس کی نگاہ ظلمتِ شام

مرے سخن کی وساطت سے عصمتِ مریم
تری حمیتِ ملی پہ بھیجتی ہے سلام

عنوانِ فکر

عاصی کرنالی

ہمارے فکر کے عنواں بدل جائیں تو کیا ہوگا!
اگر ہم وقت کے سانچے میں ڈھل جائیں تو کیا ہوگا

یہی جذبات جو سینے کی گہرائی میں سوتے ہیں
یہی طوفاں کناروں سے نکل جائیں تو کیا ہوگا

یہی آنسو جو بہہ کر جذب ہو جاتے ہیں دامن میں
یہی موجیں اگر پہلو بدل جائیں تو کیا ہوگا

ہمارے سوزِ پنہاں کا تمسخر کیوں اُڑاتے ہو
یہ فریادیں ذرا سانچے میں ڈھل جائیں تو کیا ہوگا

ہیں اپنے ظرف کی وسعت پہ کیوں خوش اہلِ میخانہ
اگر ساقی کے پیمانے بدل جائیں تو کیا ہوگا

وہ انساں جس کی منزل ماورائے لالہ و گل ہے
وہی سیرِ گلستاں سے بہل جائیں تو کیا ہوگا

زمانے کے تقاضے خود زمانے نے بدل ڈالے
مشیت کے تقاضے بھی بدل جائیں تو کیا ہوگا

بجھا ڈالی ہیں میں نے آستیں سے بزم کی شمعیں
ستارے بھی مرے دامن میں ڈھل جائیں تو کیا ہوگا

(آفاق لاہور)

ترقی پسند دانشوروں سے!

تسکین علیگ

میں تو رجعت پسند ہوں مانا ہاں مگر تم نے کیا کیا اب تک ؟
جیب و دامن کی دھجیاں دیکھیں جیب و دامن کوئی سیا اب تک ؟

ہاں بتاؤ کہ آج تک تم لوگ کشت و خوں کا جنون روک سکے ؟
شیطنت کر رہی ہے صدیوں سے آدمیّت کا خون! ــــ روک سکے ؟

زندگی خون میں نہا آئی علم و تہذیب کے علمبدارو!
تم اسے جامۂ ادب دے کر فخر فرما رہے ہو فنکارو!

اپنے دامن کی جنبشیں روکو شمع کی لو نہ اور بھڑکاؤ
صبح ہونے کا انتظار کرو اس اُجالے کی نیرگی پہ نہ جاؤ

لوگ کہتے ہیں جھوٹ کہتے ہیں! یہ اُجالا نہیں، اندھیرا ہے!
ہاں یہ سچ ہے کہ انتظار کرو کوئی دم اور ــــ پھر سویرا ہے!

لوگ کہتے ہیں جنگ چھڑ جائے جنگ بھی امن لائے گی آخر
اور کھانے دو ٹھوکریں کچھ روز راہ پر زیست آئے گی آخر

"بربریت کا راج ہے ہر سُو" لوگ کہتے ہیں انکو کہنے دو!
ہے ازل ہی سے اس جہاں کا نصیب بربریت کا راج! رہنے دو!

لوگ کہتے ہیں راج بدلیں گے! راج بدلا، مگر، تو کیا ہوگا؟
کیسے ہوگا علاجِ سوزِ دروں؟ دل نہ بدلا اگر تو کیا ہوگا؟

زندگی راہِ مستقیم نہیں یہ نشیب و فراز رہنے دو!
میرے دانشورو خدا کے لئے آفرینش کو راز رہنے دو!

جسم کے داغ دیکھتے ہو تم دیکھ لو کاش رُوح کے ناسُور
کاش ہے نورِ انجمن کے لئے ڈھونڈ کر لاؤ کوئی شعلۂ طُور (قاصد)

تجلّیاتِ حقیقت

عبدالرحمٰن طارق

رہی ہے وقفِ تگ و تاز کائنات کی روح
فریب تیرے تصور کا ہے سکون و ثبات

الگ نہ فکر کو کر ذکر کی تجلّی سے
کہ ذکر و فکر سے کامل ہے مومنوں کی برات

جلالِ حق سے اثر لیں اگر تری آنکھیں
تمام لشکرِ باطل تری نظر سے ہو مات

گمان و ظن سے نہ برباد کر خودی اپنی
فقط یقین سے ملتا ہے امتوں کو ثبات

امم کی روح کو اک فرد ہی بدلتا ہے
یہی ہے جوہرِ حکمت، یہی ہے راز کی بات

شعورِ وحدتِ باری ترے لئے ہے محال
تری جبیں کا ہیں مرجع ہوس کے لات و منات

اگر ہو شعر میں فطرت کا عکس اسے طارق
ہر اک لفظ میں آئے گا لطفِ قند و نبات

تغیّرات

عبدالرحمٰن طارق

اسلام کے نظام سے اس کو ہے انحراف
یا رب! ہمارے فہم قیادت کو کیا ہوا

ہے دین سے نفور، ترقی کی ہے ہوس
اس قوم کے شعورِ سیاست کو کیا ہو

"مومن" ہیں اور کفر کے آئین پہ نثار
وا حسرتا حمیت و غیرت کو کیا ہوا

شاہی کی بو ہے ان کے تمدن سے آ رہی
اسلامیوں کے ذوقِ خلافت کو کیا ہوا

ظاہر ہے خوفِ کفر کا ہر قول و فعل سے
ہمت کو اور عزم و شجاعت کو کیا ہوا

دنیا میں بھی نفاق ہے، دیں میں بھی ہے نفاق
امدادِ باہمی کو، اخوت کو کیا ہوا

واعظ بھی "مصلحت" سے چھپاتا ہے قولِ حق
جرأت کو اور نطقِ صداقت کو کیا ہوا

پیتے ہیں اہلِ زر رگِ مزدور سے لہو
رحم و کرم کو، روحِ عدالت کو کیا ہوا

عصمت کو بیچ کھاتی ہیں حوّا کی بیٹیاں
تقدیس روحِ عصمت و عفت کو کیا ہوا

انساں کہ جس سے آتی ہے اب وحشیوں کو عار!
انسان کے مقامِ شرافت کو کیا ہوا

ملّتِ خوابیدہ! جاگ

ضیا محمد ضیا

روزِ روشن پر مسلّط ہو گئی تاریک رات
زندگی سہمی ہوئی ہے گم ہے نبضِ کائنات
موت گاتی پھر رہی ہے اپنا وحشت خیز راگ
ملّتِ خوابیدہ! جاگ!

تیرے لیڈر اور حاکم تیرے واعظ اور خطیب
تیرے صوفی اور مفتی تیرے شاعر اور ادیب
ڈس رہے تیری رُوحِ مضمحل کو کتنے ناگ
ملّتِ خوابیدہ! جاگ!

ناخدا ہیں بے خدا اور اہلِ کشتی بے خبر
راہرو انجان ہے اور راستہ ہے پُر خطر
سیدھے سادے ہیں عوام اور رہنما ہیں تیر کے گھاگ
ملّتِ خوابیدہ! جاگ!

تیری عزت کے لئے ذلت گوارا ہم نے کی
تیری خاطر آج ہم نے ہر مصیبت مول لی
ہم نے چاہا چھین لیں اہلِ ہوس سے تیری باگ
ملّتِ خوابیدہ! جاگ

ہر طرف سے تیرے دشمن ہیں تجھے گھیرے ہوئے
اور اہلِ دیں ہیں اپنے دیں سے منہ پھیرے ہوئے
سوزِ ایماں سے لگا دے خرمنِ باطل میں آگ
ملّتِ خوابیدہ! جاگ

آج پھر بگڑا ہے تیرے پیشواؤں کا مزاج!
ہم بھی جن کو پیش کرتے تھے محبت کا خراج
بات کیا ہے بہہ رہا ہے آج انکے منہ سے جھاگ
ملّتِ خوابیدہ! جاگ

★

اَب بھی ——●

ضیا محمد ضیا

یہ کیا اندھیر ہے مِلّت ہے ذِلّت کا شکار اب بھی
چلی آتی ہے دولت آج زر داروں کے دامن میں
غریبوں کے لئے مسدود ہیں راہیں معیشت کی!
وطن میں اس سے بڑھ کر اور کیا طرزِ ستم ہو گی
کھُلے ہیں بے گناہوں کے لئے زنداں کے دروازے

بکامِ دشمناں ہے گردشِ لیل و نہار اب بھی
گریباں فاقہ مستوں کے مگر ہیں تار تار اب بھی
امیروں کا نہیں ہے رزقِ طیّب پر مدار اب بھی
لہو مزدور کا چوسیں اگر سرمایہ دار اب بھی
چمکتی ہے ستم کی سر پہ تیغِ آبدار اب بھی

"ہم کہاں جائیں گے"؟

(روحِ محمدؐ سے ایک خطاب)

سجاد شاہد

تو رعونت کی پرہول و سنگین چٹانوں کے مضبوط سینوں میں در آگیا
تو نے ظلمت کے خونیں ڈگر پر کلیجے کے داغوں کی ضو سے اجالا کیا
تو نے نسلی تفاوت کے پھنکتے ہوئے دیو سیرت بتوں کو شکستہ کیا
خاندانی بڑائی کے احساس کے آہنی پیکروں کو دو پارا کیا
تو نے صدیوں کی خوابِ گراں میں اسیر آدمیت کو غفلت سے چونکا دیا
ان گنت تیرگی کی تہوں کو نظر کی شعاعوں سے لمحوں میں پگھلا دیا
تو جہالت زدہ بادیہ کے دلوں کو حقیقت کی کرنوں سے برما گیا
ان کے یخ بستہ سینوں کو ایماں کے مسکراتے شراروں سے گرما گیا

تیرے پیغام کو تیرے جیوٹ سپاہی ترے بعد ہر سو سناتے رہے
تیرے پیرو ہر اک موڑ پر آدمی کو حقیقت کی راہیں دکھاتے رہے
سینۂ دہر پر تیرے ہاتھوں کے ترشے ہوئے نقش ہر دم نکھرتے رہے
تیرے خاکوں میں تیرے فدائی دلوں کے لہو سے نئے رنگ بھرتے رہے
لیکن آہستہ آہستہ کفر و ضلالت کی پرہول سازش بھی بڑھتی گئی
مات کھائے ہوئے قلبِ باطل میں نفرت کی اٹھتی ہوئی لہر چڑھتی گئی
سینکڑوں طرح سے جال پھینکے گئے، مختلف راستے آزمائے گئے
سیم و زر کی جھلک بھی دکھائی گئی، سلطنت کے بھی جلوے لٹائے گئے

صاف و شفاف سینوں میں نفرت کے خوش رنگ و مسموم پودے اگائے گئے
بھائی کو بھائی سے بھی لڑایا گیا — فرقہ بندی کے شوشے اٹھائے گئے
سینکڑوں سال کی مستقل کوششیں ہلکے ہلکے اپنا اثر کرتی رہیں
مرکزِ آدمیت جو تھا تیلیاں اس نشیمن کی یوں ہی بکھرتی رہیں

دو شرنگی سیاست کا جادو چلا۔ ہم گریباں سے اپنے الجھنے لگے
وہ اخوت کے تاباں دیئے جو فروزاں تھے سینوں میں آخر وہ بجھنے لگے
نور احساس اس طرح گھٹ سا گیا۔ ذہنیت اسطرح کچھ بدلنے لگی
وہ کرن جس نے عالم کو روشن کیا تیرگی کی گپھاؤں میں ڈھلنے لگی

جو زمانے کو رستہ دکھاتے رہے آخرش وہ خلاؤں میں خود کھو گئے
جو دلوں کو جگاتا کئے عمر بھر وقت کی تھپکیوں سے وہ خود سو گئے
رہنماؤں کی اندھی سیاست کے صدقے میں نکھرا ہوا کارواں لٹ گیا
باغبانوں کی غفلت سلامت رہے اپنا مہکا ہوا گلستاں لٹ گیا

اسلحوں کی گرج سیم و زر کی دمک کے تلاطم میں خود کو ڈبونے لگے
ڈالروں کے کھنکتے ہوئے تال اور سر پہ سیکھے ہوئے رقص ہونے لگے

اجنبی چوکھٹوں پر فقیروں کی مانند انصاف کی بھیک مانگی گئی!
اپنے دل کی خودی کے اجالوں کے بدلے میں اک موج تاریک مانگی گئی!
قوم کے غم میں قالین پر چلنے والے شکستہ دلوں سے گریزاں رہے
نت نیا روپ دھارے ہوئے راہزن رہنمائی کی صف میں نمایاں رہے
کوئی رہبر نہیں — راہ تاریک ہے اپنی منزل کا کیسے نشاں پائیں گے؟
ہم کہاں سے چلے تھے کہاں جائیں گے ہم کہاں جائیں گے ہم کہاں جائیں گے!

(مبشر)

آہنگ

سجاد شاہد

اٹھو ساتھیو اٹھ کے پرچم سنبھالو!

ابھی جنسِ اخلاص بدنام سی ہے
ابھی سعیِ بے لاگ ناکام سی ہے
وطن کے افق پر ابھی شام سی ہے

سروں پر نحوست کے گھیرے ہیں اب تک
دلوں میں رعونت کے ڈیرے ہیں اب تک
بہت دھندلے دھندلے سویرے ہیں اب تک

اٹھو اٹھ کے ماحول کا رخ نکھارو
فضاؤں میں اخوت کے جذبے ابھارو
سنوارو زمانے کی قسمت سنوارو

وہ سورج جو ابھرے تھے ڈھلنے لگے ہیں
نئے کچھ شرارے مچلنے لگے ہیں
جو سوئے تھے جذبے سنبھلنے لگے ہیں

وہ دیکھو — رو پہلے کنول مسکرائے
وہ دیکھو وہ سمٹے اندھیروں کے سائے
وہ دیکھو افق پر دیئے جگمگائے!

اٹھو ساتھیو اٹھ کے پرچم سنبھالو

●

ہم نوجوان

یوسف ظفر

خدا کی مشیت، محمد کی آن
پہاڑوں کے دل ہیں چٹانوں کی جان
ہم نوجوان
ہم نوجوان

دلاور، بہادر، جری، سرفروش
محمد کی صہبا کے ہم بادہ نوش
ہم نوجوان
ہم نوجوان

ہمارے اب و جد وہ صحرا نورد
شجاعت میں یکتا تھے جرأت میں فرد
ہم نوجوان
ہم نوجوان

ہمارے دلوں میں شجاعت کی آگ
ہمارے لبوں پر محبت کے راگ
ہم نوجوان
ہم نوجوان

محمد کا پیغام پھیلاتے ہیں
جسے اپنے کردار میں پاتے ہیں
ہم نوجوان
ہم نوجوان

●

کجا دستور جمہوری؟

اسد ملتانی

مسلمانوں کے لائق مزدکیت ہے نہ فغفوری — وہ ہے اللہ سے دوری یہ انسانوں سے مہجوری

کمالِ آدمیت منحصر ہے حسن سیرت پہ — کہ معیارِ شرف سرمایہ داری ہے نہ مزدوری

بھلا وحی و رسالت کی ضرورت ہی کہاں پڑتی — جو ہوتی عقل ہی سے زندگی کی رہبری پوری

بنا اسلام کی احکامِ قرآنی پہ قائم ہے — یہاں نا معتبر ہے قلت و کثرت کی منظوری

مسلماں کے لئے قرآں ہے سرچشمۂ قوت — نہ ہو کیوں ضعف اتنا جسقدر قرآں سے ہے دوری

نہ ہیں ارباب باطل بہرہ ور فیضِ رسالت سے — نہ روشن ان پہ اپنے دیدۂ باطل کی بے نوری

تعجب ہے مگر ملت کی اس ذہنی غلامی پہ — کہ ہم از خود کریں جو اور کرتے ہیں بہ مجبوری

وہ عقلِ عام پر مبنی ہے یہ وحیِ الٰہی پہ
کجا آئینِ اسلامی کجا دستورِ جمہوری

(طلوع اسلام)

مینا بازار

اعظم ادیب

آؤ ــــ آزادیٔ نسواں کی زیارت کر لو
ایک لغزیدہ جسارت کر لو
آؤ بے باک چلے آؤ، کوئی پردہ نہیں!
راستہ صاف ہے، اب حسرتِ ناکردہ نہیں
تم اسے خدمتِ ملی سے عبارت کر لو
حرمِ نو کی زیارت کر لو

آپ کے پاس کوئی نادرہ سوغات بھی ہے
نادرہ ہو نہ ہو، کوئی بات بھی ہے
یہ تو غمزہ ہے جناب، اور یہ نگاہِ بیباک
اور یہ لیجیے، یہ ہلکا سا تبسم چالاک
آپ اگر چاہیں تو مخصوص ملاقات بھی ہے
مرہمِ تلخیٔ اوقات بھی ہے

آؤ ــــ اس دیس کی بیٹی سے ملاقات کریں
صنفِ نازک ہے، مدارات کریں
لب و عارض پہ چہکتے ہوئے پھولوں کا نکھار
دیکھنا! اس کی ترستی ہوئی آنکھوں کا خمار
غیر موزوں ہے، اگر ترکِ موالات کریں
کچھ خریدیں نہ سہی، بات کریں

آؤ ــــ اے دوست! کسی کیفے میں چائے پی لیں
چند ایک زخم دروں تو سی لیں
سامنے گوشہ سے پھر شور وہ تازہ اٹھا
پھر میرے دیس کی غیرت کا جنازہ اٹھا
آؤ ــــ اے دوست کسی کیفے میں چائے پی لیں
چند ایک زخم دروں تو سی لیں

انگڑائی

اعظم ادیب

ریگ زاروں کی جلتی ہوئی گود میں کیا ہوا گر کھجوروں کا جھنڈ اُگ گیا
ہم نشیں، تیرا دل کتنا انجان ہے ایسے بے رنگ خوابوں پہ مسرور ہے
اونچے اونچے درختوں کی یہ چوٹیاں، دشت والوں میں کوئی عجوبہ نہیں
چاہِ زمزم ہے، نہرِ زبیدہ ہے یہ، ایک چشمہ پہ کیا اتنا مغرور ہے
چاندنی رات کی سلطنت ہے یہاں، ریت کا ٹیلہ چاندی کی مسند نہیں
ورنہ تیرے لئے تختِ طاؤس ہے، تختِ پرویز و اورنگ فغفور سے
دوب کے نرم گدوں کا انجام کیا، ان کا انجام کانٹوں سے کمتر نہیں
ہم نشیں، یہ مقام اپنی منزل نہیں، اپنی منزل ابھی تو بہت دور ہے
سائبانوں کی سسکتی ہوئی زندگی، کھینچتی اور سر پیٹتی ہوئی زندگی
اپنے ماحول کے چہرہ پہ داغ ہے، اپنی دھرتی کے سینہ میں ناسور ہے
پھول پتوں کی بستی سلگتی ہوئی، چاند تاروں کی دنیا پگھلتی ہوئی
تیری خلوت گلستاں گلستاں سہی، تیری جلوت مگر ایک تنور ہے
ننگِ آدم ہے تو، ننگ آدم ہوں میں، وجہِ ماتم ہے تو، وجہ ماتم ہوں میں
ایک اندیشۂ مصلحت کا غلام، اک ہوس کی غلامی پہ مجبور ہے
آرزوؤں کا موسم جواں ہے ابھی، اپنی باہوں میں تاب و تواں ہے ابھی
کیوں نہ تاروں کی چھاؤں میں بڑھتے چلیں دیکھ وہ سامنے شعلۂ طور ہے

شعلۂ طور کی سروری کے لئے موجۂ نیل کیوں راہ تکتی رہے
زندگی قبطیوں کے بیابان میں کیوں بھٹکتی رہے، سر پٹکتی رہے

جشنِ استقلال مناؤ

ارشد کاظمی

آزادی کا دن آیا ہے   بیش بہا تحفے لایا ہے!
خوشیوں کا بادل چھایا ہے   دخترِ رز کے جام لنڈھاؤ
جشنِ استقلال مناؤ

آنکھوں کو مٹکا مٹکا کر   پیمانے چھلکا چھلکا کر
نشے میں لہرا لہرا کر   دل خوش کن تقریر سناؤ
جشنِ استقلال مناؤ

دخترِ ملت ناچ رہی ہے   قوم کی غیرت ناچ رہی ہے
پیار کی دولت ناچ رہی ہے   محفل میں جھومو لہراؤ
جشنِ استقلال مناؤ

ذلت کا احساس نہیں ہے   عزت کا بھی پاس نہیں ہے
جینے کی کچھ آس نہیں ہے   عیش کرو اور جام اڑاؤ
جشنِ استقلال مناؤ

بھوک افلاس اور بیکاری ہے   گھر گھر میں آہ و زاری ہے
نااہلوں کی سرداری ہے   مکر و فن کے جال بچھاؤ
جشنِ استقلال مناؤ

سونے والے جاگ اٹھے ہیں   غافل اب ہشیار ہوئے ہیں
باطل سے لڑنے کو چلے ہیں   تم بھی اپنی جان بچاؤ!
جشنِ استقلال مناؤ

"پیکار"

شمیم عبادیہ

روزِ اول ہی سے دامنِ زیست میں ۔۔۔ کتنے نیرنگ نغمے مچلتے رہے
کتنے سورج اُفق پر ہوئے جلوہ گر ۔۔۔ اور تاریکیوں میں بدلتے رہے
قیصریت بدستور قائم رہی گنبدِ سیم و زر جگمگاتے رہے

اب سے پہلے بھی مظلوم انسانیت ۔۔۔ جبر کے سخت پاٹوں میں پستی رہی
زخم لگ لگ کے، ناسور بنتے رہے ۔۔۔ خون بہتا رہا پیپ رِستی رہی
اب سے پہلے بھی انساں انسان کے روبرو اپنے سر کو جھکاتی رہی
قیصریت بدستور قائم رہی گنبدِ سیم و زر جگمگاتے رہے

بت پرستی بدستور جاری رہی ۔۔۔ لوگ خود اپنی ہستی کو بھولے رہے
کفر و الحاد پہلے بھی بڑھتا رہا ۔۔۔ اصل خالق کی ہستی کو بھولے رہے
محفلِ رامش و رنگ کے سائے میں معصیت کو گلے سے لگاتے رہے
قیصریت بدستور قائم رہی گنبدِ سیم و زر جگمگاتے رہے

کتنے فرعون پیدا ہوئے خاک سے ۔۔۔ اور پھر خود جہاں کے خدا بن گئے
کتنے شداد پیدا ہوئے دہر میں ۔۔۔ اور "نئی خلد" کے رہنما بن گئے
کتنے نمرود کتنے براہیموں کو روزِ آتشکدوں میں جلاتے رہے
قیصریت بدستور قائم رہی گنبدِ سیم و زر جگمگاتے رہے

پہلے طاغوت کو نفا مٹنے کے لئے ۔۔۔ نوح سے ناخداؤں کو بھیجا گیا

سامریت کے ہر سحر کو توڑنے   موسیٰ سے پیشواؤں کو بھیجا گیا

کارواں راہِ حق سے بھٹک کر مگر دور اور دور ہی دور جاتے رہے

قیصریت بدستور قائم رہی گنبدِ سیم و زر جگمگاتے رہے

اور پھر دشتِ یثرب سے گونجی صدا   آخری اک صدا۔ حق کی پکار کی

یک بیک اینٹ سے اینٹ بجنے لگی   قیصریت کی فرسودہ دیوار کی

قصر و ایوان سب ڈگمگانے لگے اور انسانیت مسکرانے لگی

چند جابر زمیں پر تڑپنے لگے اور ہزاروں کی محنت ٹھکانے لگی

اور پھر وقت نے ایک انگڑائی لی   کارواں منزلوں سے بھٹکنے لگے

خود پرستی کی اور نفس کی آنچ میں   ذہن جلنے لگے، سر تڑخنے لگے

کتنے چنگیز کتنے ہلاکو اٹھے اور دھواں بن کے عالم پہ چھانے لگے

قیصریت نے پھر پاؤں پھیلا دیئے گنبدِ سیم و زر جگمگانے لگے

آج تیرہ صدی بعد! اے ساتھیو!

گنبدِ سیم و زر ڈگمگاتے ہیں پھر!

قصر و ایوان سب لڑکھڑاتے ہیں پھر!

مژدہ باد! اے رفیقو! کہ تیرہ صدی بعد حق کے عساکر ظفر پائیں گے

قصرِ شاہی کے زرکار و سیمیں کلس، وقت کے تیز دھارے میں بہہ جائیں گے

آج انساں نے پایا وہ رازِ خودی جس سے دشت و جبل بھی ہیں سہمے ہوئے

عزم و ایماں کی مشعل جلاتے ہوئے ہم افق کے کناروں کو چھو آئیں گے

آج اسلام کے جاں نثارو! سنو!   وقت نے فیصلہ کر دیا ہے یہی!

کہ خدا کے نڈر اور بہادر سپاہی   جہاں کے خداؤں سے ٹکرائیں گے!

(یثرب)

ارتقاء[1]

حفیظ میرٹھی

وہی قوت کا پتلا ابن آدم!
فنا پر طنز ہے جو مدتوں سے!
وہ جس نے زندگی میں روح پھونکی
وہی اب تجزیوں کی کاوشوں سے
نمک ہے، گیس ہے، اور کوئلہ ہے
مگر انساں "ترقی" کر رہا ہے

ابھی لاشوں پہ بارش قہقہوں کی
ابھی خود زندگی پر بیکن پہرے[2]
ابھی کچھ حد نہ تھی مختاریوں کی
ابھی کچھ اپنی تحقیقوں کے ہاتھوں
مجسم جبر بن کر رہ گیا ہے
مگر انساں "ترقی" کر رہا ہے

ادھر تو بے زباں فطرت کے رخ سے
حجاب اک اک اٹھایا جا رہا ہے
ادھر حرص و ہوا کی ڈائنوں کو!
نئے پردوں میں لایا جا رہا ہے
زمانہ یہ تماشا دیکھتا ہے!
مگر انساں "ترقی" کر رہا ہے

نظر سے فکر تک۔ دل سے زباں تک
ہر اک قربت میں لاکھوں بُعد پنہاں
کہاں کے راستے، منزل ہے کیا شے
ابھی تو دور ہے خود سے بھی انساں
اور اس پر آسماں چھونے اٹھا ہے
مگر انساں "ترقی" کر رہا ہے

جہاں میں آج بھی طاقت ہی حق ہے
لہو کمزور کا اب تک ہے پانی
ہے اکثر وسعتِ قلبی کی تہ میں
تعصب، تنگ نظری، بدگمانی
یہ سب کچھ ٹھیک ہے سچ ہے بجا ہے
مگر انساں "ترقی" کر رہا ہے

غبار آستیں رخصت ہوا گر
سیاہی نے کیا دامن کو رنگیں
گیا تاریک دورِ پادشاہی؟
تو اب تاریخ کا یہ "عہدِ زریں"
اندھیری رات بن کر چھا گیا ہے[3]
مگر انساں "ترقی" کر رہا ہے

اندھیری رات کے خوں میں نہا کر
وہ دیکھو سرخ سورج آ رہا ہے
ارے یہ انفرادیت کی چیخیں!
سویرا شام کو شرما رہا ہے
بھکاری خیر سے داتا بنا ہے
مگر انساں "ترقی" کر رہا ہے

ادھر گیسیں ادھر ہیں ایٹمی بم
دما دم دم، دمادم دم، دما دم
دھماکے، زلزلے، طوفان، آندھی
اور اسکے بعد یہ دنیا؟ . . . . جہنم
یہی انسانیت کی انتہا ہے؟!!!
مگر انساں "ترقی" کر رہا ہے

[1] حقیقت کی بے رحم کسوٹی۔ [2] مارکس کی کلیت پسندی جو حقیقت انسانی کے مجموعی عمل اور قوتِ فکر پر موت کا بھیانک سایہ ہے

تیز، ذرا تیز!

نجم الاسلام

کیوں یہ چمنِ دہر ہے ویراں نہیں معلوم
اب تک بھی ہمیں رازِ گلستاں نہیں معلوم

کب آئے گی اس ظلمتِ عالم میں پھر اک بار
رُوٹھی ہوئی وہ صبحِ درخشاں نہیں معلوم

کیوں کر ہو مداوائے پریشانیٔ انساں
کیسے ہو علاجِ غمِ دوراں نہیں معلوم

کب ہوگا کوئی واقفِ اسرارِ حقیقت
پھر آئے گا کب ہوش میں انساں نہیں معلوم

اب یاد ہے دنیا کو بس اک دورِ خزاں ہی
کیوں کر ہو بپا جشنِ بہاراں نہیں معلوم

دنیا میں نظر آتا ہے اندھیر ہی اندھیر
کیسے ہو جہاں روشن و تاباں نہیں معلوم

اک دل ہی پریشاں نہیں، اس دل کی بدولت
ہیں کتنے خیالات پریشاں نہیں معلوم

ہاں راہروو! تیز! ذرا تیز! ذرا تیز!
کب ساتھ نہ دے عمرِ گریزاں نہیں معلوم

دل ہے تو بہت کچھ طلب و شوق سے معمور
کام آئے کہاں جذبۂ پنہاں نہیں معلوم

ہاں سچ ہیں شکایاتِ زمانہ تو سب اے نجمؔ
دیکھا ہے مگر اپنا بھی داماں نہیں معلوم

●

جنوں کے ماروں کا ساتھ دوں گا!

ابوالمجاہد زاہد

نہ زرد پھولوں کا ساتھ دوں گا نہ "سرخ خاروں" کا ساتھ دوں گا
جو قیدِ رنگ و وطن مٹا دیں میں ان بہاروں کا ساتھ دوں گا

ہو اضطرابِ حیات جن میں، میں ایسے دھاروں کا ساتھ دوں گا
نہ میں کناروں سے کھیلتا ہوں نہ میں کناروں کا ساتھ دوں گا

نہ مجھ کو پھولوں سے دشمنی ہے، نہ مجھ کو تاروں سے ہے عداوت
جو روح میں رنگ و نور بھر دیں میں اُن نظاروں کا ساتھ دوں گا!

اب آدمی آدمی کا بندہ زیادہ دن تک نہ رہ سکے گا!
خدا پرستوں، حق آشناؤں، خودی شعاروں کا ساتھ دوں گا

حیات کی تیز روشنی کو چھپائیں گے کب تک اہلِ ایواں؟
طلسمِ زر کو جو توڑ دیں گے ان اشکباروں کا ساتھ دوں گا

اب اہرمن زادگانِ دوراں، دکھائیں کتنا ہی رعب اپنا
نظامِ باطل کو چاٹ لیں جو، میں اُن شراروں کا ساتھ دوں گا

خرد پرستوں کی رہبری کے فریب سب کھل چکے ہیں زاہد
جنوں کے مارے بڑھیں گے آگے، جنوں کے ماروں کا ساتھ دوں گا

کلمہ گو

"افسانہ گو"

یہ کلمہ گو ہیں! یہ قبلہ رو ہیں!

کہاں کا قبلہ؟ کہاں کا کلمہ یہ لوگ رسوائے چار سُو ہیں
یہ جادہ ساماں ہیں بے ارادہ! یہ ہرزہ گردانِ دشت و کو ہیں
ہزار دجلہ بھتا ان کے خم میں یہ محو دریوزۂ سبُو ہیں
جہاں کے بھٹکے جہاں کے رانده جہاں کے بے ننگ و آبرو ہیں

یہ کلمہ گو ہیں! یہ قبلہ رو ہیں

خدا بچائے ۔ خدا بچائے بُرا ہو قسمت کی گردشوں کا
وہ راز کھویا گیا ہے کیسے وہ راز جو راز اوج کا تھا
یہ متقی ہیں یہ مجتہد ہیں یہ کشف و رؤیا میں منفرد ہیں
یہ مفتیانِ کرام بھی ہیں! یہ واعظانِ عظام بھی ہیں
یہ حرفِ تفسیر کا بیان ہے یہ چرخ تاویل درمیان ہے
حدیث و قرآں زباں پہ جاری ضمیر فہم و ذکا سے عاری!
فساد ان کے پیام میں ہے کلام ان کے کلام میں ہے
ہر اک کا قبلہ جدا جدا ہے ہر اک کا کلمہ جدا جدا ہے

یہ کلمہ گو ہیں ۔ یہ قبلہ رو ہیں
کہاں کا قبلہ! کہاں کا کلمہ!

--- قافلہ یک رخوں کا آیا وہ کاروان سر پھروں کا آیا

جہاں کے منکر! خدا کے قائل سوا سے کٹ کر خدا پہ مائل
زبان پہ جاری ہے قد سمعنا رگوں میں جاری ھُوَا طعناً
سخن کتابِ ہدیٰ کی آیت چلن رسولِ خدا کی سیرت
خدا کا کلمہ ہے سب کا کلمہ
خدا کا قبلہ ہے سب کا قبلہ
یہ کلمہ گو ہیں یہ قبلہ رو ہیں یہ قطرے مل کر اک آبجو ہیں
یہ لوگ تفسیرِ رابطوا۔ ہیں
یہ کلمہ گو ہیں! یہ قبلہ رو ہیں

گندم نما، جو فروش

عذرا ناھید

یہ پستیوں کے مسافر، یہ ذلتوں کے نقیب
دکھا رہے ہیں جو ہم کو بلندیوں کی فضا!
بڑی مہیب ہیں ان کے فریب کی چالیں
زباں پہ حرفِ صداقت، دلوں میں مکر و ریا
بھٹک رہے ہیں یہ خود ظلمتوں کے چکر میں
یہ بن سکیں گے بھلا کیا کسی کے راہ نما؟
ان اقتدار کے بھوکوں کی زندگی کب تک؟
سحر کے نور کے آگے یہ تیرگی کب تک؟

(جہانِ نو)

ابنِ آدم کی یہ تحقیر

مسعود جاوید

غربت و یاس کی تصویر مَیں کیسے دیکھوں!
ابنِ آدم کی یہ تحقیر مَیں کیسے دیکھوں
دانے دانے کو ترستے ہیں اُگانے والے
یہ ستم! اے فلکِ پیر مَیں کیسے دیکھوں
چند آنکھوں میں گہر دیکھ بھی سکتا ہوں مگر
بزم کی بزم کو دل گیر مَیں کیسے دیکھوں
سبز پرچم کے تلے پاک زمیں کے اُوپر
آہ! بُت خانہ کی تعمیر مَیں کیسے دیکھوں!
حکمِ پیرانِ کلیسا کی اطاعت میں شتاب
حق کی تنفید میں تاخیر مَیں کیسے دیکھوں
سینۂ باطل و الحاد پہ رخشاں تمغے!
سینہ حق کے لئے تیر مَیں کیسے دیکھوں
بادلو چھاؤ کہ رخسارِ شفق گوں کے بغیر
رخِ مہتاب کی تنویر مَیں کیسے دیکھوں

★

مُطالعۂ سفارشات

ابوالبیان حمّاد

بہت ہی شور سُنا جا رہا تھا مدت سے — کہ ہو رہا ہے مرتب نظام اسلامی
سفارشات جو آئیں تو دل نے جل کے کہا — قراردادِ مقاصد کی ہائے ناکامی
وطن کی جان پہ لاگو ہُوا ہے وہ قانون — جو عقلِ خام کے سانچے میں ڈھل کے آیا ہے
زوالِ مجلسِ دستور ساز کیا کہیئے — دل و دماغ پہ باطل کا رُعب چھایا ہے
نہ کیوں ہوں قابلِ تبریک یہ "اکابرِ قوم" — پہاڑ کھود کے اک چوہیا تو لائے ہیں
ہے اُن کی بزم کا انداز ہی نرالا سا — پرائے اپنے ہیں، اپنے جو ہیں پرائے ہیں
کہاں ہیں اب وہ بڑے بول بولنے والے — سفارشات نے دعووں کا پول کھول دیا
سوال جب بھی ہوا نظمِ نو کے بارے میں — جواب اس کا قیادت نے گول مول دیا
فرنگ جن کا مہاوت ہے یہ وہ ہاتھی ہیں — کہ ہیں دکھانے کے دانت اور، اور کھانے کے
زمانہ اُن کی اطاعت کرے تو کیوں آخر — جو خود غلام ہمیشہ رہے زمانے کے
مرے رفیق نکل آ تو سر بکف ہو کر — چھڑی ہوئی ہے نئے سر سے جنگِ آزادی
یہ غیرِ حق کی خدائی نہ ختم ہو جب تک — ہے برقرار غلامی برنگِ آزادی

●

ایک گیت!

عروج قادری

سونے، روپے کے یہ دھارے!
ڈوبے ان کے لوبھی سارے
بچ کر رہنا تو اے پیارے
——— دُنیا مایا جال
اے پیارے! ———
——— دُنیا مایا جال!

•

دیکھ رہے ہیں ان کے سپنے
مہمل ہیں یہ مالا جپنے
گھیر رہا ہے دیس کو اپنے
——— غلّہ رہتے کال
اے پیارے ———
دُنیا مایا جال!

•

سنتا ہے کچھ راج دُلارے!
دل کی ٹھنڈک، آنکھ کے تارے
جُرم و خطا کے دھبّے سارے
——— آنسو سے دھو ڈال
اے پیارے! ———
دُنیا مایا جال

•

ہردے کر لے تو اُجیالا
دھو دے اس کا دھبّہ کالا
توڑ دے اس کے لوبھ کا جالا
——— چھوڑ بھی یہ جنجال!
اے پیارے! ———
——— دُنیا مایا جال!

•

ایشور کا بھجے دل میں آئے
دیش ہمارا شکتی پائے
کشٹ بھی سارا تب مٹ جائے
——— کٹ جائے یہ کال
اے پیارے! ———
دُنیا مایا جال!

•

ایشور سے ہم آگیا پائیں
اس کے کہے پر راج چلائیں
دیش کو اپنے سُورگ بنائیں
——— ہو کر مالا مال!
اے پیارے! ———
دُنیا مایا جال

•

فرمان!

تابؔ اسلم

جاؤ یہ شور یہ ہنگامہ بُرا ہوتا ہے
خوف کھاؤ کہ نہ قانون کی تن جائیں بھویں
لاٹھیاں لپکیں، فضاؤں میں رچیں انگارے
خون برسائیں دہکتی ہوئی توپوں کی نویں!

کانچ کے جام چٹانوں سے کہاں الجھے ہیں
کیا بگولے بھی پہاڑوں کو اڑا سکتے ہیں
تیرگی چاند کی مشعل کو نہیں پی سکتی
پیشِ خورشید دئیے بھی کبھی آسکتے ہیں

ہم اگر چاہیں تمہیں شہر کے چوراہوں پر
کوڑیں لگوائیں کہ کتوں سے تمہیں نچوا دیں
چند سکّوں میں ضمیروں کی لپک بک جائے
ایک روٹی کے لئے اور تمہیں لڑوا دیں

جاہلو اپنی جہالت کی نمائش یہ کیا
ملک اور قوم کی عزت کو تو محسوس کرو
یہ بہاریں جو زمانے نے تمہیں بخشی ہیں!
ان کے دامن میں یہ چیخیں یہ شرارے نہ بھرو

جاؤ یہ شور یہ ہنگامہ برا ہوتا ہے
ہم بھی بھوکے ہیں تمہیں کس طرح بتلائیں ہم
یہ محلات یہ صوفے یہ دمکتے فانوس
اک دکھاوا ہے تمہیں کس طرح سمجھائیں ہم

ہر گھڑی بھوک میں لتھڑے ہوئے نعروں کی چبھن
ہر نفس سہمے ہوئے پیٹ کے ایندھن کا سوال
سرکشو، کوڑھیو، بے دینو، ذلیل انسانو!
اپنی نوخیز حکومت کا کرو کچھ تو خیال!

جاؤ ہم رحم کی حلقوں کو نہیں پھاندیں گے
اپنی جنتا کو ستانا ہمیں منظور نہیں!
قوم شاہد ہے کہ ہم اس کے بڑے خادم ہیں
شہ رگِ ملک پہ رِستے ہوئے ناسور نہیں!

جاؤ یہ شور یہ ہنگامہ بُرا ہوتا ہے
"دینِ اسلام" کا ناموس بچانے کے لئے
تم کو ہر حال میں یہ ٹیکس ادا کرنے ہیں

(مشیر)

زرگری!

حسّان کلیمی

نت نئی روشنی کے حیلے ہیں
جنگ بازی بھی اک تجارت ہے
سود خواروں نے سٹّہ بازوں نے
اوڑھ لی ہے قبائے پرویزی
جنگ کی بھٹیوں میں پے در پے
جھونکتے ہیں "سنہرے ایندھن" کو
مُلک گیری بھی اک تجارت ہے
لاد کر آرتھر کے شانوں پہ
سیم و زر کے کھنکتے تھیلوں کو
ایشیا کو خرید لینے کا

عزمِ ناپاک دے کے بھیجا ہے
کوریا کی زمین منہ کھولے
راہ تکتی ہے آج "قارون" کی
جنگ کی آتشیں لپٹوں سے
سُرخ جنّت کا آہنی پردہ
اب پگھل کر نمایاں کر دے گا
قصرِ ظلم و ستم کے کنگورے
خونِ مزدور کے چراغوں سے
جن پہ دیپک جلائے جاتے ہیں
تیس ۳۰ سالہ یہ دورِ چنگیزی

روبرو جب جہاں کے آئے گا
کانپ اٹھے گی روحِ گیتی بھی
کھلنے والا بھرم اب اُن کا ہے
رونی دے کر خدا جو کہلائے
سرخ "فرعون" کے ڈبونے کو
والگا منتظر ہے مدت سے
پھر ضرورت ہے عصرِ حاضر کو
ہمّت و جراَتِ کلیمی کی
نیل پھٹ جائے راہ دینے کو
لائے موسیٰ کا گر عصا کوئی

خدنگِ نو!

سہیل فریدی

جنگ کے بندھ رہے ہیں منصوبے
اہلِ ایراں کا دل دھڑکتا ہے
روس و برطانیہ کے باشندے
اہرمن کے خبیث کارندے
راگ انسانیت کا گاتے ہیں
امن کے گیت بھی سناتے ہیں
اپنے جیبوں پہ ڈال کر پردے
ان ہی انساں نما درندوں نے
کوریا کو تباہ کر ڈالا
تلخ شام و پگاہ کر ڈالا

اب یہ ایراں کے تیل کے چشمے
بن گئے مرکزِ نظر ان کے
روس کے ہیں طویل منصوبے
سُرخ فردوس کے بھی ہیں وعدے
اہلِ ایراں کو ورغلاتا ہے
نامِ اسلام بھی سناتا ہے
اور برطانیہ کے دانش ور
صرف الفاظ کے ہیں بازیگر
دیکھیے وقت کیا دکھاتا ہے
ملک رہتا ہے یا کہ جاتا ہے

انقلابی توحید!

نعیم صدیقی

ایک پیمبر! ایک پیام!
ایک صحیفہ! ایک کلام   ایک نماز اور ایک امام!
ایک حکومت! ایک زمام!
ایک خدا — اور — ایک نظام!

نظم میں کچھ تغیر نہیں
کو زنگہ تقدیر نہیں!   خام کوئی تعمیر نہیں
جسم تغیر! روح دوام!
ایک خدا — اور — ایک نظام!

دین کا ہے اک جوڑا لوٹ
نسل کا دعویٰ جھوٹ ہے جھوٹ   فیض لسب اسکا پھوٹ ہے پھوٹ!
رنگ کا جادو دام ہے دام!
ایک خدا — اور — ایک نظام!

دُنیا ساری ایک ہی "کُل"
برق کہ شعلے خار کہ گُل!   ساز کہ نغمے جام کہ مُل!
نور سے ہم آہنگ ظلام
ایک خُدا — اور — ایک نظام!

ایک حریم پاک حیات!
شمع ہے اُسکی ایک ہی "ذات"   پھیل گئی کیوں لات منات؟
شرک یہاں ہے عین حرام!
ایک خدا — اور — ایک نظام!

دین، سیاست غیر نہیں
غیر ہوئے تو خیر نہیں!   خیر کا پھر سر پیر نہیں
ایک ہوا اور ایک ہی "بام"!
ایک خدا — اور — ایک نظام!

چرخ، ستارے، مہر، قمر
کوہ، سمندر، برگ، شجر   ایک ہی منزل ایک سفر!
دوش بدوش اور گام بہ گام!
ایک خدا — اور — ایک نظام!

قوم، قبیلہ، لغو، فضول!
کون گلا، اور کون ببول؟   ایک ہی مقصد ایک اصول!
دیس ہو چاہے روم کہ شام!
ایک خدا — اور — ایک نظام!

کبر کے خوگر میر و زبر
اور دکھائیں عجز فقیر   زور معزز، ضعف حقیر!
آدمیت کا کام تمام!
ایک خُدا — اور — ایک نظام!

بحر کہ بر، ہر سمت فساد!
عقل نئی پالے لاکھ تضاد   دیکھ ترقی نام نہاد!
عیش کا ساقی زہر بجام!
ایک خدا — اور — ایک نظام!

"اگر میں چاہوں تو ——"

نعیم صدیقی

تمہارے تن کو لباسِ حریر مل نہ سکا
اٹھارہ سال یونہی حسرتوں میں بیت گئے!
تمہارے واسطے ساٹن کا سوٹ سل نہ سکا
بساطِ زر پہ کئی لوگ کھیل جیت گئے!

گلہ کرو نہ کرو ——————

یہ صبر و ضبط محبت بھرا تکلف ہے!
مری نظر میں تم اک شکوۂ مجسّم ہو!
نہ کوئی "آہ" نہ "وائے" نہ "حیف" نے "اُف" ہے!
تم اپنے ذوق کا ایک مرثیہ ہو، ماتم ہو!
تمہارے چہرۂ تاباں سے صاف پڑھتا ہوں
تمہارے دل کی چھپی حسرتوں کی تحریریں!
تمہارے صفحۂ سیرت پہ دیکھ سکتا ہوں
تبسّموں کے فریموں میں غم کی تصویریں!
پڑوسنوں کے تمہیں ٹھاٹھ چھیڑ جاتے ہیں!
سہیلیوں کے تمہیں چہچہے ستاتے ہیں!
تمہارے دل میں جو اٹھتی ہیں رشک کی لہریں
تو کتنے ذوق ہیں جو پیچ و تاب کھاتے ہیں!

یہ ساریاں! یہ غرارے! یہ سینڈلیں! یہ نقاب!
یہ انگیائیں! یہ موباف! اور یہ بنیانیں
یہ خوشبوؤں کے بگولے! یہ پوڈروں کے سراب!
کہاں سے آتے ہیں؟ کس مول؟ آپ کیا جانیں!
یہ ٹھاٹھ باٹھ امارت کے، کبریائی کے!
یہ رشوتیں ہیں جو رقصاں ہیں قصر وایواں میں!
گرہ کٹوں کی عفونت بھری کمائی کے!
مظاہرے ہیں جو یوں طرح طرح سی عریاں ہیں

اگر میں چاہوں تو ظلم و ستم کی منڈی سے! ضمیر بیچ کے دولت کما کے لے آؤں!
میں کاٹ کاٹ کے افلاس و ضعف کی جیبیں تمہارے واسطے سکے اڑا کے لے آؤں!
حریم سادہ دلی میں نقب زنی کر کے ہزار عیش کے ساماں چرا کے لے آؤں!
دماغ پاس ہے! اس کو کرائے پر دے کر میں ایک جنتِ راحت سجا کے لے آؤں!
اگر میں چاہوں تو ہر جنبشِ قلم کے طفیل طلا و سیم کی نہریں بہا کے لے آؤں!

مگر یہ سوچ تو لو ــــــــــ
مرے ضمیر کی جب روح کر گئی پرواز
تو ایک نعش کو بن ٹھن کے کیا دکھاؤ گی؟
مری خودی جو گنوا دے حیات کے انداز
تو کیسے ہیکلِ لحمی سے دل لگاؤ گی؟
تم اک ذلیل سے سوداگرِ ہوس کے لئے
پھر احترام کا جذبہ کہاں سے لاؤ گی؟
وہ حق فروش جو گر جائے اپنی آنکھوں سے
تم اپنی آنکھوں پہ کیسے اسے بٹھاؤ گی؟

یہ تجربہ آپ بھی کریں گے؟

اقتدار کے ایک سوال کا جواب داعئ حق کی طرف سے

نعیم صدیقی

یہ ساری حرکت یہ ساری گرمی — یہ فردِ واحد کا کھیل ہے کیا؟
میں دیکھتا ہوں کہ میرے آگے — جہان کے انبیاؑ رواں ہیں
میں دیکھتا ہوں کہ میرے آگے — ہزارہا اتقیا رواں ہیں
مجاہدانِ سعید بھی ہیں — تو شاہدانِ شہید بھی ہیں
رواں ہے اک کاروانِ تقویٰ — کہ جس کی گرد دغبار رہوں میں
ہزاروں عزت مآب راہی — کہ جن کا اب راز دار ہوں میں
نہ جانے کیا کیا وہ قوتیں ہیں — جو مجھ مسافر کی ہم سفر ہیں
میں ایسی راہوں پہ بڑھ رہا ہوں — کہ ہم رکاب انجم و قمر ہیں
میں ایسی راہوں پہ بڑھ رہا ہوں — خدا کی آیات راہبر ہیں
میں دیکھتا ہوں کہ میرے پیچھے — مجاہدوں کا ہجوم اُٹھا
یہ قابلِ یادگار منظر — فلک نے دیکھا تو جھوم اُٹھا
جوانیاں ہیں جو میرے پیچھے — بصد عزائم لپک رہی ہیں
غبارِ فردا میں آنے والی — ہزار نسلیں ہمک رہی ہیں
یہ "فردِ واحد" کا کھیل ہے کیا؟ — کہ ملک بھر اضطراب میں ہے
نظامِ کہنہ کے پاسبانو! — یہ معرضِ انقلاب میں ہے

"کتابِ حق" کو پڑھا ہے میں نے — نگاہ تاریخ پر رہی ہے
تھی عمر اک جو حقیقتوں کی — تلاش ہی میں گزار دی ہے
نہ جانے کتنے ہی رات دن تھے — جو میں نے اس سوچ میں گزارے
رہِ مشیت کدھر سے نکلی — کدھر مڑی ہے کدھر گئی ہے
یہی سوال اک ہدف رہا ہے — مرے مسلسل مطالعہ کا
وہ راہ کیا ہے کہ جس کی منزل — فلاح و بہبودِ زندگی ہے

میں تجربوں کو عبور کر کے — میں دین سے کسبِ نور کر کے
یہ راز کی بات پا چکا ہوں — کہ کیا تقاضائے راستی ہے!
جو حق مرے سامنے کھلا ہے — میں اس کے سانچے میں ڈھل چکا ہوں
مرے عزائم کی جڑ یقیں ہے — یہ جڑ تو مضبوط ہو چکی ہے

میں اس سے ٹل جاؤں؟ غیر ممکن!
میں اب بدل جاؤں؟ غیر ممکن!

یہ کشمکش اب جو چھڑ چکی ہے — میں اس کا انجام جانتا ہوں
جو کام آغاز ہو چکا ہے — میں اس کا اتمام جانتا ہوں
خدا کے وعدوں پہ ہے بھروسہ — خدا کے احکام جانتا ہوں
کدھر سے ہو کر کدھر گئی ہے — یہ راہِ اسلام جانتا ہوں
جو آئیں گے راستے میں رہزن — بچھے ہیں جو دام جانتا ہوں

جو سیلِ تقدیر اٹھ چکا ہے
حقیر بودی رکاوٹوں سے
وہ کیا رکے گا؟ وہ کب رکے گا

یہ سیل جب بھی اٹھا ہے پہلے!
تو اس میں تاریخ جانتی ہے — ہزار دربار بہ گئے ہیں
جو تخت پر بیٹھتے تھے تن کر — حضور "سرکار" بہ گئے ہیں
پتنگ جن کی اڑی ہے اونچی! — وہ مستِ پندار بہ گئے ہیں
قصورِ رنگین بہ گئے ہیں — حسین چمن زار بہ گئے ہیں
جناب سے سینکڑوں تھے پہلے — جو اپنے داؤں لڑا چکے ہیں
خدا کے قانون کے مقابل! — تمام زور آزما چکے ہیں!
ہزاروں رستم ہوئے ہیں ایسے — جو حق سے ٹکر لگا چکے ہیں
زمانہ خود ہے گواہ اس کا — وہ کن نتائج کو پا چکے ہیں
یہ تجربہ آپ بھی کریں گے؟

بہت مبارک! ضرور کیجیے!
مگر ذرا دیر سوچ لیجیے!

●

(چراغِ راہ)

گستاخی معاف!

نعیم صدیقی

بڑی چالاکیاں، سالوسیاں ہیں!
تجسس ہی نہیں، جاسوسیاں ہیں
بہر سو مذہبی غاروں کے اندر
الٰہی خیر! کاناپھوسیاں ہیں!

+

نہ غیبت میں، نہ نجویٰ میں لگے ہیں
یہ اربابِ تقدس من چلے ہیں
مرے کا گوشت ہے میرے بدن کا
کباب اس کے اڑائے جا رہے ہیں

+

تعاون خیر میں واجب نہیں کیا؟
جُدا رہتے ہیں مومن بھی کہیں کیا؟
کہا "حضرت" نے ہم روٹھے ہوں جس سے
وہ دیں کس کام کا! وہ کارِ دیں کیا؟

+

مرے معبود! قرباں تجھ پہ جاؤں!
لہو اپنا بہاؤں، سر کٹاؤں!
مگر یہ تو مرے بس میں نہیں ہے
ترے فتویٰ نگاروں کو مناؤں!

+

وہ فتویٰ گر کہ جو ہے اس پہ مامور
کرے فساق کو تقویٰ میں مشہور
ملے جنت اگر اس کی سند پر
تو پھر دوزخ مری غیرت کو منظور!

+

ہوا شیخِ حرم کف در دہن کیوں؟
ہے اتنا آتشیں طرزِ سخن کیوں؟
جھڑیں گے بت تو میرے "لا الٰہ" سے
مگر بپھرے ہوئے ہیں بت شکن کیوں؟

+

ترا فرماں کہ میں کچلوں بدی کو
کہوں باطل نظامِ جاہلی کو
وہ کہتے ہیں کہ یہ ہے خارجیت!
تجھے چاہوں کہ تیرے مولوی کو!

+

جو طوفاں کفر کے اُبھریں، اُبھر لیں
بپھرنا چاہیں جو فتنے بپھر لیں
ابھی فرصت نہیں اربابِ دیں کو
مرے تقویٰ کی پیمائش تو کر لیں

+

اگر عامی الاپے نغمۂ دیں!
کہیں گے "خاص" کیونکر اس پہ آمیں؟
یہ کام، اور "عینِ اہلِ حق" کے آگے؟
بزرگوں کی یہ گستاخی! یہ توہیں!

+

وہ فتنہ ہیں، قیامت ہیں، بلا ہیں!
مگر کھلتا نہیں، آخر وہ کیا ہیں!
میں کافر تھا تو جب وہ مطمئن تھے
میں جب ایمان لایا وہ خفا ہیں

+

جو دی بندوں کو دعوت میں نے دیں کی
کچھ ایسی بات تو آخر نہیں کی؟
یہ پوچھا "شیخ" نے مجھ سے تنک کر
"سند" بھی کوئی رکھتے ہو کہیں کی؟

+

اذاں میں نے پکاری بتکدوں میں
مرے ایماں کے چرچے ہیں بتوں میں
مگر مُلّا کے دفتر میں جو دیکھا
لکھا تھا نام میرا کافروں میں

+

جو کچھ بھی تھا، بُرا تھا یا بھلا تھا
میں بندہ داورِ حشر! آپ کا تھا
ثبوت اس کے سوا ایماں کا دوں کیا
ترے مُلّاؤں نے کافر کہا تھا!

+

مجھے دی تو نے خود ایماں کی توفیق
میں کافر تھا، نہ فاسق تھا، نہ زندیق
مگر اعمال نامے پر نہیں ثبت
کسی "حضرت" کی یارب! مہرِ توثیق

+

سوئے حق قوم کو عامی پکاریں
یہی سینوں پہ کھاتے ہیں کٹاریں
الٰہی! تیرے غازی ہم نے دیکھے
کنارے بیٹھ کر تقویٰ بگھاریں

+

مرے دل کو ٹٹولا جا رہا ہے
مرے باطن کو کھولا جا رہا ہے
تقدّس نے لگا دی اپنی میزاں
مرا کفر اس پہ تولا جا رہا ہے

+

جسے چاہیں اُسے حق مانتے ہیں
جسے چاہیں خطا گر دانتے ہیں
سموچے اونٹ اور ہاتھی نگل کر
وہ بیٹھے مچھّروں کو چھانتے ہیں

+

جو لب پر میرے حق کا نام آیا
اُدھر سے کُفر کا الزام آیا
مُبارک تجھ کو ہو اے فسق والحاد!
کہ تقویٰ خود ہی تیرے کام آیا

+

جو پُھنکارے بھی لفظی ناگ تو کیا
اگر فتووں نے اُگلی آگ تو کیا
خدا جس سے بھی چاہے کام لے لے
حسد کے مُنہ میں آئے جھاگ تو کیا

اگر ممکن ہو کچھ تدبیر کیجے
کوئی سامانِ دار و گیر کیجے
مسلماں کو بنائے جو مسلماں
تو اس گستاخ کی تکفیر کیجے

+

کسے پُر نور اندھیروں نے بخشا؟
کسے ان زہد کے گھیروں نے بخشا؟
نظامِ کفر! تجھ سے بات ہو گی
اگر "اللہ کے شیروں" نے بخشا

+

یہ روحانی نظامِ ساہوکاری!
تقدس کے دارے کاروباری!
ہے برہم مجھ پہ طاغوتوں سے بڑھ کر
کتاب و فقہ کی جاگیرداری

+

اِنتخاب (٦)

بلا تعیینِ زمانہ

•

جگر مراد آبادی

عبد الکریم ثمر

عاصی ضیائی

فروغ احمد

ضرار محمود طوسی

مضطر گجراتی

انجم عثمانی

عرشی بھوپالی

•

کاغذی پھول

جگر مرادآبادی

آپ کے سب اصولِ جمہوری — جیسے کاغذ کے پھول کچھ رنگیں
مختصر یہ کہ آپ خود کیا ہیں؟ — آپ کی ذہنیت ہے کتنی حسیں
آپ کہتے ہیں کچھ عمل کچھ ہے — اس کے شاہد ہیں آسمان و زمیں
بس میں اتنا ہی عرض کرتا ہوں — آپ جمہوریت کے اہل نہیں
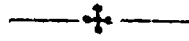
نئے سومنات

عبدالکریم ثمر

جو بے نیازِ غمِ کائنات ہوتے ہیں — دل ان کے حاصلِ صد واردات ہوتے ہیں
خبر بھی ہے تمہیں عہدِ نوی کے بُت شکنو — جہاں میں پیدا نئے سومنات ہوتے ہیں
وہ جن سے عرش نشینوں کی رُوح کانپ اٹھے — چمن میں آج بھی وہ سانحات ہوتے ہیں
زبان و فکر کو آزادیاں نصیب کہاں — نفس نفس پہ یہاں حادثات ہوتے ہیں
چمن میں اہلِ قفس ہوں نہ مائلِ فریاد — شکستہ ساز و بالِ حیات ہوتے ہیں
بیانِ حق کی سزا ہے مری زباں بندی — یہ جرم اصل میں وجہ نجات ہوتے ہیں
یہ گُل جو تیرے ہیں تو خار بھی سمجھ اپنے — کہ باقیات یہی صالحات ہوتے ہیں
وہ جن کو دانشِ حاضر نہ کر سکی تسلیم — جہاں میں ایسے بھی کچھ واقعات ہوتے ہیں
نہیں جو کہنے کی وہ بات کہہ رہا ہوں ثمرؔ — کہ ہر خیال میں کچھ ممکنات ہوتے ہیں

(قندیل)
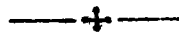
سیاستِ خارجہ کے نام

عبدالکریم ثمر

ترے خیال کا محور ہے جلوۂ اسلام
تجھے روا ہی نہیں سیرِ مجلسِ اقوام

تو بار بار فرنگی کے در کا کر نہ طواف
ترے وفود بڑھائیں نہ اور بھی آلام

وہ دیکھ بیٹھے ہیں مل کر منافقانِ قدیم
بدل رہی ہے نیا روپ گردشِ ایام

یہ طاقتوں کے توازن یہ سازشوں کے ہجوم
یہ سخت سخت شرائط یہ نرم نرم کلام

جنھوں نے عزم کو آغاز ہی میں روند دیا
وہ کس طرح تجھے بخشیں گے مژدۂ انجام

یہ دوزخی تجھے جنّت سے کر نہ دیں محروم
لبوں پہ جن کے بظاہر ہیں امن کے پیغام

علاجِ غربتِ ملّت بھی سوچنا ہے تجھے
قدم قدم پہ یہاں سرخیاں ہیں محوِ خرام

حذر ز غربیاں تا جلوۂ سحر ماند
"ثمر بدستِ تو از شاخِ تازہ تر ماند"

(نوائے وقت)

ابلیسِ سیاست کا فرمان

عبدالکریم ثمر

قول و عمل فریبِ سیاست میں ڈھال دو
مکر و فریب کی مرے کوئی مثال دو

جن کو نہیں ہے میری صدارت پہ اعتماد
اُن منکروں کو وعدۂ فردا پہ ٹال دو

مانا کہ ارضِ پاک کا پنجاب ہے دماغ
دل میں کھٹک رہا ہے کہ کانٹا نکال دو

سازش مرا اصول ہے فطرت مری فرار
میّت وقار کی مرے کاندھوں پہ ڈال دو

جس باغباں نے خوں سے سینچا تھا یہ چمن
اس باغباں کو صحنِ چمن سے نکال دو

ظرف و ضمیر بیچ کے آئے جو میرے پاس
اُس بے نوا کو منصبِ جاہ و جلال دو

جس گلستاں کے لالہ و گل ہوں مری خلاف
اس گلستاں سے لالہ و گل کو نکال دو

مجھ سے حقیقتوں نے تقاضا کیا ثمر!
ہم کو اٹھا کے شعر کے سانچے میں ڈھال دو

(نوائے وقت)

انتظار!

عاصی ضیائی

(۱)

الٰہی کائنات آج کیوں اُداس ہے؟
گُھٹی گُھٹی سی کچھ فضا　　تھکی تھکی سی کچھ ہوا
فسُردگی چمن چمن　　فسُردگی دمن دمن
نہ زیر و بم کی نغمگی صدائے آبشار میں
نہ پیچ و خم کی دل کشی ردائے جوئبار میں
یہ قصر و کاخ و بام و در،　　یہ کوہ و دشت و بحر و بر،
زمیں، اثیر، آسماں،　　قمر، نجوم، کہکشاں،
یہ شش جہت، یہ چار سو،　　یہ ایں و آں، یہ ما و تُو،
سبھی نزار و مضمحل؛　　سبھی کے تیور دل پہ بل؛
ہر ایک سوگوار ہے، ہر ایک درد مند ہے؛
نشاط ناگوار ہے، سرور ناپسند ہے؛
ہر ایک لب پہ مضطرب سی ایک التماس ہے؛

(۲)

الٰہی اہرمن کا پھر زمیں پہ اقتدار ہے!
سسک رہی ہے عافیت،　　بھڑک اٹھی ہے شیطنت،
فساد و شورشں و فتن،　　عناد و رنجش و محن،
طُلوع سے غُروب تک، اداسیاں، فلاکتیں؛
شمال سے جنوب تک تباہیاں، بلاکتیں؛
ضعیف کے حساب میں،　　غریب کے شباب میں،
مشقتیں، صعوبتیں،　　اذیتیں، عقوبتیں،
ستم گری کی تلخیاں،　　جفاکشی کی سختیاں،
کنارہ کش مسرتیں،　　شرارہ وش طبیعتیں،
خرد کی چیرہ دستیاں،　　جنوں کی عیش مستیاں،
یہ مجرمانہ سازشیں حصولِ زر کے واسطے،
یہ ملحدانہ کوششیں اصولِ شر کے واسطے!
اِدھر گناہ گاریاں　　اُدھر سیاہ کاریاں؛
قلوب میں عداوتیں،　　بطون میں شقاوتیں؛
نفاق و شرک و دہریت،　　فجور و فسق و معصیت؛
حیا کا چاک پیرہن،　　وفا کی لاش بے کفن؛
بہیمیت کے غلغلے،　　درندگی کے مشغلے؛
صدائے امن کالعدم منافرت کے راگ میں؛
ولائے باہمی بھسم منافقت کی آگ میں!
یہ ذہن کی غلط روی،　　یہ فکر کی سُبک روی؛
یہ وسوسے، یہ دھڑکنیں　　یہ گتھیاں، یہ الجھنیں؛
سخن کی بد کلامیاں،　　ادب کی بے لگامیاں؛
قلم کی زہر بیزیاں،　　زباں کی فتنہ خیزیاں؛
یہ حرص کے مظاہرے علوم کے نصاب میں؛
یہ نفس کے مطالبے فنون کے نقاب میں!
یہ فلسفہ طرازیاں،　　یہ گمرہی کی وادیاں؛

معاشیات کے سبق، سیاسیات کے ورق،
سکھا رہے ہیں زرگری، جتا رہے ہیں خودسری،
طبیعیات و کیمیا، الٰہیات و ہندسہ،
جفا کے اختیار میں، فنا کے اقتدار میں!
شکست و ریخت، قتل و خوں، جدال و کارزار ہے
نہ جانے اس جہاں کا آہ کیا مآلِ کار ہے!

(۳)

الٰہی وہ مجاہدینِ صف شکن کہاں گئے؟
مصافِ روزگار کے وہ تیغ زن کہاں گئے؟

وہی "خودی کے رازداں" وہی "خدا کے ترجماں"
وہ مجرمانِ بےخودی وہ صاحبانِ آگہی؛
وہ حاملانِ معرفت، وہ پاسبانِ حرّیت؛
وہ جن کی تیغ لا الٰہ، وہ جن کا وار بے پنہ؛
وفا شعار و نیک خو، فلاح کار و صلح جو؛
جنوں زرہ، خرد سپر، فراخ دل، قوی جگر؛
وہ عزم حوصلہ شکن وہ رزم زلزلہ فگن؛
غرض وہ جن پہ امن اور فلاح کا مدار ہے
الٰہی، کائنات کو انھی کا انتظار ہے!"

(آغاز)

کہیں جل نہ جائے چمن ترا!

عاصی ضیائی

دلِ غیر پر بھی اگر کبھی ہو جمال جلوہ فگن ترا
تو یقیں ہے وہ بھی پکار اٹھے "مرا تن ترا، مرا من ترا"

نگہِ کرم سے مجھے عطا ہوں وہ جراتیں، وہ جسارتیں
وہی میرا سجدۂ شوق ہو، وہی آستانِ کہن ترا

ترا فیصلہ تھا کہ بزم میں تری بوالہوس کا گزر نہیں
مگر آہ، میں نہ سمجھ سکا کہ کدھر ہے روئے سخن ترا!

مرے آگے چھیڑ نہ ہمنشیں ستم و جفا کی یہ داستاں
کہ مرے مذاق پہ بار ہے یہ نیازِ عزم شکن ترا

کوئی اور گل نہ کھلائیں تیرے جنوں کی فتنہ طرازیاں
کہ قفس تو ٹوٹ گیا مگر کہیں جل نہ جائے چمن ترا

نظر و عمل میں یگانگت، نہ دل و زباں میں مطابقت
نہیں کچھ امید فلاح کی جو یہی رہے گا چلن ترا

ترا ادعا ہے یہ عاصیا کہ شہیدِ راہِ وفا ہے تو
مگر اور کچھ ہی بتا رہا ہے ہر ایک تارِ کفن ترا

(سلسبیل)

قیامت!

فروغ احمد

بیگانۂ احساس ہے کیا جبرِ مشیّت! کس درجہ ستم کیش ہے تقدیر کا قانون
اندوہِ مکافات میں دُنیا ہے گرفتار حد یہ ہے کہ حیوان بھی اس سے نہیں مامُون
حل کر نہ سکے مسئلۂ سود و زیاں کو گوتم کا ہو عرفان کہ اسرارِ فلاطون
ہے وہم و گماں عقلِ فسوں گر کا کرشمہ تیری نگہِ گرم سے ٹوٹے گا یہ افسُوں

+

تجھ کو نظر آئی نہ بہارِ چمنستاں شاید کہ ترا غنچۂ دل وقفِ خزاں ہے
عالم ہمہ آبادی و ویرانیٔ باہم گُل ہنستا ہی بُلبُل کا جگر نذرِ خزاں ہے
تجھ کو جو خرابی ہی خرابی نظر آئی پھر کیا ہے کہ محکم ابھی بنیادِ جہاں ہے؟
چاہے تو کسی دن یہی عالم ہو دگرگوں وہ ذات کہ بالائے ہمہ وہم و گماں ہے

+

تخریب ہی تخریب جو ہر سو نظر آئے پھر کیوں نہ یہ سمجھیں کہ جہاں مٹ کے رہیگا
تعمیر ہی تعمیر جو ہر سو نظر آئے پھر کیوں نہ یہ سمجھیں کہ جہاں مٹ کے بنیگا
یہ نکتہ جو روشن تری آنکھوں پہ ہوا ہے کیا اب بھی قیامت کا یقیں تو نہ کریگا

تکوینِ مکافات قیامت ہے قیامت
اعمالِ مسلماں کی ضمانت ہو ضمانت!

(سلسبیل)

کس کا انتظار ہے؟

ضرار محمود علوی

کراہتی ہے کائنات، چیختی ہے زندگی — نگاہ میں بھرا ہے یاس، قلب میں فسردگی
جدھر بھی اٹھتی ہے نظر، فساد و انتشار ہے — فلک بھی لالہ زار ہے، زمیں بھی لالہ زار ہے
فضا میں ارتعاش ہے، ہوا میں حزن و یاس ہے — چمن چمن کلی کلی خموش ہے اداس ہے
زمانہ جل رہا ہے نسل و قومیت کی آگ سے — ربابِ زیست کیوں تہی ہے زندگی کے راگ سے

+

الٰہی ماجرا ہے کیا زمانہ بے قرار ہے — الٰہی کائنات کو یہ کس کا انتظار ہے

(سلسبیل)

حقائق و اسرار

مضطر گجراتی

بارہا چاک ہوئے جیب و گریبانِ سکوں — تری نظریں نہ ہوئیں محرمِ اسرارِ درون
تجھ کو بدحالیٔ مزدور کا ماتم ہے فقط — مجھ کو تقدیرِ شہی بھی نظر آتی ہے زبوں
اپنی سانسوں میں دکھا تیغِ محمدؐ کا جلال — یوں نہ ٹوٹے گا یہ پیرانِ کلیسا کا فسوں
گرم ہوتا نہ اگر معرکۂ بدر و حنین — صبح یوں شام کو کرتی نہ عطا غازۂ خوں
جب خودی ہوتی ہے آمادۂ تکبیر و صلوٰۃ — پائے انساں پہ سر افلاک کا ہوتا ہے نگوں
اٹھ گئے لیلیٔ فطرت کے انیسانِ قدیم — نجد کی خاک پہ اتریں نہ پھر آیاتِ جنوں
آگیا مرکزِ تخریب پہ عالم کا نظام — تا کجا تیری خدائی پہ میں خاموش رہوں
بادۂ سوز سے خالی ہے مسلماں کا ایاغ — اب بھی میں مرثیہ زندہ دل کا کہوں یا نہ کہوں
خالقِ صاحبِ معراج کی عظمت کی قسم — طائرِ سدرہ سے پرواز [illegible]

ڈوب کر دل کا سفینہ نہ پھر ابھرا مضطر
اُف وہ طوفان جو اٹھا تھا بانداز سکوں

—— + ——

زندگی کے دو زاویئے

(۱) ایک اشتراکی اپنی کامریڈ سے!

مری محبوب مری گود میں آجاؤ تم
اب تو بیباک ذرا ہو جاؤ
توڑ دو بندِ حیا
اپنی باہیں مری گردن سے حمائل کردو
ہوگا پھر سُرخ سویرا' ترے دامن سے طلوع

انجم عثمانی

(۲) ایک مسلم اپنی شریک حیات سے!

اے مری جانِ حیات
تم سے پیمانِ وفا لینا ہے
مجھ کو باطل کی بغاوت میں یہ جاں دینی ہے
یہ خودی اپنی بھی رسوا تو نہیں ہو سکتی
مجھ سے طاغوت کی پوجا تو نہیں ہو سکتی
تم مری راہ میں حائل تو نہ ہو جاؤ گی!

(حیات نو)

عزمِ سفر!

عرشی بھوپالی

ابھی تو عزمِ سفر تشنہ کامِ منزل ہے
مرے ندیم تھکے قافلوں کی بات نہ کر
بھٹک رہے ہیں نگارِ سحر کے دیوانے
لہو میں بھیگی ہوئی مشعلوں کی بات نہ کر

فریب دے کے اُنھیں رہزنوں نے لوٹ لیا
وہ کارواں جو امیدِ سحر میں سوئے تھے
بھلا سکیں گے نہ صدیوں کا جاں گدازِ سفر
اندھیرے کاٹ رہے ہیں ستارے ڈوبے تھے

قراردادِ مقاصد سے کھیلنے والو
حیات و موت کے جادے بدلتے جاتے ہیں
زمینِ پاک سے اُبھرا ہے اک نیا خورشید
چراغ راہگذاروں پہ جلتے جاتے ہیں

ہزار طوق و سلاسل ہزار دار و رسن
مرے جنوں کے قدم ڈگمگا نہیں سکتے
طلسمِ خانۂ شب کے طویل سناٹے
مری سحر کے اُجالے چرا نہیں سکتے

گذر رہی ہیں مسافر!

عرشی بھوپالی

لہو میں ڈوبی، سحر سے سُلگتی شاموں سے
گذر رہے ہیں مسافر کٹھن مقاموں سے

ہزار منزلِ مقصود ہو غبار آلود
مگر چھپے گی کہاں تک جنوں خراموں سے

نویدِ موسمِ گُل لے اڑی جنھیں صیّاد
کہیں رُکے ہیں وہ طائر شکستہ داموں سے

جہانِ سُرخ کہاں اور کہاں مرا اسلام
اُبھر رہے ہیں اندھیرے سحر مقاموں سے

گجر بجاؤ!

عرشی بھوپالی

وہی خزاں ہے وہی ہیں لہو کے نذرانے
تمہیں بتاؤ کہ مہکے کہاں یہ ویرانے؟

اندھیری شب کو سحر کہہ رہے ہیں دیوانے
حقیقتوں کو چھپانے چلے ہیں افسانے

مہک رہے ہیں فضا میں سحر کے میخانے
گجر بجاؤ کہ کو دی طلوعِ فردا نے

کہیں بجھے ہیں وہ تیور اجل کی آہٹ سے
جنھیں سنوار گئے زندگی کے دیوانے

یہ کس کے نقشِ قدم پھول بن کے ابھرے ہیں
چمن سے آنکھ ملاتے ہیں آج ویرانے

یہ کیا غضب ہے کہ الحاد کے اندھیروں میں
حیات ڈھونڈھتی پھرتی ہے آئینہ خانے

"تفہیم القرآن"

(مؤلفہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی)

شائقین کے لئے ایک ضروری اعلان

الحمد للہ کہ "تفہیم القرآن" جلد اول طباعت کے مرحلے سے گزر چکی ہے، اور اب صرف نقشوں، ٹائٹل، انڈکس اور جلد بندی کی تکمیل ہو رہی ہے۔ اب انشاء اللہ اس میں کچھ زیادہ دیر نہیں ہے کہ اپنے دور کا یہ بیش بہا دینی وعلمی تحفہ آپ کے ہاتھوں میں پہنچ جائے۔

کام بجائے خود اتنا بڑا تھا اور اس کے اتنے چھپے ہوئے گوشے تھے اور ہر گوشے میں اتنی پیچیدگیاں رونما ہوتی رہیں کہ جن کا اندازہ اہل اشتیاق کو تو کیا، خود پبلشر کو بھی پہلے سے نہ تھا۔ چنانچہ برابر شکایتی واستفساری خطوط آ رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ پبلشر جس نے تفہیم القرآن کی خاطر ایک مدت سے کام بند کر رکھا ہے اور سرمائے کی ایک مقدار اس میں کھپا دی ہے، بجائے خود سب سے زیادہ عجلت کار کے لئے کوشاں ہے۔ لیکن ایک بڑا کام اچھے معیار پر کرنے کے لئے صبر کی کچھ زیادہ ہی آزمائش ہوا کرتی ہے۔

پہلی جلد سورۂ فاتحہ سے سورۂ انعام تک ہے اور 22×29/8 سائز کے سوا چھ سو صفحات پر مع ۴ جغرافی نقشوں کے تیار ہوئی ہے۔ یہ ایک غیر اختیاری صورت پیش آئی ہے کہ قسم سوم کے لئے کاغذ حاصل نہیں ہو سکا، لہٰذا سرِدست صرف قسم اول اور قسم دوم کی اشاعت عمل میں آ رہی ہے۔ جن حضرات نے قسم سوم کے لئے فرمائش کی تھی وہ چاہیں تو مزید انتظار کریں اور چاہیں تو اپنی فرمائشیں قسم اول یا دوم کے لئے تبدیل کرا دیں۔

قسم اول مجلد کی قیمت -/۲۲ روپے اور قسم دوم مجلد کی قیمت -/۱۹ روپے فی نسخہ ہوگی۔ محصول ڈاک پونے دو روپے کے قریب قریب لگے گا۔ یہ قیمت متوسط قسم کی جلد کی صورت میں ہوگی۔ زیادہ اچھی جلد بندی کا انتظام بھی ہو سکتا ہے جس کے لئے اندازاً عہ سے ﷲ تک زائد صرف ہوں گے۔

جو اصحاب اپنی سابق فرمائشوں میں قسم، جلد یا اپنے پتے وغیرہ میں کوئی تبدیلی کرانا چاہتے ہوں وہ اپنے خریداری نمبر یا تاریخ فرمائش کے حوالے سے ناشر کو مطلع فرما دیں۔

شیخ قمر الدین پبلشر و بک سیلر، ناشر تفہیم القرآن

مکتبۂ تعمیرِ انسانیت۔ ۲۵۰ گوجر گلی۔ اندرون موچی دروازہ۔ لاہور

نیا نظامِ تعلیم

رائج الوقت نظامِ تعلیم و تربیت جس میں مسلمانوں کی موجودہ نسل پرورش پا رہی ہے، اسلامی عقیدہ اور نصب العین سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا ہے بلکہ اس کے لئے سخت مضر ہے، اگر اس کو مسلسل قبول کیا جاتا رہا تو اندیشہ ہے کہ کہیں ہماری آئندہ نسلیں اسلام سے نہ صرف بیبہرہ بلکہ باغی و منحرف ہو کر نہ اٹھیں۔ اس صورتِ حال کو مرکزی درسگاہ جماعت اسلامی (ہند) نے بروقت محسوس کیا ہے اور ایک ایسے آٹھ سالہ نصابِ تعلیم کی طرح ڈال دی ہے، جس میں دینی و دنیوی علوم کو ایک دوسرے میں سمو کر دونوں کو یکجا کر دیا جائے تاکہ نتیجتاً اس نصاب سے فارغ ہونے والے طلباء علوم جدیدہ سے بہرہ مند ہوتے ہوئے ایک مردِ مومن کی اسپرٹ کے ساتھ زندگی کے عملی میدان میں قدم رکھ سکیں۔ اس نصاب کی پہلی کڑی کے طور پر فی الحال تین سلسلے تیار کئے گئے ہیں۔

(۱) سلسلہ "ہماری کتاب" قاعدہ ۴ر، پہلی ۶ر، دوسری ۸ر، تیسری ۹ر، چوتھی ۱۱ر، پانچویں ۱۱ر
چھٹی زیرِ طبع

(۲) سلسلہ "اخلاقی کہانیاں" پہلی ۳ر، دوسری ۳ر، تیسری ۶ر، چوتھی ۵ر

(۳) سلسلہ "ہماری پوتھی" پرائمر ۶ر، پہلی ۶ر، دوسری ۱۲ر، تیسری ۱۲ر

چوتھا سلسلہ ریاضی کا ہے جو زیرِ تدوین ہے۔ انشاء اللہ بہت جلد اس کو پیش کرنے کی کوشش کی جائیگی، پھر اس کے ساتھ سلسلہ ہائے سیرت، تاریخ جغرافیہ و سائنس کی تیاری پیشِ نظر ہے،

یہ سلسلے اس قابل ہیں کہ ملک کی تمام اسلامی درسگاہیں ان کو اپنے ہاں رائج کریں۔ مجوزہ نصابِ تعلیم کے خاکہ کو تفصیلی طور پر سمجھنے کے لئے "نصابِ تعلیم" ہی کے نام سے ۹۶ صفحہ کا ایک کتابچہ الگ شائع کیا گیا ہے اس کی قیمت ۸ر ہے۔

کتابیں منگانے کا پتہ:۔ **مکتبہ جماعت اسلامی (ہند) رام پور یوپی**

کیا کمیونزم محض معاشی نظام ہے - یا اس کا کوئی تعلق مذہب اور اخلاق سے بھی ہے - اشتراکیت کی تجربہ گاہ میں مذہب و اخلاق کی کیا قدر و قیمت ہے اور اس تجربہ گاہ میں مذہب اخلاق - ادب - عائلی زندگی وغیرہ کے متعلق جو نئی قدریں VALUES قائم ہوتی ہیں - اُن کی حقیقت کیا ہے -

اِن سوالات کے جواب کے لئے

اِشتراکیت مذہب اور اخلاق

مباحث :-

- یورپ میں الحادی فکر کا ارتقا
- مذہب کارل مارکس اور اینجلس کی نظر میں
- مذہب لینن کی نظر میں
- مسلم ایشیا پر الحادی یلغار
- اشتراکیت اور اخلاقِ انسانی
- اشتراکی ادب - مذہب اور اخلاق

مصنف :- نذر محمد خالد — قیمت ایک روپیہ بارہ آنے — خوبصورت ٹائیٹل کے ساتھ ۱۴۴ - مجلد گرد پوش کے ساتھ ۶/-

مکتبہ چراغِ راہ - ۹ لوٹیا بلڈنگ رام باغ روڈ کراچی ۱

ہندوستان میں ترسیلِ زر کا پتہ :-

مکتبہ نشاۃ ثانیہ ، معظم جاہی مارکیٹ ، حیدر آباد دکن

جاری کردہ :- دفتر مسواک ۵۸ لکشمی بلڈنگ ۔ بندر روڈ ، کراچی

حاذق نروائن پلز

(حب خاص)

ایک جنرل ٹانک ہے جو عصبی اور دل و دماغ کی کمزوریوں کا مجرب علاج ہے
یہ گولیاں دماغی کام کرنے والے حضرات یعنی وکیل بیرسٹر، پروفیسر اور طالب علم اصحاب کے واسطے آب حیات کا کام دیتی ہیں اور جسم انسانی کی جملہ عصبی کمزوریوں کو بحال کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں، دواخانہ کے خاص مجربات میں سے ہیں۔

خوراک	۱۰ یوم	۲۰ یوم	۴۰ یوم
پیکنگ	۲۰ گولی	چالیس گولی	۸۰ گولی
قیمت	۲/۰/۰	۳/۱۲/۰	۷/۸/۰

حاذق ہسٹریا پلز

یہ گولیاں خالص و کمیاب جڑی بوٹیوں سے جدید طبی اصول پر تیار کی ہوئی ہیں عورتوں کی مشہور بیماری ہسٹریا یا اختناق الرحم، بچوں کی مرگی (ام الصبیان) کے لئے لاثانی دوا ہے۔ اس کے علاوہ عام کمزوری ضعف ہضم، اختلاج قلب (دل کی دھڑکن) کے لئے بھی بہت مفید ہے۔ یہ دواخانہ ہذا کی ایسی بے نظیر ترتیب ہے جس پر طب یونانی جس قدر بھی فخر کرے بجا ہے۔

قیمت فی شیشی ۴۰ گولی پانچ روپے

حاذق دواخانہ رجسٹرڈ مقابل ماما پارسی گرلز ہائی سکول بندر روڈ، کراچی ۱

اسلامی ادب کا علمبردار

ماہنامہ چراغِ راہ

کراچی

جنوری ۱۹۵۲ء

قیمت: ۸

جلد ۵ ——— شمارہ ——— ۱، ۲

چندہ سالانہ

پاکستان	بھارت
پانچ روپے	ساڑھے سات روپے

دفتر چراغ راہ ۹، لوٹیا بلڈنگ
آرام باغ روڈ کراچی

مندرجات

سوچ بچار

برطانوی امپیریلزم اور مصر

خدا ـــــ ایک فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیۡدُ خُدا ـــــ کے ہونے پر اور کائنات پر اس کے حکم و قانون کے نفاذ و اجرا پر انسان کو جو دلائل و شواہد یقین دلاتے رہے ہیں ان میں سے ایک یہ حقیقت بھی ہے کہ انسانی تاریخ میں جو بڑی سے بڑی جابر و سرکش طاقتیں اٹھی ہیں اور جنھوں نے مدتوں کوس لمن الملک بجایا ہے، ایک دن دنیا نے دیکھا کہ وہ اپنے اعمال کا حساب دینے کے لئے قانون الٰہی کی عدالت میں مجرم بن کے کھڑی ہیں اور اس عدالت سے ان کو جب زوال و تباہی کی سزا ملی ہے تو پھر تقدیر نے ان کو پیس کر ان کا خاکہ ہی اڑا کے چھوڑا ہے۔

ہم اس دور کے لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں کہ جرمنی، اٹلی اور جاپان جن سے امن عالم لرزہ براندام تھا قانونِ قدرت کے ہاتھ میں کس طرح پھر کی بن کے رہ گئے۔ اور پھر آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ وہ برطانیہ جس کی تقلید اور نقالی بے شمار اقوام کے لئے موجب افتخار تھی نہایت تیزی سے اپنے انجام کی طرف لڑھک رہا ہے۔ ایک قوم جو دنیا کی ایک بڑی حکمران طاقت ہی نہ تھی بلکہ ایک تہذیب کی معلم اور ایک فلسفہ کی مبلغ بھی تھی ـــــ وہ کہ جس کے پائے نازکی ایک ایک جنبش نہ جانے کتنی قیامتیں اٹھایا کرتی تھی آج ان چھوٹی چھوٹی طاقتوں کی ٹھوکروں کی زد پر ہے جن کو کمزور رکھنے اور کمزور کرنے کے لئے اس نے ہر تدبیر اختیار کی۔

گزشتہ جنگِ عظیم نے جرمنی، اٹلی اور جاپان کو قطعی طور پر ختم کر دیا، فرانس کو تیسرے درجے کی طاقتوں میں جا ڈالا، اور برطانیہ کو فاتح ہونے کے باوجود صفِ اول سے نکال کر دوسری صف میں دھکیل دیا۔ اس کے بعد قوانینِ تقدیر نے مزید نتائج دکھانے شروع کئے اور برعظیم ہند جیسی سونے کی چڑیا کا قفس اسے ہنستے مسکراتے اپنے ہاتھ سے کھول دینا پڑا۔ پھر فلسطین گیا، چین کے اڈے اور معادن گئے، ملایا اور برما میں مخالفانہ طاقتوں نے آویزش شروع کر دی اور سب سے بڑی چوٹ یہ پڑی کہ ایران کا تیل جو برطانوی شہنشاہیت کی رگوں کے لئے خون کی حیثیت رکھتا تھا، ہاتھ سے دینا پڑا۔ اتنا ہی نہیں، برے دن آئے تو وہ داخلی پہلو سے بھی ادبار ہی کا پیغام لے کر آئے۔ ایک طرف غیر معمولی برف باری کی مصیبت آئی اور اس نے برطانیہ کی اقتصادی مشکلات میں اضافہ کر دیا، برقی قوت اور کوئلے کی کمی نے مزید برا اثر ڈالا، پھر جہازیوں کی ہڑتالوں نے ستم ڈھایا اور اس پر مستزاد یہ کہ غذائی ضروریات کی کمی سے سابقہ پڑا، اور رہی سہی کسر "قومی ملکیت" کے تجربے نے پوری کر دی جو لیبر پارٹی کے زیرِ اقتدار شروع کیا گیا تھا۔ ہر وہ صنعت جو قومی ملکیت میں لی گئی اس کی پیدا آوری میں نمایاں کمی بھی آئی اور قیمت کے لحاظ سے گرانی بھی ہوئی۔ یہاں تک کہ حال ہی میں امریکہ کی مارکیٹ میں یہ سوال پیدا ہو گیا ہے کہ برطانیہ سے جو مال وہاں جا رہا ہے وہ دوسرے ممالک کے مقابلے میں گراں پڑتا ہے، لہٰذا اس کی خریداری جاری رکھنا مشکل ہے۔ غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ جیسے ایک قوم کو چاروں طرف سے قدرت کے انتقام کی فوجیں گھیرے میں لے رہی ہیں۔ اسی سلسلے کی تازہ کڑی جو ہمارے سامنے ہے وہ سویز کا قضیہ ہے!

یہ برطانوی زوال کوئی اتفاقی حادثہ نہیں، کسی دشمن کا حملہ نہیں، کسی سازش کا نتیجہ نہیں، بلکہ عین قانونِ الٰہی کے تحت یہ

برطانیہ کی اپنی بوئی ہوئی تاریخ کی کھیتی کا حاصل ہے جسے یہود وش کے بیج ہیں جو امروز کی کیاریوں میں کونپلیں نکال رہے ہیں۔ یہ سزا ہے اس گناہ کی جسے امپریلزم کہتے ہیں۔ امپریلزم دنیا کا عظیم ترین اور عالمگیر گناہ ہے جس کی لپیٹ میں لاکھوں جانیں، ہزاروں آبادیاں، اور قوموں کی قومیں آ گئی ہیں۔ امپریلزم وہ بلا ہے جس نے انسان اور انسان کو لڑایا ہے، قوموں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے، بھوک ننگ کی حالت پیدا کی ہے، امن کو غارت کر کے طرح طرح کے خوف پیدا کئے ہیں، جنگوں اور انقلابوں کی تحریک کی ہے، سازشوں اور جعل سازیوں سے ساری انسانی تاریخ کو گندہ کر دیا ہے۔ ایسے گناہ کو قدرت کبھی معاف نہیں کر سکتی۔

یہ بین الاقوامی گناہ مغرب کی قوموں کے ضمیر میں اگر نشیمن بند ہوا ہے تو یہ بلا وجہ نہیں ہوا۔ اس کی پیدائش علی الشب نہیں ہوئی کہ بغیر کسی ماں باپ کے یہ فتنہ نمودار ہو گیا ہو۔ اس کا سرچشمہ وہ فلسفہ ہے جس پر جدید قومیں ایمان رکھتی ہیں۔ آپ سوچئے کہ جن قوموں کے نزدیک یہ دنیا کسی مالک کے بنائے بغیر بنی ہو، کسی مدبر کے چلائے بغیر چل رہی ہو، اور کسی قانون ساز کے بغیر اس میں حوادث رونما ہوتے ہیں اور جن کے نزدیک اس دنیا کی زندگی کے لئے کسی برتر قوت کی ہدایت کا اتباع ضروری نہ ہو، اور جن کے نزدیک انسان کو اپنے اعمال کی جوابدہی کسی کے سامنے نہ کرنی ہو، اور جن کے نزدیک مادی مفاد ——— روپیہ پیسہ، تیل کے چشمے، تجارتی منڈیاں ——— ہی اخلاق کا اصل معیار ہوں، اور جن کے نزدیک تاریخ کا بنیادی تقاضا ہی یہ ہو کہ انسان اور انسان اور قومیں اور قومیں باہم آویزاں رہیں اور جن کے نزدیک ترقی کی شرط ہی یہ ہو کہ قوی کمزور کو کچل کر اپنا راستہ نکالے، اور جن کے نزدیک قوم وہ بت ہو کہ جس کے استھان پر ساری انسانیت کے مفاد اور امن اور آزادی کے حقوق کو ذبح کرنا جائز ہی نہیں، عین واجب ہو، ان سے امپریلزم کے سوا اور کس چیز کی توقع کی جا سکتی ہے۔ فلسفۂ الحاد جب بھی قوت کی تلوار ہاتھ میں لے گا تو امپریلزم پیدا ہوگا۔ یہ دو چیزیں امپریلزم کے والدین میں اور ان کے گھر میں ناگزیر ہے کہ امپریلزم جنم لے ——— چاہے یہ امریکہ کے ہاں پائی جائیں یا روس کے یہاں!

اس فلسفے کو لے کر جب جدید قومیں ایک ہاتھ میں قاہری کی تلوار اور دوسرے ہاتھ میں ساحری کے جال لے کے نکلیں تو پوری دنیا ان کی نگاہوں میں ایک شکارگاہ بن گئی۔ چنانچہ ان شکاری قوموں میں برطانیہ بعض خاص حالات کے تحت پیش پیش ہو گیا۔ اور یہ بات ضرب المثل بن گئی کہ برطانیہ کی سلطنت میں کبھی سورج غروب نہیں ہوتا۔ دنیا کی خشکی کا چوتھا حصہ اور اس کی آبادی کا پانچواں حصہ گزشتہ جنگِ عظیم تک برطانیہ کے زیرِ نگین تھا۔ لندن سے لے کر ملایا اور ہانگ کانگ تک برطانوی امپریلزم کے جال پھیلے ہوئے تھے اور ایشیائی اور افریقی نو آبادیات تک جانے والے راستوں اور تمام اہم ناکوں پر برطانیہ نے اپنا قبضہ قائم کر لیا۔

نہر سویز ۱۸۶۹ء میں کھدی اور دو سمندروں کو ملانے والی یہ آبنائے مغرب کی شہنشاہیت پسند اقوام کے لئے خصوصاً برطانیہ کے لئے امپریلزم کی شاہ رگ بن گئی۔ یہ پوری آبنائے مصری سلطنت میں واقع ہے اور قدرتی طور پر اس پر مصر ہی کا قبضہ ہونا چاہئے لیکن ۱۸۷۵ء میں جب خدیو مصر کے مالی حالات خراب ہو گئے تو اس نے سویز کے حصص کی فروخت کا فیصلہ کر لیا۔ یہ زریں موقع سامنے آتے ہی برطانوی وزیر اعظم نے حصص خرید لئے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ برطانیہ اور فرانس نے مصر کے مالیات کو اپنے کنٹرول میں لے لیا۔ اس کنٹرول کو مکمل کرنے کے لئے برطانوی فوجیں بھی آئیں اور آخرکار مصر کی فوجوں کی سپہ سالاری بھی برطانیہ نے حاصل کر لی۔ اس صورت حالات سے ایشیائی مفاد کے تحفظ کے علاوہ یہ فائدہ بھی برطانیہ کو حاصل ہوا کہ سوڈان اور سومالی لینڈ اور افریقہ میں پاؤں پھیلائے نیز مشرقِ وسطیٰ کو اپنے زیرِ نگیں رکھے۔ مزید یہ کہ مصر کی روئی کی مارکیٹ سے من مانا استفادہ کیے اور سویز سے گزرنے والے جہازوں کی محصول کی آمدنی سے حصہ لے۔ اتنا ہی نہیں، مصر میں اس مداخلت کا یہ فائدہ بھی تھا کہ جنگِ عظیم میں برطانیہ نے ترکیہ سلطنت کی وسعتوں کا خاتمہ کر دیا۔

ایک ملک کسی بیرونی طاقت کے تصرف کو برضا و خوشی تو برداشت نہیں کر سکتا۔ چنانچہ مصر میں اس حالت کے خلاف برابر تحریکیں چلتی رہی ہیں۔ اور ہنگامے ہوتے رہے ہیں۔ ۱۸۸۱ء میں عربی پاشا کی قیادت میں ایک تحریک وطنی تصور کو لے کر اٹھی جس کا نعرہ تھا "مصر مصریوں کے لئے!" لیکن اسے دبا دیا گیا۔ ۱۸۸۳ء میں مہدی سوڈانی اور اس کے ساتھیوں نے علم انقلاب بلند کیا۔ ایسے انقلابیوں کے لئے برطانوی سیاسی لغت میں مذہبی جنونیوں "(FANATICS) کا کراہت آمیز لقب تجویز کیا گیا۔ لیکن ان مذہبی جنونیوں نے جدید آلات سے مسلح ایک عظیم امپریلزم کو نہتے ہو کر وہ چنے چبوائے کہ تاریخ ان واقعات کو بھلا نہیں سکتی۔ دس بارہ سال تک اس تحریک کی وجہ سے سوڈان میں برطانیہ کے قدم جم نہیں سکے لیکن بالآخر جب کچھ مقامی غدار ہاتھ آ گئے تو ۱۸۹۸ء میں کچنر کے ہاتھوں سوڈانی تحریک کا استیصال ہو گیا۔ چنانچہ ۱۹۱۴ء سے مصر و سوڈان باقاعدہ سرکاری طور پر انتدابی علاقے قرار دیئے گئے۔

مگر آزادی کی مساعی جاری رہیں۔ ان کے نتیجے میں ۱۹۲۲ء میں مصر کا ایک قدم اور منزل استقلال کی طرف اٹھا۔ یعنی مصر کو لنگڑی لولی آزادی مرحمت کی گئی۔ اعلان کیا گیا کہ مصر اب آزاد ہے۔ مگر ———— (اور یہ "مگر" ایک بڑا مگرمچھ تھا) ———— مگر مصر کے رسل و رسائل، اس کا دفاع، اس کے خارجہ معاملات برطانیہ کے ہاتھ میں رہیں گے۔ نیز سوڈان برطانیہ اور مصر کی مشترک نگرانی میں رہے گا۔ اس "مگر" کی رو سے برطانوی دستے مصر میں رکھے گئے، نیز خود مصری فوج سر لی سٹاک کی سالاری میں دے دی گئی۔ مصر کے انتقامی رجحانات نے "سر لی سٹاک" کو قتل کر دیا۔ اس پر برطانیہ نے ۲۵ - لاکھ مصری سکہ کا تاوان مصر پر ڈالا۔ اسکندریہ کے کسٹم ہاؤس پر قبضہ کر لیا۔ مصر نے اس زیادتی کے خلاف لیگ آف نیشنز میں احتجاج کیا لیکن برطانیہ نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ یہ ہمارا نجی معاملہ (DOMESTIC AFFAIR) ہے۔ اس میں لیگ دخل نہیں دے سکتی۔

یہاں تک کہ آگے چل کر مطالبۂ آزادی نے بڑے ہمہ گیر ہنگاموں کی شکل اختیار کر لی اور ۳۶-۱۹۳۵ء میں جب برطانیہ اور اطالیہ میں معرکہ آرائی ہو رہی تھی، لندن میں محسوس کیا گیا کہ اب اگر اس مطالبہ کو دبا دیا گیا تو نتائج خراب ہوں گے، ۲۶۔ اگست ۱۹۳۶ء کے معاہدے کی رو سے مصر کو آزادی دے دی گئی لیکن ۲۰ سال کے لئے یہ معاہدہ فوجی تسلط کے سائے میں استوار کرتے ہوئے برطانیہ نے مصر کی آزادی کی خود ہی یہ قیمت لگائی کہ سویز کے رقبے میں مختصر سی برطانوی فوج (دس ہزار کی تعداد طے کی گئی) رہے گی۔

چنانچہ سویز پر آج تک برطانوی تسلط رہا ہے۔ لیکن برطانیہ کے مقابلے میں ایران کی کامیابی نے .... مشرقِ وسطیٰ کے ممالک میں جذبات کی ایک نئی لہر دوڑا دی ہے۔ ایران کے تیل کی آزادی نے سویز میں بھی آزادی کی لہریں پیدا کر دی ہیں۔ مگر برطانیہ جو قانون الٰہی کی جیرہ دستیوں سے بے خبر ہے، نہر سویز کے کنارے کو دانتوں سے پکڑے رکھنا چاہتا ہے۔ کیوں چاہتا ہے! ———— اس لئے کہ ایک تو اپنے ایشیائی اور افریقی اور مشرقِ وسطیٰ کے شہنشاہی مفاد کی حفاظت کر سکے، دوسرے یہ کہ آئندہ جنگ میں مشرقِ وسطیٰ کے ملکوں کو اڈوں کے طور پر استعمال کر سکے۔

ان مقاصد کے لحاظ سے ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ سویز کا مسئلہ مصر کا مسئلہ نہیں، سارے ایشیا، سارے مشرقِ وسطیٰ اور ساری مسلمان اقوام کا ہے ———— اور خود پاکستان کا اپنا مسئلہ ہے۔

خیر برطانیہ کے مفاد کچھ ہوں، سوال یہ ہے کہ ایک ملک برطانیہ کے مفاد پر اپنی حاکمیت (SOVEREIGNTY) کو، اور اپنی آزادی کو بھینٹ کس بنا پر چڑھائے؟ کیوں چڑھائے؟ ایک ملک کہتا ہے کہ سویز اس لئے میرے قبضے میں رہنی چاہئے کہ یہ میرے مفاد کا تقاضا ہے۔ اور دوسرا ملک کہتا ہے کہ سویز اس لئے میرے قبضے میں رہنی چاہئے کہ اصلاً میری ہے اور اس پر غاصبانہ قبضہ کیا گیا ہے۔ ارشاد ہو کہ حق کدھر ہے اور دھاندلی کدھر ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ سویز کے قبضے نے برطانیہ کی دھاندلی کی منطق کو بالکل ننگا کر دیا ہے اور کوئی اخلاقی وزن اس کے ساتھ نہیں رہا ہے۔

لیکن وہ اپنی دھاندلی کو اخلاقی وزن دینے کے لئے ۱۹۳۶ء کے معاہدے کو بیچ میں لا رکھتا ہے اور اپیل کرتا ہے کہ معاہدے کا احترام

ایک اخلاقی ذمہ داری ہے۔ مگر ہم پوچھتے ہیں کہ ایک ملک کو غلام بنا کر تم پھر اسے آزادی دینے کے لئے ایک خاص قیمت وصول کرنے کے لئے جو معاہدہ کرتے ہو اس میں اخلاقی وزن کہاں سے لا کے ڈالا جا سکتا ہے۔ کسی قوم کو اپنے فوجی تسلط میں لینے کے بعد اس کے ساتھ من مانی شرائط پر ایک معاہدہ طے کرنا اور پھر حالات بدل جانے پر اس معاہدے کی بنیاد پر اخلاقی اپیل کرنا بے معنی حرکت ہے۔ معاہدے وہ قابلِ احترام ہوتے ہیں جو قلم سے لکھے گئے ہوں اور ان پر فریقِ ثانی کے قلم سے دستخط لئے گئے ہوں۔ لیکن جو معاہدے تلوار کی نوک سے لکھے جائیں اور پھر ان پر ایک مظلوم قوم کے قلم سے دستخط لئے جائیں ان میں کوئی اخلاقی وزن پیدا کرنا ممکن نہیں ہے۔ سنہ ۳۶ء کا معاہدہ ایک چیتے اور ایک بکری کا معاہدہ ہے، یہ ایک اژدہا اور ایک چڑیا کا معاہدہ ہے، یہ ایک صیاد اور ایک شکار کا معاہدہ ہے۔ یہ ایک غاصب اور ایک لٹے پٹے کا معاہدہ ہے، اور ہاں یہ ایک قصاب اور پچھڑی ہوئی گائے کا معاہدہ ہے۔ معاہدے وہ واجب الاحترام ہوتے ہیں جو برابر سرابر کی پوزیشن میں فریقین نے باندھے ہوں۔

علاوہ بریں یہ حقیقت بھی قابلِ لحاظ ہے کہ اپنی جباری سے مسلط کئے ہوئے معاہدۂ سنہ ۳۶ء کی خلاف ورزی خود برطانیہ نے کر ڈالی ہے، یعنی بروئے معاہدہ وہ صرف ۱۰ ہزار کی تعداد میں اپنی فوج سوئز کے کنارے رکھ سکتا ہے، لیکن آج[1] اس تعداد سے کہیں زیادہ تعداد میں فوج وہاں موجود ہے اور مزید بھیجی جا رہی ہے۔ پھر گلیڈ اسٹون سے لے کر اٹیلی تک، ہر ذمہ دار برطانوی لیڈر نے سوئز سے فوجیں ہٹا لینے کے وعدے کئے ہیں اور ان وعدوں کی تعداد ساٹھ تک پہنچتی ہے، مگر ہر مرتبہ ان وعدوں کو توڑنے کے لئے کوئی عذر پیش کر دیا جاتا رہا ہے۔ جن لوگوں کے پاسِ عہد کا خود یہ عالم ہو، ان کو اگر دوسروں سے پاسِ عہد کا تقاضا کرنے کا حق نہ پہنچے گا تو اور کس کو پہنچے گا۔ پھر ایفائے عہد کا مصر سے مطالبہ کرتے ہوئے برطانیہ کو یہ یاد نہ آیا کہ سوڈان کا گورنر جنرل حسبِ قرارداد تاجِ برطانیہ اور تاجِ مصر کی مشترک رضامندی ہی سے اپنے منصب پر قائم رہ سکتا ہے۔ لیکن حال ہی میں مصر نے برطانوی گورنر جنرل کے حق میں اپنی رضامندی واپس لے لی ہے۔ لیکن برطانیہ نے اس کے باوجود اسے قائم کیوں رکھا؟ یہ معاہدے ہی کی نہیں، دستور کی بھی خلاف ورزی ہے۔

حالات کا تازہ ترین ارتقاء یہ ہے کہ مصر کی طرف سے سفارتی تعلقات منقطع کرنے کے فیصلے پر برطانیہ نے معاہدہ سنہ ۳۶ء میں ترمیم کرنے کے لئے گفت و شنید پر رضامندی ظاہر کی ہے، مگر اس شرط کے ساتھ کہ مصر "چار طاقتوں کی مشترک نگرانی" کی تجویز کو بنائے گفتگو تسلیم کر لے۔ اس صورت میں برطانیہ اپنی فوجیں فوری طور پر سوئز سے ہٹا لے گا، مصر کو مشرقِ وسطیٰ کے مشترکہ دفاع میں شریک کیا جائے گا "شاہِ مصر و سوڈان" کا لقب اس شرط کے ساتھ تسلیم کر لیا جائے گا کہ بعد میں سوڈان کے عوام آزادانہ استصواب سے اپنی قسمت کا فیصلہ خود کریں، اور مصر کی فوجیں امریکی ماہرین کے زیرِ قیادت سوئز کی نگرانی کریں گی۔ یہ تجویز اگر مصر قبول کرے تو صورتِ حالات اب سے زیادہ خطرناک ہو جائے گی۔ آج اگر ایک برطانیہ سے کشمکش درپیش ہے تو اس کے بعد امریکہ، فرانس اور برطانیہ تین طاقتوں سے سابقہ پڑے گا اور ان کی حیثیت یو۔ این۔ او کے نمائندوں کی ہوگی۔ اس وقت تو امریکہ سوئز کے قضیے میں برطانیہ کے لئے رقیب کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن بصورتِ دیگر دونوں ایک ہو جائیں گے۔ اور چار طاقتوں کی نگرانی قائم ہو جانے کے بعد مشرقِ وسطیٰ کو آئندہ جنگ کا اڈہ نہیں، عین میدان بننے سے کوئی تدبیر روک نہیں سکتی۔ اس تجویز کو قابلِ غور سمجھنا بھی سیاسی بصیرت کے لحاظ سے دیوالیہ ہونے کا ثبوت ہوگا۔

ایران اور مصر کو ان غیر اخلاقی معاہدوں کو پابند رکھنے کے لئے مدتوں سے جو سازش برطانیہ اور ان ممالک کے حکمرانوں کے درمیان چلی آ رہی ہے اور جس کے تحت عوامی جذبات کو برابر پامال کیا جاتا رہا ہے، اس کا ایک خطرناک نتیجہ یہ نکلا ہے کہ سوچنے والے اور ٹھنڈے طریق سے سیاسی ارتقا کے راستے پر قوموں کو لے چلنے والے عناصر کو پیچھے دھکیل کر سرپھرے عناصر آگے آ رہے ہیں اور ان ممالک کی قیادتیں ان کے ہاتھوں میں کھیلنے پر مجبور ہو گئی ہیں۔ چنانچہ بڑے بڑے لیڈروں کو ہر لحظہ قتل ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

[1] جنگِ عظیم ثانی میں اس مسلّمہ تعداد سے کہیں کم فوج سوئز کے آس پاس موجود تھی۔

عوام قانون کی حدود کو پھاند پھاند جاتے ہیں، لیکن حکومت کچھ نہیں کر سکتی۔

اس کے علاوہ یہ صورتِ حالات بھی کچھ کم تشویشناک نہیں ہے کہ ایران اور مصر وغیرہ ممالک میں مغربی امپریلزم کی پالیسی عوام کو روس کی گود میں دھکیل رہی ہے۔ آج ہماری تاریخ کے بین الاقوامی سمندر میں چھوٹی اور کمزور مچھلیوں کو ایک مگرمچھ سے سابقہ درپیش نہیں ہے، بلکہ وہ دو مگرمچھوں کے درمیان اپنی بقا کے لئے جدوجہد کر رہی ہیں۔ ایک طرف سفید امپریلزم کا بوڑھا مگرمچھ ہے جسے اب مچھلیاں خوب جان پہچان چکی ہیں، دوسری طرف سرخ امپریلزم کا نوجوان مگرمچھ ہے جسے مچھلیاں ابھی جانتی نہیں۔ یہ نیا مگرمچھ اپنے بوڑھے حریف کو شکست دینے کے لئے مچھلیوں کا سرپرست بننے کے لئے تیار رہے۔ تاکہ جب اس کی گرفت ڈھیلی پڑے تو یہ اس کی جگہ لے سکے چنانچہ جب سفید امپریلزم کے ستائے ہوئے لوگوں میں انتقامی رو اٹھتی ہے تو سرخ امپریلزم کے ایجنٹ ان کو وعظ پلاتے ہیں کہ دیکھو سفید مگرمچھ تو وہ ہے کہ جس نے تمہارے ساتھ یہ کیا، اور وہ کیا اور جو تمہارا شکار کرتا رہا ہے، اور جو آج بھی اپنی چیرہ دستی سے باز آنے پر تیار نہیں ہے، لیکن اس سرخ مگرمچھ کو دیکھو تمہارے لئے وہ کتنا شریف، کتنا خیرخواہ اور کتنا ہمدرد ہے۔ اس نے تو تمہیں اب تک کبھی نہیں کھایا، اس نے تو تمہارا شکار نہیں کیا، پھر کیوں نہ سفید مگرمچھ سے نجات پانے کے لئے سرخ مگرمچھ کی پشت پناہی حاصل کی جائے اور اس سے تعلقات استوار رکھے جائیں۔ یہ ایجنٹ مصر اور ایران میں بھی اور ان کی طرح کے دوسرے ممالک ——— بلکہ خود پاکستان ——— میں بھی یہ کام کر رہے ہیں۔ لیکن یہ جو کچھ ہو رہا ہے دنیا کے لئے اس کے جو مہلک نتائج نکلیں گے ان کی ذمہ داری برطانیہ اور امریکہ اور مغربی اقوام پر عائد ہو گی۔ امپریلیسٹ مفاد کے تحفظ کے لئے ان کی ضد اور دھاندلی مظلوم ممالک کے لئے بھی اور خود مغربی اقوام کے لئے بھی اور پھر پوری دنیا کے لئے نہایت خطرناک قسم کے کانٹے بو رہی ہے۔ ایسے نازک حالات میں ایران، مصر اور دوسری قوموں کے اسلام پسند عناصر کو پورا زور اس پر صرف کرنا چاہئے کہ سفید امپریلزم اور سرخ امپریلزم کے لئے عوام میں یکساں جذبات نفرت پرورش پائیں اور وہ اپنی آزادی کو دونوں طرف سے محفوظ رکھنے کے لئے پورا زور صرف کریں۔ وہ عوام کو جذبات میں بہک کر اس حد تک بہ جانے دیں کہ وہ سفید مگرمچھ سے بچنے کے لئے اپنا ہاتھ سرخ مگرمچھ کو تھما دیں۔ ان کو روس کے زیرنگیں ممالک ——— خصوصاً روسی ترکستان ——— کی تاریخ سے سبق لینا چاہئے۔ جو مچھلیاں سرخ مگرمچھ نے نگلی ہیں ان کے کرب سے وقت پر عبرت پذیر ہونا ہی مفید ہو سکتا ہے۔

ہمارے ایشیائی اور خصوصاً مسلمان ملکوں کو یہ ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ اس معزیہ کی پالیسی کوئی معقول پالیسی نہیں ہو سکتی جو ایک ظالم معوی سے نجات پانے کے لئے ایک دوسرے معوی کے ساتھ اغوا ہونے کے لئے تیار ہو جائے۔ یہ راستہ آزادی کا نہیں، بلکہ صرف آقا بدلنے کا ہے۔

دوسری اہم بات جو یہاں عرض کرنی ہے یہ ہے کہ مغربی قوموں کا امپریلزم اپنے کئی پہلو رکھتا ہے۔ یہ امپریلزم جہاں بھی گیا ہے وہاں وہاں ایک خاص تہذیب اور ایک خاص طرزِ فکر بھی لے کے گیا ہے۔ اس کے ساتھ کچھ فلسفے، کچھ افکار اور کچھ قدریں بھی ہیں کہ جن کے ذریعے ذہنی حیثیت سے اقوامِ عالم کو شکار کیا جاتا ہے۔ پھر اس کا دوسرا پہلو سیاسی گٹھ جوڑ اور مالیاتی بندھن ہیں کہ جن میں قومیں اسی طرح الجھ جاتی ہیں جیسے مکھی مکڑی کے جالے میں الجھتی ہے۔ اس کے بعد تیسرا محسوس ترین پہلو فوجی اور سیاسی غلبے کا ہے۔ اب جن قوموں کو کسی امپریلزم کے خلاف لڑنا ہو ان کے لئے لازم ہے کہ وہ بیک وقت اس کے تینوں ہی پہلوؤں پر حملہ آور ہوں، ورنہ اس سے نجات مشکل ہے۔

امپریلزم کے فوجی اور سیاسی تسلط اور اس کے انتفاع کے خلاف جن لوگوں کو لڑنا ہو ان کا پہلا قدم یہ ہونا چاہئے کہ وہ اس کی فکری اور ذہنی جڑیں کھود ڈالیں اور مغربی اقوام کے فلسفے اور ان کی تہذیب کو ملک بدر کر دیں۔ بغیر اس کے اگر فوجی تسلط ہٹا بھی لیا جائے تو بھی آزادی نہیں مل سکتی۔ اس کی ایک نمایاں مثال ترکی ہے کہ جو مغرب کے فوجی اور سیاسی تسلط سے آزاد ہو گیا، لیکن آج آزادی کی

جو تقریباً صدی گزارنے کے بعد وہ فکری اور تہذیبی حیثیت سے پہلے سے غلام تر ہے، اور یہی وجہ ہے کہ وہ سفید بلاک کے سیاسی، معاہداتی
اور مالیاتی گٹھ جوڑ کے جالبے میں بری طرح الجھ کر رہ گیا ہے۔ حقیقی آزادی کے حصول کے لئے ناگزیر ہے کہ آپکے دل اور دماغ، آپ کا فلسفہ
اور آپ کے اپنے اصول اور اپنی اخلاقی قدریں اور اپنا زاویۂ نگاہ، اور اپنا تصورِ حیات مغربی فلسفے کی گرفت سے آزاد ہو۔ اگر فکر و احساس
اور علم و ایجاد کے سرچشمے آلودہ ہوئے تو تیل کے چشموں کی آزادی کیا کام دے گی، اور اگر خیالات کی موجیں برطانیہ کے تسلط سے نہ نکلیں
تو سویز کی نہروں کے آزاد ہو جانے سے کونسا بڑا انقلاب آجائے گا۔ مصر سے برطانیہ کی فوجوں کو نکلنا ہی پڑے گا، لیکن اس کی فوجیں اگر
روحوں اور سیرتوں اور کرداروں کے کناروں پر خیمہ زن رہیں تو آپ کیسے پنپ سکیں گے۔ مصر اور ایران جن طاقتوں کے خلاف کشمکش کر رہے
ہیں انہی سے اصولِ حیات لیتے ہیں، انہی سے دستور اور قانون لیتے ہیں، انہی سے اخلاقی قدریں لیتے ہیں، انہی سے نظامِ معاشرت لیتے
ہیں اور اس طرح اپنے دین اور اپنے نظامِ حیات کو ان کے قبضے میں دے کر اپنی زمین کی مٹی کو ان سے آزاد کرانا چاہتے ہیں۔

ہم مغربی امپریلزم سے نجات پانے کے لئے یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ سب سے پہلے ان کے فکری و تہذیبی جالوں کو توڑ دیا جائے، پھر
ان کے سیاسی، مالیاتی اور معاہداتی بندھنوں اور بلاکوں اور آئندہ بین الاقوامی جنگ کے منصوبوں کے ہر گٹھ جوڑ سے اپنے آپ کو الگ کر لیا جائے
اور پھر ایک ہلہ میں ایشیا اور مشرقِ وسطیٰ اور مصر و افریقہ کو مغربی قوموں کی جباری اور انتفاع سے نجات مل سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے
نزدیک اس امپریلزم کے خلاف ایک اہم جنگی قدم یہ ہے کہ ہر جگہ اسلامی تحریکیں بپا ہوں اور عوام ان تحریکوں کو اپنی پوری تائید مہیا کریں۔ چنانچہ مغربی قومیں
ایک دورِ اسلامی کے احیاء کی تحریکوں میں "خطرے" کی بو محسوس کر رہی ہیں۔

ایران اور مصر کے موجودہ بحرانی حالات نے ایک مرتبہ پھر "اتحادِ عالمِ اسلامی" کے موضوع کو اہم بنا دیا ہے، اور کہا جانے لگا ہے کہ
مسلمان ملکوں کو متحد ہو جانا چاہئے۔ بڑی ہی نیک آرزو ہے، مگر ہر نیک سے نیک آرزو تقاضا کرتی ہے کہ معقولیت کے ساتھ اس پر غور بھی
کیا جائے۔ اتحاد کی دو نوعیتیں ہوتی ہیں۔ ایک اغراض کا اتحاد، دوسرے اصول اور نصب العین کا اتحاد! جہاں تک اغراض اور مفاد کے اتحاد کا
تعلق ہے، پان اسلام ازم کی بدنام تحریک سے لے کر آج تک یہ خواب دیکھا جاتا رہا، لیکن اس کی عملی تعبیر کبھی نہ نکل سکی۔ اس سلسلے کی بڑی
اہم کوشش وہ تھی جس نے "معاہدۂ سعد آباد" کی شکل اختیار کی، لیکن وہ معاہدہ طاقِ نسیاں کی نذر ہو کے رہا۔ دراصل جن اغراض کے لئے
معاہدے کئے جاتے ہیں جب ان سے بڑی اغراض سامنے آجاتی ہیں تو انھیں پامال کر دیا جاتا ہے، اور پھر یہ کہ وہ اغراض اگر ایک طرف
سے پوری ہونے کے بجائے دوسری طرف سے پوری ہونے لگیں تو فوراً "تحویلِ قبلہ" ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان ممالک کے اتحاد کے
ہر خواب کو مغربی قوموں نے بڑی آسانی سے پریشان کر کے رکھ دیا ہے، اور جب خود انہی کو ضرورت ہوتی ہے تو انھوں نے چاہا ہے
ان میں فوراً اتحاد پیدا کر دیا ہے۔ ہمارے مسلمان ملکوں کے بڑے بڑے لیڈر یہ سمجھتے ہیں کہ کچھ سفارتی تعلقات، کچھ کانفرنسیں، کچھ انجمنیں اور
کچھ کلچرل تعلقات سب کو متحد کر دیں گے اور ایک نیا بلاک بن جائے گا۔ حالانکہ یہ خیالِ خام ہے۔

آپ کو اگر واقعی اتحاد مطلوب ہے تو اغراض کی بنیاد سے ہٹ کر اسے اصول اور نصب العین کی بنیاد پر قائم کیجئے۔ یعنی مختلف ممالک
اسلام کے اصولوں کی عالمگیر دعوت لے کر اٹھ کھڑے ہوں اور ہر جگہ کے عوام احیاءِ اسلام کی تحریکوں میں منظم ہو جائیں۔ اس طرح ایک نئی
فکر، نئے اصول اور ایک زندگی بخش نصب العین کی لہریں ہر طرف سے اٹھ کر خود بخود گلے مل جائیں گی اور ان لہروں سے ایک نیا سیلاب
نمودار ہوگا جس کے سامنے کسی امپریلزم کو ٹھہرنے کی ہمت نہ ہوگی۔ یہ اتحاد نہ تو ہمارے موجودہ حکمرانوں کی تقریروں سے پیدا ہو سکتا ہے
نہ تبادلۂ وفود سے، نہ کاغذی معاہدات سے، نہ رسمی تقاریب سے اور نہ انجمن بازی سے۔ اس کے لئے تو تیاری کے ساتھ لمبا کام کرنا ہے
خدا کا شکر ہے کہ یہ کام کسی نہ کسی حد تک عربی ممالک اور پاکستان میں ہو رہا ہے۔ اسی کو اور آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ اب یہ

ہر ملک کے عوام کا اپنا کام ہے کہ وہ اسلامی نصب العین کے لئے کام کرنے والی طاقتوں کو مضبوط کریں اور ان کے خلاف جو مغرب زدہ طاقتیں "قوم پرستانہ" تحریکیں چلا رہی ہیں ان کو سوکھ جانے پر مجبور کر دیں۔ دراصل یہ مؤخرالذکر تحریکیں سب سے بڑی روک ہیں اس منزل کے سامنے، جدھر ہم جانا چاہتے ہیں۔

ایران کو، اور مصر کو اور ہم سب کو یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ ہماری حکمران طاقتیں مغربی امپریلزم کے خلاف نہایت کند تلواریں ہیں بلکہ بسا اوقات ہمارے اپنے چنے ہوئے لیڈر باہر کے شکاریوں کے آگے آگے شکار کو گھیر گھار کر پیش کرنے کی خدمت سرانجام دیتے ہیں۔ یہ لوگ مسلمان قوموں کو ان کی مرضی کے خلاف مغربی اقوام کے کئی کئی گٹھ جوڑوں میں مبتلا کئے ہوئے ہیں اور عوامی مطالبے کے باوجود ان کی بین الاقوامی سازشوں سے آزادی اختیار کرنے پر تیار نہیں ہیں۔ پس اگر واقعی بیرونی امپریلزم کے خلاف جنگ کرنی ہو تو ان کند تلواروں کو کمر سے کھول کر نئی تلواریں ہاتھوں میں لینا ناگزیر ہے۔

آپ پاکستان ہی کا حال دیکھئے کہ برما میں انگریز کے اپنے مفاد کے تحفظ کا جب تقاضا ہوا تو اس کے ایک اشارے پر یہاں سے روپیہ بھی نذر کر دیا گیا اور رائفلیں بھی، لیکن مصر کے لئے صرف ایک بھدا سا بیان کافی سمجھا گیا۔ کوریا کے لئے جب یو، این، او کی طرف سے مدد کا مطالبہ ہوا تو جواب دیا گیا کہ اگر کشمیر کا مسئلہ ہمارے لئے موجبِ تشویش نہ ہوتا تو ہم کوریا میں فوجیں بھیجتے، لیکن مصر کے لئے اس طرح کا معذرتی اعلان بھی نہ کیا جا سکا۔

یہ ہے ہمارے حکمرانوں کی پالیسی ——— جس کے ہوتے ہوئے پاکستان کے عوام مصر کے لئے دعا کر سکتے ہیں، تقریریں کر سکتے ہیں، ریزولیوشن پاس کر سکتے ہیں، لیکن اور کچھ نہیں کر سکتے، کچھ نہیں کر سکتے، کچھ نہیں کر سکتے ——— ہم بھی خوب آزاد ہیں!

بہرحال قدرت کے قوانین اپنا کام کر رہے ہیں اور مغرب کی ایک امپریلسٹ قوم، برطانیہ اب فطرت کی عدالت میں کھڑی ہے ——— اور اسے چرچل وزارت بچا نہیں سکتی! سویز کے کنارے آزاد ہوں گے، نیل کی لہریں آزاد ہوں گی، مگر خدا کرے کہ یہ آزادی "خدا کی اطاعت" کے لئے ہو، نہ کہ اس سے بغاوت کرنے کے لئے!

ہم مصر، ایران، مراکش اور تونس کی حمایت کرتے ہیں، لیکن ایشیا پرست کی حیثیت سے نہیں، ایک مسلم قوم پرست کی حیثیت سے نہیں، ایک مشرق پرست کی حیثیت سے نہیں، بلکہ صرف ایک حق پرست کی حیثیت سے! ——— اور حق اس وقت مغربی قوموں کے ساتھ نہیں ہے بلکہ ان مظلوم ممالک کے ساتھ ہے!

—— + ——

بصائر

حدیثِ نبویؐ کی دینی حیثیت

عبدالحمید خان ارشد

ذیل کا مقالہ ایک صاحبِ علم کے قلم کا مرہونِ منت ہے اور اس سے بہت کچھ استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ پھر بھی اس کی اشاعت میں ہمیں بڑا تامل تھا۔ کیونکہ چراغِ راہ فرقہ دارانہ فتنوں سے اُلجھنے کو ہمیشہ اپنے وقار کے خلاف سمجھتا رہا ہے، پھر ایسے مذہبی فتنے جن کے علمبرداروں کی دیانت تک مشتبہ ہو اور جن کی تحریریں خود ان کے ذوقِ شر پسندی کی شہادت دے رہی ہوں ان کو اپنا حریف بنانا ایک سنجیدہ جریدے کو اور بھی زیادہ پستی پر گرا دینے کا موجب ہو سکتا ہے۔ چنانچہ منکرینِ حدیث کا گروہ ہمارے لئے کبھی بھی لائقِ التفات نہ تھا ـــــــ خصوصاً ان کے بڑے سائنٹفک آرگن کا جو شخص مسلسل دو سال مطالعہ کرتا رہا ہو اور اُن کی تفسیرِ قرآن کے نمونے، اُن کے اسالیبِ بیان، ان کے سیاسی نقطہ ہائے نظر اور ان کے اجتہادات کے کمالات اور ان کے صحافتی اخلاق کے شاہکار ایک ایک کر کے اس کی نظر سے گزرے ہوں[1] وہ آخر کہاں سے کوئی اچھی رائے مستعار لے کر اپنے ضمیر میں نصب کر سکتا ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ بہر حال احیائے اسلام کی تحریک چلانے میں حصہ لینے والوں کا یہ ایک ناگزیر فرض ہے کہ وہ وقت کے فتن کی روک تھام کریں، لیکن میرا جواب یہ ہے کہ جب ایک فتنہ کے علمبرداروں کے فکر و اخلاق کے متعلق ایک آدمی حتمی طور پر یہ رائے رکھتا ہو کہ اس فکر و اخلاق کا ایک طاقت بن جانا سرے سے ممکن ہی نہیں ہے تو آخر وہ کیوں اپنا وقت اور اپنی قوتیں ضائع کرے۔ علاوہ بریں فرقہ دارانہ مذہبی خیالات سرے سے کوئی طاقت بننے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے کیونکہ ان کی دعوت کوئی اصولی مثبت دعوت نہیں ہوتی بلکہ کوئی خاص اختلافی نقطۂ نظر ان کا محورِ فکر و نظر ہوتا ہے۔ فرقوں کے بازار میں آپ داخل ہوں تو آپ کو ہر دکان سے کوئی خاص اختلافی بحث ملے گی۔ ایک سے پوچھیے کیا مال رکھتے ہو تو وہ ایصالِ ثواب اور قل شریف اور ختمِ درود کے مسائل لے کے آگے بڑھے گا، دوسرے کا جائزہ لیجیے تو وہ تقلیدِ شخصی کا موضوع لے کے آئے گا، تیسرے سے بات کیجئے تو وہ امامت، ماتم، تقیہ، متعہ اور باغِ فدک وغیرہ کے قضیے پیش کرے گا، چوتھے کا جائزہ لیجئے تو

---

[1] ایک مرتبہ اسی داعی الی القرآن آرگن کی طرف سے جماعت اسلامی پر چند متعین الزامات عائد کر کے دعوت دی گئی تھی کہ بس اگر ان امور میں کوئی ہمیں مطمئن کر دے تو ہمارا جماعتِ اسلامی سے کوئی مقصدی اختلاف نہیں ہے، چنانچہ اس دعوت کے جواب میں راقم الحروف نے خاصی محنت کر کے ایک مقالہ سپردِ قلم کیا اور ایک قابلِ اعتماد رفیق کے ذریعہ اس آرگن کے دفتر میں دستی بھجوایا۔ مگر خود دعوت دینے کے باوجود اسے شائع کرنے سے انکار کر دیا گیا۔ وہ مقالہ غالباً اب بھی میرے کاغذات میں محفوظ پڑا ہے۔

وہ عیسیٰ علیہ السلام کی حیات و موت کا مسئلہ چھیڑ دے گا اور پانچویں سے بات کیجئے تو وہ مجدّدِ وقت اور مہدیٔ موعود کے موضوعات پیش کرے گا۔ اسی طرح آپ اگر منکرینِ حدیث کی دکان میں قدم رکھیں تو سیلزمین جس اہم ترین متاع پر توجہ دلائے گا وہ "عدمِ حجیتِ حدیث" کی بحث ہوگی۔ اس پورے بازار میں آپ کو انسان اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے صلاح و فلاح کی بنیادی دعوت دینے والا ایک بھی نہ ملے گا۔ پہلے ان کا اختلافی نقطۂ نظر تسلیم کیجئے پھر آگے چلئے!

اس طرح کے مذہبی مشغلے پیدا ار ہیں نظامِ اسلامی کے تعطل کے بعد پیدا ہونے والی تفریقِ دین و سیاست کی فضا کی۔ یہ جھاڑ جھنکار صرف اس وجہ سے پیدا ہوتے اور بڑھتے ہیں کہ دین و ایمان کے چمن کا کوئی مالی نہیں رہتا جو اسے اپنے کھرپے اور اپنی قینچی سے مہذب بناتا رہے۔ پس ان فتنوں کی روک تھام کا اصل وسیلہ ایک صالح نظام کا قیام ہے اور اپنی توجہات ان پر صرف کرنے کے بجائے اس جامع وسیلۂ اصلاح پر صرف کرنی چاہئیں۔ خود اس نظامِ حق کے قیام میں بھی یہ مذہبی فتنے کچھ زیادہ رکاوٹ بننے کی صلاحیت نہیں رکھتے، بلکہ ادھر اگر کوئی حقیقی رکاوٹ بننے والی طاقتیں ہیں تو وہ نظریۂ الحاد کی پیدا کردہ جدید تحریکیں ہیں جن کا کرۂ ارضی پر گہرا تسلط ہے۔ یہ تحریکیں البتہ چراغِ راہ کی نگاہ میں ہمیشہ اس قابل رہی ہیں کہ ان کے خلاف جہاد کیا جائے، اور ان تحریکوں کے علمبردار اور خادم ایسے لوگ ہیں کہ اگر وہ ایک بار اسلام کے سامنے مفتوح ہو جائیں تو پھر وہ اس کے لئے بہترین کارکن ثابت ہوسکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ چراغِ راہ مذہبی فتنوں کی طرف کبھی متوجہ نہیں ہوا۔ پھر اگر ان میں سے کسی کی طرف توجہ بھی کی جائے تو اس کے لئے صحیح طریقہ یہ نہیں ہے کہ آپ براہِ راست ان کی چھیڑی ہوئی اختلافی بحثوں میں کود پڑیں، بلکہ چراغِ راہ جس طرزِ فکر کا جریدہ ہے، اس کے لحاظ سے کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ کسی فتنے کا تاریخی مقام اور اس کا سوشل پارٹ پوری تجزیہ کاری کے ساتھ واضح کیا جائے۔ مثلاً اسی فتنۂ انکارِ حدیث کو لیجئے، اس کی اصل حقیقت یہ نہیں کہ کچھ لوگوں کو تحقیق سے حدیث کی شرعی حیثیت کے بارے میں کوئی اختلاف ہوا ہے بلکہ اس کی حقیقت یہ ہے کہ قرونِ اولیٰ سے لے کر اب تک اسلام کے اندر غیر اسلام کو لا کر نصب کرنے کی جو کوششیں ہوتی رہی ہیں فتنۂ انکارِ حدیث بھی انہی کی ایک کڑی ہے۔ اس حقیقت کو جب آپ پوری طرح ذہن نشین کرلیں گے تو پھر آپ اندازہ کرسکیں گے کہ خوارج سے لے کر سرسید اور قادیانیوں تک اور پھر آگے چل کر سندھ ساگر پارٹی سے منکرینِ حدیث تک ایک ہی مہم ہے جس میں گروہ در گروہ لوگ اپنی قوتیں کھپا رہے ہیں۔ ہندوستان میں مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ دہلوی، شاہ اسمٰعیل شہید، سید احمد بریلوی، مفتی محمود الحسن، (رحمہم اللہ اجمعین) اگر تجدیدِ اسلام کے واحد محاذ پر کام کرنے والے لوگ تھے تو دوسری طرف سرسید، قادیانی، سندھ ساگر پارٹی اور منکرینِ حدیث "تجدّد" کے ایک ہی لمبے محاذ پر مختلف پہلوؤں سے کام کرنے والی طاقتیں ہیں۔ اگر آپ منکرینِ حدیث کے خالص قرآنی نظام کا کاغذ پر نقشہ بنا کر دیکھیں (جس کی ایک جھلک چراغِ راہ میں دکھائی جا چکی ہے) تو پھر آپ کو اندازہ ہو کہ آیات کے قلعوں سے احادیث کے پہرے اٹھانے کا اصل مدعا کیا ہے۔

ہم چاہتے ہیں کہ اگر ان فتنوں پر قلم اٹھایا جائے تو مذکورہ بالا اشارات کی روشنی میں ایک تحریک کی وسعتِ نگاہ کے ساتھ اٹھایا جائے، فرقوں کے ساتھ فرقوں کی طرح پیش آنے کی پرانی روش اختیار کرنا صحیح نہیں ہے۔ تاہم پیشِ نظر مقالہ چونکہ علمی ہے اور صاحب مقالہ کی طرف سے اصرار بھی ہے، لہٰذا ہم اسے جراغِ راہ میں دے رہے ہیں۔ البتہ یہ ہمارے لئے ممکن نہیں ہے کہ اپنے صفحات کو اس طرح کی بحثوں کے لئے مسلسل پیش کر سکیں۔

رسول اللہ صلعم کی متعین کردہ جزئیات میں کسی کو بھی ردّ و بدل کا اختیار نہیں

دین کے جن امور میں رسول اللہ صلعم نے کوئی فیصلہ فرمایا۔ یا جن قرآنی احکام واصول کی جزئیات (مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ فرائض وارکان کی جزئیات۔ اوقات وتعدادِ نماز، واجباتِ نماز۔ اوقاتِ روزہ و حج، مقدارِ زکوٰۃ وغیرہ) آپؐ نے متعین فرمادیں۔ اور قرآن نے بھی آپؐ کے فیصلے اور تعین کو بحال رکھا۔ اور خود آپؐ کے کسی دوسرے فیصلے یا حکم نے "سابقہ فیصلے" کو وقتی یا منسوخ قرار نہیں دیا۔ تو ایسی سب جزئیات (احکام وقضایا وغیرہ) وقتی نہیں، دائمی ہوتی ہیں۔ ان میں کسی کو بھی ردّ و بدل کا اختیار نہیں ہوتا۔

ارشادِ خداوندی ہے:۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ؕ (احزاب، ۳۶)

جب اللہ اور اس کے رسولؐ کوئی فیصلہ یا حکم صادر فرمادیں۔ تو کسی مومن مرد اور عورت کو ان کے حکم سے سرتابی (انکار یا ردّ و بدل) کا اختیار نہیں رہتا۔ اور جس نے اللہ ورسول (کا حکم بدل کر) (اُن کی) نافرمانی کی۔ وہ راہِ حق سے کھلے طور پر بھٹک گیا۔

کسی قرآنی حکم کی کمیت وکیفیت جب آپؐ متعین فرمادیتے ہیں۔ تو بعد میں آنے والوں کے لئے وہ مشعلِ راہ کا کام دیتی ہے۔ جس کا اتباع ان پر لازم ہوتا ہے۔ اور کسی کو بھی اس میں ردّ و بدل کا کوئی حق نہیں ہوتا۔

نبی کے فرمان کو کوئی مسلمان بدل نہیں سکتا

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کو کوئی مسلمان (خواہ مرکزِ ملّت یا امام ہی کیوں نہ ہو) بدلنے کا کوئی حق نہیں رکھتا۔ آپؐ کی رسالت وقتی نہیں بلکہ ابدی ہے۔ نیز آپ کو سب سے زیادہ "فہم قرآن" عطا ہوا۔ جسے آپؐ قول وفعل میں واضح تفصیلات کی صورت میں بیان فرماتے رہے۔ پس "اصول واحکام قرآنیہ" کے ساتھ ان کی یہی "عملی تفصیلات" متلازم ہیں۔ "اصولِ قرآنی" کی جزئیات اللہ تعالیٰ کے بتلانے سے آپؐ متعین فرماتے رہے ہے۔ مثلاً نمازوں کی تعداد (یہی پانچ نمازیں) ان کے اوقات، ان کی رکعتیں، اور باقی واجبات وفرائض وغیرہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی کامل ہدایت سے آپؐ کو معلوم ہوئے۔ "وحی جلی" کے علاوہ الہام والقاءِ ربانی کے ذریعہ جسے "وحی خفی" کہا جاتا ہے۔ رسولِ کریمؐ کو بہت سے دینی اور قرآنی احکام کی "عملی تفصیلات" بتلادی گئیں۔ یہی "تفاصیل" جب آپؐ کے الفاظ میں بیان ہوئیں۔ یا آپؐ کے عمل کو دیکھنے والوں نے اپنے الفاظ میں انھیں بیان کیا۔ ان کا نام علمی اصطلاح میں حدیث، خبر اور سنّت رکھا گیا۔

جس طرح قرآن غیر متبدل ہے۔ اس کے "احکام وتعلیمات" کی بتلائی ہوئی "پیغمبرانہ تبیین وتفصیل" بھی غیر متبدل ہے۔ پیغمبر کی بات کو صرف خدا تعالیٰ تبدیل فرماسکتا ہے۔ یا خدا کی ہدایت سے وہ خود۔ کسی اور کو خواہ خلیفہ ہو یا مرکزِ ملّت، امام ہو یا امیر اسے بدلنے کا قطعاً کوئی حق نہیں۔ پیغمبر کی رسالت ونبوت ابدی ہے۔ اس کے احکام بھی جو وہ بحیثیتِ رسولؐ صادر فرماتا ہے، ابدی ہیں۔ اور وہ تمام حالات اور ازمنہ اور بلاد وامصار، اور ضروریات ومقتضیاتِ زمان ومکان سے مطابقت رکھتے ہیں۔

اجتہاد کتاب و سنت (قرآن و حدیث) میں جن احکام و مسائل کی تصریح نہ ہو۔ اور یہ ظاہر ہے کہ یہ فرعی احکام ہوں گے۔ تو ان کو ان دونوں کی روشنی میں صحیح اجتہاد و استنباط کے ذریعہ معلوم کیا جاتا ہے۔ اور یہ کام صرف متبحر علماء و فقہاء کا ہے۔

قرنِ اول میں حفظِ صدور پر اعتماد تھا رسولِ کریم کے عہدِ مبارک میں اور اس کے بعد بھی (قرنِ اول و دوم میں) علمی خزانوں کو کتابوں کی بجائے سینوں میں محفوظ رکھا جاتا تھا۔ کتابت کے مقابلہ میں "حفظِ صدور" پر زیادہ اعتماد تھا کتابت سے وہ کسی حد تک ضرور کام لیتے تھے لیکن اس لئے کہ اس سے "حفظ" میں مدد ملتی تھی، اصل قابلِ اعتماد "حفظِ صدور" تھا۔ کتابت ممد کی حیثیت رکھتی تھی۔ عربوں کا حافظہ بھی حیرت انگیز تھا۔ جنگی کارنامے، قومی اور جنگی اشعار، انساب، اور خاندانوں کے حالات بکثرت ان کو نوکِ زبان یاد تھے۔ یہی قوم جب اسلام کے آغوشِ رحمت میں آئی۔ تو ان کے سینے اور ان کا دل و دماغ قرآنِ پاک کی روشنی سے منور ہوا۔ انھوں نے معانی کے ساتھ "کلام اللہ" کے نظمِ الفاظ و کلمات (آیات) کو بھی سینوں میں بسا لیا۔

بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ (عنکبوت، ۴۹) (قرآن عزیز کی حقانیت شک سے بالاتر ہے وہ مشکوک نہیں) بلکہ ایسی روشن (اور سچی) آیات ہیں۔ جو اہلِ علم کے سینوں میں محفوظ ہیں۔

کتابتِ قرآن رسول اکرم صلعم نے قرآن (متفرق اجزاء میں) ضرور لکھوایا۔ جب کوئی "آیۃ کریمہ" یا "سورۃ شریفہ" یا اس کا کچھ حصہ نازل ہوتا۔ آپ فوراً لکھواتے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قرآن مجید لفظاً و معنیً۔ اسلوب بیان اور معانی و علوم وغیرہ، ہر لحاظ سے معجزہ ہے۔ اس کے "متن" کی حفاظت بھی ویسی ہی ضروری ہے۔ جیسے اس کے مطالب و مقاصد کی صیانت۔ ساتھ ہی انتہائی جامعیت اور "اعجازی ایجاز" کی وجہ سے کوئی انسانی کلام اس کے معانی و مطالب کا استقصاء نہیں کر سکتا لہٰذا ضروری تھا کہ یہ سرچشمۂ ہدایت و رشد بتمامہ و کمالہ بغیر کسی ادنیٰ تغیر، و بلا تقدیم و تاخیر کلمات بِنْ و عَنْ محفوظ و مصئون ہو۔ سو کتابت چونکہ اس حفاظت میں ممد تھی اس لئے اس کا فوری اور بروقت انتظام و اہتمام کیا گیا۔ کتابت کو اس کا مؤید و ممد بنایا گیا۔ اور اس طرح حفاظت کے جملہ ممکنہ ذرائع کو عمل میں لایا گیا۔

روایت بالمعنیٰ جائز ہے لیکن حدیث میں چونکہ روایت بالمعنیٰ جائز ہے۔ اس لئے وہاں بشروع میں اس کی کتابت سے منع فرمایا۔ تاکہ عام نظر میں قرآن سے التباس نہ ہو جائے۔ لیکن حَدِّثُوْا عَنِّيْ فرما کر "حدیث" یاد کر کے زبانی بیان کرنے کا حکم فرمایا۔ "روایت بالمعنیٰ" کی صورت میں اس بات کا احتمال کم رہ جاتا ہے۔ کہ "حدیث" بھول جائے گی۔ اور اس کا معنیٰ و مفہوم ضائع ہو جائے گا۔ اگرچہ صحابہ کرامؓ اور عام محدثین "روایت باللفظ" کی انتہائی کوشش کرتے تھے لیکن تاہم "روایت بالمعنیٰ" کے جواز سے سہولت پیدا ہو گئی۔ کوئی لفظ بھول جائے تو بھول جائے۔ مفہوم و مصداق، یا دیکھا، سنا تو (علی العموم) نہیں بھول سکتا۔
یہی وجہ ہے۔ کہ اول اول "حدیث" کو "حفظ و تحدیث" کے ذریعہ اشاعت دی گئی۔ اور کتابت کی حاجت کم سمجھی گئی۔

کتابتِ حدیث بعد میں بُعدِ زمانہ (عہدِ نبوت سے دوری) کی وجہ سے، حُفّاظِ احادیث (صحابہ کرامؓ اور اُن کے تلامذہ) کے بتدریج سفرِ آخرت پر چل دینے سے یہ اندیشہ پیدا ہوا۔ کہ کہیں یہ "قیمتی سرمایہ" ضائع نہ ہو جائے تب خلیفہ عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ نے پہلی صدی کے اختتام پر مدینۂ طیبہ کے عامل (والی) اور قاضی ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم اور دوسرے عمّالِ خلافت اور علماء و فضلاء امصار کو لکھا۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو حدیث مستند و مصدق ملے اس کو لکھ لیا جائے۔ کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ علماء کے چلے جانے سے کہیں علم (حدیث) مٹ نہ جائے۔

ابن حزم کو یہ بھی حکم دیا۔ کہ عمرہ بنت عبد الرحمٰن الانصاریہ (المتوفاۃ سنہ ۹۸ھ) اور القاسم بن محمد بن ابی بکرؓ (المتوفی سنہ ۱۰۶ھ) کے پاس جو

مجموعۂ احادیث ہے وہ لکھ کر میری طرف بھیجا جائے۔

ان کے علاوہ امام الحدیث، عالم اہل الحجاز والشام محمد بن مسلم ابن شہاب الزہری المدنی کو بھی جمع حدیث کے بارے میں لکھا، جنھوں نے "حدیث" کی قابل قدر خدمت کی، بعد میں دوسرے طبقہ کے لوگوں (مثلاً ابن جریج، ابن اسحاق، امام مالکؒ وغیرہ) نے بڑے پیمانے پر تدوین وتالیف حدیث کا کام شروع کیا۔ اور اس طرح ترقی کرتے کرتے تیسری صدی میں بڑے بڑے محدثین (امام احمدؒ، بخاریؒ، مسلمؒ، ترمذیؒ وغیرہم) نے انھی سابقہ مجموعوں سے، اور مختلف دیار وامصار کے علماء وفقہاء (ثقات) سے تحصیل علم کیا اور بڑی محنت وجانفشانی اور تحقیق وتدقیق کے جملہ امکانی وسائل صرف کرنے کے بعد، مخصوص "علمی شہادتوں" کی تصدیق وتوثیق کی بناپر نہایت ہی قابل قدر مستند ومصدقہ مجموعے مرتب ومدوّن فرمائے۔ جو آج تک بلاکم وکاست امت کے پاس محفوظ ہیں۔ اور علمی دنیا سے خراج تحسین وصول کر رہے ہیں۔ اس وقت سے اس وقت تک ہر زمانہ کے لاکھوں علماء، فضلاء اور فقہاء نے انھیں پڑھا، پڑھایا۔ اور فیض پایا۔ اور سب نے ان کی صحت پر مہر تصدیق ثبت فرمائی۔ فجزاھم اللہ احسن الجزاء۔

مستند مجموعے حوالے کئے

رسول اللہ صلعم نے یہی مستند مجموعے اُمّت کے حوالے فرمائے۔ جو پہلے پہل سینوں میں (زیادہ تر) محفوظ تھے۔ کیونکہ اس وقت حفظ وصیانت کا یہی بہترین ذریعہ تھا۔ بعد میں حالات ومقتضیات وقت کے مطابق سینوں سے کاغذوں پر جلوہ افروز ہوئے۔ مستند ومحفوظ وہ وہاں بھی تھے اور یہاں (کاغذ پر) بھی۔

حکمت

یہی وہ حکمت ہے جس کا ذکر قرآن پاک میں بار بار آتا ہے۔

وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ۚ   اور رسولؐ ان کو کتاب اللہ اور حکمت ودانش کی تعلیم دیتا ہے۔

حکمت کا خواہ کوئی سا معنیٰ لیا جائے۔ فہم کتاب، یا عمل کتاب، علت وغایت قوانین قرآن، یا مقصود ومطلوب احکام قرآن، یا جیسا کہ پرویز یہی آخری معنی مراد لیتے ہیں۔ معارف ج ۴ ص ۳۲۱) یا دانش آموز مواعظ ونصائح۔ وغیرہ وغیرہ۔ اور خواہ اسے قرآن کے اندر ہی کا ایک حصہ سمجھا جائے۔ تب بھی اتنا تو کہنا پڑے گا۔ کہ وہ بھی کتاب کے ساتھ ساتھ پوری اہمیت رکھتا ہے۔ اور کتاب اللہ سے بنیادی مطابقت رکھتے ہوئے اس کے اصول کی تبیین وتوضیح ہے۔ اس کے علم کا عملی نقشہ، اس کے احکام کے مقاصد ومطالب، یا سمٹے ہوئے نور کی بکھری ہوئی کرنیں، یا پھر یوں کہنا چاہئے۔ کہ اس کے "معجزانہ ایجاز" کی بسط وتفصیل[1]۔ ورنہ "الکتاب" کے ساتھ "الحکمۃ" کے علیحدہ ذکر کرنے کے کیا معنیٰ؟

آخر ایک ہوتے ہوئے بھی ان میں کسی وجہ سے (من وجہ) قدرے امتیاز روا رکھا گیا ہے۔ سو کیوں نہ کہا جائے؟ کہ یہ امتیاز "ایجاز" "وتفصیل" اور "متن" و "شرح" کا ہے۔

حدیث قرآن سے علیحدہ نہیں

ہم بھی تو یہ نہیں کہتے کہ حکمت یا حدیث قرآن پاک سے (مقصد اور مصداق، یا بنیادی مفہوم کے اعتبار سے) یکسر علیحدہ ومغائر ہے۔ بلکہ ایک (حدیث) دوسرے (قرآن) کے "ایجاز" کی بسط وتفصیل ہے۔ اور اس کی "پُر اسرار جامعیت" کا کسی حد تک انکشاف!!

قرآن کے لحاظ سے "حدیث" (یا حکمت) کا یہی درجہ ہے۔ حقیقت میں حدیث "قرآنی علوم واسرار" کا ایک بیش بہا مرقع ہے۔

---

[1] ہرچند "قرآن عزیز" جملہ "اصول دین" کی تفصیل ہے اور تبیان بھی لیکن "اعجازی جامعیت" کی وجہ سے اُن کی "عملی تفاصیل" اور "جزئیات" رسول اللہ صلعم نے اپنے قول وعمل سے واضح فرمائی ہیں۔ ارشد عفی عنہ۔

اور انسانی الفاظ میں اس کی سچی تعلیمات پر بہترین تبصرہ، الفاظ و کلمات اور سیاق عبارات میں اس سے مختلف ہے۔ لیکن اس کی تعلیمات کا آئینہ دار ہونے اور اس کی نورانیت کی عکاسی کرنے کی وجہ سے اس سے متحد۔

یہ خدشہ نہیں ہو سکتا یہ خدشہ وارد نہیں ہو سکتا۔ کہ رسول اللہ صلعم کی سیرت طیبہ اور آپ کا "اسوۂ حسنہ" کتاب اللہ ہی میں محفوظ ہے۔ اس سے باہر (حدیث سے) ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ "کتاب اللہ" میں تو اسی "مخصوص جامعیت" اور "پر اسرار معجزانہ ایجاز" کے ساتھ ضرور موجود ہے۔ لیکن اس کی بسط و تفصیل اُن انسانی الفاظ کے فصیح ترین مجموعوں میں ملے گی۔ جو حدیث اور حکمت کے خزانوں سے بھرپور ہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ قرآن ہی میں آپ کی "سیرت کریمہ" موجود ہے۔ تو یہ اس لحاظ سے درست ہے کہ آپ کی "حیات طیبہ" "قرآنی اصولوں" کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے۔ اور ان کی مکمل عملی تفسیر اس (حیات طیبہ) میں واضح اور نمایاں ہے۔ نیز اس لحاظ سے بھی درست ہے۔ کہ آپ کی زندگی کے اہم واقعات جستہ جستہ "مخصوص اعجازی انداز جامعیت" کے ساتھ اس میں مذکور ہیں۔

قرآن عزیز شخصی سوانح حیات نہیں لیکن باایں ہمہ "قرآن عزیز" مکمل اور بے مثال صحیفۂ کل کائنات تو ضرور ہے۔ کہ اس میں خالق اور اس کی مخلوق، رب اور اس کی تمام پیدا کی ہوئی کائنات پر تبصرہ ہے۔ لیکن وہ کوئی "شخصی سوانح حیات" نہیں ہے۔ کہ اس میں آپ کی "مبارک زندگی" کی تمام تفاصیل پوری بسط و صراحت کے ساتھ بوضاحت موجود ہوں۔ تفصیل حدیث میں ملے گی۔ اور سب اصولی ہدایات اور "سعادت مندی کا سرچشمہ" "قرآن عزیز" ہی سے دریافت کیا جا سکے گا۔

"قرآن عزیز" ایک بے نظیر شاہانہ قصر ہے۔ اور حدیث اس میں داخل ہونے کا ایک عالیشان دروازہ۔

(باقی آئندہ)

اسلام کا سماجی تصور اور کمیونسٹ ڈپلومیسی

ابو الخطیب

کمیونسٹ ڈپلومیسی کو جاننے پہچاننے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس کے طریقِ کار کو سمجھیں کہ وہ کس طرح ایک نئے سماج میں داخل ہوتی ہے اور جب اس کے اثرات اس سماج میں رنگ لاتے ہیں تو یہ کیا روپ بھرتی ہے۔ اس ڈپلومیسی کے تفصیلی جائزے کی اس مختصر سے مضمون میں گنجائش نہیں اور نہ اس وقت زیادہ تفصیل مقصود ہے۔ البتہ اس کے پروپیگنڈے کی چند قسموں سے ضرور متعارف کرایا جا سکتا ہے۔

کمیونسٹ پروپیگنڈے کی جہاں اور بہت سی قسمیں ہیں ان میں یہ قسم بھی ایک بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ جہاں ان کی سیاسی اقدار براہِ راست پروان نہیں چڑھتیں۔ تو وہاں سمجھوتے کے ذریعے ان قدروں کو مختلف سہاروں (چاہے یہ سہارے ان کے فلسفے اور سیاست کی ضد ہی کیوں نہ ہوں) سے سماج میں داخل کرنے کی کوششیں کی جاتی ہیں، جیسے آج پاکستان میں قومی ملکیت کے تصور کو مختلف طریقوں سے سراہا جا رہا ہے۔ کہیں یہ ان کو معیار کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے، کہیں آزادئ نسواں کی تحریک کو ہوا دے کر اس کو عین ترقی پسندی سے موسوم کیا جا رہا ہے، حالانکہ پاکستان کا ہر سوچنے والا اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ ہماری عورت کے سامنے آج ایسا کوئی صالح سماجی تصور نہیں جیسے یکسر وہ مرد کے ساتھ کاندھے سے کاندھا ملا کر ترقی کی دوڑ میں بڑھ سکے۔ برخلاف اس کے اس نے اپنی اس آزادی سے آزاد محبت، جنسی انارکی اور اسی قبیل کی دوسری بیماریوں کو ہوا دے کر انھیں پروان چڑھایا ہے۔ اس کا ثبوت متعلقہ رپورٹوں سے لگایا جا سکتا ہے۔ یا خود سماج میں جا کر اس آزادی کے اثرات کو دیکھا جا سکتا ہے کہ خاتون پاکستان سماجی دوڑ میں مرد کے ساتھ کتنا بڑھ سکی۔ اختصار کی خاطر اس ضمن میں صرف اتنا اشارا کر دوں گا کہ سستی اور جنسی جذبات کی بھڑکانے والی کتابوں کی اشاعت، ان کی خرید و فروخت یا پھر ان چھوٹی چھوٹی کیبن لائبریریوں میں جا کر لڑکیوں کے نام جاری شدہ ناولوں اور افسانوں کی کتابوں کا جائزہ لے لیا جائے۔ اس سے معلوم ہو جائے گا کہ ان کے سماجی رجحانات کی کیا رفتار ہے۔ لیکن کمیونسٹ پریس یورپ پرست طبقے کے ساتھ برابر چیخے جا رہا ہے کہ خاتونِ پاکستان ترقی کی منزلیں طے کر رہی ہے۔ وہ ترقی کی منزلیں کیا ہیں، کہاں ہیں، نہ یہ بیچاری پاکستانی عورت کو معلوم ہے اور نہ اس یورپ پرست طبقے کو، البتہ کمیونسٹ ڈپلومیسی کو ان منزلوں کا پورا پورا علم ہے۔

ان ساری کارگزاریوں کا مقصد صرف ایک ہے کہ وہ اپنے اثر و نفوذ سے سماج میں ایک فیصلہ کن حیثیت اختیار کر سکیں جو ایک کمیونسٹ دہشت پسند انقلاب کے لئے بہت ضروری ہے۔

اس فریضے کو وہ اپنے فلسفیانہ مفروضوں کی اشاعت سے لے کر ناچ گانے تک کے سارے ہتھکنڈوں کے ذریعہ ادا کرتے ہیں۔ یہ ان کے کلچرل یونٹس جو انجمن ترقی پسند مصنفین کے نام سے جا بجا قائم ہیں۔ اسی ڈپلومیسی کی مشین کے پرزے ہیں۔ جو اپنا مقررہ عمل برابر کئے جا رہے ہیں۔ ان سب کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں کہ کمیونسٹ پارٹی کو سیاسی اور سماجی اقتدار حاصل ہو جائے۔ کمیونسٹ ڈپلومیسی کی اثر اندازیوں کو اگر واضح صورت میں دیکھنے کی خواہش ہے تو گزشتہ چند سال کے اردو ادب کا جائزہ لیجئے جب کمیونسٹ

ترقی پسندی نے ۱۹۳۶ء میں آکر اپنا نعرہ لگایا اور پھر ان شخصیتوں کو استعمال کیا جو ادب میں اور ملک میں ایک حیثیت کی مالک تھیں، جیسے مولوی عبدالحق، پریم چند آنجہانی، حسرت موہانی مرحوم، پنڈت نہرو، جگر مرادآبادی وغیرہ۔ اس کے بعد ایک دور ہمارے اردو ادب میں ایسا آیا جب جنسی انارکی بے راہ روی، سماج بے زاری لکھنے والوں میں عام سی ہوتی جارہی تھی۔ آزادی، سماج بیزاری اور بغاوت کے نام پر اس کمیونسٹ ترقی پسندی نے نہ جانے کس کس طرزِ فکر سے سمجھوتا کیا۔ منٹو بھی سمجھوتے کی اسی پالیسی کے تحت ایک عظیم ترقی پسند افسانہ نگار بن گیا۔ ایک منٹو ہی نہیں بلکہ اس قسم کے جتنے بھی جنسی انارکسٹ تھے کمیونسٹ ترقی پسندی کے ہراول دستے کے سپاہی بنے رہے۔ کوئی کمیونسٹ یا غیر کمیونسٹ جو مارکسزم سے ذرا بھی واقفیت رکھتا ہے وہ اس حقیقت سے واقف ہے کہ کمیونسٹوں کا ان عناصر سے کبھی سمجھوتہ ہو ہی نہیں سکتا، کیونکہ ان سب کے قبلۂ مقصود اجتماعِ ضدین کی حیثیت رکھتے ہیں ——— اور ہوا بھی ایسا ہی کہ کمیونسٹ ناقدین نے ان سارے عناصر کو چھانٹنا شروع کیا جو پہلے ان کی ادبی فوج کے ہراول دستے تھے۔ اس کانٹ چھانٹ کا اندازہ سید احتشام حسین صاحب کی کتاب روایت اور بغاوت کے اس مباحثے سے لگایا جاسکتا ہے جو انھوں نے رشید احمد صدیقی پروفیسر علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے ایک مضمون کے جواب میں لکھا ہے۔

ان حقائق کے مطالعہ کے بعد کمیونسٹ سیاست کی اس تبدیلی کو ملاحظہ فرمائیے جو ماؤزے تنگ کی حالیہ تنقید کے بعد وجود میں آئی۔ اس تنقید کا اثر ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے پولٹ بیورو پر سب سے زیادہ پڑا۔ سنا گیا ہے کہ راندوے کو پارٹی سے علیحدہ کردیا گیا اس کی برطرفی کے بعد پارٹی کی پالیسی میں نمایاں تبدیلی نظر آئی۔ کامریڈ جوشی پھر پارٹی میں شامل کرلیا گیا۔ پارٹی نے پھر سمجھوتے کا رویہ اختیار کرلیا اور آج ہندوستان اور پاکستان میں کمیونسٹ پارٹی اسی رویے پر عمل کررہی ہے۔ وہ اُن تمام سیاسی سماجی تحریکوں سے ناتہ جوڑ رہی ہے جن میں ذرا بھی سماج سے بیزاری پائی جاسکے۔

خصوصیت سے پاکستانی کمیونسٹ پارٹی نے بڑا خطرناک راستہ اختیار کیا ہے۔ کمیونسٹ کارکن پاکستان میں صوبہ پرستی کو ہوا دے رہے ہیں۔ سندھ سندھی کے لئے، پنجاب پنجابی کے لئے، سرحد پٹھان کے لئے، بنگال بنگالیوں کا! اگر ان علاقائی عصبیتوں کو وہ وسیع کرنے میں کامیاب ہوگئے تو معاشرتی، اقتصادی اور تہذیبی حیثیت سے پاکستان کی سالمیت پارہ پارہ ہوکر رہ جائے گی۔ وقت ہے کہ ملت کے بہی خواہ اس پر توجہ کریں۔

یہ تو چند متفرق اشارات تھے، لیکن دراصل کمیونسٹ ڈپلومیسی کے جس پہلو کی طرف مجھے آپ کی توجہ مبذول کرانی ہے وہ یہ ہے کہ یہ لوگ جہاں سیاسی اقتدار حاصل کرنے میں ناکام ہوتے ہیں۔ وہاں پھر وہ ان مشترک تہذیبی اور دینی قدروں کو ڈھانے کی کوششیں کرتے ہیں جو ان کے راستے میں کسی طرح سے حائل ہوتی ہیں۔ آج پاکستان میں کمیونسٹ سیاست اور اس کے سارے کلچرل اور ادبی مہرے اسی کام میں مصروف ہیں۔ اس لئے آج وہ ہر اس لَے کے ساتھ اپنی سر ملانے کی کوششیں کررہے ہیں جو اسلام کے تہذیبی اور سماجی تصور کو پاش پاش کرسکے۔

کمیونزم اور کمیونسٹ سیاست سے واقفیت رکھنے والے اس حقیقت سے خوب واقف ہیں کہ کمیونزم اور کمیونسٹ سیاست کے قدم پاک سرزمین میں کیوں نہ جم سکے؟ کامریڈس تو حسبِ عادت اس کا ایک ہی جواب (اپنی تسلی کے لئے) ذہن میں رکھتے ہیں کہ یہاں جاگیرداری کا دور ہے، مشین اور صنعت ابھی پاکستان میں آئی نہیں جو مزدوروں کو ایک مرکز پر جمع کرسکے۔ اس لئے طبقاتی جنگ کی آگ بھڑکنے نہیں پاتی۔ لیکن ان مجاہدوں کے سپاہیانہ دماغ میں یہ نکتہ کبھی نہیں ابھرتا کہ وہ پڑوسی ملک جہاں صنعت و مشین تھی، طبقاتی بیداری بھی کافی تھی (میرا مطلب ہے ہندوستان سے جو ایشیا کا ایک بہت اہم ملک ہے اور صنعتی ترقی کے راستے پر چلا جارہا ہے) وہاں بلال جنبش نے

مسلم قوم کو کس حد تک اپنی طرف متوجہ کیا؟ حالانکہ معاشی لوٹ کھسوٹ، ظلم و ستم، سرمایہ دار طبقے کو چال بازی سب ہی کچھ ہندو مزدور کے ساتھ مسلمان مزدور کی بھی کمر توڑ تی تھی۔ لیکن لال جھنڈے کے سائے میں ہندو مزدور کے مقابلے میں مسلمان مزدور اتنی بڑی تعداد میں کیوں نہیں آیا[1] جتنی بڑی تعداد میں ہندو مزدور آتا تھا۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ جب دونوں کا مسئلہ ایک ہی ہے تو دونوں کے لئے لال پرچم کا سایہ ایک جیسی کشش کیوں نہیں رکھتا۔

اس سوال کا جواب میرا ذہن اس وقت بھی تلاش کرتا تھا جب میں کمیونسٹ پارٹی کا ممبر تھا۔ جب خود مجھے اس سوال کا جواب نہ ملتا تھا تو دوسرے درجۂ اول کے کامریڈس سے اس کو پوچھتا لیکن ان کا ذہن بھی اس گتھی کو بخوبی سلجھا نہ سکتا تھا کہ مسلمان میں طبقاتی شعور اپنے پڑوسی ہندو مزدور کے مقابلے میں برابر قوت کے ساتھ کیوں نہیں بیدار ہوتا جب کہ دونوں کا مسئلہ ایک ہے ——— اور دونوں کے معاشی حالات میں کوئی فرق نہیں!

اسی سوال کے جواب کی تلاش میں میری نظر پاکستان، ایران، مصر، شام، انڈونیشیا اور دوسرے مسلم ممالک پر پڑی تو وہاں بھی مجھے مسلمان کا قریب قریب یہی کردار نظر آیا جو میں ہندوستان میں دیکھ چکا تھا کہ وہ بھوکوں مر کر بھی لال جھنڈے کی رہنمائی سے کوئی دلچسپی نہیں لیتا، حالانکہ معاشی بحران کے دباؤ کی وجہ سے ایشیا کی دوسری قومیں ۔ . . . . اس جھنڈے کی طرف نہایت تیزی سے بڑھ رہی تھیں۔ اسی کھوج کرید میں میری نگاہیں مارکسی نقطۂ نظر سے ہٹ کر کسی ایسے نظریے کی تلاش میں سرگرداں رہنے لگیں جو مجھے مسلم قوم کے اس کردار کو تسلی بخش طور پر سمجھا دے کہ آخر یہ تضاد کیوں ہے اور کیا ہے ——— میرے لئے یہاں اس سارے فکری سفر کے بیان کا موقع نہیں مگر جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ جو ذہن کمیونسٹوں کے شاعرانہ دم دلاسوں کے پھیر میں نہ آگیا ہو وہ اس حقیقت کو ضرور تسلیم کرے گا کہ مسلمان کا یہ انفرادی اور مذہبی کیرکٹر صرف اسلام کے ہمہ گیر سماجی تصور کی وجہ سے ہے۔

مسلمان آج بھوکوں مر کر بھی اپنی دینی روایات سے ناامید اور متنفر نہیں ہوا۔ اسے آج بھی قرآن کے دستور سے یہ امید ہے کہ وہ اسے ساری معاشی اور سماجی الجھنوں سے نجات دلا دے گا ——— ایک معمولی ذہن کا مسلمان یہ بھی جانتا ہے کہ اس تہذیبی اور معاشی لوٹ کھسوٹ کو اسلام کبھی گوارا نہیں کرتا جس کا وہ آج شکار ہو رہا ہے ——— اس لئے وہ سمجھتا ہے کہ جب اس طاغوت سے لڑ کر ہی ایک نئی اور صحت مند صالح دنیا کی چمن بندی کرنی ہے تو کمیونسٹ سرخ پرچم کے تلے ہی کیوں کی جائے۔ آخر اسلام کا پرچم انصاف بھی تو اپنے سائے میں ایک جنت لئے ہوئے ہے اور اس پرچم کو ہاتھ میں لے کر تمام دنیا کے مظلوموں کو جگایا جا سکتا ہے۔ جو اس کے اپنے بھائی ہیں اور خود اس ہی کی طرح آفت رسیدہ ہیں!

آپ ذرا بلادِ اسلامیہ کی ساری بے چینیوں کا پوری طرح تجزیہ کر کے دیکھئے۔ مصر، شام، ایران، پاکستان، انڈونیشیا ہر جگہ اسلام کے احیا کے عوامی مطالبے بڑی شدت سے بڑھتے جا رہے ہیں۔ آخر اس حقیقت کو کیا تصور کیا جائے؟ پھر پاکستان کا تو عین قیام ہی نظام اسلامی کو عملاً برپا کرنے کے لئے ہوا ہے۔ یہ نئی حرکت جو مسلمان ممالک کے اندر پیدا ہو رہی ہے اس کے پیچھے اسلام کا ہمہ گیر سماجی تصور کام کر رہا ہے۔

(باقی آئندہ)

---

[1] حالانکہ مسلمان مزدور ہندو مزدور کے مقابلے میں زیادہ مفلس یا مفلوک الحال اور پریشان ہے ان حالات کے اعتبار سے اسے کمیونزم کی طرف بڑھنے میں سبقت کرنی چاہیے۔

تجزیہ و تزکیہ

زندگی کا عدم توازن

بے شمار نفسیاتی خلل ایسے ہیں کہ جن کا راز زندگی کے عدم توازن سے چھپا ہوتا ہے۔

زندگی کے عدم توازن سے کیا مراد ہے؟

انسان بے شمار صلاحیتوں، بہت سے رجحانات، بہت سی قوتوں، بہت سے محرکات، بہت سی خواہشات اور بہت سے جذبات کا سرچشمہ ہے۔ جسمانی، دماغی اور ذہنی و اخلاقی پہلوؤں سے اس کی فطرت اور اس کی جبلت بہت سے مطالبات بہ یک وقت رکھتی ہے۔ یہ مطالبات بظاہر متضاد ہوتے ہوئے بھی درحقیقت حد درجہ متوافق ہیں۔ ان سارے مطالبات کو اگر محسوس کیا جائے اور پورا کیا جائے تو ایک متوازن زندگی تشکیل پاتی ہے۔ لیکن اگر بعض مطالبات اپنی حد سے بڑھ جائیں اور دوسرے مطالبات کو دبا دیں تو پھر ان کا توافق ختم ہو جاتا ہے اور ان میں تضاد اور تصادم کی کیفیت رونما ہو جاتی ہے اور اس تصادم میں کچھ مطالبات شکست کھا کر تحت الشعور میں تہ نشین ہو جاتے ہیں۔ یہ تہ نشین مطالبات، محرکات اور داعیات جب انسانی زندگی کی کارگاہ میں اپنا جائز مقام نہیں پا سکتے تو پھر یہ منفذ کے ناجائز راستے نکالتے ہیں۔ یہ حالت عدم توازن کی حالت ہے، اور اس حالت کا لازمی نتیجہ نفسیاتی خلل کا ظہور ہے جس سے زندگی کا کوئی گوشہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

یہ عدم توازن اگرچہ بے شمار اقسام رکھتا ہے اور انسانی کیریکٹر کے مختلف نمونوں میں ان اقسام کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے لیکن ان ساری اقسام اور ان کے چھوٹے چھوٹے پہلوؤں کا مفصل تذکرہ کرنا اس موقع پر پیش نظر نہیں ہے۔ اس عدم توازن کی بڑی بڑی صورتوں کا یہاں ہم ذکر کرتے ہیں۔

زندگی کے عدم توازن کی ایک بڑی صورت جو ہر زمانے اور ہر ملک میں پائی جاتی ہے اور خصوصاً ہماری موجودہ سوسائٹی میں بڑے پیمانے پر موجود ہے، یہ ہے کہ آدمی تمام تر اپنی حیوانی خواہشات کی طرف ڈھلک پڑے۔ اس کے لئے کمانے، کھانے، شادی بیاہ، بیوی بچوں سے دلچسپی تنخواہ اور آمد و خرچ کے مسائل سے آگے اور کوئی چیز قابل غور ہی نہ ہو۔ یہ انسانی کیریکٹر ایسا ہے کہ اپنے دائرے میں یہ اخلاقی حس کے مطالبات کو، ذوق علم کے تقاضوں کو، خدمت انسانیت کے رجحانات کو بالکل کچل دیتا ہے۔ اس کیریکٹر کا موجود ہونا ذہنی و اخلاقی صحت کی کامل نفی کرتا ہے۔ ایسے لوگ تمدن کے لئے مجسم روگ ہوتے ہیں اور جہاں بھی ہوں برابر روگ پھیلاتے رہتے ہیں۔

زندگی کے عدم توازن کی دوسری قسم جو پہلی سے زیادہ خطرناک اس بنا پر ہے کہ بظاہر اس میں بڑا وقار اور تقدس محسوس ہوتا ہے، یہ ہے کہ علمی، اخلاقی اور اجتماعی داعیات کے اثر میں ایک شخص اتنا آگے بڑھ جائے کہ اپنے انفرادی تقاضوں کو کچل دے۔

یہ کیریکٹر جب علمی قسم کے آدمیوں میں پروان چڑھتا ہے تو ان میں "عبقریت" پیدا ہو جاتی ہے اور یہی کیریکٹر جب مذہبی قسم کے لوگوں میں نمودار ہوتا ہے۔ تو اس کا نتیجہ کسی نہ کسی درجے کی "رہبانیت" کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔

عبقریت یا رہبانیت ہمیشہ وہاں پیدا ہوتی ہے جہاں جائز فطری خواہشات اور حیوانی داعیات کو دبا یا گیا ہو۔ یہ قطعی طور پر ایک

حالتِ مرض ہے لیکن چونکہ اس کے ساتھ ایک طرح کا وقار اور تقدس پایا جاتا ہے۔ اس لئے لوگ اسے قابلِ علاج سمجھنے کے بجائے قابلِ احترام سمجھتے ہیں۔

عبقریت پسند اور رہبانیت پسند لوگوں کے کیریکٹر کا اگر آپ مطالعہ کریں تو اس کے عدمِ توازن کا اندازہ اس حالت سے ہوگا کہ یہ لوگ ایک طرف تو دنیا جہان کے محسن نظر آتے ہیں لیکن دوسری طرف دیکھئے تو خود اپنے بیوی بچوں کے حق میں، بلکہ اپنے نفس تک کے حق میں پرلے درجے کے بے رحم اور ظالم بن جاتے ہیں۔ لیکن ان کی اس بے رحمی اور ظلم کو ایثار اور قربانی کا نام دیا جاتا ہے۔ ایثار اور قربانی اپنی جگہ ایک شے ہے اور اس کی ایک تعریف ہے اور اونچے مقاصد فی الواقع اس کا مطالبہ کرتے ہیں ——— بلکہ اخلاقی تقاضوں کی تو اساس ہی ایثار و قربانی پر ہوتی ہے ——— لیکن یہ لوگ ایثار نہیں کر رہے ہوتے بلکہ درحقیقت اپنے کسی نفسیاتی نقص کے استھان پر اپنے نفس اور اپنے بیوی بچوں کو بھینٹ چڑھا رہے ہوتے ہیں۔ ایثار کی یہ قسم بالکل ایسی ہی ہوتی ہے جیسے کوئی شخص کسرت کرے اور ایسی کسرت کرے جس کا پورا فائدہ جسم کے چند اعضا اٹھائیں اور دوسرے اعضا کو اس سے محروم رکھ کر کمزوری اور مرض کے حملوں کے لئے چھوڑ دیا جائے۔

اسلام نے اس مفسدے کو خوب اچھی طرح بھانپا ہے اور کیریکٹر کے عدمِ توازن کا سدِباب کرنے کا پورا اہتمام کیا ہے۔ وہاں عبادت کی ترغیب دلانے کے ساتھ ساتھ اس بات سے روکا بھی گیا ہے کہ آدمی عبادت میں لگ کر دوسرے تقاضوں کو بھول جائے۔ وہاں ازدواج سے گریز کو مکروہ سمجھا گیا ہے اور میاں بیوی کی باہمی تفریح کو دینی حیثیت سے ایک قدر و قیمت کا حامل سمجھا گیا ہے۔ وہاں دنیا کا سب سے بڑا پاکباز انسان نماز کے ساتھ ساتھ خوشبویات اور عورت کے لئے اپنی دلچسپی ظاہر کرتا ہے، وہاں سنجیدگی مطلوب ہے لیکن اس کے بالکل متوازی یہ پہلو بھی ہے کہ "تمہارا اپنے بھائی سے متبسم چہرے کے ساتھ ملنا ایک صدقہ ہے" وہاں انفاق کی بڑی تلقین اور اسراف سے روکنے کے لئے بڑی وعیدیں ہیں، لیکن دوسری طرف مطالبہ یہ بھی ہے کہ اگر خدا نے تم کو اپنی نعمتِ رزق سے نوازا ہو تو اس کا اثر تمہارے رہن سہن اور لباس سے ظاہر ہونا چاہئے۔ وہاں ایسے خطبے ضرور دئے جاتے ہیں جنھیں سن کر آنکھوں میں آنسو ڈبڈبانے لگیں لیکن ان خطبوں کو نشر کرنے والے خطیب کی مجلس ہی میں لطیفے بھی ہوتے ہیں۔ اس طرح زندگی کے تمام فطری مطالبات میں، تمام خواہشات اور داعیات میں ایک توازن پیدا کیا جاتا ہے جس سے صحت ور کیریکٹر رونما ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی صلعم اور آپ کے صحابہ علم و تفکر کی ہزاروں وادیاں طے کرنے کے باوجود کبھی عبقری نہ بنے اور زہد و اتقا کی منازل قطع کرنے کے باوجود کبھی راہب نہ ہوئے۔

لیکن ادھر مذہب کا صوفیانہ تصور جب سے ترکِ دنیا کے نظریے کو لے کر مسلمانوں میں داخل ہوا ہے، یہ کچھ عجب حالت ہو گئی ہے کہ دینی زندگی جہاں بھی پائی جاتی ہے اس کے ساتھ رہبانی ذوق کسی نہ کسی درجے میں شامل ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ شعوری طور پر جو لوگ اس ذوق کے شدید مخالف ہیں وہ بھی اس سے غیر شعوری طور پر متاثر ہو جاتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ چونکہ عام طور پر دین کے صوفیانہ تصور کے اثرات ماحول پر موجود ہیں اس لئے جہاں کسی شخص نے دین کو عملاً اختیار کیا، اس سے یہ توقع کی جانے لگتی ہے کہ وہ اب بال سنوارنا چھوڑ دے گا، میلے کپڑے پہنا کرے گا، اب سے اسے ہنسی نہیں آئے گی، اب وہ کوئی تفریح نہیں کیا کرے گا، اب وہ سیر کو نہیں نکلے گا، اب وہ بچوں کے ساتھ دلچسپی نہیں لے گا اور اب وہ بیوی سے بے تکلفی نہیں رکھے گا! اس طرح کے ماحول کا اثر یہ ہوتا ہے کہ خدا پرستی اور اخلاق اور دینداری کی راہ اختیار کرنے والے کو ان ساری باتوں میں غیر شعوری طور پر کچھ احساسِ گناہ سا ہونے لگتا ہے۔ وہ اپنی بے شمار فطری خواہشات کو ماحول کی خاطر دباتا ہے اور اپنے آپ کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اس طرح درحقیقت وہ اپنے اندر ایک خطرناک نفسیاتی روگ کو پرورش دیتا ہے جس کے نتیجے میں سارا کیریکٹر غیر محسوس مفاسد سے بھر جاتا ہے۔

ایک خدا پرست اور صاحبِ تقویٰ جو زندگی کو متوازن رکھنا چاہتا ہو اس کے لئے لازم ہے کہ وہ روح کے داعیات کے ساتھ ساتھ جسم کے داعیات کا بھی لحاظ رکھے، وہ اونچے انسانی مقاصد کے لئے کام کرتے ہوئے حیوانی خواہشات کو بھی جائز طریقوں سے پورا کرے، وہ خدمتِ خلق کے لئے وقت دینے کے ساتھ ساتھ اپنے بچوں کو بھی وقت دے اور اپنی بیوی کے لئے بھی کچھ گھڑیاں پروگرام میں مخصوص کرے، وہ کام بھی کرے اور تفریح بھی کرے، وہ دوسروں کے لئے ایثار بھی کرے اور اپنا حق وصول بھی کرے، وہ محنت بھی کرے اور آرام بھی لے، وہ سنجیدہ بھی رہے اور مسکرائے بھی، وہ ٹھوس موضوعات پر بھی بحثیں کرے لیکن اس کے ساتھ لطیفہ گوئی بھی کرے۔

اس خطرے سے تو ہر خدا پرست اور دین پسند آدمی متنبہ رہتا ہے کہ وہ کہیں خواہشات کا غلام بن کر نہ رہ جائے اور کہیں ہمہ تن حیوانی تقاضوں کا آلۂ کار نہ ہو جائے، لیکن ہم آپ کو دوسرے خطرے سے آگاہ کرتے ہیں کہ جب خدا پرستی اور اجتماعی مقاصد اور علمی سرگرمیوں کی دلچسپیاں آپ میں یہ رجحان پیدا کرنے لگیں کہ سیر و تفریح، بیوی بچوں سے دلچسپی اور جسم کے مطالبات زندگی میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے ـــــــ بلکہ الٹا کچھ یہ گناہ کی سرحد پر کے معاملات ہیں ـــــــ تو فوراً متنبہ ہو جائیے کہ یہ آپ کے کیریکٹر کو غیر متوازن کرنے والا رجحان ہے۔ یہ رجحان بظاہر بڑا قابلِ قدر اور قابلِ فخر نظر آتا ہے لیکن درحقیقت یہ ایک روگ ہے، ایک خطرناک روگ ہے، اور اس سے بے شمار مفاسد پیدا ہوتے ہیں۔ یہ فطرت کے خلاف ایک جنگی اقدام ہے جس میں آج تک کوئی فتح نہیں پا سکا!

امامِ اعظم

امام ابوحنیفہ علم فقہ اسلامی کے بہت بڑے عالم ہیں۔ اس لئے آپ کو امامِ اعظم کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کتاب میں امام ابوحنیفہ کا نام و نسب خاندان تعلیم و تربیت۔ درس و افتاء، عام اخلاق و عادات۔ فنِ حدیث میں آپ کا مرتبہ تدوینِ فقہ میں آپ کا مقام۔ اس قسم کے حالات نہایت تفصیل سے درج کئے گئے ہیں۔ آپ کی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں۔ جس پر اس کتاب میں روشنی نہ ڈالی گئی ہو۔ یہ کتاب مولانا شبلی مرحوم کی تصنیف ہے۔ قیمت چار روپے۔

شہادتِ حسین رضؓ

مولانا ابوالکلام آزاد

سید الشہداء حضرت حسین علیہ السلام کی شہادت کا واقعہ اسلامی تاریخ ہی میں نہیں بلکہ تمام حوادثِ عالم میں ایک عدیم النظیر امتیاز رکھتا ہے۔ مولانا نے اس موضوع پر اپنے مخصوص انداز میں خامہ فرسائی فرمائی ہے۔ اس واقعہ عظیمہ و شہادت کے بعض ضروری پہلوؤں پر خاص روشنی ڈالی ہے۔ نیز ان مضامین میں یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ مشاہیر اسلاف و اکابر قدماء کی یادگار قائم کرنے اور ان کے اعمالِ حسنہ کو زندہ رکھنے کی حکمت کیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے۔

ملنے کا پتہ:۔ **مکتبہ افکارِ اسلامی۔ چوک نقی روڈ۔ بالمقابل پبلک سوسائٹی۔ انارکلی۔ لاہور**

استفسارات

فحش لٹریچر

بلا شبہ سینما، کلب اور رقص کی محفلیں اور "مہذب" خواتین کی پریڈیں اور جلوس ہمارے اخلاق پر بُرا اثر ڈال رہے ہیں، لیکن ان چیزوں کا براہِ راست اثر صرف اونچے خاندانوں پر زیادہ پڑ رہا ہے۔ عوام اور طلبا اور طالبات پر برے اثرات زیادہ تر فحش جرائد کے ذریعے پڑ رہے ہیں۔ ایسے جرائد اتنی کثیر تعداد میں شائع ہوتے ہیں کہ ان کی فہرست درج کرنا مشکل ہے۔ کیا آپ حکام کی توجہ اس طرف دلانا اپنا فرض نہیں سمجھتے کہ کم سے کم تعزیرات پاکستان کی دفعہ نمبر ۲۱۲ تا نمبر ۲۱۴ کے تحت جن کے خلاف کچھ کارروائی ہو سکتی ہے ان کا تو سدباب کیا جائے؟

یہاں بطور مثال ایک کتاب کا اشتہار درج کرتا ہوں:۔

"اگر آپ کسی ایسے غسل خانے میں گھس جائیں جس میں کوئی نوخیز دوشیزہ نہا رہی ہو اور آپ کو اچانک دیکھ کر لجاتے ہوئے اور جاذب توجہ انداز میں کہے کہ میں ننگی ہوں اور فرطِ حیا سے دوہری ہو جائے'...... کو دونوں ہاتھوں سے چھپانے کی کوشش کرے تو کیا آپ الٹے پاؤں لوٹ جائیں گے؟ اگر نہیں تو کیوں؟ ــــــ اس حالت اور ایسی ہی دوسری حالتوں کا بے باک مصنف نے "میں ننگی ہوں" میں جنسیاتی نقطۂ نظر سے تجزیہ کیا ہے!"

یہ کتاب کھلم کھلا بازار میں بک رہی ہے، اور کوئی وجہ نہیں کہ اس سے بدتر کتابیں بازار میں نہ ہوں۔

اس تباہ کن فتنے کا کوئی سدباب ہونا چاہیے۔

یہ خط جس درد و کرب کے ساتھ لکھا گیا ہے اس کی اضطراب انگیزیوں میں ہم کچھ کم مبتلا نہیں ہیں اور فحش لٹریچر ہماری "اسلامی حکومت" کے زیر سایہ جس طرح پرورش پا رہا ہے اور اس کے زہریلے اثرات سے جس طرح ہمارے ملک کے دل و دماغ متاثر ہو رہے ہیں اس پر ہماری بے چینیاں کچھ کم نہیں ہیں۔ اشتہار کا جو اقتباس خط میں درج ہے اسے دل پر پتھر رکھ کر ہم نے چراغِ راہ میں نقل کر دیا ہے لیکن یہ اشتہار اس فحش لٹریچر سے کوئی نسبت نہیں رکھتا جو یہاں دن رات شائع ہو رہا ہے۔ مجھے حال ہی میں ایک رفیق نے اس عظیم قومی فتنے کی طرف متوجہ کرانے کے لیے کراچی سے شائع ہونے والے ایک رسالے کا ایک معمولی نمبر بھیجا ہے ــــــ جسے چار و ناچار مجھے پڑھنا پڑا۔ لیکن میں اس کا کوئی اقتباس تو پیش کرنا درکنار، یہ بتاتے ہوئے بھی اپنی توہین محسوس کرتا ہوں کہ میں نے فلاں رسالے کا کوئی نمبر پڑھا ہے۔ میں نے اسے پڑھ کر ایسا محسوس کیا کہ جیسے میرے ذہن میں دنیا کی سخت گھناؤنی غلاظتوں کو کسی نے یکبارگی انڈیل دیا ہے اور یہ واقعہ ہے کہ اس کے بعد دل و دماغ کی صحت کو بحال کرنے میں مجھے خاصی محنت صرف کرنی پڑی ہے۔ یہ تو میرا حال تھا لیکن ذرا غور فرمائیے کہ ہمارے نوجوان بچے اور بچیاں اس قسم کی چیزوں کو پڑھ کر کیا اثرات لیتے ہوں گے۔

آپ چاہتے ہیں کہ موجودہ حکمران طبقے سے تعزیراتِ پاکستان کی بعض دفعات کے ذریعہ اس کا سدِ باب کرانے کی کوشش کی جائے۔ دوسرے لفظوں میں آپ یہ سمجھتے ہیں کہ موجودہ حکمران طبقے کی پالیسی اور تعزیراتِ پاکستان اس صورتِ حالات سے کوئی تضاد یا کم سے کم وجہ اختلاف رکھتی ہے جو فحش لٹریچر کی اشاعت سے پیدا ہو رہی ہے۔ جی نہیں! ہماری موجودہ قیادت اور ہماری تعزیراتِ پاکستان کی دفعات موجودہ نظام کی ویسی ہی فطری کڑیاں ہیں جیسی یہ فحش لٹریچر ہے۔ آپ ان کڑیوں میں سے کسی ایک کو رکھ کر دوسری کو مٹا نہیں سکتے! یہ فحش لٹریچر ہمارے نظامِ حیات کے چمن میں جھاڑ جھنکار کی طرح شئے زائد کی حیثیت سے نہیں اُگ آیا ہے کہ اس چمن کے مالیوں کو اس پر متوجہ کرایا جائے اور ان کو یہ بھی واضح کیا جائے کہ حضرات! اسے کاٹنے کے لئے آپ کی قینچیاں ٹھیک ٹھیک کام دے سکتی ہیں، ایسا نہیں ہے! یہ اس چمن کی رونق بڑھانے والے تختے ہیں، ان کے لئے بیج ڈالے جاتے ہیں، ان کو کھاد دی جاتی ہے اور ان کی آبیاری ہوتی ہے اور مالی یہ سمجھتے ہیں کہ یہ تختے اگر نہ ہوئے تو چمن چمن نہیں رہے گا، ملائیت کا جنگل بن جائے گا! یہ آرٹ ہے، یہ فنونِ لطیفہ ہیں، یہ ترقی پسندی کے مظاہر ہیں، یہ یورپ اور امریکہ کے ساتھ ہمسری کرنے کے سامان ہیں۔

غور تو فرمائیے کہ ہمارے بچوں کو نظامِ تعلیم ایک خاص طرح کا ذوق دے کر باہر نکالتا ہے، وہ ایک خاص طرز کے ادیب اور صحافی اور آرٹسٹ پیدا کرتا ہے، ہمارا نظامِ معاشرت ذوقِ زنانہ کے لئے فضا کو سازگار بناتا ہے، سینما، زنانہ پریڈیں اور بے پردگی کی تحریکیں جنسی رجحانات کو غیر فطری حد تک مشتعل کرتی ہیں، ریڈیو کے گانے فتنے کی آگ کو اور زیادہ ہوا دیتے ہیں، عورتوں کی تصاویر سے آراستہ اشتہارات اس پر تیل چھڑکتے ہیں، پھر ہمارا ادب رہی سہی کسر پوری کرتا ہے۔ اور اس فتنے کی ہمہ گیریوں کی پاسبانی ہمارا حکمران طبقہ کرتا ہے۔ اس مجموعی صورتِ حالات کا فطری تقاضا یہ ہے کہ وہ ساری ذہنی گندگیاں نشو ونما پائیں جن سے آپ نالاں ہیں۔ اب آپ کا یہ مطالبہ بہت ہی عجیب ہے کہ اس مجموعی صورتِ حالات کی پاسبان قیادت اس کے فطری تقاضے کو دبا دے۔

میر بھی خوب ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب ... اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

یہ قیادت اگر ایسا کرنا بھی چاہے تو بری طرح ناکام ہوگی۔ فتنہ ہمہ گیر ہے تو اس کی اصلاح بھی ہمہ گیر تبدیلی کا مطالبہ کرتی ہے۔ ہمہ گیر فتنے میں جزوی اصلاح کرنے کی جو کوشش بھی کی جائے گی ناکام رہے گی۔ آپ اگر اصلاح چاہتے ہیں تو آپ کو تعلیم کو بدلنا ہوگا، ریڈیو اور سینما کو بدلنا ہوگا، ادب اور صحافت کو بدلنا ہوگا، نظامِ معاشرت اور اس کے اندر عورت کی حیثیت کو بدلنا ہوگا، تعزیراتِ پاکستان کو بدلنا ہوگا اور ان ساری تبدیلیوں کے لئے اپنی قیادت کو بدلنا ہوگا۔ اصلاح کا اس سے چھوٹا راستہ اور کوئی نہیں ہے۔

غور کیجئے کہ ایک شخص اٹھتا ہے ایک رسالہ بیچ کر نفع کمانے کے لئے پوری قوم کے اخلاق کو اپنی کسبِ معاش کی بساط پر داؤں میں لگا دیتا ہے اور اسے کسی کی طرف سے بازپرس کا اندیشہ نہیں ہوتا۔ نہ حکمران کی طرف سے، نہ پبلک کی طرف سے۔ اگر ایک صالح نظام میں یہ واقعہ ہوا ہوتا تو لوگ ایسے شخص سے ایک قاتل، ایک چور، ایک جیب کترے، ایک ٹھگ اور ایک باغی سے بدتر معاملہ کرتے۔ وہ اس کے اخلاقی زہر کو قیمت دے کر خریدنے کے بجائے اس کی بوٹیاں نوچ لیتے، وہ اس کی پھیلائی ہوئی غلاظت کو چومنے اور اس سے لذت لینے کے بجائے اس پر لعنت بھیجتے۔ لیکن فضا اس کی محافظ ہے، قانون اس کا پاسبان ہے اور قیادت اس کو اپنی پناہ میں لئے ہوئے ہے۔ وہ قوم میں اخلاقی دق پھیلاتا رہے، وہ نئی نسل کی سیرت کو جذام اور کوڑھ میں مبتلا کرتا رہے، کون ہے جو اس کے منہ آسکے۔

اس قسم کے لوگوں نے ہمارے عوام ہی نہیں، اونچے پڑھے لکھے حضرات تک کا مذاق اس حد تک بگاڑ دیا ہے کہ وہ بک اسٹال پر جاکر جب بھی کوئی پڑھنے کی چیز خریدیں گے تو ان کا معیارِ ذوق سب سے پہلے یہ دیکھے گا کہ عورتوں کی، ایکٹرسوں کی تصویریں —

خصوصاً زیادہ سے زیادہ ننگی تصویریں ـــــ کس رسالے میں ہیں اور پھر یہ دیکھے گا کہ کس نے افسانوں اور نظموں میں زیادہ سے زیادہ جنسی عریانی کو پیش کیا ہے۔ اس کے بعد جس پر اس کی نگاہ جمے گی اس کی قیمت ادا کرے گا اور چل دے گا۔ چنانچہ آپ کے ہاں سب سے زیادہ اشاعت فلمی رسالوں کی ہے اور اسی ذوق کی کشش ہے کہ بیرونی ممالک سے "غسلِ آفتابی" (SUN-BATH) جیسے جریدے بہت بڑی تعداد میں آتے ہیں اور عین آپ کے "مرکزِ ملکومت" کے چوراہوں اور فٹ پاتھوں پر بکتے ہیں!

جن حکمرانوں کے زیرِ سایہ، بلکہ جن کی اپنی طرف سے لوگوں کے مذاق کو اس حد تک روگی بنانے کے مختلف ملک گیر وسائل کام کر رہے ہیں وہ آخر کس ضمیر کے ساتھ، کس قوت کے ذریعہ، کس محرک کے زیرِ اثر اس مذاق کے تقاضوں کو پورا کرنے کے سامانوں کا خاتمہ کر سکتے ہیں؟

دوسرے مختلف فتنوں کی طرح اس فتنے کے استیصال کے لئے اجتماعی نظام کو پاکیزہ اسلامی بنیادوں پر استوار کرنے کے لئے ہم سب کو مل جل کر ایک لمبی جدوجہد کرنی پڑے گی، جیسے ہم کر رہے ہیں اور جس میں سب کا تعاون حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

یہ مبالغہ نہ تھا!

"تدبرِ قرآن" پر تبصرہ نظر سے گزرا۔ حضرت مولانا اصلاحی کے متعلق آپ کی یہ تحریر دل پر شاق گزری کہ جو انھیں نہیں جانتے وہ اسلام سے بھی دور ہے۔ اب تک دل گواہی نہیں دیتا کہ یہ تحریر آپ کی ہو۔ اگر ایسا ہے تو افسوس ہے۔ اغیار کے لئے شاید جماعت پر چوٹیں کرنے کا نادر موقع پیدا ہو گیا ہے۔ میرے خیال میں واقعی یہ صورتِ حال درست نہیں اور موصوف کے لئے بھی بہ فحوائے حدیث شریف قتل کر دینے کے لئے مترادف ہے۔

شخصیت پرستی کے روگ سے پاک رہنے والے ایک شخص کے لئے بھی ایسے مواقع آ سکتے ہیں کہ جن لوگوں کے علم و فضل اور جن کی خدمات سے وہ واقف ہو ـــــ واقف ہی نہ ہو، اُن سے پوری طرح استفادہ کرنے کی سعادت حاصل کر چکا ہو ـــــ ان کے مقام کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرے۔ میں سمجھتا ہوں کہ حدیثِ نبوی ایسے مواقع کی تردید کے لئے وارد نہیں ہے۔

آپ کو غلط فہمی یہ ہوئی کہ میں نے کوئی بے جا مبالغہ کر ڈالا ہے، حالانکہ یہ بات مبالغہ آرائی سے بالکل خالی ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے یہ کہا جائے کہ جو شخص گیلیلیو کو نہیں جانتا وہ سائنس کی دنیا سے کوسوں دور ہے، یا جسے بقراط سے تعارف نہیں وہ فلسفہ کو کیا سمجھے گا، یا جس نے غالب کو نہیں پڑھا اسے اردو شاعری سے کیا مَس، یا جس نے مارکس کا مطالعہ نہیں کیا وہ کمیونزم کی ابجد سے بھی واقف نہیں۔ ان کلمات میں مبالغہ کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

آپ خود سوچیں کہ ایک شخص اسلام کو بہ حیثیت نظامِ زندگی قائم کرنے کے لئے تگ و دو کرنے کی اسپرٹ لے کر اٹھتا ہے تو یہ اسپرٹ اس میں کچھ تو بے چینیاں پیدا کرے گی کہ وہ یہ جانے کہ کون یہاں اس مقصد کا خادم ہے اور کون اس کا مزاحم ہے۔ اگر یہ بے چینیاں پیدا نہیں ہوتیں یا اسلام کو نظامِ زندگی کی حیثیت سے سمجھا ہی نہیں گیا یا اسے قائم کرنے کا داعیہ نہیں تو ظاہر ہے کہ اس طرح کا آدمی اسلام کی حقیقت سے بہرحال کوسوں دور ہے۔ زیادہ سے زیادہ گنجائش تو اسی بات کی ہے ناں کہ ایک مخلص خادمِ اسلام اصلاحی صاحب سے اختلاف کرے، انھیں گمراہ کن نظریے کا حامل سمجھے، ان کو جہلِ مرکب میں مبتلا قرار دے، لیکن یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک شخص پاکستان

میں اسلام کا علمبردار بن کے اٹھے اور اسے عمر بھر یہ پتہ نہ چلے کہ اصلاحی کون ہے اور کیا کہتا ہے —— جبکہ اصلاحی صاحب کی فکر پاکستان کے گوشے گوشے میں بول رہی ہے اور کوئی مقام ایسا نہ ہوگا جہاں ایک خادم اسلام کے سامنے یہ فکر ایک سوال بن کے یا اس کے کسی سوال کا جواب بن کے نہ آئے۔

جو بات میں نے یہاں کئی جملوں میں پھیلا کر لکھی ہے اسی کو تبصرے میں ایک جملے میں سمیٹ دیا تھا اور اجمال آپ کے لئے ابہام بن گیا۔ مگر گستاخی معاف! اصلاحی صاحب کے لئے آپ نے ایک ایسا لفظ استعمال کر ڈالا ہے جسے میں ان کے لئے کبھی استعمال نہ کروں، چاہے میری گردن پر تلوار ہی کیوں نہ رکھ دی جائے —— وہ ہے لفظ "حضرت"! اسے انبیاء و صحابہ اور اونچے درجے کے اتقیاء و صلحاء سے نیچے آکر جب سے لوگوں نے مدرسہ و خانقاہ کے آداب کلام میں داخل کیا ہے، یہ بہت ہی خطرناک چیز بن گیا ہے۔ دراصل اپنی سطح سے نیچے آنے کے بعد اس لفظ میں وہ ذہنیت پائی جاتی ہے جسے آپ نے میرے جملے میں تلاش کرنا چاہا ہے۔ اس لفظ کے استعمال سے واقعی بسا اوقات آدمی قتل ہو جاتا ہے، اور قتل ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کا مُثلہ بھی ہو جاتا ہے۔

—— + ——
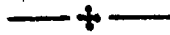
اذان کا ترجمہ

"نماز میں قرآن کے متن کے بجائے ترجمہ کی قرأت پر آپ نے جو رائے دی ہے مجھے اس سے کلی اتفاق ہے، مگر اذان مع ترجمہ پکاری جائے یا صرف ترجمہ، تو اس میں کونسی قباحت ہے۔ لوگ اگر اذان کی پکار کو سمجھیں گے تو نماز کی طرف رغبت پیدا ہونے کا زیادہ امکان ہے۔"

تو کیا آپ کی رائے میں عرب ممالک میں اس بنا پر نمازیوں کا تناسب زیادہ ہوگا کہ وہاں اذان عربی زبان میں پکاری جاتی ہے؟ آپ بھی اس کا جواب نفی میں دیں گے۔ اذان کا عربی میں ہونا نماز کی رغبت کی کمی کا موجب نہیں، بلکہ ایمان کی کمزوری اور طاعت کے جذبے کا فقدان اس کا سبب ہے۔ اذان کے ترجمہ کا مفسدہ بھی وہی ہے جو نماز کے سلسلے میں عرض کیا گیا تھا۔ مثلاً مؤذن کہتا ہے "اشھد ان لا الٰہ الا اللہ" اس کلمے کے اندر الٰہ کا جو لفظ استعمال ہوا ہے، اس کے لئے صحیح معنوں میں اردو زبان کے پاس کوئی مترادف لفظ ہے ہی نہیں، لہٰذا جو الفاظ بھی آپ استعمال کریں گے وہ ناقص ترجمانی کریں گے، اور پھر الٰہ کا مفہوم اکثر لوگوں کے نزدیک بہت ہی محدود ہے، ایسے لوگ اسی محدود مفہوم کے مطابق ترجمہ کریں گے۔

دوسرے اذان کا عربی میں ہونا من جملہ ان ذرائع کے ہے جو مسلمانوں کے درمیان بین الاقوامی احساس وحدت کا ذریعہ بنتے ہیں۔ آپ کسی ملک میں بھی جائیں تو ایک ہی اذان ہر جگہ سنائی دیتی ہے جس کے آپ پہلے سے خوگر ہوتے ہیں، لیکن اذان کے ترجموں کا رواج اس ذریعۂ یگانگت کو ختم کر دے گا۔ اور وہ فائدہ جو آپ کے نزدیک متصور ہے، وہ ترجمۂ اذان سے حاصل ہونے کا نہیں۔

—— + ——
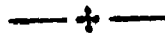
اسلام اور موسیقی

مسئلۂ تصویر پر آپ کے خیالات سے اتفاق کرتے ہوئے مسئلۂ موسیقی پر یہ کہوں گا کہ اگر یہ چیز اخلاقی لحاظ سے کوئی مفسدہ ہوتی تو قرآن اس کے بارے میں خاموش نہ رہتا۔ پھر میں نے

بزرگوں کی زبانی سنا ہے کہ حضرت خواجہ غریب نواز نے موسیقی کے ذریعہ اشاعتِ اسلام کی۔

یہ صحیح ہے کہ موسیقی کی موجودہ شکل جو ہندو پاکستان میں پائی جاتی ہے اور اس کا جو استعمال ہو رہا ہے وہ واقعی قابلِ ملامت ہے مگر کوئی وجہ نہیں کہ اس فن ہی کو سرے سے حرام سمجھا جائے۔ جیسے ادب کا استعمال غلط ہو سکتا ہے مگر فی نفسہ ادب قابلِ ترک نہیں۔

سوال یہ بھی ہے کہ اسلام انسان کی کسی بھی قوت اور کسی بھی رجحان کو سرے سے ختم نہیں کرتا بلکہ اسے سیدھے راستے پر لگا دیتا ہے۔ پھر آخر موسیقی کے رجحان کو وہ کیسے ختم کر سکتا ہے۔

فوجی بینڈ کے بارے میں بھی اسلامی نقطۂ نظر کو واضح کر دیا جائے تو اچھا ہے۔"

موسیقی اگر کوئی ذریعۂ اشاعتِ اسلام ہو تو خدا کا نبی سب سے پہلے اس بات پر مامور ہوتا ہے کہ ہر ذریعۂ اشاعت اسلام کو جو اس کے دور میں پایا جائے پوری طرح استعمال کرے۔ اس لئے اشاعتِ اسلام کے ذرائع کی جب بھی تحقیق کی جائے گی تو نبی اور اس کی سوسائٹی کے اندر کی جائے گی۔ کوئی اور نظیر اس مقصد کے لئے مفید نہیں ہے۔ اور اگر موسیقی واقعی اشاعتِ اسلام میں مدد دینے کا ذریعہ ہوتی تو پھر لازماً قرآن میں اس کا تذکرہ تحسین کے ساتھ کیا جاتا تاکہ مسلمان اس ذریعۂ اشاعتِ اسلام کے استعمال میں کوتاہی نہ دکھائیں۔ لیکن قرآن خاموش ہے ـــــ اور اس لئے خاموش ہے کہ باوجودیکہ عرب میں موسیقی تمدن کا ایک مستقل جزء تھی، مسلم سوسائٹی نے اس کو آغاز ہی سے دین و اخلاق کی سطح سے پست پاکر چھوڑ دیا تھا اور اس معاملے میں ان کے اخلاقی احساسات کو قرآن نے کافی سمجھا، کسی مزید ہدایت اور تاکید کی ضرورت نہ تھی۔ نبی صلعم نے آلاتِ موسیقی کے توڑنے کے منصب پر مامور ہونے کا جو اعلان کیا ہے اگر وہ خلافِ قرآن ہوتا تو حضورؐ کو فوراً ٹوک دیا جاتا جیسے یاایہا النبی لما تحرم تبتغی مرضات ما احل اللہ لک کی ایک مثال موجود ہے۔ قرآن کا سکوت آپ کے اعلان کی توثیق کرتا ہے۔

آپ حضرات نہ جانے کیوں موسیقی کی ماہیت کو متعین کئے بغیر مسئلے کو سوچتے ہیں۔ موسیقی الفاظ اور ان کے معانی سے بالکل الگ ایک چیز ہے۔ اس کی ایک معروف تعریف یہ ہے: "بہترین اصوات کا بہترین مجموعہ!" اس تعریف سے آپ کو اندازہ کرنا چاہیے کہ فنِ موسیقی کا تعلق صرف آوازوں اور ان کی ترتیب سے ہے۔ ایک نغمہ، چاہے اس کے لئے آپ کوئی الفاظ سرے سے اختیار نہ کریں، بلکہ محض بے معنی آوازیں نکالیں، اور چاہے آپ اس کے لئے کوئی ناپاک سے ناپاک غزل اور کوئی پاک سے پاک قصیدہ منتخب[1] فرمائیں، بلکہ اس میں قرآن کی بحر رکھنے والی سورتیں پڑھ ڈالیں تو بھی اس نغمہ کے اثرات اس ترتیب اصوات کے مطابق یکساں ہوں گے جن سے وہ تشکیل پاتا ہے۔ موسیقی سے جب آپ اثر پذیر ہو رہے ہوں تو ذہن معانی کو گرفت میں لینے اور اپنے فکری قوٰی کو بر سر عمل کرنے کی پوزیشن ہی میں نہیں ہوتا بلکہ موسیقی کا سارا حملہ آپ کے چند مراکزِ اعصاب پر ہوتا ہے جن کے متحرک ہونے سے بعض جذباتی کیفیاتِ غیر شعوری راستے سے ابھرتی ہیں۔

موسیقی کی یہ ماہیت پیش نظر نہ رکھنے کی وجہ سے آپ موسیقی کے دو استعمال بتاتے ہیں: ایک مقدس اور ایک ناپاک، اور اسی وجہ اسے ادب کے مماثل قرار دیتے ہیں۔ بات سمجھنے سے پہلے یہ غلط فہمی صاف ہونی چاہئے۔

---

[1] مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ ایک سازندہ ہمارے گاؤں میں آیا تھا جس کی تعریف کرتے ہوئے قدر شناسانِ فن کہتے تھے کہ یہ فن کار سارنگی سے کلمہ طیبہ نکالتا ہے۔

مذہبی ـــــ بلکہ صوفیانہ فضاؤں میں موسیقی جس طرح کام کرتی ہے، میں پہلے اس کی تشریح کرچکا ہوں۔ ہوتا یہ ہے کہ ایک خاص نغمہ بعض مراکزِ اعصاب کو یا تو سُن کرتا ہے اور اس سے ایک "سُکر" کی حالت پیدا ہوتی ہے جسے "قربِ الٰہی" قرار دے لیا جاتا ہے، یا پھر نغمہ کا حملہ تو ہو رہا ہوتا ہے جنسی مراکزِ اعصاب پر، لیکن اس سے جو لذت پیدا ہوتی ہے اسے سامع اپنی مشق سے منحرف (DIVERT) کر دیتا ہے خدا کے یا رسول کے، یا شیخ کے تصور کی طرف! پس اگر آپ اس فریبِ نفس کا صحیح صحیح تجزیہ کریں تو اصل حقیقت نمایاں ہو جائے گی۔ پس امرِ واقعہ یہ ہے کہ موسیقی میں آپ کچھ نہ کچھ افادیت ثابت کر بھی دیں تو بھی اس کے مفاسد کا پلڑا بھاری رہے گا۔

جی نہیں! اسلام نے خوش آوازی کے ذوق کو کبھی ختم نہیں کیا بلکہ اسے پروان چڑھایا ہے، لیکن صحیح طریقے سے پروان چڑھایا ہے۔ جس طرح اسلام نے صورت گری کا راستہ بند کیا تو اس کے ساتھ ہی نقاشی اور خطاطی اور گلکاری کے راستے کھل گئے، اسی طرح اسلام نے گانے بجانے کا دروازہ بند کیا تو خوش آوازی کے لئے دوسرے دروازے کھول دیئے۔ مسلمانوں نے حسنِ صوت کے ذوق کو اذان میں اور قرآن کی ترتیل میں پوری طرح استعمال کیا ہے۔ علاوہ بریں خوش آوازی اور لحن سے شعر پڑھنے کے راستے بالکل کھلے پڑے ہیں۔ رد کیا گیا ہے لہو و لعب کو!

فوجی بینڈ کو اگر کھینچ تان کر حدِ جواز میں رکھا بھی جائے، تو بھی یہ پیشِ نظر رہے کہ مسلمان مجاہد جو اپنے اصول و مقصد کی محبت میں شعوری طور پر ادائے فرض کی ایک گہری اسپرٹ، طاعت اور ڈسپلن کا جذبہ اور شہادت تک کا شوق لئے ہوئے مارچ کرتا ہے تو وہ اس مصنوعی جوش و خروش کا محتاج نہیں ہوتا جسے بینڈ باجوں کے ذریعہ آج کل کے کرائے کے نفس پرست سپاہیوں میں پیدا کئے بغیر اس لئے کام نہیں چلتا کہ ان کو قوم و وطن کے بتوں پر قربان ہونے کے لئے جب لے جایا جا رہا ہوتا ہے تو وہ ان ذہنی بتوں کے لئے جو غیر شعوری جذبہ رکھتے ہیں، تنہا وہ جذبہ کام نہیں دیتا۔

——+——

(بقیہ قند و نمک)

سلامیاں دے کر آپ کے وقار میں چار چاند لگائے ہیں۔ اس مہم کے لئے ریڈ کراس کے ہفتے نے خاص طور پر موسم بہار مہیا کر دیا جو تعلیمی اداروں اور اسکولوں کی لڑکیاں اس ہفتے گھر بہ گھر ڈراموں کے لئے چندے جمع کرنے اور ریڈ کراس کی ٹکٹیں بیچنے کے لئے گھومیں اور بے پردگی کے ذوق نے اپنے ارمان خوب خوب پورے کئے۔ پھر گول باغ میں مینا بازار لگا جس میں بڑی بڑی بیگمات نے اسٹال لگائے، پھر روپ متی اور باز بہادر کا ڈرامہ پیش کیا گیا ـــــ اور ایک مرتبہ نہیں دو تین مرتبہ دکھایا گیا۔ اس کا جو مظاہرہ وائی، ایم، سی، ہال میں ہوا ہے اس پر مغرب زدہ عورتیں اس کثرت سے ٹوٹ پڑیں کہ ہال میں سمائی مشکل ہوگئی، چنانچہ ایک دوسرے پر سے خواتین جب کود رہی ہیں تو بڑی دھکم پیل ہوئی ہے اور کسی کا آنچل پھٹا اور کسی کا گریبان چاک ہوا اور کسی کے دامن کے پرزے اڑ گئے۔

اس موقع پر سب سے دردناک ـــــ اور زائرات کے لئے سب سے طرب ناک ـــــ منظر یہ تھا کہ ایک مذہبی گھرانے کی خاتون ناچی ہیں اور ان کے ناچ کو سب سے زیادہ دلچسپی کے ساتھ دیکھا گیا ہے۔

ادھر وائی، ڈبلیو، اے، سی کو باہر سے مالی امداد حاصل ہو رہی ہے تاکہ یہ ادارہ اپنے کام کو توسیع دے سکے۔

ہم اس تحریک کے سرپرستوں سے درخواست کرتے ہیں کہ ذرا سوچئے کہ آپ کدھر جا رہے ہیں اور عوام کو کن گڑھوں کی طرف دھکیل رہے ہیں۔

فرار کے بعد ......

فروغ احمد

وہ سیمگوں بدلیاں فضاؤں میں ریشمی جال بُن رہی ہیں
جلوئے مہتاب میں ستاروں کا دھندلا دھندلا سا کارواں ہے
زمیں پہ امن و سکوں کی خاطر بپا ہے آگ اور خون کا طوفاں
جہاں تمدّن عروج پر تھا وہاں بس اب راکھ ہے، دھواں ہے
ضمیرِ انساں ہوس کی خوں ریزیوں سے اُکتا گیا ہے یا رب!
جہانِ انسانیت میں جاؤ، جہاں بھی اک شورِ الاماں ہے
ہمارے دہقاں کے جھونپڑے پر گھٹی گھٹی سی ہے اک اداسی
ہمارے ملاح کے سفینے کا اب بھی بوسیدہ بادباں ہے
ہزار غم جانِ ناتواں پر، نہیں تحمل کی تاب باقی!
اس آب و گل سے گزر بھی جاؤں! یہ زندگی اب بہت گراں ہے
وہ آسماں کی روپہلی وادی میں کوئی مجھ کو بُلا رہا ہے،
اُن ابر پاروں کے پیچھے شاید مرے لئے گوشۂ اماں ہے

یہ منتشر منتشر بخارات، یہ خلاء، یہ طلسمِ گردوں!
کہاں ہے وہ ریشمیں ہیولا! وہ جلوۂ سیمگوں کہاں ہے
وہ مخملیں سبزہ زار میں ہیں خمیدہ سیماب گوں لکیریں

وہ ارغنوں سا جو بج رہا ہے، رواں دواں جو نغمہ خواں ہے
سکوں عناصر میں، دشت و کہسار میں، سکوں وادی و چمن میں
حیاتِ انساں میں کیوں بپا شورشِ فساد و غم و فغاں ہے؟
خدا کی دنیا خدا کی مرضی پہ چل رہی ہے تو پُرسکوں ہے،
اور آدمی کی یہ سرکشی خود اسی کی خاطر وبالِ جاں ہے

یہ میرے کانوں میں بانگِ حیّ علی الفلاح آ رہی ہے کیسی!
زمانے سے جس کو روحِ انساں ترس رہی تھی، وہی اذاں ہے
حضورِ خالق میں سر جھکا لوں، میں تازہ کر لوں وفا کا پیماں
فریبِ باطل جو کھا چکا ہوں، ابھی دلِ زار خوں چکاں ہے
سحر نمودار ہو رہی ہے، حیاتِ نو مسکرا رہی ہے!
دلوں میں ایماں کی ہے حرارت، نفس نفس پھر شرر فشاں ہے
نئے عزائم کے ساتھ پھر رزم گاہِ ہستی میں آ رہا ہوں
مری رگ و پے میں پھر وہی خونِ زندگانی رواں دواں ہے
یہ جی میں ہے آبروئے انسانیت پہ سب کچھ نثار کر دوں
خدا کے بندوں کی زندگی کو میں رشکِ نو بہار کر دوں

(حلقۂ ادبِ اسلامی ڈھاکہ میں پڑھی گئی)

تنظیم سوز و ساز

عبد المجید مجید

ہم غمزدوں پہ ناز اگر کر سکے تو کر
ذروں کو سرفراز اگر کر سکے تو کر

یہ کیا کہ ترجماں ہوں حریفانِ کم سواد
دل کو جہانِ راز اگر کر سکے تو کر

اشکوں کو روکنا تو روش ہے عوام کی
تنظیم سوز و ساز اگر کر سکے تو کر

شیون گری تو کام نہیں اہلِ عشق کا
محرومیوں پہ ناز اگر کر سکے تو کر

تنہا نظر کا کام نہیں بزمِ حسن میں
دل کا دریچہ باز اگر کر سکے تو کر

کب تک یہ ناخدا کی خوشامد کا سلسلہ
طوفاں سے ساز باز اگر کر سکے تو کر

دُنیائے رنگ و بُو کی محبت کے ساتھ ساتھ
دُنیا سے احتراز اگر کر سکے تو کر

جُھک جائے سر کے ساتھ ترا دل بھی سوچ بھی
بس یوں ادا نماز اگر کر سکے تو کر

تیری طرح ہر اک پہ ہے وہ مہرباں مجید
اس دوستی پہ ناز اگر کر سکے تو کر

اشتراکی شاعر سے
(انجمن ترقی پسند مصنفین کے منشور کے بعد)

ضیا محمد ضیا

دیتا ہوں داد طبع حقیقت پرست کی
پھبتی کسی ہے مجھ پہ قدامت پرست کی

ہر چند تجھ سے فکر و نظر میں بلند ہوں
لیکن تری نگاہ میں رجعت پسند ہوں

میں بھی تھا سامراج کا دشمن تری طرح
پھونکا تھا جس نے میرا نشیمن تری طرح

آزادئ وطن میں ترا ہمنوا رہا
آزاد اس چمن میں مثالِ صبا رہا

ہر روز ڈالتا ہوں محلوں میں تھرتھری
اور توڑتا ہوں سازِ نوا ہائے قیصری

کھلتا ہے ہر سحر درِ زنداں مرے لئے
موجود ہیں سلاسل و جولاں مرے لئے

میں نے تجوریوں کی حمایت کبھی نہ کی
میں نے مہاجنوں سے محبت کبھی نہ کی

تسلیم میں نے کب کیا شاہوں کا اقتدار
لی ہے غلط نظام سے ٹکر ہزار بار

انسان کی خدائی کا قائل نہیں رہا
بندوں کی کبریائی کا قائل نہیں رہا

میرے اصولِ دین میں شاہی حرام ہے
کہتے ہیں جس کو سروری خدمت کا نام ہے

باطل ہے کہہ رہا ہوں نظامِ شہنشہی
انسانیت شکار ہے دامِ شہنشہی

دیتا ہوں اہلِ دہر کو پیغامِ انقلاب
توڑا ہے میرے جوشِ عمل نے طلسمِ خواب

جھنجھوڑتا ہوں خوابِ گراں سے عوام کو
بتلا رہا ہوں عظمتِ انساں تمام کو

دیتا ہوں حریت کے خیالات کو رواج
تعمیر کر رہا ہوں اسی پر نیا سماج

ظلم و ستم کو ظلم و ستم کہہ رہا ہوں میں
رنج و الم کو رنج و الم کہہ رہا ہوں میں

کہتا ہوں میں غلط ہے معیشت کا یہ نظام
عصرِ جدید کی یہ سیاست ہے بے لگام

دنیا کا ترک میں نے سکھایا نہیں کبھی
رہبانیت کو ٹھیک بتایا نہیں کبھی

کہتا ہوں میں جمود اجل کا پیام ہے
کہتے ہیں جس کو زندگی حرکت کا نام ہے

یہ زندگی ہے صورتِ میدانِ کارزار
نامرد ہے کرے گا جو میدان سے فرار

پیہم عمل ہے، سعیٔ مسلسل ہے زندگی
انساں کی کوششوں سے مکمل ہے زندگی

دل سے یہ چاہتا ہوں پریشاں نہ ہوں غریب
آرام بندگانِ خدا کو ہے نصیب

میں دیکھتا ہوں سینۂ افلاس کا دھواں
میری نظر میں شامِ غریباں کا ہے سماں

بے کیف ہو رہی ہے کسانوں کی زندگی
بیزار و مضمحل ہے جوانوں کی زندگی

مزدور کی نوا پہ دھڑکتا ہے میرا دل
دہقاں کی بے بسی پہ پھڑکتا ہے میرا دل

انسان سارے ایک ہیں مری نگاہ میں
کرتا نہیں ہوں فرق گدا اور شاہ میں

تو ان کو کر رہا ہے گروہوں میں منقسم
ٹپکا رہا ہے زہر کی بوندیں ترا قلم

آپس میں بھائیوں کو لڑاتا نہیں ہوں میں
روٹی پہ آدمی کو کٹاتا نہیں ہوں میں

تجھ سے مرا تصوّرِ انساں ہے مختلف
ہاں میرے انقلاب کا ساماں ہے مختلف

میرا قلم خدا کی امانت ہے میرے پاس
یعنی یہ اِک ذریعۂ خدمت ہے میرے پاس

جدّت پسند ہے کہ قدامت پرست ہے
بس نشۂ محبّتِ انساں میں مست ہے

ہے رشتہ ہائے قوم و وطن سے کٹا ہوا
دامن ہے اس کا لوث ریا سے بچا ہوا

تیرے ادب میں کچھ نہیں وحشت کے ماسوا
انساں سے کر رہے ہو کیا نفرت کے ماسوا

پھرتے ہو دل میں بغض و عداوت لئے ہوئے
سینے میں شعلہ ہائے بغاوت لئے ہوئے

رہتے نہیں ہو اپنے چمن کی فضاؤں میں
کرتے ہو رقص لال پھریرے کی چھاؤں میں

گاتے ہو صبح و شام بغاوت کا راگ تم
کھل کر لگاؤ امن کے خرمن میں آگ تم

پھر منہ سے امن امن کا نعرہ لگاتے ہو
کیا بے خبر عوام کو احمق بناتے ہو

لیتے ہو نام ہر کہیں مزدور راج کا
کرتے ہو کیا بچاؤ سٹالن کے تاج کا

اڑتے ہو لیوں کو سرِ حدِ ادراک سے پرے
جنّت کوئی بنائی ہے افلاک سے پرے

اوروں کو بھی اسی کا تصوّر دلاتے ہو
خوابِ خیال کی نئی دنیا بساتے ہو

تم مست پھر رہے ہو مئے لاشئے ہوئے
میں ہاتھ میں ہوں ساغرِ الّا لئے ہوئے

پاکیزہ و بلند ہیں میرے تصوّرات
روشن ہیں میرے سینے میں حق کی تجلّیات

میں جانتا ہوں تنگ ہے عرصہ حیات کا
مالک ہے کوئی اور ہی اس کائنات کا

سکّہ رواں اسی کا ہے نزدیک و دُور میں
جانا ہے ایک روز اسی کے حضور میں

مجھ کو بھی طرزِ کہنۂ گیتی بدلنا ہے
فطرت نے جو بتائی ہے اُس راہ پہ چلنا ہے

میر و غریب کا یہ تفاوت مٹاؤں گا
آپس میں ان کی حد اخوّت ملاؤں گا

جاگیرداریوں کو پنپنے نہ دوں گا میں
مزدور و کشتکار کا حق مانگ لوں گا میں

بھوکا کوئی بھی دیس میں رہنے نہ پائیگا
آنسو کسی غریب کا بہنے نہ پائے گا

گردوں تک نہ جائے گا نالہ یتیم کا
عالم نہ ہوگا بیوہ پہ امید و بیم کا

پھر دیکھتا ہے چشمِ حقارت سے تو مجھے
آتی ہے اب بھی مجھ سے قدامت کی بو تجھے

تمنّائیں

خانؔ ضبط ربّانی

(ذیل میں جو فن پارہ پیش کیا جا رہا ہے ان کا مصنف دیار رام پور کی ایک گمنام پیداوار ہے، خان ضبط ربّانی جو ظاہری آنکھوں سے پیدائشی محروم ہے آج غالباً پہلی بار کسی مطبوعہ ورق پر نظر آ رہا ہے آپ اس مادرزاد نابینا کا تصور کریں گے تو وہ آپ کو اتنی معلوم ہو گا؟ اس سے ملیں گے تو یہ چھتیس سینتیس سالہ سرخ لو انسان اپنی شائستگی گفتگو اور وسعت معلومات کے لحاظ سے آپ کے دل میں گھر کر لے گا! اس کے حالات سنیں گے تو یہ شریف پٹھان گھرانے کا مفلوک الحال فرد آپ کو پگھلا پگھلا دے گا! اور اس کا کلام پڑھیں گے تو یہ جوشیلا محبِ رسول آپ سے اپنی محبت منوا لے گا۔

اس سے زیادہ ایک فن کار کا اور کیا تعارف ہو سکتا ہے! آپ کو اگر اس کا کلام پسند آیا تو آئندہ بھی وقتاً فوقتاً انشاء اللہ اس کے فن پارے ہدیۂ نظر کئے جائیں گے ۔ ع - ص)

میری ہستی ترے جلووں کا خزینہ ہو جائے
گاہ دل مکہ بنے، گاہ مدینہ ہو جائے!

پُر مئے حُبِّ نبیؐ سے مرا سینہ ہو جائے
ہر رگِ سینہ کوئی خُم کوئی مینا ہو جائے

جان دے اور بہ دل، تیغ رضا پر، مسلم!
تاک وہ مرگ کہ تیرے لئے جینا ہو جائے

بحرِ اشکال میں کو داس کا سہارا لے کر
تو جو گھر جائے تو، گرداب سفینہ ہو جائے

عشقِ روئے نبویؐ میں ہوں میں ایسا اندھا
دیدۂ کور جو دیکھے مجھے، بینا ہو جائے!

خدمتِ دیں میں شب و روز کر اتنی محنت
خلط سے خون بنے، خون پسینا ہو جائے

کیا اُسے ربطِ سخن جس کو مرض سے اے ضبطؔ
لوٹتے لوٹتے ایک مہینا ہو جائے

اقبال پر ایک ترچھی نظر

میں کھڑا کر دیا ہے۔ ان کا عندیہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کا "مردِ مومن" (جو دراصل قرآن کا مردِ مومن ہے) ان مغربی مفکرین کے "HERO" "GENIUS" اور "SUPERMAN" وغیرہ کا چربہ ہے۔ حالاں کہ اقبال رح کا "مردِ مومن" اقبال کی تخلیق نہیں، یہ قرآن کا آئیڈیل ہے۔ ؎

یہ نکتہ کسی کو نہیں معلوم کہ مومن　　　قاری نظر آتا ہے، حقیقت میں ہے قرآن

اقبالؒ کے مردِ مومن کو سمجھنے کے لئے "فرنگی بت کدوں" میں گم ہونے کی ضرورت نہ تھی، قرآن میں ڈوبنے کی ضرورت ہے، پھر رسول اللہ اور ان کے ساتھیوں کی سیرتوں کے مطالعہ کی ضرورت ہے اور پھر اپنے آپ پر ایک نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ خودی کو "بلند" کرنے کا یہی طریقہ ہے اور اسی طرح سے آدمی "مردِ مومن" بنتا ہے۔ "فوق البشر" وغیرہ کا وجود ذہن سے باہر نہیں ہوتا۔

۵۔ تبسم صاحب فرماتے ہیں "اقبال کی ضربِ کلیمی کے لئے نظامِ فرعونی اور طلسمِ سامری ہونا اشد ضروری ہے" اقبال کے یہاں صرف ضربِ کلیمی ہی تو نہیں، اس کے پاس اور بھی بہت کچھ ہے، پھر اس نے "عہدِ حاضر کے فرعونوں کے خلاف اعلانِ جنگ" کر کے کوئی گناہ تو نہیں کیا ہے۔ اگر محض اس بنا پر نفسیاتِ دانی کی ترنگ میں اقبال رح کو "احساسِ کمتری" کا مریض قرار دیا جا سکتا ہے تو نعوذ باللہ انبیاء علیہم السلام کے لئے بھی یہی تشخیص متعین ہوتی ہے اور اسلام کا رکنِ اعظم "الجہاد" بھی اسی تشخیص کی لپیٹ میں آجاتا ہے، کیوں کہ جہاد کے لئے اقتدارِ طاغوت اور دارالحرب شرطِ اولین ہیں

ع :۔ بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است۔ کاش اقبالؒ کے کسی قادیانی مبصر کو بھی یہ نکتہ سوجھا ہوتا!

اصل میں یہ عبارت تنقید نگار نے انگلستان کے اسرائیلی مفکر "C. E. M. JOAD" کے ایک قول کے سہارے پر کہی ہے، جوڈ کو انھوں نے "مشہور ماہرِ نفسیات" کہا ہے۔ میں نے اس کی تین چار کتابوں اور کئی مقالوں کا مطالعہ کیا ہے۔ مجھے تو کہیں وہ ماہرِ نفسیات نظر نہیں آیا۔ بلاشبہ جدید افکار کی تمام اصناف پر اس کی نظر ہے اور بصیرانہ نظر ہے، لیکن اس کا میلان زیادہ تر نوافلاطونی (NEO-PLATONIC) طرزِ فکر کی طرف ہے، اس کا اقتباس آپ نے اس اہتمام سے پیش کیا ہے، جیسے کوئی آیت قرآنی یا حدیث کی کوئی مستند عبارت ہو۔ اور پھر کس طرح گویا اچھل کر فرماتے ہیں: "اب کیوں نہ ہم فلسفۂ خودی کو اقبال کے احساسِ کمتری کا ردِ عمل سمجھیں!" ــــ تبسم صاحب کو میرا مشورہ یہ ہے وہ جوڈ کی "GUIDE TO MODERN WICKEDNESS" کا بغور مطالعہ فرمائیں، میرا تو یہ اندازہ ہے کہ انھوں اقبال کے انگریزی خطبات کا بھی بالاستیعاب مطالعہ نہیں فرمایا ہے، اس کا ایک اقتباس کہیں سے دستیاب ہو گیا ہے۔ اس بدگمانی کی ایک معقول وجہ یہ ہے کہ منقولہ عبارت میں ایک جگہ فاش غلطی ہے۔ اصل نسخہ میں یہ غلطی نہیں ہے، اور اسی غلطی کی بنا پر قدرتی طور پر ترجمہ بھی غلط ہو گیا ہے[۵۶] . . . . یہ محض فروگزاشتیں نہیں ہیں، رہا یہ دعویٰ کہ اقبال کا تصورِ خودی، اقبالؒ کے "احساسِ کمتری" کی پیداوار ہے، غالباً استدلال کا سارا زور اس فقرے پر مرکوز ہے ". . . . . . OUR ONLY FEAR IS THAT" (بس ہمیں صرف یہ اندیشہ ہے کہ . . . .) حالاں کہ اقبال کا منشاء اس سے یہ ہے کہ تہذیبِ مغربی تہذیب کی خیرہ کن سطحیت سے گزر کر اس کی حقیقی داخلیت کا تجربہ حاصل کرنے آخر اس عہد میں کتنے ہیں جو مغربی شراب کی ایک بوند پی کر بھی ہوش میں ہوں! یہ اقبال کا ظرف ہے کہ وہ خم کا خم لنڈھائے بیٹھا ہے، لیکن کبھی بہکا نہیں۔ وہ "نژاد نو" میں بھی یہی ظرف پیدا کرنا چاہتا ہے اور اسے خبردار کرتا ہے کہ دیکھو! کہیں ایک گھونٹ ہی میں بہک نہ جانا ــــ اور ہمارے تنقید نگار صاحب فرماتے ہیں کہ اقبال "FEAR FLASHIA" (آسیب خوف) میں مبتلا ہے!

۶۔ ایک عجیب اعتراض یہ ہے کہ اقبال نے حیات کے صرف مثبت پہلو پر زور دیا ہے اور اس کے منفی پہلو کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اس طرح اس نے گویا زندگی کی کلیت پر ضرب لگائی ہے، اول تو پیامِ اقبال کی عمرانی اور تاریخی اضافیت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ دوسرے اگر زحمتِ نظر گوارا

۵۵ معزز علی بیگ صاحب نے بھی اس مقام پر یہی گرفت کی ہے (ف)

۵۶ معزز علی بیگ صاحب نے بھی اس کی نشان دہی کی ہے، اس لئے غیر ضروری تکرار سے بچنے کیلئے چند سطور اس مقام سے حذف کی جاتی ہیں۔ (ف)

اقبال پر ایک ترجمی نظر

ہو تو اقبال کے یہاں "خودی" کے مقابلہ میں "بے خودی" کے منفی تصور پر بھی لاتعداد اشعار کا دفتر بے پایاں موجود ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اقبال کا تصورِ "بے خودی" دراصل "اجتماعی خودی" کے مترادف ہے لیکن اس میں "فرد" کی "جماعت" کے اندر "گم شدگی" کا مفہوم بھی پوشیدہ ہے یقیناً اقبال کے "رموزِ بے خودی" میں شوپنہاؤر کی منفیت نہیں ملے گی لیکن "اسرارِ خودی" کے مقابلہ میں بہرحال اسے ایک منفی حیثیت حاصل ہے، البتہ مشینی عہد کے قنوطی نوجوانوں کے لئے یہاں وہ جاذبیت نہیں جس کی انہیں طلب ہوتی ہے۔

ناقدین کو چاہیئے کہ اقبال کے "اسرار و رموز" کا مکمل طور پر مطالعہ فرمائیں اور دیکھیں کہ جہاں اس نے انفرادی خودی کے اثبات پر زور دیا ہے وہاں ہیئت اجتماعیہ کی خاطر انفرادی بے خودی کی بھی تلقین کی ہے، اقبال کے یہاں یہ مثبت اور یہ منفی دونوں لہریں متوازی طور پر موجود ہیں، جدید مفکرین میں اور کسی کے یہاں یہ بات ہو تو اس کی نشان دہی کیجئے!

معلوم نہیں اس عبارت کا کیا مطلب ہے، "جہاں اقبال کے کلام کا کمال یہ ہے کہ اس نے مذہب، فن اور سائنس، تینوں کو ملا کر ایک نئے فلسفہ میں کمال حاصل کیا ہے، وہاں اس کے دوسرے رخ میں ان کے زوال کا ایک بھیانک عکس بھی نظر آتا ہے، کیونکہ مذہب، فلسفہ اور سائنس ایک دوسرے کے نقیض اس قدر ہیں کہ جس قدر ہیں۔ زندگی کا تضاد اور تناقض اس کا آہنگ ہے" —— اس عبارت سے سوائے چند بھاری بھرکم الفاظ کے اور تو کچھ پلے نہیں پڑتا، کچھ الفاظ اور ہوتے تو شاید مطلب واضح ہو جاتا، مثلاً قدیں، تحت الشعور، ماورائیت وغیرہ اسی قسم کی ایک عبارت یہ ہے: "افکار انسانی بہت حد تک جبلی سرچشموں سے متأثر ہوتے ہیں۔ لیکن یہ حقیقت کے معروضی ہونے کی دلیل نہیں"۔—— دو جملے ہیں اور دونوں میں کوئی معنوی ربط نہیں۔ معلوم نہیں "معروضیت" اور "عینیت" سے کیا مراد ہے، ہم تو یہ جانتے ہیں کہ نفسیات کی یہ دونوں اصطلاحات بالترتیب "OBJECTIVITY" اور "SUBJECTIVITY" کے مترادف ہیں، افکار انسانی پر جبلی سرچشموں کی اثر اندازی یقیناً حقیقت کے معروضی ہونے کے منافی ہے۔ یہاں "لیکن" کا کیا محل ہے!

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے نئے نقاد بعض قسم کے انشاپردازانہ تنقید نگاروں کے مقالے پڑھتے ہیں، انہی کے کچھ الفاظ و اصطلاحات اور کچھ جملے کے جملے ذہنوں میں محفوظ ہو جاتے ہیں، وہی ان کی تحریروں میں بے ساختہ آ جاتے ہیں، یہ مرض عام ہوتا جا رہا ہے، اگر ہم نے ابھی سے اس کا تدارک نہ کیا تو اردو میں اوریجنل اور صحت مند تنقید طفولیت کی موت مر جائے گی، اور دیکھتے ہی دیکھتے ہمارے اردو ادب پر "تنقید لطیف" کا ایک سندبن چھا جائے گا۔

تبسم صاحب اقبال کو "طبقاتی شاعر" کہتے ہیں، کہیں اس سے ان کی مراد "فرقہ پرست" تو نہیں! لیکن اگر "طبقات" کے خالص اشتراکی مفہوم کے مطابق انہوں نے یہ حرکت عمداً کی ہے، تو اس پر ہمارا کچھ کہنا ہی بے کار ہے، البتہ اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اگر انہیں پاکستان کی رائے عامہ کا خوف نہ تھا اور وہ "FEAR FLASH·A" میں مبتلا نہیں تھے تو انہوں نے کھل کر اپنا مسلک کیوں نہ ظاہر کر دیا یقیناً اس میں بھی کوئی نفسیاتی پیچ ہے!

(۸) اپنے آخری پیراگراف میں تبسم صاحب نے جس خیال کا اظہار فرمایا ہے اسے میں ڈاکٹر محمد حسن خاں صاحب کے ایک مقالہ مطبوعہ ماہِ نو میں گذشتہ سال پڑھ چکا ہوں، "اقبال نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا ہے کہ محض خودی کی اساس پر ایک نظامِ حیات برپا کیا جا سکتا ہے، وہ یہ ضرور کہتا ہے کہ "فقط خودی ہے خودی کی نگاہ کا مقصود" لیکن ہیئت اجتماعیہ کے لئے وہ "بے خودی" کا تصور پیش کرتا ہے، اور بات صرف اتنی ہی کی نہیں ہے کہ "فرد" اپنے وجود کو "جماعت" میں "گم" کر دے تو ایک ہیئت اجتماعیہ قائم ہو جائے گی، بلکہ اس کی تفصیلات میں بھی جانے کی ضرورت ہے، آپ "اسرارِ خودی" کی سرحلی تفصیلات کے ساتھ ساتھ "رموزِ بے خودی" کے تمام تدریجی مقامات پر بھی ایک نظر ڈال جائیں اور پھر دیباچہ "رموزِ بے خودی" کی اس عبارت پر غور کریں" . . . . حیاتِ ملیہ کا انتہائی کمال یہ ہے کہ افرادِ قوم کسی آئین مسلم

کی پابندی سے اپنے ذاتی جذبات کے حدود مقرر کریں، تاکہ انفرادی اعمال کا تباین اور تناقض مٹ کر تمام قوم کے لئے ایک قلب مشترک پیدا ہو جائے" ـــــ اس اقتباس میں جس "آئینِ مسلم" کا حوالہ دیا گیا ہے، اس کے متعلق خود اقبال یوں فرماتے ہیں :- ؎

تو همی دانی که آئینِ تو چیست! ‏ ‏ زیرِ گردوں سرِّ تمکینِ تو چیست
آں کتابِ زندہ، قرآنِ حکیم ‏ ‏ حکمتِ او لایزال است و قدیم
از یک آئینی مسلماں زندہ است ‏ ‏ پیکرِ ملت ز قرآں زندہ است

(۱) یہ بات کہ "آدمی مر میں ڈوب کر نکھر سکتا ہے، بدل نہیں سکتا" ـــــ ہے تو بڑی لطیف اور یہ اندازِ بیان بلاشبہ پروفیسر احتشام حسین جیسا ہے، لیکن دھوکہ تو اندازِ بیان ہی سے ہوتا ہے۔ بدلنے میں دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں یا تو ہم فوق البشر ہو جائیں یا تحت البشر بن جائیں، تیسری کوئی صورت نہیں لیکن فوق البشر انسانوں میں آج تک پیدا نہیں ہوا، اس کا انسانوں میں کیا کام! البتہ کرۂ ارض آج تحت البشر مخلوق سے بھرا ہوا ہے، فرد فرد کو کھا رہا ہے، قوم قوم کو ہڑپ کرنے کے درپے ہے اور بلاک بلاک سے ٹکرا رہا ہے۔ یہ دنیا درندوں کی دنیا بن گئی ہے، اگر بدلنا یہی ہے تو ہم ایسے بدلنے سے عاجز آ چکے ہیں اور فوق البشر بن نہیں سکتے۔ لہٰذا اصل علاج یہ ہے کہ ہم انسان بنیں اور اپنی انسانیت کو نکھاریں آپ نکھرنے کو خاطر میں نہیں لاتے، اور ہم آپ کی بات میں نہیں آتے، کیونکہ ہم "بدلنے" کا حشر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، انسانیت کو بدلنے اور مسخ ہونے سے بچانا ہے، اب اسے نکھارنے ہی کی ضرورت ہے۔

آج ہمیں اُس دستورِ حیات کی ضرورت ہے جو انسانیت کو پروان چڑھائے، بیشک وہ دستورِ حیات اقبال کا کلام نہیں ہو سکتا، میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ خود اقبال کے نزدیک وہ "آئینِ مسلم" ـــــ وہ دستورِ حیات اسلام ہے، اقبال کا کارنامہ صرف یہ ہے کہ اس نے ہمیں اس قابل بنایا کہ ہم اپنے آپ کو پہچانیں اور یقین و عشق کی شدت کے ساتھ اسلام پر عمل کریں، بیشک اس کے فلسفہ میں حرکت کا عنصر موجود ہے لیکن یہ وہ "حرکت" نہیں جو . . . پروفیسر عزیز احمد کو مارکس اور اقبال کے یہاں یکساں دکھائی دیتی ہے، حرکت اور ارتقاء کا صحیح مفہوم ذہن نشین کرنے کے لئے ہمارے ناقدین کو "عالمِ قرآن" کے متعلق ان اشعار پر غور کرنا چاہیئے، جنہیں اقبال نے "جاوید نامہ" میں بزبانِ افغانی یوں ادا کیا ہے ؎

لایزال و وارداتش نو بنو ‏ ‏ برگ و بارِ محکماتش نو بنو
باطنِ او از تغیر بے غمے ‏ ‏ ظاہرِ او انقلابِ ہر دمے

اقبال معصوم عن الخطا نہیں ہے، ضرورت ہے کہ خلوص اور متانت کے ساتھ ہم اس کی غلطیوں کی نشان دہی کریں، اب اس بحث کو ختم ہو جانا چاہیئے کہ اقبال کے یہ اشعار میر، غالب کے ان اشعار کے مقابلے میں ایسے ہیں اور ویسے ہیں، یا اقبال فلاں مغربی مفکر سے متاثر ہے اور اس کے فلاں فلاں تصورات نطشے، فشتے وغیرہ سے ماخوذ ہیں، کیونکہ معاملہ اب اقبال کی حد تک ہی محدود نہیں ہے، اس کا پیام اور اس کے افکار ایک پوری ملت پر اثر انداز ہو چکے ہیں، اس لئے اب نئے ناقدین پر بالکل نئی ذمہ داریاں عائد ہو گئی ہیں اب وہ اقبال کی شخصیت یا اس کی ذاتی خصوصیات سے بحث کر کے فنی عیاشی میں مبتلا نہیں رہ سکتے۔ اب تو انہیں اقبال کے پیام اور کلام کو انہی عمرانی قدروں کے معیار پر جانچنا اور پرکھنا ہے جن کا وہ خود علمبردار تھا اور وہ قدریں اس کی ذاتی ملکیت نہیں بلکہ اپنا تاریخی اور عمرانی مقام رکھتی ہیں، انہی ابدی قدروں کی بدولت اس کا پیغام ایشیا کی ایک کثیر آبادی کے بختِ خفتہ کو بیدار کر رہا ہے، ہمیں اب ایک ایک مقام پر انگلی رکھ کر یہ بتلانا ہے کہ اسلامی معیارِ قدر کے اعتبار سے یہاں یہ نقص ہے اور یہاں یہ خامی ہے، یہاں اقبال کا تصور نہایت واضح اور روشن ہے اور یہاں اس کا فکر مبہم اور دھندلا ہے، تضاد اور تناقض اس مقام پر ہے اور توافق اور سلامتی اس جگہ، بے شعوری میں الحاد . . . کے

یہ ملاّ، یہ مولوی!

نعیم صدیقی

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس شخص کو کیا کروں! میرا ضمیر کہتا ہے کہ اس کی عزت کرنی چاہئے، لیکن میری سیاست کہتی ہے کہ اسے گالیاں دینی چاہئیں۔ دل کہتا ہے کہ کاش کہ یہ میرا ہوتا اور میں اس کا ہوتا، لیکن دماغ کہتا ہے کہ مجھے اس کے مقابلے میں پورا متعصب اور ہٹ دھرم ہونا چاہئے۔
بہرحال مجھے اس پر غصہ آتا ہے کہ یہ مجھ سے اختلاف کیوں کرتا ہے، میرے دلائل اس کے سامنے کیوں شکست کھا جاتے ہیں۔ میری سیاست اس کے مقابلے میں احساسِ کہتری کا اثر کیوں رکھتی ہے ——— اور اس غصے کی وجہ سے میں اور کچھ نہیں کر سکتا تو اسے ملاّ کہتا ہوں، مولوی کا نام دیتا ہوں ——— حالانکہ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ یہ اُس معنی میں ملاّ مولوی نہیں ہے جس معنی میں میں اسے یہ لقب دیتا ہوں۔
یہ میری شرافت ہے کہ میں اتنے ہی پر اکتفا کرتا ہوں، ورنہ لوگ تو اس کو غدار اور دشمن کا جاسوس اور تخریب پسند تک کہہ گذرتے ہیں۔ اور وہ اچھا کرتے ہیں۔ آخر کیوں نہیں اس رَو میں بہتا جس میں ہم سب بہہ رہے ہیں، ہزاروں لاکھوں آدمی بہہ رہے ہیں، ہمارے معزز لیڈر اور محترم حکمراں بہہ رہے ہیں یہ زمانے کی حرکت کو روکنے کے لئے روڑے اٹکاتا ہے۔ تو آخر اسے ملاّ اور مولوی نہ کہا جائے تو اور کون سے الفاظ سے خطاب کیا جائے۔
کبھی کبھی مجھے خیال آتا ہے کہ جس معنی میں ملاّ اور مولوی کا لفظ میں اپنے اس دوست کے اوپر چسپاں کرتا ہوں یہ اس کا ہرگز مستحق نہیں ہے۔ میں درحقیقت جب یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ قدامت پرست، تاریک دماغ، پست ذہن، تنگ ظرف، تھڑدلا، کندۂ ناتراش، نامعقول، غیر منطقی، جذباتی، خیال پرست، جامد الفکر، باتونی، کام چور، اختلاف باز، بحث پسند اور کج فہم ہے تو میں اسے ملاّ کہتا ہوں۔ لیکن کہنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ایک شریف آدمی میرے سامنے سے گذرا اور میں نے اس پر تھوک دیا۔ راکھ کی ٹوکری اس پر الٹ دی، بدررو کی کیچڑ کے چھینٹے اس پر ڈال دیئے، اور پھر میری رائے اپنے متعلق خراب ہونے لگتی ہے۔ کہ میں بدتہذیب ہوں اور دیئے فکر میں فنڈہ پن کا مظاہرہ کرتا ہوں۔ پھر مجھے اس شخص پر رحم آنے لگتا ہے کہ یہ کتنا مظلوم شخص ہے جو یہ سارا کچھ خندہ پیشانی سے برداشت کرتا ہوا اپنا راستہ چلتا رہتا ہے۔

یہ ایک عجیب شخصیت ہے۔ اسے اپنے اوپر لفظ مولوی کے چسپاں ہونے کی ذرہ بھر پرواہ نہیں ہوتی کیونکہ کوئی احتجاج نہیں کرتا، بلکہ پورے وقار اور سنجیدگی سے اپنے وقف پر چلا جاتا ہے اور یقین رکھتا ہے کہ اسے دنیا کی کوئی تحقیر و تذلیل نہیں کر سکتی ——— اپنی عزت کو یہ کتنا اہم محسوس کرتا ہے۔
یہ مولوی لکڑوں کی بجائے اس نکالنے والوں کے دل کی تاریک گہرائیوں میں اتر کر اس کمزوری کو پا لیتا ہے جسے چھپانے والے بہت مہارت سے چھپائے رکھتے ہیں۔ غضب کا آدمی ہے یہ!

معاف کیجئے گا، ابھی تک جس شخص کے متعلق سنا رہا ہوں اس سے آپ کو متعارف تو کرایا ہی نہیں! آپ ہیں مولوی عبدالسلام ایم، اے ایچ ال ایم ایم اے ایم اے بھی ہیں ا

اس شخص کو مولوی کہنا ایک سیاسی مجبوری ہے، ورنہ کیا بتاؤں کہ یہ شخص کیا ہے!
اس سے عربی میں بات کیجئے، انگریزی میں تقریر کرایئے، اردو میں مقالات لکھوا لیجئے، کئی زبانوں کی اقلیموں پر اس کا جھنڈا گڑا ہوا ہے۔
اسے دفتر میں بٹھایئے تو بہترین قلم راں ہے، بزمِ ادب و شعر میں لے جائیے تو ذوقِ سلیم کا نمونہ، گفتگو کیجئے تو استدلال کا ماہر اور نکتہ آفریں

صاحبِ طرز، میدانِ کار میں آ جائیے تو چُست ہو کر، انتظامات پر مامور کیجئے تو ڈسپلن میں اسوۂ حسنہ کا مالک، سیاست میں دیکھئے تو بے باک سپاہی اور ستم یہ کہ مسجد میں ملاحظہ کیجئے تو صفِ اوّل میں معروفِ نماز ـــ بلکہ امامت و خطابت تک کی صلاحیتوں سے مسلح! یہ نماز من جملہ ان چیزوں کے ہے جس کی وجہ سے اس پر مولوی ملّا کے الفاظ چسپاں کرنے کا موقع ہاتھ آتا ہے۔ ورنہ اور کسی طرف سے اس پر ہاتھ ڈالنا آسان نہیں!

لباس وضع قطع، نشست و برخاست، خورد و نوش میں سادگی کے باوجود خوش ذوق! اوقات منظم، مصروفیات باقاعدہ، دوست احباب سے روابط میں انضباط۔ ان اوصاف کے ساتھ یہ شخص بہت ہی خطرناک ہو جاتا ہے۔ پھر اس کی ڈاڑھی، سلیقے سے ترشی ہوئی چہرے پر ایسی سجتی ہے کہ اپنا منڈا چہرہ حقیر نظر آنے لگتا ہے۔ پھر بھی ذرا "ڈھٹائی" سے کام لے کر ہیں اس کی داڑھی کو مولویت کا سائن بورڈ کہتا ہوں پھر ہمارے اس مولوی کا مطالعہ اتنا وسیع ہے کہ صرف اخبارات ہی پر نظر نہیں، بین الاقوامی بالخصوص پر تازہ ترین کتابیں اس کی نظر سے گذرتی ہیں، کمیونزم پر آخری لٹریچر یہ دیکھتا ہے، شعر و افسانہ تک کے ارتقا سے واقف ہے ـــ دوسری طرف قرآن پر نگاہ، حدیث سے وابستگی، اسلام کے مفکرین کے علمی کارناموں سے ربط، سیرتِ نبوی سے آگہی، خلافتِ راشدہ کی تاریخ پر عبور، تاریخ عالم کے ساتھ ملتِ اسلامیہ کی تاریخ کی سمجھ بوجھ! اسے معلوم ہے کہ اختلافی مسائل کیا کیا ہیں، اسلام کے متعلق غلط فہمیاں کس کس طرح پھیلائی گئی ہیں، فتنے کن کن سرچشموں سے پھوٹ کے نکلے ہیں ـــ چنانچہ گفتگو چھیڑ کے دیکھئے، سطحی مسائل سے فوراً یہ شخص آپ کو ان کی جڑ تک لے جائیگا۔ ایسے جیسے کوئی بچے کو انگلی پکڑ کر گھماتا پھرتا ہو۔ لیکن چونکہ اس کی گفتگو اسلامی فکر کی ترجمان ہوتی ہے، اور یہ ہر حال میں اپنی بحث کو قرآن کے کھونٹے سے باندھے رکھتا ہے، اس لئے ہمارے لئے موقع نکل آتا ہے کہ جھٹ سے اسے مولوی کہہ دیں۔ سو دلیلوں کا یہ ایک ہی جواب "امرت دھارا" کی طرح استعمال کیا جا سکتا ہے مگر یہ پسیجتا نہیں!

قدریں اس سے لرزتی ہیں، دستوریہ کو اس نے جولا رکھا ہے۔ کمیونسٹوں کی انتشار انگیزی کو روکنے کے لئے یہ موجود ہے، سرمایہ دار عناصر کے مظالم کا سدِّ باب کرنے کے لئے یہ سرگرم عمل ہے، جاہلی ادب کے خلاف یہ سینہ تانے ہوئے ہے! آخر کونسا مورچہ ہے جس پر یہ سپاہی نہ لڑ رہا ہو! ہم لوگ یہ سب کچھ دیکھتے ہیں اور پھر بھی مجبور ہوتے ہیں کہ اسے "مولوی" کہیں! اس کے سوا ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔

مولوی عبدالسلام کی قابلیت سے میرا تعارف ایک اخبار کے ذریعے ہوا جس میں آپ کے مقالات افسانے اور نظمیں شائع ہوتے تھے۔ میں اس کی جادو نگاری سے متاثر ہوا ہوں، لیکن چونکہ آپ سیاست میں میرے ہم نوا نہیں تھے، اس لئے میں نے مولوی کہہ کر ٹال دیا۔ آپ سوچئے تو سہی، میں جس پارٹی کو واحد نمائندہ سمجھتا ہوں، یہ صاحب اسے اسلامی نقطۂ نظر سے ملک کے لئے وبالِ دوش قرار دیتے ہیں۔ پھر انہیں مولوی نہ کہتا تو کیا کہتا۔

پھر میں نے اسے ایک ادبی حلقے میں افسانہ سناتے ہوئے دیکھا۔ افسانہ فن اور حسنِ ادا کی بہترین مثال تھا، اور میں نے دل ہی دل میں اس افسانے پر بہت داد دی، لیکن دوستوں میں اس قسم کا اعتراف کر کے نکو بننا مجھے کبھی گوارا نہیں تھا، لہٰذا میں نے زبان سے اس افسانے کو ملّا ازم کا مظہر قرار دیا

پھر ایک موقع آیا کہ میں نے اس شخص کو سیاست کے اسلامی پلیٹ فارم پر تقریر کرتے ہوئے سُنا۔ تقریر میں ٹھوس دلائل تھے، جذبات کی متناسب رنگ آمیزی تھی، الفاظ قرینے سے استعمال کئے گئے تھے، بیان کا بہاؤ اثر انگیز تھا، لیکن میں اگر اس تقریر پر سر دھنتا تو اس پارٹی کا کیا بنتا جس کی کونسل کا ایک رکن میں خود تھا۔ لہٰذا میں نے سر دھننے سے پرہیز کیا، داد کا کوئی کلمہ زبان پر نہیں آنے دیا، کسی بات سے اظہارِ اتفاق کرنے کی غلطی نہیں کی، بلکہ دل ہی دل میں دعائیں کرتا رہا کہ خدا کرے کہ کچھ غنڈے ہمت کریں اور جلسے میں گڑبڑ ڈال دیں، ورنہ یہ تقریر بڑی زہریلی ہے اور کتنے ہی اپنوں کو بیگانہ بنا دے گی، لیکن غنڈہ گردی کے شیطان کو بھی اس تقریر کے دوران میں سانپ سونگھ گیا۔ آخر میں نے خود ہی ہمت کر کے سوالات کی اجازت چاہی اور سوالات کرنے کے بہانے کچھ کا کچھ کہہ دیا۔ میں نے کہا کہ آپ مولوی لوگ ملک کی ترقی کو روکنا چاہتے ہیں، آپ کو اقتدار کی ہوس ہے، تھیوکریسی کی لعنت مسلط کرنا چاہتے ہیں، آپ کے پاس چوروں کے ہاتھ کاٹنے کے سوا اور کوئی پروگرام نہیں ہے، آپ نے پاکستان بننے میں معاذ اللہ ـــ

وغیرہ! لیکن مولوی عبدالسلام نے کسی گھبراہٹ کے بغیر ایسے طریق سے جواب دیئے کہ پورا مجمع اٹھا اور متاثر ہوگیا — لیکن جناب ہم بھی کبھی کو یہاں نہیں کھینچے ہم نے حسنِ جواب کا ذرہ بھی اعتراف نہیں کیا، بلکہ جہاں ذکر آیا یہی کہتے پھرے کہ رات مولویوں کا جلسہ تھا اور مولویانہ تقریر ہوئی تھی۔

پھر ایک مرتبہ میں نے اسے جلسہ کا انتظام کرنے والے کارکنوں میں دیکھا۔ یہ صاف ستھرے ذوق کا آدمی — ریاضی کا ایم اے — اپنے ہاتھ سے صفاں بچھا رہا تھا! چاہیئے تھا کہ ہم اعتراف کرتے کہ یہ نہ محسوس کریں کہ یہ نمونہ۔ لیکن ہم نے یہ حماقت نہیں کی۔ بلکہ فقرہ چست کیا تو یہ کہ آخر مسجد کی چٹائیاں بچھانے والے اور کر ہی کیا سکتے ہیں — اور اس فقرے پر اپنے دوستوں میں خوب قہقہہ اڑا!

پھر میں نے عبدالسلام کو کشمیر فنڈ اکٹھا کرنے کے لئے در بدر پھرتے دیکھا۔ صاحب! غضب ہے کہ یہ شخص اتنا بڑا آدمی ہو کر ہمارے ایک عام رضاکار کی طرف خود گلیوں کے چکر لگاتا رہا۔ خود ہی لیڈر خود رضاکار! مگر میں نے اس مثالی کردار کی قدر و قیمت گھٹانے کے لئے جو رائے قائم کی وہ یہ تھی کہ مولوی ہمیشہ سے چندہ خور رہا ہے، اور اس فن کا وہ پرانا ماہر ہے۔ لہذا یہ کوئی ایسی بات نہیں جسے قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ جسے ایک مرتبہ مولوی کہہ دیا پھر اس کی کوئی سنہری حرکت بھی قابلِ قدر نہیں ہو سکتی۔

اس کے بعد حال ہی واقعہ ہے کہ میں نے مولوی عبدالسلام کو سیلاب زدوں کی مدد کے لئے ریلیف ورک کرتے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ایک وقت میں یہ موٹر میں بیٹھے خود ہی پبلک سے تعاون کی اپیل کر رہے تھے، دوسرے وقت میں ان کو گھر گھر سے پرانے کپڑے، غلہ اور آٹا قربانی کی کھالیں، ادویات وغیرہ جمع کرتے دیکھا۔ آپ ایک ... لئے گھوم رہے تھے۔ پھر وہ سماں بھی دیکھا کہ گلے گلے تک پانی اور کیچڑ میں کہیں تیرتے، کہیں چلتے آپ شاہدرہ سے آنے کے ایک دور افتادہ گاؤں کی طرف مدد پہنچانے جا رہے ہیں۔ پتہ ہے یہ ڈرامہ کیوں کھیلا جا رہا ہے، تاکہ عوام کو متاثر کر کے ان کے ووٹوں سے مولویوں کی حکومت قائم کی جا سکے۔

ہاں ہاں! — خوب یاد آیا! بڑے ہی موقعے پر اس فقرے نے واقعات کی کڑیاں ملا دی ہیں۔ یہ مولوی عبدالسلام تو وہ ہیں جن کو ہم بہت پہلے سے جانتے ہیں — ٹھیک ٹھیک! یہ وہی ہیں!

یہ ایک زمانے میں ہندو مسلم فسادات کی روک تھام کے لئے کام کیا کرتے تھے۔ بھائی واقعہ یہی ہے کہ بڑے بڑے نازک موقعوں پر مولوی صاحب نے کمال کر دکھایا ہے۔ آپ انتہائی کھچاؤ کی حالت کو امن کی فضا میں بدل دیتے رہے ہیں۔ آپ نے اپنے گاؤں میں، بلکہ آس پاس کے علاقے میں مار دھاڑ نہیں ہونے دی۔ لیکن دوسری طرف، اگر سیاسی نقطۂ نظر سے سوچیں تو انہوں نے بڑا خطرناک پارٹ ادا کیا ہے۔ یہ چونکہ مولوی تھے اس لئے موقعے کو سمجھے بغیر اخلاق پر وعظ کہتے پھرے۔ نتیجہ یہ کہ دوسرے علاقوں میں ہزاروں مسلمان قتل ہو گئے۔ لیکن انہوں نے اپنے علاقے کے مسلمانوں کو غیر مسلموں پر ہاتھ صاف نہیں کرنے دیا۔ یہ تو دراصل قوم سے ایک طرح کی غداری تھی جس نے مولویانہ روپ اختیار کر لیا تھا۔ یہ بالکل وہی عبدالسلام ہیں!

ایک بات اور جب دو قومی تصادم آخری حد کو آ پہنچا اور خود مسلمان خطرے میں مبتلا ہو گئے تو اس وقت میں بھی گھوم تماشا ان کے ہاں پہنچ گیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ خطرے کے سامنے جس بے پناہ انداز سے یہ مولوی عبدالسلام ڈٹ گیا تھا اور جس طرح اس نے اپنے عوام کو فوجی ڈسپلن میں کس دیا تھا اس کا تصور کر کے حیرت ہوتی ہے۔ مولوی عبدالسلام اس وقت فوجی وردی پہن برچھی ہاتھ میں لئے جس طرح علاقے بھر کے جمع شدہ مسلمانوں کی کمان سنبھالے ہوئے تھے اس کا خیال آتا ہے تو شرم محسوس ہوتی ہے کہ ہم کس آدمی کو مولوی کہہ رہا ہوں! مگر کریں کیا سیاست میں اگر ایسے ایسے شاعرانہ جذبات کا لحاظ کیا جائے تو سارا گراف تباہ ہوتا ہے۔ اور یہ اصول یاد رکھنا چاہئے کہ مولوی ہر حال میں مولوی ہوتا ہے چاہے وہ کتنی ہی جانبازیاں دکھاتا پھرے۔

یقیناً یہ مولوی عبدالسلام صاحب والٹن کیمپ میں بھی کام کر چکے ہیں۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ مولویوں کی ایک ٹولی میں یہ بھی تھے۔ معلوم ہے وہاں یہ کرتے کیا تھے! — ان لوگوں نے بے سرو سامانی کے باوجود لوگوں کی کچھ نہ کچھ خدمت کی ہے۔ ایک کارنامہ تو ان کا بھلایا نہیں جا سکتا، اور وہ یہ کہ جب

یہ ملّا یہ مولوی

میضے سے اموات ہو رہی تھیں اور لوگ اپنے رشتہ داروں کو بیمار پڑتے ہی چھوڑ کے بھاگ جاتے تھے۔ اس وقت گندگی میں لتھڑے ہوئے مریضوں کو سنبھالنا اور ان کے علاج اور تیمارداری کا سامان کرنا انہی لوگوں کا حصہ تھا۔ علاوہ بریں جب بے شمار لاشیں پڑی تھیں اور بڑے سے بڑے معاوضے پر بھی کوئی ان کے دفن پر تیار نہیں تھا تو مولوی عبدالسلام اور ان کے ساتھیوں نے رضاکارانہ طور پر یہ خدمت اپنے ذمے لی اور اس کا حق ادا کیا! مگر آپ خود سوچ لیجیے کہ ہے ناں یہ مولویانہ کام؟ مردوں کی تجہیز و تکفین میں مولوی سے زیادہ باکمال اور کون ہوگا!

والٹن کیمپ سے کام کرتے کرتے ایک دن اچانک سارے مولوی عبدالسلاموں نے اپنا دفتر سمیٹا اور کیمپ کو الوداع کہہ گئے۔ بعد میں کسی دوست سے معلوم ہوا کہ واقعہ یہ رونما ہوا کہ ان کے ذمے رفیوجی بچوں اور بیماروں میں دودھ تقسیم کرنے کا کام تھا۔ بدبختی سے کیمپ کمانڈر کے عملے نے کہیں ان سے چائے کے لئے دودھ کے چند قطروں کا مطالبہ کیا۔ ایسے موقع پر ہم ہوتے تو جوئے شیر بہا دیتے، لیکن عبدالسلام اینڈ کمپنی نے کورا جواب دیا اور بڑی سخت پتھریلے طریق سے فرمانے لگے کہ کسی رفیوجی بیمار یا بچے کے علاوہ دنیا کے کسی لاٹ صاحب کو بھی یہاں سے دودھ کا ایک قطرہ تک نہیں مل سکتا۔ ہے ناں یہ مولویانہ خشکی؟ چنانچہ کیمپ کے منتظمین نے ان خطرناک لوگوں سے جان چھڑائی کہ جایئے صاحب آپ ذرا نہیں پڑھیئے آپ کو ان معاملات سے تعلق۔ بس ناٹ پیٹ دیا گیا۔ مولوی ہونے کی وجہ سے نہ خود دودھ پی سکے، نہ کسی کو پینے دیا۔

واقعات خوب یاد آ رہے ہیں۔ ستمبر ۱۹۵۳ء کا واقعہ ہے کہ ایک دن میں صبح صبح اٹھ کر سبزی منڈی کی طرف جو آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ چند مولوی بیلچے لئے غلاظت کے ڈھیر گاڑیوں میں ڈال رہے ہیں۔ ان مولویوں کے چہروں میں سے ایک اجلا چہرہ مولوی عبدالسلام صاحب کا بھی تھا۔ میں آنکھ بچا کے نکل گیا کیونکہ یہ موقع ملاقات کے لئے موزوں نہ تھا۔ لیکن ان حضرات کے اس کارنامے کی کوئی وقعت میرے دل میں قائم نہیں ہو سکی۔ گندگی اور مولوی، دونوں چیزیں ایسی ہیں کہ ان کے تصور سے مزاج میں تکدر آ جاتا ہے اور زندگی کی دلچسپیوں سے دوری پیدا ہوتی ہے۔

پھر جناب مولوی عبدالسلام کو میں نے مطالبۂ نظام اسلامی کی منظم تحریک چلاتے دیکھا، پھر اسے انقلابِ قیادت کا جھنڈا اونچا کرتے دیکھا ہے، پھر انتخاب کے لئے رائے عام کی تربیت کرتے دیکھا ہے، پھر خاموش مظاہرۂ احتجاج کرتے دیکھا ہے، پھر اسے اپنے اخبار کی نمائندگی کرتے بلکہ ہاکر بنے ہوئے بھی دیکھا ہے ——— اور سب کچھ دیکھ کر یہ رائے قائم کی ہے کہ یہ بڑا خطرناک شخص ہے۔ اس کا مقابلہ کرنے کی اور کوئی تدبیر اس کے سوا نہیں ہے کہ اسے مولوی اور ملا کہا جائے، اور بار بار کہا جائے!

چنانچہ مولوی عبدالسلام اور اس کی طرح کے دوسرے لوگوں کو میں، میرے لیڈر، ملک کے گورنر، وزرا، صحافی اور ادیب سب کے سب مولوی اور ملا کہہ کے اپنے آپ کو خطرے سے بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

لیکن اندیشہ یہ ہے کہ کہیں مولوی اور ملا کے الفاظ عبدالسلام پر استعمال ہو کر خود معزز نہ بن جائیں۔ اور ان کی گالی ہونے کی حیثیت سرے سے ختم ہی نہ ہو جائے۔ یہ ہے اصل معاملہ جو سنجیدہ غور و فکر کا طلبگار ہے۔

تاہم جب تک یہ حقیقہ الکند نہ ہو جائے عبدالسلام کو میں برابر مولوی اور ملا کہتا رہوں گا اور پاکستان کے ہر خیرخواہ اور سر سچے مسلم لیگی اور ہر ترقی پسند ذہن رکھنے والے سے میں اپیل کرتا ہوں کہ وہ بھی عبدالسلام کے لئے یہی لقب استعمال کرے!

حقائق زمانہ

(عبدالرحمٰن صاحب فیروزپوری)

پستیوں میں مبتلا ہے آدمیت کا وقار
آدمی اس گلستاں سے چاک داماں لے چلا
ہے مزاجِ دہر یکسر تلخیوں سے ہمکنار
وقت کا انداز اپنے ساتھ طغیاں لے چلا
غالباً یہ نشۂ فرعونیت کا ہے قصور
مجرمِ تہذیب دل میں ذوقِ عصیاں لے چلا
اک نئے ماحول کی تخلیق کرنے کے لئے
ذوقِ پروازِ تخیل عزم و پیماں لے چلا
عشرتِ شبگاہ کا انجام ہے کتنا مہیب
سونے والا محشرِ خوابِ پریشاں لے چلا
معصیت کے زمزموں سے یہ فضا معمور ہے
جو چلا اس میکدہ سے ذوقِ عصیاں لے چلا
زلزلے کی زد میں ہے اس وقت کاخِ ناؤنوش
وقت شائد تلخیٔ شامِ غریباں لے چلا
ظلمتیں چھٹنے لگی ہیں پردۂ آفاق میں
حق جو اپنے ہاتھ میں شمعِ فروزاں لے چلا
کانپ اٹھا قصرِ باطل لاالہ کی ضرب سے
بندۂ حق، ہاتھ میں اب تیغ براں لے چلا
رقص فرما ہے اجل، اب تو جہانِ ظلم پر
بندۂ طاغوت، دل میں یاس و حرماں لے چلا
آج ساقی کی نوازش جس پہ حِصّہ ہوگئی
کائناتِ عشق میں وہ کیفِ عرفاں لے چلا،

اکبر کا تصوّرِ مذہب

نعیم صدیقی

اس موضوع پر جتنی تیاری میں نے کی تھی اس کے مقابلے میں یہ مختصر مقالہ بہت ہی محدود نظر آتا ہے۔
لیکن مجھے ایک ضرورت کے لئے یہ مقالہ بالکل قلم برداشتہ ایک ہی نشست میں لکھنا پڑا۔ اب اتنا وقت نہیں
کہ اسے ادھیڑ کر دوبارہ مرتب کیا جائے۔ لہٰذا جو کچھ ہے اہلِ نظر کی خدمت میں ہدیہ ہے۔

اکبر الٰہ آبادی ان گرامی قدر شعرا میں سے ہے جنہوں نے اردو شاعری کو کچھ بار اور کچھ سے کی قید سے نکال کر عملی زندگی کی پنہائیوں میں لانے کے لئے بہت بڑا حصہ ادا کیا ہے۔ اکبر کا ایک انفرادی رنگ ہے اسکے اپنے مخصوص جذبات و احساسات ہیں اور ان جذبات و احساسات کو پیش کرنے کے لئے اس کا ایک خاص اسلوب ہے۔ وہ ہماری قومی زندگی کے دو دوروں کے درمیان ایک مقام اعراف پر کھڑا ہو کر اس ساری لڑائی کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے جو ہماری مخصوص معاشرتی روایات اور مغربی تہذیب کے درمیان لڑی گئی۔ اس لڑائی میں اکبر محض تماشائی نہ تھا بلکہ اس نے اپنے سرمایۂ روایات کے تحفظ میں برابر زخم کھائے ہیں اور اتنے زخم کھائے ہیں کہ وہ آخر کار بالکل بے دم ہو کر گر پڑا ہے۔

افسوس کہ اس حیثیت سے اکبر کے مقام کا جائزہ لینے کا حق ادا نہ کیا جا سکا۔ بس اس کے سرمایۂ شعر میں سے اگر کچھ چیزیں عوام کے سامنے ہیں تو ایسے مزاحیہ انداز کے اشعار جن کا انتخاب وقتاً فوقتاً مختلف رسالوں میں شائع ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکبر ایک سنجیدہ شاعر کی حیثیت سے متعارف ہو نہیں سکا بس وہ اپنے دور کا حاجی "لق لق" سمجھا جاتا ہے۔ اس کی حیثیت شاعر کی کارٹون بنانے والے شاعر کی سی بنا کر رکھ دی گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ طوفانِ مغرب کو اکبر نے کبھی کبھی اتنا کمزور سمجھا ہے کہ پھبتیاں اور فقرے اس کے روکنے کے لئے استعمال کئے ہیں؛ مگر وہ فی الحقیقت ایک سنجیدہ ——— اور سنجیدہ ہی نہیں ایک نوحہ خواں قسم کا شاعر ہے۔ وہ ایک "ماتمِ تبسم"، ایک "اشکِ خنداں"، ایک قنوطی مزاح اور نشتر جیسی طنز کے سوا اور کچھ نہیں رکھتا۔

طوفانِ مغرب کو چونکہ اکبر ایک وطن پرست کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک مسلمان کی حیثیت سے چیلنج کرتا ہے۔ اس لئے اسلامی نظریۂ ادب کے علمبرداروں کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ اکبر کے تصورِ مذہب کا جائزہ لیں۔ اس مقالے کا مدعا یہی ہے۔

اکبر کا تصورِ مذہب پوری طرح واضح اس صورت میں ہو سکتا ہے جب کہ اس ماحول کی پوری تصویر آنکھوں کے سامنے ہو جس میں اکبر کی شاعری پروان چڑھی ہے اور اس کشمکش کا نقشہ واضح ہو جو مغلیہ تہذیب کے باقیات اور مغربی تہذیب کی قدروں کے درمیان واقع ہوئی۔ آیئے اکبر کے ذہن پر اثر انداز ہونے والے حالات کا عکس خود اسی کے آئینہ شعر میں دیکھیں۔ مگر اکبر کا مطالعہ کرنے چلے ہیں تو لحاظ رہے کہ:

مشکل ہی سے یہ حالتیں سہی جاتی ہیں ۔۔۔ پھانسیں ہیں کہ قلب میں رہی جاتی ہیں
تفصیل سے نہ پوچھ ہیں اشارے کافی ۔۔۔ یونہی ہی یہ کہانیاں کہی جاتی ہیں!

اکبر کے سامنے کوئی محدود تبدیلی نہ تھی، بلکہ زمین و آسمان بدل رہے تھے:

جہاں نے ساز بدلا، ساز نے نغموں کی گت بدلی ۔۔۔ گگن نے رنگ بدلا، رنگ نے یاروں کی مت بدلی

اکبر کا تصورِ مذہب

فلک نے دور بدلا، دور نے انسان کو بدلا — گئے ہم تم بدل! قانون بدلا! سلطنت بدلی

خالی حرم کو شیخ ہی تنہا نہ کر گئے — حیرت میں بت بھی ہیں کہ برہمن کدھر گئے
سودائے مغربی میں ہیں سب کے حواس گم — ایسی یہ تپ چڑھی ہے کہ چہرے اتر گئے
آیا وطن میں پھر کے، مگر اس کی کیا خوشی — جن جن کو پوچھتا ہوں 'یہ سنتا ہوں مر گئے!

چشمِ بتاں نے نفس کی خواہش ابھار دی — دنیا ہماری دشمنِ دیں نے سنوار دی
لذت خدا کے نام میں کچھ کم نہ تھی مگر — پیشِ شکم زباں نے ہمت ہی ہار دی

وہ خوش کہ کرونگا ذبح اسے یا قیدِ قفس میں رکھوں گا — میں خوش کہ یہ طالب تو ہے مرا! صیاد سہی! جلاد سہی!

مرے صیاد کی تعلیم کی ہے دھوم گلشن میں — یہاں جو آج پھنستا ہے وہ کل صیاد ہوتا ہے

ہم کو نئی روش کے حلقے جکڑ رہے ہیں — باتیں تو بن رہی ہیں اور گھر بگڑ رہے ہیں
ذاتی ترقیاں ہیں، قومی ہے یا تنزل! — گرہیں یہ کھل رہی ہیں یا پیچ پڑ رہے ہیں
چلتی تو ہیں زبانیں اور بھرتے ہیں شکم بھی — لیکن امید کیا ہو جب دل اجڑ رہے ہیں

گردوں نے ہم کو لقمہ اس کا بنا دیا ہے — تہذیبِ مغربی کے معدے میں ہم پڑے ہیں
شخصیتیں جو اکثر تم دیکھتے ہو باقی — کیلوس ہو رہا ہے، لقمے بڑے بڑے ہیں

آنکھیں ساقی کی تھی رسیلی — اب تک بچا تھا! آج پی لی
پھاڑے مغرب، نقابِ نسواں — مشرق نے تو اپنی آنکھ سی لی

ترقی کی نئی راہیں جو زیرِ آسماں نکلیں — میاں مسجد سے نکلے اور حرم سے بیبیاں نکلیں

مصیبت ہے مجھے اس بت سے الفت ہو گئی اکبر — کہ جس کو بت کدے میں بھی کوئی اچھا نہیں کہتا

کارگر اس بت کی تدبیریں بالآخر ہو گئیں — گو ہوں مسلم خواہشیں میری بھی کافر ہو گئیں

اکبر کا تصورِ مذہب

انہی کے مطلب کی کہہ رہا ہوں — زبان میری ہے بات ان کی
انہی کی محفل سنوارتا ہوں — چراغ میرا ہے رات ان کی
فقط مرا ہاتھ چل رہا ہے — انہی کا مطلب نکل رہا ہے
انہی کا مضمون، انہی کا کاغذ — قلم انہی کا، دوات اُن کی

بت سے مراسلت ہے تو شوقِ سادہ چھوڑ — ناخوش کہیں نہ ہوں وہ خطِ مستعار پر
شکر خدا کہ شرم کی تکلیف سے بچے — یاروں کی اب تو بھیڑ ہے مٹی کی دکان پر

منہ ہم سے لگاتا ہی نہیں وہ بتِ کافر — کہتا ہے یہ اللہ سے انکار تو کر لیں

حریفوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں — کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

ناز سے اس بت نے دیکھا شیخ کو — ان کی دینداری ہی رخصت ہو گئی

دلِ ضعیف کو چارہ نہیں ہے کفر سے اب — اگر زبان مسلمان رہ سکے تو رہے

مجھ سے سید یہ کہتے ہیں کہ نیچی رکھ نظر اپنی — کوئی ان سے نہیں کہتا نہ نکلو یوں عیاں ہو کر

وہ دورِ چرخ آ رہا ہے اکبر کہ اہلِ تقویٰ ہیں زار و مضطر — بزرگ بھی طفل وار ان کو اپنے سکھا رہے ہیں گناہ کرنا

کچھ ایسا بڑھ گیا ہے حسنِ لطفِ ساقیٔ دوراں — ہزاروں شیشۂ تقویٰ پڑے ہیں چارسو ٹوٹے

ایک حساس شاعر دیکھتا ہے کہ سلطنت مٹ گئی، روایات پامال ہو رہی ہیں، قدریں الٹ رہی ہیں، عزت و ذلت کے معیار بدل رہے ہیں، خیر و شر کی ترتیب ادھڑ رہی ہے ——— اور پھر وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ جو مٹانے والا ہے وہی مرجعِ الفت بن رہا ہے، دماغ اور دل اسکے قبضے میں جا رہے ہیں، اکابر اس کے آلۂ کار بن رہے ہیں، فضا ایسی ہے کہ کسی کے لئے اپنے اصولوں پر جم کے رہنا ممکن نہیں رہا، اچھی اچھی چٹانیں اپنی جگہ سے سرک رہی ہیں تو وہ جھنجھلاتا ہے، وہ پیچ و تاب کھاتا ہے، وہ غیرت کا احساس دلاتا ہے مگر زمانے کی رو اس کے سر کے اوپر سے گذر جاتی ہے۔

اکبر ایسے تباہ کن ریلے کے سامنے کھڑا ہو کر جب اپنی تہذیب و معاشرت کے ٹوٹتے ہوئے قلعے کو دیکھتا ہے تو اس زندگی کے تضاد کی تباہ کن [illegible] پہچانتا ہے جس نے ایک مضبوط طاقت کو کھوکھلا کر دیا۔ دیکھئے وہ اس تضاد کو کس طرح اجاگر کرتا ہے۔

[illegible] تو سب کے تئے ہیں — ع [illegible] مشکل ہے

اکبر کا تصورِ مذہب

وصل ہو یا فراق ہو اکبر! جاگنا ساری رات مشکل ہے

تمہارے مذہبی دعوے جو کچھ ہوں، میں یہ دیکھوں گا عقیدوں کا اثر فکرِ معیشت پر کہاں تک ہے؟

غوطے تو لگائے زمزم میں اور غرق ہیں حبِّ دنیا میں پانی نے بدن کو پاک کیا! اب جان کو طاہر کون کرے
مذہب کی ہے دھوم اور ساتھ اسکے اعمال نہیں اخلاق نہیں چپ چپ کی صدا ہے چار طرف! اس راز کو ظاہر کون کرے
اک علم تو ہے بت بننے کا! اک علم ہے حق پر مٹنے کا اس علم کی سب دیتے ہیں سند! اس علم میں ماہر کون کرے
جب علم ہی عاشقِ دنیا ہو پھر کون بتلائے راہِ خدا جب خضر اقامت پر ہوں فدا! تائیدِ مسافر کون کرے

مقابل غیر مذہب کے تو مذہب جوش رکھتا ہے عموماً ورنہ اپنے آپ کو بے ہوش رکھتا ہے

یہ مدعیٔ اسلام تو ہیں ساتھی ہیں مگر بیگانوں کے
تقویٰ کی وہ بو ہی ان میں نہیں، وہ رنگ نہیں ایمانوں کے

عجب اصول ہیں رندانِ عشق کے اکبر گناہ کرتے ہیں اور طالبِ ثواب بھی ہیں!

مصلحِ قوم ہوں امت کے نگہبان بنیں پہلے للہ مگر خود تو مسلمان بنیں

مسلماں تو وہ ہے جو ہے مسلماں علم باری میں کروڑوں یوں تو ہیں لکھے ہوئے مردم شماری میں!

صبر، خودداری، دلیری، حق پرستی اب کہاں رکھ لیا اچھا سا اک نام اور مسلماں ہو گئے
جو کہا اس نے کیا منظور! کیا حرفِ نفی ہم سراپا اب تو اس محفل میں "جی ہاں" ہو گئے

بتوں سے میل خدا پر نظر یہ خوب کہی شبِ گناہ و نمازِ سحر یہ خوب کہی!

نظر میں آیۂ ایاک نستعین بھی رہی صنم کے پاؤں میں لیکن مری جبیں بھی رہی

کفر کی زینت بھی ہے دل میں بتوں کی چاہ بھی کہتے جاتے ہیں مگر منہ سے معاذ اللہ بھی

اکبر کا تصور مذہب

اس بُت نے کہا یو سنہ بے اون پہن کر　　　بس دیکھ لیا آپ کا ایماں یہی ہے !

یہ تضاد جس کے مناظر اکبر کے گرد چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے، اس کا جامع ترین کردار وہ شیوخ و زہاد کے اندر سے تلاش کر کے لاتا ہے اور بڑی بے باکی سے پیشوایان دین کی نمائشی سیرت کی قبا پہ ہاتھ ڈالتا ہے سنئے :-

یہ قسمت شیخ جی کی ورنہ اکبر!　　　کجا وہ بُت، کجا آمنتُ باللہ !

رنگِ زمانہ، طرزِ طبائع کا بھی ہے پاس　　　تقویٰ کا گو خیال بہت ہے جناب کو
مرعوب ہو گئے ہیں ولایت سے شیخ جی　　　اب صرف منع کرتے ہیں دیسی شراب کو

میرا مسلک کچھ جدا ہے شیخ کے اسلام سے　　　یاں خدا سے کام ہے اسکو خدا کے نام سے

حدیث و فقہ پڑھ کر شیخ بننا خوب ہے لیکن　　　زمین و آسماں کو دیکھ کر پہلے مسلماں ہو
اکبر اس تباہ کن تفرقہ سے بھی متاثر ہوتا ہے جو مسلمانوں کی سیاسی زندگی کے ساتھ معاشرتی اور مذہبی بندھن ٹوٹ جانے سے پھیلنے لگا۔ جب ایک چمن کا کوئی مالی ہی نہ رہا تو اس میں ہر طرح کے جھاڑ جھنکار کے لئے موقع تھا جدھر چاہے پھیلے۔ وہ اس حالت پر یوں نوحہ کرتا ہے۔

تفرقوں کے یہ جو طوفاں ہیں بپا کچھ کم تو ہوں　　　ہم کو کرنا چاہئے سب کچھ مگر ہم، ہم تو ہوں۔

صاف کہتا ہوں رہیں خوش یا ہوں ناخوش مولوی　　　آسماں اب چاہتا ہے مولوی کُش مولوی

مخالفین کو ہم تو کہہ دیتے ہیں کافر　　　مگر یہ ڈرتے ہیں دل میں ہمیں نہ کافر ہوں
اکبر کا تصورِ مذہب جو کچھ بھی تھا، اپنے ساتھ جوہرِ غیرت بہرحال رکھتا تھا۔ وہ دین اور قوم اور اپنی روایات کے لئے ایک مجموعی جذباتی حمیت کا عجب مظاہرہ کرتا ہے۔ دراصل غیرت و حمیت جو تعصب سے مختلف ایک چیز ہے وہ واحد قوت ہے جو اغیار کے سیاسی و تہذیبی غلبہ کے خلاف ڈھال کا کام کرتی ہے۔ یہ ڈھال کمزور پڑ جائے تو پھر قومیں بری طرح شکست کھاتی ہیں اور ان کو بچایا نہیں جا سکتا۔ چنانچہ اسلام دنیا کے ہر مذہب سے زیادہ اپنے ماننے والوں کو غیرت و حمیتِ دینی کا درس دیتا ہے۔ جیسے کہ بنی اسرائیل کو کہا گیا تھا کہ "خداوند تمہارا خدا غیور خدا ہے" بالکل اسی معنوں میں اسلام ایک غیور دین ہے۔ اس کا پرتو چاہے کسی پہ کتنا ہی دھندلا پڑے یہ بے غیرتی کو گوارا نہیں کرتا۔ چنانچہ اکبر میں غیرت و حمیت کا جو جوہر موجود تھا وہ اس کے شعر میں یوں نمودار ہوا ہے۔

ہر درِ میخانہ اکبر کے لئے دلکش نہیں　　　بادہ صافی چاہئے اور ظرف عالی چاہئے

بتکدے میں شور ہے، اکبر مسلماں ہو گیا　　　بے وفاؤں سے کوئی کہہ دو کہ ہاں ہاں ہو گیا!

اکبر کا تصورِ مذہب

نازکیا اس پہ جو بدلا ہے زمانے نے جنہیں
مرد وہ ہیں جو زمانے کو بدل دیتے ہیں

ان کی آنکھوں کی خطا کیا خود ہیں ہم الفت پہ مست
آپ ہم ایمان چھوڑیں تو یہ کافر کیا کریں !

کیا تھا شمعِ حرم تو نے بجھا دی اے دوست
دیر کے شعلہ زبانوں نے تجھے داد تو دی

مشکل ہی کیا ہے گرنا پائے بتاں پہ رو کر
لیکن میں پاؤں گا کیا اپنا وقار کھو کر

میں کیا پاؤں گا اکبر بتکدے میں حاضری دے کر
یہ بُت رہ جائیں گے تھوڑی سی یادِ کافری دے کر -

یا رب مجھے محفوظ رکھ اس بت کے ستم سے
گو دعوئے تقویٰ نہیں درگاہِ خدا میں
میں اس کی عنایت کا طلبگار نہیں ہوں
بت جس سے ہوں خوش ایسا گنہگار نہیں ہوں

آتشِ شوقِ بتاں میں نہ جلا دل اپنا
بُت پرستی میں بھی رکھ حسن کے پہلو پہ نظر
کافری کا سبب گرمیٔ بازار نہ بن
ہار بن دیر سے رشتہ ہو تو زنار نہ بن

اس قدر دلکش ہے رنگِ طبعِ اکبر دیر میں
بُت کو حسرت ہے کہ یہ کمبخت کافر کیوں نہیں !

تمام دنیا نئی روش میں جو چھوڑ بیٹھے گی دینِ حق کو
جو ایک مومن بھی ہو گا زندہ تو اس سے ایسا نہ ہو سکے گا

یہ رنگِ غیرت اپنی جگہ ایک شاندار ورثہ ہے۔ جو اکبر کے مسلمان دل و دماغ کو اپنی تاریخ سے ملا ہے۔ اس سے اکبر کے مذہبی جذبے کی گہرائی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

اب آئیے، اکبر کے مذہبی تصور کا قریب سے جائزہ لیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اکبر کے سامنے کبھی بھی اسلام کا وہ ہمہ گیر انقلابی تصور نہ تھا جو دنیا سکے اس واحد اجتماعی دین سے اخذ ہوتا ہے۔ وہ اسلام کے اصل تصور کے لئے مغربی طوفان سے نہیں لڑتا بلکہ وہ اس کے مسخ شدہ روایاتی باقیات کو سینے سے لگا کر ان کے لئے اپنی جان لڑاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کہیں کہیں یہ بات محسوس ہوتی ہے کہ اکبر اسلام کے انقلابی تصور کا ہلکا سا پرتو لئے ہوئے ہے، جیسا کہ یہ اشعار گواہی دیں گے:

اک فلسفہ ہے تیغ کا، اور اک سکوت کا
باقی جو ہے وہ تار ہے بس عنکبوت کا

اکبر کا تصورِ مذہب

وہی صاحب عمل ہیں شرع ودیں جن کا وظیفہ ہے　　　　یہ "صلح کل" فقیری فقرہ یا شاہی لطیفہ ہے

تعلیم اس کی اچھی جو اپنے گھر میں خوش ہو　　　　مذہب اسی کا اچھا جس کو پولیس نہ پکڑے
افسکھر ہیں مشاغل حضرتِ اکبر کے ان روزوں　　　　الم ترکیف بیٹھے پڑھ رہے ہیں فیل خانے میں

یہاں صاف محسوس ہوتا ہے کہ اکبر ایک کافرانہ ماحول میں انفرادی دینداری، اور اس کے مسلک صلح کل کے لایعنی پن کو خوب سمجھتا ہے اور صاف صاف تسلیم کرتا ہے کہ دنیا میں راستے دو ہی ہیں یا تیغ و قوت کا، یا سکوت و تصرف کا یہی وجہ ہے کہ وہ اس پر امن مذہب پر طنز کرتا ہے جسے کافرانہ نظام حکومت کی پولیس نظر انداز کر دے۔ لیکن یہ تصور بہت ہی دھندلا اور بغیر کسی گہرائی کے ہے۔ اکبر کے سینے میں جس مذہبی تصور کی جڑیں گہری ہیں وہ بس اتنا ہے کہ:۔

تسبیح و دعا میں جس نے لذت پائی　　　　اور ذکرِ خدا سے دل نے راحت پائی
کوئی نہیں خوش نصیب اس سے بڑھ کر　　　　بس دونوں جہاں کی اس نے نعمت پائی

اور اس کے ساتھ جب اکبر کا محبوب روایاتی ورثہ لٹ جاتا ہے تو بس آخری حد آجاتی ہے وہ اپنی لٹتی ہوئی متاعِ عزیز کا تذکرہ کن جذباتی گہرائیوں کے ساتھ کرتا ہے۔

عزیزوں کی اعانت کم، بزرگوں کا ادب رخصت　　　　جو دل بدلا تو سب بدلا، خدا رخصت تو سب رخصت
ہرگز نہیں ہم کو سلطنت کا افسوس　　　　ہے ابتریٔ معاشرت کا افسوس

اکبر کے مذہبی تصور کی یہی وہ نوعیت ہے جس کے زیر اثر وہ عورتوں کے چہروں سے نقاب اٹھتے دیکھ کر غیرتِ قومی سے زمین میں گڑ جاتا ہے، لیکن ان نقابوں کے پیچھے اسلام کی اصل قدروں کی جو تباہی کئی صدیوں سے عمل میں آ رہی تھی اس پر اکبر کبھی غیرت کی وجہ سے زمین میں نہ گڑا تھا۔

پھر اپنے جا بجا انفرادی تصورِ مذہب کی قدر و قیمت اکبر کے نزدیک اس وجہ سے بھی بڑھ گئی کہ یہ مسلم قومیت کی بنیاد ہے۔

مذہبی شاخ فقط ہے تری قومی ہستی　　　　یہ جو ٹوٹی تو نہیں کوئی نشیمن پیدا

قوم قوم کا مذہب ہے زمانے میں　　　　کہاں کی قوم جب اسکا کوئی قوم نہیں

دین و مذہب کے لئے یہ استدلال بجائے خود بڑا محلِ نظر ہے کہ اس کی کچھ کچھ روایات اور اس کی عصبیت کے سہارے ایک قوم قوم بنی ہے۔ اکبر در حقیقت مغربی تہذیب کی یورش کا مقابلہ ذہنی میدان میں کرنے کو نکلا تو محض اپنے جذبات کی رو میں نکلا، وہ اس بات کا کوئی اندازہ کر ہی نہیں سکا کہ آنے والا طوفان کس نوعیت کا ہے، اسکی علمی و فکری قوت کیا ہے اور اس کا مقابلہ کرنے کے لئے جامد مذہبیت کتنی کمزور طاقت ہے یہی وجہ ہے کہ آخر کار اکبر قنوطیت کی طرف پسپا ہو گیا۔ حالات کے سیلے نے اسے جس بری طرح مایوس کیا ہے اس کا اندازہ ذیل کے نقلی آنسوؤں سے ہو سکے گا:۔

ننگ اڑاتا اہلِ یورپ کا تو ہے اکبر محال　　　　مفت اپنے آپ کو تم نے تماشا کر دیا

اکبر کا تصورِ مذہب

دین بچنے کا نہیں ان صورتوں کے سامنے ... یا بچوں زنّار اکبر! یا درِ میخانہ چھوڑ

پیدا کئے فلک نے نا دیدنی مناظر ... نیچی ہیں ان کی نظریں جو صاحبِ نظر ہیں
غم خانۂ جہاں میں وقعت ہی کیا ہماری ... اک ناشنیدہ اف ہیں، اک آہِ بے اثر ہیں

آغاز یہ تھا کہ دل بڑھا تھا ... جو بت تھا، نگاہ پر چڑھا تھا
انجام یہ ہے کہ مر رہے ہیں ... اللہ اللہ کر رہے ہیں

نادیدنی کی دید سے ہوتا ہے خونِ دل ... بے دست و پا کو دیدۂ بینا نہ چاہئے

آمادہ حریف میں ستانے کے لئے ... اور دکھ میں شریک ہونے والا نہ رہا
زندہ ہوں تو مجھ پہ ہنسنے والے ہیں بہت ... مر جاؤں تو کوئی رونے والا نہ رہا

بت کی سی اگر کہیں تو اللہ کہاں ... اللہ کا نام لیں تو یہ "واہ" کہاں
خاموش رہیں تو دل کو بے چینی ہو ... بھاگیں تو سکت کسے ہے، راہ کہاں

رکتا نہیں انقلاب چارہ کیا ہے ... حیراں ہیں ملک! بشر بچارا کیا ہے
تسکیں کے لئے مگر ہے کافی یہ خیال ... جو کچھ ہے خدا کا ہے، ہمارا کیا ہے

نہ حالی کی مناجاتوں کی پروا کی زمانے نے ... نہ اکبر کی ظرافت سے رکے یارانِ خود آرا

اب ان قصوں کا کیا حاصل! اب ان باتوں کیا رونا
یہی مرضی خدا کی تھی! یہی قسمت میں تھا ہونا

اکثر وہی بزرگ ہیں، جو ہیں پٹے ہوئے ... باہوش کم ہیں، ان کے بھی منہ ہیں سئے ہوئے
ہرگز کوئی کہے گا نہ اس انجمن کا راز ... کیوں اپنے آپ کو ہم پریشاں کئے ہوئے

نہ رنگِ انجمن وہ ہے، نہ وہ میکش نہ وہ ساقی ... یہ دعوت کیا ہے بس ہے اک ادائے فرضِ اخلاقی

اکبر کا تصورِ مذہب

ان اشعار میں اکبر کا سوزِ جگر گھلا ہوا ہے۔ ان کا ایک ایک لفظ رو رہا ہے یہ آنسو اعترافِ شکست کے آنسو ہیں ـــــ اور کوئی ظریف کبھی ہنستے مسکراتے اعترافِ شکست نہیں کر سکتا!

یورشِ مغرب کا مقابلہ صرف ایک مثبت فکری تحریک کے ذریعے ممکن تھا۔ لیکن اکبر کا مذہبی تصور ایک مثبت تحریک کا سرچشمہ بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسے شکست ہوئی، وہ مایوسی کا شکار ہوا، اور آخرکار (COMPROMISE) کی طرف مائل ہوا۔ اکبر کے اس افسوسناک پہلو کو نمایاں کرنے کے لئے ذیل کے اشعار ملاحظہ فرمائیے:-

بہت ہے غفلت و ترکِ عمل دنیا میں یہ مانا — عقیدہ اصل ہے لیکن، وہ ہونا چاہئے پیارا
مدارِ خیر خواہی ترکِ مذہب پر نہیں ہرگز — ہر اک نے کول سے انگلش ہی کی لالٹین کا دم مارا
نہ تھا یہ مطلب سارا کہ اسمٰعیل کا فسدہو — حریفانہ نہ ہو انداز، مطلب تھا یہی سارا

تم شوق سے کالج میں پھلو، پارک میں پھولو — جائز ہے غباروں میں اڑو، چرخ پہ جھولو
بس ایک سخن بندۂ عاجز کا ہے یاد — اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

ہم مصلحتِ وقت کے منکر نہیں اکبر — لیکن یہ سمجھ لو کہ دعا بھی ہے کوئی چیز

کون کہتا ہے کہ انگلش کا نہ ہو دل سے مطیع — کون کہتا ہے نہ کر الفت و اُنس پیدا
کون کہتا ہے تکلف سے نہ کر زیست بسر — کون کہتا ہے نہ کر وضع میں جوبن پیدا
کون کہتا ہے کہ تو علم نہ پڑھ، عقل نہ سیکھ — کون کہتا ہے نہ کر حسرتِ لندن پیدا
بس یہ کہتا ہوں کہ ملت کے معانی کو نہ بھول — راہِ قومی میں تو خود ہی نہ ہو رہزن پیدا

جہاں تک کہ سرسید کی "چلو تم ادھر کو، ہوا ہو جدھر کی" والی پالیسی جس کے خلاف اکبر نے عمر بھر بڑے طنطنے سے معرکے لڑے ہیں آخرکار اس کو بھی سہ گئے! افسوس کہ اکبر دنیائے فکر و نظر کا سلطان ٹیپو نہ بن سکا!

الحاد و مادّہ پرستی کی کسی منظم اجتماعی تحریک کے سامنے ایک جامد انفرادی تصورِ مذہب کا انجام اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

لیکن ہم اکبر کی عظمت کو نہیں بھول سکتے۔ یہ وہ عظیم المرتبت شاعر ہے جس نے شاعری کی ایک نئی راہ نکالی اس نے حالی اور شبلی کے ساتھ کھڑے ہو کر مسلمانوں میں بعض ایسے احساسات پیدا کئے ہیں جو آج تک کام کر رہے ہیں، یہ وہ شاعر ہے جس نے اغیار کی تقلید کے رجحان کو دبانے کے لئے ہمارے ادب کو کچھ خیالات اور اسالیب دیئے ہیں، اور یہ وہ شخص ہے کہ جس نے جتنی ذہنی قدریں اپنے ماحول سے پائیں ان سے ایک مسلمان کی طرح سچا پیار کیا ہے اور اس پیار میں بڑی وفاداری دکھائی ہے۔ اور ہاں یہ وہ شخص ہے کہ جس کی فکر کا ایک جوہر اقبال کے کلام کی رگوں کے لہو میں گھلا ہوا ہے۔

شعر نمبر

اس وقت تک پانچ پرچے جرائد میں شعر نمبر پر تبصرے شائع ہو چکے ہیں، مزید جرائد کی طرف سے اظہار رائے کا انتظار ہے۔ اس دوران میں بعض احباب نے خطوط کے ذریعے بھی اپنی آراء بھیجی ہیں ذیل میں ان آراء کو درج کیا جا رہا ہے ۔

(۱)

شعر نمبر پر میں نے فاران میں مفصل تبصرہ کر دیا ہے۔ "شعر نمبر" اسلامی ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے جزاک اللہ فی الدارین خیرا !

ماہر القادری

(۲)

گرامی نامہ مورخہ ۵ نومبر موصول ہوا۔ اس سے پہلے شعر نمبر چراغ راہ "بہ نغمہ رہزن تمکین و ہوش" ہو چکا تھا۔ ماشاء اللہ بہت کامیاب نمبر ہے اور اسلامی ادب کے جدید شعری سرمایہ کا کامیاب انتخاب ہونے کی حیثیت سے ناقدین ادب کو دعوت مطالعہ دیتا ہے یہاں کے بک اسٹالوں پر ہم نے دیکھا ہے کہ ایسے ایسے لوگوں نے اسے شوق سے خریدا ہے جو "اسلامی ادب" کا نام تک سننے کے روادار نہ تھے ۔

شعر نمبر کے سلسلہ میں یہاں کے اکثر حلقوں میں ایک ریمارک عام طور پر سننے میں آیا "نعیم صاحب چھائے ہوئے ہیں" کچھ مجھے بھی ایسا ہی محسوس ہوا لیکن "ایں ہمہ سرمایۂ بہار" نیں آپ کے اعتراف اور معذرت سے ایک حد تک اسکی تردید ہو جاتی ہے۔ اور بہت "سوچ بچار" کے بعد اب میں خود اس نتیجہ پر پہنچ چکا ہوں کہ قصور "نعیم" کا نہیں بلکہ اصل میں اسلامی شعراء کے "وجدانی تبغض" کا رونا ہے اگر "نعیم" نے گوناگوں موضوعات کو چھیڑا ہے اور تمام نمایاں خارجی محرکات پر اس کے وجدان شعری کو ارتعاش حاصل ہوا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمارا شعری مجموعہ منتخبات اس کے شہ پاروں کے عادی رہ جائے ۔

تاہم ایک اور بات اس سلسلہ میں عرض کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ خاص نمبروں کی اشاعت میں چند "ماہرین" کا باہمی تعاون اور اشتراک عمل ازبس ضروری ہے اور آئندہ اس کا خیال رکھنا چاہیئے۔ تاکہ بعض "عمدہ چیزیں" گوشۂ گمنامی میں ہی نہ رہ جائیں۔ (میرے خیال سے ادب کسی جغرافیائی تقسیم کا متحمل نہیں کیونکہ زندگی کے متعلق بھی ہمارا یہی ایمان ہے) نیز ادیبوں کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ بروقت اپنے منتخبات حوالہ کرنے میں بخل سے کام نہ لیں۔

(فرخ احمد ڈھاکہ)

(۳)

آخر انتظار کی گھڑیاں گزر گئیں۔ اور شعر نمبر اپنے دامن میں شعر و سخن کا ایک سرمایۂ کثیر سمیٹے ہوئے آن موجود ہوا ۔ بڑے اشتیاق سے صفحات الٹنے شروع کئے۔ لیکن چشم تصور نے کھلے رنگا رنگ کا جو گلدستہ دیکھا تھا چشم سر کو نظر نہ آیا۔ یعنی فارسی اور عربی وغیرہ کا جو انتخاب ہوا تھا وہ اس میں شامل نہ تھا۔ حیران تھا کہ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے ۔ کہیں کچھ صفحات تو غائب نہیں۔ ادھر افتتاحیہ میں آپ کی معذرت نظر پڑی۔ تو بات سمجھ میں آئی۔ چند سطریں اوپر دیکھا تو ایک اور معذرت تھی۔ بلکہ ایک اور۔ پھر ایک اور میری عجیب حالت ہو گئی۔ اپنے ذہن میں اس نمبر کا ایک معیار قائم کر رکھا تھا۔ میری وہمی طبیعت کو سخت مایوسی ہوئی۔ واقعی اچھی اچھی نظمیں شامل ہونے سے رہ گئیں تھیں۔ اور بعض کمزور نظمیں شامل ہو گئی تھیں بے شک ہمارا نظریہ ہر جگہ نمایاں اور ہماری انفرادی فکر ہر جگہ نکھری ہوئی تھی۔ تاہم کمزوریاں اپنی جگہ موجود تھیں۔ فکر جتنا زوردار ہو اسے پیش بھی اتنے ہی زور سے کرنا چاہئے یہی وجہ ہے کہ ہمارا علمی محاذ بہت مضبوط ہے۔ ادبی محاذ کو بھی ویسا ہی مضبوط بنانا

ہوگا۔ زیادہ افسوس مجھے اس کا ہے کہ معیاری نظمیں موجود ہوتے ہوئے کم درجہ نظمیں نمبر میں شامل ہو گئی ہیں۔ اور اس طرح پہلی بار بازار ادب میں جو جنس ہم لانے ہیں۔ اتنی گراں بہا نہیں۔ جب کہ مقابلہ میں دوسری ایسی اجناس موجود ہیں۔ جو ہرچند ہمارے نقطۂ نظر سے خام ہیں۔ لیکن بازار میں اس وقت انہی کی قدر اور مانگ ہے۔ اور دنیا اُن کی منہ مانگی قیمت ادا کرتی ہے۔ ہمیں ان کی قیمتوں کو گرانا اور ان کے گاہکوں کو توڑنا ہے کیا ایک نیم پختہ جنس سے یہ کام کیا جا سکتا ہے؟

افتتاحیہ میں آپ نے جگہ بچھنے کے متعلق بجا فرمایا ہے اور اس سلسلہ میں زیادہ ہاتھ مجھی پر صاف ہوا ہے۔ غالباً جس فراخدلی سے میری نظمیں زیادہ لی گئی تھیں۔ اسی فراخدلی سے نکال بھی دی گئیں ذرا صفحہ ۴۶ پر نظم آپ بھی تو دیکھئے نا۔ کوئی ستائیس شعر کی نظم ہے اور صرف بائیس شعر لے کر سر دھڑ الگ کر دیا ہے بیچاری نیم بسمل صفحۂ قرطاس پر تڑپ رہی ہے۔ پہلے تو میں نے یہ سمجھا کہ بیچ میں سے شاید کوئی جزو نکل گئی ہے لیکن جب صفحات کے نمبر دیکھتا ہوں تو درست ہیں۔ اب بتایئے سدکوتاہ آستیں ہے مگر تیغ بے نیام کہاں یا نہ نظر لگے تو کہیں اُن کے دست و بازو کو" لکھوں۔

اچھا اب اس شاعری کو چھوڑتا ہوں۔ یہ تو "ادب برائے ادب" والوں کی طرح محض تفنن طبع کے طور پر لکھا ہے آپ کو معلوم ہے کہ مجھے اس کا کوئی ملال نہیں۔ جگہ نہیں نکل سکی۔ اور مجبوراً تخفیف کرنی پڑی۔ ہاں تازہ ترین نظموں میں "منشور" کے بجائے اگر وہ ترقی پسند شاعر سے" والی نظم دی جاتی تو بہتر ہوتا۔ سنئے! میں نے شعر نمبر کو کمال دیدہ ریزی سے لفظ بلفظ پڑھا ہے۔ اور اس خیال سے پڑھا ہے کہ اس کے معائب و محاسن دونوں کا اندازہ کروں بلکہ معائب کو کچھ زیادہ ہی دیکھنے کی کوشش کی۔ مخالف بھی ایسا ہی کریگا۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ فیصلہ نیت پر ہوتا ہے۔ وہ عیوب پر خوش ہوگا اور ان کا ڈھنڈورا پیٹے گا۔ میں عیوب کا غم کھاؤں گا اور ان کی اصلاح کی طرف توجہ دلاؤں گا۔ اب ذیل میں جو موٹے موٹے ریمارکس پرچے کے متعلق لکھتا ہوں اسی خیال سے لکھتا ہوں:۔

۱۔ پرچے کی ضخامت زیادہ ہے اور مواد کم ہے۔ یعنی جتنی ضخامت ہے اتنا مواد نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ پرچے کا بیشتر حصہ جلی قلم سے لکھا گیا ہے کہیں کہیں زیادہ کھلا کھلا لکھا گیا ہے میں تو اسے صفحات کا مسرفانہ استعمال کہوں گا۔ اگر قلم خفی رکھا جاتا تو اس میں بہت کچھ وسعت ہو سکتا اور اس نمبر کا تقاضا بھی یہ تھا کہ ہمارے ہاں جتنی بھی اچھی چیزیں لکھی گئیں ہیں اس میں شامل ہو جائیں۔

۲۔ تعارفی تبصرہ یا جائزہ کی کمی کو میں نے بہت محسوس کیا۔

۳۔ نظموں کے انتخاب کا معیار نرم ہے۔ اس لئے سقیم نظمیں بھی آگئیں۔ حالانکہ ان سے بہتر نظمیں موجود تھیں۔ جو رہ گئیں۔

۴۔ بعض نظموں میں فنی اور لسانی اغلاط ہیں۔ حاشیہ میں ادارہ کی طرف سے اُن کے متعلق نوٹ دیئے جانے تھے۔

۵۔ بعض اسلامی تحریکِ ادب کے شاعر غیر متعارف رہ گئے۔ اور جن کا تعارف ہوا۔ خاطر خواہ نہ ہوا۔ مثلاً حفیظ میرٹھی اور نجم الاسلام اور ابوالمجاہد زاہد وغیرہ ہم اچھے شاعر ہیں۔ انہوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ان کی صرف ایک ایک نظم لی گئی اور وہ بھی کسی انتخاب کے بغیر حکمت العمری کی قرارداد مقاصد پاس کرنیوالوں سے" بڑی اچھی نظم تھی وہ نہیں آسکی اس کے علاوہ کاتب کی کرشمہ کاریاں اپنی جگہ موجود ہیں۔

بحیثیت مجموعی نمبر کامیاب ہے۔ بعض نظمیں جو میرے لئے نئی ہیں۔ ابھی خاص ترقی پسند انہ ہیں۔ میری حوصلہ افزائی ان سے ہوتی ہے مثلاً نئے عیر وشیا، شاہ فاروق کا جشن عروسی، فرض صدارت، کو ویدال سے جاپان تک، تو آنے تو ڈالر، برطانوی مشن، نشاط فتح، امیر یزام وغیرہ پرچے کا افتتاحیہ بھی اچھا ہے۔ اگر اس کے بعد ایک تبصرہ یا جائزہ بھی شامل اشاعت ہو جاتا تو بہت خوب ہوتا۔ میری ایک تجویز ہے کہ جو روک دیا گیا ہے مثلاً عربی شاعری کا انتخاب، متقدمین کا انتخاب، ماہر القادری کا جائزہ وغیرہ ان سب کو دسمبر نمبر میں دینے کی کوشش

شعر نمبر

جا سکے۔ اول الذکر اور مؤخر الذکر تو ضروری ہیں۔

اجمالاً شعر نمبر میں جو عیوب نمایاں طور پر نظر آتے ہیں آپ ان کو دیکھ لیجئے۔

۱۔ ص تیسرا بند خارج از بحر معلوم ہوتا ہے پہلے مصرعے تو صحیح ہیں البتہ دوسرے مصرعوں کے متعلق شبہ ہے۔ آپ دیکھ لیجئے۔

۲۔ ص ۲۶ تیسرے بند میں لفظ زیادہ نہیں کھپ رہا۔

۳۔ ص پر ایک مصرعہ جہاں انگارے نہ ہوں، برف کی چٹانیں ہوں خارج از آہنگ ہے۔ اسی نظم میں نغمہ ٹینک اور موسیقی بم جیسے مرکبات گرامر کے لحاظ سے تو غلط ہیں۔

۴۔ ص آپ کی نظم میں شاخ تمنا کا ثمر ہی ہوگا۔ معلوم ہوتا ہے کاتب نے غلطی سے "اثر" لکھا ہے۔

۵۔ ص "پھر کلیم اللہ کی تاریخ کو دہرانے دے" میں کلیم اللہ کے بجائے "براہیم" ہو جائے تو شعر صاف ہو جاتا ہے۔ نیچے کا بند یوں ہونا چاہئے زندگی جیسے گزرتی ہے گزر جائیگی" اور چوتھا مصرعہ "یہ پری موت کے شیشے میں اُتر جائیگی" ہونا چاہئے یہ پری کا اشارہ زندگی کی طرف ہے۔ مناسبت لفظی کا تقاضا ہے کہ شیشے میں پری کو اتار لیا نہ کہ زندگی کو۔ آپ مذکورہ صفحہ ضرور سامنے رکھ کر یہ بند ملاحظہ فرمادیں۔ اس نظم کے آخری بند کا دوسرا مصرعہ سمجھ میں نہیں آیا

۶۔ ص ۹۸ دوسرا بند۔ کابوس کیلئے شرمندۂ تعبیر کا لفظ آسکتا ہے؟

۷۔ ص آخری دو بند خارج از بحر ہیں۔

آج میرا بہت سا بوجھ ہو گیا۔ پہلے پرچے کے انتظار کی کوفت تھی۔ پھر اس کو گہری نظر سے دیکھنے کا کام تھا۔ پھر اس کے متعلق اپنے تاثرات آپ تک پہنچانے کا۔ سو آج میرا کام ختم ہو گیا اب دیکھنا باقی رہ گیا ہے کہ دوسرے کیا کہتے ہیں۔

(ضیاء محمد ضیاء)

(۴)

جن لوگوں نے "چراغِ راہ" کو دیکھا ہوگا وہ نعیم صدیقی کی علمی و ادبی صلاحیتوں سے ضرور واقف ہوں گے۔ احساس و نظر کو چونکا دینے والے قیادت نمبر کے بعد "شعر نمبر" نعیم کا ایک دوسرا کارنامہ ہے عرصہ سے ایک ایسے مجموعے کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی جو اسلامی ادب کی نمائندگی کر سکے تاکہ جو لوگ اسلامی ادب سے متعلق کسی قسم کی غلط فہمی میں مبتلا ہیں وہ اچھی طرح اسلامی نظریہ شعر کو سمجھ لیں اور یہ بھی معلوم ہو جاتے کہ اسلام پسند ادیب زندگی کو کس ڈگر پر چلانا چاہتے ہیں۔

ابتدا میں ہر تحریک کی مخالفت ہوتی ہے، خود ترقی پسند ادب کی کیا کچھ کم مخالفت ہوئی ہے لیکن رفتہ رفتہ جب لوگ اس سے واقف ہو جاتے ہیں تو مخالفت کی جگہ حمایت کرنے لگ جاتے ہیں، تحریک ادب اسلامی بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل ایک نئی چیز ہے اور فطری قاعدے کے مطابق اس کی مخالفت تعجب خیز نہیں ہے۔ اس کی مخالفت دور کرنے کا واحد ذریعہ یہی ہے کہ ہم مخالفین کو اس کا صحیح مفہوم سمجھائیں اور دنیا اس سے جس قدر متاثر ہو رہی ہے اس کا اندازہ کرائیں۔

وہ شعر نمبر بتلائے گا کہ اسلام پسند ادیبوں کے یہاں صرف الفاظ کا گورکھ دھندا نہیں ہے، بلکہ بلندی و آگہی بھی ہے تفکر و مشاہدہ کی گہرائی بھی ہے اور یہ ہماری اجتماعی و انفرادی زندگی کے سامنے ایک واضح نصب العین، ایک پاکیزہ تخیل اور ایک اعلیٰ معیار پیش کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے خیالات کو جغرافیائی حدود یا نسلی آثار کا پابند نہیں بنایا بلکہ فکر و نظر کی بنیاد عالمگیر فلسفۂ انسانیت پر رکھی ہے۔ اس سلسلہ میں ان کو کئی مخالف قوتوں سے جنگ لڑنی پڑ رہی ہے ان مخالف قوتوں میں ان کا اپنا ماحول بھی ہے، وقت کا چھایا ہوا نظام بھی اور باطل تحریکات بھی ہیں۔۔

اس طرح ان کا دامن پھولوں سے رنگی ہوئی روش نہیں بلکہ خار دار پگڈنڈی بن کر رہ گیا ہے لیکن وہ ہمت و دلیری کے ساتھ راستے کے کانٹوں کو ہٹاتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں اور بڑھتے جا رہے ہیں ــــ انہوں نے الفاظ سازی کے فن میں بھی اجتہاد کا ثبوت دیا ہے، ترکیبوں کی جدت تشبیہوں کی ندرت اور حقائق تخیل سے انہوں نے زبان و بیان کی بنیادوں کو کافی مضبوط کیا ہے ۔ ان کے یہاں الفاظ کا ساحرانہ زیروبم شدت احساس تاثیر و توانائی سبھی کچھ ملتا ہے، انہوں نے افکار گوناگوں کے نئے نئے سانچے بھی تیار کئے ہیں اسالیب و موضوعات کی نئی نئی راہیں بھی نکالی ہیں اور مقصدیت کے حسن و جمال کو بھی نکھارا ہے اور کہیں کہیں فنی و لسانی ٹھوکریں بھی کھائی ہیں۔ مرتب نے شعر نمبر کو سنہ وار چھ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ شعر و شاعر کے باب میں باقی صدیقی کا "مشاہدہ" خاص طور پر قابل ذکر ہے، یہ حقیقت ہے کہ اپنی موجودہ شکل میں مشاعرے اپنی اہمیت و افادیت کھو چکے ہیں اور محض تفریح کی چیزیں بن کر رہ گئے ہیں ــــ "اے شعر" میں نعیم نے شعر کو مخاطب کرتے ہوئے احسان جتایا ہے کہ کافر سے ہم نے تجھ کو مسلماں بنا دیا" ــــ اور یہ ایک حقیقت ہے جس پر شعر جتنا بھی ناز کرے کم ہے ۔ اسی نظم میں نعیم صاحب ایک جگہ داماں اور یکجاں کے قافیہ میں "گویا" کو "گویاں" لکھ گئے ہیں ــــ اور ہم نے خامشی کو بھی گویاں بنا دیا ــــ جو صحیح نہیں ہے ۔

شعر نمبر میں مطالبۂ نظام اسلامی، قرارداد مقاصد اور انقلاب قیادت سے متعلق زیادہ نظمیں ملتی ہیں بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ بیشتر نظموں پر پاکستانیت چھائی ہوئی ہے اور شعر نمبر اچھا خاصا پاکستان نمبر بن کر رہ گیا ہے ــــ لیکن اس قسم کی نظموں کی کثرت سے اس کا اندازہ ضرور کیا جا سکتا ہے کہ پاکستانی ادیب پاکستان میں اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لئے کتنی جدوجہد کر رہے ہیں اور کس بے باکی اور صداقت کے ساتھ موجودہ نظام پر تنقید کر رہے ہیں "قرارداد مقاصد سے متاثر ہو کر" ــــ "جائزہ آج بھی، اُن کو پہچانیئے" (ماہر القادری) مطالبہ اور جائزے (طالب حجازی) قرارداد مقاصد (اسد ملتانی) تا خدا خوش رہو (حفیظ جالندھری) نظام اسلام آ رہا ہے (یعقوب طاہر) رنگ محل میں آگ لگی (اعظم ادیب) انتظار اور ابھی (ارشد کاظمی) میں خاموش نہیں رہ سکتا (شاہد نقوی) اور تضاد (نعیم صدیقی) خاص طور پر قابل ذکر ہیں ــــ کوثر نیازی کی بغاوت بھی بڑی ہی معصوم ہے ــــ بغاوت کے ایک مصرعہ میں کوثر صاحب نے ہارنا کی جگہ "ہرنا" لکھا ہے ــــ ایسے ماحول میں توجیت سے ہرنا اچھا ــــ جو یری دانست میں صحیح نہیں ہے ــــ "ہم کہاں جائیں گے" میں سجاد شاہد کے دل کی آواز سنائی دیتی ہے ایک کامیاب نظم میں جو خوبیاں ہوتی ہیں وہ سب اس میں موجود ہیں، شمیم جاوید کی "پیکار" بھی آرٹ کا اعلیٰ نمونہ ہے شمیم کے یہاں سجاد شاہد کی جیسی مایوسی گھبراہٹ اور بے چینی نہیں ہے ۔ بلکہ عزم و ایمان کی روشنی ہے افق کے کناروں کو چھو لینے کے بلند حوصلے ہیں، دشت و جبل کو سہارا دینے والے ولولے ہیں اور دنیا بھر کے خداؤں سے ٹکر لینے کی پاکیزہ ہمت ملتی ہے ۔

"الحکم للہ" ــــ میں عاصی ضیائی خشک مقصدیت سے آگے نہ بڑھ سکا، عاصی نے لکھا ہے کہ اس نظم کو آجکل کی نظم آزاد سے کوئی واسطہ نہیں ہے .... : عاصی صاحب کی خدمت میں عرض ہے کہ یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے اس قسم کی نظم کو نظم معرّیٰ کہتے ہیں جو "رائج الوقت" ہے ــــ تاہم عاصی کی اچھی نظم ہے ۔

شعر نمبر میں نعیم کی ڈیڑھ درجن کے قریب نظمیں ہیں جس کے لئے "زیں ہمہ سرمایہ بہار" میں نعیم نے معذرت بھی کر لی ــــ یہ حقیقت ہے کہ نعیم نئے نئے موضوعات پر انتھک لکھنے والے ہیں پھر بھی ان کی بعض نظمیں اگر شعر نمبر میں شامل نہ ہوتی تو زیادہ اچھا تھا بعض نظمیں تھکا دینے کی حد تک طویل اور بے کیف بن کر رہ گئی ہیں۔ طویل تو "تاریخ تعمیر" بھی ہے لیکن اس میں "تو آنے تو ڈالر"، "مال تجارت" اور "بلیک" جیسا گھونسہ مار طرز بیان اور کھردرا پن نہیں ہے۔ بلکہ تعمیر تاریخ نعیم کی بہترین نظموں میں شمار کئے جانے کے قابل ہے افاعیل و تنوع ان بحروں کی وجہ سے تعمیر تاریخ میں اور بھی شگفتگی پیدا ہو گئی ہے ــــ لیکن تعمیر تاریخ کے "جشن آزادی" میں نعیم اپنے بری راستے سے بھٹک بھی گئے ہیں ــــ یہیں

شعر نمبر

ناقوس بجاتا ہوں ـــــ مے کی فرحت لاتا ہوں ـــــ ہیں یہ ساقط البحر مصرعے بھی پائے جاتے ہیں ـــــ یہ منصب یہ عہدے ـــــ یہ عزت کے نغمے ـــــ آؤ محل سجاؤ ـــــ نعیم ذرا سی توجہ سے کام لیتے تو یہ نقص باقی نہ رہتا ـــــ اگر زبان و بیان کی طرف سے صرف نظر کرکے ہم نے کوئی ترقی کی بھی تو وہ ادبی ترقی نہیں ہو سکتی، بعض معاصر فنکاروں کی طرح کبھی کبھی نعیم بھی فن سے کترا کر چلنے لگتے ہیں متروکات کے استعمال میں بھی آزادی برتتے ہیں جسے مستحسن نہیں کہا جا سکتا، مقصد کی خاطر زبان و بیان کے فن سے انحراف کرنا ایک ایسا گناہ ہوگا جس کا کفارہ ہم کو ادبی زوال کی شکل میں دینا پڑے گا یہ حقیقت ہر ادیب و شاعر کے ذہن نشین ہونی چاہئے۔ ایک سوال چار جواب بھی تیمر تا ہیئت کی طرح نعیم کی بڑی پیاری اور اسلوب کے اعتبار سے بڑی کامیاب نظم ہے۔

زرگری (احسان کلیمی) خود نگر نو (سہیل زیدی) الموج (ناز ش پرتاپگڑھی) نئے عیسیٰ کشیما جنم لے رہے ہیں، الکوریا، نیا سامراج (عرشی) بہترین تخلیقات ہیں لیکن نیا سامراج میں عرشی ایک بحر میں تیرتے تیرتے چھلانگ لگا کر دوسری بحر میں جا پڑتے ہیں کہاں تو یہ بحر تھی سنے جام و صہبائی چھاگیں ہیں ـــــ " یہ سب ایک زنجیر کے سلسلے ہیں" اور کہاں اس بحر میں آگئے ـــــ جیالے کسانوں نے بھڑکایا ہے خون ـــــ بہادر جوانوں کا ابلا جنون، دلوں کو صداقت سے پرنور کر ـــــ عرشی جیسے پختہ کار سے اس قسم کی خامی تعجب خیز بھی ہے اور قابل افسوس بھی۔

فرض صدارت شمیم جاوید کی ایک کامیاب طنزیہ نظم ہے شمیم نے ایک مصرع میں زیادہ بروزن سادہ استعمال کیا ہے ـــــ زیادہ باتیں نہ کرو ـــــ جو صحیح نہیں ہے ـــــ زنانہ فوج (نعیم صدیقی) بھی ایک طنزیہ نظم ہے۔ جن لوگوں نے نعیم کی شاہکار ادب نظم عورت کا تجزیہ پڑھی ہوگی وہ نعیم کے کمال طنز نگاری کی داد دیئے بغیر نہ رہیں گے، نعیم چٹکیاں بھی لیتے، نشتر بھی چبھوتے ہیں کبھی چھپ کر کبھی سامنے آکر ـــــ زنانہ فوج کے مقابلے میں بھی نعیم ایک ماہر سپاہی کی طرح طنز کے تمام اسلحوں سے مسلح ہو کر میدان میں اترتے ہیں ـــــ لیکن نعیم نے اسی نظم میں ایک جگہ لکھا ہے۔

تو اسلحہ نو سے مسلح ہے سامان ترا سرخی ہے یہ غازہ ہے یہ پوڈر ہے یہ منجن ہے ـــــ منجن سے تو دانت صاف کئے جاتے ہیں اور بس۔ وہ سرخی یا غازہ کی طرح کوئی نمائشی یا لب و دنداں پر باقی رہنے والی چیز نہیں ہے۔ ممکن ہے نعیم صاحب نے منجن کو مسّی کے معنی میں استعمال کیا ہو لیکن زنانہ فوج میں مسّی جیسی کالی کلوٹی دیہاتن کی گذر کہاں اس لئے سرخی و غازہ کے ساتھ منجن بالکل بے جوڑ ہے منجن کی جگہ اگر مانگ میں بھرنے والا بندلا ہوتا تو شاید زیادہ بے جوڑ نہ رہتا ـــــ

اعظم ادیب کے آئینہ بازار میں حرم نو کی زیارت کرائی گئی ہے۔ لب و عارض کے چھلکتے ہوئے پھولوں کا نکھار ـــــ چالاک تبسم، نگاہ بے باک سب کچھ ہے ـــــ اور ـــــ آپ اگر چاہیں تو مخصوص ملاقات بھی ہے۔

زندگی کے دو زاویئے (انجم عثمانی) ہے تو مختصر نظم لیکن شعر نمبر کی بعض طویل طویل نظموں پر بھاری ہے۔ مختصر یہ کہ شعر نمبر میں اچھی نظموں کی کمی نہیں لیکن کئی ایک ایسی نظمیں بھی شامل ہیں جن کے شامل ہونے سے شعر نمبر کا حجم تو بڑھ گیا لیکن وقعت کچھ کم ہو گئی، اسی طرح بعض اچھے شعراء کی کاوشوں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے خصوصاً عیش صدیقی کا نام نہ پا کر حیرت ہوئی۔

بعض نظموں میں قومی ادب اور اسلامی ادب کے فرق کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ بعض شعراء کو ان کی اصلی شکل میں نہیں پیش کیا گیا ہے، خصوصاً حفیظ میرٹھی کی نظم ارتقاء دیکھ کر تعجب ہوا ارتقاء ہے تو بڑی اچھی نظم لیکن حفیظ کی نمائندہ نہیں ہے، حفیظ ایک کامیاب غزل گو ہے اور وہ غزل کے مزاج کو اسلامی بنانے کے لئے بڑی جدوجہد کر رہا ہے اور نئے نئے خوش رنگ پھولوں سے دامن غزل کو بھر رہا ہے۔ میرا خیال تھا کہ شعر میں حفیظ کی غزلیں ضرور شامل ہوں گی لیکن یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ شعر نمبر میں سرے سے صنف غزل ہی غائب ہے شعر نمبر میں یہ بڑی کمی رہ گئی ہے جس کا

شعرنمبر

وجہ سے شعر نمبر ادھوری تصویر بن کر رہ گیا ہے۔ غزل جیسی کامیاب ترین صنف کی طرف سے یہ بے اعتنائی اچھی نہیں ہے۔ ماہر شفیق صدیقی اور ش صدیقی کی چند غزلیں ملتی ہیں لیکن وہ بھی بھاری بھرکم نظموں کے تلے دبی ہوئی سسک رہی ہیں۔ (ابوالمجاہد زاہد)

(۵)

کل شام کو بعد مغرب لکھنؤ سے واپس آیا تو یہاں شعر نمبر موجود تھا۔ دیکھ کر جس قدر خوشی ہوئی اس کا اظہار امکان سے باہر ہے۔ تھکن اور دماغی بوجھل پن سا محسوس کرنے کے باوجود ایک بار سارا پرچہ شروع سے آخر تک دیکھ لیا۔ اور پھر دوبارہ ایک اجمالی جائزہ لے لیا، مگر کسی طرح طبیعت کی سیری نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ .... نیند کے غلبہ کے باوجود کافی رات گئے تک پرچہ ہاتھوں سے نہ چھوٹا اور اب صبح سے پھر ورق گردانی کر رہا ہوں۔ اردو ادب میں یہ اپنی طرز کا پہلا نمبر ہے۔ آج تک کسی جریدے نے منفعت طلبی سے ابھر کر افادیت کی اتنی پرخلوص خدمت نہیں کی .... آپ اس طرح شعر و ادب کی جولاں گاہ میں پہلے مرد میدان ہیں۔ زیادہ تعریف میں خود نہیں کرنا چاہتا۔ ڈ اُپ نے یہ فریضہ اس لئے انجام دیا ہے اور نہ یہ آپ ایسے بلند مرتبت ادیب کا مطمع نظر ہو سکتا ہے۔ آپ کا یہ اقدام ہر ستائش سے ماورا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ ایسوں کو ہماری راہ نمائی کے لئے عزم و استقلال بخشے۔

شعر نمبر پر کسی تفصیلی تبصرہ کا میں خود کو مجاز نہیں سمجھتا ہوں، یہ کسی اہل نظر کا حق ہے۔ میں تو صرف چند ایک معمولی امور کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

احمد ریاض کی نظم طوائف اور شاعر حصہ شعر و شاعری میں کچھ غیر موزوں سی نظر آتی ہے۔ آخری شعر کا پہلا مصرعہ ملاحظہ ہو ع۔ تو اپنے ماحول کی عکاسی میں اپنے حالات کا بھکاری -!- اس میں صاف جھلک رہا ہے مورد عتاب د شاعر ہے اور نہ طوائف بلکہ ماحول اور حالات ہیں۔ لیکن ہمارے نظریہ کے مطابق زمانہ اس قدر برا نہیں ہے جس قدر ہمارا انتخاب ماحول ہوتا ہے۔ ہم خود کو جب ایسے موڑ پر پہنچا دیتے ہیں تو گنا ہوں سے گلو خلاصی کے لئے توجیہیں گھڑنے لگتے ہیں۔ یہ انداز پوری نظم میں کارفرما ہے۔ معلوم نہیں آپ کا اس سے کیا مقصد ہے۔

اسی طرح اسی حصہ میں حالی کی نظم شعر کی طرف خطاب میں یہ شعر کچھ غیر مناسب معلوم ہوتا ہے ؎

عزت کا بھید ملک کی خدمت میں ہے چھپا
محمود جان آپ کو گر ہے ریاز تو —

ہمارا ادب وطن پرستی سے بلند ہونا چاہئے۔!

انتخاب ہمیشہ منتخب کے ذوق و وجدان کی نمائندگی کرتا ہے اس لئے اس پر کسی قسم کی مدح قدح کرنا میں بالکل ہی عبث سمجھتا ہوں۔ آپ نے جیسا بھی انتخاب کیا ہے بہتر ہے بلکہ اعلیٰ ترین اور معیاری ہے۔ مگر اتنا عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ کی چھلنی سے اکثر شاعر نہ نکل سکے جو نامناسب نہ ہوتے مثلاً مولانا ظفر علی خاں، اکبر اور جوہر وغیرہ۔

اس کے علاوہ ایک سب سے بڑی کمی سرمایۂ شعر پر کسی تنقیدی مضمون کے فقدان کی وجہ سے معلوم ہوتی ہے۔ کاش آپ اس طرح کا کوئی مضمون شامل کر سکتے۔ اس کے لئے انہی صفحات میں قلم کو تھوڑا سا خفی کر کے کافی جگہ نکالی جا سکتی تھی۔ میری نظر میں جو قلم حالی کی نظم "یہ شاعر" ہا سے کے لئے استعمال کیا گیا ہے اگر پورے پرچہ کی کتابت اسی طرح کی جاتی تو ایک تو یکسانی ہوتی دوسرے مزید گنجائش ہاتھ آ جاتی۔

اس بار صلیبی فہرست کے لئے جو انداز آپ نے اختیار کیا ہے اگر یہ ہمیشہ قائم رکھا جائے تو گزشتہ طرز سے بہت زیادہ جاذب نظر ہوگا۔

غزل اور منظوم ڈراموں کی طرف میرے خیال میں معتد بہ توجہ نہیں دی جا سکی ہے

شعرنمبر

بہرحال میں نے جو کچھ عرض کیا ہے کوئی نکتہ چینی نہیں ہے بلکہ ایک طرح کے ایسے اشارے ہیں جو میں نے مناسب سمجھے کہ آپ تک پہونچا دوں۔ وہ گئی شمارہ کی قدر و قیمت جو میری نظر میں ہے وہ میں خط کے ابتدائی جملوں میں عرض کر چکا ہوں۔ (ابن فرید)

(۶)

"شعر نمبر" ابھی قریب ہی موصول ہو گیا جسے دیکھ کر آنکھوں کو نور اور پڑھ کر دل کو سرور حاصل ہوا۔ تحریک اسلامی کے خیابانِ ادب سے جو کلیاں آپ نے چنی ہیں وہ آپ کی نگاہِ انتخاب کی رفعت اور مذاقِ سلیم کی بلندی کا ثبوت بہم پہنچاتی ہیں۔ آپ کے سجائے ہوئے گلدستوں کی شمیم جاں فزا سے مشامِ جاں معطر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ آپ نے "مکتبِ ادبِ اسلامی" کی نمائندگی اور ترجمانی کے لئے اس قدر شگفتہ اور صالح مواد فراہم کر دیا ہے کہ اب کوئی کور ذوق ہی ہمارے ادبی اسکول کی واقعیت و صداقت کا انکار کر سکتا ہے۔ (ابو البیان حماد)

(۷)

نیکی اور دانائی کی بات نظم ہو یا نثر، دونوں حالتوں میں نیکی اور دانائی ہے، اور بدی اور بداخلاقی کی بات شعر میں ہو تو بھی بدی اور بداخلاقی ہے اور نثر میں ہو تو بھی وہ نیکی نہیں بن سکتی۔ اسلام نے اس شاعری کو منع کیا ہے جس سے بدی پیدا ہو نیز اسلام اس شاعری کا بھی قائل نہیں ہے جس میں سرتاپا مبالغہ آرائی ہو، نہ ایسی شاعری کا مؤید جس کے پیچھے پڑ کر انسان پھر کسی کام کا نہ رہے۔ نفس شعر کا اسلام مخالف نہیں ہے۔ حضور جب مسجد نبوی میں مزدوروں کی طرح کام کر رہے تھے تو آپ کی زبان پر بے اختیار تھا کہ

اللّٰھم لا عیش الا عیش الآخرہ ۝ فانصر الانصار والمہاجرہ ۝

اس طرح کے اور بھی کئی موقع پر آپ کی زبان مبارک سے پاکیزہ اشعار سنے گئے۔ حضرت حسان بن ثابت خود آپ کے مخصوص شاعر تھے۔ حضرت علی کا دیوان مشہور ہے، اسی طرح حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے اشعار بھی کتابوں میں ملتے ہیں۔

چراغِ راہ کا ادارہ باعثِ صد ہزار مبارکباد ہے کہ اس نے اس دورِ جاہلیت میں شعر کا وہ حسین اور اعلیٰ نمونہ پیش کیا ہے جو ہماری تعریف سے بے نیاز ہے۔ (عبد القیوم ندوی)

"فردوس" میں اہم تبدیلی

ماہنامہ "فردوس" ڈھائی سال سے دنیا کو اسلام کا پیغام سنا رہا ہے سلیس اور سادہ زبان، لطیف اور دلچسپ اندازِ بیان، ...... اور اصلاح و تربیت کا رجحان اس کی خصوصیات ہیں ——— مستزاد یہ کہ اب اسے عورتوں کے لئے مخصوص کیا جا رہا ہے۔

اب یہ اندازہ لگانا آپ ہی کا کام ہے کہ آپ کو "فردوس" کی کتنی ضرورت ہے۔ اور "فردوس" کو آپ کی کتنی ——— آئیے، ہم آپ مل کر "یہ جہاد" کریں۔

"فردوس" آپ کے لئے بہترین ہمدرد ثابت ہوگا

ہماری پُرخلوص تمنائیں بہرحال آپ کے ساتھ ہیں۔ اور ——— چار روپے کے حقیر معاوضے میں ہماری خدمات آپ کے لئے سال بھر تک وقف ہو سکتی ہیں۔

آپ کے تعاون کا متمنی

منیجر ماہنامہ "فردوس"

قند و نمک

جمہوریت کی جیب تراشی

پاکستان میں ایک ایسا خطہ بھی شریک ہے جسے آہنی پردے والا خطہ کہہ سکتے ہیں۔ اس خطہ کی عنانِ اقتدار ایک ڈکٹیٹر کے ہاتھ میں ہے جو رائے عام سے بے نیاز ہے، جو مسلم لیگ سے بلند تر ہے، جو قانون اور نظم و نسق سے بالا ہے اور جو مرکز تک کو اپنا نیازمند بنائے ہوئے ہے۔ یہ خطہ صوبہ سرحد ہے۔

اس خطہ میں آزاد اخبار نویسی کا قطعی طور پر خاتمہ ہو چکا ہے۔ اس میں جلسوں کے ذریعہ اظہار اختلاف اور حکومت پر تنقید کرنے کو تقسیم کے بعد مسلسل ختم کر دیا گیا ہے، اس خطہ میں پوسٹر تک لگانے پر پابندیاں ہیں، اس خطہ میں سیاسی کارکن ہمہ وقت زیر نگرانی رکھے جاتے ہیں، اس خطہ میں سیفٹی ایکٹ کے علاوہ فرنٹیر کرائم ریگولیشن ایکٹ کی تلوار شہری آزادیوں کا برابر قتلِ عام کرتی رہتی ہے، اس خطہ میں تمام قوانین اور قواعد و ضوابط اور تمام کارروائیاں پوری طرح وزیر اعظم کے اشاروں کے تابع ہیں، اس خطہ میں سرکاری افسر ——— اور بڑے بڑے افسر ——— مسلم لیگ کے ڈائریکٹر اور قیوم کے اقتدار کے ایجنٹ بنا کر رکھ دئیے گئے ہیں۔ یہ وہی خطہ ہے کہ جہاں ایک "گستاخ" فنانشل کمشنر کو اس کے ایک ادنیٰ ماتحت سے گالیاں دلوائی جاتی ہیں اور پھر جب وہ ماتحت توہینِ عدالت کے جرم میں سزا پاتا ہے تو اس سے درخواست لے کر اسے رہا کر دیا جاتا ہے، اور فنانشل کمشنر کے اس حکم کو کہ اس شخص کی جسارت کے پسِ پردہ کوئی خاص طاقت کام کر رہی ہے لہذا اس کی تحقیقات کی جائے، ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اس خطہ میں چارسدہ کے مشہور فائرنگ کے واقعہ کے ذریعہ پٹھانوں کو ایسا دہشت زدہ کر دیا گیا ہے کہ ہماری یہ بہادر ترین قوم تیزی سے بزدلی کی طرف لڑھک رہی ہے اور بعض واقعات ایسے بھی ہوئے ہیں کہ جو پٹھانوں کی غیرت کو کھلم کھلا زخمی کرنے والے تھے لیکن قیوم کی ڈکٹیٹرشپ نے ان واقعات کو بھی قابلِ برداشت بنا دیا ہے۔

اس ڈکٹیٹر کا حال یہ ہے کہ یہ گھر سے نکلتا ہے تو کڑے مسلح پہرے کے ساتھ، اور یہ پبلک کو خطاب کرتا ہے تو ...... اس طرح کہ اس کے پیچھے اور آگے نیم دائرے کی شکل میں مسلح طاقت حلقہ زن ہوتی ہے اور پھر پچاس ساٹھ فٹ کی دوری پر پبلک کو اس طرح بٹھایا جاتا ہے کہ دو چار لائنیں پبلک کی ہوتی ہیں اور ان کے بعد پھر پولیس ہوتی ہے، پھر کچھ لائنیں پبلک کی ہوتی ہیں اور پھر پولیس ہوتی ہے۔ اس طرح یہ "مقبولِ عام" وزیر اعظم اپنی محبوب پبلک کو خطاب کرتا ہے۔

یہ حالات تھے کہ جن میں صوبۂ سرحد میں انتخابات کا اعلان ہوا۔ انتخابات سے قبل حزبِ مخالف کے بعض لوگ جیلوں میں تھے۔ بعض نظر بندی کی حالت میں تھے، بعض صوبہ بدر تھے، بعض پر کڑی نگرانی تھی اور بہ حیثیت مجموعی انتخابی پروپیگنڈے کے ذرائع پر کڑی پابندیاں تھیں۔ اعلان کیا گیا تھا کہ انتخابات سے تین ماہ قبل ساری پابندیاں اٹھا دی جائیں گی مگر ایک ہر دلعزیز عوامی وزارت کے لئے اس وعدے کا ایفا کیسے ممکن تھا۔ یہی فضا تھی جس میں انتخابات شروع ہوئے۔

آگے دیکھئے کہ کیا ہوتا ہے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا بیان یہ ہے کہ جب وہ دورے کے لئے سرحد تشریف لے گئے تو پولیس کے

چار مسلح سپاہی مع ایک سب انسپکٹر کے ان پر مستعد رہے اور وہ پبلک سے اپنی قیامگاہ پر بھی کوئی ملاقات اور گفتگو ان کی موجودگی اور نگرانی سے آزاد ہو کر نہ کر سکے۔ یہ برابر نوٹ کیا جاتا رہا کہ کون ملنے آتا ہے۔ پھر دوسرے دورے میں نوبت یہاں تک پہنچی کہ مولانا نے جہاں کسی پبلک جلسے میں خطاب کیا پولیس کی ایک پارٹی آ کر بیٹھ گئی اور یہ نوٹ کیا گیا کہ کون کون جلسے میں شریک ہوتا ہے۔

پھر کاغذاتِ نامزدگی کے بارے میں یہ حقیقت بھی سامنے آئی کہ مجسٹریٹوں کو باقاعدہ ہدایات دی گئیں کہ کس کے کاغذات منظور کئے جائیں اور کس کے لازماً مسترد کر دئیے جائیں۔ چنانچہ نہایت نامعقول وجوہ پر کاغذات رد کئے گئے اور نہایت معقول اعتراضات کے علی الرغم کاغذات منظور کئے گئے۔ جماعت اسلامی کے دو ایسے آدمیوں کو جو اپنے اپنے علاقوں میں اثر رکھتے تھے محض اس بنا پر کاغذات داخل کرنے کی تاریخ سے عین قبل گرفتار کر لیا گیا کہ ان کی نامزدگی کا امکان تھا۔ ایک آدمی کے مجوز کو عدالت کے دروازے پر گرفتار کیا گیا اور پھر اس کے کاغذات پر یہ اعتراض کیا گیا کہ مجوز کے دستخط جعلی ہیں اور امیدوار دستخطوں کی تصدیق کے لئے اسے پیش کرنے سے قاصر رہا۔

حد یہ کہ پولیس کے کارکنوں اور مال افسروں، تحصیلداروں اور پٹواریوں اور نمبرداروں کو کھلم کھلا مسلم لیگ بلکہ قیوم کے لئے ووٹ کلکٹر بنا کے چھوڑ دیا گیا۔ بعض جگہ سرکاری افسروں نے معین اشخاص کو یہ دھمکی دی کہ تمہارا بیٹا جو فلاں جگہ ملازم ہے، اسے برطرف سمجھو، اگر تم نے ووٹ کسی مخالف پارٹی یا شخص کو دئیے۔ پھر یہ تک کہا گیا کہ ہم دیکھیں گے کہ اگر کسی جگہ لوگوں کی اکثریت نے ووٹ مخالف امیدواروں کو دئیے تو ہم ان کی آنکھوں کے سامنے ایک بکس سے ووٹ نکال کر دوسرے بکس میں ڈال دیں گے۔

تازہ ترین رپورٹ وہ ہے جو فضلِ حق شیدا (جناح عوامی لیگ) نے لاہور کی پریس کانفرنس میں پیش کی ہے۔ اس کے ساتھ پیر عبداللطیف آف مانکی شریف اور آزاد امیدواروں کے پروٹسٹ شامل کر دئیے جائیں تو حالات کی تصویر مکمل ہو کر سامنے آجاتی ہے۔

لطیفے کی بات یہ ہے کہ قیوم خاں صاحب کی مرضی سے بالاتر ہو کر مسلم لیگ نے اپنے جن امیدواروں کو ٹکٹ دئیے ہیں ان کا حال بھی وہی ہے جو حزبِ مخالف کے امیدواروں اور آزاد امیدواروں کا ہے۔ خان ابراہیم جھگڑا اور خان یوسف خٹک سے پوچھئے کہ آٹے دال کا بھاؤ کیا ہے۔

یہ صریحاً جمہوریت کی جیب تراشی ہے اور یہ حقِ رائے دہی میں نقب زنی ہے۔ اندریں حالات انتخابات نہیں ہو رہے بلکہ انتخاب کا ڈرامہ ہو رہا ہے۔ اگرچہ پورے پاکستان کو حکمران طاقت فاشزم کے راستے پر لے جا رہی ہے، لیکن صوبہ سرحد میں تو فی الواقع چنگیزیت مسلط ہے۔

ہم حکمرانوں کو بھی اور شہریوں کو بھی متنبہ کرتے ہیں کہ یہ راستہ سیدھا انارکی کی طرف جاتا ہے اور اس پر ملک کو ہانکنے کے نتائج بڑے خطرناک ہوں گے!

—— + ——

پھر دیہی عورتوں کو بگاڑنے کی مہم

پاکستان میں آزادئ نسواں اور عورتوں کی ترقی کے نام پر مغربی معاشرت کے فاسقانہ مظاہر کو پھیلانے کی جو مہم چند سال سے جاری ہے، وہ رہ رہ کر نئی لہریں لیتی ہے۔

پنجاب کے مرکز لاہور میں نئے گورنر کی تشریف آوری پر اس مہم کے سوکھے دھانوں کو جیسے پانی مل گیا ہے۔ پنجاب نے زنانہ

(بقیہ بر صفحہ ۶۰)

کپاس کے کھیت میں

"ا ـــــ ذوقی"

خزاں اُس سال مُوسلادھار بارشوں کے ساتھ کچھ قبل از وقت ہی آدھمکی۔ سڑکیں دلدل بنی ہوئی تھیں، بارش کا پانی گھروں اور جھونپڑوں میں گھس رہا تھا اور زمین کا چہرہ زرد پتوں سے ڈھکا ہوا تھا۔

مناظر اپنا فطری حُسن و جمال کھو چکے تھے۔ فصل کٹ کر محفوظ ہو چکی تھی اور کھیتوں میں اگر کچھ باقی تھا تو وہ کپاس کے پتوں سے خالی پودے تھے ـــــ جو ہماری اس داستانِ غم میں ایک اہم حصہ ادا کرنے والے ہیں۔

پو پھٹ رہی تھی، موسم خراب تھا اور آسمان کالے بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ بستی کا ہر متنفس ابھی سو رہا تھا۔ بس کبھی کبھی کتوں کے بھونکنے کی آواز دور تک سنائی دیتی تھی۔ سوائے اس کے، اور ہر لحاظ سے بستی قبرستان کی طرح خاموش تھی!

لیکن اچانک دو گھوڑ سوار قصبے کی جانب سے نمودار ہوئے۔ وہ ایک قہوہ خانے کے سامنے آکر رکے۔ یہاں پہنچ کر وہ ایک دم گھوڑوں پر سے اتر پڑے اور دروازے پر پہنچے، لیکن دروازہ بند تھا۔ صرف ایک دراز میں سے ایک دھندلی سی روشنی دکھائی دیتی تھی۔ جس کے ذریعہ جھانک کر ان دونوں سواروں نے اندازہ کیا کہ اندر کوئی ہے جو جاگ رہا ہے۔

"کھولو دروازہ!" ان میں سے ایک ـــــ ڈاڑھی والا روسی چابک سے دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے چلّایا۔ دروازہ تشویش آمیز انداز سے کھول دیا، اور روسی اور اس کا ساتھی بڑے تحکم سے داخل ہوئے۔ کمرے میں ان کا سامنا ایک معمر آدمی سے ہوا جو بہت تشویش زدہ ہو رہا تھا، یہ جکشی بے تھا، قہوہ خانے کا اڈمنسٹریٹر!

نو واردوں میں سے ایک تو کپاس کے مرکزِ ذخیرہ کا کارپرداز تھا جو والکوف کے نام سے موسوم تھا، اور دوسرا جس کا نام پاری زیف تھا، ضلع کی کالخوز آرگنائزیشن کا لیڈر تھا ـــــ لیکن آج وہ روسی افسر کی ترجمانی کی ڈیوٹی پر مامور تھا کہ اس کے "ارشادات" کو مقامی زبان میں واضح کرے۔ الکوہل کی بدبو کے بھبکے ان کے مونہوں سے بری طرح نکل رہے تھے اور تھوڑی دیر میں کمرے کی ساری فضا اس سے متاثر ہو گئی۔

والکوف نے جس کا بشرہ بہت وحشیانہ ہو رہا تھا، بھیڑ کی کھال کی پوستین کے بند کھولتے ہوئے جکشی بے کو اس انداز سے گھورا کہ وہ کسی دلیر سے دلیر آدمی کو دھمکانے کے لئے کافی تھا۔ اپنا ہنٹر گھماتے ہوئے وہ چلّایا "کالخوز کے صدر کو فوراً حاضر کرو۔" جکشی بے مطلوبہ آدمی کو لانے کے لئے جھپا کے سے نکل گیا، اور اس کے جاتے ہی والکوف قہوہ خانے کے "کنجِ سُرخ" کی طرف چلا تاکہ کتابوں، اور اخبارات و رسائل کے انبار کا جائزہ لے جو وہاں جمع کئے گئے تھے۔ لیکن اس انبار کا منظر اس کے لئے دلکشا ثابت نہ ہوا بلکہ اس کے چڑچڑے پن کے ساتھ اس نے اپنی نوٹ بک میں کچھ ریمارک ثبت کئے، جو ظاہر ہے کہ اس کنجِ خاص کی نگرانی کے ذمہ داروں کے حق میں دعہ خیر نہ ہو سکتے تھے۔ اسٹالن اور لینن کی سوانح عمریوں اور کمیونسٹ پارٹی کی تاریخ پر جتنی بھی قیمتی کتابیں اور پمفلٹ پڑے تھے وہ سب کے سب گرد آلود تھے اور اکثر کے جڑے ہوئے اوراق پھاڑے تک نہ گئے تھے۔ اور یہ کتنی خطرناک صورت [illegible]

کپاس کے کھیت میں

اکابر کی جو تصاویر دیواروں پر آویزاں تھیں ان پر مکھیاں بیٹھی تھیں اور مکڑیوں نے جالے تن رکھے تھے۔

کچھ دیر بعد جکشی بے مقامی کالخوز کے پریذیڈنٹ صاحب ——— نامر کارواں ——— کو ہمراہ لئے کمرے میں واپس آ داخل ہوا۔

نامر کارواں دالکوف کی طرف توجہ کئے بغیر جواب تک "کنج سرخ" میں کھڑا تھا، پارپی ژیف کی طرف مڑا اور اس سے پوچھا کہ آپ کیا چاہتے ہیں ؟

نامر کارواں اس قسم کے "یاد فرمانے والوں" کا خوگر تھا ہی، اس وجہ سے وہ کوئی زیادہ پریشانی محسوس نہیں کرتا تھا۔ بات یہ تھی کہ ضلع تاشقند کے موضع طوسل کی کالخوز کا یہ "سربداز" کپاس کے منصوبے کو پورا کرنے میں ناکام ثابت ہو رہا تھا۔ کالخوز کے اوپر یہ لازم تھا کہ وہ ہر چنائی پر چوبیس ہنڈرویٹ کپاس مرکز ذخیرہ کے حوالے کرے۔ لیکن وہ اب تک کُل سولہ ہنڈرویٹ کی مقدار دے سکا تھا۔ اندریں صورت قریب قریب ہر روز قصبے اور ضلعے سے کمیشن آتے تھے اور ان کا خطاب بالعموم یکساں ہوتا تھا۔

"تم نے منصوبے کی تکمیل کیوں نہیں کی ؟"

"اس صورتِ حالات کا ذمہ دار کون ہے ؟"

"بڑی بدنیتی سے یہ سبوتاژ ہو رہا ہے۔"

"منصوبہ لازماً پورا ہونا چاہئے ——— یوں ہو یا دوں !"

پارپی ژیف نے نامر کارواں کے سوال کا کوئی جواب نہ دیا، بلکہ دالکوف کنج سے مڑا اور اس نے حکم دیا کہ تمام کے تمام لوگوں کو کھیتوں میں نکال کر لاؤ، کوئی شخص گھر پر نہ رہنے پائے۔ ہم دو گھنٹے کے اندر اندر یہاں واپس آتے ہیں، اور اگر میرے حکم کی تعمیل نہ کی گئی تو سمجھ لو کہ نتائج خراب ہوں گے۔

پارپی ژیف نے دالکوف کے الفاظ کی ترجمانی کی اور پھر دونوں گھوڑوں پر سوار ہو کر چل دئے۔ نامر کارواں کی نگاہیں ان کا تعاقب کرتی رہ گئیں !

"گھوڑے کی پیٹھ پر سے حکم تو ہر کوئی دے لیتا ہے۔" اس نے کہا! "لیکن تم لوگ خود کیوں نہیں جاتے، خود جا کر مزہ چکھ لیجئے۔"

جکشی بے نے نامر کارواں کو غضبناک ہوتے دیکھ کر اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی اور کہا "بیٹے ! گرم نہ ہو، اس سے کیا حاصل ؟"

نامر کارواں نے جواب دیا "اگر ہم کم از کم اپنے جذبات کا اظہار کرنے ہی کا حق رکھتے تو یقیناً میں نے اس بھلے مانس کو وہ جواب دیا ہوتا کہ یاد رکھتا لیکن بدقسمتی کہ ہم آزاد نہیں ہیں۔"

چنانچہ اس نے جاکشی بے کو کہا کہ لوگوں کو اکٹھا کرے۔ جاکشی بے نے سب کو اطلاع کی اور جھٹا پٹ مرد عورتیں سب گھروں اور جھونپڑوں سے نکل کر کھیتوں کی طرف چل دئے۔ ان میں سے بعض حکم کی حدود سے مستثنیٰ تھے، بعض اتنے بوڑھے تھے کہ کام کرنے سے معذور تھے اور بہت سے بچے تھے ——— اور بالعموم سب کے سب چیتھڑوں میں لپٹے ہوئے تھے۔ ان لوگوں کا یہ نظارا بڑا ہی المناک تھا۔ بھوک ہر آنکھڑی کے اندر سے جھانک رہی تھی، یہ تمام قلتِ غذا سے متاثر تھے لیکن ہر حال میں ان کے لئے کام کرنا ناگزیر تھا ورنہ ان کو روٹی کے آخری نوالے سے محروم ہونا پڑتا ——— وہ چاہے معذور ہوں، بیمار ہوں یا ضعیف ہوں، روٹی اسی صورت میں پا سکتے تھے جب کہ کام کریں۔

دوسرے لوگوں کے ساتھ قربان بے بھی جو کالخوز کا گاڑی بان تھا، گھر سے نکلا اور اپنی گاڑی تیار کرنے لگا۔ وہ ہر ہفتے کی جمع کردہ کپاس کو پاس کے گاؤں میں ذخیرے کے مرکز تک پہنچانے پر مامور تھا۔ یکایک یہ شخص کیا دیکھتا ہے کہ اس کی بیوی بھی کھیتوں کو جانے کے لئے تیار ہو گئی ہے جس کا حال یہ تھا کہ وہ ولادت کی گھڑی کی بالکل منتظر تھی۔ قربان بے نے اس سے کہا۔

تمہارا خیال ہے کہ تم آرام سے گھر پر رہو، تمہارے لئے یہی مناسب ہے۔"
مگر اس کی بیوی کیلاجان نے کہا "نہیں میں اسے ٹھیک نہیں سمجھتی، تم خود جانتے ہو کہ یہ روسی کتنا ظالم ہے، اگر وہ واپس لوٹے اور مجھے گھر پر دیکھ لے تو مجھے اندیشہ ہے کہ نہایت وحشیانہ طریق سے سزا دے گا۔"
قربان بے کو بھی یہ ڈر تھا، چنانچہ اس نے مزید کچھ نہ کہا صرف یہ تاکید کی کہ "کیلاجان ذرا احتیاط کرنا اور وہاں زیادہ دیر تک نہ ٹھیرنا، کیونکہ کھیتوں میں نمی بہت زیادہ ہے۔" سو وہ اپنی گاڑی لے کر چلا گیا اور اس کی بیوی کپاس کے کھیتوں کی طرف روانہ ہو گئی جہاں جا کر وہ دوسروں میں شامل ہو گئی۔ جُھک کر چُنائی کا کام کرنا اس کے لئے بہت ہی مضر ثابت ہو سکتا تھا لیکن اس نے دوسروں کے ساتھ برابر رہنے کے لئے اپنی پوری قوت صرف کی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کی ساس رضوان بھی تھی اور یہ بڑی بی کام کرتے ہوئے جوان دلہن کی نگرانی بڑی تشویش سے کر رہی تھی۔ ہر لحہ اسے ڈر تھا کہ کچھ ہو جائے گا۔
ایک گھنٹہ گزر گیا۔ کیلاجان پودوں کی ایک کیاری کا کام ختم کر کے دوسری کیاری پر جا لگی۔ رضوان اس کے ساتھ ساتھ لگی ہوئی تھی تاکہ اگر فوری طور پر ضرورت پڑے تو وہ اس کی مدد کر سکے۔ دونوں عورتیں اپنی کیاری کا پہلا نصف حصہ پورا کر چکی تھیں کہ کیلاجان کی حالت دگرگوں ہونے لگی، لیکن اپنی آخری قوت کے ذریعہ اس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی تاکہ کوئی اور یہ نہ جان سکے کہ صورتِ حالات کیا ہے۔
اس کے اندر درد اور شرم کے درمیان کشمکش ہوتی رہی، یہاں تک کہ وہ اپنے آپ کو سیدھا کھڑا رکھنے کے قابل نہ رہی اور مجبور ہو گئی کہ زمین پر گر پڑے۔ اسے معجزہ کہہ لیجئے کہ ادھر وہ گری اور ادھر کپاس کے پودے اس کے اوپر پردہ پوش بن کر جھک گئے تاکہ اسے متجسس نگاہوں سے بچائیں۔ بڑی بی ایک دم کیلاجان کے پہلو میں تھی۔ اس نے خود اپنا فرغل اتارا اور اسے نوجوان دلہن کے نیچے بچھا دیا۔
"اچھی ماں! کوئی میرا حال دیکھنے نہ پائے!" کیلاجان نے لجاجت سے کہا۔
"تم فکر نہ کرو" بڑی بی نے اسے تسلی دلاتے ہوئے جواب دیا۔
کیلاجان کے دردوں کا دورہ لحظہ لحظہ زور پکڑ رہا تھا۔ رضوان نے جیسے اندازہ تھا کہ صورتِ حالات کیسی خطرناک ہے، چپکے چپکے کام میں مداخلت کرتے ہوئے دو اور عورتوں کو اپنی مدد کے لئے طلب کیا۔ رضوان نے ان کو کچھ ہدایات دیں اور خود کالخوز کے کارپرداز کی طرف دوڑی۔ لیکن اسے کوئی نہ ملا۔ اور نہ کوئی ڈاکٹر دستیاب ہوا، نہ کوئی قابلہ! موضع فوسل کے لئے قریب ترین ڈاکٹر چار میل کی دوری پر مل سکتا تھا، اس کے علاوہ قریب ترین شفاخانہ زچگی ضلع کے صدر مقام پر تھا۔
بی رضوان بدحواسی کے عالم میں واپس آئی جہاں غریب کیلاجان کے گرد بہت سی عورتوں نے ہجوم کر رکھا تھا۔ وہ ہمدردی کے کلمات سے اس کی ہمت بندھا رہی تھیں، لیکن افسوس کہ ان میں سے کوئی بھی اسے مطلوبہ مدد پہنچانے کی اہل نہ تھی۔
رضوان کے آنے کے فوراً ہی بعد دونوں انسپکٹر بھی چُنائی کی دیکھ بھال کے لئے آ پہنچے۔ والکوف کی نگاہ جب عورتوں کے جمگھٹے پر پڑی تو وہ گھوڑے کو ایڑ لگا کر موقع پر پہنچا۔
"یہ کیسی مجلس ہے؟" وہ چلایا ــــــ دراصل ایک اُس کے منہ سے الکوحل کی بُو بھی اُبلی پڑ رہی تھی۔
"جاؤ یہاں سے، یہاں مردوں کا کوئی کام نہیں" بی رضوان نے جواب دیا۔
"معاملہ کیا ہے؟" کہتے ہوئے پارٹی آرگنائزر بھی اب اس معاملہ میں شریک ہو گیا۔
بغیر کوئی لفظ کہے بی رضوان نے اسے دکھایا کہ یہاں کیا قصہ درپیش ہے اور پارٹی آرگنائزر نے والکوف کو آگاہ کیا۔ اس سے ناظم

بڑے جابرانہ طریق سے کہا "اس وقت حکومت کو بچوں کی ضرورت نہیں ہے، اسے کپاس چاہئے! جاؤ تم سب اپنے کام میں لگ جاؤ، یہاں زیادہ سے زیادہ ایک عورت رہ سکتی ہے۔"

عورتیں ہٹ گئیں اور صرف رضوان کیلا جان کے پاس رہ گئی، اور جب دونوں گھوڑ سوار پرے ہٹ گئے تو وہ جھکی اور اس نے قربان بے کی بیوی کے ماتھے پر سے پسینے کے قطروں کو صاف کیا۔ اس نے دل ہی میں کہا کہ یقیناً والکوف جیسا بڑا آدمی ایک مصیبت زدہ عورت کے لئے بہت کچھ کر سکتا ہے، لیکن وہ کوئی مدد کرے گا نہیں۔ اسے پسند ہی یہی ہے کہ ہمارے لوگ مر جائیں۔ وہ کہتا ہو گا کہ انھیں مرنے دو، بوڑھوں کو بھی، بچوں کو بھی اور ان کو بھی جو ابھی پیدا نہیں ہوئے۔ اور جتنا جلد یہ ہو اتنا ہی اچھا ہے!

کیلا جان کے درد دن کی لہر اپنے پورے زور میں تھی، اس نے کپاس کے پودوں کو مٹھیوں میں بھینچ رکھا تھا اور وہ خدا سے رحم کی دعائیں کر رہی تھی۔ یکایک پورے کھیت میں خبر اڑ گئی کہ ایک بچے کی ولادت ہونے والی ہے۔ چنانچہ نامر کار داں اور حکشی بے دونوں لپکے کہ شاید ان سے کسی طرح کی مدد مطلوب ہو۔

دو گھنٹے کے بعد ایک بچہ اس دنیا میں داخل ہوا ——— ایک خوبصورت بچہ، کالے بالوں والا، کالی انکھڑیوں والا اور دودھ جیسی اجلی جلد والا۔ عین اُس لمحے کہ وہ پیدا ہوا، آسمان پر بادل خوب گھر آئے اور زمین کے اوپر جیسے پانی کے پرنالے گرنے لگے! ——— کیا ایسے موقعوں پر فطرت مخلوق کے نئے صرف اپنی مخالفت ہی کا مظاہرہ کرتی ہے! کیوں نہ ایسا ہوا کہ ایسے وقت پر سورج چمک اٹھتا!

اب سوال یہ تھا کہ زچہ و بچہ کو گھر کیسے لے جایا جائے؟ آخر دو عورتیں ایک ڈنڈا ڈولہ سا بنا کر لائیں جس پر کیلا جان کو ڈال کر قربان بے کے گھر لے چلیں۔ بی رضوان نے اپنے سفید گلو بند میں بچے کو لپیٹا اور پریشانی کا بار گراں کندھوں پر لئے وہ ڈنڈا ڈولے کے پیچھے پیچھے روانہ ہوئی۔ کیلا جان نے اپنے کمرے میں پہنچنے سے پہلے آنکھیں نہ کھولیں جب اس نے اپنے جانے پہچانے ماحول کو پایا تو کراہنے لگی۔ آہستہ آہستہ اسے آرام آ گیا۔

کچھ دیر بعد قربان بے کپاس کے ذخیرے کے مرکز سے واپس لوٹا اور کھیتوں سے گزرتے ہوئے اس نے اپنی بیوی کو تلاش کیا۔ اسے وہاں نہ پا کر وہ کھٹکا اور بڑی تیزی سے ہنکاتا ہوا گھر کی طرف چلا لیکن جب وہ گھر پہنچا تو وہاں ایک ہجوم دیکھ کر وہ اور بھی تشویش میں پڑ گیا۔ اس کی جان میں جان اُس وقت آئی جب لوگوں نے اسے بیٹے کی پیدائش کی خوشخبری سنائی اور مبارکباد سے اس کا استقبال کیا۔

جب اسے سب کچھ معلوم ہو گیا تو وہ گھر میں گھسا اور اپنی بیوی کے بستر پر جا کر جھک گیا۔ اس کے چہرے پر اطمینان، خوشی اور فخر کے جذبات لہریں لے رہے تھے۔ اس نے بچے کو جھوڑا، اس کے چہرے کو کھولا، اور پیار کرنا چاہا لیکن وہ یہ دیکھ کر متفکر ہو گیا کہ بچے کی آنکھیں بند ہیں اور اس کے ننھے سے نتھنے ایک انوکھے طریق سے لرز رہے ہیں۔ اس نقشۂ احوال نے قربان بے کو مشتعل کر دیا اور وہ چلایا۔

"میرے بچے کو کیا ہو گیا ہے؟"

بی رضوان نے جواب دیا "اسے سردی لگ گئی ہے۔"

قربان بے کی آنکھیں بچے کے چہرے پر جم کر رہ گئیں لیکن اب وہاں کوئی جنبش باقی نہ تھی۔ آخر یہ ہوا کیا؟

قربان بے گہری توجہ کے ساتھ ننھے سے جسم پر جھک گیا تاکہ وہ اس کے قلب کی دھڑکن کی آواز سن سکے۔ لیکن وہاں کوئی دھڑکن رہی ہی نہ تھی! اس کا پہلوٹھا بچہ اس کے بازوؤں پر مردہ پڑا تھا۔

کمرہ ماتمی آوازوں سے بھر گیا خود قربان بے سُن ہو کر رہ گیا لیکن پھر وہ یکایک اٹھ کھڑا ہوا اس نے اپنے دانت پیسے، مٹھیاں بھینچیں اور چلّایا "یہ ملعون زندگی! ——— اور یہ ملعون روسی! جو ہم سے ہمارا سب کچھ چھین رہے ہیں ——— ہمارے بچوں کی زندگیاں تک چھین رہے ہیں!"

ماخوذ ترجمہ از مجلۂ "ملت ترکستان"

——— + ———
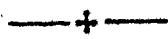
زکوٰۃ

(اموالِ زکوٰۃ، مقدارِ نصاب، شرح، وقتِ وجوب اور مستحقینِ زکوٰۃ کی تفصیل)

یہ نقشہ "زکوٰۃ کی حقیقت اور اس کے اصولی احکام" (ترجمان القرآن جلد ۳۵ عدد ۱) کو سامنے رکھ کر مرتب کیا گیا ہے۔ اس لئے تفصیلات اس میں ملاحظہ فرمائیے۔ مذکورہ بالا ماخذ سے صرف ایک مسئلے میں اختلاف کیا گیا ہے یعنی سونے کے نصاب کو اس نقشہ میں چاندی کے تابع کر دیا گیا ہے۔ یہ مرتب کا اجتہاد نہیں بلکہ پہلے سے علماء کا ایک گروہ اسی کا قائل ہے اور راقم الحروف نے ان کی رائے کو ترجیح دی ہے۔ تجویز یہ ہے کہ اس نقشے کو باقاعدہ چارٹ کی صورت میں شائع کر دیا جائے۔ ہم مزید مشوروں کے منتظر رہیں گے۔

نمبر شمار	قسم مال	تفصیل انواع	مقدار نصاب	شرح	زکوٰۃ کب واجب ہوتی ہے	ضروری اشارات
۱	زرعی پیداوار	ا۔ بارانی رقبے کی پیداوار ب۔ آبپاشی رقبے کی پیداوار		۱۰۔ فی صدی ۵۔ فی صدی	ہر فصل اٹھانے پر " " "	۱۔ زرعی پیداوار میں غلّے کی تمام فصلیں صنعتی فصلیں اور قابلِ ذخیرہ داری پھلوں اور سبزیوں کی فصلیں شامل ہیں۔ ۲۔ سبزی اور چارے کی ناقابلِ ذخیرہ داری فصلوں پر زرعی زکوٰۃ تو نہیں ہوگی لیکن ان کی کاشت و برداشت اور خرید و فروخت کے کاروبار پر تجارتی زکوٰۃ عاید ہوگی جس کا حساب نمبر شمار (۳) کے تحت مذکور ہے۔
۲	نقود ا۔ روپیہ پیسہ	ا۔ نقد بدست (سکوں اور نوٹوں کی شکل میں) ب۔ بنکوں میں رکھی ہوئی امانات ج۔ سیونگ سرٹیفکٹ وغیرہ د۔ درشنی ہنڈیاں	½ ۵۲ تولہ چاندی یا کم سے کم مالیت	½ ۲ فیصدی	ایک سال گزرنے پر	۱۔ نقود کی مختلف اقسام کا مجموعہ بھی اگر نصاب کو پہنچ جائے تو زکوٰۃ عائد ہوگی۔ ۲۔ ساڑھے باون تولہ چاندی کی مالیت متعین کرنے کی ضرورت زکوٰۃ کا حساب کرنے میں پیش آتی ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ جس تاریخ کو زکوٰۃ کا حساب کیا جائے اس تاریخ کو منڈی میں چاندی کا جو نرخ ہو اس سے مالیت متعین کر لی جائے مثلاً مورخہ ۲۳۔ جون ۱۹۵۱ء کو چاندی کا نرخ

	۲۔ چاندی	۱۔ دھات غیر مصنوعہ ب۔ زیور یا دوسری مصنوعات کی شکل میں۔	۵۲½ تولے کی مقدار	۲½ فیصدی	ایک سال گزرنے پر	۷۴ روپے فی سیر تھا، لہٰذا اس تاریخ کو ۵۲½ تولے چاندی کی مالیت ۶۰ روپے ۷ آنے ۲ پائی قرار پائے گی۔ ۳۔ جواہرات وغیرہ جو زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہیں، ان پر حکومت مناسب سمجھے تو دوسرے ٹیکس لگا سکتی ہے۔ ۴۔ غیر ملکی سکے اگر بآسانی ملکی سکوں میں تبدیل کئے جا سکتے ہوں تو وہ نقود کی تعریف میں شامل ہیں۔
	۳۔ سونا	۱۔ دھات غیر مصنوعہ ب۔ زیور یا دوسری مصنوعات کی شکل میں۔	۷½ تولے کی مقدار			
۴	کاروباری "زرگرداں"	۱۔ مستقل کاروبار ب۔ کمپنیوں کے حصص	زرگرداں ۵۲½ تولے چاندی کے ہم مالیت ہو۔ سرمایۂ حصص ۵۲½ تولے چاندی کے ہم مالیت ہو۔		ایک سال گزرنے پر " " "	۱۔ "زرگرداں" کی اصطلاح اس لئے استعمال کی گئی ہے کہ سرمائے کی جو مقدار عمارات، آلات، مشین، یا "عوائق" و وسائل میں کھپ جاتی ہے وہ زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہے۔ اس کو الگ کرنے کے بعد سرمائے کی صرف ایک ہی قسم رہ جاتی ہے اور اس کا نام "زرگرداں" ہے۔ زرگرداں کا اندازہ نقد اور اسٹاک (اجناس خام یا مال مصنوعہ) کے مجموعے سے کیا جا سکتا ہے۔ ۲۔ جو اشیا کرایہ پر دی جاتی ہیں ان میں لگا ہوا سرمایہ ان کے منافع سے مشخص کر کے ان پر تجارتی زکوٰۃ عائد کی جا سکتی ہے۔ ۳۔ مرغی خانے اور شیر خانے وغیرہ قسم کے کاروبار پر بھی تجارتی زکوٰۃ عاید ہوگی۔

نوٹ: کاروباری سرمائے کا سالانہ حساب بنانے میں بڑی پیچیدگی یہ ہے کہ اصل زر کے ساتھ ہر روز منافع مل کر سرمایہ بنتا جاتا ہے، پھر ایک تاجر وقتاً فوقتاً مزید رقوم سرمائے میں شامل کرتا چلا جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس بارے میں قدیم فقہ بھی پوری روشنی ہم نہیں پہنچاتی اور کوئی جدید اجتہادی مسلک بھی ہمارے پیشِ نظر نہیں ہے۔ ائمہ و فقہا سے جو رہنمائی ملتی ہے

	اس کے تحت ممکن العمل صورت یہ ہے کہ شروع سال کے "زرگرداں" اور ختم سال کے زرگرداں (نقد مع اسٹاک) کا اوسط لے کر اس پر زکوٰۃ محسوب کر لی جائے۔ اس عام اصول سے وہ بڑی نمایاں رقوم مستثنیٰ رکھی جائیں جنہیں کسی خاص موقع پر کاروبار میں شامل کیا گیا ہو۔ ایسی رقوم پر جب بھی سال پورا ہو جائے تو ان کی زکوٰۃ الگ سے ادا کر دی جائے۔					
۴	دفینہ (برآمد شدہ)			۲۰ ٪	برآمد ہونے پر	
۵	معدنیات	ا۔ ٹھوس دھاتیں ب۔ مائعات (پٹرول، پارہ وغیرہ) ج۔ یا جوامد (گندھک وغیرہ)		۲½ فیصدی	برآمد ہونے پر	
۶	مواشی	ا۔ بھیڑ بکریاں	۴۰۔ راس	(۴۰ تا ۱۲۰ بکریوں پر) = ایک بکری (۱۲۱ تا ۲۰۰ بکریوں پر) = ۳ بکریاں ہر سو پر ایک ایک بکری زیادہ کرتے جائیں۔		۱۔ زکوٰۃ صرف ایسے مواشی (بکری، گائے، بیل، بھینس، اونٹ) پر عائد ہوگی جو بقدر نصاب ہوں، افزائشِ نسل کے لئے پالے جائیں اور گھر پر بندھے ہوئے نہ پلیں بلکہ چراگاہ جاتے ہوں۔ ۲۔ ایسے مواشی جو بہ حیثیت "عوامل" (ذریعۂ کاروبار) کام کرتے ہوں ان پر زکوٰۃ نہیں۔ بلکہ زکوٰۃ ان سے ہونے والی آمدنی پر عائد ہوگی جبکہ اس پر ایک سال گزر جائے۔ ۳۔ مویشیوں کی تجارت کی جائے تو تجارتی زکوٰۃ عائد ہوگی جو نمبر شمار (۳) کے خانے میں مذکور ہے۔ ۴۔ مواشی کی زکوٰۃ خود مواشی کی شکل میں بھی ادا کی جا سکتی ہے اور ان کی رواجی قیمت لگا کر نقدی کی شکل میں بھی دی جا سکتی ہے۔
		ب۔ گائے، بیل، بھینس	۳۰۔ راس	۳۰ تا ۳۹ پر = ایک بچھڑا ایک سالہ ۴۰ پر ایک بچھڑا دو سالہ		
		ج۔ اونٹ	۵۔ راس	۵ تا ۲۴ پر = ہر پانچ کے لئے ایک بکری		

			۲۵ تا ۳۵ پر ایک اونٹنی جو دوسرے سال میں لگ گئی ہو۔ ۳۶ تا ۴۵ پر ایک اونٹنی جو تیسرے سال میں لگ گئی ہو۔ ۴۶ تا ۶۰ پر ایک اونٹنی جو چوتھے سال میں لگ گئی ہو۔ نوٹ: مزید تفصیل درج کرنا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔			
۷	چند مخصوص اموال ۱۔ دئیے ہوئے قرضے	ا۔ اگر سہل الحصول ہوں	۵۲½ تولے چاندی کی قیمت کے برابر	۲½ فیصدی	عام نقد روپے پیسے کی طرح جب سال پورا ہو جائے	
		ب۔ اگر ان کی وصولی یقینی نہ ہو	" " " "	" "	وصول ہونے پر ایک سال کی زکوٰۃ ادا کی جائے	
	۲۔ لئے ہوئے قرضے	ا۔ جو سال بھر پس انداز رہیں ب جن کو کاروباری سرمایہ بنایا گیا ہو۔	" " " " " " "	" " " "	سال پورا ہونے پر " " "	
۸	پراویڈنٹ فنڈ اور بیمہ	ا۔ جبری ب۔ اختیاری	۵۲½ تولہ چاندی کی قیمت کے برابر " " " "	۲½ فیصدی " "	جب رقم وصول ہو جائے سال پورا ہونے پر	رقم کے اس حصہ کی ایک سال کی زکوٰۃ واجب الادا ہوگی جو کسی ملازم کی اپنی تنخواہ میں سے وضع ہوتا رہا ہے لیکن اسمیں جو کچھ بطور عطیہ شامل کیا گیا ہو وہ مستثنیٰ ہے۔ اس کا حساب قبضے میں آنے کے بعد سے شروع ہوگا۔ ہر سال صرف اس رقم پر زکوٰۃ دینی ہوگی جو کسی ملازم کی تنخواہ میں سے وضع ہو کر سال بھر جمع رہی ہو۔ اس عطیہ پر قبضے میں آنے سے قبل کوئی زکوٰۃ محسوب نہ ہوگی جو اسکی اپنی رقم میں شامل کیا جاتا ہو۔

نوٹ: سود کا جو حصہ پراویڈنٹ فنڈ یا بیمہ کے پریمیم میں شامل ہوگا اس کا استعمال کرنا شرعاً حرام ہے۔ لہذا اس پر زکوٰۃ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

نوٹ: (۱) مرہونہ زمین کا عشر یا مرہونہ کاروبار یا زیور کی زکوٰۃ وہ ادا کرے جو اس پر قابض ہو۔ (۲) یتیم اور فاتر العقل اور قیدی کے اموال کی زکوٰۃ ان کے اولیا ادا کریں۔ (۳) متوفی کے ذمے اگر زکوٰۃ باقی واجب الادا ہو تو چاہیے اس نے وصیت کی ہو یا نہ کی ہو اس کے ورثا پر لازم ہے کہ وہ ترکے میں سے ادا کریں۔ (۴) متنازعہ فیہ اموال کی زکوٰۃ دوران نزاع میں وہ شخص دے گا جو ان پر قابض ہے اور فیصلے کے بعد ان کی زکوٰۃ کا ذمہ دار وہ ہوگا جس کے حق میں فیصلہ ہو۔

مستحقینِ زکوٰۃ

نمبر شمار	مستحق	تعریف	ضروری اشارات
۱	فقراء	فقیر ہر وہ شخص ہے جو اپنی بسر اوقات کے لئے دوسروں کی مدد کا محتاج ہو۔	وہ تمام لوگ فقراء میں شامل ہیں جو بڑھاپے یا کسی دوسرے جسمانی نقص کی وجہ سے معذور ہو گئے ہوں یا یتیمی، بیوگی اور بےروزگاری کی وجہ سے محتاجِ امداد ہوں۔
۲	مساکین	مسکین وہ ہے جو نہ اپنی حاجت بھر مال پاتا ہے، نہ پہچانا جاتا ہے کہ لوگ اس کی مدد کریں، نہ کھڑے ہو کر لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے (حدیثِ نبوی)	وہ تمام شرفاء مساکین میں شامل ہیں جو روزی کے لئے ہاتھ پاؤں مارتے ہیں مگر بقدرِ ضرورت نہیں پاتے اور نہ شرافت کی وجہ سے سوال کر سکتے ہیں۔
۳	عاملینِ زکوٰۃ	عاملین وہ لوگ ہیں جو زکوٰۃ کی تحصیل، تقسیم اور اس کے حساب کتاب پر مامور کئے گئے ہوں۔	عاملین صاحبِ نصاب ہوں تو بھی زکوٰۃ کی مد سے تنخواہ پائیں گے۔
۴	مؤلفۃ القلوب	ایسے لوگ جن کو اسلام یا اسلامی ریاست کے مفاد کی مخالفت سے روکنے، یا اس مفاد کی خدمت پر آمادہ کرنے کے لئے مال صرف کر کے زیرِ اثر لینا ناگزیر ہو۔	اس صف میں غیر مسلموں کے ساتھ ضعیف الایمان مسلمان بھی شامل کئے جا سکتے ہیں ——— چاہے وہ اسلامی مملکت کے شہری ہوں یا نہ ہوں۔ اس صف کے مسلمانوں کو صاحبِ نصاب ہونے کے باوجود زکوٰۃ دی جا سکتی ہے۔
۵	فی سبیل اللہ	وہ تمام مساعی جو خدا کے دین کو قائم کرنے، اس کی اشاعت کرنے اور اسلامی مملکت کا دفاع کرنے کے لئے کی جائیں۔ خواہ یہ مساعی تلوار کے ذریعہ عمل میں آئیں، یا قلم کے ذریعہ یا ہاتھ پاؤں کی محنت یا دوڑ دھوپ کے ذریعہ۔	(۱) فی سبیل اللہ کے معنیٰ رفاہِ عام کے کبھی نہیں لئے گئے۔ (۲) راہِ خدا میں جہاد کرنے والے اگر صاحبِ نصاب بھی ہوں تو بھی جہاد کے لئے ان پر زکوٰۃ خرچ کی جا سکتی ہے۔
۶	رقاب	وہ غلام جن کو آزاد ہونے کے لئے زرِ فدیہ ادا کرنے میں مالی مدد مطلوب ہو۔	
۷	غارمین	ایسے قرضدار لوگ جو اگر اپنا پورا قرض ادا کر دیں تو ان کے پاس بقدرِ نصاب مال باقی نہ رہے۔	ایسے لوگ کمانے والے بھی ہو سکتے ہیں اور بے روزگار بھی!
۸	مسافر	ہر وہ شخص جو سفر میں ہو۔	مسافر اگرچہ گھر پر صاحبِ نصاب ہو تو بھی حالتِ سفر میں زکوٰۃ سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

ضروری نوٹ: (۱) زکوٰۃ افراد اور اداروں سب کو دی جا سکتی ہے۔
(۲) زکوٰۃ کی مد میں سے یکمشت امداد بھی دی جا سکتی ہے، وظائف بھی، اور قرضِ حسن بھی!

(تعارف کتب وجرائد)

ہماری حکومت بجز ایک الحاد، بے دینی، بے پردگی اور مغربیت کو پھیلانے کی مہم کے اور کسی معاملے میں شاید ہی کوئی متعین پالیسی اور کوئی قطعی پروگرام رکھتی ہو۔ زندگی کے ہر شعبے میں جو کچھ ہو رہا ہے، آٹومیٹک طریق سے ہو رہا ہے اور ایک اندھی قوت (BLIND FORCE) کے دم قدم سے سارا کارخانہ سرگرم عمل ہے۔ اور شعبوں میں تو لوگ راضی بہ رضا اور تکیہ بر تقدیر ہو ہی گئے ہیں لیکن نظام صنعت سرمایے کی بڑی بھاری قوت کے ہاتھ میں ہے، چنانچہ یہ قوت اس مذاق کو برداشت نہ کر سکی جو صنعت کے ساتھ کیا جا رہا تھا۔ اس قوت نے وزارتِ صنعت پر جب ہلہ بولا ہے تو ایک ہی ایٹم بم میں یہ ہیروشیما کھنڈروں میں بدل گیا ہے۔ یہ ایٹم بم ایک پمفلٹ ہے جو "وزارتِ صنعت کی کارگزاری پر ایک نظر" کے عنوان سے انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں مرتب کیا گیا ہے۔ اس پمفلٹ کے لپیٹے میں وزارت صنعت کے متضاد بیانات اور تقاریر اور کھوکھلے وعدوں کا بے رحمانہ طریق سے "ایکس رے" کیا گیا ہے۔

مگر ہمارے اربابِ صنعت کا نقطۂ نظر خود غرضانہ ہے، اسی لئے وہ صرف اپنے مفاد کو بچانے کے لئے وزارتِ صنعت کے خلاف آواز اٹھا کر رہ گئے۔ حالانکہ وزارتِ صنعت ہماری حکومت کا صرف ایک پہلو ہے اور وہ مشترک ذمہ داری کے اصول کے تحت کام کرتی ہے۔ خرابی صرف وزارتِ صنعت کی نہیں، بلکہ "ایں خانہ تمام آفتاب است"!

یہ پمفلٹ بہرحال قابلِ دید ہے اور انجمن صنعت کارانِ پنجاب (۱۵۔ دل محمد روڈ، لاہور) نے شائع کیا ہے۔

—— + ——
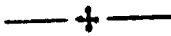
"اقبالیات" کے ذخیرے میں بشیر الحق رضوی کی کتاب "اصلاحاتِ اقبال" ایک اچھا اضافہ ہے۔ اس کتاب میں علامہ اقبال کی ان اصلاحات کو پیش کیا گیا ہے جو مرحوم نے اپنی متعدد نظموں میں جو مخزن وغیرہ میں شائع ہوتی رہی تھیں، بانگِ درا میں شریک کرتے ہوئے کیں۔ اس مختصر سے تحقیقی کام سے علامہ مرحوم کے شاعرانہ فنی ارتقا کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

یہ کتاب مکتبۂ دین و دانش، بانکی پور پٹنہ نے شائع کی ہے اور عمر میں مل سکتی ہے۔

—— + ——
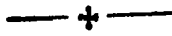
"فرائضِ پولیس" کے نام سے مولوی عبد اللہ لغاری صاحب (پیش امام مسجد پولیس، میرپور خاص) نے ایک عجیب و غریب پمفلٹ لکھا ہے۔ اس میں مقابلۃً یہ دکھایا ہے کہ انگریزی دور کی پولیس اور پاکستان کی پولیس میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ پاکستانی پولیس کا نقشہ پڑھیے تو بالکل معلوم ہوگا کہ خلافتِ راشدہ کا دور پلٹ آیا ہے۔ غالباً مولوی صاحب نے "ایسا ہونا چاہیے" کو "ایسا ہے" کے پیرائے میں پیش ... اسلوب پیدا کیا ہے۔ مگر اس سے بڑی غلط فہمی پیدا ہوتی ہے۔ ترتیب اور زبان کے پہلو بھی کمزور ہیں۔ قیمت ۸ آنے

—— + ——
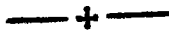
... ک استقلال کی لیڈرشپ اربابِ تجدد کے ہاتھوں میں تھی اور دین پسند عناصر ان کے دست و بازو تھے۔ لہٰذا ...

گلگشت

حالات مصر کے توڑے گئے اسلام کے نام پر اور بازی رہی تجدد کے ہاتھ۔ ان دین پسند عناصر کی صف میں سعید حلیم پاشا بھی شامل ہیں جن کی نگاہ ہمیشہ اسلامی نظام پر رہی اور غالباً یہ اپنے بہت سے معاصرین کے مقابلے میں اسلام کی اجتماعی ہیئت کو بہتر طور پر سمجھنے والے تھے۔ سعید حلیم پاشا کی فکر کو ان کی فرانسیسی کتاب سے پکتھال نے انگریزی میں منتقل کیا ہے اور پھر اسے سید ہاشمی صاحب فرید آبادی نے "خدا کی بادشاہت" کے نام سے اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ پہلے یہ ترجمہ ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا تھا اور اب پاکستان بننے پر دستور و نظام اسلامی کی بحثوں کے درمیان دوبارہ مکتبہ تعمیر انسانیت (۲۵۔ گجر گلی، موچی دروازہ، لاہور) نے شائع کیا ہے۔ سعید حلیم پاشا کے جذبات صالح ہیں مگر فکر دھندلی ہے۔ اپنے دور میں یہ کتاب موجودہ دور کے مقابلے میں زیادہ قدر و قیمت کی حامل تھی۔ تاہم آج بھی قابلِ استفادہ ہے۔ (قیمت درج نہیں)
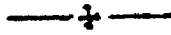
چند حیدر آبادی اکابر نے حیدر آباد ٹرسٹ قائم کیا ہے جس کے تحت ادارۂ کاروانِ ادب کی سرپرستی میں ایک ماہنامہ "کاروان" کے نام سے (تاراچند اسٹریٹ، لارنس روڈ، کراچی) شائع ہو رہا ہے۔ مضامین اور نظمیں معیاری ہیں۔ لیڈروں، حکام اور بے پردہ عورتوں کی تصاویر کا فتنہ بھی "کاروان" کا سامانِ زینت ہے۔ ادارت جناب شاہد حسین رزاقی کے ہاتھ میں ہے۔ چندہ سالانہ چھ روپے فی پرچہ ۸ آنے۔
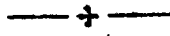
یہ رہا "نور و نار" کا سالنامہ۔ ایک طرف اسلام پسند اہلِ قلم کی تحریریں اس میں شریک ہیں اور دوسری طرف وہی گندی، کہانیاں کہ جن کے خلاف وہ لوگ، اعلانِ جنگ کر چکے ہیں۔ ستم یہ کہ یہ رسالہ خاص طور پر خواتین کے لئے شائع ہوتا ہے۔
یہ بجا کہ عورت کے جو حقوق علماء و فضلاء نے غصب کر رکھے ہیں ان کے لئے آپ لڑیں مگر جو حقوق مغرب زدہ طبقے نے اڑا لئے ہیں ان کے بارے میں چشم پوشی کیوں؟ "خلع" ضرور برحق مگر ساتھ ہی "طاعت" کی دعوت دینے میں تامل کیوں؟ جاہل بزرگوں اور ناعاقبت اندیش مولویوں کی آنکھیں ضرور کھولنی چاہئیں لیکن جاہل لیڈروں اور دین ناآشنا حکام کی بصیرت سے پردے نوچنے میں پس و پیش کس بنا پر؟
یہ باتیں اظہارِ نفرت کے لئے نہیں، ادارۂ نور و نار کے سوچنے کے لئے عرض کی گئی ہیں۔
کلثوم رحمٰن، اختر حمید اور محمد اشرف صابر کی ادارت میں ۱۱/۴۔ ایف، ماڈل ٹاؤن لاہور سے شائع ہوتا ہے۔ چندہ سالانہ خاص ۱۰ روپے، عام ۶ روپے۔ قیمت سالنامہ درج نہیں۔
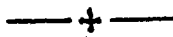
شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ برعظیم ہند کی تاریخ تجدیدِ اسلام میں ایک اونچا مقام رکھتے ہیں، اس لئے قدرتی طور پر آپ کی تصانیف لوگوں کے لئے مرکزِ توجہ بنتی ہیں۔ اور ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ شاہ صاحب کے علمی کارنامے اردو کے پیرائے میں عوام کے سامنے آئیں۔ اس وقت ہمارے سامنے شاہ صاحب کی دو کتابوں کے تراجم ہیں۔ ایک ہے خیر کثیر، دوسری البلاغ المبین!
خیر کثیر کا ترجمہ مولانا عبدالرحیم صاحب مولوی فاضل پروفیسر عربی اسلامیہ کالج پشاور نے کیا ہے۔ لیکن اس کتاب کو جو تشابہات کے غوامض سے بحث کرتی ہے اور نفسِ مضمون کے لحاظ سے ادق اور دقت کے ذوق سے بعید ہے، نجانے کیوں مولانا نے پسند کیا۔ پھر اس کا ترجمہ حد درجہ ناقص ہے اور زمانے کی زبان سے بے نیاز ہے۔ شاہ صاحب کے دور کی فارسی اور عربی اصطلاحات کو ترجمہ میں منتقل کر دیا گیا ہے۔

یہ ترجمہ ابناء مولوی محمد بن غلام رسول سورتی تاجران کتب (۱۳۲۔ ۱۳۴ جامع محلہ، بمبئی ۳) نے شائع کیا ہے۔ اس کی قیمت تین روپے ۸۔ آنے ہے۔

"البلاغ المبین" شرک اور مشرکانہ نظریات واوہام سے بحث کرتی ہے، اس لئے نسبتاً اس کی اشاعت زیادہ اہم ہے۔ مترجم کا نام درج نہیں، لیکن کوئی صاحب علم اور صاحب درد آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ تبلیغی جذبے کے تحت پہلے بعض مخیر لوگوں نے اس کے ایڈیشن خرید کر مفت تقسیم کئے ہیں اور اب اس کا چوتھا ایڈیشن قریباً لاگت کی قیمت پر مکتبہ تبلیغ۔ آدم کے ناگرہ، براستہ جامکی ضلع سیالکوٹ نے شائع کیا ہے۔ سادہ جلد کے ساتھ پونے دو سو صفحات کی یہ کتاب ۱۲ر آنے میں مل سکتی ہے۔

عبدالسلام خاں ایم، اے، ایل، ایل، بی نے ایک پمفلٹ "قانونِ شریعت" کے عنوان سے لکھا ہے۔ سلسلہ مختصر ادبیات اسلامی کی تیسری کڑی ہے۔ اس میں پاکستان میں قانونِ شریعت کے نفاذ پر زور دیا گیا ہے۔ قانونِ شریعت کے مآخذ کی قدیم ترتیب یعنی اول کتاب، دوم سنت، سوم اجتہاد وقیاس میں آپ نے ترمیم کرکے ان کو چار بنا دیا ہے، یعنی اول کتاب، دوم اجتہاد وقیاس (جسے آپ "حکمت" کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں) سوم سنت، چہارم فقہ۔ آپ نے قانون شریعت جاری ہونے کے بعد کے پاکستان کا بڑا مفصل خیالی نقشہ پیش کیا ہے، یہاں تک کہ گورنر جنرل کے لئے چھ کمروں والا مکان بھی تعمیر کر دیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ علماء اور جدید طبقہ پر جس انداز سے تبصرہ کیا ہے اس سے آپ کی دماغی اعجوبگی (ABNORMALITY) کھل جاتی ہے۔ ذہن میں خیالات بے ترتیبی سے بھرے ہوئے ہوں تو عموماً تحریر اسی طرح کی ہوتی ہے۔ آپ سے تعاون کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے آپ باوضو ہوکر ۱۹ مرتبہ بسم اللہ شریف پڑھیں، پھر ایک عہد نامہ پر کریں اور آٹھ آنے کے منی آرڈر کے ساتھ موصوف کو بھیج دیں۔ اس فنڈ سے دارالاشاعت اور ایک علمی ادارہ کا قیام عمل میں آئے گا۔

یہ پمفلٹ ماہ لقا بیگم مسز خاں (موصوف کی اہلیہ) نے مدنی دارالاشاعت دارالسلام ٹھٹھہ (سندھ) سے شائع کیا گیا ہے۔ قیمت ۸ ر آنے ہے

محکمہ تعلیم پنجاب کے منظور شدہ نصاب کے تحت "اشاراتِ قرآن" کے نام سے پارۂ عم کی آخری بارہ سورتوں اور سورۂ فاتحہ کا ترجمہ مکتبۂ فروغ اردو بازار کھٹیکاں، سیالکوٹ شہر نے شائع کیا۔ نقطۂ نظر درست ہے۔ کاغذ ہلکا استعمال کیا گیا ہے۔ پیش لفظ پروفیسر عاصی ضیائی کے قلم سے ہے۔ قیمت ۶ ر آنے۔

مکتبہ الحسنات رام پور کے لٹریچر کی نوعیت سے اب ہمارے قارئین اچھی طرح آگاہ ہیں۔ تعلیم بالغاں کے لئے اس مکتبہ کا مخصوص سیٹ، پہلی، دوسری، تیسری کتاب، سورج کا پیغام اور انسان کی کہانی پر مشتمل ہے۔ یہ کتابیں خوبصورت سرورق کے ساتھ اسلامی نقطۂ نظر سے مرتب کی گئی ہیں۔ تعلیم بالغاں سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب کے لئے مناسب ہوگا کہ اس سیٹ کا تجربہ کریں۔

ان کتابوں کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

قیمت پہلی کتاب ۳ ر دوسری کتاب ۳ ر تیسری کتاب ۴ ر سورج کا پیام ۵ ر انسان کی کہانی ۱۲ ر

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی نے حال ہی میں تین بیش قیمت کتابیں پیش کی ہیں۔

ایک تو "رسائل و مسائل" کے عنوان سے ۹۹ مسائل پر وہ تمام اہم سوالات و جوابات یکجا کر دئیے گئے ہیں جو ماہنامہ ترجمان القرآن میں گزشتہ کئی سال کے دوران میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ یہ سوالات و جوابات "تفسیر آیات و تاویلِ احادیث" "فقہی مسائل" "خلافیات" "عام مسائل"، "معاشی مسائل"، "چند کاروباری مسائل"، "سیاسی مسائل"، "جماعت اسلامی اور اس کی تحریک سے متعلق" کے جامع عنوانات کے تحت مرتب کئے گئے ہیں۔ اس ترتیب سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ زندگی کے تقریباً سارے گوشوں میں ہمارے روزمرہ کے بے شمار مسائل پر یہ کتاب اسلامی نقطۂ نظر سے بصیرت افزا معلومات فراہم کرتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا قلم یہ بھی واضح کرتا ہے کہ اسلام کے اصولوں کو مسائلِ حاضرہ پر منطبق کرنے کا صحیح طریقہ کیا ہے اور ایک مسلمان کا طرزِ فکر کیا ہونا چاہئیے۔ یہ کتاب اسلام اور تحریکِ اسلامی کے متعلق بے شمار غلط فہمیوں کو صاف کرنے کا کامیاب ذریعہ ثابت ہوگی۔

دوسری کتاب کا عنوان ہے "مرتد کی سزا اسلامی قانون میں"۔ یہ ایک معرکۃ الآرا مسئلہ ہے جس پر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے قلم اٹھایا ہے۔ انگریزی تصورات کی یورش میں جب شکست خوردہ ذہنیت کے ساتھ ہمارے کچھ ذہین لوگوں نے اسلام کے بعض احکام کے لئے معذرتیں اور تاویلیں پیش کرنی شروع کی تھیں تو منجملہ دوسرے مسائل کے سزائے ارتداد کا مسئلہ بھی اسی ذہنیت کا شکار ہوا تھا۔ اس ذہنیت کے خلاف تحریکِ اسلامی کا آغاز کرنے سے پہلے مولانا نے جو جہاد شروع کیا تھا، اسی کے سلسلے میں سزائے ارتداد پر بھی ایک سلسلۂ مضامین آپ نے لکھا۔ اس میں صرف یہی نہیں کہ کتاب و سنت اور خلفائے راشدین کے علمی نظائر سے قتلِ مرتد کی مشروعیت کو ثابت کیا گیا ہے، بلکہ یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ زمانۂ حاضر میں بھی قوم اور اسٹیٹ کی طرف سے اپنے مرتدین کو یہی سزا دی جاتی ہے اور عقل تقاضا کرتی ہے کہ ایسا ہو۔ اسلام بھی یہ سزا ایک مذہب کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک اسٹیٹ، ایک دین اور ایک اجتماعی نظامِ حیات کی حیثیت سے دیتا ہے۔

—— + ——

اس مسئلے پر بحث کرتے ہوئے بے شمار ایسے مسائل پر گفتگو کی گئی ہے جن کے ذریعے اسلام کی حقیقت پڑھنے والے پر واضح ہوتی ہے۔

تیسری کتاب "جماعت اسلامی کی دعوت و تاریخ" ہے جو اشارات کے اس سلسلے پر مشتمل ہے جسے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے رہائی کے بعد ترجمان القرآن میں شائع کیا ہے۔ یہ کتاب جماعت اسلامی کے پس منظر، اس کے مقصد، طریق کار، پالیسی، موجودہ پروگرام اور آئندہ کے مراحل کے متعلق تفصیل سے روشنی ڈالتی ہے۔ یہ کتاب جماعت کی ماضی کی تاریخ بھی ہے اور مستقبل کی رہنما بھی! نیز یہ مخالفانہ پروپیگنڈے کی ایک مثبت اور سنجیدہ تردید بھی ہے۔

اس کتاب کو پڑھ کر جماعت اسلامی کی ماہیت کو بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔

قیمت رسائل و مسائل مجلد مع خوشنما گرد پوش ۸ روپے۔ مرتد کی سزا ۱۲ آنے۔ جماعت اسلامی کی دعوت و تاریخ ۸ آنے۔

یہ کتابیں مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی، ۵، اے ذیلدار پارک، اچھرہ لاہور سے مل سکتی ہیں۔

—— + ——

مولوی عبدالحق جن کا دین ہی ترقیٔ اردو بن چکا ہے، اردو زبان کو پاکستان کی یونیورسٹیوں میں ذریعۂ تعلیم بنوانے کے لئے پوری کوشش کر رہے ہیں۔ اس وقت موصوف کا ایک رسالہ "اردو بہ حیثیت ذریعۂ تعلیم سائنس" کے نام سے ہمارے سامنے ہے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ اردو سائنس کی تعلیم کا ذریعہ بننے کے قابل نہیں، اس کا جواب اس رسالے میں اس طرح دیا گیا ہے کہ متعدد ذمہ دار اہلِ علم کو استفسار بھیج کر ان کی حاصل شدہ مفصل آراء کو یکجا شائع کر دیا گیا ہے۔ علاوہ بریں مصر اور ترکی وغیرہ کے تجربات کو شامل بھی کیا گیا ہے۔

شائع کردہ: انجمن ترقیٔ اردو۔ پاکستان۔ کراچی۔

مولانا مولوی حافظ محمد عبدالعزیز صاحب محدث رحیم آبادی کے قلم سے صحیحین کی احادیث کا ترجمہ "سواء الطریق" (حصہ اول) ہمارے سامنے ہے۔ متن ساتھ نہیں ہے۔ احادیث کی ترتیب اور ان کی فصل بندی کتب احادیث کے انداز پر ہی کی گئی ہے۔ یہ بہرحال ایک مفید خدمت ہے۔
شائع کردہ: ڈاکٹر سید محمد فرید صاحب ایم اے، ایل، اے لہریا سرائے، دربھنگہ (انڈیا) قیمت درج نہیں۔

—— + ——

جناب عطا محمد صاحب بلوچستانی نے نفسیات عاداتِ انسانی کے موضوع پر ایک ضخیم کتاب لکھی ہے۔ اس کتاب میں ایک طرف مغرب کے علمائے نفسیات کے نظریات بیان کئے گئے ہیں، دوسری طرف مثنوی مولانائے روم سے ان کی تردید کی گئی ہے۔ اس طرح کچھ عجیب سا مخلوطہ بن گیا ہے۔ بحثیں سائنٹفک نہیں ہیں، زبان اور اصطلاحات اور استدلال معیاری نہیں ہے، عنوان بندی کچھ پرانے طرز کی سی ہے۔
مؤلف سے سبی، بلوچستان کے پتے پر طلب کی جا سکتی ہے۔ قیمت پانچ روپے۔

—— + ——

مکتبۂ یثرب تدبر قرآن کے بعد جناب مولانا امین احسن اصلاحی کی دوسری کتاب "اسلامی ریاست میں فقہی مسائل کا حل" کے نام سے سامنے لایا ہے۔ فاضل مؤلف نے بڑے علمی طریق سے بتایا ہے کہ اسلام میں جائز اختلاف کے لئے کہاں تک آزادی کے حدود ہیں، کن اسباب کے تحت اختلافات اپنی حدود سے آگے بڑھے، موجودہ اختلافات کی تاریخ کیا ہے، ایک اسلامی نظامِ حکومت اختلافات کی گنجائش کہاں تک دیتا ہے۔ اور وہ اختلافات کو حل کیسے کرتا ہے، نیز فرقوں کی حیثیت کسی اسلامی ریاست میں کیا ہوگی۔
مکتبۂ یثرب، ۱۰۔ اے دی مال، لاہور سے ۱۲ میں ملے گی۔

—— + ——

جناب مولانا عبدالقیوم ندوی نے نبی صلعم کے خطبات کو یکجا کر کے خطباتِ نبوی کے نام سے شائع کیا ہے۔ یہ ایک قابلِ قدر خدمت ہے۔ خطبات کے متن کے ساتھ ساتھ اردو ترجمہ ہے۔ ہر خطبے کے ماخذ کا حوالہ بھی درج ہے۔
شکایت صرف اس بات کی ہے کہ کتابت و طباعت بہت ناقص ہے۔ کتاب دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ہم نولکشوری دورِ طباعت ہی میں ہیں۔
ملنے کا پتہ: محمد زبیر، کتب خانہ امجدیہ۔ قصبہ ستر کھ۔ ضلع بارہ بنکی (انڈیا) قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

—— + ——

انڈیا میں اس وقت انتخابات کا مسئلہ وہاں کے مسلمانوں کے لئے بڑی آزمائش بن کر سامنے کھڑا ہے۔ اس آزمائش سے نمٹنے کے لئے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ کانگریس کا ساتھ دو، کچھ کہتے ہیں کہ ہندو مہاسبھا کا دامن تھامو، کچھ کہتے ہیں کہ کنارے بیٹھ رہو، اور مسلمان عوام پریشانی میں مبتلا ہیں۔ انڈیا کی جماعت اسلامی چونکہ اپنا ایک اصولی موقف رکھتی ہے، لہٰذا اس کا نقطۂ نظر بالکل جداگانہ ہے۔ اسی نقطۂ نظر کی وضاحت "مسئلہ انتخابات اور مسلمانانِ ہند" نامی پمفلٹ میں انڈیا کی جماعت کے امیر جناب مولانا ابواللیث صاحب اصلاحی نے کی ہے۔
شائع کردہ: مکتبہ جماعت اسلامی ہند، رام پور۔
قیمت ۱۴ر آنے

—— + ——

نوائے عرب

شعراء

- مصطفیٰ صادق الرافعی
- عبدالوہاب عزام
- زہیر بن سلمیٰ
- سموئل
- قطری ابن الفجاءۃ
- شوقی
- ابوالاسود دؤلی

مترجمین

- محمد طٰہٰ صدیقی — رفیق دارالعروبہ
- محمد عاصم — "
- منہاج الدین — "

معذرت

افسوس کہ ان نظموں کو جو ترتیب دی گئی تھی کاتب نے بے توجہی میں اس کے بخیے ادھیڑ دیئے۔ اب اسی "اصلاح یافتہ" ترتیب کے ساتھ یہ پیشِ خدمت ہیں ـــــ !

مصطفیٰ صادق الرافعی

تیری ہی یاں پکار ہے!

جمعیت شبان المسلین کا ترانہ

ذیل میں جمعیۃ الشبان المسلمین کے ترانے کے چند بند پیش کئے جاتے ہیں، مصطفیٰ صادق الرافعی (وفات ۱۹۳۷ء) نے آج سے بیس برس قبل ۱۹۲۹ء اس زمانے میں یہ اشعار کہے تھے، جب کہ جمعیت ایک زندہ جماعت تھی، یہ وہی رافعی مرحوم ہیں، جن کے بارے میں امیر شکیب ارسلان رحمۃ اللہ نے فرمایا "لم تنجب العرب مثلہ منذ مئات من السنین"۔ (عربی دنیا نے صدیوں میں ایسا ادیب نہیں پیدا کیا۔) اگرچہ رافعی کا اشہب قلم نثر کے میدان میں زیادہ تیز گام ہے تاہم ذیل کا ترانہ بھی اپنا ایک خاص رنگ رکھتا ہے اور خاص طور پر راہِ حق کے مسافروں کے لئے ایک زندگی بخش اور حیات افروز رجز ہے۔

رَبَّنَا اِیَّاکَ نَدْعُو، رَبَّنَا — آتِنَا النَّصْرَ الَّذِیْ وَعَدْتَنَا

پروردگار تیرے ہی لئے ہماری پکار ہے — مددگار! ہمیں اپنی نصرت موعود سے سرفراز کر

اِنَّنَا نَبْغِیْ رِضَاکَ، اِنَّنَا — مَا ارْتَضَیْنَا غَیْرَ مَا تَرْضٰی لَنَا

تیری خوشی کے ہم طلب گار ہیں — اور ایک تیری خوشی کے سوا ہماری کوئی خوشی نہیں

اَنْفُسًا طَاهِرَةً طُهْرَ الْحَرَمْ — ہم چاہتے ہیں پاک نفوس۔ ارضِ حرم کی طرح پاک

تَمْلَأُ التَّارِیْخَ مَجْدًا وَّکَرَمْ — جن کی بزرگی و کرم سے تاریخ کے صفحات معمور

وَافِیَاتٍ بِالْعُهُوْدِ وَالذِّمَمْ — اپنے عہدوں اور ذمہ داریوں کے وفا شناس

رَاقِیَاتٍ لِلْمَعَالِیْ وَالْهِمَمْ — عزم و ہمت کی بلندیوں کے مکیں۔

اَلْعُلَا، اِنَّ الْعُلَا — وَاجِبَاتُ الْمُسْلِمِ

سربلندی و سرفرازی — مسلمان کے واجبات ہیں

خَیْرُ عَامٍ قَدْ خَلَا — کَانَ فِیْنَا یَنْتَمِیْ

گزرا ہوا بہترین عہد — ہماری نسبت سے ہی مفتخر ہے

لِلْعُلَا، نَحْنُ لَنَا — اُمَّةُ التَّقَدُّمِ

سربلندی ہمارے لئے — کہ ہم آگے بڑھنے والی امت ہیں

لِلْعُلَا، وَهَا اَنَا — بِحَیَاتِیْ وَدَمِیْ

الٰہی رفعت و سربلندی کیلئے — میری جان عزیز قربان

يَا شَبَابَ الْعَالَمِ الْمُحَمَّدِيِّ   يَنْقُضُ الْكَوْنَ شَبَابٌ مُهْتَدِي

گلزارِ محمدی کے نونہالو   دیکھو کہ دنیا ہدایت دینے والے نوجوانوں سے خالی ہو چکی

نَلَدَّدُ دِينُكُمْ لِيَقْتَدِي   بِنَا عَقْلٍ، وَضَمِيرٍ، وَيَدِ

زمانے کو اپنے دینِ مبین سے آشنا کراؤ وہ تمہاری تقلید کرے   میں بیس عقل و بصیرت، قلب و ضمیر اور قوت شوکت ہیں

يَا شَبَابَ الْعَزَمَاتِ الْمُبْرَمَهْ   عزمِ صمیم کی دولت سے مالا مال نوجوانو!

عَمَرُوا الْكَوْنَ الْعَلَاءَ وَالْمَكْرُمَهْ   زمانے کو تیار کرو عزت و سربلندی کیلئے

عَمَرُوا الْكَوْنَ الْهُدَى وَالرَّحْمَهْ   زمانے کو تیار کرو ہدایت و رحمت کیلئے۔

عَمَرُوا الْكَوْنَ النُّفُوسَ الْمُسْلِمَهْ   زمانے کو تیار کرو "نفوسِ مسلمہ" کے لئے ہیں۔

اَلْعُلَا، إِنَّ الْعُلَا   وَاجِبَاتُ الْمُسْلِمِ

سربلندی و سرفرازی   مسلمان کے واجبات ہیں

خَيْرُ عَالَمٍ خَلَا   كَانَ فِينَا يَنْتَمِي

گزرا ہوا بہترین دور   ہماری نسبت سے مفتخر ہے

لِلْعُلَا، فَإِنَّنَا   أُمَّةُ التَّقَدُّمِ

سربلندی ہمارے لئے   کہ ہم آگے بڑھنے والی امت ہیں

لِلْعُلَا، وَهَا أَنَا   بِحَيَاتِي وَدَمِي

ہاں اس رفعت و سربلندی کیلئے   میری جانِ عزیز قربان

فِي ضَمِيرِي دَائِمًا صَوْتُ النَّبِيِّ   آمِرًا، جَاهِدْ، وَكَابِدْ، وَتَعَبْ!

میرے ضمیر کی پہنائیوں میں رسول اللہ صلعم کی آواز گونج رہی ہے   ان کا حکم کہ اٹھو کمر ہمت باندھو اور تھکا دینے والی محنت سے بھی گریز نہ کرو

صَارِخًا، غَالِبْ، وَطَالِبْ، وَدَأَبْ   صَارِخًا كُنْ أَبَدًا حُرًّا أَبِي

ان کی آواز کہ غالب ہو کر رہو، ذوقِ طلب پیدا کرو، مسلسل کوشش   کئے جاؤ ان کی پکار کہ ہمیشہ ایک باوقار مردِ آزاد کی طرح رہو"

كُنْ سَوَاءً مَا اخْتَفَى وَمَا عَلَنْ   اپنے ڈھکے چھپے ہر معاملہ میں ایک رنگ ہو

كُنْ قَوِيًّا بِالضَّمِيرِ وَالْبَدَنْ   جسم و بدن اور قلب و ضمیر کو قوی کر

كُنْ عَزِيزًا بِالْعَشِيرِ وَالْوَطَنْ   خاندان اور وطن میں عزیز بن کر رہ

كُنْ عَظِيمًا بِالشُّعُوبِ وَالزَّمَنْ   اقوامِ زمن میں تیری عظمت کا ڈنکا بجے

اَلْعُلَا، إِنَّ الْعُلَا   وَاجِبَاتُ الْمُسْلِمِ

سربلندی و سرفرازی   مسلمان کے واجبات ہیں

خَيْرُ عَالَمٍ خَلَا   كَانَ فِينَا يَنْتَمِي

گزرا ہوا بہترین دور   ہماری نسبت سے ہی مفتخر ہے

لِلْعُلَا ، فَاِنَّنَا | اُمَّةُ التَّقَدُّمِ
سربلندی ہمارے لئے | کہ ہم آگے بڑھنے والی امت ہیں
لِلْعُلَا ، وَهَا اَنَا | بِحَيَاتِيْ وَدَمِيْ
ہاں اسی رفعت و سربلندی کیلئے | میری جان عزیز قربان

رَبِّ بِالْاِسْلَامِ قَدْ هَدَيْتَنِيْ | رَبِّ مِنْ نُوْرِكَ قَدْ آتَيْتَنِيْ
پروردگار تو نے مجھے اسلام کی راہ راست بتائی | اور اپنے نور سے مستنیر فرمایا
فَعَلَيَّ الْعَهْدُ ــــ مَا اُحْيِيْتَنِيْ | اَحْرُسَ الْكَنْزَ الَّذِيْ وَهَبْتَنِيْ
پس ــ جیتے جی ــ مجھ پر فرض ہے کہ تیری عطا کردہ | دولت کی پوری پوری حفاظت کروں ــ

اَوْ اَمُوْتَ دُوْنَهُ مَوْتَ الْبَطَلْ | یا اس راہ میں ایک بہادر کی موت مروں
ثَابِتًا اَحْيَا بِقَلْبٍ مِنْ جَبَلْ | اپنے دل کو پہاڑ سے زیادہ مضبوط و محکم رکھتے ہوئے
نَيِّرًا اَحْيَا بِرُوْحٍ مِنْ شُعَلْ | شعلوں سے زیادہ روشن روح کے ساتھ مسلسل کوشش
جَاهِدًا اَحْيَا بِجِسْمٍ مِنْ عَمَلْ | کرتے ہوئے ، جسم کی تمام تر قوتوں سے زیادہ

اَلْعُلَا ، اِنَّ الْعُلَا | وَاجِبَاتُ الْمُسْلِمِ
سربلندی اور سرفرازی | مسلمان کے واجبات ہیں
خَيْرُ عَامٍ لَمْ يَخْلُ | كَانَ فِيْنَا يَنْتَمِيْ
گزرا ہوا بہترین دور | ہماری نسبت سے ہی مفتخر ہے
لِلْعُلَا ، فَاِنَّنَا | اُمَّةُ التَّقَدُّمِ
سربلندی ہمارے لئے | کہ ہم آگے بڑھنے والی امت ہیں
لِلْعُلَا ، وَهَا اَنَا | بِحَيَاتِيْ وَدَمِيْ
ہاں اسی رفعت و سربلندی کے لئے | میری جان عزیز قربان

مترجم :- محمد طٰہٰ صدیقی - رفیق دار العروبہ

احکام قرآنی

اس کتاب میں ہر مسئلۂ حیات یعنی اعتقادات - عبادات - واجبات - جائزات و معاملات وغیرہ پر قرآنی احکام و اصول بہترین ترتیب اور کسی قدر شرح کے ساتھ جمع کئے گئے ہیں - مصنفہ ایم - عبد الرحمٰن خاں - قیمت تین روپے آٹھ آنے

ملنے کا پتہ

مکتبہ افکارِ اسلامی - چوک نقی روڈ - بالمقابل ریجس بک سوسائٹی - انار کلی - لاہور

عبد الوہاب عزام

اشتراکیت

أَحْدَثُ الدَّعَوَاتِ فِي هٰذِي الأُمَمِ
تَسْلُكُ الإِنْسَانَ فِي سِلْكِ الغَنَمِ
تَعِدُ الإِنْسَانَ بِالمَرْعَى الخَصِيبِ
فِيهِ عُشْبٌ وَزُغَاءٌ وَنَبِيبٌ
تَعِدُ الإِنْسَانَ أَعْشَابَ الرَّبِيعِ
ثُمَّ عَيْشٌ مِثْلَ مَا عَاشَ القَطِيعُ
يُوعَدُ المَرْعَى وَلَا شَيْءَ لَهُ
وَعَصَا الرَّاعِي تُرِيهِ كُلَّهُ
لَيْسَ يُغْرِيهِ بِهِمْ: أَيْنَ المَسِيرُ
لَا، وَلَا يَشْعُرُ إِلَى أَيْنَ المَصِيرُ
وَيَتِمُّ الشِّبْهُ فِيهِ بِالغَنَمِ
قَطْعُهُ عَنْ مَنْبَعِ الخَيْرِ العَمَمِ
كُفْرُهُ بِاللهِ وَالخَيْرِ وَمَا
فِيهِ إِنْسَانٌ عَنِ العُجْمِ سَمَا
ضَيَاعُ البَيْتِ مِنْهُ وَالرَّحِمِ
وَحَنَانِ القَلْبِ مِنْ أُخْتٍ وَأُمّ
كَافِرٌ بِاللهِ لَا بِالوَثَنِ
كَافِرٌ بِالسِّلْمِ لَا بِالفِتَنِ
يُبْصِرُ الظُّلْمَةَ عِنْدَ الصَّنَمِ
عَنْ ضِيَاءِ اللهِ وَالحَقِّ عَمِي
كُلُّ مَا فِي البَيْتِ مِنْ وُدٍّ وَحُبّ
لَا يُسَاوِي عِنْدَهُ مِكْيَالَ حَبّ
كُلُّ مَا يَدْعُو أُنَاسٌ بِالشُّعُورِ
لَا يُسَاوِي عِنْدَهُ كَفَّ شَعِيرِ

اشتراکیت ان مغربی تحریکوں میں جدید ترین تحریک ہے جو انسان کو بھیڑوں کا ایک گلہ بنا کر رکھتی ہے ۔

وہ انسان سے ایک سرسبز و شاداب چراگاہ کا وعدہ کرتی ہے جس میں ہری بھری گھاس ہو اور دوسری بھیڑوں کی آوازیں ۔

وہ انسان سے موسم بہار کی طرح طرح کی گھاس کا وعدہ کرتی ہے، جس کے بعد ایک زندگی ہے جو بھیڑوں کے گلے سے بہتر نہیں ہے ۔

انسان سے اسی طرح کی چراگاہ کا وعدہ کیا جاتا ہے مگر دراصل اس میں اس کے لئے کچھ نہیں ہے، گڈریے کی لاٹھی ہی ہے جسے اس کا چارہ دکھایا جاتا ہے ۔

انسان نما بھیڑوں کا یہ گلہ اپنے ہانکنے والوں سے کبھی نہیں پوچھتا، یہ چلنا کس جگہ اور کہاں تک ہوگا !

انسان کی بھیڑ سے مشابہت کو یہ چیزیں مکمل کر دیتی ہیں، اس کا خیر و بھلائی کے منبع سے کاٹ دیا جانا، اس کا کافر بننا ہے ۔

اللہ، خیر و بھلائی اور ہر ایسی چیز کا جس کی بدولت انسان حیوانات سے افضل قرار دیا گیا ۔

اس کا گھر کی زندگی سے وہ محروم ہونا اور رشتے داروں کا اس سے چھوٹنا اور ماں اور بیٹی کے دل کی محبت سے اس کا بیگانہ ہونا ۔

وہ اللہ کا کافر ہے نہ کہ بت کا ۔ وہ صلح و آشتی کا منکر ہے نہ کہ جنگ و فساد اور خون ریزی کا ۔

بُت کے قریب اسے اندھیرے کے سوا کوئی چیز سجھائی نہیں، اللہ کے نور اور حق سے تو وہ بالکل اندھا ہوتا ہے ۔

گھر اور اس کی زندگی میں جو پیار و حُب (محبت) ہوتا ہے اس کے نزدیک ایک حبّ (دانہ) کی قیمت نہیں رکھتا ۔

جس شعور و وجدان کے ساتھ دوسرے لوگ اپنی اپنی دعوتیں پیش کرتے ہیں اس کے نزدیک اس کی قدر ایک کفِ شعیر (مٹھی بھر جو) سے زیادہ نہیں ۔

ذَلِكُمُ السَّيْرُ وَهَذَا الْمُنْتَهَى ۔ یہ ہے مقصد سفر اور یہ ہے اس کا انجام اور منزل مقصود ۔ اے
أَنْعِمُوا التَّفْكِيرَ يَا أَهْلَ النُّهَى ۔ عقل رکھنے والو! اسے سمجھنے کے لئے اپنی قوت فور و فکر سے کام لو۔

یہ اشعار ڈاکٹر عبدالوہاب عزام سفیر مصر کی نئی نظم " اللمعات " سے لئے گئے ہیں، جو انہوں نے اقبال کی " اسرار خودی " اور " رموز بےخودی " سے متاثر ہو کر لکھی ہے۔ اور ابھی ابھی " پیام مشرق " کے عربی ترجمہ کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ جیسا کہ خود انہوں نے دیباچہ میں ذکر کیا ہے، میں نے لفظی ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

(مترجم :۔ محمد عاصم، رفیق دار العروبہ)

زهیر بن سلمٰی
(جاہلی شاعر)

قانونِ مکافات

(۱)

وَمَنْ يَجْعَلِ الْمَعْرُوفَ مِنْ دُونِ عِرْضِهِ
يَفِرْهُ وَمَنْ لَا يَتَّقِ الشَّتْمَ يُشْتَمِ

جو شخص لوگوں سے میل جول میں اخلاق اور نرمی سے پیش آتا ہے، اور ان سے سختی سے پیش آکر اپنی آبرو کا امتحان نہیں لیتا وہ اپنی آبرو کو بچا لے گا اور جو دوسروں کو گالی دے گا، تو ناگزیر ہے کہ اسے بھی گالی ملے۔

وَمَنْ يَكُ ذَا فَضْلٍ فَيَبْخَلْ بِفَضْلِهِ
عَلَى قَوْمِهِ يُسْتَغْنَ عَنْهُ وَيُذْمَمِ

جو شخص خوش حال اور مالدار ہونے کے باوجود اپنی قوم سے بخل و کنجوسی کا معاملہ کرتا ہے تو لوگ اس سے بیزار و بے نیاز ہو جائیں گے اور وہ ان کے مابین بدنام ہو جائے گا۔

وَمَنْ هَابَ أَسْبَابَ الْمَنَايَا يَنَلْنَهُ
وَإِنْ يَرْقَ أَسْبَابَ السَّمَاءِ بِسُلَّمِ

جو شخص موت کے ہتھکنڈوں سے ڈر کر بھاگنا چاہتا ہے تو ان کا اسے پالینا یقینی ہے خواہ وہ سیڑھی لگا کر آسمان ہی میں کیوں نہ جا بیٹھے۔

یہ تین شعر زہیر بن سُلمیٰ کے ہیں جس کا انتقال نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے ایک سال قبل ہوا، قبل اسلام جاہلیت کے تین ممتاز شعراء میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ حضرت عمر رضؓ اس کے بہت مداح تھے اور تمام جاہلی شعراء پر اسے ترجیح دیتے تھے۔

---

(۲)

سموأل (جاہلی شاعر)

إِذَا الْمَرْءُ لَمْ يَدْنَسْ مِنَ اللُّؤْمِ عِرْضُهُ
فَكُلُّ رِدَاءٍ يَرْتَدِيهِ جَمِيلُ

اگر انسان کی آبرو خست و کمینگی سے آلودہ نہ ہو تو جو لباس اور جو چادر وہ اوڑھ لے خوبصورت ہے۔

وَإِنْ هُوَ لَمْ يَحْمِلْ عَلَى النَّفْسِ ضَيْمَهَا	اگر وہ اپنے نفس پر سختی کرکے اسے اپنا مطیع و فرمانبردار نہیں بنا تا تو وہ
فَلَيْسَ إِلَى حُسْنِ الثَّنَاءِ سَبِيْلٌ	کسی ذریعہ سے لوگوں کی تعریف و ستائش کا حق دار نہیں بن سکتا۔

یہ دو شعر مشہور جاہلی یہودی شاعر سموءل کے ہیں جس کا انتقال ہجرت سے ۶۶ سال قبل ہوا۔ جس طرح حاتم طائی سخاوت میں ضرب المثل ہے۔ اسی طرح اہلِ عرب کے عہد میں سموءل وفا میں ضرب المثل ہے۔

(مترجم:۔ محمد عاصم، رفیق دار العروبہ)

قطری ابن الفجاءۃ

(خارجی شاعر)

حیاتِ بے قیمت

أَقُوْلُ لَهَا وَقَدْ طَارَتْ شَعَاعاً	اے چند بہادروں سے ہراساں اور حواس باختہ نفس، افسوس کہ تو ڈر رہا ہے
مِنَ الْأَبْطَالِ وَيْحَكِ لَنْ تُرَاعِي	حالاں کہ تجھے ڈرنا نہیں چاہیئے۔
فَإِنَّكِ لَوْ سَأَلْتِ بَقَاءَ يَوْمٍ	خواہ تو لاکھ چاہے لیکن اجل معین سے ایک دن بھی زیادہ باقی رہنا تیرے
عَلَى الْأَجَلِ الَّذِي لَكِ لَنْ تُطَاعِي	لئے ناممکن ہے۔
فَصَبْراً فِي مَجَالِ الْمَوْتِ صَبْراً	پس ایسے مقام پر جب کہ موت منڈلا رہی ہو، صبر اور ایک صبر ہی بہتر طریق ہے،
فَمَا نَيْلُ الْخُلُوْدِ بِمُسْتَطَاعِ	اس لئے کہ ہمیشہ زندہ رہنے کی خواہش تو ایک امر محال ہے۔
سَبِيْلُ الْمَوْتِ غَايَةُ كُلِّ حَيٍّ	(حقیقت یہ ہے کہ) موت ہی ہر ذی حیات کا منتہیٰ ہے اور ممکن نہیں کہ
وَدَاعِيْهِ لِأَهْلِ الْأَرْضِ دَاعِي	کوئی اجل سے چھٹکارا ہو سکے۔
وَمَا لِلْمَرْءِ خَيْرٌ مِنْ حَيَاةٍ	(اور یاد رکھو) کہ اس شخص کی زندگی کی کوئی قدر و قیمت ہی نہیں جو ذلیل اور
إِذَا مَا عُدَّ مِنْ سَقَطِ الْمَتَاعِ	حقیر سمجھا جائے۔

یہ قطری ابن الفجاءۃ کے شعر ہیں جو دورِ بنی امیہ کا ایک مشہور خارجی شاعر ہے، اہلِ ادب کا اتفاق ہے کہ شجاعت اور صبر و استقامت پر اس سے اچھے شعر نہیں کہے گئے۔ (مترجم:۔ منہاج الدین، رفیق دار العروبہ)

شوقی

اِلغائے خلافت

عَادَتْ أَغَانِي الْعُرْسِ رَجْعَ نُوَاحِ	شادی کی رنگ رلیاں یکایک غم و اندوہ اور ماتم میں تبدیل ہو گئیں اور شادیانوں
وَنُعِيْتِ بَيْنَ مَعَالِمِ الْأَفْرَاحِ	اور مسرتوں سے بھری گھڑیوں میں تیری موت کی خبر دی گئی۔

كُفِّنْتِ في لَيْلِ الزِّفَافِ بِثَوْبِهِ
وَدُفِنْتِ عِنْدَ تَبَلُّجِ الْإِصْبَاحِ

میں شب زفاف میں اپنی کپڑوں سے میری تجہیز تکفین کر دی گئی اور صبح کے طلوع ہوتے ہی مجھے سپرد خاک کر دیا گیا۔

اَلْهِنْدُ وَالِهَةٌ وَمِصْرُ حَزِيْنَةٌ
تَبْكِي عَلَيْكِ بِمَدْمَعٍ سَحَّاحِ

ہندوستان اس حادثہ سے بدحواس ہے اور مصر غمگین ہے اور زار زار آنسو بہا رہا ہے۔

اَلشَّامُ تَسْأَلُ وَالْعِرَاقُ وَفَارِسٌ
أَمَحَا مِنَ الْأَرْضِ الْخِلَافَةَ مَاحِ

شام، عراق اور ایران سوال کر رہے ہیں کہ کیا کسی مٹانے والے نے زمین سے خلافت کا نام و نشان مٹا دیا ہے!

نَزَعُوا عَنِ الْأَعْنَاقِ خَيْرَ قِلَادَةٍ
وَنَضَوْا عَنِ الْأَعْطَافِ خَيْرَ وِشَاحِ

ان ترکوں نے اپنی گردنوں سے بہترین ہار اتار پھینکا ہے اور اپنی کمر سے جواہرات سے جڑا ہوا عمدہ ترین ہار الگ کر دیا ہے۔

يَا لَلرِّجَالِ لِحُرَّةٍ مَوْءُوْدَةٍ
قُتِلَتْ بِغَيْرِ جَرِيْرَةٍ وَجُنَاحِ

اے دنیا کے لوگو! ہائے! ایک زندہ درگور کی ہوئی شریف زادی!! بیچاری کو بے گناہ ختم کر دیا گیا۔

مَالِي أُطَوِّقُهُ الْمَلَامَ وَإِنَّنِي
قَلَّدْتُهُ الْمَأْثُوْرَ مِنْ أَمْدَاحِي

مجھ میں کیا تبدیلی ہوئی کہ جس شخص کی تعریف میں بیسیوں ایسے قصیدے لکھ چکا ہوں جو آج بھی زبان خلق پر رواں ہیں آج اسی کے گلے میں ملامت و مذمت کا طوق ڈال رہا ہوں۔

فَالْحَقُّ أَوْلَى مِنْ وَلِيِّكَ حُرْمَةً
وَأَحَقُّ مِنْكَ بِنُصْرَةٍ وَكِفَاحِ

(اپنے آپ کو مخاطب کرتے ہوئے) حق کا احترام تیرے دوست پر مقدم ہے اور وہ نصرت و امداد کا تجھ سے زیادہ حق دار ہے۔

یہ چند شعر مصر کے مشہور عربی شاعر "شوقی" کے ہیں۔ جو انہوں نے ترکوں کے الغائے خلافت سے متأثر ہو کر کہے تھے۔ پہلے چھ شعر خلافت کی اپنی زبان سے کہے گئے ہیں، اور آخری دو شعر شاعر کی زبان سے، شوقی کا انتقال مصر میں ۱۹۳۲ء میں ہوا۔ یہ اپنے زمانے کے بلند ترین عرب شاعر خیال کئے جاتے تھے اور "ملک الشعراء" ان کا لقب تھا۔ ان کے اشعار میں ہر طرح کی چیزیں مل جاتی ہیں۔ ان کے زیادہ شعر تو قومیت کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں مگر اسلامی فکر کے شعر بھی ان کے ہاں مل جاتے ہیں، اگرچہ اسلام اور اسلامی خیالات سے انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔

افسوس اس وقت ہمارے پاس "دیوانِ شوقی" کا کوئی نسخہ موجود نہیں ہے، ان چند شعروں کے نقل کرنے میں حافظہ ہی سے کام لیا گیا ہے۔

(مترجم:۔ محمد عاصم۔ رفیق دار العروبہ)

ابو الاسود دؤلی
(ایک تابعی شاعر)

دیگراں را نصیحت

يَا أَيُّهَا الرَّجُلُ الْمُعَلِّمُ غَيْرَهُ
هَلَّا لِنَفْسِكَ كَانَ ذَا التَّعْلِيمُ

اے دوسروں کو وعظ و نصیحت کرنے والے آدمی! کیا یہ وعظ و نصیحت معصوں ہی کے لئے تو دعا تجویز کرتا ہے۔

تَصِفُ الدَّوَاءَ لِذِي السَّقَامِ وَذِي الضَّنَا
كَيْمَا يَصِحُّ بِهِ وَأَنْتَ سَقِيمُ

بیمار اور نحیف آدمی کے لئے تو دوا تجویز کرتا ہے۔ بھلا تیری اس دوا سے وہ صحت یاب کیسے ہو سکتا ہے، جب کہ تو خود بیمار ہے۔

وَنَرَاكَ تُصْلِحُ بِالرَّشَادِ عُقُولَنَا
أَبَداً وَأَنْتَ مِنَ الرَّشَادِ عَدِيمُ

ہم ہمیشہ دیکھتے ہیں کہ تو ہماری عقلوں اور ذہنیتوں کی پند و ارشاد سے اصلاح کرنا چاہتا ہے، حالاں کہ تو خود اس سے تہی دست ہے۔

إِبْدَأْ بِنَفْسِكَ فَانْهَهَا عَنْ غَيِّهَا
فَإِذَا انْتَهَتْ عَنْهُ فَأَنْتَ حَكِيمُ

اس نصیحت کی ابتدا سب سے پہلے اپنے آپ سے کر، اگر تیرا نفس گمراہی اور بدکاری سے باز آ گیا تو ہم سمجھ لیں گے کہ واقعی تو حکیم ہے اور تبلیغ و ارشاد کے اصول سے واقف ہے۔

فَهُنَاكَ يُسْمَعُ مَا تَقُولُ وَيُهْتَدَى
بِالْقَوْلِ مِنْكَ وَيَنْفَعُ التَّعْلِيمُ

اس وقت تیری بات سنی جائے گی اور لوگ اس پر عمل کر کے راہ و ہدایت پائیں گے اور تیری تبلیغ اور وعظ کے پھل ظاہر ہوں گے۔

لَا تَنْهَ عَنْ خُلُقٍ وَتَأْتِيَ مِثْلَهُ
عَارٌ عَلَيْكَ إِذَا فَعَلْتَ عَظِيمُ

کسی ایسی برائی یا بد اخلاقی سے لوگوں کو ہرگز نہ روک، جس کا یا اس جیسی دوسری کا تو خود مرتکب ہو رہا ہے اگر تو نے ایسا کیا تو یہ تیرے لئے صد درجہ عار اور ڈوب مرنے کا مقام ہوگا۔

یہ ابو الاسود دؤلی (ت ۶۹ھ) کے چند اشعار ہیں جو ایک تابعی تھے اور ان کا شمار اپنے دور کے فقہاء و محدثین میں ہوتا ہے۔ ادب و شاعری ان کا خاص ذوق تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ پہلے شخص ہیں، جنہوں نے حضرت علی رض کے حکم سے عربی نحو کے قواعد وضع کئے۔

(مترجم ـ محمد عاصم، رفیق دار العروبہ)

"غلطی ہائے کتابت"

"شعر نمبر" چونکہ بہت عجلت میں مرتب ہوا اور عجلت ہی میں اس کی کتابت اور تصحیح ہوئی اس وجہ سے بہت سی غلطیاں باقی رہ گئیں۔ مناسب معلوم ہوا کہ یہ تصحیح نامہ شائع کر دیا جائے۔ صرف صحیح عبارات درج کی جا رہی ہیں:

صفحہ (۱) اِنَّ مِنَ الشِّعرِ لَحِکمَۃً

صفحہ (۲) یہ اک معرکۂ مرد افگن کی نفیر بھی ہے۔

ان کا ایک مظاہرہ کرنے کے لئے "چراغِ راہ" کا یہ شعر نمبر.....

صفحہ (۳) بے خبر مردانِ رزم کفر و دیں　　جان من تنہا جو زین العابدین

صفحہ (۱۲) حالی کو تجھ پہ ناز ہے! کر اس پہ ناز تو!

صفحہ (۱۷) گو تیّے امیروں کے نورِ نظر ہیں۔

صفحہ (۱۸) ہے سیمیا جو نظر میں رہے فقط زر و سیم

جو بہرِ نفعِ مصنف ہو وہ کتاب سقیم

صفحہ (۱۹) شاعرِ حق تو ذرا رفعتِ گردوں پہ ابھر

اپنے نغموں سے تو آوازِ درا پیدا کر

شاعرِ دہر! تو بے روح دعاؤں سے نہ کھیل

چھوڑ بے راہ روی! پست نواؤں سے نہ کھیل

صفحہ (۲۰) کہ زندگی کو شب و روز ہے اجل کی طلب

صفحہ (۲۳) ابو الوفا حجازی

مزار محمود طودی

سر مد قدیم خالقی

صفحہ (۲۹) ہے انتظار و تپش ہی میں زندگی کی جلن

صفحہ (۳۵) راہِ یقین و صدق میں ہم........

صفحہ (۳۹) روش روش پہ بسیرا لئے ہیں زاغ و زغن

صفحہ (۵۴) اُن کو مرا خیال ہو آتا نہیں یقیں

صفحہ (۵۹) جہاں بے راہ و سبک گام ہوں ملت کے زعیم

صفحہ (۶۴) وقت کی شاخِ تمنا کا ثمر

صفحہ (۶۸) ذہنِ مسلماں میں گر فرقِ حق و باطل تو ہو

صفحہ (۷۱) زمیں پر غلبۂ قرآں کا دور

باہر درِ مسجد سے ہے الحاد کی شاہی

صفحہ (۷۳) بہیں دو تہذیب کو

صفحہ (۷۴) وہ قوت کی سرمستی ہیں

وہ خون جو بے خطا بہا ہے۔

امیں ہو تم جس کتابِ حق کے خود اس کو یوں بھاڑ میں نہ جھونکو

صفحہ (۷۵) بدل دو، بدل دو، ترانہ بدل دو

صفحہ (۷۶) خود بخود پردے سے اٹھ جاتے ہیں شاہیں! کس طرح؟

صفحہ (۷۸) یہ تیرے سوا سب سے بیزار بندے

یہ باطل کی خدمت کے نااہل یکسر

ترے دیں کو قائم یہ کرنے اٹھے ہیں

صفحہ (۸۱) جو ہیں دو قدم بولہب سے بھی آگے

صفحہ (۸۲) اٹھ! دیکھ فضا دیں کے نعروں سے ہے معمور!

صفحہ (۸۳) اس کے اُدوار ترے دل کی خبر دیتے ہیں!

صفحہ (۸۴) چشمِ تخیل نے ہر موج پہ ساحل باندھا۔

آج خود اپنے لئے کفر کی نیت باندھی

صفحہ (۸۵) کفر و الحاد کی دنیا میں سبھی کچھ ہے مگر

صفحہ (۹۰) بارہا موتیوں کو گھورے پر

صفحہ (۱۱۲) نہ چھوٹے گا کلی کا مسکرانا

غلطی ہائے کتابت

صفحہ(۱۱۷) دیارِ شوق پہ لرزاں تھے ہر طرف سائے
صفحہ(۱۳۵) ایک ایسا مہراج کہ .....
ٹوک سکے اک مفلس جس کو بیچ بھرے دربار
تیرے شہزوں میں آیا ہوں بن کر اک فریادی
کہیں میری تقدیر خدایا پھر سے پھوٹ نہ جائے
صفحہ(۱۳۹) چلے ہیں ڈال کے جیبوں میں دین کے سکے
صفحہ(۱۴۴) سفینے کو گر طوفان سے ٹکرا دیا تو نے
صفحہ(۱۵۰) جیالے کسانوں کے بیتاب خوں سے
بہادر جوانوں کے سادہ جنوں سے
بلکتے زمانوں کے سوزِ دروں سے
ہوا ختم جاگیرداری نراج!
دلوں کو صداقت سے پرنور کر دے
محبت سے سینوں کو معمور کر دے
ہر اک مردِ مومن کو منصور کر دے

صفحہ(۱۵۲) کوئی توجیہ ہے آخر حریم قدس ترا
صفحہ(۱۵۵) امدادِ باہمی کو، اخوت کو کیا ہوا
صفحہ(۱۵۷) مات کھائے ہوئے، ......اٹھتی ہوئی لہر چڑھتی گئی
صفحہ(۱۵۸) سیکڑوں سال...... ہلکے ہلکے اثر اپنا کرتی رہیں
صفحہ(۱۶۲) تختِ پرویز اور رنگِ نغفور ہے۔
چیختی سر پٹکتی ہوئی زندگی
صفحہ(۱۶۶) مارکس کی کلیت پسندی جو حقیقت میں
صفحہ(۱۷۳) توڑ دے اس کے لوہے کا جالا
صفحہ(۱۸۲) تقدس کے ادارے کاروباری
صفحہ(۱۸۵) جلوۂ سحر ماند
تازہ تر ماند
صفحہ(۱۸۹) نگاہ میں بھری ہے یاس، قلب میں فسردگی
اب بھی میں مرثیہ زندوں کا کہوں یا نہ کہوں؟
طائرِ سدرہ ہے پروانہ ہے انساں کی فردوں

اسلامی ادب کا علمبردار

ماہنامہ
چراغ راہ
کراچی

مارچ ۱۹۵۲ء

مندرجات

قیمت: ۸ر

جلد ۵ شمارہ ۴

چندہ سالانہ

پاکستان	بھارت
۵ روپے	۶

دفتر چراغ راہ - ۹ اولمپیا بلڈنگ - آرام باغ روڈ - کراچی

سوچ بچار

قسمت گران پنجاب

(۲)

مجالس قانون ساز میں اسپیکر کا پارٹ بڑا ہی اہم ہوتا ہے۔ وہ اگر حکمران پارٹی کے لئے جانبداری دکھلائے اور قواعدِ کارروائی کی تصریح میں بددیانتی کرنے لگے تو پھر کارروائی کی گاڑی غلط پٹڑی پر پڑ جاتی ہے۔ اسپیکر قانون سازی کے کھیل کا ریفری ہوتا ہے کہ جس کا ہر لفظ کھیل کے دوران میں واجب الاطاعت قرار پاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے نازک منصب پر بالعموم یا تو کسی غیر جماعتی (NON PARTY) ذہین آدمی کو تلاش کیا جاتا ہے یا پھر اپوزیشن میں سے لیا جاتا ہے تاکہ حکمران پارٹی کی اکثریت اور اپوزیشن کا سپیکر باہم توازن قائم کر سکیں۔

اسپیکر کے عہدے کی عظمت کے لحاظ سے اسے بڑا بھاری وقار (PREVILIGE) حاصل ہوتا ہے یعنی اسپیکر کے پوائنٹ آرڈر پر صرف اسمبلی کے ارکان ہی سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور نہیں ہوتے، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر اسمبلی کے حدودِ اقتدار کے پورے حلقے میں اسپیکر کے رویہ پر حرف نہیں رکھا جا سکتا، چاہے وہ کھلم کھلا خلافِ دیانت روش کیوں نہ اختیار کرلے۔ ظاہر ہے کہ ایسے "تقدس مآب" منصب کے لئے کسی پست کردار آدمی اور کسی خوشامدی اور قوت سے دب جانے والے اور اقتدار کی دامن برداری کرنے والے فرد کا انتخاب بڑی خطرناک حرکت ہوتی ہے ــــ اور اس منصب کی عظمت اور ذمہ داری ایسی ہے کہ بعض اوقات تو ایک پست فطرت آدمی بھی اس پر فائز ہونے کے ساتھ فوراً اپنے ضمیر کو بیدار کر لیتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ اس منصب کو بٹہ نہ لگنے پائے۔ کیونکہ جب کوئی اسپیکر اپنے اختیارات کو حکمران پارٹی کے اشارۂ ابرو کے تابع کر دیتا ہے تو اگرچہ اسمبلی کا کوئی رکن اس کے آگے جنبش نہیں کر سکتا لیکن جن لوگوں پر اس کی پوشیدہ کمزوری کھل جاتی ہے ان کے دلوں میں اس کی حقیقی عزت باقی نہیں رہ سکتی۔ اسی طرف پریس اور پارٹیاں بھی شاید اس کے خلاف کوئی لفظ نہ کہہ سکیں لیکن اس کے کیرکٹر کے ایک گھناؤنے پہلو سے داقف ہو جانے کے بعد وہ اس کے قانونی وقار کو حقیقی وقار نہیں سمجھ سکتیں۔ آخر سپیکر صرف اسمبلی کا سپیکر ہی تو نہیں ہوتا، سوسائٹی میں اس کے اور بھی تو بہت سے روابط ہوتے ہیں اور اس کے سر اور بھی تو ذمہ داریاں ہوتی ہیں اور اس کے کچھ اور بھی تو دائرہ ہائے اثر ہوتے ہیں، اس لئے وہ اسمبلی میں ضابطے کی سنگین کی پناہ لے کر اگر کم ظرفی کا مظاہرہ کرے گا تو دوسرے دائروں میں اس کا یہ مظاہرہ اس کے اثر کو تباہ کر دے گا۔ پھر کسی اسپیکر کو ساری عمر تو اسپیکر نہیں رہنا ہے، وہ کبھی کچھ اور بھی...... بنے گا تو اس وقت کیا اس کی پچھلی تاریخ اس کے لئے موجب ندامت نہ ہوگی۔ چنانچہ اسپیکر لوگ بڑے محتاط ہوتے ہیں اور بڑی عالی ظرفی اور نصفت شعاری سے کام لیتے ہیں۔ نیز حکمران پارٹیاں بھی اگر کچھ عقل رکھتی ہوں تو اوچھے اور کمینہ فطرت افراد کو وہ اس منصب کے لئے کبھی پسند نہیں کر سکتیں۔ یہ صرف وہ گھٹیا اور مصنوعی حکمران پارٹیاں ہوتی ہیں جو کسی پست کردار آدمی کو اس منصب پر لا کر یہ فائدہ اٹھاتی ہیں کہ اپوزیشن کو دبا لیتی ہیں، بحث کو چلنے نہیں دیتیں، اپنی مرضی کے قوانین کو سرعتِ رفتار سے پاس کرا لیتی ہیں، سوالات ...... کے جواب سیدھے طریقے سے نہیں دیتیں اور اپوزیشن کی ہر ترمیم کو رد کرتی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کسی اسمبلی کی کارروائی کا جائزہ لینے کے لئے سپیکر کے کردار کو دیکھنا ضروری ہوتا ہے۔

ہم پنجاب اسمبلی کے سپیکر کے وقار کا پورا لحاظ رکھتے ہوئے اور اس کے عمل و کردار پر کسی طرح کا تبصرہ نہ کرتے ہوئے صرف اس کی عملی تصویر قارئین کے

سامنے رکھ رہے ہیں۔

ایک دلچسپ بات تمہیداً عرض کر دینے کی ہے، مگر محض بطور لطیفہ! وہ یہ کہ جب اپوزیشن کو ٹوکنے کی ضرورت ہو یا کوئی موقع بحث آجائے تو ملک قادر بخش کا ایک خاص "ایکٹ" یہ ہوتا ہے کہ وہ ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے یہ فرمائیں گے کہ (SIR, THE QUESTION SHOULD BE NOW PUT) اس فقرے کا اگر آپ لفظی ترجمہ کرنے پر اصرار نہ کریں تو اس کا سیدھا سادہ مفہوم یہ ہوتا ہے کہ "جناب والا! اب اڑنگا لگانے کا وقت آگیا ہے!" اور پھر "اڑنگا" لگ جاتا ہے۔

تفنن برطرف! اب آئیے اصل مدعا کی طرف!

ہمارے محترم و معزز اسپیکر جو علمی حیثیت سے بڑی وقعت رکھتے ہیں، اور سوشل روابط کے لحاظ سے جن کا حلقۂ اثر اتنا زیادہ وسیع ہے کہ اس کا اندازہ ہیں صرف زمانۂ انتخاب میں ہی ہو سکا، اور جن کی شہرت بھی اتنی دور رس ہے کہ جتنی ایک بڑے آدمی کی ہونی چاہئے، اور جن کو "قانون" سے اتنا واسطہ رہا ہے کہ وہ [illegible] میں عدل و انصاف کرنے کی ضروری ذہنی استعداد رکھتے ہیں اور جن کا سیاسی مقام اس سے اونچا اور کیا ہو سکتا ہے کہ صوبے کی واحد نمائندہ پارٹی کے خادم ہیں ـــــ اپنی بیش بہا صلاحیتوں کی بنا پر ہی اسپیکر چنے گئے ہیں۔ ان وجوہ سے بڑا حسنِ ظن رکھنے کا مقام ہے!

موصوف کے دیئے ہوئے چند رولنگ حسب ذیل تھے :۔

(۱) ۱۷۔ دسمبر کو دولتانہ صاحب نے جب قانون مصائب قومی پر بحث کرنے کے دوران میں مسٹر گبن پر چند فقرے چسپاں کئے (جن کو ہم پہلے پیش کر چکے ہیں) تو میاں باری صاحب نے اسپیکر سے احتجاج کیا کہ یہ بحث سے متعلق باتیں ہیں؟ مسلم لیگ کے بنچوں سے شور ہوا کہ ہاں "یہ متعلق ہیں، متعلق ہیں!" ملک غلام نبی اٹھ کر کہنے لگے کہ یہ مسلم لیگ کا جلسہ نہیں ہے۔ اس پر اسپیکر صاحب نے فرمایا :۔

"مجھے افسوس ہے کہ ارکان آدابِ ایوان کا لحاظ نہیں کر رہے، اگر وہ اپنی روش ٹھیک نہ رکھیں گے تو مجھے کوئی سخت قدم اٹھانا پڑے گا۔"

دولتانہ صاحب کی زیادتی [illegible] میں چلی گئی، لیکن [illegible] دور تک تعاقب کرتے ہیں۔ میاں باری صاحب نے خطاب کیا کہ دولتانہ صاحب گبن کے شخصی کردار کا ذکر کر رہے تھے! اب [illegible] صاحب نے اٹھ کر دریافت کیا کہ "کیا یہ باتیں بحث سے متعلق نہیں؟" اور اسپیکر نے میاں باری صاحب کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے فرمایا کہ "مسٹر گبن کے بجائے بولنا مسٹر باری کا کام نہیں ہے!" اور بات [illegible] گئی ہر گئی!

(۲) ۱۸۔ دسمبر کو جب میاں دولتانہ صاحب نے اپوزیشن پر [illegible] کیا (جن کا حوالہ بھی گزشتہ اشاعت میں دیا جا چکا ہے) تو میاں باری [illegible] چنانچہ اسپیکر صاحب نے میاں دولتانہ صاحب سے کہا "براہ نوازش مسودۂ قانون پر بات کیجئے۔"

[illegible] ۲۴۔ دسمبر کو غلام محمد لوندخور نے [illegible] سیفٹی ایکٹ کے [illegible] استعمال کو زیر بحث لانے کے لئے جو تحریک التوا پیش ہوئی [illegible] منظور کرنے [illegible] اسپیکر صاحب نے یہ فرمایا کہ سیفٹی ایکٹ کو ناجائز طور پر استعمال کرنے کا جو الزام لگایا گیا ہے اس کا [illegible] قواعد [illegible] نہیں ہے۔

(۴) ۸۔ جنوری کو پہلے زرعی مسودۂ قانون کی بحث کے دوران میں دولتانہ صاحب نے فرمایا کہ "میں اس معاملے میں مسلم لیگ کا موقف (STAND) واضح کر دوں" [illegible] چودھری محمد شفیع نے توجہ دلائی کہ "مسٹر اسپیکر! وزیر اعظم مسلم لیگ کی پالیسی پر اظہار خیال فرما رہے ہیں حالانکہ آپ اسے خلاف قاعدہ قرار دے چکے ہیں۔ اسپیکر کا جواب یہ تھا "نہیں! وہ مسلم لیگ کی پالیسی نہیں [illegible] کر رہے۔"

[illegible] اس سے قبل اپوزیشن نے جب مسلم لیگ کے منشور کا حوالہ دے کر بات کی تو دولتانہ صاحب نے کہا تھا کہ کسی سیاسی پارٹی کی پالیسی پر گفتگو نہیں کی جا سکتی۔

(۵) ایک صاحب نے زمینداروں کے متعلق ریمارک دیا کہ بڑے زمینداروں کے آباؤ اجداد نے اپنی زمینداریاں بنانے کے لئے اپنے ضمیروں سے زیادہ کوئی قیمت ادا نہیں کی۔ فوراً مسلم لیگ کے بنچوں سے شور بلند ہوا کہ "الفاظ واپس لو۔ الفاظ واپس لو۔" اور شور تھا تو اسپیکر نے مقرر کو حکم دیا کہ "بیٹھ جاؤ!‏ ——— کیوں بیٹھ جاؤ! بیان کرنا اسپیکر کے لئے ضروری نہیں ہوتا۔

(۶) ۹ جنوری کی کارروائی میں مسٹر گبن کی تحریکِ التوا پیش ہوئی (جس کا ذکر ہم کر چکے ہیں) تو اس کو رد کرنے کے دو وجوہ بیان کئے گئے۔ ایک یہ کہ اس کا مقصد صراحت سے پیش نہیں کیا گیا، دوسرے یہ کہ یہ مفادِ عوام سے متعلق نہیں۔ چنانچہ گبن اور دوسرے عیسائی ارکان اس رولنگ کے خلاف واک آؤٹ کر گئے۔

(۷) ۱۰ جنوری کو تحفظ و بحالی حقوقِ مزارعت کے مسودۂ قانون پر بحث کرتے ہوئے جب شیخ ظفر حسین کی طرف سے ایک نئی شق بطور ترمیم پیش ہوئی تو اسپیکر کا ضابطے کے تحت یہ رولنگ تھا کہ ایسی ترمیم ایوان کی اجازت کے بغیر زیرِ بحث نہیں آسکتی۔ چنانچہ ایوان نے اسے نامنظور کر دیا۔ اور اس طرح کی متعدد ترامیم نامنظور قرار دے دی گئیں۔ اسی سلسلے میں ایک ترمیم رانا عبدالحمید خاں کی طرف سے بھی آئی تھی۔ جو اپنی نوعیت میں کسی قدر مختلف تھی لیکن اسپیکر کا رولنگ یہ تھا کہ یہ بھی پیش نہیں ہو سکتی۔ رانا عبدالحمید خاں نے احتجاج کیا کہ میری ترمیم کی وجہ سے اصل شق میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ لیکن یہ احتجاج غیر مؤثر ثابت ہوا۔ اس پر رانا صاحب نے جوش میں کہہ دیا کہ "جناب والا! آپ ہمارے ساتھ تعاون نہیں فرماتے ہیں۔" مگر اسپیکر کی شان میں ایسے الفاظ کہنا کوئی مذاق تو نہیں۔ اسپیکر نے فوراً مطالبہ کیا کہ "اپنے الفاظ واپس لیجئے!" رانا صاحب نے الفاظ واپس لینے سے انکار کیا اور اپنے آپ ہی کو ایوان سے واپس لے لیا، یعنی واک آؤٹ کر گئے!

(۸) سب سے اہم موقع یہ تھا کہ ۱۱ جنوری کو قانون انبار خود دکی بحث میں شیخ ظفر حسین کی ترمیم سامنے آئی شیخ صاحب کی ترمیم کا یہ منشا تھا کہ حکومت کو یہ اختیار حاصل ہو کہ وہ معاوضہ ادا کئے بغیر ان نہروں پر قبضہ کر سکے۔ اس ترمیم پر چودھری شفیق صاحب نے بڑا اہم دستوری اعتراض اٹھایا یعنی یہ ترمیم اس ایوان کے حدودِ اختیار سے بالاتر ہے۔ کیونکہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی دفعہ ۲۹۹ کے تحت کوئی صوبائی یا مرکزی حکومت ایسا قانون نہیں بنا سکتی جس کی رو سے حکومت کوئی عوضانہ دئے بغیر کسی کی ملکیت سلب کرنے کا اختیار حاصل کر سکے۔

اعتراض کتنا صاف ہے۔ اس کا اعتراف اسپیکر نے بھی کیا، لیکن فرمایا کہ "یہ اعتراض کسی عدالتِ قانون کے سامنے اٹھایا جانا چاہیے!" ——— اور ترمیم پاس ہو گئی۔

سوچئے کہ اگر دنیا کی اسمبلیوں کے اسپیکر ایسی تجویزوں اور ترمیموں کو جو دستور کی دفعات کے خلاف ہوں یہ کہہ کر پاس ہو جانے دیا کریں کہ معاملہ عدالتِ قانون کے سامنے رکھنے کا ہے تو پھر کونسی چیز ہے کہ جسے پامال کرنے میں دستور رکاوٹ ڈال سکے۔

(۹) ۱۴ جنوری ہی کو چودھری محمد افضل چیمہ "روزنامہ آفاق" کے ایک نوٹ کے خلاف تحریکِ التوا لائے، جو لاہور کی ڈائری" کے زیرِ عنوان میاں محمد شفیع صاحب نے لکھا تھا ——— اور میاں محمد شفیع پنجاب اسمبلی کے نہ صرف رکن ہی نہیں بلکہ مسلم لیگ پارلیمنٹری پارٹی کے سیکرٹری بھی تھے ——— اور اپنی ان حیثیتوں کے ساتھ انہوں نے مزارعین کو خلافِ قانون حرکات کے لئے علم لہرا دینے کر بڑی غلطی کی تھی، جس پر ادارہ "آفاق" نے بھی محض اس زعم کی وجہ سے گرفت کرنا غیر ضروری سمجھا کہ وہ ماشاءاللہ پنجاب کے سیاسی آقایانِ کرام کا منظورِ نظر ہے چیمہ صاحب کی تحریک کا منشا یہ تھا کہ اس نوٹ کی اشاعت پر بحث کی جائے۔ تحریکِ التوا اتنی معقول تھی کہ خود دولتانہ صاحب کی رائے یہ تھی کہ:-

"پیشِ نظر نوٹ انتہائی غیر ذمہ دارانہ ہے اور یہ واقعہ بڑا حیرت انگیز ہے کہ ایسے نوٹ کو ایک اخبار اپنے کالموں میں شائع کرے۔ اس نوٹ نے زرعی اصلاحات کے اساسی اصولوں کے اوپر ایک افسوسناک ضرب لگائی ہے جن کا اصل منشا ہی یہ ہے کہ صوبے میں امن اور تعاون کی فضا پیدا ہو۔"

علاوہ بریں اسپیکر نے بھی اس حقیقت کو محسوس کر لیا، لیکن تحریکِ التوا کو بہر حال پیش کرنے کی اجازت نہ دی۔

(۱۰) ایک اور دلچسپ صورتِ واقعہ اسپیکر کا امتحان لینے کے لئے ۱۵ جنوری کو سامنے آئی۔ ۱۰ جنوری کا دن غیر سرکاری کام کے لئے تھا۔ لیکن وزیرِ اعظم کے مطالبے پر یہ دن ایوان نے سرکاری کام کے لئے اس شرط پر دے دیا کہ اس کے بعد بدلے کا سرکاری دن مجرا دے دیا جائے گا ——— یعنی ۱۰ جنوری کے غیر سرکاری کام کو ۱۵ جنوری کو پورا کیا جائے گا۔ لیکن لطیفہ ملاحظہ ہو کہ جب ۱۵ جنوری آئی تو وزیرِ اعظم صاحب نے فرمایا کہ آج ۱۵ جنوری کا سرکاری دن ہم حسبِ قرارداد غیر سرکاری کام کے ایک دن کے لئے مجرا دیتے ہیں لیکن غیر سرکاری کام کا یہ دن ۱۷ جنوری ہوگا۔ یہ بڑا غور کرنے کا لطیفہ ہے۔ معاملہ دراصل یہ تھا کہ ۱۰ جنوری کا مقررہ کام بڑا اہم قسم کا تھا اور اپوزیشن کی طرف سے اسلامی دستور کے متعلق ایک قرارداد پیش ہونے والی تھی، اسے ٹالنے کے لئے ۱۵ جنوری کا دن مجرا کر دیا تو گیا لیکن ۱۰ جنوری کے کام کے لئے نہیں۔

اس لطیفہ آئینی پر چودھری شفیق صاحب نے پوائنٹ آف آرڈر کا مطالبہ کیا کہ چونکہ ۱۵ جنوری کا دن ۱۰ جنوری کے کام کے لئے مجرا دیا جانا طے ہے لہٰذا ۱۷ جنوری کا ایجنڈا آج اختیار نہیں کیا جا سکتا ——— کیونکہ ہاؤس کا اجلاس آج آئندہ اجلاس کی تاریخ کے تعین کے بغیر (SINE DIE) ملتوی ہو رہا ہے اور ۱۷ جنوری کی تاریخ اس کے خاتمے کے بعد پڑتی ہے، لہٰذا بعد کی کسی تاریخ کو مجرا دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مگر دوسری طرف سے کہا یہ گیا کہ ہمارے ذمّے ایک دن کا مجرا دینا ہے، چاہے وہ ۱۰ جنوری ہو یا ۱۷ جنوری! اس پر چودھری محمد شفیق صاحب نے اپنے اعتراض کی تائید میں ضابطے کے بعض حوالے بھی دئیے۔ آخری فیصلہ تو بہر حال ہاؤس کے ریفری کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور ریفری نے فیصلہ یہ دیا کہ (AGENDA FOR THE DAY WAS IN ORDER) اور اعتراض کو ردّ (RULE OUT) کر دیا۔

یہ ایک ایسی صورت تھی کہ ہمارے صوبے کا مشہور سیاسی گونگا پہلوان بھی چپ نہ رہ سکا۔ مگر آگے سے پڑی تو کیسی پڑی! اسپیکر صاحب نے فرمایا کہ آپ اسپیکر کے رولنگ کے بعد اب اعتراض نہیں کر سکتے۔ اپنی اس بے بسی کا ہمارے پہلوان کو بڑا صدمہ ہوا اور وہ اپنی پارٹی سمیت دس منٹ کے لئے ایوان سے واک آؤٹ کر گئے۔

ایک اجلاس میں یہ تین واک آؤٹ ہمارے محترم اسپیکر کی شان میں ایک گستاخی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

(۱۱) علاوہ بریں یہ ایک بڑی پیچیدہ صورت ہے کہ وزراء جب چاہتے ہیں اٹھ کر بولنا شروع کر دیتے ہیں اور اسپیکر کو بڑی حد تک مروتاً برداشت کرنا پڑتا ہے، آخر کوئی عالی ظرف آدمی کہاں تک ٹوکے۔ دوسری طرف اپوزیشن کو یہ مشکل پیش آتی ہے کہ جب کسی کو بولنا ہو تو وہ حسبِ قاعدہ اسپیکر سے بول کر درخواست نہیں کر سکتا بلکہ اسے صرف اپنی جگہ کھڑے ہو جانا ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں اکثر یوں ہوتا ہے کہ اپوزیشن اور اکثریت دونوں کے متعدد آدمی بیک وقت اٹھ جاتے ہیں ——— اور اب نصیبہ اسی کا جاگتا ہے جس پر اسپیکر کی نگاہ پہلے پڑ جائے اور ایک بڑی اکثریت میں ایک چھوٹی اپوزیشن کو اس نگاہ میں سے کم ہی حصہ مل سکتا ہے۔

(۱۲) اسپیکر کی طرف سے اسی اجلاس میں یہ قاعدہ بھی عاید کر دیا گیا ہے کہ اپوزیشن کے کسی ایک گروپ کے دو سے زیادہ مقررین ایک معاملے میں نہیں بول سکتے اور ان دو مقررین کے علیٰ الترتیب زیادہ سے زیادہ ۱۵ منٹ اور ۱۰ منٹ کا وقت محدود کر دیا گیا ہے (آخر انجمن حمایتِ اسلام کے تعلیمی ادارے میں جس شخص نے کام کیا ہو وہ کالجوں اور اسکولوں کے مباحثوں کے لئے تعین وقت کے فوائد کو کیوں نہ بخوبی جانے گا) لیکن حکمران پارٹی کا معاملہ بالکل دوسرا ہے۔

ہم آپ کہہ سکتے ہیں کہ اسمبلی کی بحثوں کو کالجوں کی بحثوں کے سسٹم پر ڈھالنا کوئی صحیح طریقہ نہیں، کیونکہ وہاں صرف انجمن آرائی ہو رہی ہوتی ہے اور یہاں قوم کی قسمت بن رہی ہوتی ہے، لہٰذا ضروری ہوتا ہے کہ ہر مسودۂ قانون پر کھل کر بحث ہو اور اس کے روشن اور تاریک پہلو پوری طرح نمایاں ہو جائیں ——— لیکن ایسی باتیں اسپیکر کے وقار کے خلاف پڑتی ہیں اور عقلمند آدمیوں کو یہ باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔

یہی صورت حالات تھی جس کے موجود ہوتے ہوئے انتہائی اہم مسودہ ہائے قوانین پیش ہوئے اور آناً فاناً پاس کر ڈالے گئے۔ اپوزیشن کو ان پر بحث کرنے کا کم سے کم موقع دیا گیا۔

دو حرف ایوان کی شان اسلامیت پر بھی کہنے کو جی چاہتا ہے۔

یہ بات نہایت افسوسناک ہے کہ اس ایوان میں جہاں لوگوں کے من مانے نظریات برسر کشمکش تھے یا جہاں پس پردہ سیاسی مقاصد و اغراض کام کر رہے تھے، بار بار اسلام اور شریعت کا نام رگید اگیا ہے ــــــ صاف تر لفظوں میں اس نام کی توہین کی گئی ہے۔ حکمران پارٹی ہو یا اپوزیشن ہو، جس کو جہاں موقع ملا کہ اس نام سے زورِ تقریر پیدا کر سکے اس نے پھر کوئی کوتاہی نہیں کی۔ خاص طور پر پردہ بل کی پیشی اور بحث اسلام پر کرم فرمانے کا بڑا افسوسناک نمونہ تھی۔ اس بل کو لانے والے اور اس کی تردید کرنے والے دونوں کے دونوں درحقیقت ایک ہی مقام پر نظر آتے ہیں۔ اس بل کو لاتے ہوئے محرک اور ان کے حامیوں کو سوچنا چاہئے تھا کہ موجودہ نظام اور موجودہ قیادت اور موجودہ فضا کے تحت، اور پنجاب اسمبلی کی خطرناک عددی اکثریت کے سامنے اس طرح کے بل لانا کہیں اسلام اور اسلامی تصورات کو مذاق تو نہ بنا چھوڑے گا۔ ان پہلوؤں سے قطع نظر کر کے اور حکمت کو بالائے طاق رکھ کر محض جوشِ ایمان کے ساتھ ایسے بل سامنے لے آنا بالکل ویسا ہی ہے جیسے کوئی صاحب بہکے ہوئے شرابیوں کے مجمع میں قرآن لے کے جا گھسیں۔ ہم صاف صاف کہتے ہیں کہ اگر پردہ بل کے لئے اسمبلی میں فضا کی د(س) فی صد سازگاری نہ ہوتے ہوئے اسے محض اس لئے لایا گیا تھا کہ حکمران پارٹی کے خلاف پروپیگنڈے کا طوفان اٹھانے میں سہولت ہوگی تو یہ اسلام کے خلاف بدترین حرکت ہے! جو اس پر احسان دھرتے ہوئے کی جا سکتی ہے لیکن ہم اتنی بدگمانی کیوں کریں، ہم صرف کوتاہیٔ حکمت کا گلا کرتے ہیں۔ چنانچہ اس بل پر اسلام کے بارے میں اس کے مخالفین کو بہت کچھ کہنے کا موقع ملا اور عددی اکثریت نے اسے کھلم کھلا رد کیا، اور اس طرح بے پردگی کی تحریک کے ہاتھ اور مضبوط کر دیئے گئے۔

عددی اکثریت کے ایک ذہین مقرر نے کیا خوب فلسفہ پیش کیا کہ پردہ اور اسلامی اصول معاشرت تو تعلیم و تربیت کے ذریعے اور اخلاقی طریقوں سے رائج کرنے چاہئیں، کیونکہ قانون سے پائیدار اصلاح تو نہیں ہو سکتی۔ جی ہاں! آپ کی زرعی اصلاحات تو قانونی طاقت کی طلبگار ہوں، معائب فوڈ [illegible] کے دوران میں لوگوں کا تعاون حاصل کرنے کے لئے بھی حکومت کو قانون کی لاٹھی کی ضرورت پڑے اور غلے کے ذخائر بھی برآمد کرنے کے لئے قانون کی قوت ناگزیر ہو، لیکن اسلامی معاشرت صرف "وعظوں" کے بل پر فروغ پائے ــــ درانحالیکہ اس معاشرت کو مغربی معاشرت کے فروغ کی ایک [illegible] سے سابقہ درپیش ہے جو حکمرانوں اور ان کی بیگمات کی نگرانی میں چل رہی ہے۔ ذرا ملاحظہ ہو کہ کیا ذہنیت کام کر رہی ہے! اسلامی معاشرت ایک ایسی شریف خاتون [illegible] حالت میں ہے جس پر چاروں طرف سے کتوں نے حملہ کر دیا ہو، اور ہمارے اکابر کرسیوں پر بیٹھے اس کا تماشا کرتے ہوئے یہ تقریریں فرمائیں کہ اس [illegible] قانونی مداخلت سے بچا[نا] کچھ اچھا نہیں لگتا، بلکہ اخلاقی ذرائع ہی اس کام کے لئے موزوں ہیں۔

ہاں، خوب یاد آیا، اس اجلاس کا افتتاح مشہور قومی حادثے یعنی لیاقت علی خاں کے قتل پر اظہار افسوس کرنے سے ہوا تھا۔ اس سلسلے میں [illegible] کے حکم سے پورے ایوان نے کھڑے ہو کر فاتحہ خوانی کی۔ کیا ہم اسلام کے محسنوں سے یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ کونسے قرآن میں اور کس [illegible] اور کونسی [illegible] میں آیا ہے کہ مسلمان متوفی کے لئے دعا مغفرت کرنے کا یہ طریقہ پڑھا ہے؟ کس اسلام نے آپ کو یہ تعلیم دی ہے؟ آخر یہ کیا مذاق ہے کہ آپ [illegible] اپنے دین اور اس کی شریعت میں [illegible] ایجادیں کرتے جائیں؟

قارئین ہمارے وعدے کے بموجب اس کے منتظر ہوں گے کہ اپوزیشن کے رویے پر بھی اسی طرح تبصرہ کر دیا جائے۔ طرفگی بات یہ ہے کہ اپوزیشن جیسی کچھ ہے اور جن حالات میں سے گزر رہی ہے اس پر خواہ مخواہ رحم آتا ہے لیکن محض الیفائے عہد کے لئے اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ ہماری اپوزیشن اپنے مزاج کے لحاظ سے حکمران پارٹی سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ وہی ملبہ ہے اور وہی معمار ہیں اور وہی فنِ تعمیر ہے ــــ البتہ اگر کوئی مزید پہلو قابلِ قدر ہے تو یہ ہے کہ ابھی تک ہماری اپوزیشن کے سامنے کوئی اصول اور نصب العین اور منصوبہ نہیں ہے۔ جو جس کا جی چاہتا ہے کہہ دیتا ہے اور اس طرح کبھی کچھ اچھی باتیں بھی ہو جاتی ہیں اور کبھی نقصان دہ بھی!

بصائر

مولانا عبدالحمید ارشد

(۲)

حدیث شریف کا اہتمام | حدیث شریف کا عصر اول (عصر صحابہؓ و تابعین) میں اس قدر اہتمام تھا۔ کہ ایک ہی "حدیث" کے سننے کے لئے بعض اوقات مہینوں بھر سفر کی صعوبتیں خندہ پیشانی سے برداشت کی جاتی تھیں[1]۔

ایک شخص، ابوالدرداء صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت دمشق (شام) کی مسجد میں حاضر ہو کر عرض کرتا ہے:۔

یا ابا الدرداء انی جئتک من مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم لحدیث بلغنی انک تحدثہ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ ماجئت لحاجۃ۔

ابوالدرداء! میں مدینۃ الرسول صلعم سے (دمشق تک سینکڑوں میل مسافت طے کر کے) آپ کے پاس محض ایک "حدیث" سننے کے لئے آیا ہوں۔ جس کے متعلق مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ اسے رسول اللہ صلعم سے (بلا واسطہ) بیان فرماتے ہیں۔ میں کسی اور حاجت کے لئے نہیں آیا۔

ابوالدرداءؓ نے اُسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ فرمان سنایا جس میں "طالب علم دین" کے فضائل اور اس کے لئے اجر و ثواب کا ذکر فرمایا گیا ہے کہ جو شخص "علم دین" کے حصول کی خاطر کسی راستے پر چلا، تو (گویا) اللہ تعالیٰ نے اسے جنت کے راستے پر چلا دیا۔ فرشتے اس کی رضا جوئی کی خاطر اس کے سامنے اپنے بازو بچھا دیتے ہیں۔ اور آسمان و زمین کی سب مخلوقات، پانی کے اندر مچھلیوں تک ایک عالم کے لئے مغفرت طلب کرتی رہتی ہیں (آخر حدیث تک[2])۔

معلوم ہوتا ہے کہ وہ "مطلوبہ حدیث" اس شخص کو بالواسطہ پہنچی ہوئی تھی لیکن مزید توثیق کے لئے وہ اُسے خود ابوالدرداءؓ (اولین راوی حدیث) سے سننا چاہتا تھا جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ فرمان بلا واسطہ سُنا تھا۔

محدث ترمذیؒ نے بروایت ابوسعید خدریؓ (صحابی) رسول اللہ صلعم کی "حدیث مبارک" بیان فرمائی ہے۔ کہ آپؐ نے (صحابہ کرامؓ) فرمایا:۔

اِنَّ النَّاسَ لَکُمْ تَبَعٌ وَاِنَّ رِجَالاً یَاتُوْنَکُمْ مِنْ اَقْطَارِ الْاَرْضِ یَتَفَقَّھُوْنَ فِی الدِّیْنِ فَاِذَا اَتَوْکُمْ فَاسْتَوْصُوْا بِھِمْ

بلاشبہ، لوگ (دین اور علم میں) تمہارے تابع ہیں۔ اور یقیناً کئی لوگ دور دراز ملکوں (اطراف عالم) سے تمہارے پاس، دین

---

[1] احادیث کی یہ حیثیت، [illegible] اور مسلمانوں میں ان کی یہ طلب جو موجود تھی، اگر سرے سے اس کی کوئی بنیاد ہی نہ ہوتی تو پھر تو واضعین حدیث کے لئے میدان کار کوئی ہوتا ہی کہاں۔ وضع حدیث کے فتنے کے تو معنی ہی یہ ہیں کہ احادیث کی کوئی دینی قدر تھی جس سے چند دشمنانِ حق اور بندگانِ نفس نے بھی فائدہ اٹھانے کا راستہ نکال لیا۔ اگر مارکیٹ میں سونے کی کوئی پوچھ ہی نہ ہو تو ملمع کے کاروبار کے لئے تو راستہ ہی کوئی نہیں ہو سکتا۔ لیکن ....ملمع کا کام ہوتا دیکھ کر اگر کوئی یہ نعرہ بلند کر دے کہ سارا سونا ہی ملمع کا کھیل ہے اور سرے سے طرفین پر کوئی اعتماد ہی نہیں کیا جا سکتا تو ایسے عقل مند سے مولانا ارشد کیسے عہدہ برآ ہوں گے (چراغ راہ)

[2] احمد، ترمذی، ابوداؤد (وغیرہ) بحوالہ مشکوٰۃ شریف ص ۳۴۔

خَيْرًا۔ (ترمذیؒ بحوالہ مشکوٰۃ شریف۔ ص ۳۲)

سیکھنے کے لئے آئیں گے۔ جب وہ آئیں تو ان سے بھلائی و خیر خواہی سے پیش آنا۔

کتمانِ علم سے منع فرمایا

آپ کا ارشاد ہے:۔

مَنْ سُئِلَ عَنْ عِلْمٍ عَلِمَهُ ثُمَّ كَتَمَهُ أُلْجِمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِلِجَامٍ مِنْ نَارٍ۔ (احمد، ابوداؤد، ترمذی، (بروایت ابوہریرہؓ۔ بحوالہ مشکوٰۃ ص ۳۴)

جس شخص سے علم (اور دین) کی کوئی ایسی بات پوچھی گئی جو اسے معلوم ہے۔ پر اس نے وہ بات چھپالی (اور نہ بتائی) تو قیامت کے دن (اس کے منہ میں) آگ کی لگام ڈالی جائے گی۔

اشاعت و تبلیغ دین کی ترغیب فرمائی ہے

آپ کا فرمان ہے:۔

نَضَّرَ اللّٰهُ عَبْدًا سَمِعَ مَقَالَتِي فَحَفِظَهَا وَوَعَاهَا وَأَدَّاهَا فَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ غَيْرُ فَقِيهٍ وَرُبَّ حَامِلِ فِقْهٍ إِلَى مَنْ هُوَ أَفْقَهُ مِنْهُ۔

(شافعیؒ بروایت ابن مسعودؓ۔ اور احمد، ترمذی وغیرہ بروایت زیدؓ بن ثابت بحوالہ مشکوٰۃ ص ۳۵)

اللہ تعالیٰ اس بندے کو خوشحال اور تر و تازہ (بارونق) رکھے جس نے میری بات کو سنا۔ پس اسے یاد کر لیا اور ضبط کئے رکھا اور اس کو (ٹھیک طور پر) دوسروں تک پہنچا دیا۔ پس علم و دانش کے کئی اٹھا کر پہنچانے والے خود اس کے حکیمانہ اسرار تک رسائی رکھنے والے (فقیہ) نہیں ہوتے۔ اور کئی اپنے سے زیادہ فقیہ (اسرار علم و دین تک رسائی رکھنے والے) تک پہنچانے والے ہوتے ہیں۔

صحابہ کرامؓ، تابعین اور محدثین نے روایتِ حدیث میں ہمیشہ بڑی احتیاط برتی ہے

ائمۂ دین نے ہمیشہ کسی حدیث کو قبول کرنے یا اُسے دوسروں تک پہنچانے میں ہمیشہ بڑی احتیاط، حزم اور دیانتداری سے کام لیا ہے۔ اور صرف اُس حدیث کو قبول کیا ہے جس کو وہ علی العموم جانتے پہچانتے تھے۔ یا جس کا مفہوم ایک مسلمہ حقیقت کو پیش کرتا تھا۔ یا جس کی تصدیق دلائل و شواہد سے ہوتی تھی۔[1]

اگر کوئی راوی کوئی انوکھی سی بات یا اچھوتا مسئلہ یا حکم پیش کرتا جسے عام شہرت نہ ہوتی اور وہ حکم معلوم اور متداول نہ ہوتا تو شواہد و براہین سے اس کی تصدیق چاہی جاتی۔ راوی اور مروی (روایت کنندہ اور روایت شدہ حدیث) دونوں کی خوب جانچ پڑتال ہوتی اور متناً و سنداً ایک ایک کڑی کی دیکھ بھال کی جاتی تا آنکہ قطعی دلائل و ضوابط سے ردّ و قبول کا عادلانہ فیصلہ صادر کیا جاتا۔

بعض اوقات راوی صدوق اور معتبر ہوتے ہوئے بھی[2] اس سے قسم اٹھوائی جاتی یا اپنی تائید میں مزید قابل وثوق شخصی شہادت پیش کرنے کے لئے

---

[1] حدیث کے جوہر خالص کو کٹھالیوں میں ڈال کر اور کسوٹیوں پر پرکھ کر پاک صاف حالت میں محفوظ کرنے کی یہ ساری جانفشانیاں اور عرق ریزیاں اور شب بیداریاں منکرین حدیث کی نگاہ میں ہیچ ہیں لیکن وضعین حدیث کی مساعی ان کے لئے بڑی مقبول ہیں۔ جن لوگوں نے ایک چشمۂ حیوانی کی سوتوں میں خس و خاشاک لا لا کے بھر ان کا کارنامہ تو گویا نقش کالحجر ہو گیا، لیکن وہ لوگ جنھوں نے اس چشمہ کو صاف کرنے کے اور صاف رکھنے کے لئے محنتیں صرف کیں، ان کی خدمات نقش بر آب قرار دی گئیں منکرین حدیث اپنی ترازو کے دو نوں پلڑوں میں ایک کو عجیب طرح دو کو شکار یا لوں کو جانچتے ہیں تو یہ ترازو سارا وزن تخریب کاروں کو دیتی ہے اور تعمیری خدمت کو بے وزن بنا کے رکھ دیتی ہے۔ (چراغ راہ)

[2] دنیا میں روایت و خبر کے پرکھنے کے لئے عقل انسانی جتنے کڑے سے کڑے معیار اور جتنے وسیع سے وسیع ذرائع ایجاد کر سکتی ہے مسلمانوں نے ان سب کو فراہم کیا اور اس حد تک پروان چڑھایا کہ کئی کئی مستقل علوم مدون ہو گئے لیکن ہمارے ان مہربانوں کو اس ساری داستان میں سے اگر یاد رہا تو صرف اتنا کہ کچھ واضعین نے حدیثیں وضع بھی کی تھیں لہٰذا سارا ذخیرہ بے کار ہے۔ (چراغ راہ)

اسے کہا جاتا۔ اور جب تک وہ حلف نہ اٹھالیتا یا اپنی تائید میں، روایتِ حدیث کے متعلق قوی شہادت پیش نہ کرلیتا تب تک اس کی حدیث کو قبول نہ کیا جاتا۔ عصرِ صحابہؓ کے بعد تابعین، تبع تابعین اور دوسری تیسری صدی کے ائمۂ حدیث اور ائمۂ جرح و تعدیل نے روایتِ حدیث اور ردّ و قبولِ حدیث میں بڑی چھان بین کی۔ اور اس کے لئے مستقل فنون (فنِ اسماء الرجال، فنّ الجرح والتعدیل۔ وغیرہ) کی بنیاد رکھی اور انھیں اتنی وسعت دی کہ کسی راوی کا حسب و نسب اور اس کی زندگی کا کوئی گوشہ (علمی اور عملی) پردۂ خفا میں نہ رہ سکا۔ اور جب تک رُواۃ کا سارا سلسلہ (کسی حدیث کی روایت میں) من اوّلہٖ الیٰ آخرہٖ، اعتقادی، علمی، عملی اور اخلاقی (غرض ہر لحاظ سے) طعن و تشنیع سے بالاتر، قابلِ وثوق، لائقِ اعتماد، لائقِ اعتبار اور دیانت دار ثابت نہ ہوا۔ تب تک اس کی روایت کردہ حدیث کو قبول نہیں کیا گیا۔

بلکہ بعض ائمۂ جرح و تعدیل نے تو اس بارے میں اتنی سختی کی کہ اچھے خاصے ثقہ، عدل اور صَدُوق راویوں پر بھی بعض معمولی کوتاہیوں (مثلاً حفظ میں معمولی کمی، وہم وغیرہ) کی بنا پر جرح کر ڈالی۔ اور ان کی "مرویات" کو کسی حد تک ضعیف جانا ہے ______

یہی وجہ ہے کہ بعض "رُواۃ" کے بارے میں ثقات اور ائمۂ فن میں بھی اختلاف رونما ہوگیا۔ کہ کسی نے "تعدیل" کے لئے زیادہ کڑی شرطیں مقرر کیں اور کچھ نے اعتدال کو ملحوظ رکھا۔

رہے ایسے راوی جن سے کبھی جھوٹ سرزد ہونا ثابت ہوا ہو۔ یا جو بدعقیدہ یا بدعمل ہوں۔ یا ان کا سوءِ حفظ معلوم ہو۔ یا ان کی روایت "ثقاۃ" کی روایت کے مخالف ہو (وغیرہ۔ وغیرہ) سو ان کی حدیث کو "ائمۂ فن و جرح و تعدیل" میں سے کوئی بھی قبول نہیں کرتا۔ بلکہ ان کو "موضوع" یا "منکر" (وغیرہ) کہنے میں سبھی کا اتفاق ہے۔

امام ابن شہاب زہری نے قبیصہؓ سے روایت کیا ہے۔ کہ ایک شخص کی "جَدّہ" (دادی یا نانی) نے امیرالمومنین ابوبکر الصدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوکر (اپنے مردہ پوتے یا نواسے کے ورثے میں سے) اپنا حصہ طلب کیا۔ آپؓ نے فرمایا:۔

کتاب اللہ میں آپ کے لئے میں کچھ نہیں پاتا۔ پھر آپؓ نے دوسرے صحابہ کرامؓ سے اس کے بارے میں دریافت فرمایا۔ جس پر مغیرہؓ (ابن شعبہ۔ صحابی) نے اٹھ کر کہا۔ کہ رسول اللہ صلعم جَدّہ کو (ماں کی عدم موجودگی میں) ترکہ کا سُدُس (⅙) دیا کرتے تھے۔ صدیقؓ نے فرمایا هَلْ مَعَكَ أَحَدٌ؟ (یعنی تیرے ساتھ کوئی اور بھی ہے جو اس عملِ نبویؐ (اعطائے سُدُس) پر شہادت دے) پس محمد بن مسلمہؓ نے اس کی شہادت دی اور خلیفۂ اولؓ نے "جَدّہ" کو چھٹا حصہ ترکے کا دیدیا۔[1]

محدثین نے یہ چھان بین اور "تَثَبّت فی النقل" کے طور طریقے شیخینؓ اور دوسرے صحابہ کرامؓ سے اخذ کئے ہیں۔ کہ وہ بھی شک و شبہ کی صورت میں حدیث کے قبول کرنے میں توقف کیا کرتے تھے۔ اور جب تک یقین کے لئے دلائل و وسائل فراہم نہ ہوجاتے اسے تسلیم نہ کرتے لیکن ٹھوس علمی شہادت یا خبرِ ثقات کی صورت میں کبھی اس کی صحت میں تأمل نہیں کرتے تھے۔ اور فوراً فرمانِ نبویؐ کو سر آنکھوں پر رکھتے اور بڑے بڑے اہم معاملات میں اسے "قولِ فیصل"[2] قرار دیتے تھے۔

---

[1] "مفتاح السنۃ" للخولی (المصریؒ) صفحہ ۱۹، ۲۰۔

[2] سوال یہ ہے کہ فرض کیجئے کہ بادعائے منکرینِ حدیث، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات اور اعمال آپؐ کے دور کے بعد کے لئے سیرت سے کوئی دینی اہمیت نہیں رکھتے تھے تو پھر کیا وجہ ہے کہ جب بالکل اوائل ہی میں، احادیث کا چرچا ہونے لگا تو صحابہ اور تابعین میں سے ایسے لوگ نہ اٹھے جو (آپ کے خیالات کے لحاظ سے) اس فتنہ و بدعت کے خلاف احتجاج کرتے اور امت میں کم سے کم اتنا اختلاف تو اس معاملے میں رونما ہوتا جتنا بنوامیہ کے اقتدار کے متعلق تھا یا جتنا یزید کی خلافت و بیعت کے مسئلے میں پایا جاتا ہے۔ یا جتنا فتنہ "خلقِ قرآن" کے بارے میں (باقی ص ۱۰ پر)

ابوسعید خدریؓ (صحابی) نے بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ ابوموسیٰ اشعریؓ (صحابی) نے امیر المومنین عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دروازہ پر حاضر ہو کر (اجازت چاہنے کے لئے) تین مرتبہ سلام کیا۔ لیکن انھیں (اندر آنے کی) اجازت نہ ملی۔ پس واپس لوٹ گئے۔ عمرؓ نے ان کے پیچھے قاصد بھیج کر بلوایا۔ اور کہا لِمَ رَجَعْتَ ؟ (آپ کیوں واپس ہوئے؟) ابوموسیٰؓ نے عرض کیا:-

سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ "إِذَا سَلَّمَ أَحَدُكُمْ ثَلَاثًا فَلَمْ يُجَبْ فَلْيَرْجِعْ"۔

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "جب تمہارا کوئی (مسلمان) بھائی تین مرتبہ سلام کہے (لیکن) اسے کوئی جواب (یا اجازت) نہ ملے۔ تو وہ لوٹ جایا کرے۔

قَالَ: لَتَأْتِيَنِّي عَلٰى ذٰلِكَ بِبَيِّنَةٍ۔ أَوْلَأَفْعَلَنَّ بِكَ[۱]

(عمرؓ) نے فرمایا: آپ کو اس حدیث کی صحت پر مزید) شہادت پیش کرنی ہوگی۔ ورنہ میں آپ کے ساتھ (مناسب) کارروائی کروں گا۔

(ابوسعید فرماتے ہیں) ہم بیٹھے ہوئے تھے کہ ابوموسیٰؓ اشعری تشریف لائے۔ ان کا رنگ بدلا ہوا تھا۔ ہم نے پوچھا کیا بات ہے؟ انھوں نے سارا قصہ کہہ سنایا۔ اور فرمایا:-

هَلْ سَمِعَ أَحَدٌ مِنْكُمْ۔

تم میں سے کسی نے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے) وہ حدیث سُنی ہے؟

قُلْنَا: نَعَمْ كُلُّنَا سَمِعَهُ۔

ہم نے کہا۔ ہاں ہم سب نے سُنی ہے۔

تو ان کے ساتھ ایک شخص بھیج دیا جس نے عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر حدیث کی صحت کی تصدیق کی۔[۲]

یہ شبہ نہ کیا جائے

کہ یہ تحقیق اور "تثبت فی الروایت" خلفائے راشدینؓ یا صحابہ کرامؓ تک محدود تھا۔ یا صرف ان کے زمانے میں احتیاط برتی جاتی تھی۔ نہیں ہر زمانے میں "آئمہ حدیث" اور رجالِ جرح و تعدیل (مثلاً زہریؒ، شعبیؒ، ابن سیرینؒ، سعید ابن المسیبؒ، اعمشؒ، شعبہؒ، مالک بن انسؒ، معمرؒ، اوزاعیؒ، سفیان ثوریؒ، حماد بن سلمہؒ، لیث ابن سعدؒ، عبداللہ ابن المبارکؒ، سفیان ابن عیینہؒ، ابن وہبؒ، وکیع ابن الجراحؒ، یحییٰ بن سعید القطانؒ، عبدالرحمن بن مہدیؒ، یزید بن ہارونؒ، ابوداؤد طیالسیؒ، یحییٰ بن معینؒ، احمد بن حنبلؒ، علی ابن المدینیؒ، ابوبکر بن ابی شیبہؒ، محمد بن عبداللہ ابن نمیرؒ، عبداللہ بن عمرو القواریریؒ، اسحاق بن راہویہؒ، ابوجعفر محمد بن عبداللہ عمار الموصلیؒ، احمد بن صالحؒ، ہارون بن عبداللہ الحمالؒ، دارمیؒ، بخاریؒ، محمد بن سعدؒ (کاتب واقدی) مسلمؒ، ترمذیؒ، ابوداؤد سجستانیؒ، نسائیؒ، فریابیؒ، ابوحاتم رازیؒ، ابوزرعہ رازیؒ، ابوزرعہ دمشقیؒ، ابوبکر البزارؒ، ابن ابی شیبہؒ، شافعیؒ، ابویوسف القاضیؒ، محمد بن الحسن الشیبانیؒ، ابن خزیمہؒ، ابن ابی حاتمؒ، ابن حبان البستی، طبرانیؒ، ابن عدی الجرجانی، ابوعلی الحسین بن محمد نیسابوریؒ[۳]

(بقیہ ص ۹) نمودار ہوا۔ بھائی! کم سے کم اتنی آواز تو "خالص قرآنی دین" کے حق میں اٹھتی جتنی آج منکرینِ حدیث اٹھا رہے ہیں! امت مختلف مسائل میں بہکی ضرور ہے مگر اس طرح کبھی نہیں بہکی کہ اس کے اندر چند اونچے ذہن کے لوگ بھی کسی حق کی حمایت اور کسی فتنہ کی مخالفت کرنے والے باقی نہ رہیں اور کئی صدیاں گزرنے کے بعد اچانک ایک آدمی اٹھے اور کہے کہ حدیث کو تو ملاؤں نے سازش کر کے جزو دین بنا دیا۔ یہ بالکل اسی قسم کا دعویٰ ہے جیسے شیعہ کا کہ [illegible] نے سازش کر کے سارا قرآن بدل ڈالا اور اہلِ بیت کی تعریف کو اس سے محو کر دیا اور ان کی جگہ اپنی مرضی کی چیزیں بھرتی کر دیں (چراغ راہ)

[۱] مفتاح السنۃ للخولی (المصری) صفحہ ۱۹، ۲۰۔

[۲] مفتاح السنۃ ص ۲۰۔

[۳] ابوعلی نیسابوری نے "مسند" لکھی ہے جس کے ایک ہزار تین سو اجزاء ہیں (جزء میں غالباً آٹھ ورق ہوتے ہیں) جس میں علل حدیث اور مختلف احادیث کی تنقید بسط و تفصیل سے کی ہے۔ یہ کتاب (غالباً) اب نایاب ہے۔ صحاح ستہ وغیرہ سے سب ضروریات پوری ہو جاتی ہیں۔ (ارشد عفی عنہ)

ابو احمد الحاکمؒ، دارقطنیؒ، ابن مندہؒ، ابو عبداللہ الحاکمؒ، ابوالشیخ ابن حبانؒ، ابن مردویہ الاصفہانیؒ، ابوحاتم العبدریؒ[1]، ابن عبدالبر اندلسیؒ، ابن حزم اندلسیؒ، ابن جریر طبریؒ، بیہقیؒ، ابن ماجہ قزوینیؒ، ابو یعلیؒ، خطیب بغدادیؒ، ابو عبداللہ الحمیدیؒ، ابن طاہر المقدسیؒ، شہرویہ الدیلمیؒ، ابن عساکرؒ، عبدالغنی المقدسیؒ، ابن الصلاحؒ، الزکی المنذریؒ، ابن تیمیہؒ، ابن دقیق العیدؒ، الذہبیؒ، الزین العراقیؒ، البرہان الحلبیؒ، ابن حجر العسقلانیؒ (المتوفی ۸۵۲ھ) وغیرہم نے نہایت محنت و جانفشانی سے "علم حدیث" کی بڑی مخلصانہ اور دیانت دارانہ خدمات انجام دی ہیں[2]۔ اور ٹھوس فنی اصول و قوانین کی روشنی میں متناً و سنداً احادیث کو پرکھا ہے۔ اور "نقد رجال" میں تمام "وسائل تنقید" اور "ذرائع جرح و تعدیل" کو بڑی دیانتداری سے کام میں لاکر صدق و امانت اور حفظ و صیانت میں، مراتب رجال کو متعین کیا ہے۔ اور اس طرح یقین و وثوق کے درجے میں کسی حدیث کی صحت و ضعف (یا وضع و انکار وغیرہ) کا حکم لگایا۔

صدیوں کی محنت و تحقیق کے بعد احادیث رسول اللہ صلعم کے یقینی صحیح اور منقح مجموعے "صحاح ستہ" مؤطا، مسند امام احمد بن حنبلؒ، دارمی، وغیرہ وغیرہ (دوسرے معتمد مسانید و مجامیع و سنن) ملت اسلامیہ کے سامنے مدوّن و مرتب صورت میں پیش کر دیے گئے۔ اور اس خدمت میں عرب و عجم دوش بدوش کھڑے تھے[3]۔

ہزاروں اہل بصیرت کی دیانتدارانہ محنت کے نتیجے میں احادیث کے مصدقہ مجموعے ہم تک پہنچے

احادیث کی "علیٰ وجہ البصیرۃ" تنقیح و تنقید، دس۔ بیس۔ چالیس۔ پچاس سو۔ دو سو آدمیوں کا کام نہیں تھا۔ بلکہ "امت مسلمہ" کی چوٹی کے بلند پایہ علماء، فقہاء اور مبصر ین صلحاء (عرب و عجم) میں سے ہزاروں افراد نے اس "اہم دینی فریضہ" کے لئے اپنی گرانقدر زندگیاں وقف کر دی تھیں۔ جن کی شب و روز کی دماغ سوزی، دیانتدارانہ محنت و جانفشانی، انفرادی اور اجتماعی کوششوں اور تحقیق و تنقیح (RESEARCH) کے نتیجے میں احادیث کے موجودہ مصدقہ و منقح مجموعے ہم تک پہنچے ہیں[4]۔ جن کی صحت پر ہر عہد میں ہزاروں اصحاب بصیرت، نقاد علماء، فقہاء اور محدثین نے (ٹھوس اور یقینی علمی شہادتوں اور علمی و روایتی تواتر کی بنا پر) اتفاق کیا ہے۔ اور امت نے ان کی تصدیق و توثیق پر فنی دلائل و براہین کی روشنی میں، اجماع کیا ہے۔ دین و دنیا کے کسی بھی اہم ترین معاملے میں اس سے بڑھ کر "شہادت" (گواہی) یا ثبوت کا کوئی تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ حدیث کے بارے میں جس قدر کام "خیر اُمّۃ" سے کیا جانا متصور ہو سکتا تھا۔ کیا گیا۔ انسان اس سے زیادہ کا مکلف بھی نہیں۔ اس کے سب علمی اور شرعی فیصلے "سچی شہادتوں"[5] کے ساتھ وابستہ ہیں۔ سو حدیث کے سلسلے میں بھی اس نے ایسے ہی ٹھوس اور یقینی فیصلے کئے (فجزاہم اللہ)

حدیث کی روایت علم اور یقین سے کی جائے

محدثین نے ہمیشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق، ان احادیث کو صحیح

---

[1] ابو حاتم العبدری کے علم حدیث کو (اس کے شاگردوں نے) دس ہزار اجزاء (کاپیوں) میں لکھا۔

[2] مفتاح السنۃ ص ۱۴۷۔۱۵۱۔ (باختصار)

[3] منکرین حدیث کا صحاح کے مجموعوں کو "عجمی سازشوں کی افتراپردازیاں[5]" کہنا (یا موضوع قرار دینا) گستاخی، ناحق جسارت ڈھٹائی اور بے فکری کی انتہا ہے۔

ہم محترم مولانا سے گزارش کرتے ہیں کہ وہاں تو شعر و افسانہ کی زبان ہی ہمارے زور استدلال کی جان ہے آپ "عجمی سازشوں کی افتراپردازیوں" کے مسودے پر یہ مصرعہ نہ لگاتے تو بہت مناسب ہوتا۔ (چراغ راہ)

[5] (بحوالہ طلوع اسلام اکتوبر ۱۹۵۸ء ص ۱۱)

[4] بخاری، مسلم وغیرہ کے موجودہ معتمد نسخے تدوین کے بعد، ہم تک لاکھوں علماء، فقہاء کے ذریعے پہنچے ہیں۔ جنہوں نے ان کی صحت پر اتفاق کیا۔ لہٰذا بعد و کثرت صحاح کے یہ مجموعے "تواتر کی حد کو پہنچے۔ ارشد عفا اللہ عنہ۔

[5] (طلوع اسلام دسمبر ۱۹۵۸ء ص ۱۰ کے حوالے سے) مولانا جے راجپوری کا روایت درروایت (سند حدیث) کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ تو "نہ علم ہے۔ نہ شہادت (الخ)...... قابل سماعت ہے (الخ) بڑی حیرت زدہ دارانہ بات ہے۔ غالباً موصوف مروجہ "دفتری شہادت" کے تصور میں کسی طرح الجھ کے رہ گئے ہیں۔ ارشد عفی عنہ

جاتا ہے۔ جو ثقہ راویوں کے ذریعے ان تک پہنچے ہیں۔ اور جن کی صحت کے متعلق "علمی شہادتوں" کی بنا پر ان کو علم اور یقین حاصل ہو چکا ہے۔ کیونکہ آپؐ کا فرمان ہے :۔

اِتَّقُوا الْحَدِيْثَ عَنِّيْ اِلَّا مَا عَلِمْتُمْ۔ فَمَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ۔[1]
(ترمذیؒ۔ بروایت ابن عباسؓ)

جب تک تمہیں علمی ذرائع سے) میری حدیث کا علم نہ ہو جائے۔ تب تک اس کی روایت سے بچو۔ پس جس نے مجھ پر دانستہ جھوٹ بولا پس وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے۔

سچے راوی کے حق میں دعا فرمائی ہے | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :۔

نَضَّرَ اللّٰهُ امْرَأً سَمِعَ مِنَّا شَيْئًا۔ فَبَلَّغَهٗ كَمَا سَمِعَهٗ فَرُبَّ مُبَلَّغٍ اَوْعٰى لَهٗ مِنْ سَامِعٍ۔[2]
(ترمذی، ابن ماجہ۔ عن ابن مسعودؓ، دارمی عن ابی الدرداءؓ)

اللہ تعالیٰ اس شخص کو تر و تازہ (شادمان) رکھے جس نے ہم سے کوئی بات سنی۔ پس جوں کی توں دوسروں (اہلِ علم) تک پہنچا دی۔ پس کئی مرتبہ ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ جن (اہلِ علم) تک وہ بات پہنچائی جاتی ہے۔ وہ اس سننے والے سے بھی زیادہ اسے ضبط (اور حفظ) کر لیتے ہیں۔

علم سے سیری نہیں | فرمان نبویؐ ہے :۔

لَنْ يَّشْبَعَ الْمُؤْمِنُ مِنْ خَيْرٍ يَّسْمَعُهٗ حَتّٰى يَكُوْنَ مُنْتَهَاهُ الْجَنَّةَ۔ (ترمذی عن ابی سعید الخدری)

مومن جنت میں پہنچنے (مرنے) تک (علم کی) بھلی باتیں سننے سے ہرگز سیر نہیں ہوتا۔

کتاب و سنت اور فقہ یعنی استنباطِ احکام علوم دین ہیں | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :۔

اَلْعِلْمُ ثَلٰثَةٌ: اٰيَةٌ مُّحْكَمَةٌ۔ اَوْ سُنَّةٌ قَائِمَةٌ اَوْ فَرِيْضَةٌ عَادِلَةٌ۔ وَمَا كَانَ سِوٰى ذٰلِكَ فَهُوَ فَضْلٌ۔
(ابوداؤد، ابن ماجہ، عن عبداللہ بن عمروؓ)

علم (یعنی دین کے علم) تین ہیں۔ کتاب اللہ کی محکم آیت، رسول اللہ صلعم کی سنتِ ثابتہ (صحیح حدیث) یا (ان دونوں کی روشنی میں فقیہانہ اجتہاد سے مستنبط) حکم۔ ان کے سوا باقی سب فالتو ہے۔

دین کی اساس اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے۔ حدیث اس کی سچی اور صحیح تفسیر و تبیین ہے۔ اور صحیح اسلامی فقہ، ان دونوں کی روشنی میں، مقررہ قواعد کے مطابق، پیش آنے والے واقعات و حوادث کے لئے احکام کا استنباط اور مسائل کا استخراج ہے۔
یہ تینوں، بفرقِ مراتب دین کے مآخذ اور علوم دین ہیں۔ انھی کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی عبودیت و اطاعت (دین) تک رسائی ہو سکتی ہے۔

[1،2،3] مشکوٰۃ شریف ص ۳۲، ۳۴، ۳۵۔

[1] بڑی مبارک حدیث ہے، بہترین جواہر ریزۂ حکمت ہے، ایک حیات افروز سرچشمۂ علم ہے مگر ایک جوہری اس موتی کو دیکھ کر اگر اسے موتی نہ مانے تو آپ اس کا کیا بگاڑ لیں گے۔ آپ کے مضمون میں جن احادیث کے حوالے ہیں ان میں سے ہر ایک قرآن کے مطابق، عقل کے مطابق اور افادیت سے لبریز ہے، لیکن "خالص قرآنی دین" کا علمبردار تو کہے گا کہ یہ سب اسی سازش کے اجزا ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ آپ اس کا منہ بند نہ کر سکیں گے۔ ایک شخص کے سامنے چمن کھلا ہوا رکھ دیجئے لیکن وہ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ رائے دیتا ہے کہ میری رائے میں یہ کوڑے کا ایک ڈھیر ہے۔ آپ فرمائیے کہ کیا آپ اس سے مناظرہ کرنے بیٹھ جائیں گے؟ اس چیز کا دنیا میں کوئی علاج نہیں۔ (چراغِ راہ)

ان میں سے کوئی بھی محض تاریخ دین نہیں۔ بلکہ دین اور اس کے علوم کے اصل ماخذ ہیں۔[1]

محمد بن سیرین (محدث اور فقیہ تابعیؒ) نے فرمایا ہے:۔

إِنَّ هٰذَا الْعِلْمَ دِيْنٌ فَانْظُرُوْا عَمَّنْ تَأْخُذُوْنَ دِيْنَكُمْ (مسلمؒ۔ از مشکوٰۃ ص ۳۷)

یہ (حدیث کا) علم دین ہے۔ پس خوب اچھی طرح سے دیکھ لیا کرو۔ کہ تم کن لوگوں سے دین لے رہے ہو (یعنی ہمیشہ عدول اور ثقات سے حدیث کی روایت کیا کرو)

ایک سوال اور اس کا جواب

علامہ عبدالعزیز الخولی المصری نے اپنی کتاب "مفتاح السنۃ" (صفحہ ۱۹) پر "حدیث کی صحت" اور صحابہ کرامؓ کے تثبت واحتیاط در بارۂ روایت حدیث کے سلسلے میں ایک سوال اور اس کا جواب ان الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

عَسَاكَ تَقُوْلُ: إِذَا كَانَتِ الصُّدُوْرُ دِعَاءَ السُّنَّةِ فِي الْقَرْنِ الْأَوَّلِ فَكَيْفَ يُؤْمَنُ عَلَيْهَا النِّسْيَانُ وَأَنْ يَنْدَسَّ بَيْنَ الْمُسْلِمِيْنَ مَنْ يَتَقَوَّلُ عَلَى الرَّسُوْلِ؟

شاید تو (معترض ہو کر) کہے کہ جب پہلی صدی ہجری میں سنتِ رسول اللہ صلعم (حدیث) سینوں کے اندر محفوظ تھی۔ تو یہ اطمینان کیسے ہوتا تھا کہ وہ بھولے گی نہیں۔ اور مسلمانوں میں ایسے لوگ آنہیں گھسیں گے جو رسول اللہ پر جھوٹ بولیں گے؟

فَنَقُوْلُ إِجَابَةً عَلَى ذٰلِكَ: إِنَّ الصَّحَابَةَ وَأَكَابِرَ التَّابِعِيْنَ كَانُوْا عَلَى عِلْمٍ بِالْكِتَابِ۔ وَكَانُوْا أَسْبَقَ النَّاسِ إِلَى الْإِئْتِمَارِ بِأَمْرِهٖ وَالْإِنْتِهَاءِ بِنَهْيِهٖ وَقَدْ عَلِمُوْا مَا أَوْعَدَ اللّٰهُ بِهٖ كَاتِمَ الْعِلْمِ مِنْ لَعْنٍ وَطَرْدٍ وَإِبْعَادٍ مِنْ رَحْمَةِ الرَّبِّ۔ فَكَانُوْا إِذَا عَلِمُوْا شَيْئًا مِنْ سُنَنِ الرَّسُوْلِ بَادَرُوْا إِلَى تَعْلِيْمِهٖ وَإِبْلَاغِهٖ خُرُوْجًا مِنَ التَّبِعَةِ وَإِبْتِغَاءً لِلرَّحْمَةِ۔ فَسُرْعَانَ مَا يَنْتَشِرُ بَيْنَ الْجَمَاهِيْرِ فَإِنْ نَسِيَ بَعْضٌ مِنْهُمْ فَرُبَّ مُبَلَّغٍ أَوْعَى مِنْ سَامِعٍ۔

سو ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ اور تابعین کبارؒ کتاب اللہ کا (زیادہ سے زیادہ) علم رکھتے تھے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوامر ونواہی کی پابندی میں باقی لوگوں سے بڑھے ہوئے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ نے "کاتم علم" (علم کو چھپا کر رکھنے والے) کے لئے جو لعنت، پھٹکار، اور اپنی رحمت سے دوری کی سزا مقرر فرمائی ہے، وہ انھیں معلوم تھی۔ پس رسول اللہ صلعم کے سنن وآداب میں سے جو بات بھی ان کو معلوم ہوتی۔ فوراً اس کی تعلیم دیتے اور دوسروں تک پہنچاتے تھے۔ تاکہ (کتمان علم کی) وعید سے بچیں۔ اور رحمت کے حقدار ہوں۔ سو اس طرح سے وہ حدیث جمہور مسلمانوں میں بہت ہی جلدی پھیل کر مشہور ہو جاتی تھی۔

سو اگر ان میں سے بعض (اُسے) بھول بھی جاتے (تو دوسروں کو یاد ہوتی) کیونکہ بہت مرتبہ ایسا بھی ہوا ہے کہ جن (اہل علم) تک وہ (حدیث) پہنچائی گئی۔ وہ (اُس کے) سننے والے سے بھی زیادہ ضبط کرنے والے ثابت ہوئے۔

---

[1] منکرین حدیث۔ حدیث کے متعلق وسوسہ اندازی کے کئی مکارانہ ڈھنگ نکالتے رہتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں "عجمی سازش کی افتراپردازیاں ہیں" (طلوع اسلام اکتوبر ۱۹۵۳ء ص ۱۱) کبھی کہتے ہیں۔ حدیث دین نہیں "تاریخ دین ہے" (طلوع اسلام ص ۳ نومبر ۱۹۵۳ء از مولانا جیراجپوری) اور کبھی کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلعم نے جو احکام جزئیہ متعین فرمایا وہ وقتی تھا۔ "بعد میں آنے والے اپنے زمانے کے حالات کے مطابق ان میں ردّوبدل کرسکتے ہیں۔" (معارف جلد ۴۔ ص ۲۹۲)

[اصل مدعا تینوں صورتوں میں یکساں حاصل رہتا ہے یعنی قرآن کو من مانے معنی پہنانے اور دین کے نظام میں باہر سے اصول وافکار اور طور طریقے لاکے نصب کرنے کے لئے راستے صاف ہوتے ہیں۔ آپ مدعا کو دیکھئے، مدعا حاصل کرنے کے طریقوں کو نہ دیکھئے (چراغ راہ)]

نَسَبِ الْبُعْدِ بِمَكَانٍ اَنْ يَضِيْعَ شَيْئٌ مِنَ السُّنَّةِ اَوْ يَخْفٰى عَلٰى جُمْهُوْرِ الْمُسْلِمِيْنَ۔	پس اندریں حالات یہ احتمال نہایت ہی بعید ہے کہ سُنّت (حدیث) میں سے کوئی چیز ضائع ہو جائے۔ یا اس کی حقیقت و صداقت جمہور "ائمۃ المسلمین" پر پوشیدہ ہو۔
(مفتاح السنۃ" خولی" ص ۲۰)	

امیرالمومنین علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا ہے :۔

میں رسول اللہ صلعم سے جب کوئی حدیث خود سنتا تو اس سے جس قدر نفع اللہ تعالیٰ مجھے پہنچانا چاہتا تھا پہنچاتا۔ اور جب کوئی دوسرا مجھ سے آپؐ کی حدیث بیان کرتا۔ تو میں اُسے حلف دیتا۔ سو اگر وہ میرے سامنے حلف اٹھا لیتا (کہ اُس نے یہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنی ہے۔ یا آپ کو ایسا کرتے دیکھا ہے) تو (تب) میں اسے سچا جانتا۔ اور ابوبکر صدیقؓ نے مجھ سے (کئی بار) احادیث رسول اللہ صلعم بیان فرمائی ہیں اور سچ سچ بیان فرمائی ہیں۔[1]

قلتِ روایتِ حدیث بہت سے صحابہ کرامؓ محض اس خوف سے حدیث کی روایت کم کرتے تھے کہ کہیں بھول چوک یا غلطی سے رسول اللہ صلعم کی طرف کوئی ایسی حدیث منسوب نہ کر بیٹھیں جو درحقیقت آپؐ کی نہ ہو۔ اور رسول اللہ صلعم پر جھوٹ باندھنے کی جو سزا مقرر ہے کہیں (نادانستہ طور پر) اس کے مستوجب و سزاوار ہو جائیں۔ ان ہی کم روایت کرنے والوں میں سے زبیرؓ، ابو عبیدہؓ اور عباسؓ ابن عبدالمطلب (وغیرہ) ہیں۔ یہ لوگ حدیث کی کثرت سے روایت کرنے والوں پر اس لئے انکار و مواخذہ کرتے تھے کہ "کثرتِ روایت" "مظنۂ خطا" ہے (غلطی کرنے کا بیشتر احتمال ہو سکتا ہے)

کثرتِ روایت انھوں نے مشہور صحابی ابوہریرہ رضی اللہ عنہ پر بھی احادیث کی کثرتِ روایت کو انوکھا سمجھ کر اعتراض کیا جس پر ابوہریرہؓ نے انھیں مسکت (لیکن تسلی بخش) جواب دے کر ان کے "انکار و استعجاب" کو دور کیا اور فرمایا :۔

لوگ کہتے ہیں کہ ابوہریرہ نے کثرت سے احادیث روایت کی ہیں! اگر کتاب اللہ میں (کتمانِ علم کی صورت میں) یہ دو آیتیں نہ ہوتیں تو میں ایک حدیث بھی بیان نہ کرتا۔ پھر آپ پڑھتے :۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِى الْكِتٰبِ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَبَيَّنُوْا فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ (البقرہ، ۱۵۹-۱۶۰)

ترجمہ : جو لوگ ہماری اتاری ہوئی روشن تعلیمات اور ہدایت کو، اپنی کتاب میں، لوگوں کے لئے، پوری وضاحت سے بیان کر دینے کے بعد چھپاتے ہیں (چاہے یہ بیان اصولاً کیوں نہ ہو؟) اللہ تعالیٰ ان چھپانے والوں پر لعنت (پھٹکار) بھیجتا ہے۔ اور سب لعنت کرنے والے بھی انھیں لعنت کرتے ہیں! البتہ (وہ مستثنیٰ ہیں) جو (کتمانِ ہدایت سے) باز آگئے اور اصلاح حال پر متوجہ ہوئے اور (دینی ہدایات کو) بوضاحتِ تمام (کھول کر) بیان کیا سو ایسے سعادت مندوں کی توبہ قبول فرما کر ان پر (خصوصی) نزولِ رحمت کرتا ہوں۔ اور میں (اللہ) ہوں بھی توبہ قبول فرما کر مغفرت و رحمت سے رجوع فرمانے والا، بیحد مہربان، صاحبِ رحم و کرم (جلّ شانہٗ)

ہمارے مہاجرین بھائی بازاروں میں سودا سلف میں مشغول رہتے اور انصار بھائی اپنے اموال و املاک میں کاروبار کے اندر (کھیتی باڑی وغیرہ) میں شاغل رہتے۔ (لیکن خود میں) ابوہریرہؓ پیٹ بھر کھانا ملنے پر (شب و روز) رسول اللہ کی ملازمت و صحبت میں رہتا جن باتوں میں وہ (مہاجر و انصار) حاضر نہ ہوتے وہ (ابوہریرہؓ) وہاں بھی حاضر ہوتا۔ اور اسے وہ وہ (جواہر پارے) یاد ہو جاتے جو انھیں یاد نہ ہوتے۔"[2]

---

[1] مفتاح السنۃ الخولی ص ۲۰۔

[2] منکرینِ حدیث تو کہیں گے کہ (نعوذ باللہ) ابوہریرہ بھی عجیب آدمی تھے کہ ان باتوں کو سننے اور یاد کرنے کے پیچھے پڑے رہے جن کی دین میں کوئی قدر و قیمت نہ تھی اور جن کا چلن رسول اللہ صلعم کی وفات کے ساتھ ختم ہو جانے والا تھا (چراغ راہ)

دفعہ "۱۴۴"

ضیاء محمد ضیاء

(یہ نظم انتخاباتِ سرحد کے زمانے میں لکھی گئی تھی جس روز تحریکِ اسلامی کے داعی کی پشاور میں آمد تھی عین اسی روز دفعہ ۱۴۴ نافذ کر کے جلسوں، جلوسوں پر پابندی عائد کر دی گئی۔ گو اس نظم کا محرک ایک ہنگامی واقعہ ہے لیکن میں نے ماحول اور گفتگو میں تصرّف کر کے اسے عمومی حیثیت دینے کی کوشش کی ہے اور یہ دکھانا چاہا ہے۔ کہ حق جب براہِ راست باطل کے قلعہ کی طرف پیش قدمی کرتا ہے تو باطل اور اس کے حواریوں پر کیسی بوکھلاہٹ اور بے حواسی طاری ہوتی ہے اور وہ اپنے تمام ہنگامہائے عیش و نشاط کو سرد ہوتے دیکھ کر کس قسم کی بے چینی اور اضطراب اور خوف و ہراس میں مبتلا ہو جاتے ہیں)

پردۂ شب سے عیاں ہونے لگا نورِ سحر — عمر بھر سوئے تھے جو، خوابِ گراں سے جاگے
تیرہ و تار فضاؤں میں اُجالے پھیلے — سائے ہٹنے لگے خونخوار اندھیرے بھاگے

قصرِ شاہی کے ستوں خوف سے تھرّا اُٹھے — رنگ محلوں کے مکینوں پہ ہے رعشہ طاری
عیش برہم ہوا پُر کیف طرب گاہوں کا — ہال سُونے ہوئے اور محفلیں اجڑیں ساری

بال رُوموں کے در و بام لرز اُٹھے ہیں — رقص گاہوں کی بہاروں پہ خزاں چھائی ہے
حاصلِ عشرتِ امروز پہ شعلہ لپکا — خرمنِ عیش پہ اک برق سی لہرائی ہے

کپکپاتے ہیں سلاطین کے چاوُش و نقیب — ڈگمگاتے ہیں قدم آج جہانداروں کے
خون جمنے لگا، فسّاق کی نبضیں ڈوبیں — دل مکافات سے ڈرتے ہیں ستمگاروں کے

خفیہ چالیں ہیں، تدبیریں، منصوبے ہیں — سنسنی چھائی ہے کس بات سے درباروں میں
انقلابات کے سیلاب کو روکیں کیسے — مشورے ہوتے ہیں اس امر کے سرکاروں میں

کون آتا ہے سنانے کو خدا کا پیغام — تہلکہ مچ گیا فغفور کے ایوانوں میں
شاہِ ذی جاہ کی نیندوں میں خلل آیا ہے — غلغلہ پڑ گیا قیصر کے شبستانوں میں

کس کے نعروں کی گرج سے ہے فضاؤں میں خروش — حدِ سرحد میں کوئی مردِ جلیل آتا ہے ؟
کس کی ہیبت سے اڑا چہرۂ نمرود کا رنگ — کیا کوئی رہروِ شاہراہِ **خلیل** آتا ہے ؟

یہ تگاپوئے مسلسل یہ جہادِ پیہم — سعیٔ بے لوثِ غرض بہرِ نظامِ اسلام
دل میں یہ خواہشِ بے تاب لئے پھرتا ہے — پھر سے جاری ہو زمانے میں خلافت کا نظام

کس طرح رکتا یہ طوفانِ ہجومِ جمہور — بندِ قانون کا باندھا کہ یہ سیلاب رکے
رنج و آلام کے ماروں کی زباں کاٹتے ہو — ان تدابیر سے کیوں نالۂ بے تاب رکے!

گھی اور ڈبے

(ملک، مقام اور اشخاص کو نامعلوم ہی رہنے دیجئے)

نعیم صدیقی

یہ ایک شادی کی دعوت تھی ——— اچھے اچھے سرکاری عہدے دار جمع تھے، جنھوں نے کھانے کی میز پر بیٹھتے ہوئے کوٹ اور شیروانیاں ہی نہیں، بلکہ تکلف کے سارے لبادے بھی اتار ڈالے تھے۔

ایک چیرمین ڈسٹرکٹ بورڈ سے اس کے ایک دوست نے پوچھا کہ کیا حال ہے۔

چیرمین: حال جو کچھ بھی ہو، روپیہ میرے پاس بہت ہے اور بہت آ رہا ہے۔

دوست: اتنا روپیہ تم نے کیسے پیدا کیا؟

(اب ساری مجلس اس گفتگو کی طرف متوجہ ہو گئی)

چیرمین: بائیں ہاتھ کا کھیل!

ایک مجسٹریٹ: وہ کھیل کیا ہے، ذرا معلوم تو ہو۔

چیرمین: آپ جانتے ہیں کہ میرے پاس فوج کو گھی بہم پہنچانے کا ٹھیکہ ہے۔

دوست: محض فوجی ٹھیکے سے تو اتنی کمائی نہیں ہو سکتی!

چیرمین: ارے یار، سنو تو سہی، گھی کن انگلیوں سے نکالا جاتا ہے۔ قصہ یہ ہے کہ جب اول اول میں نے ٹھیکہ لیا تو اپنے ایک فوجی میجر کے ذریعے اسے "پاس" کرانے کا انتظام تھا، اور کام چلتا رہا!

مجسٹریٹ: یعنی کچھ ملاوٹ بھی کرتے تھے؟

چیرمین: تو اور کمائی کہاں سے ہوتی! ——— ہاں تو کچھ عرصہ تو بات بنی رہی، مگر آخر کار فوج میں شکایت شروع ہوئی کہ گھی ناقص آ رہا ہے اور میرے خاص "میجر" کا تبادلہ ہو گیا اور ایک نیا میجر مقرر ہوا جس نے نہایت ہی پیچیدہ قسم کا سائنٹفک طریقہ گھی کے کنستروں کی جانچ کے لئے اختیار کیا۔ ایک خاص طرح کا آلہ ہوتا ہے جس کے ذریعے کنستر میں شیشے کی ایک لمبی ٹیوب لگا کر گھی ایک ایسے سسٹم سے ٹیوب میں چڑھایا جاتا ہے کہ کنستر کے اوپر سے لے کر نیچے تک کی ساری تہوں کا حال الگ الگ معلوم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ہمارے کنستروں کی ایک بڑی تعداد جس میں تھوڑے سے گھی کے ساتھ پانی بھرا ہوا تھا مال گاڑی پر لد جانے کے بعد پکڑ لی گئی۔ میں نے اپنے ایک ملازم کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ سارا الزام اپنے سر لے لے اس سے میرا سمجھوتہ اس بات پر ہوا کہ جیل میں اسے اے کلاس دلوانا اور اس کے بیوی بچوں کو نان و نفقہ بہم پہنچانا میرے ذمے رہا۔ چنانچہ میں نے بیان دیا کہ میرے ہاں سے کنستر خالص گھی سے بھر کر روانہ کئے گئے تھے لیکن راستے میں میرے ملازم نے میرے ساتھ چالاکی کی ہے۔ ملازم کا جب بیان لیا گیا تو اس نے اقبال جرم کر لیا۔ وہ جیل چلا گیا اور میرا ٹھیکہ بچ گیا۔ اب بڑی فکر ہوئی کہ نئے میجر کے سائنٹفک ٹیسٹ سے کس طرح عہدہ برآ ہوا جائے۔ میں نے ایک کیمسٹ نوجوان کی خدمات حاصل کیں کہ وہ گھی کے کچھ ایسے مرکبات تیار کرنے میں میری مدد کرے کہ جو ہر قسم کے ٹیسٹ میں صحیح نکلیں۔ آخر اس نوجوان کا ایک فارمولا کامیاب ہو گیا۔ کچھ صابن، کچھ سفید مٹی، کچھ اور خاص اجزا کے ذریعے گھی کا ایسا مرکب

تیار کر لیا گیا کہ جو گرم کرنے پر بھی امتحان سے گزر سکتا تھا لیکن اصل ایجاد جو ہم نے کی وہ یہ تھی کہ پہلے یہ معلوم کیا کہ میجر کنستروں پر ہتوڑ کس مقام سے لگاتا ہے۔ جب یہ قطعی طور پر معلوم ہو گیا تو ہم نے اس ایک خاص کونے میں تو بالکل ہی خالص گھی بھرنا شروع کر دیا لیکن اس جزیرہ نما کے باقی تین طرف ہم اپنا مخصوص مرکب بھر دیتے تھے۔ چنانچہ میجر گھی پاس کرتا جا رہا تھا۔ ہزاروں کنستر اس کے امتحان سے گزر گئے۔ اُدھر یہ ہوا کہ سپاہی بیمار پڑنے لگے اور گھی کے خلاف عام شکایت پھیل گئی۔ یہ شکایت جب افسروں تک پہنچی تو انھوں نے امتحان کرنے والے میجر کو متنبہ کیا۔ میجر نے جواب میں قطعیت کے ساتھ لکھا کہ شکایت بالکل غلط ہے، میں اپنا کام ٹھیک طریقے سے کر رہا ہوں۔ کچھ عرصے کے بعد پھر شکایت آئی، میجر نے پھر لوٹا دی غا اسی طرح متعدد بار ہوا۔ یہاں تک کہ آخر کار معاملہ اوپر پہنچا۔ وہاں سے میجر کے تبادلے کا حکم بڑے ریمارک کے ساتھ جاری ہوا۔ میجر نے احتجاج کیا کہ تبادلہ تو میرا جہاں چاہیں کر دیں لیکن میرے شیٹ رول میں ایک سخت ریمارک کا اندراج باقاعدہ تحقیقاتی کارروائی اور میری جواب دہی کے بغیر نہیں ہونا چاہیے۔ اب ملٹری کے اعلیٰ افسروں کا ایک بورڈ تحقیقات کرنے بیٹھا۔ گھی کے کنستر [illegible] ان د معائنہ کیا گیا تو ان کے مخصوص جغرافیہ کا راز بھی کھل گیا اور ہمارے مرکب کی بھی جب زیادہ باریک تجزیہ کاری کی گئی تو "نسخہ" بھی فاش ہو گیا۔ چنانچہ اس بورڈ نے یہ ریمارک دیا کہ آئندہ اس ٹھیکیدار کی نسل سے بھی کسی کو کوئی فوجی ٹھیکہ نہ دیا جائے۔

مجسٹریٹ: مگر تم تو اب بھی ٹھیکیداری کر رہے ہو۔

چیئرمین: جی ہاں! اس ریمارک کو چاندی کے پانی سے دھونا پڑا ——— گھی برابر جا رہا ہے!

دوست: کمال ہے بھئی! تم نے اپنے ملک کی فوج کی بڑی خدمت کی!

چیئرمین: لگے ہاتھوں ایک کہانی اور بھی سن لیجیے۔

مجسٹریٹ: ہاں، ضرور، ضرور!

چیئرمین: میں دنبے بھی فوج کو سپلائی کرتا ہوں۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ پہلے دنبوں کا ایک مجموعی معائنہ ہو جاتا ہے، اس معائنے میں جب دنبے پاس ہو جاتے ہیں تو پھر ان کو تول لیا جاتا ہے اور ایک مقررہ ریٹ سے ان کی قیمت لگ جاتی ہے۔ پھر دنبے مختلف چھاؤنیوں کو بھیج دئیے جاتے ہیں۔ افسر معائنہ سے میرا معاملہ ہمیشہ اچھا رہا ہے۔ مگر ایک مرتبہ کرنا خدا کا کیا ہوا کہ ایک انگریز مقرر ہو گیا ——— یہ بڑی بُری قوم ہے ——— میں نے اس کو چاروں طرف سے ٹٹولا، دعوتیں بھی کھلائیں، خوشامدانہ انداز بھی اختیار کئے "نوٹ" بھی دکھانے کی کوشش کی، اپنی کا[illegible] سیر و تفریح کے لئے پیش کی، مگر کمبخت کسی طرح نہیں پسیجا اور کہیں اس نے انگلی دھرنے نہیں دی۔ یوں وہ خوب بے تکلف بھی ہو جاتا تھا لیکن جب [illegible] کام کا وقت آتا تو [illegible] ایک ایک دنبے کی دیکھ بھال کرتا اور جسے ذرا بھی کمزور پاتا اسے فوراً باہر نکلوا دیتا۔ جب سارے نفسیاتی حربے اس کمبخت کے مقابلے میں شکست [illegible] گئے تو ہم نے کہا کہ اب کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ ایک حویلی خریدی، اس میں پانی کا حوض بنوایا اور دو چار نوکر رکھ لئے۔ [illegible] بھا [illegible] کا م [illegible] طے ہوتا تو اس دن صبح سے میرے ملازم دنبوں کو لٹا لیتے اور پسا ہوا نمک ان کی زبان پر خوب ملتے۔ یہ ملائی ہوتی رہتی [illegible] قبل ان کو حوض پر لے جاتے، دنبے سیروں پانی پی لیتے۔ صاحب آتا اور ان کے پھولے ہوئے پیٹ دیکھ کر خوش ہو [illegible] دنبے [illegible] .... پھر وہ تُلتے اور دُگنا وزن دیتے۔ یہ دنبے جب گاڑی میں لد کر روانہ ہو جاتے تو راستے میں مرنا شروع ہو جاتے [illegible] یا نصف حصہ بچ نکلتا ہو گا۔ صاحب [illegible] سے شکایتی چٹھیاں آنے لگیں۔ لیکن صاحب نے ان کو لغو سمجھا اور اپنے [illegible] لی توہین محسوس کیا۔ معاملہ یونہی چلتا رہتا، مگر ایک نمک حرام ملازم نے جا کر صاحب کو ساری حقیقت بتا دی۔ بجلسند کیا ہو جاتا، وہ تو میری خوش نصیبی تھی کہ مجھے بھی بروقت اس نمک حرامی کا راز معلوم ہو گیا۔ اگلے صاحب بڑے طنطنے سے آیا، مگر اس مرتبہ دنبوں کے ساتھ

(بقیہ بر صفحہ ۸۰)

محض "فلک پیمائی"

نعیم صدیقی

اوہام پرست لوگ کہتے ہیں کہ تاریخیں بھی اپنے اندر مخصوص روحانی تاثیرات رکھتی ہیں۔ ہم اوہام پرست نہیں، لیکن یہ بات کچھ حقیقت آمیز ضرور معلوم ہوتی ہے۔ اتنا ہو نہیں ہر تاریخ اپنے عظیم واقعات کے ساتھ کوئی نہ کوئی پراسرار رابطہ ضرور رکھتی ہے اور نہ بھی رکھتی ہو تو انسانی دماغ چاہتا ہے کہ ایسا رابطہ ہونا چاہئے اور وہ بہرحال پیدا کر ہی لیتا ہے۔

ہم اپنے ابتدائی دورِ مطالعہ میں جب کسی قدیم کتاب کا مطالعہ کرتے تھے تو اس کے حواشی کے خاتمے پر "۱۲" لکھا ہوا ہوتا تھا۔ یہ بات تو معمولی عقل سے سمجھ میں آگئی کہ یہ عدد بات کے خاتمے کو ظاہر کرتا ہے۔ لیکن سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ آخر "۱۲" کا عدد اس معنیٰ میں کیونکر استعمال ہونے لگا ہے۔ سوچتے سوچتے حروفِ ابجد کے مقررہ نظامِ اعداد کی طرف ذہن منتقل ہوا کہ یہ "۱۲" بہرحال کسی لفظ کے اعداد ہیں جو خاتمے کا معنیٰ دیتا ہوگا۔ اب ہم نے ایسے دو حرفا مرکب کی تلاش شروع کی جس کے اعداد "۱۲" ہوں۔ چنانچہ وہ لفظ مل گیا ———— وہ تھا "حد"! کسی کی مدد لئے بغیر اس دریافت میں کامیاب ہونے سے ہمیں بڑی ہی مسرت ہوئی۔

اب جو "۱۲۔ مارچ" کی تاریخ سامنے آتی ہے تو معاً "حد" کا لفظ ہی میں ابھر آتا ہے۔ یعنی ملتِ پاکستان نے "قراردادِ مقاصد" پاس کی اور اس کے ذریعہ اپنے اسلامی ماضی اور اپنے مطلوبہ اسلامی مستقبل کے درمیان "۱۲" کے عدد سے "حد" قائم کر دی۔ ایک دور ختم ہوا اور اس کا خاتمہ نئے دور کے ظہور کا اعلان ٹھیرا۔ خیال رہے کہ لفظ "مارچ" کچھ یونہی قراردادِ مقاصد کے ساتھ آکے وابستہ نہیں ہوگیا۔ بلکہ یہ صریحاً "اقدام! اقدام" ———— "آگے بڑھو، آگے بڑھو" کا جرس ہے جو قراردادِ مقاصد کے آگے آگے بج رہا ہے "مارچ" میں یوں بھی قافلۂ بہارِ حیات کی تازگیوں کے ہجوم سانولے پھول بکھیرتا، کرنیں برساتا، شمیم ہا لٹاتا دشت و دمن میں متحرک ہو جاتا ہے، اس لئے اس مہینے کے نام ہی میں (MARCH ON) کا بگل بجتا سنائی دیتا ہے۔ مارچ کے اس بگل کو غور سے سنئے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے "۱۲۔ مارچ" اس کے پیچھے طوفانِ حیات بنی لپک رہی ہے اور اس کے لچھن بتاتے ہیں کہ یہ بارہ کے بارہ مہینوں پر اپنا جھنڈا گاڑنے چلی آرہی ہے ———— کیا عجب کہ ہر مہینہ، اور ہر مہینے کا ہر دن ایک روز "۱۲۔ مارچ" بنا دکھائی دینے لگے۔

کہ ہم نے انقلابِ چرخِ گرداں یوں بھی دیکھے ہیں

مگر پاکستان کے "دوازدہ اماموں" نے بھی تو "حد" کر دی ہے کہ یہ "اقدام اقدام" کا بگل بجا کر خود سو گئے ہیں اور پھر (MARCH ON) کی آواز پر اگر "مشیٔ نا الزم" فرماتے بھی ہیں تو آگے کی طرف نہیں، پیچھے کی طرف! یعنی ان حضرات کا خیال یہ ہے کہ "۱۲" کے اعداد سے جو "حد" قائم ہوئی ہے وہ تگ و تاز کی آخری حد ہے۔ اس حد کو توڑنا اور اس سے آگے بڑھنا حرام ہے۔ عجب حال ہے کہ اذان ہوئی، لوگ اقامتِ صلوٰۃ کے لئے جمع ہوئے ———— اور امام "غائب!" یہ تماشا جو کچھ ہو رہا ہے اسے چپ چاپ دیکھتے رہیے، پالا ایسے لوگوں سے پڑا ہے جو بارہ گھاٹوں کا پانی پئے ہوئے ہیں، یہ اگر (MARCH ON) کے بگل پر "اباؤٹ ٹرن" کر جائیں تو بھی ان کے "یہ بارہ" ہی ہیں۔

خیال ہوتا ہے "۱۲" کے عدد میں کچھ نحوستیں بھی ہو سکتی ہیں، خصوصاً اس صورت میں جب کہ یہ عدد گھڑی کے ڈائل کا ایک جزو چھوڑ دے تو کاملاً

متعلق کسی سکھ " سے ہو۔ ہمارے لطیفہ زا سکھ بھائی ہم سے بچھڑ گئے لیکن ان کا اثر " ۱۲ " کے ہندسے پر کچھ نہ کچھ ضرور رہ گیا ہے۔ اور " ۱۲۔ مارچ " کی وساطت سے پھر یہ اثر قراردادِ مقاصد کے مصنفین پر بھی منعکس ہو گیا ہے۔

مثلاً آپ دیکھیں کہ سکھوں کا بنیادی سلوگن یہ ہے کہ " راج کرے گا خالصہ ——— چاہے جو کچھ ہو! " ——— عین اسی اصول پر ہمارے سرداران کرام " کا سلوگن یہ ہے کہ " راج کرے گی ایک ہی ٹولی، چاہے انتخابات ہوتے رہیں " لوگ اس راج سے کتنے ہی دل برداشتہ ہوں، اس کے خلاف چیخیں چلائیں، لیکن " واحد نمائندہ ٹولی " وہ " کل محمد " ہے کہ " زمین جنبد " تو " جنبد " یا اپنی جگہ سے " نہ جنبد "۔ پھر اور ملاحظہ فرمائیے۔ سیفٹی قوانین کیا ہیں؟ ——— وہی سکھا شاہی کے دور کا نچوڑ کہ " سالے! تم ساری عمر اگر جرم نہ کروگے تو کیا ہم تم پر کبھی جرمانہ نہ کریں گے "! اور آگے چلئے، وہاں اصول تھا کہ " ایک سکھ = سوا لاکھ " یا " ایک خالصہ = فوجان " ——— اور یہاں اس اصول نے یہ جدید روپ دھارا ہے کہ " ایک وزیر = جملہ عوام " اور " وزارتِ عظمائے سرحد = پورا صوبۂ سرحد " یا " دولتانہ = سالم صوبۂ پنجاب "!

پس " ۱۲ " کے عدد کی سعادتیں اور نحوستیں ٹکرا گئی ہیں ——— " قراردادِ مقاصد " دونوں کے بیچ میں پس گئی ہے ——— قراردادِ مقاصد کے مؤذن کرسیوں پر بیٹھے یہ بیچ دیکھ رہے ہیں ——— اور عام لوگ اس کشتی کو دیکھتے دیکھتے اونگھنے لگے ہیں، بڑی تعداد تو ایسی ہے جو خراٹے لے رہی ہے۔

مگر ۱۲۔ مارچ تو ہر سال آتی ہے اور آئے گی اور ہر سال ایک مرتبہ پاکستان کی دستوریہ کے دروازے پر دستک دے گی اور محاسبہ کرے گی کہ پاکستان کے لیڈرو! تم نے قراردادِ مقاصد کی " گفتار " کا حق " کردار " سے کتنا ادا کیا اور پاکستان کے عام لوگو! تم نے لیڈروں کے قول و فعل کے تضاد کی خلیج کو پاٹنے کے لئے کتنی جدوجہد کی؟

پھر کیا قراردادِ مقاصد کی " بارہ وفات " منانے کا ارادہ ہے؟

(بقیہ گھی اور دنبے)

وہ " عمل " نہیں کیا گیا تھا۔ صاحب نے دنبوں کے پیٹ ٹٹولنے شروع کئے۔ مجھے بڑی ہنسی آئی، مگر ہنسی کو ضبط کر کے تجاہلِ عارفانہ کے ساتھ میں نے پوچھا صاحب! کیا دیکھتا ہے؟ صاحب نے کچھ غیر حاضر دماغی کے ساتھ جواب دیا کہ ذرا ان کا گوشت دیکھ رہا ہوں ———

میں نے دل ہی میں کہا کہ جو کچھ تم دیکھ رہے ہو، مجھے معلوم ہو، لیکن آج وہ ہو بھی ناں! ——— حضرات! یوں روپیہ کمایا جاتا ہے!

دوست: واہ بھئی واہ! کمال ہے تمہاری چابکدستی!

ایک وکیل: خدا کے لئے میرا حصہ بھی ڈال لو۔

چیئرمین: ایسے کام حصہ داروں کے ساتھ نہیں چل سکتے۔

(اب کھانا ختم ہو چکا تھا، گانا شروع ہو رہا تھا)

(بقیہ چراغِ راہ کا شعر نمبر)

کی بہتر نظمیں کتابچوں کی صورت میں شائع کرنے کا سلسلہ جاری کیا جائے۔

یہاں میں خالص ذاتی پسند کے اعتبار سے اپنے ساتھی شعراء میں سے چند کا ذکر بھی کر دوں۔ ان میں میں اُن کا ذکر نہیں کرتا جو محض کبھی کبھی ہمارے کیمپ میں کہہ دیتے ہیں، مستقلاً ہمارے کیمپ کے شاعر نہیں۔ بہرحال، میری پسند کی ترتیب نزولی یہ ہے :-

عاصی کرنالی، نعیم صدیقی، ملک عزیز، ماہر القادری، ضیا محمد ضیا، عبدالکریم ثمر اور اعظم ادیب۔

اس ترتیب سے اوروں کو اختلاف ہو سکتا ہے۔ شاید بہتوں کو ان ناموں میں اپنے پسندیدہ نام نہ ملیں لیکن مجھے اس پوری ترتیب کے منوانے پر اصرار بھی نہیں۔ بہرحال، ان میں سے چند، بالخصوص جناب نعیم صدیقی، کے بارے میں انشاء اللہ اگلی صحبت میں کسی قدر تفصیل سے عرض کروں گا۔

تجزیہ و تزکیہ

بازارِ صحت پر ایک "عبقری" کا تبصرہ

آؤ، دیکھو ــــــــــ یہ ہے بازارِ صحت!

یہ فٹ پاتھ پر دیکھتے ہو کہ ایک عامل بیٹھا ہے؟ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ دنیا کی ہر بیماری کا علاج اس کی جھاڑ پھونک، اس کی سلگانے کی بتیوں اور اس کے تعویذوں سے ہو سکتا ہے۔

اور ان دوسرے حضرت پر بھی ایک نگاہ ڈالتے چلو! یہ کچھ جڑی بوٹیوں کی ڈھیریاں لگائے اور کچھ سیپیاں اور کوڑیاں سجائے دھونی رمائے براجمان ہیں، کچھ شیشوں میں نامعلوم قسم کے تیل بھرے پڑے ہیں، کچھ تھیلیوں میں پراسرار سفوف ڈال رکھے ہیں! اور ان کے علاج کا کمال یہ ہے کہ بواسیر کا تین روز میں ہی خاتمہ ہو جاتا ہے، سل و دق کی جڑ ایک ہفتہ میں کٹ جاتی ہے، بوڑھے آدمی چوبیس گھنٹے میں نوجوان ہو سکتے ہیں اور ان کا سرمہ اندھوں کو چالیس روز میں بینا بنا سکتا ہے۔

اور وہ اس طرف دیکھنا، ایک بزرگ ایک دوا لئے بیٹھے ہیں۔ یہ ایک دوا ہر بیماری کا علاج ہے۔ آبِ حیات ہے ناں؟

کیا یہ عطائی نہیں ہیں؟ کیا ان کا مقصد بھولے بھالے عوام کو بے وقوف بنا کر روپیہ اینٹھنے کے سوا اور بھی کچھ ہے؟ کیا انھوں نے صحت اور طب اور علاج کے خلاف ایک سازش نہیں کر رکھی؟ کیا یہ جعل سازی نہیں ہے؟

ہاں! تم نے خوب سمجھ لیا کہ یہ جعل سازی ہے، مگر آؤ ذرا اور آگے چلیں ــــــــــ جہاں اس سے بڑی جعل سازی کی گئی ہے اور ایسی پیچیدہ جعل سازی ہے کہ تم کبھی ماننے پر تیار نہ ہو گے۔

یہ ایک ڈاکٹر کھڑا ہے۔ سرنج اس کے ہاتھ میں ہے، سرنج میں چند قطرے ایک سیال دوا کے جھلک رہے ہیں، وہ مریض سے کہہ رہا ہے کہ ایسے چند قطرے تم دو چار مرتبہ بدن میں داخل کرا لو تو تمہاری گری ہوئی صحت بحال ہو جائے گی۔

اور وہ دوسرا ڈاکٹر ادھر اپنی کمین گاہ میں بیٹھا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک خاص قسم کی دوا کی چند گولیاں کھا لینے سے دماغی اعصاب، پٹھوں اور عضلات اور ہڈیوں کی ساری کمزوریاں دور ہو جاتی ہیں۔

اور پھر یہ معمر اور تجربہ کار حکیم صاحب اس بات کے مدعی ہیں کہ ان کے ہاں سے جواہر مہرہ اور یاقوتی اور دوا المسک لے کر دو چار تولے کھا لیجئے تو بس اعضائے رئیسہ کا نظام اپنی معیاری اور معتدل حالت پر آ جاتا ہے۔

وہ ایک ہومیوپیتھ نظر آتے ہیں ناں، وہ فرمائیں گے کہ میری ننھی ننھی سفید سفید میٹھی میٹھی چند گولیاں قوائے کو بحال کر سکتی ہیں۔

تم سوچو! کہ کیا عقل یہ مان سکتی ہے کہ اچھی غذا اور مناسب آرام اور ضروری ورزش، تازہ ہوا اور غسل و صفائی کی جگہ ان لوگوں کی دواؤں کے چند قطرے، ان کے سفوف کی چند حقیر خوراکیں اور ان کی چند بے وزن گولیاں بحالیٔ صحت کا ذریعہ ہو سکتی ہیں۔ ان لوگوں نے دراصل بڑی گہری سازش کر رکھی ہے کہ لوگوں کو صحت کے اصل فطری تقاضوں سے غافل کریں، نیز یہ اپنی دواؤں کی جو تعریف کرتے ہیں اور اپنے اشتہاروں میں عوام کو جس انداز سے یہ یقین دلاتے ہیں کہ صحت کا زوال چاہے کسی وجہ سے ہو اور کسی درجہ کا ہو ان کی دواؤں کی برائے نام چند خوراکوں سے اسے دور کیا جا سکتا ہے

اس کے اندر خود یہ ترغیب بھی ہے کہ لوگ صحت کے اصل تقاضوں سے بے پروا رہیں، بیماریوں میں اطمینان کے ساتھ مبتلا ہوں اور پھر اپنے آپ کو ان سازشی عطائیوں کی دواؤں کے حوالے کر دیں:

تم کہو گے کہ یہ لوگ عطائی نہیں ہیں، بلکہ ڈاکٹر اور طبیب ہیں اور لکھے پڑھے لوگ ہیں، اور ان کے ساتھ بڑا علمی و تحقیقی لٹریچر ہے جس پر ماہرین نے عمریں کھپائی ہیں اور ان کے دعووں کے حق میں بڑے بڑے محققین کے دلائل موجود ہیں اور پھر ان کے ہر دعوے کے پس پشت تجربات کی قوت ہے —— تو میں اس کے جواب میں کہوں گا کہ عزیزو! تم بڑے بھولے ہو اور یہ سارے بڑے بڑے ماہر فن ہیں۔ انھوں نے اصولِ صحت کی کتابِ فطرت میں بڑے بڑے ماہرین اور محققین کا نام لگا کر تعریفیں کر کے پرانے اکابر نے طرح طرح کے من مانے فارمولے اور نسخے طبی لٹریچر کے مستند ذخیرے میں بھرتی کر دئیے ہیں۔ یہ سارا لٹریچر دو معنی اور متضاد ہے اور بالکل ظنی اور مشکوک ہے کیونکہ اس لٹریچر میں ایک طرف تم کو یہ تلقین ملتی ہے کہ صحت کے چند بنیادی فطری تقاضے ہیں وہ پورے کئے بغیر تندرستی ممکن نہیں۔ دوسری طرف یہ بتایا گیا ہے کہ چند نسخوں سے صحت حاصل ہو سکتی ہے۔ کتنا بڑا تضاد ہے!

ورنہ یہ لوگ کبھی نہ کہتے کہ بحالیٔ صحت کے لئے چند گولیاں، سفوف کی چند حقیر خوراکیں اور کسی سیال کے چند قطرے بھی کافی ہو سکتے ہیں۔ دیکھو، ان میں سے کوئی بھی ہے جو ان دواؤں کی تعریف کرتے ہوئے بھی غذاؤں، غسل، صفائی، ورزش اور آرام کے بنیادی تقاضوں کا ذکر کرتا ہو۔

پس یہ علمِ صحت کا سارا ذخیرۂ علمی دریا برد کر دینے کے قابل ہے اور یہ سارا بازارِ صحت فٹ پاتھ کے عطائیوں اور اونچے دکانوں کے عطائیوں سمیت ڈائنامائٹ سے اڑا دینا چاہئے! اور آؤ کہ ہم سب مل کر فطری اصولِ صحت کو فروغ دینے کے لئے ایک ادارہ مشترک سرمائے سے قائم کریں اور حسبِ ضرورت نسخے بھی خود بنائیں!

—— + ——
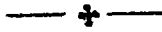
اس خاکسار نے آپ کی پر مغز تقریر اور بلیغ تنقید کو بڑے غور و توجہ سے سنا، اس حسین ادبی اندازِ بیان اور اس شاعرانہ روانی اور اس منطقی استدلال سے بڑا لطف لیا۔ واللہ بڑا زور ہے، بڑا جوش ہے، بڑا انقلابی جذبہ ہے، بڑی جدت ہے، بڑا ولولہ ہے، اس کی داد نہ دینا ظلم ہوگا۔

مگر یہ حقیر ناچیز محسوس کرتا ہے کہ آپ کو ایک بنیادی غلط فہمی ہوئی ہے۔ آپ نے فٹ پاتھ کے عطائیوں اور اہلِ علم معالجوں کو اسی غلط فہمی کی وجہ سے ایک کر دیا ہے۔ یہ معالج جب کسی دوا کا ذکر کرتے ہیں، اس کی تعریف کرتے ہیں یا اس کا اشتہار دیتے ہیں یا ان کے لٹریچر میں جب کوئی نسخہ درج کیا جاتا ہے تو اس کا فطری اصولِ صحت اور تندرستی کے بنیادی تقاضوں کی تردید اس میں شامل نہیں ہوتی، بلکہ الٹا یہ بات از خود اس میں شامل ہوتی ہے کہ صحت و قوت کے فطری تقاضوں کو پورا کرنے کے ساتھ یہ دوائیں اپنا فلاں فلاں اثر پیدا کریں گی۔ اسی طرح جب بحالیٔ صحت کے لئے کسی دوا کی اہمیت بیان کی جاتی ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ لوگوں کو ترغیب دلائی جا رہی ہے کہ تم اطمینان سے بیمار پڑو اور پھر دواؤں کا سہارا لو، بلکہ مدعا یہ ہوتا ہے کہ بیماریاں جو لاحق ہوتی رہتی ہیں ان کا علاج ممکن ہے اور روزمرہ زندگی میں جو چھوٹی موٹی کوتاہیاں صحت کے تقاضوں کو پورا کرنے میں ناگزیر ہی جاتی ہیں ان کے نتائج سے بچنے کے لئے کچھ ذرائع ہیں کہ جن سے استفادہ کیا جائے۔

باقی رہی یہ بات کہ طبی لٹریچر میں تضاد ہے تو آپ کا یہ دعویٰ آپ کی غیر معمولی عبقریت (GENIOUSNESS) کا ثبوت دیتا ہے۔ آپ دراصل یہ چاہتے ہیں کہ ہر نسخہ جو جسم کی کسی تکلیف یا کمی کو دور کرنے کے لئے درج کیا جائے اس کے ساتھ بار بار صحت کے بنیادی تقاضوں کو دہرایا جاتا رہے۔ حالانکہ وہ تقاضے سب سے پہلے بیان کر دیئے جاتے ہیں۔ اور ان کو ایک مرتبہ واضح کر دینا کافی ہوتا ہے۔

ویسے آپ کا کوئی قصور نہیں، کیونکہ جو باتیں عقلِ عام (COMMON SENSE) سے سمجھنے کی ہوتی ہیں وہ جب "عبقریوں" کے ہتھے چڑھ جاتی ہیں تو یہی کچھ ہوتا ہے! لہٰذا گھبرانے کی کوئی بات نہیں اور اس میں شرمندگی کا کوئی مقام نہیں!

—— + ——
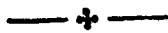
چراغِ راہ کا شعر نمبر ــــــ!

ایک تفصیلی جائزہ

عاصی ضیائی رامپوری

آخر چراغِ راہ نے شعر نمبر شائع کر کے ادبی حلقوں میں ایک نئی تحریک کا "بھرپور" تعارف کرا دیا۔ اب تک پُرانے لکھنے اور پڑھنے والے تحریکِ ادبِ اسلامی کو یا تو جان نہ سکے تھے یا سمجھ نہ سکے تھے۔ کچھ کا خیال تھا کہ "ادبِ اسلامی" کا مقصد و مفہوم تو شاید اس کے علمبردار بھی نہ جانتے ہوں گے! اور زیادہ تر اہلِ قلم ازراہِ تمسخر اس کا مقصد "ادب برائے لوٹا" بتاتے تھے۔ لیکن شعر نمبر نے شائع ہو کر حجت پوری کر دی ہے کہ اب یہی ادب اس ملک اور اس عصر کے دلوں کی پکار ہے، اور آئندہ کم از کم پاکستان میں کوئی دوسرا فکری ادب اس کے سامنے ان شاء اللہ نہ ٹھہر سکے گا۔

تحریکِ ادبِ اسلامی کی مخالفت بڑی حد تک فطری تھی۔ ایک تو یوں ہی ہر نئی تحریک اجنبی ہونے کی بنا پر خوش گوار پذیرائی کا سامنا نہیں کرتی، پھر خاص طور پر حق کے اٹھنے پر تو باطل اپنے تمام اختلافات مٹا کر اس کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتا ہے، کیونکہ حق کے پنپنے میں خود باطل کو اپنی موت کھلی کھلی نظر آتی ہے۔ ان کے علاوہ معاملہ صرف عام تحریکِ اسلامی کا نہ تھا، بلکہ اسلامی ادب کا تھا۔ اور ادب کے بارے میں صدیوں سے یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ اس کو اسلام سے کوئی سروکار نہیں؛ خصوصاً شاعری کے میدان میں اگر کسی نے اسلامی جذبے کے ساتھ قدم رکھا بھی تو حمد و نعت یا میلاد جیسی اصناف سے آگے نہ بڑھ سکا۔ لہٰذا آج کل کے ذہنوں کے لئے بھی یہ انوکھی بات سوچنا بالکل مستبعد تھی کہ اسلام کا سکہ تمام شعبہ ہائے حیات کے علاوہ شاعری پر بھی رواں ہو سکتا ہے۔

بہر نوع، اب، کہ شعر نمبر نے ہمارا موقف دُنیا کے آگے رکھ دیا ہے، ہمیں امید رکھنی چاہئے کہ محض ہٹ دھرم گروہ کے علاوہ ادبی ادارے ہم سے اصولاً اختلاف رکھتے ہوں تو رکھیں، لیکن ہمارے نظریۂ ادب کے بارے میں کسی غیر واضح غلط فہمی کا شکار نہ رہ سکیں گے لیکن اس مرحلے پہ ہم کو قدم آگے بڑھانے سے پہلے اب تک کی کارکردگی کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ اور اسی ناگوار مگر ناگزیر فرض کے لئے ہم نے قلم اٹھانا چاہا ہے جس طرح اسلام پسند جماعت کا ہر فرد ایک دوسرے کے ساتھ نیک گمان کرنے کے باوجود کھلی اور بے لاگ تنقید کرنے اور سننے کے لئے اپنی زندگی اور کردار کے دوسرے گوشوں میں تیار رہنے پر مامور ہے، اسی طرح ادب کی وادی میں بھی اس کا قافلہ صرف "من ترا حاجی بگویم، تو مرا حاجی بگو" کہتا ہوا آگے نہیں بڑھنا چاہئے۔ فنِ تنقید کے بارے میں ہم میں سے غالباً ہر شخص کا تجربہ صفر سے کچھ ہی آگے ہوگا، لیکن دل کی لگن سچی اور قوی ہے تو تجربات اور علوم خود ہی فراہم ہو جاتے ہیں، کیونکہ بقولِ اقبال ؎ علم ہے ابن الکتاب، عشق ہے اُمّ الکتاب۔

چراغِ راہ کے مرتب سے بہتوں کو شکایت ہے کہ انھوں نے شعر نمبر کا معیار بعض بعض مقامات پر گرا دیا، اور بہت سی اچھی نظمیں شائع کرنے سے روک لیں اور بہت سی گھٹیا نظموں کو جگہ دے دی۔ شکایت کرنے والوں کے پیشِ نظر غالباً یہ تھا کہ اس کارروائی سے ہم "غیروں" کو بعض نیم پختہ مواد دکھا کر اپنا مضحکہ ہی اڑوا سکتے ہیں، نہ کہ ان کے آگے سر افتخار بلند کر سکتے؟ اور شکار۔ کئے جانے والے کے پاس غالباً یہ جواب ہے کہ ہمیں اپنے نو مشقوں کی حوصلہ افزائی بھی منظور تھی۔ لیکن میں ان دونوں نقطہ ہائے نظر کے علاوہ کچھ اور ہی طرح سوچتا ہوں۔ مجھے جناب ماہر القادری سے اتفاق ہے کہ یہ نمبر ان شاء اللہ ایک سنگِ میل ثابت ہوگا۔ پس اس کو حال کے بجائے مستقبل میں پہنچ کر سوچئے کہ آج سے مثلاً پچاس سال بعد جب ایک مؤرخ اردو شاعری کی جدید تاریخ ــــــ یعنی اُس عہد کی رو سے جدید ــــــ لکھے گا تو اسے تحریکِ ادبِ اسلامی کا پہلا نمائندہ مجموعۂ شعر

کی حیثیت سے دیکھ کر کیا رائے قائم کرے گا۔ مستقبل سے ہم واقف نہیں، لیکن ان دو صورتوں کے سوا تیسری کوئی صورت نہیں کہ یا تو اس وقت اسلامی تحریک ہمہ گیر و آفاق گیر ہو چکی ہو گی، یا خدا ناکردہ اس کا نام لیوا بھی کوئی نہ ہو گا۔ پہلی صورت میں یقیناً ایک مؤرخ توقع کرے گا کہ ہم نے پہلے ہی مرحلے پر اپنا منتخب ترین ادب پیش کیا ہے۔ لیکن جب وہ دیکھے گا کہ اس میں بعض "ادب پارے" محض خانہ پری کے طور پر درج ہیں، تو اسے ہم سے مایوسی ہو سکتی ہے کہ ہم لوگ اس ہمہ گیر تحریک کے پیچھے محض تابع مہمل کے طور پر لگ گئے تھے، ورنہ دراصل اسلامی انقلاب برپا کرنے میں ادب کا مطلق کوئی حصہ نہیں۔ رہی دوسری صورت، تو اس میں مؤرخ ایک تو ویسے ہی ہمارے نظریات و معتقدات کا مخالف ہو گا، پھر اس کو اسلام سے مزید منحرف کرنے کے لئے ہمارا یہ کم معیاری نمونۂ شعر بھی ہو گا؛ اور وہ مطمئن ہو جائے گا کہ جس تحریک نے ایسے سطحی ادیب اور شاعر میدان میں اتارے اس کا انجام ناکامی ہی ہونا چاہئے! پس مرتب یا شاکیوں کے سامنے "تالیفِ قلوب" یا "افتخار و تذلل" کا سوال نہ ہونا چاہئے؛ بلکہ اس کو مستقبل کی آنکھ سے دیکھنا ضروری ہے، کہ آیا ہم اپنے بعد آنے والوں کے لئے کوئی لائقِ تقلید مثال چھوڑ رہے ہیں یا کسی فتنے کا سبب بن رہے ہیں۔ اوراق صفحات میں ہم اس کو اس کی اسی حیثیت سے دیکھنے کی کوشش کریں گے۔

شعر نمبر میں چھوٹی بڑی ملا کر ایک سو اکتر[۱۷۱] نظمیں ہیں، جن میں سے تین اقبالؔ اور تین حالیؔ کی نظمیں چھوڑ کر باقی سب شعرائے حاضر کی تراوشِ فکر ہیں۔ ان کو مرتب نے کئی ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا مجموعہ "شعر و شاعر" کے عنوان سے ان نظموں پر مشتمل ہے جن میں ان حضرات نے رائج الوقت شعر گوئی یا عام اصولِ شاعری سے بحث کی ہے۔ اس پر ہم علیٰحدہ تبصرہ کریں گے۔ فی الحال ہم ان ادوار کو جدا جدا دیکھنا چاہتے ہیں جن کو مرتب نے ایک خاص اہتمام ترتیب کے ساتھ مربوط کیا ہے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ اس صدی میں تحریکِ اسلامی کا آغاز تقسیمِ ہند سے برسوں پہلے ہو چکا تھا، لیکن شعری سرمایہ اس تحریک میں اس وقت نہ ہونے کے برابر تھا، کیونکہ ایک تو شعرا جیسی تخیل پسند قوم کسی عملی دعوت کے قبول کرنے پر جلد مستعد نہیں ہوتی؛ دوسرے، ایک عمر کسی طرزِ خاص کی شاعری میں گزارنے کے بعد ایک دم اس سے منحرف ہو کر روش بدل ڈالنا آسان کام نہیں۔ اس لئے شعر نمبر میں تقسیم سے پہلے تک کا انتخاب کل سات نظموں پر مشتمل ہے۔ اس میں پہلی نظم جناب ماہر القادری کی ہے، جس میں انھوں نے "برطانوی مشن" (۱۹۴۶ء) کی کیا دی ظاہر کی ہے۔ دوسری نظم چند رباعیوں کا مجموعہ ہے۔ ان میں ماہرؔ صاحب نے "ملحد انقلابی شاعر" کی مذمت کی ہے۔ یہ دو نظمیں اگر ایک ہماری تحریک پر اشتراکیوں کے اس اعتراض کو رفع کرتی ہیں کہ ہم رجعت پسند اور انگریزی استعمار کے دلدادہ ہیں تو دوسری طرف ہمارا یہ موقف بھی ظاہر کرتی ہیں کہ ہم اشتراکیوں سے کس بارے میں اور کیوں اختلاف رکھتے ہیں۔ لیکن، بہر حال، یہ ہنگامی نظمیں ہیں۔ ان میں بالخصوص پہلی میں، وہ گہرا اور ہمہ گیر تاثر (EMOTION) نہیں جو ایک نصب العین عشق کی خصوصیت ہے کے ساتھ عظمتِ فکر اور عمقِ نظر بھی ظاہر کرتا ہے۔ سطحی جذباتیت (SENTIMENTALITY) اور عام فریادی کیفیت ہے، جو ہر عامی کے دل پر گزر سکتی اور گزرتی ہے۔ اور یہی حال اگلی نظم "اعلانِ تنفر" (از سید شبیر بخاری) اور "رہبرِ ترانہ فوج" (نعیمؔ) کا ہے۔ خصوصاً یہ آخری نظم تو فریاد سے بڑھ کر طنز بن گئی ہے۔ لیکن ہم کو یہ نہ بھولنا چاہئے کہ اس غیر یقینی اور شدت سے جذباتی دور میں ایسی نظمیں اس سے بہتر نہ ہو سکتی تھیں۔ بالخصوص "اعلانِ تنفر" کی مناسب آمیز بے چینی خواہ آج ہمیں کتنی ہی بے کیف یا اوپری سی معلوم ہو، اپنے وقت کے لحاظ سے بعید قابلِ قدر ہے، کیونکہ شاعر نے اس میں اپنا صحیح موقف بہت خوبی سے پیش کیا ہے۔ بیک وقت ہمارا یہ شاعر اس نظم میں وطنیت پر بھی بالواسطہ ضرب لگاتا نظر آتا ہے، اشتراکی تصور پر بھی کنایتاً وار کرتا ہے، مغربی تہذیب کی لعنتیں بھی گنا دیتا ہے، ملک کے فسادات پر اپنا دلی کرب بھی نمایاں کرتا ہے، اسلام کے تنگ اور جامد تصور پر بھی ملامت کرتا ہے اور ان سب کے ساتھ ہی اپنا نقطۂ نظر بحیثیت مجموعی بھی ——— اگرچہ پوری طرح واضح نہیں ——— کھول کر رکھ دیتا ہے۔ ان خوبیوں کے علاوہ اس نظم میں دوسرے شعرا کی بقیہ نظموں سے، جو اس دور میں درج ہیں، ایک معنوی اور مقصدی ہم آہنگی ملتی ہے۔ ایک طرح سے "اعلانِ تنفر" اس دور کی ساتوں نظموں میں نمائندہ نظم ہے۔ نعیم کی "ایک سوال، چار جواب"

بظاہر اپنے دلکش ترنم، ہموار تسلسل اور مناسب ترین اختصار کی بنا پر "اعلانِ تنفر" سے بہتر نظر آتی ہے، لیکن اس کا "عوامی پن" اس کو شاعری کی تین منزل سے کسی قدر نیچے گرا لاتا ہے، اور اسی بنا پر "اعلانِ تنفر" میری رائے میں اس سے بڑھی ہوئی ہے۔ اس پر تفصیلی بحث ان شاء اللہ انفرادی تبصرے کے ماتحت آگے چل کر ہوگی۔ ان نظموں کے علاوہ نعیم کی "امپریلزم" ایک جیتا جاگتا بگل ہے جو اُس وقت کی (اور حقیقتاً آج کی بھی) عالمی سیاست کی چونکیوں کا الارم بن کر قاری کے ذہن میں گونج جاتا ہے؛ مگر "مالِ تجارت" میں جذبہ دھیما اور گھٹا گھٹا سا ہے، اور اس میں شاعر کے جبار آمیز عزم کے مقابل ماحول اور صدیوں کی وراثت کے زیرِ اثر بے بسی کے پردے میں بے عملی نہایت انوکھی اور تلخ ہیں۔ شاید لوگوں نے اس نظم کے اختتامی بندوں کی معنویت پر توجہ نہیں دی، ورنہ اس نظم پر بھی بہت کچھ کہا جا سکتا تھا۔

بحیثیت مجموعی ہم اس دور کو تمہیدی دور کہہ سکتے ہیں۔ اس زمانے میں شعرا پر داخلیت یا موضوعیت (SUBJECTIVITY) کا غلبہ ہے لیکن ان کا میدانِ فکر برون بینی (EXTROSPECTION) کے رجحان رکھتا ہے۔ اس عہد میں وہ اپنی انفرادیت یا ذہنیت کے متعلق کھل کر نہیں کہتے، صرف ایک تماشائی کی حیثیت سے دنیا کے بگڑتے ہوئے نظام پر اچٹتی سی نظر ڈال کر اس سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔ اسی اظہارِ بیزاری کو میں نے داخلیت کہا ہے، کیونکہ وہ دنیا کے حوادث وافکار پر، جو اس عہد میں ہر طرف مقبول ہیں، اپنے نقطۂ نظر سے بحث کرتے ہیں، اور اس طرح نئی اقدار کی داغ بیل ڈال رہے ہیں؛ یعنی معاشرۂ انسانی کو اس کے جو خدوخال خود اُس کی نظروں میں دلکش تھے، گھناؤنے بنا کر دکھانا چاہتے ہیں۔ ساتھ ہی بعض مفاسد کے، جو پہلے سے انسان کی نظروں کے آگے آ چکے تھے، کچھ مزید بھیانک پہلو بے نقاب کرنا چاہتے ہیں۔ یہ نئے پہلو کیا ہیں؟ خدا اور رسولؐ کی ہدایت سے بے نیاز رہنے والوں کے لئے تو اجتماعی مفاسد زیادہ سے زیادہ معاشی ابتری اور عمرانی برہمی ہی تک پہنچا کر چھوڑ دیتے ہیں، لیکن ایک مومن کی فراست اس سے بھی آگے بڑھ کر اس کا نتیجہ ایک عالمگیر ہلاکت کی شکل میں دیکھتی ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ ہمارا شاعر اپنے اس پیغام کو وضاحت کا جامہ نہ پہنا سکا۔ وہ یہ تو جانتا نظر آتا ہے کہ عصرِ حاضر کی فلاں اور فلاں بات ہمارے نقطۂ نظر سے مذموم اور تباہ کن ہے، مگر یہ نہیں بتا سکتا کہ خالص معروضی حیثیت سے یہ خرابیاں کس منزل پر انسانیت کو پہنچا کر دم لیں گی۔ مختصر یہ کہ وہ حال کو دیکھ کر لرزتا اور مستقبل کا خیال کر کے لرزتا ہے لیکن اس کی یہ کڑھن اور لرزہ زیادہ تر نتیجہ ہے اس کے اس ایمان کا کہ بے خدا معیشت وسیاست کا انجام یہی ہوتا ہے۔ اور قاری سے بھی وہ پہلے ہی سے متوقع رہتا ہے کہ اس ایمان میں وہ بھی اُس کا ہم نوا ہے۔ اب اگر سامع اس بات پر ایمان نہ رکھتا ہو تو اس کے لئے شاعر کی یہ کوشش تقریباً بالکل بے معنی ہو کر رہ جائے گی۔ گویا یہ شعری ادب ایک مخصوص ملت (مسلم) سے خطاب کرتے ہوئے پیدا کیا گیا ہے۔ اس میں شعر کی وہ تجرید (ABSTRACTNESS) نہیں ہے جو ہر انسان کی توجہ جذب کر لے۔ حالانکہ تحریکِ اسلامی کا عمومی، اور من وتو کے امتیازات سے بلند ہونا ضروری ہے۔ پھر بھی ہم یہ سمجھ کر شاعر کو معذور کہہ سکتے ہیں کہ اُس عہد کا تقاضا ہی یہ تھا، اور دیگر ابنائے وطن کی عصبیت نے اُن کو ہماری سچی سے سچی بات سننے کے قابل بھی نہیں چھوڑا تھا۔ لہٰذا شاعر بھی مجبور تھا کہ اپنے ہی ہم جنسوں سے خطاب کر کے اُن تک پیغامِ حق پہنچا دے۔

فنی طور پر اس عہد میں کوئی خصوصیت نہیں، سوائے اس کے کہ اسلوب پر ایمائیت کی لطافت کے بجائے وضاحت کی کرختگی پائی جاتی ہے خصوصاً نعیم کی "مالِ تجارت" نظمِ آزاد ہونے کی بنا پر ایمائیت کی زیادہ مقتضی تھی۔ ایسی نظموں میں خیال کا تسلسل اور ربط نا گزیر ہے کیونکہ مصرعوں کے بے ربط گھٹنے بڑھنے سے الفاظ کے معنوں پر بھی جھٹکے سے لگتے ہیں اور تسلسلِ خیال میں حارج ہوتے ہیں۔

اس کے بعد انتخابات کے معاملے میں مجھے نعیم صاحب سے اختلاف ہے۔ انھوں نے ہر سال کے ماہ اگست سے اگلے سال ماہِ اگست تک کو ایک دور قرار دے کر نظمیں منتخب کی ہیں۔ حالانکہ فکر کا ارتقا یا انقلاب سال کی جنتریوں کا پابند نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں اگست ۱۹۴۷ء تو یقیناً ایک تاریخی موڑ کا نشانِ راہ ہے اور اس مہینے کے بعد فکر میں بھی یقیناً ایک موڑ آیا ہے؛ لیکن اس تاریخ کے

بعد شعری انتخاب کے لئے دوسرا دور اگست ۱۹۴۷ء تک کے بجائے مارچ ۱۹۴۹ء تک رکھنا چاہیئے تھا، کیونکہ اس تاریخ کے بعد ہماری تحریک ایک نئے مرحلے میں داخل ہوتی ہے۔ قراردادِ مقاصد منظور ہو جانے کے بعد ہمارے ادیب اپنے اسلوب و پیغام میں ایک نئی لے سموتے ہیں۔ اور آج تک یہ مرحلہ طے نہیں ہو سکا ہے۔ بہرحال، ہم شعر نمبر کے انتخابات نمبر ۲ و نمبر ۳ کو باستثنا اُن نظموں کے جن میں قراردادِ مقاصد کا کسی نہ کسی طرح ذکر ہے، ایک زمرے میں رکھ کر دیکھیں گے، اور بقیہ تمام انتخابات کو مجموعی طور پر یکجا کر کے ان کا جائزہ لیں گے۔ شاید کسی کو یہ خیال ہو کہ مارچ ۱۹۴۹ء کو ایک حدِ فاصل مان کر ادوار کی تقسیم صرف پاکستانی ادیبوں کے لئے ہو سکتی ہے، لیکن اردو کے ہندوستانی اسلام پسند ادیبوں کے لئے یہ تاریخ اس اعتبار سے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ سو اول تو اسلامی رجحان کے ادیب اکثر پاکستانی ہی ہیں، اہلِ ہند کے ادیبوں کے لئے تو ابھی کوئی تیسرا مرحلہ ۱۹۴۷ء کی تقسیم کے بعد آیا ہی نہیں؛ اس لئے انھیں جس دور میں جگہ دی جائے، وہ وہاں مناسب معلوم ہوں گے۔

غرض اگست ۱۹۴۷ء کی انقلابی، خونی، یادگار تاریخ آئی، اور اپنے ساتھ نہایت بھڑکتے ہوئے مسائل لائی۔ یہ مسائل اس قدر فوری توجہ کے محتاج تھے کہ شاعروں کو بھی اپنی شاعری کچھ عرصے کے لئے ملتوی کرنا پڑی؛ اور وہ اگر عمل دوست تھے تو اُن مسائل کے سلجھانے میں ہمہ تن مشغول ہو گئے، ورنہ اس ہولناک انقلاب سے ایسے مبہوت ہوئے کہ ان کے ذہن بھی شعر کی تخلیق سے عاجز ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ پورے ایک سال کی نظموں کا انتخاب پانچ نظموں سے زیادہ نہ ہو سکا۔ اور یہ پانچ نظمیں بھی پانچ شاعروں کی ہیں (حالانکہ اس سے پہلے اور بعد کے انتخابات میں ایک ایک شاعر کی کئی کئی نظمیں بطور انتخاب درج ہیں) اس انتخاب میں ہمیں چند نئے نام ملتے ہیں، جن میں سے ایک خاتون کا نام بھی ہے۔ جناب اسعد ملتانی کی "عزمِ حرم" اور محترمہ شاہین کی غزل نما نظم "کوئی تو ہے" اپنے سلجھے ہوئے تخیل، متانت آمیز انداز اور عمومی بلکہ ایک حد تک تجریدی تأثر کے اعتبار سے "پیداوارِ عصر" نہیں معلوم ہوتیں۔ شاید یہ نظمیں قبلِ تقسیم کہی گئی ہوں، اور بعد میں چھپی ہوں۔ اور اگر بعدِ تقسیم کہی گئی ہیں تو ہمیں ان دونوں شاعروں کی پُرسکون اور متحمل طبع کا قائل ہونا پڑے گا۔ اس کے علاوہ شاید یہ بات بھی ہے کہ یہ دونوں، خصوصاً جنابِ اسعد، شاعری میں نئے تجربے کرنے سے احتراز کرتے ہیں۔ اور چونکہ قدما کے سانچوں میں ہمارے وقت کے تیزی سے بدلتے ہوئے مسائل نہیں ڈھل سکتے، اس لئے ان دونوں حضرات نے بھی ان پر کچھ زیادہ کھل کر کہنے کی ضرورت نہ سمجھی یا استطاعت نہ پائی۔ بہرصورت دونوں نظمیں آج بھی لطف خیز ہیں، اور آئندہ بھی رہیں گی؛ خصوصاً "عزمِ حرم" کا "عربی ترنم" اور دھیما دھیما جذبہ ایک عرصے تک یادگار رہے گا۔ البتہ اگر اس میں فکر کی عظمت بھی شامل ہوتی تو شاید یہی نظم غیر فانی ہو جاتی۔

ہاں، نعیم کی "تعمیرِ تاریخ" خالص وقت کی چیز ہے؛ بلکہ یہ تو پڑھنے والوں سے اُس وقت تک اپنا لوہا منواتی رہے گی جب تک اردو میں اسلامی ادب کی تحریک جاری رہے گی! اس ڈرامائی نظم کو تو میں اگر پورے شعر نمبر کی نمائندہ نظم کہوں تو بے جا نہ ہو۔ اس میں کیا نہیں ہے؟ — انقلاب کی خوفناک آندھی کے بعد اس کی قیامت خیز ویرانی کے کھنڈروں سے یہ نظم گونجتی ہوئی بلند ہوتی ہے، اور رفتہ رفتہ آبادی، چہل پہل، ہٹ دھرمی، فریب، سفاک عزائم وغیرہ میں سے کبھی افتاں و خیزاں، کبھی رواں دواں، کہیں سے بچتی، کہیں ہانپ کر دم لیتی، گزر کر ایک دوسرے انقلاب کی سُرخ دہکتی روشنی دکھا کر اتھری خلا میں ماند پڑ کر غائب ہو جاتی ہے! اس نظم پر علیحدہ تبصرہ آگے چل کر کیا جائے گا۔ سردست اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ اس نظم کے آئینے میں ہم، آپ، اربابِ حکومت، اور دوسرے تمام پاکستانی اپنے آپ کو پوری طرح پہچان سکتے ہیں، اپنے اعمال کا جائزہ لے سکتے ہیں، اور جس گاڑی میں بیٹھے ہوئے ہیں اُس کا رُخ بھی معلوم کر سکتے ہیں۔ اس نظم کی بدلتی ہوئی بحریں ہماری بدلتی ہوئی زندگی سے ایسی ہم آہنگ ہیں کہ ہم نعیم کو بلا تامل اپنی ذہنیت کا نمائندہ اور نباض قرار دے سکتے ہیں، اور یہی شاعر کی عظمت کا ایک ثبوت ہے۔ اس نظم کے علاوہ انتخاب نمبر ۲ و نمبر ۳ میں ہمیں جتنی نظمیں ملتی ہیں وہ گویا "فقط اک نکتۂ ایمان کی تفسیریں" ہیں، لیکن مسائلِ حاضرہ کا غلبہ ہمارے شاعروں پر اس قدر زیادہ ہے کہ وہ ابھی تک اپنی مستقل "شاعرانہ سیرت" کی تعمیر بھی نہیں کر پائے ہیں۔ زیادہ تر کھل کر کہنے کے عادی ہو گئے ہیں، اور اس طرح شعر کو خطابت کی سرحدوں میں گھسیٹ

گئے ہیں، مگر میں سمجھتا ہوں کہ نفسِ امر میں بڑی حد تک معذور ہیں۔ ایک طرف ہم اپنی قوم کا مزاج دیکھتے ہیں تو ہمیں صدیوں کی بے عملی کی بدولت وہ سطح میں طبائع ملتی ہیں جو کام کے بجائے نعرے لگانا یا سننا پسند کرتی ہیں؛ اور پھر ان مسلسل نعروں اور "سیمابی" جلوسوں نے ان کے اعصاب اتنے سریع الحس بنا دئے ہیں کہ خفیف سی تکلیف پر بلبلا اٹھنا اور موہوم سی امید پر آپے سے باہر ہو جانا ان کا معمول ہو گیا ہے۔ اس کیفیت کو قومی مزاج بنا کر پختہ کرنے میں بعض بیرونی عناصر نے بھی خوب مدد دی، مغربی تہذیب اور اشتراکی تحریک دونوں کی تان بالآخر "مظاہرۂ جذبات" پر ٹوٹتی ہے[1] یعنی جو کچھ دل پر گزرے، بے تامل اس کا اظہار مبالغے کے ساتھ کر ڈالو۔ حالانکہ ہماری قدیم تہذیب کا طرۂ امتیاز "ضبطِ جذبات" اور "وضع داری" تھا۔ پس ایسے ماحول میں سے جو زمانۂ دراز سے سطحیت پسندی کا گہوارہ بنا ہوا ہے، ہم اس سے بہتر شاعری کی کیوں توقع کریں؟ دوسری طرف ہنگامی کشمکش اور وقتی مسائل پوری دنیا میں اس کثرت سے اور اتنے پے در پے آتے چلے جا رہے ہیں کہ ہمیں یکسوئی سے مشاہدات کو ہضم کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ چنانچہ ہمارے شاعر بھی بیشتر اسی زود حسی اور عجلتِ فیصلہ کا شکار ہیں۔ اب انھیں اتنی فرصت یا تحمل کہاں کہ ورڈز ورتھ کی طرح ایک قدرتی منظر سے متاثر ہو کر اس کا شاعری میں اظہار سات سات برس بعد کریں! یہ صحیح ہے کہ جذبات کو اس طرح اپنے رگ و ریشہ میں سرایت ہونے دینا یا مدارِ شعر کی تخلیق کا باعث ہوتا ہے، لیکن غالب کے الفاظ میں زمانہ فرصت دے تو ہم بھی دکھا دیں کہ ہمارا "ہر داغِ دل اک تخم ہے سرو چراغاں کا"! پھر بھی ہمارے شاعروں نے جو کچھ کہا ہے وہ کم از کم عام ترقی پسند شعرا کے کلام سے زیادہ دقیع، متین اور دیرپا ہے۔ اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہمارے شاعر جس تحریک سے وابستہ ہیں وہ خود انسان کو تحمل اور سنجیدگی کا پیکر بنانا چاہتی ہے۔ اب یہ ہماری کمزوری ہے کہ ہم اس کے تربیتی اثرات پوری طرح نہ لے سکے؛ اور جتنا قصور ہم میں اس نہج سے رہے گا اتنا ہی نقص ہمارے ادب میں بھی موجود رہے گا۔ البتہ مجھے ایک شکایت اپنے عام شعرا سے یہ ضرور ہے کہ اگر عام زندگی میں وہ اتنے سریع الجذبات نہیں تو کیوں نہیں میدانِ ادب میں بھی وہ اپنا مزاج ایسا بنانے کی کوشش کرتے کہ کم سے کم وقت میں زیادہ تاثر لے کر بہتر شعر تخلیق کر سکیں؟ ہمارے قدیم کلاسیکی شعرا کی غیر معمولی ندرتِ فکر محض اس بات میں پوشیدہ نہیں کہ ان کے پاس فکرِ شعر کے لئے فرصت بہت تھی۔ شعر گوئی کو وہ ایسا ہی سنجیدہ کام سمجھتے تھے جیسا تحصیلِ علم کو۔ اور اگر کسی شخص میں شاعرانہ صلاحیت ہوتی تو وہ اس کی صحیح تربیت کے لئے ہر ممکن کوشش کرتا۔ آج ہم اس عہد کے سلسلۂ استادی و شاگردی پر ہنستے ہیں، لیکن درحقیقت شاعرانہ مزاج پیدا کرنے کے لئے یہ اس زمانے کا نہایت آزمودہ اور عمدہ طریقہ تھا۔ جو لوگ محض تک بندہ ہوتے تھے وہ تو اپنے استاد کے رنگ میں رنگ جاتے تھے؛ لیکن حقیقی شاعر اپنے اسی استاد کی شاگردی کر کے اپنی انفرادیت بنانا سیکھتا تھا۔ پھر اگر آج یہ سلسلہ برہم ہو گیا ہے، یا ناقص ثابت ہوا ہے، تو کم از کم شاعرانہ مزاجِ لطیف پیدا کرنے کے لئے مطالعۂ فنِ شاعری تو ناپید یا ناکارہ نہیں ہو گیا۔ میں نے شعرِ منبر کا مطالعہ کرتے ہوئے محسوس کیا ہے کہ ہمارے ساتھ ایسے ایسے خوش فکر "بدیع نگار" موجود ہیں جو اگر چاہیں تو میر و سودا کے عہدِ زریں کی طرح ایک نیا دور پیدا کر دیں (ان کی نشاندہی آگے کروں گا)، لیکن مطالعے کی کمی اور تنوعِ اسلوب اور طبعی عجلت پسندی کے باعث ابھی تک جہاں سے چلے تھے وہیں کھڑے ہیں۔ کیا یہ حضرات محض شعر گوئی نہیں؟ اپنی تحریک کی خاطر اتنا وقت بھی نہیں نکال سکتے کہ اپنے قدما کے کلام کا مطالعہ کرتے رہا کریں؟ اگر ان کو یہ خیال ہو کہ قدما کے اشعار جاہلیت کی طرف لے جاتے ہیں، تو وہ اس خیال کو دل سے نکال

---

[1] انگریز اپنے ضبطِ جذبات کے لحاظ سے یورپ بھر میں ممتاز قوم مانے جاتے ہیں، مگر ان کی معاشرت میں بھی جس قدر کثرت سے جذبات کا بیجا اظہار ہوتا ہے، اس کے مقابل ہماری معاشرت کے مجلسی و عمرانی تعلقات میں اظہارِ جذبات کچھ بھی نہیں۔ اس کا تجربہ اس وقت ہو سکتا ہے جب آپ کسی انگریز خاندان یا فرد کی صرف ایک دن کی زندگی کا مشاہدہ کریں، اور اس کا موازنہ ایک اوسط درجے کے مسلمان خاندان کی زندگی سے کریں۔ مزید ثبوت کے لئے ملاحظہ ہو کہ انگریزی زبان میں جتنے تعجبیہ کلمات (INTERJECTIONS) ہیں، اردو میں شاید ان سے آدھے بھی نہ ہوں! اور اشتراکی تحریک کے بارے میں تو کچھ کہنا ہی کار ہے، اس کا تجربہ ہم کو اب خاصا ہو چکا ہے۔

وجہ اول تو میرا دعویٰ ہے کہ اردو شاعری کا بیشتر حصہ کم از کم ادبِ جائز کی حدود میں آتا ہے۔ اور پھر یہ کہ آپ ... یا اہلی قدروں سے کیوں اخذ لیں؟ اگر امام غزالیؒ جاہلی فلسفے کے ابطال کے لئے اس کا مطالعہ کرنے میں حق بجانب ٹھیریں، اگر علمائے اسلام اپنے دین کا ماخذ قرآن و حدیث پڑھنے اور سمجھنے کے لئے عربیت کا مطالعہ شعرائے جاہلیت کے کلام سے نہ صرف خود کریں بلکہ ان کا درس عین مساجد میں بیٹھ کر دیں اور پھر بھی مورد الزام ہونے کی بجائے سزاوار تحسین قرار پائیں تو کیا آ... یہ کا ایمان محض اس ... سے مخطور ہو جائے گا کہ آپ نے تحریکِ اسلامی کو ادب میں رائج اور حاوی کرنے کے لئے ان ہتھیاروں کا بالاستیعاب معائنہ کیا جن سے ہمارے شعرائے متقدمین نے لوگوں کے دل و دماغ جیتے تھے؟ آخر چھ سو سال کا سرمایۂ شعر اردو محض "غرقِ مئے ناب" ہی تو نہیں کہ آپ کے گوشۂ چشم کے التفات کے بھی ناقابل ہو! وہاں آپ کو بیشمار اسالیب ملیں گے، خیالات کی رنگارنگی اور نفسیاتِ انسانی کے ہزاروں پہلوؤں پر تبصرے ملیں گے، معاشرے اور ماحول کو روحِ شاعری بنانے کے طریقے ملیں گے، انفرادیت برقرار رکھتے ہوئے اجتماعیت پر سیر حاصل مباحث ملیں گے ——— قصہ مختصر آپ کو وہ تمام سامان ملے گا جس سے آپ کا ایک مزاجِ شاعری بن سکے، اور جو آپ کی تحریک کو پائداری حاصل کرنے میں مدد دے سکے۔ ہماری تحریک میں دو ایک صاحب ایسے بھی ہیں، مثلاً ماہر القادری، ملک عزیز، اور (اپنے افکار و شاعری کے اعتبار سے) اسد ملتانی جن کا اندازِ کلام بتاتا ہے کہ وہ قدما کی شاعری کا خاصا مطالعہ کر چکے ہیں؛ اور اسی لئے ان کے ہاں ایک وقار اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ وہ گہرا رچاؤ بھی پایا جاتا ہے جو شعر کو خطابت بننے سے روکتا ہے۔ آپ ان حضرات کی مثال سامنے رکھئے، اور پھر دیکھئے کہ آپ بھی قدما کے کلام کا مطالعہ کر کے کہاں سے کہاں پہنچ جاتے ہیں۔

اس مشورے پر ایک اندیشہ شاید دلوں میں اور پیدا ہو کہ اس طرح ہم قدما کی شاعری پڑھ پڑھ کر مقلد بن جائیں گے، اور شعر میں نئے تجربے نہ کر سکیں گے، جیسا کہ ایک حد تک متذکرہ بالا تینوں شاعروں (ماہر، عزیز، اسد) کا حال ہے۔ لیکن گزارش ہے کہ نئے تجربے کرنے کی اجازت اس وقت تک کیوں کر کسی طالبِ علم کو مل جائے جو ابھی پرانے ہی تجربے پوری طرح نہ کر چکا ہو؟ یہ کیا ضرور ہے کہ فقہ قدیم کا مطالعہ کرنے والا مقلد ہی بن سکتا ہے، مجتہد نہیں؟ یہ تو طالبِ علم کی روحِ اجتہاد پر موقوف ہے؛ اگر اس میں اجتہاد کی صلاحیت ہے تو وہ اس مطالعے سے اور نکھر جائے گی، اور جہاں جہاں پرانے مجتہدوں سے اس کو اختلاف ہوگا وہاں وہاں اس کی یہ صلاحیت خود ہی صحیح و غلط کی نشان دہی کرتی جائے گی۔ لیکن اجتہادی صلاحیت کی وجہ سے مطالعے کی اہمیت کا کیوں کر انکار ہو سکتا ہے؟ ورنہ پھر آپ ان مغرب زدہ حضرات کو کس طرح اُن کے بلا علم اجتہاداتِ دینی پر ملزم ٹھیرائیں گے جو مغربی علوم میں فاضل ہونے کے باوصف علمِ دین میں بالکل کورے ہوتے ہیں؟

اس وقت ہمارے شعرا کے اسلوبِ بیان پر اقبالیت سب سے زیادہ چھائی ہوئی ہے۔ وہی فخیم و پرشکوہ الفاظ اور بندشیں، وہی گونجتا گرجتا "نعرہ نما" خطاب، وہی چونکانے اور کھڑکھڑانے والی لَے، لیکن بایں ہمہ آخر ان کو اقبال کی سی ہمہ گیر نہ سہی، اس کی ہزارواں حصہ کامیابی اور مقبولیت کیوں نہیں حاصل ہوتی؟ یہ تقلیدی روش ہم میں بہت پرانی ہے، لیکن فی الحقیقت اتنی ہی لایعنی اور بے مصرف بھی ہے۔ میر و مرزاؔ کی تقلید کرنے والوں کو کیا مل گیا، اور ٹیگور کا سا "ادبِ لطیف" رائج کرنے والوں نے کیا پا لیا جو اب ہم اقبالؔ کے پیچھے چل کر حاصل کر لیں گے؟ بلکہ یہاں معاملہ اور بھی مایوس کن ہے۔ ایک تو ہم میں سے کتنے مقلدینِ اقبالیت ہیں جنھوں نے اقبال کو اس کے سستے مداحوں کی تحریروں سے نہیں، خود اقبال کے کلام کا سنجیدہ مطالعہ کر کے سمجھا؟ زیادہ تر شاید وہی ہیں جنھوں نے اس کے متفرق اشعار جہاں تہاں پڑھ کر، اور اس پر چند مضامین یا ایک آدھ کتاب کا مطالعہ کر کے اس کی ہمنوائی کا دم بھرنا شروع کر دیا۔ ورنہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ اقبال کی اتنی سطحی نقل کرتے؟ پھر ایک یہ خیال بھی غالباً انھیں تتبعِ اقبال پر اکساتا رہا کہ اس کا دنیائے شاعری میں وہی مرتبہ ہے جو کسی اسلامی تحریک کے مجدد کا ہوتا ہے، لہٰذا اس راہ پر گامزن ہونے کے لئے اسی کے نقشِ قدم پر نعل بالنعل چلنا ضروری ہے۔ دوسرے، اقبالؔ نے جو سلیقۂ شاعری

کے بنائے تھے ان میں اپنی فکر کو ڈھالنا کسی اقبال ہی جیسے "دیدہ بینا" شاعر کا کام ہو سکتا ہے۔ وہ اپنا نغمہ اس دنیا سے آپ و گل یا بقول خود اس "جہانِ درد مندان" میں بیٹھ کر نہیں الاپتا۔ وہ تو کسی ایسی ماورائی بلندی سے اس دنیا کو دیکھتا ہے جہاں سے اس دنیا کے تفصیلی خدوخال اور باریک نقوش نظر نہیں آتے۔ اس کے برخلاف آپ یہیں بیٹھ کر اس کی رسیں لیتے ہیں تو یہ کونسا درست طریق کار ہے؟ پہلے آپ اتنی ہی بلندی پر جا پہنچئے، پھر آپ کے یہ پُرشور نغمے اچھے بھی لگیں گے، اور دل نشین بھی ہوں گے۔ یہ موضوع ذرا متحیر کن اور شاید یاس زا ہے، اور ایک جداگانہ مضمون کی تفصیل چاہتا ہے، جس پر آئندہ بشرط فرصت انشاء اللہ گفتگو ہو گی۔ اس جگہ اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اقبال کے تتبع کے لئے ابھی ہمارے ساتھیوں کو بہت سی منزلیں طے کرنی ہیں؛ فی الحال ابھی ان کی پیروی کے بھی بس کا نہیں؛ لہٰذا فی الحال اُس کو اُس کے حال پر چھوڑ کر اپنی راہ آپ پیدا کیجئے، ورنہ جو بات اُس کی زبان سے نکل کر دلوں اور ذہنوں میں اپنا نقش بٹھا دیتی تھی، آپ کے یہاں پر آ کر ایک شکست خوردہ کی فریاد بن کر رہ جائے گی۔

یہ تمام باتیں مجھے مضمون کے آخر میں کہنا چاہئے تھیں، مگر آمد سخن میں مضمون کا آخری جز میں نے یہیں سمیٹ لیا۔ خیر، جو کچھ عرض کیا گیا اسے خلوص پر محمول کیا جائے تو شاید یہ دماغ سوزی ٹھکانے لگ جائے۔ اب میں سلسلۂ کلام پھر وہیں سے جوڑتا ہوں جہاں سے چھوٹا تھا۔

انتخاب نمبر۲ میں ماہر اور اسد کی ایک ایک نظم کے علاوہ باقی سب نظمیں تحریکِ اسلامی سے کسی نہ کسی طرح تنقیدی حیثیت سے متعلق ہیں، یعنی ہمارے شعرا نے اپنے نقطۂ نظر سے وقت کے مسائل پر تنقید کی ہے، اور آخر میں نظام اسلام کی برکات کا صراحتاً یا کنایتاً ذکر کیا ہے۔ پھر اس موقع پر یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ اب اس تحریک کے ساتھ نئے نئے فن کار بھی ہوتے جا رہے ہیں، اور پہلے فن کاروں کی فکر اور انداز بھی سنورتا جا رہا ہے۔ اگرچہ ابھی تک وہی جذبے کی خام کاری موجود ہے، جس کی وجہ سے ابلاغ میں خطابت کا رنگ آ گیا ہے؛ اس کے علاوہ ہنگامی مسائل کی وجہ سے اسلوب میں بھی ہنگامی پن آ گیا ہے۔ بلکہ ہمارے شاعر کسی پیش پا افتادہ مضمون کو اپنے اندازِ بیان کی قوت سے دوامی بنانا تو درکنار، اہم اور بنیادی حقائق کو بھی ناقابلِ اعتنا حد تک وقتی اور عارضی سا بنا دیتے ہیں۔ اور اس کی وجہ، جیسا اوپر بیان ہوا، ہمارے پورے معاشرے کی ہنگام پسندی اور پھر ان شعرا کی مطالعۂ علم الشعر کی طرف سے لاپروائی ہے۔ البتہ اس انتخاب میں دو ایک مستثنیات بھی ہیں۔ ماہر، عزیز، اسد، شفیق اور عاصی کرنالی کی نظمیں اپنی جداجدا خصوصیات رکھتی ہیں۔ خصوصاً عاصی کرنالی کی "سرمایۂ گلشن" تو اس انتخاب کی جان ہے، بلکہ پورے شعر نمبر کی چوٹی کی نظموں میں اس کا شمار ہونے کے قابل ہے۔ میں نے پہلے پہل جب یہ نظم پڑھی تو حقیقتاً چونک پڑا کہ ہماری تحریک میں ایسا بے بدل شاعر بھی شامل ہو گیا۔ پھر جب ایک عزیز سے جو اس کے ہم وطن ہیں، یہ معلوم ہوا کہ یہ ابھی نوخیز ہی ہے، پختہ عمر نہیں تو میری حیرت اور بھی بڑھ گئی۔ جی نہیں مانتا کہ "سرمایۂ گلشن" کے یہ اشعار پیش کئے بغیر آگے بڑھوں ؎

رستے میں کئی عرش، کئی فرش پڑیں گے — حالانکہ وہ منزل ہے رگِ جاں سے بھی نزدیک
قرآن کو اک غازئی کردار سے پوچھو — ملّا تو سمجھتا ہے فقط "ہدیۂ تبریک"!
چبھتے ہیں جو ارباب تماشا کی نظر میں — سرمایۂ گلشن ہیں وہ کانٹے مرے نزدیک

نو شعر کی اس غزل نما نظم سے جس کا ہر شعر دامنِ دل کھینچتا ہے، میں نے یہ تین شعر تین خصوصیات کے حامل ہونے کی بنا پر بطور نمونہ چُن لئے ہیں۔ پہلے شعر کا مضمون بہت ہی فرسودہ اور نہایت پامال ہے، مگر اس شاعر نے اپنے اسلوبِ ادا سے نہ صرف اس کو تازہ بنا دیا ہے، بلکہ اس میں وہ روح پھونک دی ہے جو ایک تحریکِ اسلامی سے وابستہ شاعر ہی پھونک سکتا تھا۔ دوسرا شعر ایسے موضوع پر ہے جو ہمارے آپ کے لئے روزمرہ کی چیز بن گیا ہے۔ مگر اس عام اور پیش پا افتادہ موضوع کو شعر کے قالب میں ڈھال کر اس قدر دلآویز اور گوارا بنا لینا ہر ایک کا کام نہ تھا۔ اور تیسرا شعر تو شاعرانہ کنائے کے ساتھ وقت کی حق و باطل کی کشمکش کا ایسا بلیغ اور تغزل آمیز بیان ہے کہ اپنا جواب آپ ہی ہے۔

دوسری خوب صورت نظم جناب اسدؔ کی "قرارداد مقاصد" ہے، جس کے یہ اشعار بڑے دلکش ہیں ؎

تو مضطرب کہ جلوہ ابھی عام کیوں نہیں — میں اس پہ مطمئن کہ تقاضا ہوا تو ہے
انجام کے لئے بھی خدا کارساز ہے — آغازِ کار حسبِ تمنا ہوا تو ہے
پڑتی ہے جس سے وحدتِ کردار کی بنا — اُس وحدتِ نظر کا نظارا ہوا تو ہے
غیروں کے اعتراض مبارک کہ ہم میں پھر — تائیدِ حق کا ولولہ پیدا ہوا تو ہے

اس کے علاوہ ملک عزیز کی "جماعتِ اسلامی" بھی ایک خاصی پُر اثر دعا ہے، اور شفیق صدیقی کی "سوزِ ناتمام" بھی اپنی جگہ خوب ہے، لیکن اس میں اوپر کی مذکورہ نظموں کی سی حدتِ ادا مفقود ہے۔

من حیث المجموع انتخاب ۵۲ء - و ۵۳ء میں ہمارے شاعروں کے ہاں فنی پختگی پہلے سے زیادہ ہو گئی ہے، لیکن چند مستثنیات چھوڑ کر شعور و فکر میں خامی اور عجلت نمایاں ہے۔ گویا اس اعتبار سے ہم ابھی وہیں ہیں جہاں قبلِ تقسیم تھے۔ اور ایسا ہونا تعجب خیز بھی نہیں، کیونکہ تقسیم سے حالات سدھرنے کے بجائے کچھ اور بگڑ ہی گئے ہیں۔ اس صورت میں ہمارے شعرا کا بگڑنے کے بجائے اپنے مقام پہ جما رہنا ہی قابلِ اطمینان ہے۔ اور پھر شاید ان کا یہی عزمِ محکم اور استقلال ہے جو اس تحریک میں بعض ان سے بہتر شعرا کو لانے یا کم از کم اُن کے اس کے سے مانوس ہونے کا ایک سبب بنا۔ چنانچہ اس دور میں جن نئے صاحبوں نے فکرِ شعر کی ہے وہ پہلے سے کہیں بہتر نظر آتے ہیں، یہی وہ دور ہے جب سے ہمارے ساتھ بعض قابلِ فخر حضرات شریکِ بزم ہوئے ہیں، جن کے افکارِ منظوم دیکھ لینے کے بعد کسی مخالف کو بھی کم از کم اسلامی ادب کے شعری سرمائے کو حقیر سمجھنے کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ یہ دور ایک عزم اور للکار کا دور ہے، البتہ جیسا اوپر بیان ہوا، اس عزم اور للکار میں کسی قدر کھوکھلا پن ضرور پایا جاتا ہے، جسے بلند آوازوں میں چھپانے کی کوشش کی گئی ہے۔ مجھے پہلی بار اپنے ساتھی شعرا ہی کا کلام دیکھ کر احساس ہوا کہ مقصد کے عشق کی کمی کا تناسب کس قدر واضح ہو کر شعر میں نظر آتا ہے۔ اسی عشق کی خامی کی وجہ سے ہم میں کوئی پختہ مشق شاعر ہے تو فکر کی گہرائی اور گیرائی سے عاری ہے، اور کسی میں عشق جھلکتا ہے وہ تو اظہار و ابلاغ میں تتلاتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ کیاں امید ہے کہ نصب العین کی لگن میں اضافہ و شدت کے ساتھ ساتھ رفع ہوتی جائیں گی۔

اس کے بعد اگلا انتخاب (۵۴ء) اُس یادگار تاریخ کے کچھ ماہ بعد سے شروع ہوتا ہے جب پاکستانی سیاست نے قراردادِ مقاصد منظور کرنے کی صورت میں گویا کلمہ پڑھ کر اس ریاست کے مسلمان ہونے کا اقرار کیا، مگر جیسا کہ اندیشہ تھا، وہ کلمہ بھی طوطے کی طرح پڑھا گیا تھا۔ اور چونکہ اس اندیشے کے درست نکلنے کا ثبوت مل جانے پر حالاتِ عصر میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوئی، اس لئے ہمارے شعرا کے لئے بھی نئے موضوعات پیدا نہ ہو سکے۔ لہذا عام مرکزی مضمون کے اعتبار سے اس انتخاب اور گزشتہ انتخابوں میں کوئی بھی فرق نہیں، سوائے اس کے کہ دو ایک نئی باتیں محسوس ہوتی ہیں جن کا تعلق مضمون سے نہیں ہے۔ ایک تو یہ کہ معاشرے کو اس کی ذمہ داری اور اس عہد کے، جو انھوں نے اپنے ربُّ العالمین سے قراردادِ مقاصد کی صورت میں کیا تھا، پورا کرنے کا احساس دلانا پہلے کی نسبت زیادہ ہو گیا ہے۔ اور اس ضمن میں اربابِ اقتدار کی طرف براہِ راست خطاب زیادہ تعدد، زیادہ شدت اور زیادہ صاف گوئی کے ساتھ کیا جانے لگا ہے۔ کیونکہ انھوں نے زبان سے خدا اور عوام کے سامنے، ایک عہد کیا اور عملاً کھلم کھلا اس کی خلاف ورزی پر روز بروز تیز سے تیز تر ہوتے گئے۔ دوسرے یہ کہ تقسیمِ ہند کی تاریخ سے بعد ہوتے جانے کے ساتھ ساتھ دماغی اعصاب میں پہلا سا تناؤ نہ رہا، اور اب نسبتاً سکونِ خاطر کے ساتھ ہمارے شعرا کو حالات کے سمجھنے اور پرکھنے کا موقع ملا، جس کی وجہ سے نومشقوں میں بھی پختگی کے آثار پیدا ہونے لگے، اور پختہ کاروں کو اپنے موقف پر مزید راسخ ہونے کے اسباب حاصل ہوئے۔ تیسرے یہ کہ اس دور میں ہمارا قافلہ بہت کثیر التعداد مسافروں کی ہمرکابی سے

گراں بار و گراں قدر ہوگیا، اور غالباً یہی وہ زمانہ ہے جب ہم کہہ سکتے ہیں کہ ؏ یہاں اب مرے راز داں اور بھی ہیں۔

البتہ اس انتخاب میں پہلے سے زیادہ عنوانات ملتے ہیں، اور کیوں نہ ملیں، ایک تو اپنے ملک میں پہلے کی نسبت کسی قدر معاشرتی سکون، پھر کثرتِ شعرا جن میں بہت سے وہ بھی ہیں جو ہمارے کیمپ سے متعلق نہیں، گو اُن کا قلم ہماری ہنوائی کرجاتا ہے۔ اس انتخاب کا عام لب و لہجہ پہلے انتخابوں سے زیادہ بے باک مگر ساتھ ہی تلخی لئے ہوئے بھی ہے، جس میں طنز بھی جھلک جاتا ہے۔ یہ بات شاعرانہ نقطۂ نظر سے کچھ زیادہ پسندیدہ نہیں۔ طنز میں دوسرے اصناف کی سی قوت پیدا کرنا عام شعرا یا ادبا کا کام نہیں۔ طنز کی بے پناہی کے لئے اکبر سا شاعر اور رشید صدیقی یا قاضی عبدالغفار سا نثر نگار ہونا شرط ہے۔ چنانچہ ہمارے شعرا جب اپنے افکار اس سانچے میں ڈھالنے لگتے ہیں تو اپنی سطح سے پست نظر آنے لگتے ہیں۔ اور پھر ان کے اسلوب و انداز میں ترقی پسند شاعروں کی سی بے اصولی اور "پروپیگنڈاپن" پیدا ہوجاتا ہے۔ ساتھ ہی ناتجربہ کاری کے باعث زبان اور شاعری کے مسلمات سے بھی بے اعتنائی بلکہ ان کی پامالی پڑھنے والے کو بہت گراں گزرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض حضرات نے شعر نمبر پر اپنے خطوط میں تبصرہ کرتے ہوئے مدیر چراغِ راہ کو اس کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اور سچ یہ ہے کہ جتنا کچھ انھوں نے بتایا ہے اس سے کہیں زیادہ اسقام ان نظموں میں موجود ہیں، اور یہ اسقام اسی انتخاب سے شروع ہوتے ہیں، کیونکہ یہی سب سے طویل انتخاب ہے، اور شعرا کی تعداد بھی اس میں زیادہ ہے۔

عنوانات میں سے اکثر کا تعلق وقت کی تحریکِ اسلامی اور اس کا اہلِ اقتدار سے ٹکراؤ سے ہے۔ معاشرتی مسائل میں اشتراکیت پر تنقید اور عورت کے مقام کی تعیین سب سے پیش پیش ہیں۔ اور یہی دو مسائل واقعی اہم بھی ہیں۔ اشتراکیت بحیثیت تحریک اگرچہ پاکستان میں منظم نہ رہ سکی لیکن بحیثیت ایک فکری موضوع کے ہمارے نئے تعلیم یافتہ ذہنوں پر کم و بیش ضرور اثر انداز ہوئی اور ہوتی رہتی ہے۔ البتہ دوسرا مسئلہ یعنی "عورت" اس سے کہیں زیادہ اہم ہے، کیونکہ ایک طرف تو ہمارا ملک خود بزعمِ خود عورت کو "آزاد" کرنے کی دوڑ میں بے تحاشا مغربی ممالک کا ساتھ دینے لگا، اور دوسری طرف اہلِ حل و عقد نے بھی اس دوڑ کو مہمیز لگا لگا کر تیز کیا۔ لیکن اس مسئلے پر ہمارے شعرا اس دور میں کم بولے ہیں، اور شاید اس میں وہ اس لئے حق بجانب ہیں کہ قرار دادِ مقاصد کے بعد انھیں دوسرے مسائل کے ہجوم نے اس طرف کم متوجہ ہونے دیا۔ تاہم اس موضوع پر بھی کچھ نہ کچھ کہا ضرور گیا۔ اور یہاں بھی سب سے دلآویز کہنے والا عامی کرنالی ہی نظر آتا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

جمالِ یار، اور اتنا دراز دست ہوس ! کہاں بچیں گے مری عصمتِ نگاہ کے پھول !

زنانِ انجمن آرا نے اک سبق تو دیا کہ ان حدوں سے بہت دور ہے مقامِ بتولؓ

یہاں تک پہنچ کر مجھے ایک عجیب بات نظر آئی۔ اس شعر نمبر میں مرتب نے اپنے رفیقوں اور غیر رفیقوں کی نظمیں جمع کرنے میں کسی بخل سے کام نہیں لیا، لیکن عورت کے "آپے سے باہر ہوجانے" پر سوائے اسلام پسند شعرا کے کسی نے ایک حرف بھی نہیں لکھا، بجز جناب اسد ملتانی کے جنھوں نے اس موضوع پر اپنی نظم "بوقلمونیاں" میں صرف ایک شعر کہا ہے اور وہ بھی بطور طنز ؎

اٹھے حجابِ زنان اور طوائفیں نہ رہیں ! کہیں نئے بھی ہیں ہم اور کہیں پرانے بھی

ان کے ماسوا جتنے شعرا نے عورت کے موجودہ اخلاق سوز رجحان پر کچھ لکھا ہے وہ سب کے سب تحریکِ ادبِ اسلامی کے شاعر ہیں۔ "غیروں" نے جو کچھ کہا ہے وہ زیادہ تر ایک مسلم ریاست کے بن جانے پر اظہارِ اطمینان، اور نہ معاشرے کے عوام کی عام (بلکہ مبہم) اخیر اسلامی روش پر ملامت کے ساتھ اسلاف صالحین کی پیروی کی تلقین سے زیادہ نہیں۔ یہیں وہ فرق محسوس ہوتا ہے جو ایک عام مسلم شاعر اور ایک شعوری طور پر اسلام پسند شاعر کے افکار میں ہوسکتا ہے۔ اول الذکر کو یا تو معاشرے کے فساد میں عورت کی بے حجابی کا عنصر نظر نہیں آتا یا اس پر اظہارِ رائے کی جرأت نہیں کرتا۔

اور اب آئیے انتخاب ۸۳ء پر۔ اس میں ہم چند اور نئے ساتھیوں سے ملتے ہیں؛ لیکن، جیسا میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں، اس انتخاب کو سابق انتخاب ۸۲ء سے جدا کرنے کی کوئی توجیہہ نہیں ہو سکتی۔ اس کی نظمیں بلحاظ عنوانات، اسالیب، طریقہ ہائے ابلاغ وغیرہ کے پچھلے سال کی نظموں سے کچھ مختلف نہیں۔ صرف دو تین شعرا جو نئے شریکِ بزم ہوئے ہیں، "ترقی پسند گروہ" سے ٹوٹ کر آئے ہوئے یا ان سے بہت متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں وہی تیوروں کی خشونت معلوم ہوتی ہے، یہاں تک کہ انھوں نے بحریں بھی وہی اور ویسے ہی استعمال کی ہیں جو اور جیسے ترقی پسند صاحبان کو مرغوب ہیں؛ خصوصاً سجاد شاہد کی "ہم کہاں جائیں گے" جس کا مطلع ہے ؎

تو رعونت کی پرہول و سنگیں چٹانوں کے مضبوط سینوں میں در آگیا   تو نے ظلمت کے[1] خونیں ڈگر پہ کلیجے کے داغوں کی ضو سے اُجالا کیا

یا انور عظمی کی "انگڑائی" جو بالکل اسی بحرِ متدارک مثمن مضاعف میں ہے، اور یہی خردش رکھتی ہے، یا عرشی بھوپالی کی نظم "آزاد" "فرقہ پرست" یا اعظم ادیب کی "مینا بازار" وغیرہ، ایسی نظمیں ہیں جو اپنی اصوات کے آہنگ اور بدائع کے نرالے پن کے اعتبار سے ترقی پسند نظموں سے بڑی مماثلت رکھتی ہیں، لیکن حسنِ صناعت اور عدمِ ابہام کے باعث اُن سے یقیناً بہتر ہیں۔

"بلاتعین زمانہ" کے تحت جو انتخاب پیش کیا گیا ہے وہ مختصر ہونے کے علاوہ پچھلے انتخابات کے مقابل کوئی علیحدہ حیثیت نہیں رکھتا کہ جداگانہ تبصرے کا محتاج ہو؛ بلکہ اس میں غالباً شعرا کے ابتدائی زمانے کے کلام ہیں، کیونکہ نومشقی کے آثار بعض بعض جگہ بہت واضح ہیں۔

"نوائے تازہ تر" زمانے کے لحاظ سے تازہ ترین نظموں کا انتخاب ہے۔ اس میں مجھے سب سے اہم بات یہ نظر آتی ہے کہ ہمارے اکثر شاعر غزل نما نظم کی طرف آتے جا رہے ہیں۔ ایک اعتبار سے یہ رجحان مسرت خیز اور خوش آئند ہے، لیکن ایک حیثیت سے اندیشہ ناک بھی۔ قصہ یہ ہے کہ غزل ہماری شاعری کی بڑی پیچیدہ، انوکھی اور دلچسپ صنف ہے۔ یہ ہمارے شاعر کا آغازِ سخن بھی ہے اور منتہائے کمال بھی۔ بیسویں صدی کا عام اردو شاعر اپنی ابتدائی مشقِ غزل گوئی سے کرتا ہے، پھر اس "ظرفِ تنگنائے" کو اپنے "بقدرِ ذوق" نہ پا کر کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کے لئے۔ کہتا ہوا اصنافِ نظم کی لاتعداد وادیوں میں پھر جاتا ہے۔ اور جب اس بیاباں نوردی سے عاجز آجاتا ہے تو پھر اسی غزل کے پرسکون سایۂ عاطفت میں پناہ لیتا ہے۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب شاعر پر ایشیائی وقار اور ٹھیراؤ غالب آجاتا ہے؛ کائنات کی وسعتیں اس کی ایک "کفِ نظر" میں سما جاتی ہیں، اور پھر وہ بڑے بڑے حقائق مختصر سے مختصر رمز و کنایہ کے الفاظ میں کہنا پسند کرنے لگتا ہے۔ یہ مختصر گوئی سامع اور قائل کے درمیان سے بہت سے تکلفات دور کر کے شاعر کو اس کے مداحوں کے دل کے اتنے قریب لے آتی ہے کہ وہ اس کا ہر اثر قبول کرتا چلا جاتا ہے۔ یہاں سامع اور شاعر ایک دوسرے کے راز دار ہو جاتے ہیں، کیونکہ غزل کے مخصوص الفاظ، استعارے، تلمیحیں وغیرہ ہمارے معاشرے میں صدیوں سے ایسی جانی پہچانی ہیں کہ ان کی تشریح و تعبیر میں غلط فہمی پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ اب اگر غزل میں ہمارے شاعر پرانے علائم (SYMBOLS) کو نئے مفہوم دے کر اور نئے علائم جو پرانے علائم سے دلکش ہوں، اضافہ کر کے ہمارے معاشرے کا رُخِ زندگی بدل سکے تو یقیناً یہ کارنامہ اس صدی کا ایک اعجاز ہوگا، اور عام نظموں سے کئی گنا زیادہ دیرپا اثرات ہمارے دلوں پر نقش ہو جائیں گے، بلکہ اس سے انداز فکر ایسا پلٹ جائے گا کہ نسلاً بعد نسلٍ اس کے آثار مستمر ہوتے رہیں گے لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے کہ ہماری غزل درجۂ اول کی ہو، تیسرے یا دوسرے درجے کی غزل کہنے سے بہتر ہے کہ نظم گوئی ابھی باقی رہنے دی جائے۔ یہ وقت ہماری ادبی تحریک کے لئے نہایت احتیاط اور سوجھ بوجھ سے کام لینے کا ہے۔ ہم ادب کا رُخ موڑنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی مجاہدانہ سرگرمیوں میں ہلکی سے ہلکی غفلت نہ برتنا چاہئے۔ ہم آنے والی نسلوں کے لئے ایک نئی راہ نکال رہے ہیں تو ہمارا کوئی قدم ایسا نہ پڑنا چاہئے کہ وہ لوگ ہماری غلط مثال کو حجت بنالیں، یا ہمارے کسی غلط مجوزے سے اجو ہم جا بجا قدروں سے پیچ غفلت

---

[1] ڈگر مذکر نہیں، مؤنث ہے۔ شاید یہ غلطی جنابِ کاتب کی اصلاح ہو۔ ع۔ ص۔

سہل انگاری کے سبب عمداً یا سہواً کریں، مغالطے میں پڑ کر اپنے لئے ڈھیل کی مزید گنجائشیں نہ نکال لیں۔ سو الحمد للہ کہ نظموں میں تو اس اندیشے کا امکان نہیں، کیونکہ ان کی وسعتیں لامحدود ہیں، اور ہمارے شعراء ان پر اس خوبی سے حاوی ہوتے نظر آرہے ہیں کہ اب ملک میں دوسرے طرز کی نظمیں اپنی مقبولیت برابر کم سے کم تر کرتی جارہی ہیں۔ لیکن غزل نہایت نازک آبگینہ ہے۔ اس کو چھونے سے پہلے اس امر کا پوری طرح اطمینان کر لیجئے کہ آپ کے ہاتھ ایسی نازک چیزیں برت سکتے ہیں، اور اگر آپ اس میں سے "بادۂ شیراز" پھینک کر "صہبائے حجاز" بھریں گے تو نہ تو یہ آبگینہ ٹوٹے گا نہ "رندوں" کو ناگوار ہوگا!

اس نظر سے جب ہم اس انتخاب کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں عبدالکریم ثمر، اعظم ادیب، ضیا محمد ضیاؔ، اور حاصیؔ کرنالی پیش پیش نظر آتے ہیں۔ ان میں بھی مؤخرالذکر دو حضرات اوروں سے بڑھے ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ سب نے کوششیں تو بہت اچھی طرح کی ہیں، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان میں غزل کا مذاق ابھی رچا نہیں ہے۔ انھیں چاہئے کہ سردست نظم گوئی ہی کئے جائیں۔ آخر ان کا وجدان ایک منزل پر آکر خود انھیں بتا دے گا کہ بس اب نظم کی سرحد ختم ہوئی، اب خلوت گاہِ غزل کی حریم شروع ہوئی، جہاں ہر ایک نہیں پہنچ سکتا۔ علاوہ بریں، کامیاب غزل لکھنے کے لئے نہ صرف اس کی تمام گزشتہ روایات کا عہد بہ عہد مطالعہ ضروری ہے، بلکہ اس کے لئے زبان دانی بھی اہلِ زبانی کی حد تک شرط ہے؛ اور جن حضرات کی مادری زبان اردو نہیں ہے، وہ اگر غزل ہی لکھنا چاہتے ہیں تو ان کے لئے اہلِ زبان کا روزمرہ سیکھنا قطعاً ناگزیر ہے۔ یہ محض عصبیت نہیں، مشاہدات کی بنا پر مجھے کہنا پڑ رہا ہے۔ اردو کی تاریخ دیکھ جائیے، غیر اہلِ زبان ایک اچھا نظم گو تو ضرور ہوا ہے، لیکن اچھا غزل گو کبھی نہیں۔ حتیٰ کہ وہ غیر مسلم بھی جو دہلی یا لکھنؤ ہی کے باشندے رہے ہوں، محض مسلم اہلِ زبان کے گھریلو اور مجلسی ماحول سے ناآشنا ہونے کے سبب غزل گوئی میں کوئی نمایاں کارنامہ نہ کر سکے۔ یہی حال فارسی کا ہے۔ ہند و پاک کے بڑے بڑے فارسی شاعر سوائے امیر خسروؔ کے، اہلِ ایران کے معیارِ مذاق پر پورے نہ اتر سکے۔ حالاں کہ اردو کے رائج ہونے سے پہلے فارسی کا یہاں اتنا چرچا تھا کہ معمولی خط بھی فارسی میں لکھے جاتے تھے۔

اجمالی تبصرہ ختم کرنے سے پہلے ایک بات اور قابلِ ذکر سمجھتا ہوں۔ ہمارے شعراء نے زیادہ تر جو بحریں استعمال کی ہیں اُن سے بھی ان کے تاثراتی رجحان کا پتہ چلتا ہے۔ اس لئے بحروں کے استعمال کا تقابل یہاں خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ ذیل کے اعداد سے اس کا اندازہ لگ سکتا ہے۔ یہ اعداد میں نے اسی شعر نمبر کی نظموں سے حاصل کئے ہیں۔ ان میں حالیؔ اور اقبالؔ کی نظمیں اور نعیمؔ کا منظوم ڈراما "تعمیر تاریخ" جو مختلف بحروں میں ہے، شامل نہیں ہیں۔

۱۔ بحرِ رَمَل مُثمّن مخبون (فَعِلاتن فَعِلاتن فَعِلاتن فعلن) میں ۴۴ نظمیں (ان میں نظم ہائے آزاد بھی شامل ہیں، جن کے ارکان چار سے گھٹتے بڑھتے بھی رہتے ہیں)

۲۔ بحرِ مُجتَث مُثمّن مخبون محذوف (مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن) میں ۳۰ نظمیں۔

۳۔ بحرِ ہَزَج مثمن اخرب مکفوف محذوف (مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن) میں ۱۴ نظمیں۔

۴۔ بحرِ مضارع مثمن اخرب مکفوف محذوف (مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن) میں ۱۲ نظمیں۔

۵۔ بحرِ ہزج مثمن سالم (مفاعیلن . . . . چار بار) میں ۶ نظمیں۔

۶۔ بحرِ رمل مثمن محذوف (فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن) میں ۶ نظمیں۔

اور ان کے علاوہ باقی بحریں، جو اردو میں خاصی متداول ہیں، بہت کم استعمال کی گئی ہیں۔ اس نقشے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے معاشرے میں عجلت اور الجھن کی شدت ہے۔ اسلام پسند شعراء نے جو بحریں سب سے زیادہ استعمال کی ہیں، یعنی پہلی دو، وہی ترقی پسندوں کے ہاں بھی سب سے زیادہ مروّج ہیں۔ ان کے زیر و بم کو اگر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ان میں چھوٹی چھوٹی حرکات پے در پے آتی ہیں، پھر کچھ فاصلے کو لمبی ہیں؛ اور یہ سارا سلسلہ ہموار اور باقاعدہ آہنگ کے ساتھ نہیں، جھٹکے اور جھکولے کھاتا ہوا چلتا ہے، اور بیچ میں کوئی رکاؤ یا سکون نہیں آتا۔ پہلی بحر کا آہنگ ایک ڈگمگاتی ہوئی ریل گاڑی کا سا ہے، جو پٹری کے ہر جوڑ پر تیزی سے جھڑ جھڑا اٹھتی ہے۔ اس میں اور تیسری بحر میں بظاہر کوئی مماثلت نہیں، لیکن اگر اس کا آخری رکن (فعلن) سب سے پہلے رکھ دیا جائے تو بالکل تیسری بحر بن جاتی ہے۔ یہ تیسری بحر بہت

بناشی اور رجزیہ ہے۔ اس میں نظم کہنا ظاہر کرتا ہے کہ شاعر اپنے جذبے کا پر جوش اظہار کرنا چاہتا ہے، مثلاً

اُٹھ دیکھ فضا دہر کے نعروں سے ہے معمور ــــــ اے مجلسِ دستور! (یعقوب طاہر)

دوسری بحر بھی پہلی کی ایک قریبی بہن ہے۔ اس میں حرکات وسط میں آکر یکایک مجتمع ہوجاتی ہیں، جیسے ہچکولے کھاتی ہوئی ٹرین نے یکایک کا نشانہ لا اور پھر ڈگمگاتی ہوئی بڑھ گئی۔ بعینہٖ یہی صورت چوتھی بحر میں ہے، کیونکہ یہ بھی دوسری بحر کا آخری رکن (فعلن) سب سے پہلے لانے سے بنتی ہے۔ ان چاروں بحروں کے برخلاف پانچویں بحر نہایت پر سکون اور باوقار ہے۔ اس میں چھوٹی حرکات کم اور لمبی مدیں زیادہ ہیں اس کا آہنگ بہت باقاعدہ ہے۔ اور اس سے کچھ کم چھٹی بحر کا معاملہ ہے۔ ان کے علاوہ اور جتنی بحریں ہمارے شعرا نے استعمال کی ہیں ان میں یہی بات غیر شعوری طور پر مدنظر ہو گئی ہے کہ عجلت اور بے چینی ظاہر کرنے والی بحریں زیادہ ہیں، اور ٹھہری بحریں کم۔ خطابی طرزِ کلام کا بھی یہی حال ہوتا ہے؛ اور ایک استاد کے لیکچر اور لیڈر کی تقریر میں بھی یہی تحمل، وقار اور شائستگی مابہ الامتیاز ہوتی ہے۔ پس میری رائے میں اسلام پسند شعرا کو اپنی لَے پر نظرِ ثانی کرنی چاہئے۔ بات یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی عام زندگی کے شعوری پہلوؤں پر تو نظر رکھتے اور ان کی اصلاح کرتے رہتے ہیں، لیکن غیر شعوری یا تحت شعوری امور ابھی تک ان کی گرفتِ احتساب میں پوری طرح نہ آسکے، اور کہیں کہیں بغاوت کر ہی بیٹھتے ہیں۔ یہ وہی نصب العین کے عشق میں کمی کی نشانی ہے، جس کی وجہ سے اُن کا تحتِ شعور ضابطے کی پابندی سے کسی حد تک آزاد ہے۔

اس اجمالی تبصرے کے بعد میں اپنے بعض شعرا کا تفصیلی جائزہ لینا چاہتا تھا، لیکن یہی تبصرہ اتنا طویل ہو گیا کہ نہ تو شاید پڑھنے والے اس سے لطف اٹھانا تو درکنار اسے پورا پڑھنا ہی گوارا کریں گے، نہ غالباً نعیم صاحب اس کو اتنا سراہیں گے کہ اس کی خاطر چراغِ راہ کے دوسرے مضامین کی قربانی کر کے اس کو شائع کریں؛ اس لئے میں انفرادی تبصرے کو اگلی فرصت پر اٹھا رکھتا ہوں۔ البتہ شروع مضمون میں میں نے اسے مستقبل کے مؤرخ کی حیثیت سے دیکھنے کی کوشش کا وعدہ کیا تھا، اور اب چند الفاظ میں اپنی پھیلی ہوئی رائے کو سمیٹ کر یہی کہہ سکتا ہوں کہ یہ شمارہ اپنے مندرجات کے اعتبار سے یقیناً ایک سنگِ میل ہے۔ اس نے نہ صرف ہمیں ڈھارس بندھائی ہے کہ ہمارے ساتھی اپنے فن کے اعتبار سے اسلام پسند شاعری کو اس منزل پر لے آئے ہیں جہاں اس کا مضحکہ اڑانے کے بجائے غیر اسلامی روش پر یہ بذاتِ خود ایک طنز کا درجہ رکھتی ہے، بلکہ اس نے دوسری طرف بھٹکے چلے جانے والے شعرا کے لئے بھی ایک واضح اور روشن راہ کھول دی ہے، جس پر چل کر وہ اپنی صلاحیتوں کو بہتر سے بہتر بنا سکتے ہیں۔ اس نمبر کے بعد مشکل ہی سے یہ امید ہو سکتی ہے کہ بازاری اور مبتذل ادب کے فریفتوں کو چھوڑ کر سنجیدہ ادبی حلقوں میں کوئی دوسری شاعری بھی اتنی ہی قبولیت حاصل کر سکے گی۔ بلکہ امید یہ کرنی چاہئے کہ آئندہ پانچ دس ہی سال میں کوئی دوسرا ادبی ادارہ بھی، جس کا مقصد اسلام پسندی کے سوا کچھ اور ہو، باقی نہ رہ جائے گا؛ اور اس کے لئے ہم حضورِ ایزدی کے جتنے بھی شکر گزار ہوں، کم ہے۔ ضرورت ہے کہ شعر نمبر کو کتابی شکل[1] میں شائع کرایا جائے، اور اس میں سے کچھ کمزور درجے کی نظمیں نکال کر ۱۹۵۱ء کے اختتام تک کی تمام اچھی مطبوعہ نظمیں شامل کی جائیں؛ اور پھر آئندہ ہر سال کے ختم پر اس سال

(بقیہ برصفحہ ۲۰)

[1] ادارۂ چراغِ راہ کے سامنے بھی یہ تجویز تھی، مگر چونکہ اس چیز کی خصوصی طلب کچھ زیادہ محسوس نہیں ہوئی اس لئے مزید کچھ سوچا نہیں۔ اگر قارئین خصوصاً اصحابِ ذوق اس طرح کا مشورہ دیں تو ہم اسے عمل میں لانے کو تیار ہیں۔ ہماری ایک شرط اور ہے اور وہ یہ کہ کم سے کم ضیا محمد ضیا اور عاصی ضیائی کسی وقت لاہور آ کر دو تین روز اس پر صرف کر دیں کہ کتابی مجموعے کے لئے مواد منتخب ہو جائے۔ وہ چیزیں جو شعر نمبر میں سے ساقط کر دی جانی چاہئیں، ان کو نشان زد کرنے کے ساتھ ساتھ مزید ایسی چیزوں کی فہرست تیار کر لی جائے جن کو شامل کرنا ضروری ہے۔ اس مجموعے میں شعر نمبر کے اداریے اور عاصی ضیائی صاحب کے اس تنقیدی مقالے کے علاوہ شاید مرتب چراغِ راہ اپنے قلم سے بھی کوئی تبصرہ پیش کر سکے۔ اگر مناسب ہو تو "ادوارِ زمانی" کی بھی نئی ترتیب قائم کر لی جائے۔ اس سلسلے میں ہم اپنے خیر خواہوں کے مفید مشوروں کے منتظر رہیں گے۔ (چراغِ راہ)

قولِ صادق

مصطفیٰ صادق

نت نئی الجھن! الٰہی! خیر ہو! — دل کے یہ لچھن! الٰہی! خیر ہو!
خانقہ طاغوت کی جائے پناہ! — رہنما رہزن! الٰہی! خیر ہو!
کوڑیوں کے بھاؤ پل میں اُٹھ گیا — زہد کا مخزن! الٰہی! خیر ہو!
لذتِ کام و دہن کی نذر ہے — قوم کا سب دھن! الٰہی! خیر ہو!
مرد کی مردانگی کو کیا کہیں! — زن ہوئی نازن! الٰہی! خیر ہو!
اہلِ حق میں کفر پر یہ اعتماد؟ — حق سے سوئے ظن! الٰہی! خیر ہو!

بن رہا ہے آج صادق کا وطن
قریۂ مدین! الٰہی! خیر ہو!

اقبال

بیا نقشِ دگر ملت بریزیم
کہ این ملت جہاں را بارِ دوش است

زباں سے کہہ نہیں سکتے!

نازش جلالی
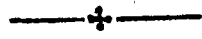
دلیلِ قلبِ زندہ ہے شہیدِ آرزو رہنا
نشانِ مرگِ دائم ہے تہی از جستجو رہنا
یہ خاک و نسل کے بُت کفر کی تعمیرِ تازہ ہیں
بتوں کو توڑ دے چاہے اگر با آبرو رہنا
تمنا ہے کٹے گردن خُدا کی راہ میں اپنی
مری تقدیر میں لکھا ہو یا رب سرخرو رہنا
زباں سے کہہ نہیں سکتے نظر والے سمجھتے ہیں
"سکھایا ہے مجھے کس نے شہیدِ جستجو رہنا"
زباں سے بندگی حق کی عمل سے کفر کی طاعت
اسی باعث تری تقدیر ہے بے آبرو رہنا
مری آشفتہ حالی نے مجھے نازش سکھایا ہے
پریشاں گلستانِ دہر میں مانندِ بو رہنا

اکبر

معنی کی گرہ کہاں کھلی ہے
الفاظ ہی کی دکان کھلی ہے
ارادہ کی ترجمے بھی یہاں ہے
دم بند ہے اور زباں کھلی ہے

عصمتِ نظر!

نعیم صدیقی

جلووں کے ایک نرغے میں آئے ہوئے ہیں ہم — پر عصمتِ نظر کو بچائے ہوئے ہیں ہم

کوئی ہماری آ کے اڑائے ہی کیوں ہنسی — اب کیا بتائیں کس کے رلائے ہوئے ہیں ہم

اک شاعری ہے تیری محبت کا ادّعا — کن کن بتوں کو دل میں بٹھائے ہوئے ہیں ہم

کھوئے ہوئے سے آپ نظر آرہے ہیں آج — جی چاہتا ہے کہہ دیں کہ پائے ہوئے ہیں ہم

ہم نے تو دار پر سے پکارا ہے تیرا نام — کہتے ہیں لوگ تجھ کو بھلائے ہوئے ہیں ہم

بس تم کو چاہنے کی خطا ہم سے ہو گئی — سارے جہاں کے آج پرائے ہوئے ہیں ہم

اے چرخ! احترام ہو اس مشتِ خاک کا! — معلوم بھی ہے کس کے مٹائے ہوئے ہیں ہم

ہم کو نہ چھیڑیئے کہ ہزاروں قیامتیں — دل میں تھپک تھپک کے سلائے ہوئے ہیں ہم

حق بات کہنے آئے ہیں قیصر کے سامنے — اپنی صلیب آپ اٹھائے ہوئے ہیں ہم

چوروں کے اک ہجوم میں سینے پہ رکھ کے ہاتھ — تیری امانتوں کو چھپائے ہوئے ہیں ہم

اس عشق کو قبول نہیں ترکِ روزگار — دونوں جہاں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں ہم

حق کے لئے "یقین" ہے، بت کے لئے "عمل" — دونوں طرف ہی بات بنائے ہوئے ہیں ہم

ہے اُس طرف سے ایک اشارے کا انتظار — پہلو میں ایک حشر دبائے ہوئے ہیں ہم

باطل کے اقتدار میں تقویٰ کی آرزو؟ — ہے کیا حسیں فریب جو کھائے ہوئے ہیں ہم

غیروں کی دشمنی کا گلہ ہم نے کب کیا؟ — اپنوں کی شفقتوں کے ستائے ہوئے ہیں ہم

یہ اپنا ضبط تھا کہ تمہیں بھی خبر نہیں — اک چوٹ ہے کہ سینے پہ کھائے ہوئے ہیں ہم

اے آندھیو! سنبھل کے چلو اس دیار میں — امید کے چراغ جلائے ہوئے ہیں ہم

جن کو نہ دیں کسی کے تقدس کے مول بھی — دامن پہ ایسے داغ سجائے ہوئے ہیں ہم

ہم رزمِ کفر و دیں میں بھی نکلے ہیں سرفروش

بزمِ سخن میں آ کے بھی چھائے ہوئے ہیں ہم

قند و نمک

ڈالری امداد

آخر ڈالر کی سنہری زنجیروں کو چوم کر ہمارے آقاؤں نے اپنے گلے میں ڈال ہی لیا! ــــــ اب ان زنجیروں کی جڑ ہمارے قلب و دماغ میں اتار دی گئی ہے۔ ان جڑوں کی آبیاری شروع ہو گئی ہے۔ ان سے اب نئی زنجیریں خود بخود پھوٹیں گی، بڑھیں گی، وہ کونپلیں نکالیں گی، گل کھلائیں گی، برگ و بار لائیں گی ــــــ اور امپریلزم کا یہ سرطان ہمارے کھیتوں، ہماری منڈیوں، ہمارے کارخانوں اور ہماری چھاؤنیوں میں ہر طرف اپنے تار پھیلا دے گا۔

دُنیا کی تاریخ میں کسی ملک نے امپریلسٹ طاقتوں کی سرپرستی اور امداد اور سرمائے کے بل پر ترقی نہیں کی۔ مسلمان ملکوں میں سے ترکیہ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ اس نے امریکی ڈالر کا سہارا لیا اور اپنی داخلی معیشت، دفاعی پالیسی اور اپنے خارجہ تعلقات کی باگ ڈور امریکہ کے ہاتھ میں دے دی۔ اب ترکیہ امریکہ کی ایک منڈی ہے، اس کا ایک جنگی اڈہ ہے اور اس کے لئے جاں نثار سپاہی فراہم کرنے والی ایک نوآبادی ہے۔ درحقیقت یہی پوزیشن ہے جو ۹۔ جنوری ۱۹۵۲ء کی ایک منحوس ساعت میں پاکستان نے امریکی امداد کے معاہدے پر دستخط کر کے اپنے لئے قبول کی ہے۔ آج ہماری معیشت امریکی اشاروں کے تابع ہو گئی ہے اور لازماً اس کا ارتقاء اب آئندہ جنگ کے تقاضوں کے تحت ہو گا، آج سے گویا ہمارا ملک قطعی طور پر آئندہ جنگ کے لئے ایک دھڑے کا ساتھی ہو گیا اور آج سے بین الاقوامی ادارت میں اس کی پالیسی کا ایک نیا رخ متعین ہو گیا۔

بدقسمتی سے ہمارے ملک میں غلام زادگانِ مغرب کا ایک کثیر التعداد طبقہ ایسا موجود ہے جو ہمارے حکمرانوں کے اس کارنامے کو سراہنے والا ہے۔ ان کے نزدیک آقایانِ ملک نے امریکی امداد حاصل کر کے بڑی سیاسی بصیرت کا ثبوت دیا ہے۔ یہی کوتاہ نظر لوگ ہیں کہ جن کی وجہ سے پاکستان ایک ایسی مصیبت کا شکار ہو گیا ہے جس کی تلخیاں ذرا اور آگے چل کر محسوس ہوں گی۔ یہ معاہدۂ امداد جو امریکہ اور پاکستان کے درمیان واقع ہوا ہے اس کی رو سے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کتنی جانیں ہیں کہ امریکی مفاد پر جن کے بھینٹ چڑھ جانے کا، کتنے ہی سہاگ ہیں کہ جن کے اجڑنے کا، اور کتنے ہی نونہال ہوں گے کہ جن کی یتیمی کا معاملہ طے ہو گیا ہے۔ افسوس کہ ہمارے خواص نے جو کھیل کھیلا ہے اسے ہمارے عوام ابھی سمجھنے کے قابل نہیں ہیں۔

معاہدے کی بنیاد اس شعور پر رکھی گئی ہے کہ "انفرادی آزادی، آزاد ادارات اور حریت و استقلال کا دارومدار مستحکم معیشت اور مضبوط بین الاقوامی روابط پر ہے" اور "اس حقیقت کے پیشِ نظر امریکہ و پاکستان دونوں امن عالم کے قیام کے لئے بین الاقوامی حسنِ تعلقات اور باہمی حسنِ ظن کو ارتقا دینے پر متفق ہو گئے ہیں۔"

اس معاہدے پر عمل درآمد کرانے کے لئے امریکہ کی نمائندگی ڈائرکٹر آف ٹیکنیکل کوآپریشن کرے گا جو مع اپنے اسٹاف کے پاکستان میں علاً سفارت کے ایک حصہ کی حیثیت سے مقیم رہے گا۔ یہ نمائندہ اور اسی طرح کا پاکستانی حکومت کا ایک نمائندہ دونوں باہمی سمجھوتے سے طے کرتے رہیں گے کہ معاہدے کے مقاصد کے تحت کب کونسا کام کتنے صرف سے کیا جائے۔ علاوہ بریں فنی ماہرین بھی امریکہ بہم پہنچائے گا، نیز منصوبوں کو عمل میں لانے کے لئے ضروری میٹیریل بھی امریکہ ہی سے خرید کیا جائے گا۔ اس سلسلے کے منصوبوں کے لئے جو ڈالری اور روپے کے فنڈ مخصوص کئے جائیں گے اُن کے صرف میں کسی قانون اور ضابطے کے تحت کوئی شخص یا کوئی فرم مداخلت نہ کر سکے گی ورنہ حکومتِ پاکستان کو متنبہ رہنا چاہئے کہ ایسی مداخلت

معاہدے کے مقاصد کو مجروح کرنے والی ہوگی۔

یعنی ڈالر آئیں گے تو ساتھ امریکہ کے نگرانوں اور کارکنوں کی ایک بڑی تعداد کو بھی لائیں گے، اور پھر ڈالر آئیں گے تو امریکی پالیسی کو بھی ساتھ لائیں گے۔ آہ صرف ایک کروڑ ڈالر لے کر ہم نے کیا کچھ دے دیا :—

"قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند"

ایک اور خیرات

ادھر فورڈ فونڈیشن مشن نے بیگم لیاقت علی خاں کے ہاتھوں سے (۱۶) سولہ لاکھ روپے "اپوا" کو پیشکش کئے ہیں۔ اس امداد کا منشا یہ ہے کہ پاکستان کی اسلامی ریاست کی خواتین کو گھریلو زندگی اور معاشرتی آداب و مشاغل کی تربیت دینے کے لئے مستقل اداروں کا قیام عمل میں لایا جائے۔ دیکھیئے ناں کتنا درد ہے فورڈ فونڈیشن مشن کے سینے میں خواتین پاکستان کی ترقی کا! روپیہ بھی دیا جا رہا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ تربیت دینے کے لئے ماہر خواتین بھی فراہم کی جائیں گی اور پھر پاکستانی بیگمات کو امریکہ جا کر اسلامی معاشرت کا درس لینے کی سہولتیں بھی دی جائیں گی۔

اس امداد کے پیچھے اصل محرک جو کام کر رہا ہے وہ صرف یہ نہیں کہ پاکستانی خواتین کو امریکی معاشرت کی تربیت دے کر یہاں امریکی سامان آرائش کی منڈی بنانا مطلوب ہے بلکہ اس سے بڑھ کر اصل منشا یہ ہے کہ امریکی تہذیب اور امریکی امپریلزم کے لئے فضا کو سازگار بنایا جائے۔ پھر اس سے بھی زائد اس "خیرات" کا مدعا یہ ہے کہ عورتوں کو بگاڑنے کی جو مہم اکابر پاکستان نے شروع کر رکھی ہے اس کے محاذ کو مضبوط کر کے اسلامی انقلاب کا راستہ روکا جا سکے ——— کیونکہ یہ انقلاب امریکی مفاد کے لئے ایک بڑا خطرہ ثابت ہو سکتا ہے۔ بے پردگی اور بے حیائی کی فضا میں اسلامی قدروں کا پنپنا ناممکن ہے۔ اس نقطہ کو ہمارے گھر کے "امریکی" بھی خوب سمجھتے ہیں اور امریکہ کے امریکی تو خیر اس معاملے میں بہت زیادہ بصیرت رکھتے ہیں۔

گورنر پنجاب اور احادیث نبویؐ

حکومت پنجاب کی پالیسی پنجاب کو غلہ موجود ہونے کے باوجود مصنوعی قحط میں مبتلا ہونے سے بچانے میں بری طرح ناکام ہو چکی ہے۔ چنانچہ اب اور ساری تدبیروں کو آزمانے کے بعد گورنر پنجاب نے نبی صلعم کی احادیث پڑھ پڑھ کر ذخیرہ اندوزوں اور چوربازاری کے مجرموں کو خدا اور رسول کی ناراضی اور حشر کی رسوائی سے ڈرایا ہے۔ بات بڑی مبارک ہے، مگر ہم پوچھتے ہیں کہ کیا ہمارے گورنر صاحب نے اسی رسولؐ کی وہ احادیث بھی کبھی ملاحظہ فرمائی ہیں جن میں خواتین کی بے پردگی پر لعنت برسائی گئی ہے؟ وہ احادیث بھی کبھی یاد آتی ہیں جن میں ملازمین حکومت کے معاوضوں کے متعلق ہدایات دی گئی ہیں؟ وہ احادیث بھی کبھی یاد آتی ہیں جن میں اکابر حکومت کے لئے حدود معین کئے گئے ہیں، وہ احادیث بھی کبھی یاد آتی ہیں جو سیفٹی ایکٹ کی مخالف ہیں اور جو فاشی طرز کی قانون سازی کو جائز نہیں رکھتیں؟

اگر نہیں تو ہم عرض کریں گے کہ اس زبان سے دنیا احادیث سن کر کبھی کوئی اثر نہیں لے سکتی جن کے پیچھے احادیث کا کوئی حقیقی احترام موجود نہ ہو!

احتفال العلماء

کراچی میں مسلم ممالک کے علماء بڑے نیک ارادوں کے ساتھ جمع ہوئے ہیں۔ اس وقت مختلف مسلم ممالک مغربی امپریلزم کے خلاف جس کشمکش میں مبتلا ہیں اس نے ایک مرتبہ پھر ان ممالک کو اتحاد کی ضرورت کا احساس دلایا ہے۔ اسی احساس کا ایک مظاہرہ ہے جو احتفال العلماء کی شکل میں جلوہ گر ہوا ہے۔

لیکن دو باتیں ایسی ہیں کہ جن پر اس انجمن کے شرکاء کو غور کرنا چاہیے۔ ایک یہ کہ وہ ان اسباب کی چھان بین کریں جو آج تک اس اتحاد کا خواب پریشاں کرتے رہے ہیں اور اس بنائے اتحاد کو دریافت کریں جو کوئی مضبوط جوڑ لگا سکتی ہو۔ ورنہ "نشستند و گفتند و برخاستند" کا سلسلہ تو مدت سے جاری ہے اور اس کی چاٹ بھی اتنی پڑی ہوئی ہے کہ یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کو کبھی بھی کوئی چیز کلمۂ اسلام، نظامِ اسلامی کے نصب العین اور تحریکِ اسلامی کی سرگرمیوں کے بغیر جوڑ نہیں سکتی۔ اس حبل اللہ کو چھوڑ کر اور جس رسّی کو بھی آپ تھامیں گے وہ تارِ عنکبوت ثابت ہوگی۔ دوسری یہ بات کہ کسی ایسی انجمن کو ممالکِ اسلامیہ کی باہم وابستگی کا ذریعہ بنانا جو محض "علماء" کی انجمن ہو بنیادی طور پر دین و سیاست کی تفریق کے نظریے کی حامل ہے۔ ایسی انجمن کل کوئی فیصلہ کرتی ہے اور وہ مختلف ممالک کی حکمران طاقتوں کو یا مغرب پرستوں کو پسند نہیں آتا تو وہ کہہ دیں گے کہ یہ چند مولویوں اور ملّاؤں کا فیصلہ ہے۔

درحقیقت ضرورت ایک ایسے ادارے کی ہے جو مختلف مسلم ممالک میں چلنے والی احیائے اسلام کی تحریکوں کا نمائندہ ہو۔ یہ تحریکیں ایک طرف داخلی طور پر ہر ملک میں مغرب پرست عناصر سے کشمکش کریں اور دوسری طرف مسلمان ممالک کی مجموعی پالیسی کو اسلامی اصولوں کے تحت ہم آہنگ کرنے کے لئے ایک مشترک مرکز پر اپنے قویٰ کو مرتکز کریں۔

موجودہ صورت میں جو کچھ ہو رہا ہے، اگرچہ ہم اس کے لئے دعائے خیر کرتے ہیں، لیکن یہ اپنے مقصد کے لئے کوئی کامیاب اقدام مشکل ہی سے ثابت ہو سکتا ہے۔ خدا کرے کہ ہماری رائے ہی غلط ثابت ہو۔

ہنگامہ آرائی کی لہر

مشرقی پاکستان میں زبان کے مسئلے پر ہنگامے کی جو لہر طلباء اور کچھ سر پھرے سیاسی کارکنوں نے برپا کر دی ہے اور جس کی وجہ سے ڈھاکہ میں کرفیو اور لاٹھی چارج تک نوبت جا پہنچی ہے، بڑی توجہ طلب حیثیت رکھتی ہے۔ اگر ہمارے حکمرانوں کے سر میں اللہ نے کچھ بھی بھیجا رکھا ہے تو انشاءاللہ وہ اس حقیقت پر ایک مرتبہ اچھی طرح سوچ بچار کریں کہ وہ جس سیکولرازم کے دلدادہ ہیں اور جس نیشنلزم کے بل پر وہ پاکستان کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں، کیا واقعی وہ ایسا مسالہ بن سکتا ہے جو ہمارے مختلف صوبوں، اور قوموں اور نسلوں کو، اور بالخصوص مشرقی اور مغربی پاکستان کو ایک وحدت بنا سکے؟ حضرات! ہم بڑی خیر خواہی سے پھر توجہ دلاتے ہیں کہ صرف اسلام ہی ان دونوں علاقوں کو جوڑ سکتا ہے ورنہ آج زبان کا مسئلہ ہے، کل ۵۰۔۵۰ کے تناسبِ نمائندگی کا، پرسوں کو اٹانومی کا، اور اس کے بعد کوئی اور خطرناک مسئلہ نمودار ہو جائے گا جسے حل کرنا آپ کے بس میں نہیں ہوگا۔ اور وقت ہے کہ اب بھی آپ ہیجانی کی تحریکیں چلانے اور عورتوں کو بے پردگی سکھانے پر توانائیں صرف کرنے کے بجائے سیدھی طرح عوام کے اسلامی شعور کی نشوونما کی فکر کریں اور ایمانداری سے ایک اسلامی دستور سامنے لاکر قوم کی صحیح فکری و کرداری تعمیر فرمائیں۔ نیز یہ بھی ضروری ہے کہ ہمارے اکابر ایسے مناصب [illegible] اور دوسری [illegible] "ذیلی علاقہ" کی عصبیتوں کو [illegible]

ادھر پنجاب جیسے وافر غلہ پیدا کرنے والے صوبے میں حکومت کی غذائی پالیسی کی ناکامی نے احتجاجی جلسوں سے تنگ آکر عوام کو مشتعل جلوس بازی کی سرحد پر پہنچا دیا ہے۔ کل ۲۳ فروری کو مال پر جو قانون شکنی ہوئی ہے اس پر دو [illegible] گورنمنٹ کو غور کرنا چاہئے۔ پھر یہ مسئلہ درحقیقت صرف غلہ ہی کا پیدا کردہ نہیں بلکہ ہماری [illegible] اور قانون شکنی کے ہنگاموں کے پیچھے وہ افسوسناک "انتخاب" بھی کام کر رہا ہے جس میں دھونس، دھاندلی اور [illegible] سے بازی جیتی گئی تھی۔ لوگوں کے [illegible] [illegible]

تلخ نوائیں، تلخ پیام

کوثر نیازی

گھڑیں گے ایک نہ اک دن مرے "وطن کے امام"

نیا خدا، نیا پیغامبر، نیا اسلام

فقیہِ شہر کے تقویٰ کا واہ! کیا کہنا

حرام. رزقِ حلال و حلال رزق حرام

طلوعِ صبح کا اعلان ہو گیا لیکن

یہ بات کیا ہے کہ ظلمات میں گھرے ہیں عوام

یہاں اصول اگر ہے تو بے اصولی ہے

نہیں نظام! یہ انصاف پر ہے اِک الزام

"یہ اپنے آپ کو سولی پہ[1] لا چڑھانا ہے"

حضور! رہنے ہی دیں آپ دینِ حق کا قیام

جہاں کہ بنتی ہے ٹھوکر بھی رہبرِ منزل

تجھے نصیب ہو! اے میرِ کارواں وہ مقام

خدا کرے۔ کہ ترے حق میں شہد ہو جائیں

یہ میری تلخ نوائیں، یہ میرے تلخ پیام

●

بہار آئے تو کیسے آئے؟

کوثر نیازی

وہ دینِ قیم کے چند پیرو، جہاں کے رُخ کو بدل رہے ہیں

مفاد کے جو اسیر تھے، اب وہ حق کے سانچے میں ڈھل رہے ہیں

یہ ہے نتیجہ خدائے واحد سے انحراف اور سرکشی کا

بھنورِ مصائب کے اہلِ دُنیا! تمہیں جو ہر سُو نگل رہے ہیں

ظہور پائے گا کیا یہیں سے، نظامِ اسلام، اے اکابر!

جہاں محلاتِ رنگ و بو میں "لہو" کے فانوس جل رہے ہیں

میں سوچتا ہوں کہ اس چمن میں بہار آئے تو کیسے آئے

جو باغباں ہیں خود اپنے ہاتھوں گل و سمن کو مسل رہے ہیں

یہ خود ہلاکت کے غار میں جا گرائیں گے اس کو دیکھ لینا

جو سانپ ملت کی آستینوں میں چند سالوں سے پل رہے ہیں

وہ جن کی رگ رگ میں آمریت لہو کی صورت رواں دواں تھی

نظامِ حق کا نفاذ سن کر جگر اب اُن کے نکل رہے ہیں

خُدا وہ لایا ہے وقت کوثر. طلوعِ اسلام ہو رہا ہے

جو گھٹ رہے تھے، تڑپ رہے تھے، وہ دل کے ارماں نکل رہے ہیں

●

[1] یہ مصرعہ نعیم صدیقی کا ہے۔

گلگشت

(تعارف کتب و جرائد)

یوم منانے کی جو بدعت یورپ سے وارد ہوئی ہے اس میں مفید پہلو ایک ہی ہے، وہ یہ کہ سیاسی اور ادبی شخصیتوں کے حالات اور کارناموں کا ہر سال چرچا ہو جاتا ہے۔ پاکستان میں ہمارے حکمرانوں نے جو سیاسی جمود پیدا کر دیا ہے اس کی فضا میں یوم منانے کی تقاریب کو قدرتی طور پر فروغ ہونا چاہئے۔ چنانچہ اسی سلسلے میں یوم حالی منایا گیا۔ انجمن احیائے ادب پاکستان (لاہور) نے "مقالاتِ یومِ حالی" کے نام سے ایک مختصر سی کتاب میں حالی مرحوم کے حالاتِ زندگی اور ان کے کلام پر چند تعارفی تحریریں جمع کر دی ہیں۔ اس کتاب کو غیر مفید تو کوئی نہیں کہہ سکتا، البتہ ہم نے اس کا جائزہ اس نقطۂ نظر سے لیا کہ کیا حالی کا مطالعہ اس میں کسی نئے، صالح اور تحقیقی رجحان کے ساتھ کیا گیا ہے یا نہیں؟ سو اس لحاظ سے ہماری رائے یہ ہے کہ سرسری قسم کی تعارفی چیزیں جمع کی گئی ہیں اور کوئی خاص بات نہیں۔ ہمیں جناب حافظ جلیل احمد صاحب انصاری پرنسپل طبیہ کالج (لاہور) کی اس رائے سے اتفاق نہیں ہے کہ حالی مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبہ کو اسلامی رنگ میں رنگا ہوا دیکھنا چاہتے تھے (ص ۲۲) بخلاف اس کے حالی بقول مولانا صلاح الدین احمد صاحب مدیر ماہنامہ ادبی دنیا (لاہور) سرسید کے نقیب تھے (ص ۹۱) اور اس لحاظ سے وہ دراصل احیائے اسلام کے نہیں بلکہ احیائے قوم مسلمین کے علمبردار تھے۔ ان دونوں چیزوں میں بڑا فرق ہے۔ حالی اس خاص مکتب خیال کے آدمی ہیں جو اسلام کو بھی قومی زاویۂ نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس مبالغہ آرائی کو ہم پسند نہیں کرتے کہ "چونکہ قدرت کو حالی سے انقلاب آفریں کام لینا تھا اس لئے قدرتی طور پر حالی کی تعلیم و تربیت بھی حسبِ ضرورت و حسبِ منشا ہوئی"۔ ہماری رائے میں مولانا حالی اگرچہ بڑے احترام کے مستحق ہیں اور ہم ان کے کارنامے میں خدمتِ اسلام کا روشن پہلو بھی دیکھتے ہیں، لیکن بہرحال ہم ان کی "خاص ماموریت" کے تصور کے لئے کوئی خاص وجہ نہیں پاتے۔

یہ مجموعہ ناصح زاہدی صاحب کا مرتب کردہ ہے اور چھ(؟) فی جلد کے حساب سے مل سکتا ہے قیمت مارکیٹ ریٹ سے نمایاں طور پر زیادہ ہے۔

عبادات انحطاطِ عام کے زیرِ اثر جس طرح رسمیات میں بدل گئی ہیں اس کو ہر شعوری مسلمان شدت سے محسوس کرتا ہے۔ یہی حج کے ساتھ بھی ہوا کہ بس ایک سفر، طوافِ کعبہ، نمازِ عید، قربانی اور سعی منا، عرفات و مزدلفہ کی مقررہ حرکات تو اہتمام سے سرانجام دے لی جاتی ہیں مگر حرم سے آبِ زمزم کے سوا کم ہی حاجی ہوں گے جو کوئی اور تحفہ ساتھ لاتے ہوں۔ اسی حقیقت کو کتب خانہ الفرقان گوئن روڈ نے محسوس کرتے ہوئے مولانا محمد منظور نعمانی اور مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی کے مقالات کا مجموعہ "آپ حج کیسے کریں؟" کے عنوان سے شائع کیا ہے۔ یہ مجموعہ نہ صرف یہ کہ سفرِ حج کے متعلق پوری رہنمائی دیتا ہے بلکہ اس سفر کے آداب اور مناسکِ حج اور ان مناسک کی اصل روح کی تعلیم بھی دیتا ہے۔ ان مقالات میں بڑا سوز ہے جو اثر انگیز ہے اور دلوں میں ایک تڑپ پیدا کر دیتا ہے۔ ہم نے فی الواقع اس مجموعے سے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ قیمت مجلد مع رنگین سرورق تین روپے۔

محمد رحمت علی صاحب ایم۔ اے (حمتانیہ) نے سیاسی ادارات کے عنوان سے ایک مختصر کتابچہ لکھی ہے جس کا منشا یہ ... سیاسی تنظیمی ادارات کی [illegible] اور ان کے تاریخی نشوونما سے ہمارے خواندہ عوام واقف ہو سکیں۔ اس کا مطالعہ [illegible] لئے مفید ہے [illegible]

ابتدائی درجے کی تحقیقی چیز نہیں ہے۔ علاوہ بریں یہ کتاب ایک عام قسم کے مروجہ نقطۂ نظر کے ساتھ لکھی گئی ہے، حالانکہ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ سیاسی تحریکوں اور اداروں کی تاریخِ فکر و عمل پر اسلامی نقطۂ نظر سے ناقدانہ تحریریں لکھی جائیں اور ایک نئے اندازِ فکر کو پروان چڑھایا جائے۔
ناشر: [illegible] مشوی اینڈ کمپنی، نظام شاہی روڈ، حیدر آباد۔ دکن۔ صفحات ۶۲۔ قیمت عہ (جو زائد معلوم ہوتی ہے)

غیر اسلامی" دستوری سفارشات" کے ردِّ عمل نے اسلامی دستوریات پر جو مفید لٹریچر پیدا کیا ہے اس کی صف میں "دی کانسٹی ٹیوشنل مشینری آف پاکستان" کی بھی جگہ ہے۔ اس دستوری خاکے کے مؤلف جناب اسد القادری ناظمِ اعلیٰ جمعیت علمائے اسلام (کراچی) ہیں۔ مؤلف نے یہ خاکہ حسبِ ذیل امور کی رعایت فرماتے ہوئے لکھا ہے: (ا) پاکستان کا دستوری نظام جمہوریت، عدلِ اجتماعی اور انفرادی آزادی کے ان تصورات کی طرف لے جانے والا ہو جو اسلام نے پیش کئے ہیں (ب) مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کو مناسب تحفظات حاصل ہوں اور ان کے باہمی تعلقات بہتر ہو سکیں (ج) موجودہ پارٹی گورنمنٹ کے مفاسد سے بچ کر ایسا راستہ پیدا کیا جائے کہ انتخابات میں بہترین اور موزوں افراد ہی ابھر سکیں (د) پاکستان کے ایک خطے کو دوسرے خطے پر دراز دستی کرنے کے مواقع کا زیادہ سے زیادہ سدِّ باب ہو جائے (س) انتظامیہ، قانونیہ، اور عدلیہ کو زیادہ سے زیادہ حد تک ایک دوسرے سے آزاد رکھتے ہوئے حکومت کا کام متوافقانہ انداز سے چل سکے۔

اس دستوری خاکے پر ہماری مجمل رائے یہ ہے کہ فی الجملہ یہ خاکہ اسلامی مزاج کا ہے اور اس کے فاضل مرتب نے یقیناً سوچ بچار سے کام لیا ہے۔ اسی رائے کی بنیاد پر ہم اس کو اسلامی دستوریات پر مفید لٹریچر کی صف میں رکھتے ہیں۔ لیکن جہاں تک تفاصیل کا معاملہ ہے بہت سے پہلو قابلِ بحث ہیں۔ ہم مختصراً یہاں ضروری باتوں کی طرف اشارات کر رہے ہیں:۔

(۱) دفعہ (۳) کا یہ حصہ کہ "ریاست کا مذہب اسلام ہوگا" صحیح اسلامی دستوری نقطۂ نظر میں جچتا نہیں۔ اس طرح کے فقرے مذہب و سیاست کی تفریق کو مان کر سوچنے والے ممالک نے ایجاد کئے ہیں۔ اس فقرے کی جو تفصیل مؤلف نے دی ہے وہ بالکل ٹھیک ہے۔ کیونکہ دفعہ (۱) اور (۲) میں اصل بنیادی اصول طے کر دیا گیا ہے کہ حاکمیت پوری کی پوری اللہ کے لئے ہے اور تمام مسلم شہری اس کے نائب ہیں۔ دفعہ (۴) میں یہ بھی صاف کر دیا گیا ہے کہ قرآن و سنت سے متصادم ہونے والے قوانین کو مناسب مدت کے اندر منسوخ کر دیا جائے یا ان میں ضروری ترامیم کر دی جائیں۔ علاوہ بریں دفعہ (۵) نے یہ بات بھی صاف کر دی کہ صدر، کمانڈر ان چیف، سپیکر مجلس قانون ساز، چیف جج اور صدر مجلس دینی لازماً مسلم شہری ہوں گے۔ ان ساری تصریحات کے اندر مذکورہ بالا فقرے کی کوئی جگہ نہیں ہے۔

(۲) صدرِ مملکت کا انتخاب محدود رائے دہی کے ذریعے ہوگا۔ حقِ رائے دہی کا معیار ایک طرف تعلیم کو رکھا گیا ہے اور دوسری طرف ٹیکس کی ایک مقدار کو۔ سالانہ ٹیکس کی مقدار کو حقِ رائے دہی کا معیار بنانا کسی سرمایہ دارانہ نظام کا تقاضا ہے، نہ کہ اسلامی نظام کا!

(۳) "مجلسِ مذہبیات" (ECCLESIASTICAL BOARD) کو بالاتر اختیارات کے ساتھ قانونیہ، انتظامیہ اور عدلیہ کے اوپر جس انداز سے رکھا گیا ہے وہ پھر ذہن کو دین و دنیا کی دوعملی کی طرف منتقل کرتی ہے۔ اس مجلس کا نام بھی کوئی اچھا اثر نہیں ڈالتا۔ نیز یہ بڑا مشکل معاملہ ہے کہ ملک کی فضا اس مجلس کو اس کے حقوق و اختیارات کے ساتھ قبول کر سکے۔ اندیشہ ہے کہ ایسی دستوری مشینری جس میں دو طبقے الگ الگ منظم کر کے بٹھا دیئے گئے ہوں، اس میں داخلی کشمکش واقع ہونے لگے۔ زیادہ سے زیادہ اس سلسلے میں گنجائش اس بات کی ہے کہ ابتدائی چند سالوں کے عبوری دور کے لئے علماء کی ایک مجلس مشاورت قانونیہ کو مشورے بہم پہنچائے اور تھوڑے سے بہت آئینی اختیارات بھی اسے حاصل ہو جائیں لیکن اصل اختیار قانونیہ کے ہاتھ ہی میں رہنا چاہئے۔

اس مجلس کو جتنے اختیارات سے مسلح کیا گیا ہے ان کے ہوتے ہوئے اسے مسلمانوں اور غیر مسلموں کی مشترک مجلس بنانا بنیادی طور پر

غلط ہے۔ فرض کیجئے کہ اس کے کسی اجلاس میں اکثریت غیر مسلموں کی موجود ہو، یا باہر سے غیر مسلموں کی کوئی تعداد ملک میں داخل ہو کر تناسب آبادی کو متأثر کر دے، یا کل آپ کسی ایسے ملک میں اسلامی نظام قائم کر کے دینے پر مامور ہوں جہاں آبادی میں مختلف غیر مسلم گروہوں کی مجموعی تعداد بڑھ جائے، تو پھر وہاں کیا آپ اپنا دستوری اصول اور نظریہ بدل ڈالیں گے؟

اس مجلس کے اندر سے جو "مجلس اسلامی" پیدا کی جائے گی وہ فتوے جاری کرنے کا کام آخر کاہے کو کرے گی۔ افتاء کے مروجہ مشغلہ کی حقیقت و ماہیت کو جناب مؤلف سمجھ نہیں سکے۔ یہ تو دراصل اسلامی نظام قضا کے سقوط کے بعد پیدا ہونے والے خلاء کو مصنوعی طور پر پُر کرنے کی ایک کوشش تھی۔ اب اگر وہ "نظام قضا دوبارہ زندہ ہو جائے تو اس مشغلے کی ضرورت کیا ہوگی۔ اس کے بعد تو مفتی" ماہرین قانون" کی حیثیت سے عوام کو قانونی رہنمائی اور ججوں کو مقدمات کی بحث میں قانونی مشورے بہم پہنچائیں گے۔ اس مقام پر بہرحال کچھ جھول ہے۔

(۴) میٹرک سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک کے لئے قرآن کی تعلیم کو لازمی قرار دیا گیا ہے۔ یہاں پھر اسلامی تعلیم کا ادھورا اور دو رنگا تصور کام کر رہا ہے۔ تعلیم اگر اسلامی ہوگی تو ابجد خوانی سے لے کر آخر تک پوری کی پوری قرآن کی فکر کے سانچے میں ڈھلے گی اور اسلامی نہ ہوگی تو قرآن کی لازمی تعلیم کا اضافہ بھی اسے بہتر نہیں بنا سکتا۔

اس دستوری خاکے کے بعض مزید اختیارات کا ذکر کر دینا ضروری ہے۔

ا۔ اس خاکے کی رو سے نظام قانونیہ میں کوئی پارٹی کیبنٹ نہیں ہوگی۔ البتہ صدر اپنی امداد کے لئے اپنے لئے کچھ وزرا منتخب کر سکتا ہے جو خود اسی کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔

ب۔ صدر کے اختیارات قانونیہ کے ذریعے محدود کر دیئے گئے ہیں۔

ج۔ پریس کی آزادی کو پورے کمال کے ساتھ مطلوب قرار دیا گیا ہے۔

د۔ کسی فرد کی جان مال پر کوئی تصرف باقاعدہ قانونی کارروائی کے بغیر جائز نہیں قرار دیا گیا۔

س۔ عوام اور سرکاری ملازمین کے درمیان مساواتِ قانونی کو لازم قرار دیا گیا ہے۔

ش۔ ابتدائی مفت لازمی تعلیم، مفت اور لازمی فوجی تعلیم، معذورین کے لئے ضروریاتِ زندگی اور بے کاروں کے لئے ایمپلائمنٹ ایکسچینج کے انتظام کی ذمہ داری حکومت پر ڈالی گئی ہے۔

ص۔ حکومت کے لئے لازم رکھا گیا ہے کہ غذا، پانی اور تعلیم، صحت، زچگی اور ناکاری کے لئے بیمہ، ذرائع رسل و رسائل، صفائی کے انتظامات، آب پاشی کے انتظامات کو وہ ارزاں رکھے اور محنت کاروں کے لئے اوقاتِ محنت اور دوسری شرائط کو انسانی تقاضوں کے مطابق رکھے۔

ط۔ انتخابات عدلیہ کی نگرانی میں ہوں گے۔

ع۔ صدر مملکت، سپیکر، چیف جسٹس وغیرہ کا احتساب (IMPEACHMENT) ہو سکے گا۔

ف۔ ہنگامی صورتِ حالات کا (EMERGENCY) اعلان قانونیہ ہی کر سکے گی۔

اس انگریزی پمفلٹ کی قیمت ۳۔آنے ہے۔ اور ڈاکٹر محمد یونس زبیری ایم اے ایل ایل بی (حیدرآباد) کا شائع کردہ۔

قوموں کا زوال و انحطاط اور عروج و ارتقاء دن رات انسان کے سامنے ایسے وسیع الاثر حوادث کو پیش کرتا رہتا ہے کہ بجائے خود ان حوادث کا مجموعی نام تاریخ ہے، ایک مستقل بلکہ مرکزی موضوعِ تحقیق بن گئے ہیں۔ تاریخ کے اتار چڑھاؤ کے مطالعہ سے یہ جاننے کی کوشش کی گئی ہے کہ آیا یہ سب کچھ بغیر کسی آئین اور ضابطے کے ہو رہا ہے یا اس تغیر و حدوث کے لامتناہی سلسلے کے کوئی اصول بھی ہیں۔ چنانچہ [illegible]

چھوڑ دیں۔ بعض لوگوں نے دنیا اور انسانی تاریخ کو قدرت کا ایک دل بہلاوا اور رام کی ایک لیلا سمجھ کر مزید سوچنے سے دست برداری کر لی ہے، لیکن حکماء علما کا بہت بڑا گروہ اس حقیقت کا قائل ہوا ہے کہ انسانی تاریخ میں قوموں کا مدوجزر اپنے پیچھے کچھ قواعد و ضوابط رکھتا ہے۔ پھر ان قواعد و ضوابط کے تعین میں اختلافات ہوئے ہیں۔ بعض نے تاریخِ انسانی پر صرف مادّی و طبعی عوامل کی حکمرانی تسلیم کی ہے لیکن انبیا کی حکمت کہتی ہے کہ انسانی زندگی پر مادی و طبعی نوامیس کے ساتھ ساتھ کچھ اخلاقی ضابطے نسبتاً زیادہ وسعت کے ساتھ اثرانداز ہوتے ہیں۔ تاریخ کے مطالعہ کا یہی اسلامی نقطۂ نظر ہے۔

اسی نقطۂ نظر کو واضح کرنے کے لئے جناب ضیاءالہدیٰ صاحب نے "قانونِ مکافات" اور جناب سید حامد علی صاحب نے "قوموں کا عروج و زوال" کے زیرِ عنوان اپنے نتائجِ فکر و تحقیق جمع کئے ہیں۔ بحث کے راستے دونوں نے الگ الگ اختیار کئے ہیں مگر دونوں ایک ہی منزل کی طرف لے جاتے ہیں۔ افسوس کہ تفصیلی تبصرہ کی گنجائش نہیں۔

"قوموں کا عروج و زوال" مکتبہ جماعت اسلامی (ہند) رام پور نے شائع کی ہے جو آٹھ آنے فی جلد کے حساب سے مل سکتی ہے۔

"قانونِ مکافات" مکتبہ دین و دانش بانکی پور پٹنہ نمبر۴ کی شائع کردہ ہے اور قیمت فی جلد عہ ہے۔

جدید طریقۂ تعلیم کے اصول و تجربات سے ہمارے ملک کی تعلیمی فضائیں گزشتہ دس پندرہ سال سے روشناس ہوئی ہیں اور اس کا اثر یہ پڑا ہے کہ نصاب، خصوصاً ابتدائی نصاب کی تدوین جدید کی طرف توجہ ہو رہی ہے۔ پچھلے پانچ چھ سال میں ہماری نگاہ سے تعلیم ابجد و ابتدائی خواندگی کے لئے مرتب کئے ہوئے کئی "قاعدے" جدید انداز کے گزرے ہیں۔ اور ابھی اس میدان میں ارتقا ہو رہا ہے۔ اس وقت جناب محمد یحییٰ صاحب کا مرتب کردہ "ہمارا قاعدہ" جو مکتبہ نظامِ[1] اسلامی، اچھرہ لاہور کا شائع کردہ ہے، ہمارے پیشِ نظر ہے۔

محمد یحییٰ صاحب کے بارے میں ہمیں ذاتی طور پر یہ معلوم ہے کہ موصوف بچوں کو ابتدائی خواندگی کی تعلیم دینے کے تجربات ایک مدت سے کر رہے ہیں اور یہ تجربات خاصے کامیاب ہیں۔ انھی تجربات کا حاصل "ہمارا قاعدہ" ہے۔ اس قاعدے کا پہلا سبق ایک نظم ہے اور پھر چھوٹے چھوٹے جملوں کے اسباق ہیں۔ یعنی طریقہ یہ ہے کہ پہلے جملے، پھر الفاظ، پھر حروف!

اوپر کی سطور اگر اس قاعدے کی افادیت کا تعارف کرانے کے لئے کافی ہوں تو اب ہم اس کے کمزور پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہیں اور بوجہ قرب و یگانگت ہماری یہ تنقید، ہو سکتا ہے کہ زیادہ کڑی ہو۔ ضروری اشارات یہ ہیں:-

۱۔ مکتبہ نظامِ اسلامی کا شائع کردہ یہ قاعدہ اپنے اسباق کی ترتیب میں اُس نقطۂ نظر کو سموئے ہوئے نہیں ہے جو اسلامی تعلیم کا ہو سکتا ہے۔ سوائے اس کے کہ بالکل آخر کے صفحے پر "ہمارا اللہ" کا ایک سبق درج ہے۔

۲۔ اس قاعدے کو تصاویر سے خالی رکھ کر بچوں کی نفسیاتِ تعلیمی کو نظرانداز کر دیا گیا ہے۔

۳۔ الفاظ سکھانے میں تعلیمی نقطۂ نظر سے جو ترتیب ملحوظ رکھی جانی چاہئے تھی اسے عام قاعدہ نگاروں کی طرح نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ صحیح ترتیب یہ ہو سکتی ہے کہ پہلے اکہرے دو حرفی اور دوہرے دو حرفی کا جوڑ "ا" "و" "ے" یا "حرکتِ فتحہ" سے ہوتا ہو، پھر ایسے سہ حرفی جن کے بیچ میں حرفِ علت ہو، پھر وہ سہ حرفی جن کے آخر میں حرفِ علت ہو، پھر ایسے سہ حرفی جن کے حرفِ اول پر فتحہ اور آخری دو حرفوں پر سکون ہو، پھر وہ جن کے اولین دو حرفوں پر فتحہ اور صرف آخر میں سکون ہو، اس کے ساتھ ساتھ کسرہ اور ضمہ والے مرکبات کا استعمال،

---

[1] یہ مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی سے الگ، ایک پرائیویٹ مکتبہ ہے۔ مغالطہ نہ ہو! (چراغِ راہ)

پھر واؤ مجہول و معروف اور یائے مجہول و معروف کے فرق کی وضاحت، پھر مشدد مرکبات، پھر نون غنہ اور واو معدولہ اور پھر بقیہ متفرق قواعدِ ترکیبِ حروف!

بخلاف اس کے ہمارا قاعدہ کے پہلے ہی سبق میں ایک تو سادہ حروف کے ساتھ "کھ" کا استعمال کیا گیا ہے، دوسرے "بچوں" "نئی" "منہ" وغیرہ جیسے "مشدد" اور نون غنہ والے مرکبات اور "صبح" جیسا لفظ بچے پر ٹھونسنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۴۔ مرکبات کا تجزیہ کر کے بچوں کو مرکبات سازی کے اصولوں کی تربیت دی گئی ہے لیکن افسوس کہ اس ... کاری میں مرتب نے غلطیاں کی ہیں مثلاً

مؤلف کا تجزیۂ مرکبات	اصلاح یافتہ صورت
گیا = گ ، یا	گیا = گ ، یا = گ ، ی ، ا = گ ، ے ، ا
سجا = س ، جا	سجا = سہ ، جا = سہ ، جہ ، ا = س ، ج ، ا
بجا = ب ، جا	بجا = بہ ، جا = بہ ، جہ ، ا = ب ، ج ، ا
شکر = شں ، کر	شکر = شک ، ر = شکہ ، ر = شہ ، کہ ، ر = ش ، ک ، ر
نرم = ن ، رم	نرم = نر ، م = نہ ، ر ، م = ن ، ر ، م
ندی = ن ، دی	ندی = ند ، دی = نہ ، د ، دی = ن ، د ، ی

ہماری رائے یہ ہے کہ اگرچہ نصابی کتب (خصوصاً "قاعدہ") لکھنے کے لئے عملی تجربہ بنیادی اہمیت رکھتا ہے لیکن اس کام میں نظریاتی مطالعہ و مشورہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے جناب مؤلف اس پہلو کو پورا کر لیں تو ان کی آئندہ کوششیں اور بھی زیادہ مفید ہوں گی۔

قاعدے کی کتابت و طباعت بہت خوشنما ہے۔ قیمت ۴ ر

ذیل میں ہم چند جرائد کا مختصر تعارف کرائے دیتے ہیں جو اظہار رائے کے لئے موصول ہوئے ہیں :۔

(۱) ہفت روزہ "ایمان"۔ بادارت جناب احمد حسین صاحب حمیدی۔ مقام اشاعت کراچی۔ قیمت فی پرچہ ۱۲ آنے۔ اوسط درجے کا جریدہ ہے

(۲) سہ ماہی "نوائے ادب" شائع کردہ انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی ۱۔ چندہ سالانہ للعہ روپے فی پرچہ عہ روپیہ۔ اردو زبان و ادب پر تحقیقی مقالات شائع کرتا ہے۔

(۳) ماہنامہ "دعوت الحق" بہ نگرانی جناب مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی۔ نگران دارالعلوم الاسلامیہ اشرف آباد، ٹنڈو الٰہ یار، حیدرآباد، سندھ، چندہ سالانہ چھ روپے، فی پرچہ آٹھ آنے۔ خالص دینی مزاج کا علمی جریدہ ہے۔ مقالات کے ساتھ اچھی نظمیں بھی درج ہیں۔

(۴) ماہنامہ "تعمیر نو"۔ شائع کردہ انجمن تعمیر ادب راولپنڈی۔ چندہ اور قیمت خدا جانے کہاں درج کی گئی ہے۔ جریدہ معیاری ہے اور اس کی روح اسلامی ہے۔ علمی مقالات بھی ہیں، ہلکی پھلکی ادبی نگارشات اور نظمیں بھی ہیں۔

(۵) ماہنامہ "کرن"۔ بادارت محمد عبدالغنی صاحب، عزیزی و دیگر معاونین۔ مقام اشاعت باری روڈ، گیا (صوبہ بہار) یہ جریدہ کچھ ادبی ہے، کچھ مذہبی، کچھ انجمنی، چندہ سالانہ پانچ روپے۔

(۶) ماہنامہ "سلطان المشائخ" بادارت سید عبداللطیف شاہ صاحب چشتی۔ مقام اشاعت لاہور۔ چندہ سالانہ سجادہ نشینوں سے ۲۵ روپے عوام سے تین روپے۔ فی پرچہ ۵ آنے۔ اس جریدہ کا موضوع تصوف ہے۔

اپنی طاقت کی حفاظت کریں

جب آپ کی صحت کمزور ہو اور جسم میں خون کم ہو تو

مشہورِ عالم

مفرح فولادی

استعمال کریں۔ آپ کو معلوم ہو جائیگا۔ کہ یہ مقبول اور مقوی دوا آپ کی قوت میں اضافہ کرتی ہے۔ اور کھوئی ہوئی توانائی واپس لاتی ہے

قیمت فی شیشی:۔ دو روپے آٹھ آنے
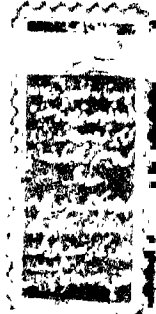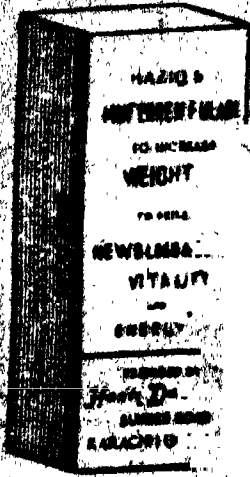
الٰہی زمن معدۂ من مرنجاں ۔ دگر ہر چہ رنجیدہ رنجیدہ باشد

معدہ کی خرابیوں کو نظر انداز نہ کیجیئے۔

کہیں ....

معدہ کی خرابیاں آپ کو نظر انداز نہ کر دیں۔

ہاضمی

ایک بہترین مقوی معدہ ہے جو عمل ہضم کو قدرتی طور پر کام کرنے میں مدد دیتا ہے۔ اور معدہ کو ہر خرابی سے محفوظ رکھتا ہے۔ حفظ ماتقدم علاج سے بہتر۔ اس لئے ہاضمی کا استعمال کیجیئے: تاکہ آپ کا معدہ ہر خرابی سے محفوظ رہے۔ مرد اور عورت دونوں کیلئے یکساں مفید ہے

قیمت فی شیشی۔ ایک روپیہ چار آنے

تیارکردہ۔ حاذق دواخانہ بندر روڈ۔ کراچی

اسلامی ادب کا علمبردار

ماہنامہ

چراغِ راہ کراچی

مندرجات

اپریل ۱۹۵۲ء

قیمت: ۸ آنے

جلد ۵ — شمارہ ۵

چندہ سالانہ

پاکستان	بھارت
۵ روپے	۶ روپے

دفتر چراغِ راہ - ۹، لوٹیا بلڈنگ - آرام باغ روڈ - کراچی

سوچ بچار

پنجاب بجٹ

اس مرتبہ "سوچ بچار" کے صفحات میں پروفیسر عبدالحمید صاحب آپ کے سامنے آ رہے ہیں۔ موصوف کے قلم سے پہلے بھی ہمارے قارئین واقف ہیں اور ان کے مطالعۂ فکر پر اعتماد کرتے ہیں۔ (ادارہ)

میزانیہ کسی ملک کی ترقی اور خوشحالی کا مقیاس ہی نہیں بلکہ یہ وہ مرغ باد نما ہے جس سے کسی حکومت کے ارادوں کا رُخ معین کیا جاسکتا ہے جس طرح ایک انسان کے چہرے کو دیکھ کر ہم بآسانی اس امر کا ایک ہلکا سا اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس کے دل کی گہرائیوں میں کونسے جذبات موجزن ہیں، کون کون سے احساسات انگڑائیاں لے رہے ہیں، بالکل اسی طرح کسی ملک کے میزانیہ پر غور و فکر میں ہمیں کسی حد تک حکومت کی پالیسی کا ایک مدھم سا پرتو ضرور دکھائی دیتا ہے۔ ہم کسی حد تک اس بات کو سمجھ سکتے ہیں کہ حکومت کے کارندوں کا رُخ کس سمت کو ہے، اُن کا کوہر مراد کیا ہے، اُن کی منزلِ مقصود کیا ہے۔ وہ کونسا مقام محمود ہے جس کو حاصل کرنے کے لئے یہ لوگ ہاتھ پاؤں مارتے ہیں۔ جن لوگوں کی قسمت کا فیصلہ ان کے ہاتھ میں ہے انھیں اُن سے کونسی اور کس قسم کی توقعات وابستہ کرنی چاہئیں اور وہ انھیں کہاں تک پورا کر رہے ہیں۔ کیا مسندِ اقتدار پر جلوہ فروز ہونے کا مقصد اُن کے سامنے یہی ہے کہ وہ اپنے اور اپنے ساتھیوں کے لئے زیادہ سے زیادہ مواقع بہم پہنچائیں۔ قوم کے مفلس اور نادار لوگوں کو خود لوٹیں اور اپنے ساتھیوں کے لئے میدان صاف کریں بجائے "خدمتِ خلق" کے "خدمتِ شکم" کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگائیں۔ اور برابر اس کوشش میں مصروف رہیں کہ کسی طرح وہ مسند اُن کے ہاتھ سے نکلنے نہ پائے جس کو حاصل کرنے کے لئے انھوں نے اخلاق اور شرافت۔ جائز اور ناجائز کی سب حدود کو پھاند دیا تھا اور بالآخر بڑی ہی تگ و دو کے بعد وہ یہاں تک پہنچے۔

یہ میزانیہ جہاں ایک طرف صاحبِ اختیار لوگوں کی ان ذہنی کیفیات اور قلبی واردات کو منعکس کرتا ہے۔ وہاں بھلائی کے ان احساسات کو بھی بغیر کسی لاگ لپیٹ کے ظاہر کرتا ہے۔ وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ کتنے دل ایسے ہیں جن میں مودت، ہمدردی اور شفقت کا جذبہ کارفرما ہے کون کونسی مدیں ایسی ہیں جن میں عوام کی بہتری کو پیشِ نظر رکھا گیا۔ کتنے سکے ایسے ہیں جو رفاہِ عامہ کے کاموں کے لئے مخصوص ہیں کتنی اسکیمیں ایسی ہیں جن میں افلاس، جہالت اور بیماری کے طوفان کو فرو کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں کتنے محصولات ایسے ہیں جن کو حاصل کر کے لاوارثوں اور یتیموں اور بیواؤں کی دستگیری کی جائے گی۔ اور تقسیمِ دولت کے اُس عظیم تفاوت کو ختم کیا جائے گا جس کی بنا پر ہمارا پورا سماج دو ایسے مختلف طبقوں میں بٹ کر رہ گیا ہے جس میں منافرت کی دبی چنگاریاں سلگ رہی ہیں۔ اور ذرا سی ہوا دینے سے بھڑک سکتی ہے۔

یہ میزانیہ یہ بھی بتاتا ہے کہ بچت اور سرمایہ کاری میں کیا توازن ہوگا۔ کیا دولت کی گردش تیز ہوگی اور اس کا کچھ حصہ سر بفلک محلات اور رفیع الشان عمارات سے گزر کر غریبوں کی جھونپڑیوں تک بھی پہنچے گا یا یہ سرمایہ چند ہاتھوں میں ہی سمٹ سمٹا کر رہ جائے گا اور غریب اس کو [illegible] گے جس کا لازمی اثر ملک میں بے روزگاری کا ظہور ہے جو موجودہ دور میں سب بیماریوں سے زیادہ خوفناک بیماری ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ بالواسطہ ٹیکسوں کی نوعیت ہم پر یہ راز بھی منکشف کر دیتی ہے۔ کہ حکومت کن چیزوں کی سماج میں افزائش چاہتی ہے۔

اور کن اشیاء کو ختم کر دینے کا ارادہ رکھتی ہے۔ کیا اُسے سامانِ تعیش کی توسیع مطلوب ہے یا ضروریاتِ زندگی کی فراہمی ـــــ دوسرے الفاظ میں کیا حکومت امراء اور سرمایہ داروں کے حفظ و بقا کے لئے قائم ہے یا غرباء اور عوام کی بہتری کے لئے۔

یہ ہیں وہ عام اندازے جو ایک معمولی لکھا پڑھا انسان بھی ایک میزانیہ کو دیکھ کر آسانی سے لگا سکتا ہے۔

لیکن ہمارے لئے یہ بجٹ ایک اور حیثیت سے بھی ضروری ہے۔ اور از بس ضروری ہے۔ یہ بجٹ اس حکومت کے دل کا بجٹ ہے جس نے قراردادِ مقاصد کے ذریعہ اللہ کی حاکمیت کا قلادہ اپنی گردن میں ڈال لینے کا اعلان کیا ہے۔ جس نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ وہ معروف کی ترقی اور اشاعت کے لئے ہر آن کوشش کرے گی اور برائیوں کو ملک میں پھیلنے سے روکے گی جس کا مقصدِ حیات ہی یہ ہے کہ وہ یہاں اسلام کی مثالی حکومت قائم کرے اور اس میں اجتماعی عدل کے اُس نصب العین کو حاصل کرے جس کے لئے سرورِ دو عالم اور اُن کے رفقاء نے کارِ نے مدینہ میں کوشش فرمائی تھی۔ اور تن من دھن کی قربانی سے اس نخل کی آبیاری کر کے اس کو لہلہاتا ہوا چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ اسی مقصد کا اس قرارداد میں اعلان لیا گیا ہے۔ ہمیں بحیثیت ایک مسلمان کے اب یہ دیکھنا ہے کہ اس بجٹ میں اس آدرش کے حصول کے لئے کہاں تک کوشش کی گئی ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ہمارے لئے اس بجٹ میں سب سے زیادہ جاذبِ نظر اگر کوئی چیز ہے تو وہ صرف یہ۔ اگر اس میں اس امر کا لحاظ رکھا گیا ـــ تو اس میزانیہ میں سب کچھ ہے۔ اور خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنھوں نے اسے مرتب کیا ہے۔ لیکن اگر اس میں اس طرف دھیان نہیں دیا گیا۔ تو اس سے بدتر بجٹ ہماری نظر میں اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ کہ ہمارے سربراہ کار اُس نصب العین سے آنکھیں پھیر لیں جس طرف بڑھنے کا وہ رات دن ڈھنڈورہ پیٹتے رہتے ہیں۔

ممکن ہے یہ گزارشات پڑھ کر ہمارے کچھ بھائی یہ کہیں کہ اسلام کی مثالی حکومت کا اتنی تھوڑی مدت میں قیام تو ممکنات میں سے ہے۔ لہٰذا اس میزانیہ سے یہ توقع کرنا کہ یہ ایک خالص اسلامی حکومت کا بجٹ ہو۔ پریشان خیالی کے سوا کچھ نہیں۔ دوسرے یہ ایک صوبے کا بجٹ ہے۔ چونکہ حکومت کی تبدیلی کا معاملہ ایک پالیسی کا معاملہ ہے اس لئے اس کو وضع کرنے میں مرکزی حکومت ہی مکمل اختیارات رکھتی ہے۔

بظاہر یہ دونوں اعتراضات کچھ وزنی معلوم ہوتے ہیں اور ان میں کسی حد تک صداقت موجود ہے۔ مگر ان میں کافی حد تک خام خیالی کو بھی دخل ہے۔ اس معاملے میں غلط فہمی کی بنا یہ ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ ہم آن کی آن میں اسلامی حکومت کے قیام کا مطالبہ کرتے ہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ کوئی ایسا شخص جو اپنے ہوش و خرد قائم رکھتا ہے یہ دعویٰ نہیں کر سکتا۔ نظامِ حکومت کی ترتیب و تدوین جان جوکھوں کا کام ہے۔ اس میں بڑی ہی عرق ریزی کی ضرورت ہے۔ اس میں مسلسل اور پیہم جد و جہد درکار ہے۔ یہ چند دنوں یا مہینوں کا کام نہیں۔ اس کی تکمیل میں ممکن ہے کئی سال صرف ہو جائیں۔ مگر اس سے یہ مراد بھی نہیں کہ ہم بجائے اس سمت قدم بڑھانے کے اس کی مخالف سمت میں گامزن ہوں اور سوچ سمجھ کر ان چیزوں کو ترک کرتے چلے جائیں جو اسلامی حکومت میں سب سے زیادہ پسندیدہ ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ کسی آدرش تک پہنچنے کے لئے کافی محنت کی ضرورت ہے۔ اس میں کافی مدت صرف ہوتی ہے مگر ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ نصب العین انسانوں اور قوموں کی زندگی میں نشانِ راہ کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ہماری جد و جہد کے رخ کو ظاہر کرتا ہے۔ اور ہمارے کام کی قدر و قیمت کا فیصلہ کرتا ہے۔ ہمارے اندر طلب و سعی کے جذبے کو بیدار کرتا ہے۔

اس بجٹ میں ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ اس رُخ پر بڑھنے کی ہم نے کہاں تک ایماندارانہ کوشش کی ہے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ پنجاب ایک صوبہ ہے۔ اس کے اختیارات اور وسائل محدود ہیں۔ اس ضمن میں پہلی گزارش تو یہ ہے کہ صوبہ پنجاب

پاکستان میں ایک مرکزی اہمیت رکھتا ہے۔ یہاں کے باشندوں میں سیاسی شعور سب سے بڑھا ہوا ہے۔ پڑھے لکھے لوگوں کا تناسب بھی کہیں زیادہ ہے۔ لہٰذا جس قسم کے رجحانات کا اظہار یہاں کی حکومت کرے گی۔ وہ مرکزی حکومت پر ضرور اثر انداز ہوں گے۔ اور وہ کسی حد تک مجبور ہوگی کہ اپنے رخ کو اسی طرف پھیر لے جس طرف کہ پاکستان کا دل پھر رہا ہے۔

دوسرے ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ اس صوبے نے آخر اپنی محدود اختیارات میں کہاں تک اسلام کو اپنانے کی کوشش کی ہے۔ اگر اس کے بااختیار لوگوں نے اپنی حد تک اس فرض کو سرانجام دے دیا ہے۔ تو پھر پریشان کرنے والی کوئی بات نہیں۔ لیکن اگر اس نے اپنے احاطۂ اختیار میں بھی اسلام کی طرف بڑھنے کی کوشش نہیں کی تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہمیں فکر لاحق نہ ہو۔ اور ہم ساری ذمہ داری مرکز پر پھینکتے ہوئے اسے یکسر بری الذمہ خیال کریں۔

ان گزارشات کے بعد اب ایک نظر میں بجٹ کو دیکھ لیجئے۔

امسال پنجاب کی صوبائی اسمبلی میں جو بجٹ پیش کیا گیا ہے۔ اس کی صورت حسب ذیل ہے:۔

آمدنی ۳۳ کروڑ ۵۷ لاکھ۔

اخراجات ۳۴ کروڑ ۱۵ لاکھ۔

خسارہ ۱۵ لاکھ۔

تفصیل:۔

(۱) آبیانہ اور لگان پر جو ۱۲۵ فی صدی کا ٹیکس عائد کیا گیا ہے۔ وہ اسی طرح جاری رہے گا۔

(۲) زرعی انکم ٹیکس میں کم از کم حد کو بڑھا کر کسی حد تک تخفیف کی گئی ہے۔

(۳) تھل اسکیم کی توسیع پر ۴۵ء۵ کروڑ۔

(۴) پولیس ۳۳۳۲۵۳۰۰ روپے۔

(۵) تعلیم ۳۷۲۰۳۰۰۰ روپے۔

(۶) دس لاکھ کی رقم جسمانی اور فوجی تعلیم کے کالجوں کے اجرا پر خرچ ہوگی۔

(۷) پنجاب یونیورسٹی کو ۴ لاکھ روپے کا خاص عطیہ دیا جائے گا۔

(۸) دس لاکھ کی رقم لوکل باڈیز سکولوں کو اساتذہ کی تنخواہوں کے بڑھانے کے لئے دی جائے گی۔

(۹) صحت ——— ۱۴۰۷۰۰۰۰۔

(۱۰) پبلک ہیلتھ ——— ۳۷۴۰۰۰۔

(۱۱) فاطمہ جناح میڈیکل کالج کے لئے ——— ۸۶۴۰۰۰۔

(۱۲) تیس لاکھ روپیہ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کی توسیع کے لئے۔

(۱۳) آبپاشی کی اسکیموں کی تکمیل پر ۷۸ء۸ کروڑ۔

(۱۴) بجلی کی اسکیموں پر ——— ۳۷ء۳ کروڑ۔

(۱۵) سول کے کاموں پر ——— ۳۹ء۲ کروڑ۔

اس سلسلے میں حکومت کی طرف سے اعلان کیا گیا ہے۔ کہ اس بجٹ کا سب سے خوشگوار پہلو یہ ہے کہ کوئی نیا ٹیکس عائد نہیں کیا گیا۔ بلکہ بعض ٹیکسوں میں ترمیم کر دی گئی ہے۔ حکومت نے زرعی آمدنی کے موجودہ درجوں پر ٹیکس کی شرح گھٹا کر زرعی انکم ٹیکس میں بھی کمی کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ جس سے صوبائی محاصل میں بائیس لاکھ روپے کا خسارہ ہوگا۔ میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ نے اپنی بجٹ کی تقریر کے آغاز میں اس امر کا انکشاف کرنے کے بعد کہ آئندہ مالی سال کے مجموعہ تخمینہ جات میزانیہ سے ایک کروڑ بہتر لاکھ روپے کا خسارہ ظاہر ہوگا ایوان کو مطلع کیا کہ بجٹ کی تکمیل کے بعد مرکزی حکومت سے جو تازہ ترین اطلاعات موصول ہوئی ہیں اُن کے مطابق اگلے مالی سال کے دوران میں بکری ٹیکس کی مد سے ہمارے حصے کی آمدنی سابقہ توقعات کے برعکس تین کروڑ بیاسی لاکھ روپے کی بجائے چار کروڑ چھبیس لاکھ روپے ہو جائے گی۔ اور انکم ٹیکس سے حاصل ہونے والی آمدنی اڑسٹھ لاکھ روپے سے بڑھ کر اٹہتر لاکھ روپے ہو جائے گی۔ محکمہ ہائے تعلیم اور صحت عامہ کی ترقی کی اسکیموں کے لئے مرکزی حکومت سے صوبائی حکومت کو جو پانچ کروڑ روپے کا عطیہ دیا گیا ہے۔ اس میں سے چوالیس لاکھ روپے کی لاگت سے آٹھ نئے ہائی اسکول اور آٹھ نئے مڈل سکول کھولنا بھی حکومت کے منصوبے میں شامل ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے سلسلہ میں انجینئرنگ پر بیس لاکھ روپے صرف کرنے کی تجویز ہے۔ اور عورتوں کو امور خانہ داری کی تعلیم دلانے کے لئے پانچ لاکھ روپے کی لاگت سے ایک نیا کالج بھی کھولا جائے گا۔ لاہور میں دو لاکھ روپے کے خرچ سے لڑکیوں کے لئے سپیشل ہوسٹل بھی کھولے جائیں گے۔

دیہاتی علاقوں میں بہم رسانی آب کی اسکیموں پر صرف کرنے کے لئے ۱۵ لاکھ روپیہ کی رقم مخصوص کی گئی ہے۔ بہبودئ اطفال اور دایہ گری کے مراکز قائم کرنے پر پانچ لاکھ روپے صرف کئے جائیں گے۔

ترقی کی اسکیموں کے سلسلے میں مہاجرین کی خاطر خواہ آبادی کی غرض سے بڑے بڑے شہروں کے نواح میں چودہ نئے شہروں کی تعمیر پر پندرہ کروڑ روپیہ صرف کیا جائے گا۔

پاکستان آرٹ کونسل اور پنجاب لٹریری لیگ علی الترتیب ۲۵ ہزار اور دس ہزار روپیہ وقف کیا گیا ہے۔ پنجاب میں مزدوروں کی فلاح و بہبود کا ایک محکمہ قائم کیا جا رہا ہے جس پر دو لاکھ روپے صرف ہوں گے۔ آئندہ سال اس مد پر چالیس لاکھ روپے صرف کئے جائیں گے حکومت نے محکمہ اسلامیات کو جاری کرنے کا فیصلہ بھی کیا ہے۔ اس کا اہم فرض یہ ہوگا۔ کہ ہمارے علماء اور طلبا کے لئے اسلام کا وہ بنیادی لٹریچر مہیا کیا جائے۔ جو ناپید ہوتا چلا جا رہا تھا اس میں سے بعض علماء سے اسلام کی تشریح میں مضامین لکھوا کر ان کی اشاعت کا انتظام بھی کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ موجودہ سڑکوں کی توسیع اور نئی سڑکوں کی تعمیر کے لئے تیس کروڑ چھبیس لاکھ روپے مخصوص کئے گئے ہیں

اس میزانیہ پر کسی تفصیلی تبصرہ سے پہلے یہ بات ضروری ہے کہ میزانیہ سے متعلق چند ابتدائی باتیں گوش گزار کر دی جائیں۔

حکومت کے میزانیہ کو کسی فرد کے میزانیہ پر کبھی قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ ایک فرد کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ اپنے اخراجات کو اپنی آمدنی کی وسعت کے اندر رکھے۔ بالفاظ دیگر ایک فرد چادر کی لمبائی دیکھ کر پاؤں پھیلاتا ہے لیکن حکومت کے میزانیہ کا معاملہ دوسرا ہے۔ وہ سب سے پہلے یہ دیکھتی ہے کہ اس کے حفظ و بقا۔ ترقی اور خوشحالی کے لئے کون کون سے مصارف ضروری ہیں۔ پھر وہ ان مصارف کو پورا کرنے کے لئے محاصل وصول کرتی ہے۔ آمدنی کے ذرائع تلاش کرتی ہے۔ اور اگر اسے ضرورت پڑ جائے تو اسے قرض لینے میں بھی دریغ نہیں ہوتا۔ لہٰذا خسارے کا بجٹ یا فاضل بجٹ کسی حکومت کی کامیابی اور ناکامی کی دلیل نہیں بن سکتا۔

ہمیں دیکھنا یہ ہے۔ کہ کیا حکومت کی آمدنی اور خرچ کا توازن اس طرز پر قائم کیا گیا ہے جس سے اجتماعی عدل کا حصول ممکن ہو۔ اور قوم میں خوشحالی پائی جائے۔ مختلف محصولات حکومت کی آمدنی کا ذریعہ ہیں۔ اور پھر حکومت اسی آمدنی کو مختلف شعبوں پر خرچ کرتی ہے

اس دولت کا خرچ کرنا درحقیقت دولت کا مختلف ہاتھوں میں دینا ہے۔ اگر محصولات اکٹھے کرنے کا طریق سماج میں تفاوت کو ختم کرتا ہے اور سماج کی فلاح کے لئے مفید ثابت ہوتا ہے۔ تو پھر یہ ٹیکس کی پالیسی کامیاب ہے۔ اسی طرح اگر دولت کا خرچ اجتماعی عدل میں ممد و معاون ثابت ہوتا ہے اور اس سے سماج میں دولت کی گردش بڑھتی ہے۔ اور قوم بحیثیت مجموعی خوشحال ہوتی ہے۔ تو پھر یہ مصارف سود مند ہیں۔

اس ضمن میں یہ بھی یاد رہے کہ دورِ جدید کا میزانیہ ازمنہ وسطیٰ کے میزانیہ سے بہت حد تک مختلف ہے۔ پرانے وقتوں میں اگرچہ حکومتیں محصولات کی شکل میں کافی کچھ اکٹھا کیا کرتی تھیں۔ اور پھر اسی طرح خرچ بھی کرتی تھیں مگر یافت اور خرچ کی وسعت اتنی نہیں تھی۔ اور پھر ٹیکس حاصل کرنے کے طریقے اور خرچ کرنے کے مختلف راستے اس طرح ہماری اجتماعی زندگی پر اثر انداز نہیں ہوتے تھے۔ آج حکومت کا دائرۂ اختیار وسیع ہے۔ حکومت خواہ جمہوری ہو یا اور کسی طرز کی اس کے اختیارات کی حدیں زیادہ پھیلی ہوئی ہیں۔ اس کی ذمہ داریاں زیادہ نازک ہیں۔ اور اس کی پالیسی افراد پر زیادہ اثر انداز ہوتی ہے۔ لہٰذا دنیا کی ساری حکومتیں اس حقیقت کو تسلیم کرتی ہیں۔ کہ محصولات اور مصارف کا نظام اس نہج پر مرتب کیا جائے جس سے ملک معاشی میدان میں مکمل روزگار کی سطح پر رہے۔ اور اس کے بسنے والے کسی فرد کی محنت رائگاں نہ جائے۔

اسلام نے مالیتِ عامہ میں بڑی ہی اہم تبدیلیاں کیں۔ اس نے سب سے پہلے احاطۂ اقتدار میں آئے ہوئے لوگوں پر سے محصولوں کے بوجھ میں تخفیف کر دی۔ چنانچہ دریائے نیل کا زرخیز خطہ یعنی مصر جب رومی شہنشاہیت کے پنجے میں تھا۔ تو اس کے بسنے والوں سے بحیثیت مجموعی آمدنی کا چالیس فی صدی یا اس سے بھی زیادہ وصول کر لیا جاتا تھا۔ جس کی وجہ سے کاشتکاروں کی اور دوسرے مزدوروں کی حالت سخت ناگفتہ بہ تھی۔ حضرت عمرو بن العاص نے جب مصر فتح کیا۔ تو حضرت عمرؓ کو اپنے ایک خط میں مصری کسانوں کے متعلق یہ لکھا :۔

"ایک مخلوق جس پر خدا کی مہربانی ہے۔ اور جو شہد کی مکھیوں کی طرح دوسروں کے لئے محنت اور مشقت کرتی ہے اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی سے کچھ فائدہ حاصل نہیں کرتی"۔

لیکن تاریخ شاہد ہے کہ جونہی ان علاقوں پر اسلام کی شعاعیں پڑنا شروع ہوئیں۔ تو اس سے استبداد کی زنجیریں پگھل کر گر گئیں۔ انہی بھاری محاصل سے تنگ آ کر ہی قبطیوں نے مسلمان حملہ آوروں کو خوش آمدید کہا۔ اور رومی جوا اتار پھینکنے میں مسلمانوں کی مدد کی۔ ایک انگریز مؤرخ بٹلر کے الفاظ ہیں :۔

"عرب حکمرانی نے مصریوں کو بھاری محصول سے بڑی حد تک نجات دلائی۔ اس کے علاوہ اسلام کے نقطۂ نظر سے ملک کو اندرونی اور بیرونی دشمنوں سے بچانا ہی مملکت کا اصلی مقصد نہیں کیونکہ اس پر تو خود حکومت کے وجود کا انحصار ہے۔ بلکہ اس کا یہ فرض ہے کہ وہ باشندوں کی بنیادی ضروریات کی بھی کفیل ہو۔ چنانچہ خلیفہ کے فرائض پر بحث کرتے ہوئے علمائے اسلام نے اس حقیقت کو بار بار آشکارا کیا ہے۔ مختار الکونین کی ایک عبارت " اسلام کا اقتصادی نظام" کے حوالے سے نقل کی جاتی ہے۔

"یہ بات جان لینا چاہیئے کہ انسان کی ضروریاتِ زندگی میں تین چیزیں لازمی ہیں۔ مرد ہو یا عورت سب ہی اس میں برابر ہیں۔ اس لئے کہ زندگی کی بقاء، عباداتِ الٰہی کے لئے طمانیت اور بقائے نسل ان تینوں امور سے ہی وابستہ ہیں۔ لہٰذا امام (خلیفہ) کے ذمہ واجب ہے کہ وہ ہر انسان کے لئے خواہ وہ دولت مند ہو یا غریب یا فقیر۔ مرد ہو یا عورت اس کے حالات اور ضروریات کے پیشِ نظر ان تین چیزوں کے حصول کے لئے ہر قسم کی آسانیاں بہم پہنچائے (تا ہر شخص اپنا معاشرتی اور معاشی حق پائے) اور وہ تین چیزیں یہ ہیں۔ اول

THE ECONOMICES OF FULLEMPLOYMENT BY DR. SCHUMACHER.

کھانے پینے کی سہولت، دوسری لباس کی سہولت۔ خواہ وہ صوف کا ہو یا کتان کا یا سوت کا یا کسی بھی چیز کا ہو۔ اس لئے کہ یہ دونوں چیزیں انسانی حیات کے لئے ضروری ہیں۔ اور تیسری ازدواجی زندگی کی سہولت۔ اس لئے کہ یہ بقائے نسل کے لئے ضروری چیز ہے۔"

خراج کی آمدنی کی تفصیلات پیش کرتے ہوئے مولانا مناظر احسن گیلانی ہدایہ میں سے مندرجۂ ذیل عبارت نقل فرماتے ہیں :-

"امام (حکومت) کو جو آمدنی خراج سے ہو۔ اور بنی تغلب کے مال سے جو ملے اور اہلِ حرب سے جو کچھ ہدیہ اور تحفہ کے طور پر اسلامی حکومت کو ملے۔ اور جزیہ کے ذریعے سے جو کچھ آمدنی ہو۔ یہ ساری آمدنیاں مسلمانوں کی عام ضرورتوں پر خرچ کی جائیں۔ مثلاً سرحدوں کی حفاظت۔ دریاؤں پر پُل بنائے جائیں۔ اور مسلمانوں کے قاضیوں کو ان کے عمال اور حکام وعلماء کو معاوضہ دیا جائے۔ جو ان کے لئے کافی ہو۔ اور فوجیوں کے بال بچوں کی تنخواہوں پر۔ یہی نہیں بلکہ اسلامی حکومت نے عہدِ خلافتِ راشدہ سے آخر زمانے تک صحتِ عامہ کے لئے دواخانے اور شفاخانے بھی جاری رکھے۔"

تقسیمِ دولت کے شعبہ میں اس زمانے میں حکومت کی یہ کوشش رہتی ہے۔ کہ مزدور کی ادنیٰ شرحِ اجرت کا تعین کر دیا جائے۔ تاکہ اس سے کم اجرت نہ ہو۔ اور پیدائشِ دولت سے اس کو زیادہ سے زیادہ حصہ ملے۔ اسلامی حکومت اس سے بھی آگے غریبوں۔ بے روزگاروں کی ذمہ داری لیتی ہے۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں تو باقاعدہ یہاں تک تجربے کئے گئے۔ کہ ہر شخص کتنا کھا سکتا ہے۔ اسی کے مطابق آٹا، زیتون وغیرہ دیا جانے لگا۔ اس عطا میں نہ صرف شہری ہی شریک تھے بلکہ اضلاع کے دیہاتی بھی شریک تھے۔ اس طرح اسلامی حکومت مسافروں کی امداد۔ ان کے قیام کا انتظام اور ان کے مال کی چوکسی کرتی اور مسافر خانے بنواتی تھی۔ اس کے علاوہ مقروضوں کو قرضہ دیتی تھی۔ اور انتقال کے بعد نادار مرنے پر مقروضوں کے قرضوں کی ادائی بھی کرتی نیز یتیموں اور بیواؤں کی امداد کرتی تھی۔

اس پس منظر میں اب بجٹ پر غور فرمائیں۔

اس بجٹ کو دیکھ کر سب سے پہلی چیز جو انسان محسوس کرتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس میں کسی نئی شے کا اضافہ نہیں۔ ایک پامال راستہ ہے جس پر ایک صدی سے زیادہ انگریز چلتے رہے۔ اور آج آزادی کے بعد بھی ہم اسی لکیر کے فقیر چلے آتے ہیں۔ اس میں کسی بنیادی اصلاح یا اساسی تبدیلی کا خیال ہم میں پیدا نہیں ہوا۔ اعداد وشمار میں کسی حد تک کمی وبیشی ہوئی ہے۔ مگر میزانیہ کا ڈھانچہ من وعن وہی ہے۔ اور ہمارے دل میں اس امر کی معمولی سی تحریک بھی پیدا نہیں ہوتی۔ کہ غلامی کے بندھن ٹوٹنے کے بعد اب ہم بھی کھلی فضا میں سانس لیں۔ اور آزادی کے ساتھ اپنے نفع اور نقصان کو سوچیں۔ میزانیہ کا یہ پہلو سب سے زیادہ حوصلہ شکن ہے۔ میاں ممتاز دولتانہ اپنی ذہانت کے باوجود کسی نئی راہ کو اختیار کرنے کے لئے تیار نہیں۔ انھیں اس فرسودہ میزانیہ کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ اس سارے بجٹ میں آمدنی کے ذرائع بالکل وہی ہیں۔ اخراجات کی مدیں ویسی کی ویسی ہیں۔ اس سلسلے کی دوسری کڑی یہ ہے کہ یہ میزانیہ اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ حکومت چند جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے مفاد کے لئے قائم ہے۔ ان کا منشا ان کی خوشحالی ہے۔ اس کا مطمحِ نظر اس کو ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچانا اور ان کی بہتری کے لئے کوشاں رہنا ہے۔ عوام کو اس بجٹ میں یکسر نظر انداز کر دیا جائے۔ اور یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کہ حکومت چند خوش نصیبوں کے لئے ہی قائم ہے۔

اب ایک ایک مد کو لیجئے :-

؎ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو کتاب الاموال باب اجراء الطعام علی الناس من الفئ۔

نظم و نسق کے سلسلہ میں سب سے زیادہ پولیس پر خرچ کیا گیا ہے یعنی سال رواں میں پولیس پر ۲۳۳۲۵۳۰۰ روپیہ صرف کیا جائیگا اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر پولیس پر اتنا کیوں خرچ کیا جا رہا ہے۔ حکومت کی طرف سے اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ صوبے کے انتظام و انصرام کو بہتر بنانے کے لئے! بظاہر یہ بڑا ہی معقول جواب ہے لیکن اس وقت ہمارے سامنے غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ آخر صوبے کا نظام کیوں بگڑا ہوا ہے۔ رشوت کی کیوں گرم بازاری ہے۔ قتل و غارت کی واردات میں آخر کیوں اضافہ ہوا ہے۔ بلیک مارکیٹ کیوں بند نہیں کی جا سکتی غور کیا جائے۔ تو معلوم ہوگا ان مفاسد کی ذمہ داری خود حکومت کے کارندوں پر عائد ہوتی ہے۔ دھڑے بندیوں کی بنا پر ہر گروہ اپنے ہاتھ مضبوط کرنے کے لئے اپنے ساتھیوں کو ہر طرح خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ان کی خوشی کے لئے خواہ انھیں کتنی ہی ناجائز سے ناجائز حرکت کرنی پڑے مگر وہ اپنے رفقاء کی ناراضگی کو گوارا نہیں کر سکتے۔ کیونکہ یہ انھیں کے دم قدم سے اقتدار پر فائز ہیں۔ چنانچہ حکام پر ہر طرف سے دباؤ ڈالا جاتا ہے۔ ان کو بد دیانتی پر اکسایا جاتا ہے۔ اور اگر ضرورت آن پڑے تو ڈرا دھمکا کر مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ حق و انصاف، صداقت اور راستی کی راہ کو چھوڑ کر ناانصافی اور ظلم کے راستے اختیار کریں۔ اور اگر کوئی اتنا سخت جان ہو کہ ضمیر کی آواز پر ان کی بات سننے سے انکار کر دے تو اس پر استبداد کی بجلی گرائی جاتی ہے۔ اس کو خود اس کا سبق دیا جاتا ہے کہ وہ دھڑے بندی میں ایک فعال رکن کی حیثیت سے شریک ہو کیونکہ ترقی اور تنزل کے لئے یہی معیار ٹھیرایا گیا ہے۔ جہاں حالات اس قدر دگرگوں ہوں وہاں اس بات کی توقع کرنا کہ پولیس کے اضافہ سے صوبے کا انتظام بہتر ہوگا، ایک حکایتِ تشنہ سراب سے کسی طرح کم نہیں۔ جس صوبے کا حال یہ ہے کہ ایمانداری محنت اور دیانت ایک منفی قابلیت سمجھی جائے۔ جہاں بے ایمانی۔ دجل۔ جھوٹ اور فریب ترقی کے زینے ہوں وہاں صرف پولیس کا بڑھانا اس آگ کو ہوا دینے والی بات سے کسی صورت مختلف نہیں۔ انتظام کی درستی کے لئے تو یہ ضروری تھا کہ حکومت اخلاقِ عامہ کی اصلاح اور عوام کی ذہنی تربیت کے لئے ایسے انتظامات کرتی جس سے لوگوں میں سچی خدا پرستی اور خدا ترسی پیدا ہو۔ اپنی اخلاقی اور اجتماعی ذمہ داریوں کا احساس پیدا ہو۔ نیکی اور بھلائی کے کاموں میں تعاون اور برائی کے کاموں میں عدمِ تعاون کی اسپرٹ پیدا ہو۔ قانون کے احترام کا جذبہ اور اجتماعی مفاد کا درد پیدا ہو۔ اور عوام الناس اس قابل ہو سکیں کہ برائیوں کے انسداد اور بھلائیوں کی ترویج ہو۔ اجتماعی فرائض کی ادائیگی کا دار و مدار محض قانونی جبر پر نہ رہے۔ بلکہ لوگوں کا اخلاقی حس ان کاموں کے لئے کافی ہو۔ سارے بجٹ کو اٹھا کر دیکھ لیجئے کیا اس کام کے لئے ایک دمڑی کی گنجائش بھی اس میں رکھی گئی ہے۔ اس سلسلہ کی ساری خدمات محکمۂ اسلامیات کے جاری رکھنے کا فیصلہ ہے۔ مگر یہ محکمۂ اسلامیات کیا ہے۔ اس سے دین کی کیا خدمات لی جائیں گی۔ اس سے لوگوں کے اندر اسلامی اخلاق پیدا کرنے کا کس طرح کام لیا جائے گا۔ یہ ایسا راز ہے جس کے چہرے سے آج تک پردہ نہیں اٹھ سکا۔ زیادہ سے اتنا بتایا گیا ہے کہ احادیث و فقہ کی کتابوں کو شائع کر کے طالبانِ علوم کے لئے آسانیاں بہم پہنچائی جائیں گی، نیز یہ کہ علما اور مفکرین اسلام سے مسائل حاضرہ پر مضامین لکھوا کر بھی یہ محکمہ انھیں اخباروں میں شائع کرتا رہے گا۔

اب اگر اس محکمہ کا مقصد اسلامی اصولوں پر معاشرے کی تشکیل ہو تو یہ مقصد اس رقم کے صرف کئے بغیر بھی حل ہو سکتا ہے۔ حکومت کے سارے محکمے اگر حکومت کی خواہش ہو تو محکمہائے اسلامیات کا فریضہ انجام دے سکتے ہیں۔ محکمہ تعلیم۔ محکمۂ قانون و عدالت۔ محکمہ پولیس اور دوسرے سارے محکمے معاشرے کو اسلامی اصولوں پر قائم کرنے کے لئے کام کریں۔ اگر دوسرے تمام محکمے غیر اسلامیات کے محکمے ہوں تو محض ایک محکمۂ اسلامیات کا اضافہ بالکل بے معنی ہے اور اس سے قوم کو الو تو بنایا جا سکتا ہے۔ لیکن اسلام کی کوئی خدمت نہ ہو سکے گی۔ اور یہ رقم بے جا صرف ہوگی۔

لہٰذا پولیس کے اضافہ کے بجائے حکمران طبقہ کو یہ فیصلہ کرنا چاہئے کہ کیا وہ حق و انصاف پر قائم رہنا چاہتا ہے۔ کیا وہ انتظام کے کاموں میں بے جا مداخلت سے باز کرنے کو تیار ہے۔ کیا وہ نیکی اور بھلائی کو سہارا دینے کا عزم رکھتا ہے اور بد دیانتی اور

(بقیہ صفحہ ۳۴)

محض تفنّن

پنج بنائے پاکستان

نعیم صدیقی

اسلام کی بنائیں پانچ ہیں اور یہ پورا نظام انھی پانچ ارکان پر کھڑا ہوتا ہے —— اسلام ہی پر منحصر نہیں، ہر مذہب کا حال یہی ہے، مثلاً سکھ دھرم بھی پانچ "ککوں" کے بل پر کھڑا ہوتا ہے۔ پانچ ککوں سے مراد ہوتے ہیں پانچ "ک" یعنی ایک کاف کیس کا، دوسرا کاف کرپان کا، چوتھا کاف کلچھے کا، پانچواں کاف کنگھے کا۔ عیسائیوں نے خواہ مخواہ تحریف کر کے پانچ کو تین کر دیا، ورنہ اس تین پانچ کرنے سے اگر وہ باز آجائیں تو ارکان وہاں بھی پانچ ہیں۔ خدا، روح القدس، عیسیٰ، صلیب، اور پادری۔ ٹھیک اسی اصول پر شیعہ اصحاب نے بھی پنج تن پاک کی محبت کو سامانِ نجات قرار دیا اور کسی طرح "چار یاروں" کا احترام کرنے پر تیار نہیں ہیں، کیونکہ "چار" کا عدد کسی کام کا نہیں۔ مذہب تو مذہب انسان کے حسّی علم کے دروازے بھی پانچ ہیں ہمارے اوقاتِ نماز بھی پانچ ہیں۔ اور پھر دیکھئے کہ آپ کا یہ محاورہ بھی اسی کا ثبوت دیتا ہے ....

کہ بس "پانچ منٹ" میں یہ کرتا ہوں، اور پانچ منٹ میں آتا ہوں۔ یعنی ہر کام کے ارکان کسی نہ کسی طرف سے پانچ ہوتے ہیں۔ اسی لئے تو ماہرین نے گھڑی کے ڈائل پر پانچ منٹ کے ٹکڑے بنائے ہیں۔

یہی اصول تھا جس کی وجہ سے بالکل فطری طاقتوں کے زیرِ اثر پاکستان پانچ صوبوں سے بنا اور اسے کشمیر سے بھی اسی کی وجہ سے محروم ہونا پڑا کہ کہیں وہ چھ صوبوں کا ملک نہ بن جائے۔ مگر یہاں ہم جغرافیہ نہیں بیان کر رہے ہیں۔ یہاں ہم بڑے اہم اصولوں پر بحث کر رہے ہیں پاکستان کا وجود اصولاً جن ارکان پر قائم ہے اور جن کے ذریعے مضبوط ہو سکتا ہے وہ بھی پانچ ہیں۔

فلسفیانہ پن کی ثقالت سے بچنے کے لئے ہم ان پانچ ارکان کو پانچ کرداروں میں ڈھال دیتے ہیں۔ اور ان کرداروں کے فرضی نام بھی رکھ لیتے ہیں۔ یعنی گاما، مہاجا، ساجا، چھیدا اور رتا جا۔

نوٹ:- یہ لاہوری نام اس لئے انتخاب کئے گئے ہیں کہ پنجاب پاکستان کا سینہ ہے اور لاہور اس کا دھڑکتا ہوا دل ہے۔ اس لئے لاہور کے لوگ ہی پورے پاکستان کی نمائندگی کے لئے موزوں ہو سکتے ہیں۔

گاما اس روز سے جس روز سے پاکستان کی تقسیم ہوئی ہے برابر اس بات کے لئے بے چین ہے کہ پاکستان کے اپنے فلم اسٹوڈیو اور آرٹ کے مراکز زیادہ سے زیادہ تعداد میں ہونے چاہئیں۔ اس ترقی پسند جوان کے خیال میں پاکستان کو مسجدوں کی اتنی ضرورت نہیں ہے جتنی ناچ گھروں اور گانوں کے مدرسوں اور آرٹ سوسائٹیوں کی ہے —— کیونکہ مسجدوں میں سوائے اس کے اور ہوتا کیا ہے کہ کوئی ملّا پانچوں وقت محلے کے بوڑھوں، ان پڑھوں اور بے کاروں کو اٹھک بیٹھک کرا دے اور ہفتے میں ایک دن منبر پر کچھ کرتب دکھا دے۔ اور اس کے عوض میں ہر گھر سے ایک روٹی، مہینے کا وظیفہ اور جنازے کی جنس وصول کرے —— پس گاما کہتا ہے کہ جس روز ہماری اپنی فلمیں بننے لگیں گی، ہمارے ہاں گانے بجانے اور ناچنے کا زور شور ہو گا اسی روز اصلی پاکستان بنے گا۔

مہاجا پاکستان بننے کے بعد سے دن رات اس مقصد کے پیچھے پڑا ہوا ہے کہ کسی طرح عورتوں کا پردہ اتروا دیا جائے۔ وہ سڑکوں پر پھریں، پارکوں میں ٹہلیں، کلبوں میں ناچیں، دعوتوں میں مسکرائیں، جلسوں میں ابھریں، وزیروں کو سلامیاں دیا کریں، ریڈیو پہ گائیں، ہیرا ہوں

میں کبڈی کھیلیں، دفتروں میں نوکری کریں، آزادی کی تقریب منائی جائے تو ون بھنگڑا دکھائیں، کوئی غیر ملکی آئے تو اس کے استقبال کے لئے پریڈیں کریں، اعلیٰ مقاصد کے لئے چندہ کرنے کو مینا بازار لگائیں اور ڈرامے کھیلیں۔ زندگی میں ایک گرما گرمی پیدا کردیں۔ قوت مضبوط ہو سکتی ہے تو صرف اس طریق سے ہو سکتی ہے اور قوم قوم بن سکتی ہے تو اس کا راستہ یہی ہے۔

ساجا کچھ اور ہی سوچتا ہے۔ وہ پاکستان کے بقا و استحکام اور اس کی ترقی کی تیز رفتاری اور امن و امان کا بنیادی تقاضا یہ مانتا ہے کہ وزیروں کے خلاف کوئی آواز بلند نہ ہو۔ حقوق تربیت ختم کردیئے جائیں۔ کوئی اخبار نہ نکلے، کوئی جلسہ اور تقریر نہ ہو، کسی ادیب کو لکھنے کا حق نہ دیا جائے اور کوئی لکھے بغیر نہ رہے تو اس کے ہاتھ قلم کردیئے جائیں۔ ایک قانون بنا کر یا سیفٹی آرڈی ننسوں اور سیفٹی ایکٹوں میں ایک ہی دفعہ کا اضافہ کرکے ساری اپوزیشن پارٹیوں کو خلافِ قانون قرار دے دیا جائے ــــــ تاکہ صرف "واحد نمائندہ" جماعت باقی رہ جائے ــــــ انتخابات قطعی طور پر بند کردیئے جائیں۔ اگر جمہوریت کی شرط ہی پوری کرنی ہو تو پانچ سال بعد شہر بہ شہر اور قریہ بہ قریہ انتخاب کا ایک فلم دکھا دیا جایا کرے۔ اس کام کے لئے حکومت کے محکمۂ تعلقاتِ عامہ کے تحت چند ٹورنگ سینما قائم کردینے کافی ہوں گے۔ اسی طرح اسمبلیوں اور پارلیمنٹ اور دستور یہ میں تجاویز اور بلوں پر بحث کرنے کو از روئے قواعد ناجائز ٹھیرا دیا جائے۔ تجویز محض قرأت سے ہی پاس ہو جائے۔

اس طرح کوئی گڑبڑ نہ رہے گی، کوئی ہنگامہ، اختلاف نہ ہوگا، پبلک کے سامنے کوئی کائیں کائیں نہ کرے گا، اخبار پڑھنے پر لوگوں کا وقت ضائع نہیں ہوگا، جلسوں کے ذریعہ کسی طرح کا ذہنی انتشار برپا نہیں ہوگا۔ لوگ آرام سے اپنا اپنا کام کریں گے اور رموزِ مملکت کو خسروان خود سمجھتا رہے گا۔ باتونی پن کے بجائے عمل بڑھ جائے گا، اختلاف ختم ہو کر وحدت برپا ہو جائے گی، سست رفتاری تیز رفتاری میں بدل جائے گی اور پاکستان بہت جلد مضبوط ہوگا۔

چھیدے کے سامنے ایک اور ہی مسئلہ ہے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ پاکستان کو امریکہ سے زیادہ سے زیادہ مالی امداد حاصل کرنی چاہئے۔ مالی امداد ہی نہیں، وہاں سے ماہرین بھی لینے چاہئیں اور مشینیں اور دوسری ضروریات بھی حاصل کرنی چاہئیں۔ ڈالر کا خوان یغما لُٹ رہا ہے اور اس کو لُٹتے دیکھ کر خاموش بیٹھے رہنا بے وقوفی ہے۔ ہمارے امریکی سفیروں اور وزارتِ خارجہ کو چاہئے کہ وہ اچھے سے اچھے لفظوں میں ٹرومین کی خوشامد کریں، آخر مطلب کے لئے آدمی گدھے کو باپ کہہ دیتا ہے۔ خوشامد ہی نہ کریں، بلکہ امریکی بلاک میں شامل ہو جائیں اور پاکستان میں جنگ کے لئے اڈے بنانے کا معاہدہ بھی کر ڈالیں۔ محض "آزادی" کے لفظ کو لے کر چاٹتے رہنے سے تو ترقی نہیں ہوتی۔ اڑوس پڑوس کے ممالک اس معاملے میں بہت آگے بڑھ گئے ہیں، حالانکہ آزادی ان کو بھی عزیز ہے۔ چھیدے کی خواہش اب کچھ پوری کی جانے لگی ہے اور اب وہ خوش ہے کہ آخر اکابرِ مملکت کو وہی کرنا پڑا جو اس نے سوچا تھا۔ وہ اب اپنے آپ کو بڑا سیاست دان سمجھتا ہے۔ مگر ابھی وہ پوری طرح مطمئن نہیں ہوا کیونکہ دل کھول کر بھیک نہیں مانگی گئی اور دامن اچھی طرح نہیں پھیلایا گیا۔

تاجا سب سے الگ سوچتا ہے۔ اس کی خواہش یہ ہے کہ اس سرزمین میں سُرخ جھنڈا لہرانا چاہئے۔ پھر یہاں ایک خونی ہنگامہ ہونا چاہئے، لوگ اچانک ایک صبح کو گھروں سے نکل کھڑے ہوں، کدالیں اور برچھیاں اور درانتیاں اور ہتھوڑے اور ہل ان کے ہاتھوں میں ہوں اور وہ پاگل ہو جائیں، پھر جو ان کے سامنے آئے وہ اس پر حملہ آور ہو جائیں، عمارتوں کو آگ لگا دیں، باغوں کو اجاڑ دیں، دکانوں اور بنکوں اور گھروں کو لوٹ لیں، خون کی ندیاں بہیں ــــــ اور اتنے میں یکایک درۂ خیبر سے اور کشمیر کے راستے تبت کی سرحد سے امن کے دیوتاؤں کا لشکر داخل ہو اور وہ اپنی تلواروں سے یہاں کی دنیا بدل ڈالے۔ مزدور کارخانوں کے اور کسان زمینوں کے اور کلرک دفتروں کے اور چپراسی بنکوں کے اور کلینر اور کنڈکٹر اور کاروں کے اور سنیم کاروباروں کے مالک بن جائیں۔ یہ واقعہ جسے تاجے کی نگاہ میں کبھی نہ کبھی دن چھڑکے رہنا ہے اگر بروقت نہ ہوا تو پاکستان کیا ہو جائے گا ــــــ اس کے بغیر پاکستان پاکستان ہی نہیں۔

پاکستان کے یہ "پانچ ارکان" کوئی معمولی لوگ نہیں، یہ پروفیسر بھی ہیں، ٹھیکیدار بھی ہیں، وکیل بھی ہیں، ڈاکٹر بھی ہیں، مولوی بھی، ادیب اور شاعر بھی ہیں، سیاسی، لیڈر اور کارکن بھی ہیں۔ اور پاکستان میں جو کچھ ہو رہا ہے ان کے دم قدم سے ہے۔ یہ آپس میں حد درجہ کا اختلاف بھی رکھتے ہیں اور پھر ان میں حد درجہ کا اتحاد بھی ہے۔ ان کے کردار اپنی مستقل نوعیتیں رکھتے ہیں لیکن ان کے پیکر ہزار در ہزار ہیں اور یہ ہر صوبہ، شہر، گاؤں اور گلی کوچے میں، گاڑی کے ہر ڈبے میں اور بسوں اور تانگوں میں، ہوٹلوں اور قہوہ خانوں اور کافی ہاؤسوں میں دکھائی دیتے ہیں۔ پاکستان انھی کے بل پر قائم ہے بلکہ پاکستان انھی کا نام ہے۔

کچھ بے وقوف لوگ ایسے بھی ہیں جو ان کے منہ آتے ہیں اور ان کا زور توڑنے کے لئے خواہ مخواہ ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ یہ اپنی قدامت پرستی اور رجعت پسندی کی وجہ سے یوں سوچتے ہیں پاکستان سے رشوت اور خیانت دور ہو جائے، غریبوں کے حقوق ادا ہونے لگیں، تعلیم اور صحت کے انتظامات ہمہ گیر ہو جائیں، انصاف کی ترازو ٹھیک ٹھیک ہو اور انصاف مفت ملنے لگے، غیر ملکی اثرات کا خاتمہ ہو جائے، آزادی ہو تو بیرونی زنجیروں سے اس کے ہاتھ پاؤں جکڑے نہ رہیں، نمائشی مظاہرات کے بجائے تعمیرِ اخلاق پر توجہ دی جائے، مغرب کی گندگیوں سے پرہیز کیا جائے، عورت کو عائشہ اور فاطمہ کے نمونے پر اٹھایا جائے ——— اور ہر طرف اسلامی نظامِ زندگی لہریں لینے لگے!

لیکن ان کی کون سنتا ہے۔ پاکستان کو پانچ ارکان چاہئیں، اس چھٹے رکن کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔ اس لئے گاما، فہما، جاہا، بہا، چھیدا اور تاجا سبھی ان کی طفلانہ تجویزوں اور حرکتوں کا مذاق اڑاتے ہیں اور وہ خوب سمجھتے ہیں کہ یہ خود ختم ہو جائیں گے۔

—— + ——

چند ضروری امور ——— !

آئندہ شمارہ

● آئندہ شمارہ ایک ہی مضمون "اشتراکی جنت میں جبری محنت" پر مشتمل ہوگا۔ یہ مضمون ترجمہ و تلخیص ہے ایک تازہ کتاب فورسڈ لیبر ان رشیا (FORCED LABOUR IN RUSSIA) کا جو پروپیگنڈہ کی نوعیت نہیں رکھتی بلکہ ایک محققانہ تالیف ہے۔ یہ کتاب ڈیوڈ، جے، ڈلین (DAVID, J. DALLIN) اور بورس، آئی، نکولاوسکی (BORIS, J. NICOLAEVSKY) کے قلموں سے ہے۔[1]

ترجمہ و تلخیص کا کام ہمارے رفیق پروفیسر عبدالحمید صاحب ایم، اے کر رہے ہیں۔

● پروفیسر حامی منیائی چراغِ راہ کے شعر نمبر پر تفصیلی تبصرہ لکھ رہے تھے۔ اس کی ایک قسط گزشتہ شمارے میں شائع ہوئی ہے۔ لیکن دوسری قسط اپریل نمبر کے لئے اب تک موصول نہیں ہوئی، اور مئی کے شمارے میں اس کی اشاعت ممکن نہیں، لہٰذا ناظرین اسے جون نمبر ہی میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

● اس دوران میں متعدد مضامین اور نظمیں اشاعت کے لئے منتخب کی جا چکی ہیں، لیکن اب بمجبوری ان سب کو جون نمبر کے لئے معلق کرنا پڑا ہے۔ ہمارے قلمی معاونین ہمیں معاف کرنے میں بخل نہیں کریں گے۔

● چراغِ راہ کے مرتب کے نام آئے ہوئے خطوط کا ایک انبار دفتر میں پڑا ہے۔ اس میں متعدد فوری جواب طلب خطوط بھی ہیں مگر افسوس کہ راقم الحروف اپنی اور بچوں کی بیماری کے چکر میں ایک عرصے سے مبتلا ہے اور پھر اس حالت کے علی الرغم بعض فرائض کی انجام دہی بالکل ناگزیر ہے۔ ان حالات میں خطوط پر بالکل توجہ نہیں دی جا سکی۔ انشاء اللہ موقع پاتے ہی اس بارِ فرض سے سبکدوش ہونے کی کوشش کروں گا۔

[1] اس اشاعتِ خاص کو اگر ایجنٹ صاحبان زیادہ تعداد میں منگانا چاہیں تو دفتر کو مطلع کریں۔

ترقی پسند ادب کا جائزہ

(اسلامی نظریۂ ادب کے تحت)

عماد الحق صدیقی

پچھلے دنوں ہمارے ملک میں جس ادب نے ترقی کی وہ ترقی پسند ادب تھا لیکن اب پاکستان میں اس کی رفتار رک گئی ہے یہاں اس کے بڑھنے کے مواقع ہر طرف سے بند نظر آرہے ہیں البتہ یہاں دن بدن ایک نیا ادب جنم لے رہا ہے اگرچہ ابھی یہ عہد طفولیت میں نظر آتا ہے لیکن اس کے اثرات ہر طرف پھیلتے نظر آرہے ہیں اور ترقی پسند ادب بھی عمر رسیدہ ہونے کے باوجود اس سے سہما ہوا نظر آرہا ہے اس ادب کو اسلامی ادب یا تعمیر پسند ادب کہا جاتا ہے۔ اسلامی نظریۂ ادب اور مکتبِ ادب پر اظہارِ خیال کرنے کو ہم مؤخر کرکے اس وقت اسلامی نظریۂ ادب کو ذہن میں رکھ کر ترقی پسند ادب کا ایک عام جائزہ لینا چاہتے ہیں۔

پچیس تیس سال قبل جب ترقی پسند ادب نے جنم لیا تو اس نے پرانے ادب کو زندگی کی کچھ قدروں سے روشناس کرایا اور یہ دعویٰ کیا کہ ادب صرف خوبصورتی پیدا کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ اگر اس میں زندگی نہ پائی جائے تو وہ ادب بیکار ہے اور ادب برائے ادب ایک لغو و بے معنیٰ بات ہے ادب برائے ادب کے بجائے ادب برائے زندگی ہونا چاہیئے اگرچہ خود ان کے ادب میں زندگی سوز قدریں شامل ہیں جن کا انھیں دوسروں سے گلا ہے البتہ انھوں نے پچھلی بہت سی زندگی سوز قدروں کو جن کو سماج میں ہچکچاہٹ کے ساتھ قبول کیا جا رہا تھا فخریہ اور اعلانیہ قبول کیا اور بہت سی نئی تباہ کن اقدار کا اضافہ کیا۔ یہ ضرور ہے کہ ان کی پشت پر ایک مادی فلسفہ ہے جو قدما کے پاس نہ تھا۔

جو چیز ہم کو ترقی پسند ادب میں واضح نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کے ادیب روس کے ذہنی غلام اُس کے بہترین مبلغ اور اشتراکیت کے علمبردار ہیں جس کے نتیجے میں خدا سے بغاوت اور اخلاقی قدروں کی تباہ کاری ان کے ادب کا لازمی جزو ہے۔ اس ادب کی فطری ساخت ایسی ہے کہ انسان اور انسان کے درمیان مستقل جنگ کی تبلیغ جس میں عام انسانوں کو بھوک کا نعرہ لگا کر ہر قسم کی اخلاقی پابندی سے آزاد کرا کے راہ روی کے لئے آمادہ کیا جاتا ہے۔ اس ادب میں زندگی تمام کی تمام معدہ کی بھوک اور جذبۂ شہوت کے گرد گھومتی نظر آتی ہے۔

احتشام حسین رضوی کہتے ہیں:-

"ہندوستانی ترقی پسندی تحریک، دنیا میں ترقی پسندی کی تحریک اشتراکیت کے پرچار اور فاشزم کے خلاف تمدنی اور ادبی محاذ قائم کرنے کی عام تحریک کا ایک حصہ ہے اسے ان تحریکوں کی جزوی حیثیت سے سمجھنا چاہیئے۔"

کرشن چندر لکھتے ہیں:-

"وقت آگیا ہے کہ ہر ادیب کھلم کھلا اشتراکیت کا پروپیگنڈا شروع کردے، کیونکہ ہمارے سامنے دو ہی راستے ہیں، آگے بڑھتی ہوئی رواں دواں اشتراکیت یا ساکن وجامد موت۔"

ابھی کچھ عرصہ ہوا عبادت بریلوی نے ترقی پسندوں کی بدنامی کو دور کرنے کے لئے لکھا تھا کہ اس ادب کے لئے ضروری نہیں ہے کہ صرف اشتراکی نظریات رکھنے والے ہی اس کے ادیب شمار ہوں لیکن اس پر عصمت چغتائی نے نہایت ناراضگی کے ساتھ صاف صاف جواب دیا کہ جب ہمارے نظریات اشتراکی ہیں اور ہمارے ادب کی اقدار اشتراکی ہیں تو ہمیں حقیقت کے اظہار میں ہرگز نہیں شرمانا چاہیئے۔ جب ہم کلمہ اشتراکیت کا پڑھتے ہیں تو اشتراکی

کہلانے سے گریز کرنے کا کیا مطلب ہے۔

کرشن چندر اپنے افسانے سفید جھوٹ میں روس کا پراپیگنڈہ کس صفائی سے کرتا ہے :-

"اب تانگہ والا لڑکیوں کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا اس کا سر جھکا ہوا تھا اور وہ کسی گہری سوچ میں محو تھا یکایک ایک ضمیمہ بیچنے والے کی تیز آواز نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

"روسی پولینڈ میں جاگیرداروں کی زمین ضبط ہو گئی، امیر آدمی قید کر دیئے گئے ہر ایک کسان کو پانچ ایکڑ زمین اور ایک گائے مفت۔ قیمت ایک پیسہ۔ تانگے والے کا چہرہ روشن ہو گیا۔ رخساروں پر خون کی جھلک دکھائی۔ دینے لگی اس نے ایک پُر وقار طریق پر اپنے سر کو جنبش دی اور کہا آپ نے سنا صاحب!"

یہ الفاظ تانگے والا اس شخص کو کہتا ہے جس نے اس سے پہلے روس کی مخالفت مذہب کے نام پر کی تھی اور اسی طرح اس کو سفید جھوٹ کہتا تھا۔" اس کی آواز میں ایک چابک کی سی درشتی تھی شعلے کی لپک اور زہریلے بچھو کا خطرناک ڈنک۔ مجھے اپنے گلے میں ٹائی کی گرہ پھانس بن کر چبھتی ہوئی محسوس ہوئی اور چہرے پر سے خون اڑتا ہوا معلوم ہوا میں نے تانگے کو ٹھیرا کر اسے پانچ آنے دیئے اور تانگے سے اتر گیا۔

ضمیمے والا چلا چلا کر کہہ رہا تھا" پانچ ایکڑ زمین اور ایک گائے صرف ایک ضمیمہ باقی رہ گیا ہے قیمت ایک پیسہ صرف "ایک پیسہ"

دو مزدور عورتیں ٹوکریاں اٹھائے چلتی چلتی کھڑی ہو گئیں اور اس کی آواز کو سننے لگیں ان کے چہروں سے معلوم ہوتا تھا کہ

"آواز کے سحر سے ان کی روحیں بیدار ہو رہی ہیں اور صدیوں کے دھندلکے اڑے جا رہے ہیں" روسی پولینڈ میں سب امیر قید کر دیئے گئے"

اور اس قسم کی تحریروں سے ترقی پسند ادیب مسلسل روس کا پراپیگنڈہ کرنے میں مشغول ہیں۔ افسانہ، نظم، ڈرامہ، غرضکہ ادب کی ہر صنف سے روس کی تبلیغ کی جا رہی ہے۔

اب ذرا نظم ملاحظہ ہو

ساحر اپنی ایک نظم "طلوعِ اشتراکیت" میں کہتا ہے :-

روندی کچلی آوازوں کے شور سے دھرتی گونج اٹھی ہے
دنیا کے انیائے نگر میں حق کی پہلی گونج اٹھی ہے
آج پرانی تدبیروں سے آگ کے شعلے تھم نہ سکیں گے
ابھرے جذبے دب نہ سکیں گے اکھڑے پرچم جم نہ سکینگے

محی الدین ایک نظم میں کہتا ہے ——— !

صفِ اعدا کے مقابل میں ہمارا رہبر
اسٹالین
مادرِ روس کی آنکھوں کا درخشاں تارا
جس کی تابانی سے روشن ہے زمیں
میرے نغمے تو وہاں گونجیں گے
ہے مرا قافلہ سالارِ جہاں اسٹالین

ظہیر کاشمیری کہتے ہیں :-

آج یورال کی سبز پہنائیوں سے نیا آدمی کسمساتا اٹھا
اس نے پیغمبرانہ متانت سے توپوں، بموں اور دھماکوں کی تحقیر کی،
آج تاتار و چیھوں کی سرحدیں مل گئیں۔
آج کاکیشیا اور بکیشریا، کشت زاروں میں تبدیل ہونے لگے
آج باشندگانِ سمرقند احیائے الفت کی تدبیر کرنے لگے
ٹنڈرہ کی برودت زدہ چوٹیوں پر وہ جلوے سرِ عام دیکھے گئے
جو پرانے زمانے کے نبیوں کے سینوں میں دیکھے گئے تھے۔

ابنِ انشا کہتے ہیں :-

اب بخارا و سمرقند کی راہوں سے نسیم
لایا کرتی ہے دمِ صبح بہاروں کا پیام
اور ہر پھول سے کہہ جاتی ہے چپکے چپکے
تم جو چاہو تو بدل سکتا ہے گلشن کا نظام
تم کو آدم کے مقدر کو جگانے کے لئے
بابل و ہند کے جادو نہ جگانے ہوں گے
اپنی اس جنتِ گم گشتہ کو پانے کے لئے
مصر و بغداد میں کیوں بنانے ہوں گے

اور سلام مچھلی شہری :-

سُرخ فوجوں کے جوانوں کو سلام اور ان سُرخ نشانوں کو سلام
جو زمانے میں نمایاں ہو کر خون کے روپ میں رقصاں ہو کر
اونچے ہوتے ہی چلے جاتے ہیں آج کس شان سے لہراتے ہیں
سُرخ فوجوں کے جوانوں کو سلام

کیفی اعظمی سے سنئے :-

ہماری قوتوں کا پوچھنا کیا ہماری پشت پر ہے ایک دُنیا
ہمارے ہاتھ میں ہے لال جھنڈا یہ جھنڈا جس کو ہم اونچا کریں گے
ہٹو میدان میں ہم آرہے ہیں

جاں نثار اختر نے یوں راگ الاپا ہے :-

حریت کی پاسباں زندگی کی رازداں
جنگ جو جری جواں ایک سُرخ کہکشاں

یہ کماں یہ نشاں　　بلند ہو رہا ہے گل جہاں
جھک رہا ہے آسماں　　مرغ فوج ہے رواں

عارف عبدالمتین اپنی ایک نظم "لینن کے حضور میں" کہتے ہیں :-

عظیم باپ! عظیم انقلاب کے رہبر
تو آج ہم میں نہیں، ترا سایہ ہم پہ نہیں
مگر تری فلک آثار روح نے ہم کو
وہ عزم بخشا ہے جس کی اساس غم پہ نہیں

ترے ارادوں کی تکمیل اپنا ایماں ہے
لپک رہے ہیں فقط تجھ سے لو لگائے ہوئے
تری حیات کی جہد جنوں فزا کی قسم
رکے ہیں اور نہ رکیں گے قدم بڑھائے ہوئے

قارئین کو مندرجہ بالا تحریروں سے اچھی طرح اندازہ ہوگیا ہوگا کہ ترقی پسند مصنفین کس بری طرح روس کی ذہنی غلامی میں مبتلا ہیں اور کس دلیری سے اس ملک میں بھی روس کی تبلیغ کر رہے ہیں ——— جو ملک روس و امریکہ سے ہٹ کر اپنا ایک پروگرام رکھتا ہے اور اس کے قیام کے لئے اس میں جدوجہد جاری ہے۔

اس ادب کی دوسری کوشش یہ ہے کہ خدا و مذہب کے تصور کو مٹا دیا جائے اور اس طرح نہ صرف ہر اخلاقی بے راہ روی کے لئے ہی راستہ کھل جائے بلکہ ہر قسم کے ناقابل برداشت خیالات کو مسلمانوں میں عام کیا جاسکے، اور یہ خصوصیت ان کے ادب میں اتنی اہمیت رکھتی ہے کہ جو ادیب بھی اس قسم کے خیالات نہ رکھتا ہو وہ رجعت پسند ادیب ہے، وہ ترقی پسندوں کے دائرے میں شامل نہیں ہوسکتا۔ جوش ایک جگہ کہتا ہے" ترقی پسند ادب مردانہ وار اس کا ذکر کرتا ہے کہ وہ معروف خدا اور مذہب کے معروف تخیل کے خلاف آواز ضرور بلند کرتا ہے۔"

انجمن ترقی پسند مصنفین لاہور میں ۱۲۔ فروری ۱۹۴۹ء کو ظہیر کاشمیری نے اپنی نظم "جمہور" پیش کی جس پر حسب ذیل تبصرہ ہوا۔

صادق منصور: نظم اپنے حسن و جمال میں بے نظیر ہے لیکن اس میں دہریت کا پرچار کیا گیا ہے جو ادب عالیہ کی اسپرٹ کے خلاف ہے۔

طفیل احمد: پرانے فرسودہ خیالات اور مروجہ نظام تصورات سے بغاوت ہی ادب عالیہ کا سب سے بڑا خاصہ ہے اور اس نظم کی یہی قدر ہے۔

مجاز اپنی ایک نظم "خواب سحر" میں کہتا ہے :-

مہر صدیوں سے چمکتا ہی رہا افلاک پر
رات ہی طاری رہی انسان کے ادراک پر
عقل کے میدان میں ظلمت کا ڈیرا ہی رہا
دل میں تاریکی دماغوں میں اندھیرا ہی رہا

اس کے بعد وہ انبیا و خدا سب کی شدت کے ساتھ توہین کرتا ہے اور میٹھے طنز کے ساتھ مناصب کے خلاف اپنی پوری پوری نفرت کا اظہار کرتا ہے :-

ابن مریم بھی اٹھے موسائے عمراں بھی اٹھے
رام و گوتم بھی اٹھے، فرعون و ہاماں بھی اٹھے
اہلِ سیف اٹھتے رہے اہلِ کتاب آتے رہے
این جناب اٹھتے رہے اور آں جناب آتے رہے
حکمراں دل پر رہے صدیوں تلک اصنام بھی
ابرِ رحمت بن کے چھایا دہر پر اسلام بھی[1]
مسجدوں میں مولوی خطبے سناتے ہی رہے
مندروں میں برہمن اشلوک گاتے ہی رہے
آدمی منت کشِ اربابِ عرفاں ہی رہا
دردِ انسانی مگر محرومِ درماں ہی رہا

پھر وہ انبیا کے طریقِ کار پر مزید نشتر چلاتا ہے۔

رہبری جاری رہی پیغمبری جاری رہی
دین کے پردے کے پیچھے زرگری جاری رہی
یہ مسلسل آفتیں، یہ یورشیں، یہ قتلِ عام
آدمی کب تک رہے اوہامِ باطل کا غلام

اپنی اس نفرت و حقارت کا اظہار کرنے کے بعد وہ کہتا ہے :-

ذہنِ انسانی نے اب اوہام کے ظلمات میں
زندگی کی سخت طوفانی اندھیری رات میں
کچھ نہیں تو کم سے کم خوابِ سحر دیکھا تو ہے
جس طرف دیکھا نہ تھا اب تک ادھر دیکھا تو ہے
آہ! اے فرزندِ آدم، نامراد و ناتمام
اے خدائی کے اسیر اے شہریاری کے غلام
کر بھی دے معزول ان اربابِ عز و جاہ کو
آسمانوں پر خدا کو اور زمیں پر شاہ کو

---

[1] یہ واضح رہے کہ شاعر یہاں طنز کر رہا ہے نہ کہ تعریف!

اور پھر :-

مگر اے میری تیرہ راتوں کی ساتھی !
یہ شہنائیاں سن رہی ہو ؟
یہ شاید کسی نے مسرت کی پہلی کرن دیکھ پائی !
نہیں اس دریچے کے باہر تو جھانکو
خدا کا جنازہ لئے جا رہے ہیں فرشتے
اسی ساحرِ بے نشاں کا
جو مغرب کا آقا ہے مشرق کا آقا نہیں ہے !
یہ انساں کی برتری کے نئے دور کے شادیانے ہی سن لو
یہی ہے نئے دور کا پرتو اولیں بھی
اٹھو اور ہم بھی زمانے کی تازہ ولادت کے اس جشن میں مل کے دھومیں مچائیں۔
شعاعوں کے طوفان میں بے محابا نہائیں۔

کرشن چندر نے اپنی کتاب "نئے زاویے" جس میں اس نے مختلف ترقی پسند ادیبوں کی نگارشات کا بہترین نمونہ اشعار کا مجموعہ مرتب کیا ہے۔
جس میں ساحر ایک جگہ کہتا ہے :-

ابلیس خندہ زن ہے مذاہب کی لاش پر
پیغمبرانِ دہر کی پیغمبری کی خیر
انساں الٹ رہا ہے رخِ زیست سے نقاب
مذہب کے اہتمامِ فسوں پروری کی خیر
الحاد کر رہا ہے مرتب جہانِ نو
دیر و حرم کے حیلۂ غارتگری کی خیر

عقائد وہم ہیں مذہب خیالِ خام ہے ساقی ازل سے ذہنِ انساں بستۂ اوہام ہے ساقی

مخدوم محی الدین کی شاعری کی مثالیں ملاحظہ ہوں

حرم کے دوش پہ عقبیٰ کا دام ہے اب تک
سروں میں دین کا سودائے خام ہے اب تک
توہمات کا آدم غلام ہے اب تک
گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

جا نتا ہوں موت کا دمساز وہمدم کون ہے
کون ہے پروردگار بزم ماتم کون ہے
کوڑھ کے دھبّے چھپا سکتا نہیں ملبوس دیں
بھوک کے شعلے بجھا سکتا نہیں روح الا میں

اے خدا سرمایہ داروں کے خدا
اے خدا! اے تاجداروں کے خدا
تجھ کو دلچسپی نہ ہو گر کام سے
بیٹھ جا کر عرش پہ آرام سے[1]
چند دن دے دے مجھے اپنا مقام
ٹھیک کردوں تیری دنیا کا نظام

اس کے علاوہ افسانوں کے ذریعہ سے بھی ہوشیاری کے ساتھ خدا کے خلاف نفرت پھیلانے میں یہ لوگ سرگرم ہیں۔ اے حمید کا ایک افسانہ "حسن ورو ٹی" جو انجمن ترقی پسند مصنفین لاہور میں پڑھا گیا اس میں وہ پہلے ایک آرٹسٹ کی مفلسی کو بہت مؤثر اور بھیانک انداز میں پیش کرتا ہے، دوسری طرف وہ مالدار کا نقشہ بھی دکھاتا ہے اور ساتھ ساتھ اپنا کام کرتا ہے :۔

"آرٹسٹ نے بڑی کاوش سے کر سوچا۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر یہ مہمان اس وقت نہ آتے! اس کے لئے آپا کے ساتھ گھر میں ایک اجنبی لڑکی کا آنا جیسے وہ زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہو اس وقت ایک اہم بات بھی تھی اور غیر اہم بھی۔ آرٹسٹ نے ایک لمحہ کے لئے لڑکی کی پُراسرار سُرمگین آنکھوں پر ڈھلکی ہوئی پلکوں کے جھکاؤ اور گردن کے نازک خم میں کوئی جمالیاتی تناسب پیدا کرنے کی کوشش کی مگر دوسرے ہی لمحے اس کا خیال اپنی بوڑھی ماں کی طرف پلٹ گیا جس کا زرد چہرہ بھوک کے باعث زرد اور لاغر ہو رہا تھا اور جس کی غیر پُراسرار سرمگین، آنکھوں میں زندگی کی چمک دم بدم بجھ رہی تھی۔ یہ خیال کہ اس کی ماں اور دوسرے گھر والے رات بھر سے بھوکے ہیں، سانپ بن کر اس کی روح کو ڈسنے لگا، اس کی زہر آلود نگاہوں کے آگے ایک تاریک پردہ سا کھچ گیا اور دوسرے لمحے آپا علی اور دلیم سیکسر کی تصویر اور رجا وید نامہ اور نور مشرق، ہر شے ہر چند اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ وہ لڑکی بھی، جس کا رنگ زرد و زرد کیک ایسا تھا، جس کی قمیص پر ہلکے عنابی رنگ کے بڑے بڑے پھول بنے ہوئے تھے اور جس کی سرمگیں آنکھوں پر ڈھلکی ہوئی پلکوں اور نازک گردن کے لطیف خم میں اس نے کوئی جمالیاتی تناسب پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ پردہ اس نے سوچا، بھوک مفلسی اور بے بسی کی وہ دیوار تھی جس نے اس کے اور اس کے فن کی عظمت کے درمیان حائل ہو کر اسے پستی، ذلّت، گمرہی اور بدذوقی کے صحرائے اعظم میں بھٹکنے کے لئے بے یار و مددگار چھوڑ دیا تھا۔

مسجد میں مؤذن کی آواز بلند ہوئی، اور ٹھیکیدار کے دیوانخانے میں ان پڑھ چنچل لڑکیوں کا شور دھیما ہو گیا ——— اللہ بہت بڑا ہے اللہ بہت بڑا ہے ———!"

وہ اس طرح مفلسی اور سرمایہ دار کے مقابلے میں حال کی افراط کو دکھا کر بہت خوبی سے اپنے افسانے میں ایک خاص موقعہ پر جبکہ قاری کے

---

[1] صاحب مضمون نے تحریر کی بے احتیاطی اور بدخطی سے لکھی ہے۔ اس وجہ سے ممکن ہے کہ مرتب کے قلم سے کوئی تصرف بے جا ہو گیا ہو۔

جذبات ایک خاص حد تک ابھر جاتے ہیں وہ مؤذن کی آواز کو پیش کر کے یہ ترجمہ لکھتا ہے " اللہ بہت بڑا ہے اللہ بہت بڑا ہے" اور اس طرح بڑی ہوشیاری سے نفرت کے ان تمام جذبات کو خدا کی طرف پھیر دیتا ہے جو سارے افسانے کے دوران میں پڑھنے والے کے دل میں جمع ہوتے ہیں۔

یہ ادیب نہ صرف خدا، مذہب کے خلاف نفرت پیدا کرتے ہیں بلکہ وہ ادیب جو خدا و مذہب کے قائل ہوں ان کے نزدیک ادیب ہی شمار نہیں ہوتے وہ رجعت پسند دقیانوسی قرار دیئے جاتے ہیں۔ علامہ اقبال کے متعلق اسی لئے یہ لوگ زہر افشانی کرتے ہیں۔ ادبِ لطیف ماہ ستمبر ۱۹۵۱ء میں "ترقی پسند ادب کی تحریک کا نیا موڑ" میں یہ الفاظ ملاحظہ ہوں :۔

"اس کی واضح مثال علامہ اقبال کے فلسفے میں ملتی ہے چونکہ بورژوا طبقے کو انگریزی سامراج کے تسلط کے باعث بھرپور طور سے پڑھنے کا موقعہ نہیں ملا، وہ مغرب کے مادی فلسفے کو اپنا نہیں سکا جس حد تک اس نے بدیسی راج سامراج کے خلاف جنگ کی ہے اس نے مادی علوم و فنون اور حقیقت کو اپنانے کی بھی کوشش کی ہے۔ لیکن جس حد تک سرمایہ دارانہ نظام کے انحطاط کے مقدر کا علم ہوتا گیا اس نے مادیت سے بھی فرار اختیار کیا اور اس حقیقت کو چھپانے کے لئے اس نے ایشیا کی روحانی زندگی پر زور دیا ہے حقیقت تو یہ ہے کہ وہ یہاں بدیسی سامراج کی چال کا شکار ہو گیا۔"

"سرسید اور اقبال میں فرق صرف زمانوں کا ہے سرسید ہابس لاک، مل اور برگسان کی تعلیمات سے متاثر ہیں۔"

"علامہ اقبال اس فلسفے سے براہ راست متاثر ہیں اور برگسان ہی کے فلسفے کی روشنی میں انھوں نے اپنے ماضی کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔ فرق یہ ہے کہ برگسان نے ایک ہی فلسفے میں دونوں پہلوؤں کو محیط کر لیا ہے۔ یہ کام علامہ اقبال کے لئے مشکل تھا۔"

ظہیر صدیقی کا ایک مقالہ جو ماہنامہ جاوید لاہور میں شائع ہوا ہے۔ جس کا عنوان ہے" اقبال کی شاعری کے ترقی پسند اور رجعت پسند عناصر" اس میں اقبال کے ایسے تمام اشعار کو رجعت پسند قرار دیا گیا ہے جیسے

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں　　　اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار

اس پر جب ان سے شورش کاشمیری نے سوال کیا کہ انھوں نے یہ مضمون کس نقطۂ نگاہ سے شائع کیا ہے تو انھوں نے فرمایا خالص مارکسی نقطۂ نگاہ سے زیکو سلوویکیا کی انجمن ترقی پسند مصنفین کے ایک جلسے میں پاکستان کے ادب پر ایک مقالہ پڑھا گیا جس میں اکثر ترقی پسند ادیبوں کی قصیدہ خوانی کی گئی اور منجملہ اور باتوں کے یہ بھی کہا گیا کہ کچھ دنوں پہلے پاکستان میں اقبال کے اثرات بہت تھے جو کہ ایک رجعت پسند شاعر تھا لیکن اب ایک ترقی پسند شاعر ظہیر کاشمیری ابھر رہا ہے اور اس کی وجہ سے دن بدن ان کا اثر کم ہو رہا ہے۔

خود ان ادیبوں میں سے اگر کسی کے قلم سے مذہبی رجحانات لئے ہوئی تحریریں نکل جاتی ہیں تو ان کو بھی یہ حضرات کسی قیمت پر برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ قتیل شفائی کے مندرجہ ذیل اشعار ان کی زد پہ آ گئے۔

آج بھی کل کے یزیدوں کی جہانبانی ہے　　　دہر کوفہ ہے بشر ظلم کا زندانی ہے

وہی الجھن ہے ابھی وقت کی رفتار وہی

آؤ بھولے ہوئے عہد کی تجدید کریں　　　آؤ حسین کے اوصاف کی تقلید کریں

عبدالمتین عارف　　کرتے ہوئے لکھتے ہیں قتیل شفائی بتا سکتے ہیں کہ کیا کل کے یزیدوں اور آج کے یزیدوں کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں اور کیا وقت کی رفتار میں اب بھی وہی الجھن ہے جو اسلام کے ابتدائی دور میں تھی اور کیا اس بھولے ہوئے عہد کی تجدید میں موجودہ الجھن کا علاج ممکن ہے اور اس سلسلے میں اگر قتیل شفائی کا جواب اثبات میں ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ قتیل شفائی اور جماعت اسلامی کے نظریں میں کیا فرق ہے؟"

اس کے علاوہ اس ادب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ طبقاتی جنگ کو خوب ہوا دی جائے اور امیر و غریب میں زیادہ سے زیادہ

نفرت وعداوت پھیلائی جائے۔ انسانی محبت واخوت کے ہر پیام سے اس ادب کو دشمنی ہے۔ یہ گوارا نہیں کرتا کہ انسان کو محبت واخوت کے رشتے سے جوڑا جائے اور تصادم کو صرف آخری اور بالکل ہی آخری چارۂ کار کی حیثیت سے زیادہ سے زیادہ مؤخر کیا جائے۔ یہ سوسائٹی کے طبقوں میں ابتدا سے ہی نفرت وعداوت کے جراثیم پیدا کر کے خونریزی کا سبق دیتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ صد درجہ انسانیت کش حرکت کا ارتکاب ہے کیونکہ خونریزی، مار دھاڑ سے بالآخر کیا نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے؟ زیادہ سے زیادہ جو چیز حاصل ہو سکتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ اس وقت کے ظلم کرنے والے بیچ میں سے ہٹ جائیں۔ لیکن جو لوگ ملک کے ذرائع ووسائل پر قبضہ کریں گے یعنی جو افراد ریاست کا جدید انتظام کریں گے ان کے لئے کیا گارنٹی ہے کہ وہ لوگ ہوس کے نشے میں ہل جوتنے والوں اور معمولی مزدوروں پر وہ ظلم نہیں توڑیں گے جو اس سے پہلے ظلم کرنے والے کر رہے تھے۔

عارف عبدالمتین صاحب مار دھاڑ کی تبلیغ کا ذکر کرتے ہیں:۔

ترقی پسند شاعروں نے اپنے کلام میں بار بار ایک جھپک اور ٹکراؤ کی تعلیم دی ہے اور اصلاح پسندی اور نام نہاد امن جوئی کے خلاف آواز اٹھاتے ہوئے انقلاب اور بغاوت کا نعرہ بلند کیا ہے۔"

اسی نظریے کے تحت احمد ندیم قاسمی اپنے ایک افسانے میں لکھتے ہیں:۔

"پھر اچانک وہ اس شدت سے چلائی کہ میں نے آج تک اس کی اتنی تیز وتند آواز نہیں سنی تھی "ہماری ہے" وہ چلائی! ایک لمحے کے بعد پھر چلائی "ہماری ہے" اور میں اس سے اس پاگل پن کی وجہ پوچھنے ہی والا تھا کہ وہ ایک بار پھر گرجی "ہماری ہے" ——— گرد وغبار میں بلند ہوتا ہوا شور بالکل واضح ہو گیا۔ ایک آواز آئی "یہ زمین کس کی ہے؟" اور میں فاطمہ سے مل کر چلایا ہماری ہے" ——— یہ ایک امڈتا ہوا ہجوم تھا۔ لوگوں کے ہاتھوں میں کدالیں اور پھاوڑے اور درانتیاں اور کندھوں پر ہل تھے ان کی آنکھوں میں آگ اور چہروں پر گلاب تھے۔ وہ جھیل سے نکلتے ہوئے معلوم ہوتے تھے، جیسے جھیل نے بے قرار ہو کر اپنی تیاں لہروں کو سیلاب کی صورت میں دھرتی پر انڈیل دیا تھا اور یہ سیلاب جھیل کے سونے کو ساری دھرتی پر پھیلانے کے لئے امڈ پڑا تھا۔ سب سے آگے عورتیں تھیں، ان کے پیچھے نوجوان تھے۔ کہیں کہیں بوڑھے بھی نظر آجاتے تھے جو اپنی سفید داڑھیوں کے باوجود جوانوں کی تیز رفتاری کا ساتھ دے رہے تھے، ان کے چہروں اور سینوں پر پسینے کے موتی تھے۔ ٹانگوں پر گرد جم رہی تھی۔ وہ اپنا حق مانگنے کی بجائے چھیننے نکلے تھے۔

مندرجہ بالا تحریر بظاہر نہایت معصوم اور غریبوں کے حق میں ہمدردانہ معلوم ہوتی ہے اور اس میں انصاف وہمدردی کے جذبات جھلکتے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن ان کے ساتھ ساتھ وہ غیر شعوری طور پر جس زہر کو اگل رہا ہے وہ یہ ہے کہ پڑھنے والوں کے دلوں میں ایک خانہ جنگی کی صورت میں انقلاب لانے کا جذبہ بو دیا جائے اور وہ برچھیاں اور کدالیں لے کے انسانیت کی جڑیں کھود دینے کے لئے تیار ہو جائیں۔

مجاز نے ایک جگہ کہا ہے:۔

"بڑھ رہے ہیں دیکھ وہ مزدور دراتے ہوئے
اک جنوں انگیز لے میں جانے کیا گاتے ہوئے!
سرکشی کی تند آندھی دم بدم چڑھتی ہوئی
ہر طرف یلغار کرتی ہر طرف بڑھتی ہوئی"

اس طرح مزدور کی مفلسی کی حس کو اکسا کر جنگ وخونریزی کے جذبے کو مسلسل بھڑکایا ہے:۔

"خون کی بو لے کے جنگل سے ہوائیں آئیں گی!

خاک پہ خوں ہوگا نگاہیں جس طرف بھی جائیں گی
جھونپڑوں میں خوں، محلوں میں خوں، شبستانوں میں خوں!
دشت میں خوں، وادیوں میں خوں، بیابانوں میں خوں!
پُرسکوں صحرا میں خوں، بیتاب دریاؤں میں خوں
دیر میں خوں، مسجدوں میں خوں، کلیساؤں میں خوں
خون کے دریا نظر آئیں گے ہر میدان میں
ڈوب جائیں گی چٹانیں خون کے طوفان میں
خون کی رنگینیوں میں ڈوب جائے گی بہار
ریگِ صحرا پر نظر آئیں گے لاکھوں لالہ زار
خون سے رنگیں فضائے بوستاں ہو جائے گی
نرگسِ مخمور چشمِ خوں فشاں ہو جائے گی!

پھر شاعر آگے بڑھتا ہے تو اپنے سرخ بیت المقدس کی طرف سے حملے کا خواب دیکھتا ہے اور بڑی مسرت سے یہ تصور کرتا ہے کہ پاکستان میں ایک بیرونی اقتدار داخل ہوگا :-

کوہساروں کی طرف سے سُرخ آندھی آئے گی
جا بجا آبادیوں میں آگ سی لگ جائے گی!
توڑ کر بیڑی نکل آئیں گے زنداں سے اسیر
بھول جائیں گے عبادت خانقاہوں میں فقیر
حشر در آغوش ہو جائے گی دنیا کی فضا
دوڑتا ہوگا ہر اک جانب فرشتہ موت کا
سُرخ ہوں گے خون کے چھینٹوں سے بام و در تمام
غرق ہوں گے آتشیں ملبوس میں منظر تمام

آپ کہیں گے کہ یہ شاعری ہے یا نامعقولیت ——— اور آپ کو جواب ملے گا کہ یہ ترقی پسندی ہے، یہ نئی شاہراہیں ہیں، یہ فکری انقلاب ہے! ——— ذرا بتائیے کہ یہ جواب سن کر آپ کیا کرلیں گے؟

ترقی پسند ادب کی ایک بہت بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ جنسی بے راہ روی کو عام کر دیا جائے شوہر اور بیوی کا تعلق ان کے نزدیک بورژوا نظام کی قدروں کا اظہار ہے اس لئے یہ ادب اپنی تمام نگارشات میں خاص طور سے جنسی لذت کو شدت سے ابھارتا ہے۔ چنانچہ اس ادب کا افسانہ پڑھا جائے تو محدود مگر شستہ دامان ایسا نظر آئے گا جو اس غلاظت کے دھبوں سے بچ گیا ہو، بلکہ اشتراکی خیالات و رجحانات کو پڑھنے والوں کے ذہنوں میں اتارنے کے لئے یہ ضروری سمجھا جاتا ہے کہ جنسی ہوس کی آگ کو زیادہ بھڑکا دیا جائے۔ اس ادب کے اس تعفن کے خلاف شور اٹھنے لگا تو ترقی پسندوں نے جنسیت کو رنگ آمیز بنا کر کسی قدر ہلکا کر دیا۔ یعنی ترقی کے بجائے بیماری کو مناسب سمجھا گیا۔ بھولئے نہیں کہ سعادت حسن منٹو کا افسانہ "ٹھنڈا گوشت" اشتراکی پرچے "جاوید" میں شائع ہوا، جس کے ایڈیٹر عارف عبدالمتین اشتراکی تحریک کے رکن بھی ہیں۔ اس کی انتہائی عریانیت پر حکومت نے مقدمہ چلایا

انھوں ترقی پسندوں نے اس کی پوری پشت پناہی کی۔ سوچیے ایک ایسا افسانہ جس میں شدت کے ساتھ ایک مرد کے ان انتہائی ہیجانی کیفیات کو دکھایا گیا ہے جس میں وہ ایک عورت کے ساتھ اپنے حیوانی جذبات کا مظاہرہ کرتا ہے۔ عورت ننگی ہے وہ اس کے جسم کو کس طرح سے کاٹتا ہے، اس کو پوری تفصیل سے بیان کیا گیا ہے پھر عورت کے ہیجان میں آنے کی کیفیت کو بھی اسی طرح نمایاں کیا گیا ہے۔ اس قسم کا ادب ان کے نزدیک ترقی پسندانہ ادب ہے۔

کرشن چندر تو فخریہ اپنی کتاب "نئے زاویے" میں کہتا ہے کہ پرانے ادب میں محبوب چلمن کے پیچھے ہی رہتا تھا اور ادیب ذہنی انزال کے مرتکب ہوا کرتے تھے لیکن ترقی پسند ادیب کا محبوب سڑکوں اور شاہراہوں پر پھرتا ہے اور اس میں شرم و جھجک کے بجائے بے تکلفی اور لگاوٹ ہے۔

کرشن چندر کی یہ بات خود اس بات کی گواہی ہے کہ پچھلی گندگی کہ جو ان کے نزدیک عین نفاست ہے، اب دو آتشہ ہو گئی ہے۔

یہی کرشن چندر اپنے مرتب کردہ "ترقی پسند ادب" کے مجموعے میں ایک افسانے کو ترقی پسندانہ معیار پر پرکھ کر شامل کرتا ہے۔ اس کی شان ملاحظہ ہو۔

"سحر اسے اپنے آغوش میں لے رہا تھا، وہ آغوش میں آگئی۔ اس کے جسم کا ہر عضو ڈھیلا ہو گیا۔ اس کے تمام وجود نے خود کو چھوڑ دیا اور سیما اس کے آغوش میں پڑی رہی۔ وہ اگر چھوڑ دیتا تو وہ گر پڑتی۔ لیکن وہ سیما کو اپنے بازوؤں میں لئے رہا اور خاموشی کے لمحے دھڑکنوں میں جذب ہوتے گئے اور سیما نے اس کے ہاتھ کو اپنے سینے پر محسوس کیا، جیسے وہ اپنے ہاتھ سے ایک بلی کی ملائم سمور کو پرسش کر رہا ہو۔ سیما کی تمام موہوم توجہ اپنے سینے پر سمٹ آئی، وہ اپنے آپ سے غافل تھی، اس سے بھی غافل تھی ——— اسے اپنے سینے کا احساس تھا، صرف اس لمس کا جو اس کے سینے اور سحر کے درمیان تھا۔ وہ آہستہ سے اس کے سینے پر ہاتھ پھیر رہا تھا اس کی چھاتی کو اپنی انگلیوں کے نرم پہلوؤں سے محسوس کر رہا تھا۔ وہ غافل تھی اس کے لب سیما کے لبوں پر رکھے تھے اور وہ غافل تھی۔

جب وہ گھر پہنچی تو اب تک وہ اس سحر کے اثر میں مبتلا تھی اس کی روح کو چھید کر کوئی چیز اس کے اندر داخل ہو گئی تھی۔"

یہ تو ان کا وہ پہلو ہے جو معاشرے کی گندگیوں کو تلاش کر کے انھیں رنگین بنا کر پیش کرتے ہیں لیکن اس کے علاوہ خود ان کے ذہن کا اندازہ کیجئے کہ ان کے اپنے اندرونی احساسات کس قسم کے ہیں اور وہ باہر کی دنیا پر کس قسم کی نگاہ ڈالتے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی اپنے ایک افسانے میں فرماتے ہیں:—

"ایک چڑیا پگڈنڈی سے کچھ دور ایک خشک درخت پر بیٹھی چہچہا رہی تھی، لفنگی معلوم ہوتی ہے یہ چڑیا" بوڑھا مسکرایا۔ "کسی لفنگے کی راہ دیکھ رہی ہے، جبھی تو غول سے کٹ گئی ہے۔"

متین ہنسا۔ بوڑھا بولا "یہ لالچ کمبخت ہر چیز سے لگا ہوا ہے۔ مرغا مرغی کے پیچھے دوڑا پھر رہا ہے، کبوتری کبوتر کو بلا رہی ہے۔ گدھا گدھی کے پیچھے دوڑا پھر رہا ہے، کبوتری کبوتر کو بلا رہی ہے، گدھا گدھی کے پیچھے مارا مارا پھر رہا ہے، پچھلے دنوں ہمارے گاؤں کی چھوکری ——— بیاہی چھوکری ایک پردیسی لفنگے کے ساتھ بھاگ گئی۔ قدرت کے کھیل ہیں۔"

ایک دوسرے افسانے میں اس طرح تحریر فرماتے ہیں:—

"گاؤں کی بیاہی گلی میں ایک کتیا کو چمکارتے ہوئے کتے نے بھونک کر میری ان موچھوں کا تار و پود بکھیر دیا اور میں چلایا ——— ہٹ جا ——— اور کتیا بھاگ نکلی۔ کتے کو شاید ایک مسافر کی سکڑی پنڈلی سے اپنی کتیا زیادہ عزیز تھی، اس نے زور سے بھونکا"

ہم اس گندی تحریر کو لکھ کر اگر آدمی ادیب بنتا ہو تو ساری دنیا کے ادب پر ہزار بار لعنت۔ اگر ترقی پسندی یہی ہے تو ہماری رائے میں اس کا پڑا اونچا ہو گا کہ ادیب صاحب بیت الخلا میں انسانی واردات کی نقشہ کشی فرمائیں۔ (چراغ راہ)

جیسے کہہ رہا ہو" دفع ہو" اور اپنی مفروضہ محبوبہ کے تعاقب میں ایک پست سی حد بندی پھاند کر غائب ہو گیا۔

ایک اور جگہ تحریر فرماتے ہیں :۔

"سنجانی کی پہلی گلی میں کتے کتیلنے میرا استقبال کیا مجھے لال لال آنکھوں سے گھور کر غرائے اور پھر منہ ملا کر یوں بڑبڑائے جیسے کہہ رہے ہوں جانے دو، کوئی لفنگا معلوم ہوتا ہے، ہم اپنا ردمان کیوں خراب کریں"

یہ وہ مقدس تحریریں ہیں جس سے سماج کی خدمت کی جا رہی ہے اور یہ وہ ادب ہے جو بامقصد ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور اپنی ترقی پسندی کا ڈھونگ رچاتا ہے۔

جنسی بے راہ روی اور عریانیت پھیلانے کے علاوہ یہ ادیب اخلاقی اقدار کے کھلے کھلے دشمن ہیں اور انھیں انسان میں کسی ایسے عمل کا امکان ہی نظر نہیں آتا جو معاشی محرکات پر مبنی نہ ہو۔ ان کے نزدیک انسان بس ایک ذلیل ترین جانور ہے جو صرف دولت کے گرد گھومتا ہے اور اپنے اس دعوے کو اپنے ادب میں بڑی ڈھٹائی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ندیم قاسمی اپنے افسانے "محدب شیشے" میں لکھتے ہیں :۔

"وہ میرے اور قریب سمٹ آئی۔ میں اسے اندر کمرے میں لے گیا لالٹین جل رہی تھی اور فلکا باہر برآمدے میں سو رہا تھا۔ میں لالٹین اٹھا کر اس کے قریب لے آیا اور اسے غور سے دیکھ کر بولا صابی، بہت خوبصورت ہو تم۔ انسان کو اتنا خوبصورت بنا کر خدا اپنے لئے کیا چھوڑتا ہے۔

وہ مسکرا دی۔ لالٹین کو فرش پر رکھ کر میں جھکا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ میرے شانوں پر رکھ دیئے جھینپی اور مجھ سے لپٹ گئی۔ . . . . . روس کی جنگ اور بنگال کا قحط اور اکیلا بھول۔ میں سب کچھ بھول گیا۔ فلکے کو بھی بھول گیا۔ میں نے صابی کے ہونٹوں پر اپنے[1] ہونٹ یوں رکھے جیسے کانچ کی چوڑی پر کانچ کی چوڑی رکھی جاتی ہے۔

میں کھلے دروازے کو بھی بھول گیا۔ میں نے صابی کے گالوں سے اپنے گال ملے۔ میں یہ بھی بھول گیا کہ باہر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی ہے ـــــــ"

اس حالت کا وہ پورا نقشہ کھینچتا ہے۔ اتنے میں صابی کا باپ داخل ہوتا ہے اور یہ سب کچھ دیکھ کر آگ بگولا ہو جاتا ہے اور کہتا ہے "ہم دہقان لوگ سوداگری نہیں جانتے۔ میاں تین سو ٹھیکریوں کے بدلے مجھے اپنی ناک کٹوانا منظور نہیں، چاہوں تو اسی وقت تمہاری کھوپڑی کے دو ٹکڑے کر کے رکھ دوں۔"

اس کے بعد ندیم قاسمی یہ دکھانے کی کوشش کرتا ہے کہ اخلاق عصمت و عفت کی باتیں محض فریب ہیں اور پیسے کے ذریعے سے سب کچھ بکتا ہے "میں سوچنے لگا جب یہ دہقان لوگ پیسے کے بدلے جھوٹی گواہی دے سکتے ہیں موروثی زمینیں بیچ سکتے ہیں تو آخر وہ اپنی ان لڑکیوں کا سودا کیسے نہیں کر سکتے۔"

اس کے بعد وہ جب صابی سے ملتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ تین سو روپے کے بدلے وہ بیچی جا چکی ہے۔ اس پر وہ قارئین پر اس طرح یوں اثر ڈالتا ہے :۔

"میں کہتا ہوں کہ تم یہاں ـــــــ

وہ کہتی ہے ہاں!

---

[1] بڑا کارنامہ انجام دیا آپ نے!

میں پوچھتا ہوں کیسے؟

وہ کہتی ہے تین سو روپے کے بدلے!

میں نے صرف اس روز محسوس کیا کہ کائنات لٹو کی طرح گھومتی ہے۔ حواس باختہ ہو جاتا ہوں۔ بڑبڑاتا ہوں ستارے مر گئے ہیں۔ فرشتوں کو کالی کھانسی کا عارضہ ہے۔ چاند کے چیچک نکل آئی ہے۔ آسمان کا گریبان پھڑ پھڑا رہا ہے۔

آگے چل کر کہتا ہے:۔

یہاں ہر چیز بکتی ہے، یہاں ہر ایک جنس ہے، یہاں انسان بھی بکتے ہیں اور مجبوریں بھی۔ یہاں مذہب بھی بکتا ہے اور خدا بھی۔ یہاں دین بھی بکتے ہیں اور ایمان بھی۔

میں جانے لگتا ہوں تو صابی کہتی ہے کہ میں نے مذاق کیا تھا،

میں کہتا ہوں کہ یہاں ہر بات مذاق ہے یہاں کوئی سنجیدہ نہیں یہاں سب مسخرے ہیں۔ یہاں انسان بھی مذاق ہے۔ محبت بھی مذاق ہے۔ خدا بھی مذاق ہے۔ جنگ اور وبائیں سب مذاق ہیں۔"

اس طرح یہ ادیب انسان کو معاشی محرکات کا تابع قرار دیتے ہیں اور ان کے پورے ادب میں ایک تحریر بھی ایسی نہیں مل سکتی جس میں وہ انسان کے اس کردار کو ابھاریں جس کے اثر سے اخلاقی خوبیاں انسانی ذہن میں جگہ حاصل کریں۔

ترقی پسند ادب اپنے اسی مخصوص مزاج اور اپنے انہی احوال کی وجہ سے ترقی کرتے کرتے یکایک جمود کی حالت میں مبتلا ہو گیا ہے، اور پاکستان بننے کے بعد تو جیسے ساری ترقی تاریخ لسنہ ہو گئی ہو۔ چنانچہ سوچا جا رہا ہے کہ یہ جمود کیوں ہے؟ بحثیں کی جا رہی ہیں، مقالے لکھے جا رہے ہیں، مگر اس جمود کی تشخیص نہیں ہو پائی۔

اِدھر ترقی پسند ادب جمود میں ہے، اور اُدھر دوسری طرف اسلام پسند ادیبوں کی نکالی ہوئی نئی شاہراہِ ادب پر قافلوں کی رفتار روز افزوں ہے۔ وہاں کوئی مجبور نہیں اور وہاں جمود کی تشخیص کے لئے کوئی بھی طبّی بورڈ نہیں بیٹھا۔

ایک رائے

"نقطے اور لکیریں" پر میری طرف سے دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔ یہ آپ ہی کے "افسانہ نہیں بن رہا" کی ارتقا یافتہ شکل ہے۔ میرا خیال ہے، طلوعِ اسلام کو اس پر یوں تبصرہ کرنا چاہیئے "..... مولوی ہونے کے باوجود اس فن میں اتنے کامیاب ہوئے ہیں.....!"

اپنے یہاں کے افسانہ نگاروں میں فن اور مقصد کا اتنا اچھا امتزاج میں نے کبھی نہیں دیکھا ہے۔ اسی طرح کی تخلیقات ہوتی رہیں تو انشاءاللہ بہت جلد ادبی محاذ کا یہ گوشہ بھی ہمارے قبضہ میں ہوگا۔ خدا نہ کرے کہ "نقطے اور لکیریں" سال کا بہترین افسانہ ہو۔ میری دعا تو یہی ہے کہ ؏

اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے۔

علامہ اقبالؒ کا نظریۂ فقر

محمد خان مظفر آبادی

اس مقالے کی عبارت آرائی میں اگرچہ بتدیاں تصنع کھٹکتا ہے اور اس سے
بھی زیادہ علاماتِ اوقاف کا غلط استعمال نمایاں ہے، لیکن نفسِ مضمون کے لحاظ
سے یہ بہت قابلِ قدر ہے۔ اسی وجہ سے ہم اسے شائع کر رہے ہیں۔ (ادارہ)

حریف اپنا سمجھ رہے ہیں، مجھے خدایانِ خانقاہی ‌‌ ‌ انھیں یہ ڈر ہے کہ میرے نالوں سے شق نہ ہو سنگِ آستانہ

"تصوراتِ الٰہیات" کے سلسلے میں فکرِ انسانی کے گستاخ ترین "استعجاب" کا جس قدر تشفی بخش اور واضح "جواب" اسلام نے دیا ہے۔ اس کی مثال، "نفسیات" کے کسی بڑے سے بڑے ضابطے میں بھی، نہیں ملتی۔

اسلام نے خلاقِ عالم کی قبائے صفات کے نقوش، کچھ اس طرح، اُجاگر کئے ہیں۔ کہ حسنِ ذات کا پرتوِ جمال، خود بخود، احساس کو منور کئے دیتا ہے۔

جس طرح، ہم، ہر روز، سینکڑوں، مختلف النوع اشیاء کا مشاہدہ کر کے، ان کے "وجود" پہ یقین کر لیتے ہیں۔ اسی طرح، آئینِ حیات (اسلام) کا "سچا پیرو" خلاقِ عالم کو، بچشمِ ظاہر سے، دیکھے بغیر، اس کے غیر مرئی وجود پہ ایمان رکھتا، اور اسے ہر کہیں، حاضر وجود سمجھتا ہے۔ وہ، اس کے ساتھ "پیمانِ لا الٰہ" کر کے اس کی ربوبیت کا اقرار کر لیتا ہے۔

اقبالؒ نے اسی "پیمان" کو "خودی" کا نام دے کر، کتابِ زیست کا، عنوان ٹھیرایا ہے۔

خودی کا سِرِّ نہاں، لا الٰہ الا اللہ
خودی ہے تیغِ فساں، لا الٰہ الا اللہ

زندگی کے ہر چھوٹے بڑے مسئلے میں، اس "پیمان" کو مدِ نظر رکھ کر، عمل پیرا رہنے کا نام ہے "فقر"۔ اقبال، فقر کو، حیاتِ انسانی کا "بلند مقام" قرار دیتا ہے۔ جہاں "خواہش و آرزو" رضائے الٰہی کے تابع ہو کر رہ جائے اور کشمکشِ حیات میں، انسان، ہر اُس "فعل" سے مجتنب رہے۔ جس کے "وقوع" سے پیمانِ خودی کی تنسیخ کا امکان ہو۔ نیز اس دنیائے نظر فریب میں، کہ جہاں، قدم قدم پہ

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

کا "امتحان" درپیش ہے، اپنے کردار کو صرف "حق" ہی کے لئے وقف رکھ کر "باطل" کا پردہ چاک کرنا ہے۔

فقر، انفرادی و اجتماعی "افعال" کو دینِ فطرت کی کسوٹی پہ پرکھتا ہے۔ جو فعل "پیمانِ خودی کے منافی ہو، اس کے مقابلے پر آنا

پورا "مصلحتِ جنگ و شکوہ" پورا کرتا ہے۔

مصلحت در دینِ ما، جنگ و شکوہ! مصلحت در دینِ عیسیٰ غار و کوہ!

فقرِ اصیل "جرم وگناہ" سے بچنے کے لئے "مصلحتِ دینِ عیسوی" کو بروئے کار لاتے ہوئے غار و کوہ کا راستہ اختیار نہیں کرتا۔ اور نہ ہی "مصلحت" کی آندھیوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے لئے، خانقاہوں کے تاریک حجروں میں "خیرِ فانیات" کی تانیں اڑاتا نظر آتا ہے، بلکہ، ان ساری قباحتوں کے استیصال کی خاطر، ستیزہ گاہِ عالم میں مصروفِ پیکار دکھائی دیتا ہے۔ اس کی برق صفت تلوار کبھی اروم میں چمکتی ہے۔ تو کبھی ایران کے میدانوں میں، نگاہِ باطل کو خیرہ کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ مٹھی بھر نفوس اسی "جوہر" کے طفیل، اک جہان کی قسمت بدل کر رکھ دیتے ہیں۔

چڑھتی ہے جب فقر کی سان پہ تیغِ خودی اک سپاہی کی ضرب، کرتی ہے کارِ سپاہ!

منشاءِ فقر! مالِ غنیمت اور کشور کشائی نہیں، صرف حفظِ خودی کی خاطر، مرگ و زیست سے بے نیاز ہو کر "خرمنِ کفر پہ" صاعقہ پاش رہنا، اس کا "مدعا" ہے۔

فقیراں تا بمسجد صف کشیدند گریبانِ شہنشاہاں دریدند!

اقبال! آج کل کے "نسخۂ درویشی" کا قائل نہیں جس میں "رہبانیت" کو بےعملی کا خوگر بنایا جا رہا ہے۔ وہ "مجاہدانہ حرارت" کا متلاشی ہے۔ وہ! اس "درویشی" کا حامل ہے جس کی "دستاویز"..... خونِ دلِ شیران سے تحریر ہوئی۔ وہ عرصۂ کارزار میں "نوائے جنگ" کا طالب نہیں۔ البتہ! "ربطِ حیات" کو "زخمۂ شمشیر" سے نوازنا اس کا "مشغلہ" اور تلواروں کے سایہ میں "لا الٰہ" کی پناہ لینا اس کا "ایمان" ہے۔

مردِ سپاہی ہے وہ، اس کی زرہ ہے لا الٰہ سایۂ شمشیر میں، اس کی پنہ ہے لا الٰہ!

اس فقر! "بندگی" کی لذتوں سے بہرہ مند، اور "آرزومندی" کے سوز سے فیضیاب ہے اسی لئے "بندگی و آرزومندی" کے عوض، "شانِ خداوندی" بھی عطا ہو، تو قبول نہیں کرتا۔

متاعِ بے بہا ہے، درد و سوزِ آرزومندی! مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

"مقامِ بندگی" کا "مفہوم" یہی ہے۔ کہ "حفظِ خودی" کے لئے، خورشید سے تا بہ عرش، "طلسمِ لات و منات" سے تصادم جاری رکھ کر، "حقیقت ایک تو، باقی فسانہ" کے "عنوان" کو "کتابِ زندگی" کی زینت بنایا جائے۔

مقامِ بندۂ مومن کا ہے ورائے سپہر زمیں سے تا بہ ثریا، تمام لات و منات!

اور اس "طلسمِ لات و منات" کو توڑ کے، حریمِ ذات تک پہنچنا ہی "کمالِ فقر و آگہی" ہے۔ یہی "مقصدِ حیات" اور یہی "انسانیت کی معراج" ہے۔

حریمِ ذات ہے اس کا نشیمنِ ابدی نہ تیرہ خاکِ لحد ہے، نہ جلوہ گاہِ صفات!

بیشک! یہ "ردائے نیلی فام" "عالمِ بشریت" کی "زد" میں ہے۔ اور مردانِ خود آگاہ سے "نشیمنِ ابدی" دور نہیں۔

خود آگہاں چوں ازیں خاکداں بروں جستند! طلسمِ مہر و سپہر و ستارہ بشکستند

اقبال! "فقر" و "سلطانی" کو دو متضاد صورتیں قرار نہیں دیتا۔ مگر! اس کے نزدیک، فقر کے "نظامِ جہانبانی" کا ڈھنگ نرالا ہے۔ وہ

"ملوکیت" کو "مکر و نیرنگ" سے زیادہ اہمیت نہ دیتے ہوئے، صرف "خلافت" ہی کو "انسانیت کے دکھوں کا "مداوا" سمجھتا ہے، جہاں "نیابتِ الٰہی" کے فرائض انجام دے کر زمانے کو عملی طور پہ "اسلامی تمدن" اور "دستورِ معاشرت" سے "کسبِ فیض" کی دعوت دی جا سکے۔ اور "ناموسِ الٰہی" کی حفاظت کا منشا پورا ہو۔

خلافت بر مقامِ ما گواہی است　　حرام است آنچہ بر ما پادشاہی است
ملوکیت ہمہ مکر است و نیرنگ　　خلافت حفظِ ناموسِ الٰہی است!

اس کا "فقرِ غیور" "اسکندری" سے افضل ہے۔ کیونکہ "اسکندری یا ملوکیت" نے شیشے کی طرح ناپائیدار اور غیر منصفانہ "دستور" وضع کر کے "انسانیت" پہ وہ ستم ڈھائے ہیں، کہ معمورۂ ارض کے گوشے گوشے سے امن و سلامتی کی دھجیاں اڑتی نظر آ رہی ہیں۔ اور ہر سو "فساد" کے شعلے بلند ہو رہے ہیں۔ اس کے برعکس "سلطنتِ فقر" میں "شیشہ سازی" کی بجائے "آدم گری" کا "سراغ" ملتا ہے۔

یہاں! انسانی عقل و خرد کے تراشے ہوئے "سومناتوں" کی جگہ ایک ہی "کعبہ" نظر آتا ہے۔ یہاں خلاقِ عالم کے بنائے ہوئے "ضابطۂ عمل" کی برکتوں سے انسان! انسان سے "نالاں" دکھائی نہیں دیتا۔ یہاں! ظلم و ستم وحشت و بربریت کی کند چھری رگِ انسانیت پہ، نہیں چل سکتی۔ اور یہاں! "انسان" صرف اللہ کی غلامی کا طوق گردن میں ڈال کر "سلطانِ موجودات" ہونے کی "بشارت" پاتا ہے۔

مرا فقر بہتر ہے اسکندری سے　　یہ آدم گری ہے، وہ آئینہ سازی!

نیز سلطنتِ فقر میں، تعیش و تن آسانی کی بجائے۔ جفا طلبی و سخت کوشی، قناعت و خود نگہداری، عدل و انصاف، رواداری و مساوات، بالفاظِ دیگر، اپنے "نفس" کے "عملی احتساب" کا پُرجلال مظاہرہ دیکھنے میں آتا ہے۔ اسی لئے

اُن کی حکومت سے ہے خاموش یہ رمزِ غریب　　سلطنت اہلِ دل، فقر ہے، شاہی نہیں!

حیف! کہ آج ہم اس "مسلک" کو بھلا کر، "مزاجِ خانقاہی" میں پختہ ہو چکے ہیں۔ "فقرِ خانقاہی" کے "شعورِ تصوف" نے ہماری آنکھوں سے "تماشائے حیات" چھپا دیا ہے۔ ہم نے، "عالمِ کردار" سے بیگانہ ہو کر، "بساطِ زندگی" کے تمام مُہرے "مات" کروا ڈالے۔ ہماری "متاعِ عمل" "رہبانیت" کے "غمزۂ خونریز" کا شکار ہو کر رہ گئی۔

اقبال ہماری اس بے چارگی کو بھانپ کر ہمیں اپنے "اصلی مقام" کی طرف لے جانا چاہتا ہے۔

مسلماں شرمسار از بے کلاہی!　　کہ دینش مُرد و فقرش خانقاہی!
تو دانی در جہاں میراث ما چیست؟　　گلیمے از قماشِ پادشاہی!

اس "بے کلاہی و شرمساری" سے کیونکر نجات ممکن ہے؟ رہبانیت کی موجِ تند سے کس طرح سفینۂ عمل، بچایا جا سکتا ہے؟ "خود نگری و آدم گری" کو نسے "فقرِ غیور" کا "شیوہ" رہا؟ سینۂ انسانیت پہ رستے ہوئے ناسور کا "علاج" ملاحظہ ہو۔

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری!　　کہ فقرِ خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری!

نظامِ باطل کو درہم برہم کرنا ہی "کمالِ فقر" ہے، نہ کہ "رزمِ حق و باطل" سے منہ موڑ کے خانقاہوں میں پناہ لینا؟ جبھی تو "آرزو" سے گریزپا ہو کر ستاروں پہ کمند نہیں ڈالی جا سکتی۔ فقط! رسمِ شبیری ادا کرنا ہی، انسانیت کی "بقا" کا ضامن ہو سکتا ہے "تعمیرِ اسباب" سے بے نیاز ہو کر، "آتشکدۂ باطل" سرد کرنا ہی "مقصدِ فقر" ہے۔

کہ موجودہ فقیری سے یہ "مقصد" پورا نہ ہو سکا۔ یہ وہی "فقر" تو نہیں، جس نے مسلمانوں کی "سطوتِ جنگ و شکوہ" [illegible]

فقر بے توکل کے گرداب" میں جا پھنسایا۔ عرصۂ کارزار میں "جمالِ خداوندی" کے متلاشیوں کو "خانقاہوں" میں، "معرفت" کا سبق پڑھایا، اور تلواروں کی چھاؤں میں "جنت" ڈھونڈھنے والوں کو نذرانوں اور چڑھاووں کے بدلے، "بہشت" کا "وارث" ٹھیرایا۔۔۔۔۔۔ اسی فقر نے، "رقص و سرود" کو داخلِ عبادات بتلا کر، مسلمانوں کی "روحِ عمل" چھین لی۔

اقبال حقیقی فقر، اور موجودہ گداگری کا موازنہ کر کے، "ہمیں" ہماری میراث سے باخبر کرتا ہے۔

اک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری ! اک فقر سے کھلتے ہیں "اسرارِ جہانگیری!
اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری! اک فقر سے مٹی میں خاصیتِ اکسیری!
اک فقر ہے شبیری اس فقر میں ہے میری میراثِ مسلمانی سرمایۂ شبیری!

صدیوں کی غلامی، اور "علم و دانش کے فقدان" نے "فقر و درویشی" کے "حیات بخش پہلو" کو مردہ و بے روح بنا دیا" رہبانیت" کی عشوہ طرازیاں کام آئیں۔ اور مسلمانوں نے کشاکشِ حیات سے منہ موڑ لیا۔ اور جب "ہولناک نتائج" سامنے آئے۔ تو "زبان" کو گردشِ دوراں کا گلہ کرتے پایا۔ اگر "ہمیں" "پیمانِ لا الٰہ" یعنی "خودی" کے "حقیقی تصور" کے تقاضاؤں کو پورا کر کے، ربِّ دو جہاں کی "خوشنودی" حاصل کرنی ہے تو سب سے پہلے، "فقرِ خانقاہی" کی بساط الٹنی چاہیئے۔ اور اپنے اسلاف کے اس "مسلکِ فقر" کو اپنا چاہیئے جس پر عمل کرنے سے، دنیا میں، ہم اپنا "کھویا ہوا مقام" حاصل کر سکتے ہیں۔

گرمِ فغاں ہے جرس اٹھ کہ گیا قافلہ وائے وہ رہرو کہ ہے منتظرِ راحلہ!
تیری طبیعت ہے اور تیرا زمانہ ہے اور تیرے موافق نہیں خانقہی سلسلہ !
اُس کی خودی ہے ابھی شام و سحر میں اسیر گردشِ دوراں کا ہے جس کی زباں پر گلہ!

—✣—

قدم بہ قدم!

محمد نیاز

نہ مدرسے میں حمیت نہ خانقاہوں میں ہے وقفِ مدحتِ سلطاں زبان ہو کہ قلم
خطیبِ شہر کہ ہے مستِ مصلحت بینی خود اپنے آپ کا اک مرثیہ ہے اک ماتم
ہوا ہوں نعرہ زنِ لا الٰہ الا اللہ مجھے قبول نہیں ہے قصیدہ خوانیٔ جم
جو حق کے داعی تھے شیطاں نے ان کو طعنہ دیا کہ لو مزاجِ "تقدس" بھی تم سے ہے برہم
ہزار بادِ مخالف ہو سرکش و چالاک مجاہدانِ ہمالہ شکن! قدم بہ قدم!

ہمارا عہد!

سعد مظاہری

عروجِ حق کا ہم دُنیا میں ساماں کر کے چھوڑیں گے
یہاں توحید کی شمعیں فروزاں کر کے چھوڑیں گے

نجانے کب سے ہے سرمایہ و محنت میں آویزش
ہم ان کا فیصلہ از روئے قرآں کر کے چھوڑیں گے

دکھا کر خود گدازی کا تماشہ اہلِ محفل کو
خرد کے ساتھ دل کو بھی مسلماں کر کے چھوڑیں گے

شہادت خلوت و جلوت میں دے کر دینِ قیم کی
بتانِ عصرِ حاضر کو پریشاں کر کے چھوڑیں گے

مسلماں ذرّۂ ناچیز ہے دُنیا کی نظروں میں
اسی ذرّے کو ہم مہرِ درخشاں کر کے چھوڑیں گے

نجانے کب سے بُلبُل خستہ و درماندہ پھرتی ہے
ہم اس بے خانماں کو گل بداماں کر کے چھوڑیں گے

دلوں میں کچھ نہ کچھ ذوقِ یقیں تو پایا جاتا ہے
یہ قطرہ ہی سہی ہم اس کو طوفاں کر کے چھوڑیں گے

رُخِ قرآں سے تاویلات کا گھونگھٹ اٹھا دیں گے
مسلماں کو حقیقت میں مسلماں کر کے چھوڑیں گے

ہر اک مغرور سر کو تیری چوکھٹ پر جھکانا ہے
بہت مشکل ہے لیکن اس کو آساں کر کے چھوڑیں گے

خرد کی کشمکش سے زندگی ہے سرگراں سرمدؔ
نوائے عشق سے ہم اس کو رقصاں کر کے چھوڑیں گے

بحضورِ رسالتؐ

سعادت نظیر

پیغامِ عمل تو نے سُنایا ہے جہاں میں　　غفلت کے حجابوں کو اٹھایا ہے جہاں میں
مایوس کا دل تو نے بڑھایا ہے جہاں میں　　ہر طرح مصیبت سے بچایا ہی جہاں میں

بیداریٔ اقوام و ملل فیض ہے تیرا
ہے علم عطا تیری، عمل فیض ہی تیرا

آوازِ صداقت کی زمانہ کو سنائی　　اک شمع ہدایت کی اندھیرے میں جلائی
انسان کو یوں راہ حقیقت کی دکھائی　　کوشش تھی "نہ دنیا میں رہے کوئی برائی"

بل رہ گئے سب ظلم کی رسّی کے نکل کر
دم تو نے لیا زاویۂ فکر بدل کر

تو نے ہی عداوت کا ہر اک نقش مٹایا　　آئینِ مساوات پہ دُنیا کو چلایا
کمزور جو تھے اُن کا بہت زور بڑھایا　　انسان کو انسان حقیقت میں بنایا

تہذیب پہ آداب پہ احسان ہے تیرا
دل مانتا ہے جس کو وہ فرمان ہے تیرا

اللہ! یہ تھی دل میں یتیموں کی محبت　　جب تجھ سے ملے بھول گئے باپ کی شفقت
معصوم کی ہر حال میں کی تو نے حمایت　　محسوس ہوئی اب ترے کردار کی عظمت

دنیا میں یہ احساسِ شرافت نہیں ملتا

دل ملتے ہیں، یہ جذبۂ خدمت نہیں ملتا

تونے چمن جور کو برباد کیا ہے　　اک تازہ جہاں امن کا آباد کیا ہے
کیا؟ تونے غلاموں ہی کو آزاد کیا ہے!　　ناشاد کا ہر طرح سے دل شاد کیا ہے

دنیا ہے ترے جذبۂ ایثار کی قائل
رفتار کی، گفتار کی، کردار کی قائل

ہر عیب کو ہے تونے زمانے سے مٹایا　　اک عالمِ نو عالمِ ویراں میں بسایا
اک فرش محبت کا زمیں پر ہے بچھایا　　ہر ایک کو جینے کا سبق تونے سکھایا

ہر نقشِ قدم میں ہے ترے نور کا عالم
موسیٰ ہوں تو محسوس کریں طور کا عالم

وہ راہِ عمل میں تری دن رات مشقت　　باغوں میں کبھی تھی کبھی کھیتوں میں ریاضت
وہ کوششِ پیہم، وہ عرق ریزی و محنت　　دیکھی کسی قائد میں نہ یہ شانِ قیادت

اس طرح کا رہبر کوئی لائے کوئی کہاں سے؟
خود بھی وہی کرتا ہو جو کہتا ہو زباں سے

تو عدل کی تنویر ہے، اے محسنِ عالم!　　اسلام کی توقیر ہے، اے محسنِ عالم!
تو عزم کی تصویر ہے، اے محسنِ عالم!　　تو باعثِ تکبیر ہے، اے محسنِ عالم!

اسلام کا ہے نام و نشاں نام سے تیرے
سکہ ہے شریعت کا رواں نام سے تیرے

———

مامتا کی امید!

محمد نیاز

بزمِ گیتی میں "اخوت کی زباں" ہو جائے گا   باغِ عالم میں "محبت کا بیاں" ہو جائے گا
زندگی کی ایک رنگیں داستاں ہو جائے گا   وہ زمیں پر غیرتِ صد آسماں ہو جائے گا
ایک دن آئے گا جب ننھا جواں ہو جائے گا

وقت کے لمحاتِ نوجوں جوں گزرتے جائیں گے   اس کی چشم و گوش کو بیدار کرتے جائیں گے
رفتہ رفتہ اس کے احساسات ابھرتے جائیں گے   دمبدم اخلاق اور جذبے نکھرتے جائیں گے
ایک دن آئے گا جب ننھا جواں ہو جائے گا

شاہراہِ زندگی پر دوڑتا جائے گا وہ!   نقشِ پا ہر ہر قدم پر چھوڑتا جائے گا وہ
ہاں طلسماتِ سکوں کو توڑتا جائے گا وہ   عالمِ خاموش کو جھنجھوڑتا جائے گا وہ
ایک دن آئے گا جب ننھا جواں ہو جائے گا

فرض جب اس کو پکارے گا کبھی جنگاہ میں   بے خطر بڑھتا چلا جائے گا، حق کی راہ میں
وہ سنبھل کر تیر مارے گا دلِ بدخواہ میں   ساتھ باطل کا نہیں دے گا تلاشِ جاہ میں
ایک دن آئے گا جب ننھا جواں ہو جائے گا

بستی بستی میں، خدا کا نام لے کر جائے گا   شہر شہر اللہ کا پیغام لے کر جائے گا
حق کے میخانے سے بھر کر جام لے کر جائے گا   جس طرف بھی جائے گا، اسلام لے کر جائے گا
ایک دن آئے گا جب ننھا جواں ہو جائے گا

ہاں اگر چاہا خدا نے وقت وہ آنے کو ہے   کافِ دلوں کی تیرگی، کافور ہو جانے کو ہے
میرا ننھا روشنی قرآں کی پھیلانے کو ہے   مضطرب انسانیت اک دورِ نو پانے کو ہے
ایک دن آئے گا جب ننھا جواں ہو جائے گا

میرا ننھا دیدنی ہوگا بشرطِ زندگی   جب عطا ہوگی اسے ایمان کی رخشندگی
وہ کرے گا دور کفر و شرک کی ہر گندگی   اور بندوں کو بتائے گا، طریقِ بندگی
ایک دن آئے گا جب ننھا جواں ہو جائے گا

—— + ——

ایک نازی لڑکی کا روزنامچہ

لالۂ صحرائی

یہ روزنامچہ مانچیو (جرمنی) کی ایک سترہ سالہ لڑکی کے اُن چند خطوط سے ترتیب دیا گیا ہے جو اس نے جرمنی کی شکست کے زمانے میں ہٹلر کے طوفانی دستے کے ایک نوجوان اور اپنے "محبوب" کے نام لکھے، اور بعد میں امریکیوں کے ہتھے چڑھ گئے۔

ہٹلر نے اپنی مخصوص سیاسی تربیت کے ماتحت جس قسم کی شخصیتیں تراشیں، ان کا ایک ہلکا سا اندازہ ان خطوط کے بین السطور سے کیا جا سکتا ہے۔ نوجوانوں کے جذبات کو ایک سریع الاثر اشتعال کی ترنگ پہ نچانا، اور پھر ان کی تمام شخصیت کو اپنی آمریت کی زخمہ در انگلیوں کے تحت ایک جذباتی باجہ بنا کر رکھ دینا، ——— یہ تھا ہٹلر کا اصولِ اجتماع!

ایک ایسا ہی جذباتی باجہ یہ لڑکی بھی معلوم ہوتی ہے، بظاہر تندیٔ جوش سے کھڑ کھڑ بجتی، لیکن بباطن خوف اور تشکیک کا خلائے بے پایاں! ...... بظاہر نہایت حالی تخیل، لیکن بباطن نہایت عصبی المزاج، ...... لرزتی، سہمتی، بڑھتی اور پیچھے ہٹتی سادہ لوح بچی! جو توپوں کی گھن گرج کا ذکر کرتے کرتے یکایک آلودں کی نایابی کا تذکرہ چھیڑ دیتی ہے، اور بموں کی پرواز کو بیان کرتے کرتے خالص گھی اور تازہ روٹی کی تمنا میں گھلنے لگ جاتی ہے! جس کی طبعی بے یقینی اور تشکیک کے جذبۂ وافر نے اسے جذباتی اشتعال کے چکر میں الجھا کر اس کی ذہنی دنیا، اور تخیل کے پیکر کو یوں پارہ پارہ کر دیا ہے، کہ وہ اپنے خطوط کا سعیٔ بسیار کے باوجود کوئی ایک موضوع نہیں بنا پاتی، اگرچہ اپنے خطوط میں کہیں کہیں وہ اپنے نصب العین کے علو کی طرف کچھ پھیکے پھیکے اشارات کرتی ہے، لیکن واقعہ میں اس کی زندگی کا نصب العین بس یہی معلوم ہوتا ہے، کہ ابلو، بھڑکو، اور پھر چپکے سے مرجاؤ!

ہٹلر نے قومی عصبیت کے تباہ کن جذبے کو تقدیسِ وطن کے احساس سے دو آتشہ کرکے اپنی خدائی کا تخت جمانا چاہا تھا، اور اس تخت کے لئے اس نے نوجوانوں کے فطری جذبۂ اشتعال اور طبعی جوش کی سرزمین کو تاکا تھا، لیکن ہوا یہ کہ، ——— دیکھتے ہی دیکھتے اس اشتعال کے سبک غبارے پھٹ گئے، پادر ہوا جوش کی بودی ردائیں پارہ پارہ ہو گئیں، اور ہٹلر کا تختِ خداوندی دھم سے نیچے پاتال کی تہوں میں لڑھک گیا!

ہٹلر کے اس حسرت ناک انجام میں دنیا کی ساری قوموں کے لئے ایک عظیم سامانِ موعظت پوشیدہ ہے، اور وہ یہ کہ جب تک ان گرم اور کھرے طبعی جذبات و اشتعال کو چند متعین اخلاقی قدروں کی آنچ سے مجلّا نہ کر دیا جائے، وہ بازارِ کامرانی میں ایک جنس کاسدھی بنے رہتے ہیں، اور انسانیت کی فوز و فلاح کی بجائے اس کے لئے تباہی و خسران کا موجب!

یہ جو ادھر چند دنوں سے ہمارے ہاں بھی چند درباری قسم کے نوجوانوں کی طرف سے "پاکستانی کلچر"، "پاکستانی ادب"، "پاکستانی قوم" اور اس قسم کی دوسری مجرّد قومی دلکی اور سراسر مبہم اصطلاحیں پیدا کی جا رہی ہیں، وہ قومی عصبیت کے اس شجرِ خبیثہ کا گویا بیج ہیں، جس کے بس بھرے ثمرات کھا کر دنیا کی کئی قومیں ابدی ہلاکت کا شکار ہو چکی ہیں!

ربِّ اکرم اُن دس لاکھ شہیدوں کے تصدق ہمیں اس خطرناک راہ اور اس مہلک انجام سے بچا لے، جنھوں نے محض اور محض "اسلامی کلچر"، "اسلامی ادب"، "اسلامی قوم"، اور "اسلامی ملک" کے قیام کے لئے اپنی جانیں نچھاور کی تھیں، اور جن کی اسیر اجل آنکھوں کے سامنے جب قیامِ پاکستان کا تصورِ قیامِ اسلام کی شکل میں ایک سیمیں بجلی بن کر تڑپا تھا، تو ان کے مقدس چہروں پہ چھائی ہوئی موت کی مردنی میں بانکپن کی کروڑوں لہریں ہوا ہو گئی تھیں!

اس ذہنی پس منظر کے ساتھ، آئیے آپ کو قومی عصبیت کے نشوں میں چور ایک جرمنی لڑکی کے روزنامچہ کی جھلکیاں دکھلائیں، فاعتبروا یا اولی الابصار۔

مانچیو: ۷، اکتوبر ۱۹۴۴ء

جب سے امریکی فوجیں اس شہر میں داخل ہوئی ہیں، میں اپنا طبعی توازن کھو چکی ہوں، اے کاش! مجھے صرف اتنا معلوم ہو جاتا کہ تم کہاں ہو، شاید زندگی کچھ گوارا ہو جاتی۔

کل میں نے سُنا، کہ اُن بزدلوں نے ہمارے محبوب شہر گلوکن پر پھر ہیبت ناک حملے کئے ...... میرے اچھے پطرس[1] رفتہ رفتہ یہ حقیقت مجھ پر واضح ہوتی جا رہی ہے، کہ موجودہ جنگ حقِ زیست کے مقدس جذبے کے تحت ہرگز نہیں لڑی جا رہی ہے، بلکہ یہ تو مادی طاقتوں کے زیادہ سے زیادہ حصول کی ایک جدوجہد ہے، یہی ہے! کتنا مکروہ مقصد ہے یہ۔

بھی سوچو تو، کہ اگر بدقسمتی سے امریکہ کے ہاں ہمارے ملک جیسی زرخیز زمینوں کی افراط نہیں ہے، تو اس میں ہم غریب جرمنوں کا کیا قصور؟ ایک شے کا کسی کے پاس وافر موجود نہ ہونے سے اس امر کی وجۂ جواز کیسے پیدا ہوگئی، کہ وہ مطلوبہ شئے کو زبردستی دوسروں سے ہتھیا لے؟

پطرس! واقعہ یہ ہے، کہ ہم جرمن لوگ طبعی اور فطری اعتبار سے اس بُری خصلت سے محروم ہیں، جو انتہائی رذیل طریقوں کے ساتھ چھوٹے چھوٹے بے بس ممالک کو اپنی طمع اندوزی کا شکار بنا لیتی ہے، اور پھر اسے "جنگ برائے جمہوریت" کا مقدس نام عطا کرتی ہے!

امریکی، اپنی مسلسل بمباریوں کی عادت کے باوصف، اب تک کہیں ایک جگہ بھی پیش قدمی نہیں کر سکے! بس یاس و نامرادی کے عالم میں سر دھنتے اور ڈھیٹوں کی طرح بکے جاتے ہیں کہ "واقعی سپاہیت جرمنوں پر ختم ہے!"

پطرس! کس قدر بزدل واقع ہوئے ہیں یہ امریکی!

۸، اکتوبر ۱۹۴۴ء

آج مطلع صاف ہے، اور سورج بے حجاب، دقت ہے، تو صرف یہ، کہ بموں کے دھماکوں کا سلسلہ ٹوٹنے میں نہیں آ رہا، اور توپیں دم بدم اپنے تڑاخوں کے ساتھ مسلسل جھنجھنائے جا رہی ہیں۔

جرمن سپاہی حملہ آور دستوں کا اس بے جگری کے ساتھ مقابلہ کر رہے ہیں، جو قدرتِ انسانی سے سراسر بعید ہے!

میرے نہایت پیارے، پطرس! آخر ہم کیوں کر ان مصائب کے مستحق ہوگئے؟ کیا ہم نے اپنے قلوب میں ایک مقدس نصب العین کی لو نہیں لگائی تھی؟ کیا اس مقصدِ پاک کے لئے ہم نے اپنے اندرون ایک عزمِ صادق کی بھٹی نہیں دہکائی تھی؟ —— اور پھر اپنی محبوب منزل تک پہنچنے کے لئے کیا ہم نے خود کو محنتِ شاقہ، اور جاں سپاری کی گھاٹیوں سے نہیں گزارا تھا؟ —— اگر ان سب کا جواب اثبات میں ہے، تو پھر مجھے کوئی بتلائے، کہ یہ سب کچھ کرنے کے باوجود ہم کیوں کر شکست کے اس عذاب کے مستحق ہوگئے، جو قانونِ قدرت کی طرف سے اب تک صرف بزدلوں کے حصہ میں ڈالا جاتا تھا!

کیا ہماری سال ہا سال کی جدوجہد، محنت، صعوبت اور جاں سپاری کے ساتھ کاٹ کر بہائی ہوئی قومی برتری کی تدریجی بلندی نامرادی کی ہولناک کھڈوں میں دھکیل دی جائے گی؟

---

[1] مکتوب الیہ کا نام۔

کیا قانونِ قدرت کی بے مثال ضابطہ پرست مشین ہمارے ہی حق میں حرکتِ معکوس کرے گی؟

نہیں، نہیں! پطرس، ایسا نہیں ہونا چاہئے، ایسا نہیں ہوگا! . . . . . دیکھو، دیکھو، مجھے یوں محسوس ہونے لگا ہے، کہ آخرکار ہم اپنی مصیبتوں کا جگر چیر ڈالیں گے، کیونکہ ہم ہیں بھی تو فولاد کی طرح سخت جان، اور جاں گداز! وہ ہم ہی تو ہیں جنھوں نے اپنے سچے قائد کے پہلے اور آخری نصب العین کے حصول کے لئے اپنی زندگی کی بازی لگا رکھی ہے، . . . . . پطرس! میں تو یہ یقین کامل رکھتی ہوں، کہ ہماری ساری کی ساری قوم قائدِ عزیز سے روگردانی کر لے، تو بھی ہم صادق وجانباز نوجوان اسے دُنیا میں سرفراز دیکھیں گے، اور اس کے عزم وعمل کا کبھی ساتھ نہیں چھوڑیں گے، ہو سکتا ہے کہ مقدر ہم پر بالآخر پھر ایک بار نگہِ لطف مبذول کر دے۔ اور ہمارا قائد پرانا ہمارا ایمان فتح ونصرت کے سم سم کو کھولنے کے لئے حرفِ طلسم کشا بن جائے!

اور پطرس! تم مطمئن رہو، کہ مصائب سے پُر موجودہ ایام میں بھی تمہاری محبوبہ، ایک روتی بسورتی عورت نہیں بنی، اس کے برعکس واقعہ یہ ہے، کہ میری طمانیت اور کبھی بعض اوقات گھر کے دوسرے پریشان ومضطرب لوگوں کو بے حد مشتعل کر دیتی ہے۔

ہو سکتا ہے کہ میں ان دنوں پیشتر سے ذرا کم ہنسا کرتی ہوں، لیکن خدا کا شکر ہے، کہ میری طبعی شگفتگی بالکل ہی ماند نہیں پڑی!

۹-اکتوبر ۱۹۴۴ء

آج یہاں کل کی نسبت آدم شکاری کا کھیل کم کھیلا جا رہا ہے۔ یہ خط لکھنے کے بعد میں تازہ ترین خبریں حاصل کرنے کی غرض سے شہر میں ادارۂ محبانِ وطن کے ہاں جاؤں گی۔ لیکن اس ادارے کے ارکان میں واحد لڑکی ہوں، چنانچہ میں وہاں جا کر عموماً مجوب سی رہتی ہوں، سچ پوچھو تو محجوبی میری ایک بہت بھاری کمزوری ہے۔ اور اگر اس کمزوری کا احساس کبھی غالب آ جائے، تو جی چاہتا ہے۔ یا خودکشی کر لوں، اور یا ــــــ اف! پاگل ہو جاؤں گی میں، یہ سوچ سوچ کر!

لیکن تم تسلی رکھو، ہمارے ادارے کے تمام ارکان "جمعیتِ نوجوانانِ ہٹلر" کے امرا میں سے، لہٰذا مجھے ان کے ہاں جا کر کام کرنے میں کوئی خطرہ نہیں ہے۔

پطرس! یہ جرمن بچارے ہمیشہ ہی مقدر کی واژگونیوں کا شکار رہے، تاہم ہم آخر کیوں ناامید ہوں، ہم تو شاہینوں کے وارث ہیں!

اور پھر دیکھو نا، یہ امریکی۔ تم جانتے ہی ہوگے، کہ آج کے امریکی باشندوں کی بیشتر تعداد اصلاً جرمن لوگوں پر مشتمل ہے۔ اور اب ہمارے یہی کٹے ہوئے بھائی اپنے ہی اجداد کی اولاد پر دیوث بن کر آ چڑھے ہیں، ــــــ ناخلف کہیں کے!

۱۰-اکتوبر ۱۹۴۴ء

پطرس!

میری پژمردگی کی کیفیت درجۂ آخر تک پہنچ چکی ہے۔ کل ہمارے ایک وفادار رفیق کو یہ معلوم ہوا، کہ ان پژمردوں میں سے دو صاحبزادیوں نے امریکی سپاہیوں کے ساتھ رقص کیا، اور سن لو، کہ یہ دونوں صاحبزادیاں، ہمارے ادارے کے قائدین میں سے ہیں، چھی، چھی! یہ سفلہ پرور لڑکیاں!

آج کا دن بڑا بھیانک تھا، چار سو مشین گنیں کھڑ کھڑ بجا کیں۔ اور ہیں گولیوں کی سیٹیوں کے مابین فضا میں جیسے چنگاریاں سی لپکا کیں، ابھی تک ہمارے دستے پہاڑی مورچے پر قابض نہیں ہو سکے۔ ادھر ہمارے طوفانی دستوں کے بیشتر نوجوان بھاگ کر قریبی جنگلوں میں روپوش ہو چکے ہیں، اور یہاں ــــــ امریکی بمبار طیارے ہمارے سروں کی رفعت سے ذرا ہی اوپر کامل بے تکلفی سے بھنبھنا رہے ہیں!

کل رات ہم ادارے میں دیر تک ڈاکٹر گوئبلز کی تقریر پر تبصرہ کرتے رہے، پطرس! میں گوئبلز کی اس بکواس کو کبھی معاف نہیں کروں گی، کہ دشمن کے مقبوضہ علاقوں کے لوگ خود کو جرمن کہلانے کے مستحق نہیں ہیں، اور یہ کہ ــــــ ہم لوگ اپنے گھروں میں گھس کر امریکیوں سے مل گئے ہیں، ہمیں کے ان فقروں نے ادارہ کے ہر شخص کو جوشِ غضب سے دیوانہ بنا ڈالا ہے۔ کیوں بے ظالم! ہم آخر کہاں جاتے؟ کیا ان کے اس یار

جہاں دشمن کی موت اگلتی توپیں، ہولناک اژدہوں کی مانند منہ کھولے بیٹھی ہمارا انتظار کر رہی ہیں؟
پطرس! سچ پوچھو، تو مجھے اب آن کر معلوم ہوا ہے۔ کہ خود کو جرمن کہلانے میں فخر و مسرت کی کیسی کیسی حسین کیفیتیں پنہاں ہیں، اپنے جرمن ہونے کا احساس ہوتے ہی انسان پر جنگ لازم آجاتی ہے!

سنتی ہوں کہ امریکیوں نے شہر والوں کو متنبہ کیا ہے۔ کہ یا تو دس بجے تک شکست قبول کر لو، ورنہ طیاروں اور توپوں سے برباد ہونے کے لئے تیار ہو جاؤ، پطرس، یہ کیا بکواس ہے، کیا ہمارے طوفانی دستے ان بزدل امریکیوں کے ہاتھوں، کبھی شکست قبول کر سکتے ہیں؟ ابھی تک مجھے اس کا یقین کیا معنی، تصور تک بھی نہیں آتا، ...... ہائے! کس قدر خوفناک ہے یہ حقیقت، کہ گوئبلز محض اس لئے ہمیں غداری کے القاب سے نواز رہا ہے۔ کہ ہم جرمن بن کر اور جرمن رہ کر لڑائی کی اس بساط پر جمے رہنا چاہتے ہیں! ..... ناشکرا شخص!

۱۱۔ اکتوبر ۱۹۴۴ء

آج صبح ہوتے ہی دشمن کے توپخانے نے گولہ باری شروع کر دی۔ اور اب تک یہ عمل اندھا دھند جاری ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ نشۂ نخوت سے بدمست ہو کر وہ لوگ اپنے جنگی نقشوں کو بھی نظر انداز کر چکے ہیں، شہر کے تمام حصوں، اور گوشوں سے مشین گنوں کے دھماکے سنائی دے رہے ہیں، اور ان کے ساتھ ہی بارود کا کثیف اور غلیظ دھواں عظیم الجثہ بگولوں کی صورت میں چمکیلے آسمان کی سمت لپک رہا ہے ——— کیا کرے گا یہ شہر!

۱۳۔ اکتوبر ۱۹۴۴ء

نادم ہوں کہ میں پرسوں والا خط ختم نہ کر سکی۔ کیونکہ ہمیں فی الفور پہلا ٹھکانا چھوڑنا پڑ گیا، اور خدا معلوم ابھی کہاں کہاں جانا ہوگا۔ سنا ہے کہ دشمن گھر گھر پھر کر چھپے ہوئے جرمن سپاہیوں کا کھوج نکال رہا ہے۔

۱۶۔ اکتوبر ۱۹۴۴ء

لو، اب ہم ایک اور جگہ آگئے، یہ تمہارے مولد کا نواحی قصبہ لافن برگ ہے، اور اس کے ایک بوسیدہ سے مکان میں ہم پناہ گزین ہو رہے ہیں، لیکن بھئی، مجھے تو یہ جگہ قطعی پسند نہیں آئی۔ چاروں طرف بڑے غلیظ لوگ آباد ہیں، غلیظ بھی، اور غریب بھی! بھلا بتلاؤ ایسی بستی میں ہم نادار مسافر کیا کریں؟

جان سے عزیز پطرس! آج تمہاری سالگرہ ہے، لیکن صد حیف، کہ تمہارا کچھ پتہ نہیں، اے کاش، مجھے کسی طرح تمہارے موجودہ ٹھکانے کا پتہ چل جاتا، یا کم از کم یہی معلوم ہو جاتا، کہ اپنے محبوب ساتھیوں کے ساتھ تم کونسے جنگل میں چھپے ہوئے ہو، تو بھی، تمہاری دیوانی تمہیں کسی نہ کسی طرح ڈھونڈ ھ نکالتی، لیکن اب؟ اب؟ ——— اب تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے تم کہیں ازل اور ابد کی طویل کشاکش میں جا چھپے ہو ....!

ہمارے محبوب شہروں، ڈیوس اور ایکن پر آج کل ایک بے حد خوفناک تقدیر محیط ہے، خدا نہ کرے، کہ ان کا انجام بھی ہمارے دوسرے شاندار شہروں کی مانند ہو، اف! اس انجام کا محض تصور ہی بڑا وحشت ناک ہے، وحشت ناک، اور خوفناک! بھئی، تم جانو، میں تو ہر امر کو وقت اور تقدیر کے سیلِ بے پناہ کے حوالے کر دینے کی قائل ہوں۔ کیونکہ جانتی ہوں، کہ مقدر کو بدلنا ہمارے بس سے باہر ہے! .... لیکن تم کہو گے، کہ یہ سب درست، پر ہمیں کامل صدق و خلوص کے ساتھ اپنی جدوجہد تو جاری رکھنا چاہئے، پطرس! تمہارے اس ارشاد سے پہلے ہی میں اس پر عمل کر رہی ہوں، اور اپنی سی جدوجہد کئے جا رہی ہوں، یقین کرو، ..... اچھا لو، دیکھو، یہ میرے داہنے ہاتھ کی انگلیاں، ..... خون رس رہا ہے نا ان میں سے؟ وجہ؟

——— ابھی ابھی ان کے ساتھ ایک بم کا آہنی ریزہ آن چپکا تھا، اور اس کے باوجود میں بڑی بے فکلی کے ساتھ یہ خط لکھے جا رہی ہوں، کیوں جاری ہے نا، میری جدوجہد؟ اچھا، تو اب مسکرا دو، مسکرا دو نا! ......

پطرس! میرے علاوہ، تمہارے والد بھی تو تمہاری خیریت کا پتہ نہ ملنے کے باعث ہراساں و پریشان ہوں گے، لیکن تم یقین رکھو، کہ اپنی سی جدوجہد ہمارے وہ قابلِ احترام بزرگ بھی ضرور فرما رہے ہوں گے، جدوجہد، جدوجہد، جدوجہد، جدوجہد! میری، تمہاری، میرے تمہارے بزرگوں کی، میرے تمہارے عوام کی، اور میرے تمہارے محبوب قائدِ اعظم، ہر ہٹلر کی ——— جدوجہد! ...... بارِ الٰہ کب نکلے گا اس عظیم و جلیل جدوجہد کا نتیجہ!

۱۷۔ اکتوبر ۱۹۴۴ء

آج طوفانی دستے کے ایک نوجوان سے میری ملاقات ہوئی، یہ حال ہی میں دشمنوں کی قید سے بھاگ کر یہاں پہنچا ہے، اگر تم بھی یوں اچانک کبھی میرے سامنے آجاؤ، تو یہ اچانک ملاقات کس قدر مسرت انگیز ہوگی، پطرس! آہا! ......

آج بڑی بھاری جوکھوں کے بعد میں اپنے گھر گئی، دراصل اپنے موجودہ ویران ٹھکانے میں مجھے جو سب سے بڑی تکلیف تھی، وہ خبریں نہ ملنے کی تھی۔ (اگرچہ ہم خود بھی ایک بہت بڑی خبر یہاں بنا رہے ہیں!) میں نے مصمم ارادہ کر لیا، کہ میں ہر قیمت پر گھر پہنچ کر وہاں سے اپنا ریڈیو سیٹ اٹھا لاؤں، چنانچہ میں وہاں جا کر سیٹ لے آئی ہوں، فرانسیسی سیٹ ہے یہ! تم نے تو دیکھا ہوگا، ...... گھر سے واپسی پر، میں ایک مدفون سرنگ پر پاؤں دھرنے سے بال بال بچ گئی، ایک امریکی نے عین وقت پر لپک کر میری جان بچائی، ...... ذری تصور تو کرو کہ اگر میرا قدم سرنگ کی کمانی پر جا پڑتا، تو؟ ...... ہائے ری زندگی! اتیرے اندر یہ پیار کے سمندر کس نے انڈیل رکھے ہیں!

لو، ابھی ابھی ہمسائی خبر لائی ہے۔ کہ طوفانی دستے کے چند اور نوجوان دشمن کی قید سے بھاگ کر یہاں آپہنچے ہیں،

پطرس! پطرس! پطرس!!

آہ کالگن، میرے اپنے شہر کالگن! تمہارا کیا حشر ہو رہا ہے، کیا اس وسیع و عریض کائنات کے کسی گوشے میں انصاف نامی کوئی وجود باقی ہے؟ اگر ہے، تو خدارا اسے کوئی آواز دے، اور وہ کالگن میں آکر اپنی آنکھوں سے ظالموں کے ظلم اور مظلوموں کی بربادی کا تماشا دیکھے...... لیکن کہتے ہیں، انصاف اندھا ہوتا ہے، تو پھر کون دیکھے گا، یہ ہولناک تماشا، کون تماشا رچانے والے ظالموں کو ان کے مظالم کی ہولناکی کے مطابق سزا دے؟ کون؟ کون ہے وہ ہستی! پطرس، میں اس قادر و توانا ہستی کے حضور فریاد لے جانے کے لئے تڑپ رہی ہوں، میرے دل میں آج انتقام کا جوالا مکھی بری طرح بھڑک اٹھا ہے، ...... لیکن ہائیں، یہ اب تک ردی والا کیوں نہیں آیا! ......

کل ہماری ٹولی کے ایک شخص کو یہ پتہ چلا ہے۔ کہ "جمعیت نوجوانانِ ہٹلر" کے تمام ارکان کو فرانس میں ملبہ صاف کرنے کی بیگار پر بھیجا جا رہا ہے، لیکن میں نے ٹھان لی ہے۔ کہ اپنی باری آنے سے پیشتر ہی کسی طرف منہ اٹھا کر نکل جاؤں گی!

۱۹۔ اکتوبر ۱۹۴۴ء

بھلا، جرمنی کی عوامی فوج کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے، یہاں تو یہ لوگ اسے مجرمانہ تنظیم، اور قتل عام کا مستحق قرار دے رہے ہیں! ...... میرے خیال میں عوامی فوج کا ظہور اس بات کی علامت ہے، کہ ہمارے ہاں اب ہتھیار نہیں رہے، اور ہماری سرکاری فوج روز بروز ختم ہوتی جاتی ہے! پطرس! اس احساس کا خنجر دل کو مروڑ رہا ہے۔ کہ ان طویل سالوں میں ہمارے نوجوانوں نے جو عظیم و جلیل قربانیاں کیں وہ سب ریت میں انڈیل دیئے جانے والے شہد کی مانند اکارت جائیں گی! نہیں، یوں نہیں ہو سکتا، ورنہ، پطرس، ہم نوجوانوں کا کیا حشر ہوگا؟

ٹینک شکن جرمن مشین گن نے ابھی ابھی پھر ضرب اندازی شروع کی ہے، آئیفل کے جنگل میں لڑائی اب نہایت کٹھن ہوتی جا رہی ہے امریکی جنگل کے کنارے تک تو پہنچے ہیں، لیکن گھنے درختوں میں گھسنے کی تاب نہیں پا رہے، بزدل! ان رقص و سرود کے رسیا امریکیوں کو سپاہیت کی تو ہوا تک نہیں لگی، لڑائی اور دھاوا ان کے لئے خالص بدیشی الفاظ ہیں، مجھے کامل امید ہے۔ کہ آج امریکیوں کی خوب ٹھکائی ہو رہی ہے!

پطرس، جب مجھے ماینچوی میں گزاری ہوئی گھڑیاں یاد آتی ہیں، تو جی امڈ سا آتا ہے۔ اور سامنے چمکیلی دھوپ میں دمکتے ہوئے ہر ذرے کے اندر تمہاری حسین شبیہ رقصاں نظر آنے لگتی ہے، آہ! ماضی کی وہ نورانی ساعتیں کس قدر گریز پا تھیں، اس آوارہ بدلی کی سیمیں بجلی کے مانند، جو کسی بدنصیب کسان کی کھیتی پر صدیوں بعد آ کر برسے، اور پھر چند ہی لمحوں کے بعد دوبارہ آسمان کی وسیع پہنائیوں میں ہمیشہ کے لئے کھو جائے!

حیران ہوں کہ ان دنوں انسانیت کا احساس کہاں جا کر مر گیا ہے، ہولناک جنگلوں میں پیوست یہ وحشی دنیا، کیا ہم گنتی کے دو انسانوں پر بھی رحم نہیں کھا سکتی؟ —— لیکن یہ میں کیا کہہ رہی ہوں، ہمیں اس رحم وحم کی ہرگز ضرورت نہیں، جب کہ میرا یہ ایمان ہے، کہ:۔

زندگی کے معنی ہیں: لڑنا۔

اور لفظ جرمن کے معنی ہیں: ثابت قدم رہنا!

یقین رکھو کہ میں اپنی زندگی کے آخری لمحے تک لڑوں گی، اور وفادار اور ثابت قدم رہوں گی۔ اور نہ صرف میں، بلکہ تم دیکھو گے، کہ میرے بچے بھی، اسی نصب العین کی چھاؤں میں پلیں اور بڑھیں گے —— خدا کی قسم!

۲۱۔ اکتوبر ۱۹۴۴ء

پیارے! آخر ہم اب کیوں جرمنی کے وفادار بن کر زندہ نہیں رہ سکتے؟ ماینچوی میں اب صرف تین ایسے جرمن باقی رہ گئے ہیں جن کی وفاداری مشکوک نہیں ہے۔ کیا یہ حقیقت خوفناک نہیں؟

ہمارے ہاں نوجوانوں کے ضمیر بگاڑے جا رہے ہیں۔ پندرہ پندرہ سال کے نوعمر لڑکوں کے ہاتھ میں امریکی سگرٹ تھما دیئے جاتے ہیں۔ اور انھیں تمباکو نوشی کا چسکا لگایا جا رہا ہے۔ پطرس! یہ سن کر تمہارے دل نے اندر ہی اندر بل نہیں کھایا؟ نوجوانوں کی عصمت، اور بلند اخلاقی کے بارے میں کہاں ہے وہ ہمارا معیاری زاویۂ نظر؟

کل دو امریکی سپاہی ہماری سابقہ امیر جیش کو اس کے شیر خوار بچے سمیت پکڑ کر لے گئے، وہ لوگ اس خاتون سے ضلع کے جرمن حاکموں کا موجودہ پتہ معلوم کرنا چاہتے ہیں، لیکن وہ یقیناً انھیں کچھ نہیں بتائے گی۔ شاید اس کے بعد میری باری آئے، جانتے ہو، میں انھیں کیا جواب دوں گی؟ یہ، کہ حاکم ضلع ایکن بھاگ گیا ہے۔ اور چونکہ اس کی دونوں ٹانگیں چوبی ہیں۔ لہٰذا اسے بآسانی ڈھونڈا جا سکتا ہے۔

اگرچہ یہ بیان سراسر جھوٹ ہوگا، تاہم اس سے ہوگا بھی کیا!

۱۷۔ اکتوبر ۱۹۴۴ء

کل یہاں پہ جہنم کے دروازے کھول دیئے گئے ہیں!

مشین گنیں تڑاتڑ گولے برساتی رہیں، آسمان آتش گیر مادے کے مسلسل پھٹتے رہنے کے سبب سارا دن ایک دہکتی ہوئی بھٹی کی مانند سرخ رہا، اور اس کے نیچے نودارد امریکی ٹینکوں اور توپوں کی دہشت ناک گھن گرج اپنی لہروں کو دن بھر معلق کئے رہی۔ اس شور و غوغا میں "ہمارے پھیپھڑے بہوں" کی مدھم، لیکن دور دور تک نفوذ کر جانے والی گنگناہٹ سارے منظر کو جیسے چھیدتی جا رہی تھی، اف! کیسے بیان کروں اس جہنمی غل غپاڑے کی تفصیلات!

آج امریکیوں نے ہم سب کو اپنے فوجی دفتر میں طلب کیا، اغلباً کل سے ہم اپنے گھروں میں نظر بند کر دیئے جائیں گے!...... اور پھر

پھر ———؟

۲۸۔ اکتوبر ۱۹۴۴ء

پطرس!

میں ابھی تک اپنا طبعی توازن درست نہیں کر پائی، خوف و دہشت نے میرے روئیں روئیں کو لوہے کے تاروں کی مانند ایستادہ کر دیا ہے،

جانتے ہو کیوں؟ لو سنو،

آج بصد مشکل ہمیں صرف ایک گھنٹے کے لئے ایکن میں اپنے گھروں کو دیکھنے کی اجازت ملی، اور غالباً ذہنی عذاب میں مبتلا کرنے کے لئے!.....

میں جب اپنے گھر میں داخل ہوئی۔ تو صحن میں گھپ اندھیرا سائیں سائیں کر رہا تھا، خوف سے دھڑ دھڑ بجتی میں آگے بڑھی، تو مثا میرا پاؤں کسی شئے سے جا ٹکرایا، میں فوراً سمجھ گئی، کہ ٹھکرانے والی شئے ایک انسانی نعش تھی، اور اس احساس کے ساتھ ہی میرے رگ و پے میں ایک برفانی لہر دوڑ گئی، جسم کا لہو جیسے جم گیا، اور دل و دماغ پر جیسے ہتھوڑے برسنے لگے!...... میں نے ہزار ہا دقتوں کے ساتھ اپنی لڑھکتی ہوئی طاقت کو جمع کیا، اور پوری وحشت کے ساتھ حلق سے اٹھتی ہوئی چیخ کو نگلا۔ من من بھر کے پاؤں اٹھا کر میں نے کہیں صدیوں کے اندر تین قدم اٹھائے، اور قمیص کی جیب سے دیا سلائی نکال کر روشن کی۔ اس کی مدھم روشنی سب سے پہلے میرے قدموں میں پڑی ہوئی نعش کے چہرے پر پڑی، میرے خدا! یہ ایک جرمن تھا، ظالموں نے قتل کرنے کے بعد اس کے خدوخال بری طرح سے مسخ کر دیئے تھے، کالے بھجنگ اندھیرے کے اندر دیا سلائی کی پیلی پیلی نیم جان روشنی میں لیٹی ہوئی ایک مسخ شدہ انسانی نعش!........ افوہ، پطرس! ذرا تصور تو کرو، کہ میں آخراب تک پاگل کیوں نہیں ہوئی،........ یہ منظر دیکھ کر خوف و دہشت نے میرے اندر گویا کوک سی بھر دی، اور میں تیز تیز قدم اٹھاتی بالاخانے کی سیڑھیاں چڑھ گئی۔ وہاں روشنی موجود تھی، لیکن فرش پر ایک زخمی جرمن سپاہی پڑا کراہ رہا تھا۔ اور پھر اس کی زبانی مجھے گھر کی بربادی کا حال معلوم ہوا۔

یہ دونوں جرمن سپاہی آج سے تین روز پہلے امریکیوں سے چھپتے چھپاتے ہمارے گھر کے پائیں باغ میں پناہ گزین ہو گئے، کل جب ان کو چار روز کی بھوک اور پیاس نے بے کل کر دیا تو وہ ہمارے گھر کے اندر داخل ہو گئے۔ تھوڑے ہی عرصے بعد انھوں نے نیچے سیڑھیوں پر کچھ آوازیں سنیں، اور پھر دفعتاً انھوں نے اپنے روبرو چند امریکی سپاہی ایستادہ پائے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا۔ اس کی ذہن میں خود ہی تصویر بنا لو...... صندوق، الماریاں اور دراز سب کے سب خالی پڑے بھائیں بھائیں کر رہے تھے۔ اور ان کی غیر پسندیدہ اشیاء فرش پر جابجا بکھر رہی تھیں۔ رس بھری کا شربت فرش پر لنڈھا دیا گیا۔ اور الماریوں میں سے اکثر کپڑے نوچ نوچ کر اس شیرہ پر پھینک دیئے گئے تھے۔ میں تمہیں ایک اور اندوہناک منظر کا حال بتاؤں۔ اُن خناسوں نے انتہائی بے دردی کے ساتھ ہمارے لکھنے والے میز کی پتلی کا سطح آہنی سلاخیں مار مار کر اسے تہس نہس کر دیا تھا، ——— ہائے کیسے یقین کروں اپنی عزیز اشیاء کی اس وحشیانہ تباہی پر!

پیارے پطرس، میری ایک بات مانو گے؟ تم بھی سپاہی ہو، اور مزید برآں ایک طوفانی دستے کے سپاہی! لیکن جلی، میری ایک درخواست سدا یاد رکھنا، اور وہ یہ کہ بے گناہ شہریوں کو کبھی اپنی سپاہیت کا نشانہ نہ بنانا!........ اگر باہر پھرتے ہوئے تمہیں کبھی بھوک ستائے، اور تمہارے اپنے پاس کھانے کے لئے کچھ نہ ہو، تو تم کھانے کی کوئی چیز بے شک کسی گھر سے حاصل کر لو لیکن اس کے بعد؟ اس کے بعد انھیں کچھ نہ کہو،..... بے ضرر عوام کو ستانا بڑا ہی مکروہ فعل ہے! ——— سنتے ہو؟

۲۹۔ اکتوبر ۱۹۴۴ء

ہر چالیس منٹ کے بعد ایک "بھونرا بم" اپنی جہنمی گنگناہٹ سے کانوں کو جیسے سماعت کے کسی بھنور میں دھکیلے جاتا ہے.....

دشمن برسیلز اور لیج تک پہنچنے کا تہیہ کئے ہوئے ہے!

میری ایک پڑوسن لڑکی جو چھ ہفتے پیشتر زخمی ہو گئی تھی۔ اب واپس گھر لوٹ آئی ہے۔ بچاری کو ابھی کم از کم دو تین ماہ بستر پر پڑا رہنا ہوگا۔ اس کی دائیں ٹانگ میں گھٹنے سے ذرا اوپر لکڑی کی ایک نوکیلی کھپچی اتر گئی ہے۔ ادھر چونکہ ماہیجیو میں بجلی میسر نہ تھی، لہذا اسے امریکی ریڈ کراس کی طرف سے بلجیم کے ایک شہر میں بھیجا گیا، اور وہاں ایکس رے کے ذریعے معلوم ہوا۔ کہ بچاری کا گھٹنا ٹوٹ گیا ہے۔ اسپتال میں چند روز تو اس کی مجروح ٹانگ کا باقاعدہ علاج کیا گیا، اس کے بعد جب اسے بخار بھی لاحق ہو گیا، تو اس کی نگہداشت چھوڑ دی گئی۔ اور دو ہی دن بعد اسے ہمبرگ کے ایک سرحدی اسپتال میں پہنچا دیا گیا۔ ہمبرگ سے اسے ہمارے نواحی گاؤں لیگے بھیج دیا گیا، جہاں اس نے بلجیم والوں کی نفرت و حقارت کا مزا چکھا، اور اس کے ساتھ ساتھ ہمارے بھونرے بموں کا بھی! ——— کل مجھے ملی تو چھوٹتے ہی کہنے لگی "کیا آج ایک روٹی نہیں دلواؤ گی کہیں سے!" میں نے وعدہ کیا۔ تو اس کا پیلا چہرہ یوں دمک اٹھا، جیسے وہ یکایک کسی تنور کی آنچ کے قریب آ گیا ہو، بڑے تکلف کے بعد ایک مردہ سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر رینگی، اس نے زبردستی میرا ہاتھ پکڑ کر بھینچا، اور پھر بولی "جانِ من! یاد رکھو جرمنی اور فتح دو لازم و ملزوم الفاظ ہیں!"

آہ، فتح! جرمنی کی فتح!..... لیکن پطرس، فتح آنے تلک ہم روٹی کے بغیر زندہ کیسے رہیں گے؟

یکم نومبر ۱۹۴۲ء

ہماری جنگ اس وقت آخری مراحل پہ ہے، اور اس کے ختم ہو جانے پہ ہم شاید اپنی ہر شے کو ہار بیٹھیں، لیکن ایک چیز کو ہم سے کوئی طاقت نہیں چھین سکتی، اور وہ ہے، ہمارا طرزِ فکر، اور طرزِ زیست! کیونکہ ہمارے نوجوانوں کے سینوں میں ان دونوں متاعِ عزیز کے بڑے بڑے خزانے بند کر دیئے گئے ہیں! ہم نے قوم کے لئے مرنے اور مٹنے کا جذبہ وراثت میں پایا ہے۔ اور لڑتے بھڑتے ہی ہم پلے اور بڑھے ہیں، ہم اپنی نئی زندگی کو بھی، خواہ وہ کیسی ہی یاس انگیز صورت رکھتی ہو، مرنے اور مٹنے کے انہی اصولوں کے سایہ میں پروان چڑھائیں گے، ہمیں بہتری کی ہمیشہ امید رکھنی چاہیئے، اور جرمنی کے خوش آئند مستقبل پہ پختہ اعتماد کرنا چاہیئے،......

خدا کا شکر ہے۔ کہ گزشتہ دو دن سے ہمیں گوشت کافی مقدار میں مل رہا ہے، یعنی ہفتہ میں ایک سیر فی کس، لیکن اغلباً سردیوں میں ہماری فاقہ کشی کی نوبت آ جائے گی۔ آلوؤں کی فصل تا حال زیرِ زمین ہے، چپاتیوں کا مسئلہ بھی خاصا ٹیڑھا ہو چکا ہے۔ ایک ایک عدد کے لئے انسان کو مسلسل چار چار گھنٹے قطار بندی میں کھڑے ہو کر انتظار کرنا پڑتا ہے۔ کیا یہ صورتِ حال خوفناک نہیں ہے؟

ابھی ابھی میں نے پانچ بجے والی خبریں سنی ہیں، حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں!

لیکن مجھے اس حال میں بھی جرمنی کی فتح کا پورا یقین ہے۔ گھر میں میرا یہ یقین ہمیشہ سے موردِ عتاب بنا رہتا ہے، لیکن مجھے امید ہے، کہ بس ایک دو روز کے اندر ہی انہیں معلوم ہو جائے گا کہ میں حق پر تھی، اور میری نگاہیں ان سے زیادہ دور رس تھیں۔

آج کل زندہ رہنے کے معنی ہی یہ ہیں، کہ لڑا جائے!

۵۔ نومبر ۱۹۴۲ء

پرسوں سے بھوکی ہوں، روٹی اور مکھن کی نہایت کمی آ چکی ہے۔ ادھر یہ سوچ کر دیوانی ہوئی جاتی ہوں، کہ دشمن ہمارے حسین جرمنی اور ہماری صدیوں پرانی زبان کو اپنا غلام بنانے پر تل گیا ہے...... آخر ہمارا حشر یوں کیوں ہو؟ محض اس وجہ سے، کہ گو ادھر چند دشمن آرام کرسیوں پہ دراز ہو کر ہمارے خلاف بے بنیاد افسانے گھڑتے رہتے ہیں؟..... جرمن سپاہی کی جاں سپاری پہ میرا یقین و اعتماد تا حال قائم ہے۔ کیونکہ وہ اقوام کے سپاہیوں کے مقابلے میں بہادر و حوصلہ مند واقع ہوا ہے۔ اس میں شبہ نہیں، کہ دشمن کے پاس وسیع ساز و سامان موجود ہے۔ لیکن

ان کے سپاہی بمقابلہ ہمارے سپاہیوں کے نہایت ہی دہشت زدہ اور ڈرپوک واقع ہوئے ہیں، لیکن ہٹلر! یہ جنگ سپاہیوں کی بجائے ماؤں سے لڑی جا رہی ہے، پھر بتاؤ! میرے بہادر سپاہی! اس کا مقابلہ تم کیسے کرو گے؟ ....

آج صبح ایک بم دندناتا ہوا آیا، اور مجھے جگا گیا، چند ہی لمحوں کے بعد ہم نے ایک عظیم دھماکہ سنا، سارا مکان ڈولنے لگ گیا، اور دروازے اور کھڑکیاں دھڑ دھڑا کر کھل گئیں، ....

فضا میں جدھر بھی نظر اٹھتی ہے، طیارے ہی طیارے سنسناتے ہوئے نظر آتے ہیں، آہ ہمارے بے بس بھائی، اور نفیس شہر! ....

اب گھر والوں سے میری نہیں نبھ سکتی، آج صبح ناشتے پر میرا ان سے پھر جھگڑا ہو گیا، محض اس وجہ سے، کہ میں ناشتے کے بعد کہیں یہ کہہ بیٹھی، کہ "بھئی میری تو بھوک مٹی نہیں!" میرا بھائی اس پر بولا "اوہو! اب تو بی سپاہن کو بھی بھوک لگنے لگی"! نانی اماں نے اور جلی کٹی سنائیں "اے بیٹا! دیوانہ ہو گئی ہے بھلا تو اور بھوک؟ چہ، چہ، چہ! ابھی تو میری بٹیا کا لاڈلا سورما ہٹلر دشمنوں کے جگر چیرتا ہوا آ رہا ہوگا، اب اس کی فوج ظفر موج آئی، کہ آئی، لو سنو، وہ ان کی سلامی کا گولا چھوٹا! لیکن نہیں، یہ تو انھی موئے امریکیوں کا بم ہے! .... چہ! چہ جانورے ہو، ابھی نہ برسو، بھوک لگی ہے میری ننھی سی جان کو!" ....

ظاہر ہے، کہ اس کے بعد مجھے کمرے سے نکل جانے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا! آج ہمارے ٹھکانے کے گرد بھی گولیاں برسیں! ......

اللہ، خیر گزارے! ...... سنتی ہوں کہ آج رات ہر ہٹلر ریڈیو پہ تقریر فرمائیں گے، کیا واقعی؟ لیکن میں حیران ہوں، کہ اگر جرمن اعظم بولا، تو میں اس کی تقریر کیسے سنوں گی؟ گھر والے تو اس کی آواز سنتے ہی ریڈیو بند کر دیں گے، اور پھر بھیا سرخ سرخ آنکھیں نچا کر گالیوں کی بوچھاڑ شروع کر دے گا!

پھر، پھر، کیسے سنوں اس کی تقریر!

آج صبح سے بطور احتجاج میں نے ناشتے کے بعد کچھ نہیں کھایا!

۹- نومبر ۱۹۴۴ء

آج صبح سے برف گر رہی ہے، ماضی کے برباد موسم ہمارے لئے باہمی ہنسی مذاق کا جو رنگین پیام لاتے تھے، افسوس! کہ وہ آج کسی کو میسر نہیں، آج تو ہمیں بازاروں اور گلیوں میں نکلنے تک کی اجازت نہیں! ..... باورچی خانوں میں آلو کا چھلکا تک نظر نہیں آ رہا، اور ان سب پہ مستزاد یہ، کہ ہم اپنے یخ بستہ بازاروں میں اپنے دشمنوں کو گلکاریاں مارتے ہوئے موجود پاتے ہیں، اور یہ سب کچھ سہتے چلے جا رہے ہیں، اُف! کیا قیامت کا عالم ہے۔

خدایا، کیا یہ بازار ان خناسوں کے وجود سے پاک ہو کر کبھی جرمن چہروں سے نہیں سجیں گے؟

آج میں نے یہ سنا ہے، کہ جرمنی کی طرف سے وی-۲ بم کا استعمال شروع ہو گیا ہے۔ بھئی خوب ہوا! مجھے کامل امید ہے کہ اس کے ذریعے ہمیں کافی تقویت پہنچے گی، ..... دیکھئے کیا ہو!!

کل شب میں نے قائدِ اعظم کی تقریر کا تا دیر انتظار کیا، لیکن اس کی آواز سنائی نہ دی، کل تک اس کا وجود میرے لئے ایک عظیم ترین سہارا بنا ہوا تھا، لیکن شب کو اس کی آواز نہ سن کر یوں محسوس ہونے لگا ہے، جیسے کسی نے مجھے ایکا ایکی ثریا کی رفعتوں سے پاتال کی گہری کھڈوں میں پھینک دیا ہے، سخت حیران ہوں، اور سخت سراسیمہ، ...... آج یہ بھی سننے میں آیا ہے، کہ ہملر نے ہمارے محبوب قائدِ اعظم کو قید کر دیا ہے، بار الٰہ یہ کیوں ہوا! ادارہ علیہ بھی تو قائدِ اعظم کی کوئی خبر نہیں دیتا! ... ہائے ری دنیا! .... قائدِ اعظم، تجھے کیا ہوا؟ تو رات کیوں نہیں بولا؟ دیکھ ہماری امیدوں کے سدا بہار کنول کملائے جا رہے ہیں! دیکھ ہماری اکھڑی ہوئی سانسوں میں جرمنی کی شکست کے نوحے گونج رہے ہیں، دیکھ، ہمارے لئے، تیرے محبوب نوجوانوں کے لئے، یہ وسیع و عریض کائنات سوئی کے ناکے کی مانند تنگ ہوتی جا رہی ہے، ــــ "ہمارے محبوب قائد! لے ہم دیوانوں کے اندر لٹکتے ہوؤں کے ہاتھ تھام! انہیں بچا لے، ہیں، ہیں، اپنے محبوب نوجوانوں کو! ــــ ارے! اوہ ایک بم ہمارے ٹھکانے پر گرا! ہٹلر! ہٹلر!

— + —

حضرت خواری کو بیخ و بُن سے اکھیڑ دینے کا ارادہ رکھتا ہے۔ بجائے پولیس کی جمعیت اکٹھی کرنے کے وہ اپنے دل کو ٹٹول کر دیکھے۔
ہیں حکومت سے خواہ مخواہ کی کوئی کد نہیں ہے۔ کہ اس کے ٹھیک کاموں میں بھی کیڑے نکالیں۔ اگر وہ کوئی واقعی مفید کام کرنے کے
تیار ہو تو ہم اس کا ہر طرح ہاتھ بٹائیں گے۔ لیکن پولیس پر اخراجات کی زیادتی اس بات کی غمازی کر رہی ہے کہ اسے محض اپنی ساکھ بڑھانے
کی فکر ہے۔ اپنے ہاتھوں کو زیادہ سے زیادہ مضبوط کرنا مطلوب ہے۔ اور اس سے عوام کی حفاظت درکار نہیں بلکہ مسندِ اقتدار کی حفاظت
کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ پولیس کا اضافہ شہری آزادی پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لئے کیا گیا ہے۔ جو پولیس پہلے سے موجود ہے وہ
کونسے ایسے قابلِ فخر فرائض سر انجام دے رہی ہے کہ ہم آئندہ اس سے کوئی اچھی توقعات وابستہ کر سکیں۔ حالات جس طرح کے ہیں
اُن میں ہم خوش فہمی کی آخری سرحدوں کو چھو کر بھی اس خرچ کو کسی طرح حق بجانب خیال نہیں کرتے اور اُسے مالیات پر بے جا بوجھ تصور کرتے ہیں۔
اسی طرح عام نظم و نسق پر بھی زرِ کثیر خرچ کیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں ہمیں جو کچھ اعتراض ہے وہ تنخواہ کے مابین تفاوت پر ہے۔
کیونکہ اسی کی وجہ سے اجتماعی عدل کا حصول ناممکن ہوتا ہے۔ بعض خوش قسمت تو ایسے ہیں جو ہزاروں روپے تنخواہ پانے کے ساتھ
اتنے ہی الاؤنس بنا لیتے ہیں۔ پھر ان کے بنگلوں اور کاروں کے اخراجات کا بوجھ بھی حکومت کے کندھوں پر ہی ہوتا ہے اور اسی حکومت
کے چند وہ کارندے ہیں جو روٹی کے نوالوں کے لئے بھی ترستے ہیں۔ ان کے معاوضے اس قدر کم ہیں کہ وہ ان کے خاندان کے تو کیا خود ان
کے .... اپنے جسم و روح کے رشتہ کو قائم رکھنے کے لئے بالکل ناکافی ہیں۔ اُن کے بچے تعلیم سے محروم رہ جاتے ہیں۔ ان
کے ہاں اگر کوئی بیمار پڑ جائے تو وہ ہمت نہیں رکھتے کہ ڈاکٹروں کی فیس کا بوجھ برداشت کر سکیں اور اسی کس مپرسی کی حالت میں جان
جانِ آفریں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ ان پر ترقی کے تمام دروازے مسدود ہیں۔ آرام اور سکون ان کے نزدیک شجرِ ممنوعہ کے پھل ہیں، وہ
پیدا ہی اس لئے ہوئے ہیں کہ افلاس اور جہالت کا شکار ہوں۔ اس تفاوت نے دنیا کو کئی بار فساد کی طرف دھکیلا ہے۔ بڑے بڑے
افسروں کو جو زیادہ معاوضے دیئے جاتے ہیں تو اس کی اصل وجہ یہ نہیں کہ انھیں اس کی ضرورت ہے۔ بلکہ اس کا اصل مقصود ان کی ٹھاٹھ
کو قائم رکھنا ہوتا ہے۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنی مشہور کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں صالح اقتصادی نظام کی ضرورت پر بحث
کرتے ہوئے اسی ضرورت کو نمایاں کیا ہے۔

"جب پارسیوں اور رومیوں کو حکومت کرتے صدیاں گزر گئیں اور دنیوی تعیش کو انھوں نے اپنی زندگی کا شعار بنا لیا اور
آخرت کو بھلا دیا اور شیطان نے ان پر قبضہ کر لیا تو اب ان کی زندگی کا حاصل یہ بن گیا کہ وہ عیش پسندی کے اسباب میں
منہمک ہو گئے۔ اور ان میں کا ہر شخص سرمایہ داری اور تمول پہ فخر کرنے اور اترانے لگا۔ حتیٰ کہ ان کے امرا اور سرمایہ داروں
کے لئے یہ سخت عیب اور عار سمجھا جانے لگا کہ ان کے پاس عالی شان سر بفلک محل نہ ہو جس میں پانی کے سرد و گرم
حمام۔ بے نظیر پائیں باغ ہوں۔ اور ضرورت سے زائد نمائش کے لئے بیش قیمت سواریاں۔ حشم و خدم اور حسین و جمیل
باندیاں موجود ہوں۔ اور صبح و شام رقص و سرود کی محفلیں گرم ہوں۔ اور جام و سبو سے شراب ارغوانی چھلک رہی ہو
اور فضول عیاشی کے وہ سب سامان مہیا ہوں جو آج بھی تم عیش پسند بادشاہوں اور حکمرانوں میں دیکھتے ہو۔"

آگے چل کر وہ ارشاد فرماتے ہیں۔

"نتیجہ یہ تھا کہ مملکت کی اکثریت پر یہ حالت طاری تھی کہ دلوں کا امن و سکون مٹ گیا تھا۔ ناامیدی اور کاہلی بڑھتی چلی جاتی
اور بہت بڑی اکثریت رنج و غم اور آلام و مصائب میں گھری نظر آتی تھی۔ اسی لئے ایسی مفرطانہ عیش پرستی کے لئے زیادہ
زیادہ رقوم اور آمدنی درکار تھی اور وہ ہر شخص کو مہیا نہ تھی۔ البتہ اس کے لئے بادشاہ۔ نواب۔ امرا اور حکام نے

معاشی دستبرد شروع کردی۔ اور اس کا طریقہ یہ اختیار کیا کہ کاشتکاروں، تاجروں، پیشہ وروں اور اسی طرح دوسرے کارپردازوں پر طرح طرح کے ٹیکس عائد کرکے ان کی کمر توڑ دی۔ اور انکار کرنے پر ان کو سخت سے سخت سزائیں دیں اور مجبور کرکے ان کو گھوڑوں اور گدھوں کی طرح بنا دیا جو آبپاشی اور ہل چلانے کے کام میں لائے جاتے ہیں۔ اور پھر کاشتکاروں اور مزدور پیشہ لوگوں کو اس قابل بھی نہ چھوڑا جاتا کہ وہ اپنی حاجات و ضروریات کے مطابق بھی کچھ پیدا کرسکیں۔"

اس کے برعکس اسلامی حکومت میں معاوضوں کا طریق یہ تھا۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب ابوبکر رضی اللہ خلیفہ بنائے گئے تو انھوں نے خطبہ میں کہا کہ یہ بات میری قوم بخوبی جانتی ہے کہ میرا کاروبار میرے اہل و عیال کی کفالت سے عاجز نہیں ہے۔ مگر اب میں مسلمانوں کے معاملات (خلافت) میں مشغول کردیا گیا ہوں لہذا اب ابوبکر کے اہل وعیال کی "قوتِ لایموت" بیت المال سے ملے گی اور ابوبکر مسلمانوں کی خدمت سرانجام دے گا۔[1]

حضرت عمرؓ ہر گورنر کو اس کی ضروریات اور مقیم شہر کے حالات کے پیشِ نظر مشاہرہ دیا کرتے تھے[2]۔ حضرت عمرؓ نے اپنے ابتدائی عہد میں مسلمانوں کو جمع کیا اور فرمایا خلیفہ کے لئے اس بیت المال سے کس قدر لینا حلال ہے۔ سب نے بالاتفاق کہا اس کو صرف اپنی ضروریات اور اپنے عیال کی ضروریات کے لئے قوت لایموت لینا چاہئے۔ جس میں کسی قسم کی کمی یا زیادتی نہ ہونے پائے۔ اور اپنے لئے اور عیال کے لئے سردی اور گرمی کے کپڑے اور جہاد روزانہ کی ضرورت اور عمرہ کے لئے دو سواری کے جانور اور مالِ غنیمت وغیرہ میں سب مسلمانوں کا حصہ ہے اور بس[3]۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا مجھ کو تمہارے مال (بیت المال) میں اتنا ہی حق ہے جس قدر کہ یتیم کے ولی کو یتیم کے مال میں۔ اگر میں رفاہیت میں ہوں گا تو کچھ نہ لوں گا۔ اور اگر حاجتمند ہوں گا تو دستور کے مطابق کھانے کے لئے لوں گا[4]۔

یہی حضرت عمر فاروقؓ عام خوشحالی کے لئے یہ جذبات رکھتے تھے اور اُن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے ساری عمر سعی فرماتے رہے۔ قسم بخدا اگر میں زندہ رہا تو اہلِ عراق کی بیوہ عورتوں کو ایسا کر جاؤں گا کہ میرے بعد پھر وہ کسی امیر کے پاس حاجتمند نہ ہوں[5]۔

رومی حکومت اور اسلامی حکومت کے مصارف کی نوعیت آپ کے سامنے ہے۔ اب آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہماری حکومت کا منتہا مقصود کیا ہے۔

پھر معاملہ صرف معاوضوں اور الاؤنسوں پر ہی ختم نہیں ہوتا۔ ایک زرِ کثیر ہر سال وزرا اور گورنروں کی آمد اور اُن کے شاہانہ استقبال پر خرچ کی جاتی ہے کسی شاہ کی آمد کسی غیر ملکی خاتون کا دورہ غریبوں کی کمائی کا بہت سا حصہ لے جاتا ہے اور یہ نام نہاد اسلامی حکومت " اس حقیقت کو یکسر فراموش کردیتی ہے کہ اُن کے ان درباروں کے انعقاد میں کتنے غریبوں کی گاڑھے پسینے کی کمائی ہوئی دولت بے جا صرف کی جارہی ہے۔ اگر ہمارے دلوں میں غریبوں کی محبت اور تعاش پیدا کرسکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اپنی ملکی دولت ان بے جا اور فضول کاموں پر ضائع کریں۔

---

[1] کتاب الاموال لابی عبید ص ۲۲۶ بحوالہ اسلام کا اقتصادی نظام از مولانا حفظ الرحمٰن لوہاری۔
[2] الاسلام وحضارۃ العربیہ ۱۳۱ " " " " " " " ۔
[3] " " ۱۲۸ " " " " " " " ۔
[4] " " ۱۲۸ " " " " " " " ۔
[5] کتاب الخراج ص ۱۵۔

آپ اگر میزانیہ کی آمدنی پر نگاہ ڈالیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ صوبائی آمدنی کا زیادہ تر حصہ چھوٹے کاشتکاروں اور چھوٹے زمینداروں کی گرہ سے آتا ہے یعنی کل آمدنی کا دس فیصدی حصہ مالیہ اور بیس فی صدی سے تیس فی صدی تک آبیانہ اور مہاجر ٹیکس کے ذریعہ سے وصول ہوتا ہے۔ لیکن ان غریب کاشتکاروں کو جن کی عرق ریزی حکومت کے خزانے بھرتی ہے بالکل نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ اُن کی اصلاح کی طرف سے آنکھیں یکسر بند کر لی گئی ہیں۔ اس میزانیہ میں صرف زرعی انکم ٹیکس کی کم از کم حد کو بڑھا دیا گیا ہے۔ جس سے مفلوک الحال کاشتکاروں کو کوئی فائدہ نہیں۔ فائدہ اگر کچھ پہنچا ہے تو ان زمینداروں کو ہے جنھیں حالیہ زرعی اصلاحات نے اس مشکل میں ڈال دیا تھا کہ وہ ٹیکسوں کا پورا پورا بوجھ بیچارے کاشتکاروں پر ڈالنے میں کچھ دقت محسوس کرتے تھے۔

حکومت پنجاب اگر آمدنی میں اضافہ کر کے کاشتکاروں کے افلاس کو دور کرنا چاہتی ہے تو اسے اس جاگیردارانہ نظام کو ختم کر کے اس کی جگہ زمینوں کی بہتر تقسیم کی جرأت مندانہ پالیسی پر عمل پیرا ہونا چاہئیے۔ حکومت کو چاہئیے کہ ایسی جاگیریں واپس لے لے جو کسی حکومت نے کسی ناجائز (یعنی پاکستان کے اسلامی یا قومی مفاد کے خلاف) خدمت کے صلے میں عطا کی تھیں۔ ایسی جاگیریں بھی واپس لے لی جائیں جو کسی سابق حکومت نے سرکاری املاک میں سے عطا کرنے کی بجائے لوگوں کی ملکیتیں غصب کر کے جاگیرداروں کو بخش دی تھیں یا پرانے مالکوں کو زبردستی جاگیردار کا مزارع بنا دیا تھا۔ وہ جاگیریں بھی واپس لے لی جائیں جو بعض مخصوص خدمات کی انجام دہی کے لئے عطا کی گئی تھیں، مگر یا تو وہ خدمات اب انجام نہ دی جا رہی ہوں یا ان خدمات کی اب ضرورت نہ ہو۔ جن جاگیرداروں کو ناجائز خدمات کے صلے میں سرکاری املاک واجبی سے زائد مقدار دی گئی ہو۔ اُن سے وہ زائد مقدارہ . . . . واپس لے لی جائے (واجبی حدود سے مراد اس قدر رقبہ اراضی ہے جو کسی علاقہ میں ایک خاندان کی متوسط خوشحالی کے لئے کافی ہو) مذکورہ بالا طریقوں سے جو زمینیں واپس لے لی جائیں ان میں سے آباد زمینوں پر انھیں لوگوں کو حقوقِ ملکیت دیئے جائیں جو فی الحال انھیں آباد کر رہے ہیں۔ اور غیر آباد زمینوں کو انصاف کے ساتھ مستحق لوگوں میں تقسیم کر دیا جائے۔

بنیادی خرابیوں کی اصلاح بنیادوں کو تبدیل کرنے سے ہی ہو سکتی ہے۔ ایک بوسیدہ مکان میں تھوڑی بہت تبدیلی کبھی بھی مفید اور کارآمد ثابت نہیں ہو سکتی اگر حکومت کاشتکاروں کی جو ہماری آبادی کا زیادہ حصہ ہیں ترقی چاہتی ہے تو پھر اس راہ کے علاوہ اور کوئی راہ نہیں۔ وہ زرعی اصلاحات جس کا پچھلے دنوں اس قدر غلغلہ بلند ہوا ان غریبوں کی فاقہ مستی میں کوئی کمی نہیں کر سکتیں۔ وہ ایوان کے اندر اور باہر تقریروں کے لئے موضوع تو بن سکتی ہیں مگر کسانوں کی جہالت اور بے بسی کو دور کرنے سے قاصر ہیں۔ اس کے لئے نقطۂ نظر کی تبدیلی کی ضرورت ہے۔

جن اشیاء پر بالواسطہ ٹیکس عائد کئے گئے ہیں وہ اس قسم کے ہیں کہ جن پر ایک غریب کی جیب پر سب سے زیادہ اثر پڑتا ہے۔ اُن پر ٹیکس عائد کرنے سے ان اشیاء کی قیمتیں بڑھتی ہیں اور غریبوں کو بہ نسبت رؤسا اور امراء کے زیادہ رقم خرچ کرنا ہوتی ہے۔ بجلی پر ٹیکس اس معاملے کی سب سے زیادہ واضح مثال ہے۔

ہمارے ٹیکس کے نظام میں (MULTIPLICITY PRINCIPLE) پر عمل کیا جاتا ہے۔ مختلف ناموں سے ایک ہی چیز پر ٹیکس عائد کرنے کے طریقے سے تجارت کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔ ان حالات میں جب کہ کساد بازاری کی بیماری پھوٹ پڑنے کا سخت خطرہ لاحق ہے۔ اس قسم کی پالیسی سے حتی الامکان گریز کرنا چاہئیے۔ حکومت اگر اپنی آمدنی میں اضافہ چاہتی ہے تو اسے اس قسم کے طریق اختیار کرنے چاہئیں کہ وہ اس مقصد میں کامیاب ہو سکے۔ ہمارے صوبے کی دم توڑتے ہوئے کارخانوں کو پھر سے زندہ کرنے کی کوشش کرنا چاہئیے۔ سیالکوٹ میں [illegible]ے سامان بنانے کا کارخانہ جاں بلب ہے۔ گوجرانوالہ میں الماریوں کے کارخانے اور برتنوں کے کارخانے آخری سانس لے رہے [illegible]ت کو چاہئیے تھا کہ بجٹ میں اُن کی ترقی کے لئے گنجائش نکالتی۔ اور اس طرح اسے ٹیکس عائد کرنے کے لئے وسیع و عریض میدان

نظر آجاتا جہاں سے اس کے خزانے کو کافی رقم وصول ہو سکتی۔

تعلیم کے لئے جو رقم منظور کی گئی ہے وہ صوبے کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے لئے بالکل ناکافی ہے جس ملک کی ۸۵ فی صدی آبادی جہالت میں گرفتار ہو اس وقت تقریباً ۲۵ لاکھ بچے ایسے ہیں جنہیں تعلیم دینا ازبس ضروری ہے۔ ان میں سے صرف سات لاکھ بچے زیر تعلیم ہیں باقی سب آوارہ پھر رہے ہیں۔ بجٹ میں ۱۲۰۰ نئے سکول کھولنے کی تجویز ہے حالانکہ آبادی کے لحاظ سے کم از کم بائیس ہزار نئے سکولوں کی ضرورت ہے۔

بجٹ میں کلچر کے تحفظ کا بھی ذکر ہے معلوم نہیں کلچر سے کیا مراد ہے۔ ترقی اردو کے لئے کوئی روپیہ مخصوص نہیں کیا گیا۔ بظاہر تو اردو کو سرکاری زبان قرار دینے کے عزم کا اظہار کیا جاتا ہے لیکن اردو کی حوصلہ افزائی کرنے سے بھی گریز کیا جا رہا ہے پنجاب نے اردو کی بہت خدمت کی ہے۔ حیرت ہے کہ حکومت کے بجٹ میں اردو کے فروغ کے لئے کوئی تجویز شامل نہیں کی کلچر کے تحفظ کے لئے آرٹ کونسل کو بیس ہزار روپے دئے گئے ہیں۔ اندیشہ ہے کہ اگر دریا دلی کا یہی حال رہا تو آئندہ بجٹ میں کلچر کے تحفظ کے نام پر ایک رقص و سرود بورڈ بھی قائم کر دیا جائے گا۔ اور طبلہ سارنگی کے فروغ کے لئے بھی رقم محفوظ کر دی جائے گی۔

اس بجٹ میں صحت پر رقم پچھلے سال سے کم صرف کرنے کی تجویز ہے۔ اس صوبے میں جہاں سرکاری اعلانات کے مطابق ہر سال بارہ ہزار سے بیس ہزار افراد تپ دق کا شکار ہو جاتے ہیں اور پھر یہ موذی مرض برابر پھیلتا جا رہا ہے جہاں دیہات اور شہروں میں ہر سال ہزاروں انسان ملیریا، ہیضہ اور نمونیا اور اسی قسم کی دوسری وباؤں میں مبتلا ہو کر نہایت کس مپرسی کی حالت میں دم توڑ دیتے ہیں وہاں اس شعبہ پر خرچ کی کمی نہایت ہی افسوسناک ہے۔ کیا بہتر یہ نہیں تھا کہ اسمبلی پر جو تقریباً گیارہ لاکھ روپیہ سالانہ کی رقم خرچ کی جاتی ہے اس میں کمی کر دی جاتی۔ آخر یہ ارکان اسمبلی کس چیز کی تنخواہ لیتے ہیں۔ کیا یہ معاوضہ انھیں صرف دو دفعہ لاہور جانے کا دیا جاتا ہے۔

سب سے آخر میں اور سب سے ضروری گزارش یہ ہے کہ ہم نے مانا کہ بجٹ میں مختلف شعبوں پر مختلف رقوم صرف کرنے کا عزم کیا گیا ہے لیکن کیا ان رقوم کو کاغذوں کے اندر مختلف شعبوں میں تقسیم کر دینا ہی کافی ہے۔ کیا صرف اسی سے صوبے کی سب بیماریاں دور ہو جائیں گی اور یہاں خوشحالی اور ترقی کا دور دورہ ہونے لگے گا۔

میزانیہ میں دیکھنے والی اصل بات یہ ہے کہ رقوم کو صحیح وقت پر صحیح مصرف میں لایا جائے۔ اس کے لئے قابلیت، بیدار مغزی اور جو کسی کی اشد ضرورت ہے جو فی الحال یہاں عنقا ہیں۔ پھر دیکھنا یہ ہے کہ کیا یہ رقمیں مستحقین کے ہاتھوں میں صحیح سلامت پہنچ جاتی ہیں۔ اس سلسلے میں بھی کوئی زیادہ توقعات وابستہ نہیں کی جا سکتیں۔ پچھلے سالوں کے واقعات اس کے خلاف شہادت دے رہے ہیں۔ ان تدابیر کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ضرورت ہے مستعد، ایماندار افسروں اور ماتحتوں کی لیکن بدقسمتی سے الا ماشاء اللہ ہماری حکومت کی مشنری میں اس چیز کی سب سے زیادہ کمی ہے۔ اس میں وہ مستعدی اور قوت کارکردگی نہیں جس کی ایک ملک کے تعمیری دور میں بے حد ضرورت ہوتی ہے۔

ہوائی قلعے تعمیر کر کے نعرے لگوا لینا، خوش آیند باتیں کر کے تالیاں پٹوا لینا کچھ مشکل کام نہیں۔ مشکل اگر ہے تو یہ ان اسکیموں کو خواب و خیال کی دنیا سے اٹھا کر حقیقت کی دنیا میں لایا جائے۔ اس کے لئے عزم درکار ہے۔ ایک ارادہ مطلوب ہے اور ایک محرک کی ضرورت ہے جو انسانوں کو سرگرم عمل کرنے کے لئے کافی ہو۔ ایک محرک ایک نصب العین ہی ہو سکتا ہے جو انسانوں کے دلوں اور دماغوں کو مسخر کر کے انھیں سراپا عمل بنا دیتا ہے۔ اور جس کی وجہ سے وہ پورے خلوص و تندہی سے کام میں لگ جاتے ہیں۔ اس صوبے میں یا بلکہ اس پاک سرزمین میں بدقسمتی سے مفقود ہے اور اگر ہے تو بالکل بے اثر۔

کیا وزیر خزانہ نے اس طرف بھی کوئی توجہ فرمائی ہے؟

روح افزا

مقوّیات سرتاج سلورین پلز

مردوں کے لئے ایک اچھا متوازن اور آج کل کا آزمودہ جنرل ٹانک ہے جو بھوک کو بڑھاتا ہے اور جسم میں تازہ اور سرخ خون پیدا ہوتا ہے قوت اور طاقت پیدا کرتا ہے۔

سلورین پلز

پر آپ بھروسہ کر سکتے ہیں قیمت ۴۸ گولی چار روپے بارہ آنہ۔ ۱۰۰ گولی ۹ روپے

فیمیلین (نسائی خاص)

یہ گولیاں عورتوں کی جملہ پوشیدہ شکایتوں کو دور کرنے میں اکسیر ہیں سیلان ماہواری کی بے قاعدگی اور اسی قسم کی دوسری زنانہ شکایتوں سے پیدا شدہ نقائص کو دور کرنے میں لاثانی ہیں۔ استقرار حمل کو مدد دیتی ہیں گویا عورتوں کے لئے ایک جنرل ٹانک ہے جس کا متواتر استعمال عورتوں کے نظام عصبی کو درست کرتا ہے جن عورتوں کو اسقاط حمل کی بار بار شکایت ہوتی ہو ان کے لئے بے حد مفید ہے۔

قیمت مکمل کورس ۴۰ گولی ۲۰ یوم کی خوراک دو روپے بارہ آنے ۲/۱۲

حاذق دواخانہ۔ بندر روڈ۔ کراچی

اسلامی ادب کا علمبردار

ماہنامہ

چراغِ راہ

کراچی

مئی ۱۹۵۲ء

قیمت: ۸ر

جلد ۵ ——— شمارہ ۶

چندہ سالانہ

پاکستان	بھارت
۵ روپے	[illegible]

مندرجات

دفتر چراغِ راہ - ۹، لوشیا بلڈنگ - آرام باغ روڈ - کراچی

سوچ بچار

اندھی نگری

پاکستان جو ایک آزاد مملکت ہے۔ اور جس کی ایک بین الاقوامی اہمیت ہے، جب اس میں سیفٹی ایکٹوں اور سیفٹی آرڈیننسوں کا راج چلتا ہو جب اس کی عدالتوں کے ہاتھ خاص اختیارات کے ذریعے انتظامیہ نے باندھ رکھے ہوں جب اس میں بنیادی انسانی حقوق کھلم کھلا پامال کئے جا سکتے ہوں۔ تو اس کے رجواڑوں کا حال جتنا بھی پتلا ہو، قابل تصور ہے! یہاں اگر استبداد قانون اور اختیارات کا جامہ اوڑھ کر کام کرتا ہے تو نوابوں کی ریاستوں میں تو وہ اس جامہ سے باہر ہو کر رقص کرے گا۔ یہاں اگر گھٹیا قانون کا دور دورہ ہو۔ تو وہاں خالص لاقانونی کا سکہ رواں ہوگا یہاں اگر محض ناانصافیاں ہوتی ہوں۔ تو وہاں اندھی نگری بن کر رہے گی!

ایسی ہی ایک اندھی نگری ریاست سوات ہے۔ اس کے والی کے لئے نہ خدا کا خوف کوئی قابل احساس چیز ہے، نہ رائے عامہ کا احترام، نہ دین واخلاق کا لحاظ، نہ مرکزی حکومت کے عتاب کا کوئی خدشہ ــــــ چنانچہ آج زمین کے اس تاریک گوشے کی جو آبادی اس کے زیر اقتدار ہے اس کے حقوق اتنے بھی نہیں ہیں جتنے کسی قصاب خانے کی بھیڑوں کے ہوتے ہیں۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے خدائی کا نشہ سر پہ چڑھا ہو جیسے شداد بننے کی ٹھان لی گئی ہو جیسے تشدد کے زور سے اپنے اقتدار کو لازوال بنانے کا فیصلہ کر لیا گیا ہو!

والی سوات انگریزی اقتدار کے زمانے ہی سے اپنی ریاست کے اس اولین فرد کے دشمن جان بن گئے تھے جس نے دعوتِ اسلامی پر لبیک کہنے میں سبقت کی تھی۔ ان کو جب یہ معلوم ہوا کہ ایک نظریہ ایسا سامنے آ رہا ہے جس کے ماننے والے خدا کو خالق و مالک ہی تسلیم نہیں کرتے، بلکہ حاکم اور قانون ساز بھی مانتے ہیں۔ تو نہ جانے کیوں ان کا ماتھا ٹھنکا۔ کہ ان لوگوں کے "لا الٰہ الا اللہ" کی زد میرے ہی اوپر پڑتی ہے۔ بس یہ وہ احساس تھا کہ جس کے تحت والی صاحب نے شروع ہی سے جماعت کے کارکنوں کے خلاف جابرانہ قسم کی پالیسی اختیار کی۔ تاج الملوک صاحب کو نظر بند کیا، ستایا، دکھ دیئے اور آخر کار ان کو ریاست چھوڑنے پر مجبور کیا۔ پھر شیر علی صاحب پر بھی مسلسل عتاب ہوتا رہا، یہاں تک کہ اب والئے سوات کا طرز عمل تحریک اسلامی کے متوسلین کے بارے میں بربریت کی انتہا کو پہنچ گیا ہے!

مظالم کی جو اطلاعات ہمارے معتمد ذرائع سے آ رہی ہیں ان کو ملاحظہ فرمایئے تو اندازہ ہوگا۔ کہ حالات کیا ہیں!

یہ تازہ سلسلۂ کرمفرمائی اس واقعہ سے شروع ہوا کہ امیر جماعت اسلامی پاکستان کی اپیل پر سیلاب زدگانِ پنجاب کی امداد کے لئے اعانت فراہم کرنے کے جرم میں ڈاکٹر حافظ محمد صاحب سابق امیر جماعت اسلامی کو گرفتار کر لیا گیا اور پھر چند ماہ کے بعد جیل سے نکال کر ان کو اپنے گاؤں ہی میں نظر بند کر دیا گیا۔ اس کے بعد ۱۲ جنوری ۵۶ء کو شیر علی خان صاحب حال امیر حلقہ سوات اور ۳۰ جنوری کو ڈاکٹر زین العابدین صاحب کو گرفتار کر لیا گیا۔ گرفتاری کے بعد دونوں کو ریاست سے اخراج کا حکم سنایا گیا اور جماعت کے عام متفقین کو یہ عام دھمکی دے دی گئی کہ وہ اخراج کے حکم کے قبل ہی بطور خود ریاست بدر ہو جائیں۔ ان "عنایات" کے سلسلہ میں گفتگو کرنے کو جب ایک وفد جا کر ملا تو اس سے والی صاحب یہ فرماتے ہیں۔ کہ میں تو حکومت پاکستان کے ماتحت ہوں۔ اور جو کچھ ہدایات ملتی ہیں ان پر عمل کرتا ہوں!

پھر جب اس پر جماعت کے مرکز کی طرف سے پریس میں بیان دیا گیا۔ تو والی صاحب کے [illegible] نے ان واقعات کی تردید کر دی۔ اس

جواب یہ مرکز سے کارکنان کو ہدایت کی گئی کہ جب ریاست کی طرف سے صفائی دے دی گئی ہے تو وہ واپس چلے جائیں اور کام جاری رکھیں لیکن کارکنوں کی واپسی پر انتہائی تشدد کا نیا دور شروع ہو گیا!

اس نئے دورِ تشدد میں کیا ہو رہا ہے؟ ——— اس کا جواب آپ کو اگر روزنامہ تسنیم اور سہ روزہ کوثر اور دوسرے اہم اخبارات میں نہ مل سکے تو مختصر لفظوں میں یہ سمجھ لیجئے کہ وہ کچھ ہو رہا ہے جو ایک اندھیر نگری میں ہو سکتا ہے۔ وہاں دو کارکن قید میں ہیں اور ان سے اخلاقی قیدیوں کی طرح برسرِ عام سڑکیں کٹوانے کا کام لیا جا رہا ہے۔ ایک رکن کو مشیر سوات نے بلا کر مجمع کے سامنے فحش گالیاں دیں، ایک اور کارکن کو تحصیلدار نے تحصیل میں بلا کر گالیاں بھی دیں، زد و کوب بھی کیا اور ان کی ڈاڑھی کے بال نوچے اور پھر ان کو ان کے گاؤں میں نظر بند کر دیا گیا۔ ایک کارکن کو ڈاڑھی منڈا کر گدھے پر سوار کرا کے ذلیل کرانے کی دھمکی دی۔ ڈاکٹر حافظ محمد صاحب ان حالات کو معلوم کر کے جب تحصیلدار سے گفتگو کرنے آئے تو ان کو بھی فحش گالیاں دی گئیں اور ایک سپاہی کی نگرانی میں ان کو والئے سوات کے پاس بھیج دیا گیا۔ والئے سوات فرماتے ہیں کہ تحصیلدار میرا مددگار ہے اور اس نے جو کچھ کیا ہے ٹھیک کیا ہے۔ میرا حکم تو یہاں تک ہے کہ اس جماعت کو دبانے میں قتل تک سے بھی دریغ نہ کرو۔ والی صاحب کے یہ الفاظ تو تاریخ کے صفحات پر سنہری حروف میں لکھ کر رکھنے کے قابل ہیں کہ:-

”اگر پاکستان کی جمہوری حکومت میں عبدالقیوم خان کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکا نہیں تو پھر ایک شخصی حکمران ہوں میرا کوئی کیا بگاڑے گا؟“

والی کی پیشی کے بعد ڈاکٹر صاحب سرکاری نگرانی میں وزیر مال کے سامنے پیش کئے گئے۔ وزیر مال نے ڈاکٹر صاحب سے نگرانی کرنے والے سپاہی کا خرچ طلب کیا۔ جب انھوں نے اس ناجائز مطالبے کو ماننے سے انکار کر دیا تو توہینِ عدالت کے جرم میں سو روپیہ جرمانے کی سزا دی۔ ڈاکٹر صاحب کو حکم دیا گیا کہ وہ مریضوں کو دیکھنے جائیں تو یا تو پیدل ہی جائیں یا پھر سرکاری نگران کی سواری یا اس کے کرایہ کی ذمہ داری بھی لیں۔ ڈاکٹر صاحب کے قائم کردہ مدرسہ میں تعلیم پانے والے طلبا کے والدین کو مجبور کیا گیا کہ وہ اپنے بچے وہاں سے اٹھا لیں ورنہ جرمانہ کیا جائیگا۔ اب ڈاکٹر صاحب جیل میں ہیں۔ جماعت کے ایک اور رکن مولانا عبدالرؤف صاحب کو اپنے گھر میں نظر بند کر دیا گیا ہے!

حلقہ سوات کے امیر حال شیر علی خاں صاحب جب مرکز کی ہدایت کے تحت ریاست میں داخل ہوئے تو ان کو ان کے والد نے والی صاحب کے احکام کے مطابق گھر میں جگہ دینے سے انکار کر دیا۔ پھر وہ مارے مارے پھرے لیکن لوگ والی سے اتنے خوف زدہ تھے۔ کہ کہیں ٹھکانہ نہ مل سکا۔ موصوف پر ایسا سخت وقت تھا کہ رات کھیتوں میں فصلوں کے اندر گزارنے پر مجبور ہو گئے۔ جب جان اور عزت کا خطرہ بڑھ گیا، تو انھوں نے مجبوراً ریاست کو خیرباد کہہ دیا!

جماعت کے لٹریچر کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا ہے۔ اخبار تسنیم کا داخلہ بھی بند کر دیا گیا ہے اور کارکنوں کی تلاشیاں لی جا رہی ہیں۔ ایک متفق کا گھر لٹوا دیا گیا ہے اور اسی طرح قتل کی دھمکی دوسروں کو بھی دی گئی ہے حد یہ ہے کہ ایک دس سالہ بچہ بھی جماعت سے دلچسپی رکھنے کی بنا پر قید میں ڈالا گیا ہے۔ علماء کو مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ جماعت کی تکفیر کریں۔ عوام کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ کارکنانِ جماعت سے اگر علیک سلیک کے تعلقات بھی رکھیں گے تو ان سے سخت برتاؤ کیا جائے گا!

یہ واقعات ہو رہے ہیں - ان کی اطلاعات کسی نہ کسی ذریعے سے ہمیں پہنچ رہی ہیں۔ اخبارات میں ان کی اشاعت ہو رہی ہے لیکن نہ والی صاحب کے رویے میں کوئی فرق آیا ہے نہ حکومت پاکستان نے اس معاملے میں کوئی مداخلت کرنے کی ضرورت سمجھی ہے - اتنی دھاندلی بلکہ اتنی بڑی بے حیائی کا رویہ اپنی مثال آپ ہے!

سوچ بچار

اس "اندھی نگری" کی یہ داستان ہم حکومت پاکستان کے سامنے رکھ کر یہ پوچھتے ہیں کہ کیا واقعی یہ سب کچھ آپ کی ہدایات کے تحت ہو رہا ہے؟ اگر نہیں تو پاکستان کے چند شہریوں کے انسانی حقوق سے آپ کی اسلامی ریاست میں جو ہیمانہ سلوک کیا جا رہا ہے اس پر آپ نے کیا نوٹس لیا؟ اور کیا نوٹس لینے کا ارادہ رکھتے ہیں؟ ہماری نگاہ میں آپ کا فوری فرض یہ ہے کہ آپ بربریت کے اس طوفان کو روکیں اور ریاستوں کے لئے ایسی قطعی اور یکساں پالیسی اختیار کریں کہ پاکستان کے تمام شہریوں کو برابر کے حقوق حاصل ہوں یہ آپ کے زیر سایہ پلنے والے "شخصی حکمران" آخر کب تک "شخصی حکمران" ہونے پر شرمندہ ہونے کی بجائے فخر کرتے رہیں گے؟

اس سلسلہ میں پاکستان کی رائے عام کے سر بڑی بھاری زمہداری عائد ہوتی ہے سیفٹی قوانین کی فرمانروائی ہو یا پنجاب اور سرحد کے انتخابات کی دھاندلیاں ہوں یا والیان ریاست کے مظاہرہائے جباری ہوں، یہ سب گویا تجربات ہیں جو ہمارے ہاں کا حکمران طبقہ ہمارے اوپر کر رہا ہے۔ وہ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ آمریت قائم کرنے اور عداوندی جلانے کے لئے کتنے مواقع موجود ہیں اور عوام میں اپنے مقام کا کتنا ایک شعور موجود ہے جمہور اچھی بھیڑ بکریاں ثابت ہو سکتی ہیں یا ان میں انسانیت کا کچھ احساس کارفرما ہے!

یہ آپ خود سوچ لیجئے کہ ان تجربات کا کیا جواب آپ کو دینا چاہیئے اور کس طرح دینا چاہیئے؟

ہمیں سخت افسوس ہے کہ اعلان کے مطابق ہم "اشتراکی جنت میں جبری محنت" کا طویل مقالہ پیش نہ کر سکے۔ دراصل اس کتاب کے کسی جزو کو شائع کرنے سے پبلشر کمپنی کی طرف سے قطعی طور پر روکا گیا ہے۔ اس لئے یہ معاملہ اجازت حاصل کرنے کا ہے اور اندازہ یہی ہے کہ حصول اجازت میں خاصی دیر لگے گی ہم نے تو اپنی طرف سے کام کی رفتار میں کوئی کمی نہیں کی، بلکہ ترجمہ و تلخیص کا کام، اس کی نظر ثانی، اور کتابت تینوں بیک وقت شروع کر دی گئی تھیں۔ لیکن اجازت حاصل ہونے سے قبل ہم اس کی ایک سطر بھی شائع کرنے کا قانونی و اخلاقی حق نہیں رکھتے! الٹا ہمیں ایک زیر کتابت کام کو رکوا کر دو تین روز میں پورا رسالہ از سر نو مرتب کر کے پانچ چھ روز میں اس کی کتابت مکمل کرانی پڑی ہے۔ ان حالات میں کتابت و طباعت کی کوتاہیوں پر گرفت کرنے کی بجائے براہ کرم چٹکیوں میں اتنا بڑا کام کر دکھانے پر ہمیں داد دیجئے!

انشاء اللہ جولائی ۵۲ء کا شمارہ "جبری محنت" کے مقالہ پر مشتمل ہوگا۔ (ادارہ)

قوالی کی نفسیاتی ماہیت

اقبال مرحوم کی نگاہ میں!

پروفیسر حمید احمد خان

پچھلے دنوں چراغ راہ میں موسیقی کے متعلق سوالات کے جو جواب دیئے جاتے رہے ہیں۔ ان میں قوالی کے مقدس "ظاہر" کا تجزیہ کر کے اس کی نفسیاتی حقیقت کو عرض کیا گیا تھا۔ جسے جاننا آسان نہیں ہے۔ حال ہی میں ماہنامہ "الحمراء" (اقبال نمبر) نگاہ سے گزرا۔ اس میں جناب پروفیسر حمید احمد خاں صاحب نے "اقبال کے ساتھ چند لمحے" کے عنوان سے جو سطور لکھی ہیں۔ ان میں اتفاق سے اقبال مرحوم کا نقطۂ نظر قوالی کے متعلق بھی سامنے آگیا ہے۔ جو نہ صرف بہت دلچسپ ہے۔ بلکہ اس کا آخری فقرہ تو ایک زریں نکتے پر مشتمل ہے
مگر اقبال آج زندہ ہوتا۔ تو وہ دیکھتا کہ جس قوالی کے متعلق اس کی رائے ایسی تھی۔ آج خود اس کی اپنی زندگی بخش منظومات اسی قوالی کا شکار بن گئی ہیں:۔ (ادارہ)

ایک دن صوفیوں کی مجالس اور قوالی کا ذکر ہو رہا تھا۔ قوالی سے پیدا کئے ہوئے جوش کو ڈاکٹر صاحب "مصنوعی حرارت" کہتے تھے۔ اس پر ایک صاحب نے کہا:۔ "مگر وجد و حال جو قوالی کے دوران میں بعض لوگوں پر طاری ہو جاتا ہے۔ اس میں تصنع بالکل نظر نہیں آتا۔ ان لوگوں کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ مصنوعی طور پر جوش میں آئے ہوئے ہوں"۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا: "ایسے لوگوں نے وجد و حال کو ایک مذہبی رسم بنا رکھا ہے۔ (ڈاکٹر صاحب نے CULT کا لفظ استعمال کیا تھا) یہ کیفیت ان پر واقعی طاری ہوتی ہے۔ لیکن جب وہ اپنے جوش جذبات کو اس طرح فرو کر لیتے ہیں تو پھر ان میں کچھ باقی نہیں رہتا اور وہ جذبہ دوبارہ طاری نہیں ہوتا۔ دراصل مسلمان جب عرب سے نکلے اور انھیں باہر کی قوموں سے سابقہ پڑا۔ تو صوفیوں نے ان قوموں کے زنانہ پن (ڈاکٹر صاحب نے EFFEMINACY کا لفظ استعمال کیا) کا لحاظ کرتے ہوئے قوالی و موسیقی کو اپنے نظام میں شامل کر لیا۔ زنانہ پن سے مراد ہے SURPLUS EMOTION (یعنی فالتو جذبات) ایران اور ہندوستان میں فالتو جذبات کی کثرت ہے۔ اور حال انھیں فالتو جذبات کے اخراج کا ایک ذریعہ ہے۔ صوفیہ کے سلسلے میں قوالی کو جو دخل ہے وہ صرف اسی وجہ سے ہے یہاں لاہور میں ہمارے حاجی (ڈاکٹر صاحب نے جو نام لیا اسے میں یہاں ا۔ب۔ج سے تعبیر کروں گا) ا ب ج کے مکان پر ایک زمانے میں قوالی ہوا کرتی تھی۔ حاجی صاحب مجھے بھی کبھی کبھی بلا لیتے تھے۔ ان کے ایک پیر تھے جن کا نام "مہر صاحب" تھا۔ ایک دن حاجی صاحب کے مکان پر سماع کی محفل ہوئی۔ مہر صاحب اور ان کے مرید جمع تھے۔ حاجی صاحب نے مجھے بھی دعوت دی۔ میں گیا۔ وہاں اسی طرح ایک شخص کو حال آ گیا۔ مہر صاحب کا ایک مرید میرے پاس آ بیٹھا اور کہنے لگا: "سنا ہے آپ حال کو نہیں مانتے"۔ میں نے کہا: "تم سے یہ کس نے کہہ دیا کہ میں حال کو نہیں مانتا؟" وہ بولا آپ کے متعلق لوگ عام طور پر یہ کہتے ہیں کہ آپ کو جذب و حال کی کیفیت پر اعتقاد نہیں ہے۔ مگر اب یہ ہمارا پیر بھائی آپ کے سامنے ہے

دو خط

ضیاء اور عاصی

(۱)

جناب عاصی ضیائی کو ضیائے عاصی کا سلام پہنچے!

شعر غیر پر آنتخاب کا تبصرہ نظر سے گزرا۔ یہ خاکسار پچھلے دنوں لاہور نعیم صاحب کے پاس حاضر ہوا تھا۔ موصوف نے اس تبصرہ کا ذکر کیا تھا۔ میں عموماً چراغ راہ کا مسودہ دیکھ آیا کرتا ہوں۔ اس دفعہ موقع نہ ملا۔ ورنہ یہ سطور شاید انہی دنوں لکھ دی جاتیں!

آپ نے اپنے تبصرہ میں بعض ایسے نکتے بھی سمجھائے ہیں جن کی طرف عام توجہ کم ہی ہوتی ہے۔ اپنے شاعروں کے ہاں تیوروں کی خشونت، مزاج کی برہمی، لب و لہجہ کی درشتی، غضب اور کھولاؤ دیکھ کر آپ کو بجا تشویش ہوئی۔ بلاشبہ تحریک اسلامی کا مزاج اس سے مختلف ہے۔ ضبط، سکون اور ٹھہراؤ اس کے مابہ الامتیاز ہیں لیکن کسی تحریک کے لئے "سکون" اور "ٹھہراؤ" کے الفاظ کا استعمال ذرا خلاف احتیاط ہے۔ یہ الفاظ "سنجیدگی" کا مفہوم تو نہیں ادا کرتے (یعنی)" لیکن جو لوگ ترقی پسند ادب سے متاثر رہے ہیں یا ادھر سے ٹوٹ کر آ رہے ہیں ان کو کچھ الاؤنس ضرور دیجئے۔ بالخصوص میرے لئے اس معاملے میں فی الحال لازماً گنجائش نکالئے۔ یہ رعایت کیوں مانگتا ہوں۔ اس کا راز کچھ روز ٹھہر کر آپ پر (خود) آشکار ہو گا!

اور دیکھئے، بحروں کے انتخاب کا معاملہ زیادہ تر ذوق و وجدان سے تعلق رکھتا ہے۔ شاعر کی پسند پر پابندی لگانا اچھا نہیں بعض دفعہ موضوع کی مناسبت بھی بحر کے انتخاب کا باعث ہوتی ہے۔ زبان کا قالب بھی بہت کچھ بدل چکا ہے۔ زندگی کے گوناگوں مسائل مقتضیات اور زمانے کے لاتعداد احوال و واقعات کے پیش نظر بیان و اظہار کے نئے نئے اسالیب وضع ہوتے رہتے ہیں۔ تو پھر کیوں نہ مذاق عام کی رعایت کرتے ہوئے ہم بھی اپنی بات مروجہ انداز میں کہیں۔ یہ امر تو مسرت و طمانیت کا موجب ہے کہ ہماری صفوں میں ہر قسم کے لوگ موجود ہیں، جو ہر اسلوب کو اپنا سکتے ہیں، یا اپنائے ہوئے ہیں۔ ہماری تحریک قدیم و جدید کا ایک خوشگوار امتزاج ہے اور ہمارے فنکار اپنے موقلموں سے ہر رنگ کی تصویریں بنا کر پیش کر سکتے ہیں۔ اگر شعر کے قالب میں اسلامی روح بول رہی ہے اور چھوٹی بڑی بحروں کے پیمانوں میں تہی ایمان کی صہبا جھلک رہی ہے تو فہو المراد۔ پھر قالب بھی بدلتے رہیں گے اور پیمانے بھی!

اور ہاں، دوسری گزارش یہ ہے کہ شعر جذبات و احساسات کے اظہار کا واسطہ ہے اور یا تقاضائے فطرت یا بتقاضائے ضرورت اس میں شدت بھی آ سکتی ہے! البتہ ایسے موقعوں پر ذہنی توازن کھو دینا اسلامی فنکار کی شان سے فروتر بھی ہے اور حکمت تبلیغ کے منافی بھی۔ یہاں جو چیز خاص طور پر "تازہ وارد این بساط ہوائے شعر" کو سمجھانے کی ہے وہ یہی ہے کہ ایسے موقعوں پر شعر کے لوازمات اور فن کے تقاضوں کو نظر انداز نہ ہونے دیں۔ عموماً جذبات کی رو میں جب ہمارے "لکھنے" والے بہ نکلتے ہیں تو ادبی اقدار، زبان، فن کی روایات کو بھی اپنے ساتھ ہی بہا لے جاتے ہیں۔ میں عموماً اپنے نوجوان شاعروں کی تخلیقات میں بعض دفعہ کھلے عیوب دیکھ کر بہت پریشان ہوا ہوں۔ ضرورت ہے کہ بدستور کوئی خامیوں کی نشاندہی کرتا رہے کہنے والا پوری دلسوزی اور جذبہ اصلاح سے کہے اور سننے والے اسے

سراسر اخلاص پر محمول کریں۔ اور اس سلسلے میں آپ کی طرف سے جو کچھ وقتاً فوقتاً ارشاد ہوتا رہتا ہے، میں اُسے نہایت قابلِ قدر سمجھتا ہوں۔ حضرت ماہر القادری کی بے باکانہ تنقید بھی اس سلسلے میں بہت کام کر رہی ہے۔ خود میں نے بھی ایک دفعہ آپ کی ایک نظم "گیا دورِ گراں خوابی" کے بعض مقامات کے متعلق مدیر چراغِ راہ کو لکھا تھا۔ اپنی ادبی تحریک کے ان ابتدائی مراحل میں اگر ہم نے تنقید و احتساب کا یہ سلسلہ جاری رکھا اور بقول آپ کے "ہمیں تو راجا جی تجویم تو مرا جاجی بگو" کی خطرناک پالیسی پر عمل نہ کیا تو انشاءاللہ اس کے مفید نتائج اگلی منزلوں میں رونما ہوں گے!

لیجیے! شاعری کی اصلاح میں توارد ہو گیا۔ یہ ہر سال کے ختم پر اس سال کی بہترین نظمیں کتابچوں کی صورت میں شائع کرنے کا سلسلہ شروع کرنے کی تجویز میں نے شعر نمبر کی اشاعت سے قبل مدیر چراغِ راہ کے سامنے پیش کی تھی۔ پھر فوراً بعد شعر نمبر کا اعلان ہو گیا اور اس طرح کچھ سالوں کا سرمایۂ شعر اس میں سمٹ گیا۔ اب آئندہ سال کے لیے سال بہ سال شعری انتخاب کتابچوں کی صورت میں شائع کرنے کا سلسلہ شروع ہو جانا چاہیے۔ میں اس کی پرزور تائید کرتا ہوں۔

نعیم بھائی نے ہم دونوں کے لاہور آنے سے اس کام کو مشروط کیا ہے۔ تو پھر ہماری وجہ سے یہ کام پیچھے نہ پڑنا چاہیے۔ بہار کی تعطیلات قریب چلی آ رہی ہیں۔ انہی میں مل بیٹھ کر یہ کام سرانجام دے ڈالیں (مگر افسوس کہ اب کے بھی دن بہار کے یوں ہی گزر گئے" (ن م) نعیم صاحب ہم دونوں کو کسی ایک ہی تاریخ کی اطلاع کر دیں گے۔ آپ کی نظر میں اگر کچھ ایسی چیزیں آئی ہوں جو قابلِ انتخاب تھیں لیکن شعر نمبر میں نہیں آ سکیں۔ تو ان کی فہرست تیار کر کے لائیں۔ والسلام

مشتاق دید، ضیا محمد عفی عنہ

(۲)

مجھ کو منتسب ہم عرف کا سلام آج ملا۔ اور صرف رسید سلام پر قناعت نہ کر کے یہ احقر بھی بحکم قرآنی کم از کم اتنا ہی سلام آپ کی طرف بھی روانہ کرنے کی عزت حاصل کرتا ہے۔ وعلیکم السلام

آپ کے تبصرہ پر تبصرہ کا ممنون ہوں، اور بے شک میں اپنے اوپر جرح و نقد کا ہر حال میں خیر مقدم کرتا ہوں۔ لیکن آپ کی یہ تحریر پڑھ کر صرف اتنا عرض کروں گا۔ کہ براہِ کرم میرے مقالے کو پھر پڑھ لیجیے۔ میں درحقیقت خداوند کریم کا شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھ سے اس مقالے میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں لکھوایا جس پر ابھی تک مجھے اپنی ضمیر کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔ یہ مقالہ زیادہ تر تجزیہ ہے، اظہارِ رائے بہت کم ہے۔ اور جو ہے وہ نہایت محتاط! میں نے جہاں جہاں اپنے دل کھیوں پر تنقید کی ہے، وہیں ان کی وکالت بھی حتی المقدور کی ہے اور حضرت جس چیز کا حوالہ آپ نے دیا ہے یعنی آپ کے الفاظ میں "تیوروں کی خشونت" "مزاج کی برہمی" "لب و لہجہ کی درشتی" "غضب اور کھولاؤ" پر اظہارِ تشویش تو کہیں بھی نہیں۔ اول تو اتنے بہت سے الفاظ آپ کو نہ لکھنے چاہئیں تھے۔ صرف پہلا فقرہ "تیوروں کی خشونت" میں نے ایک جگہ استعمال کیا ہے اور وہ بھی اس لیے کہ ان نظموں اور ترقی پسند نظموں میں مماثلت صرف اسی فقرے سے ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن یہ صرف اظہارِ واقعہ ہے (یعنی جو مجھے نظر آیا) اس میں تشویش کا اظہار تو کہیں بھی نہیں۔ البتہ اس کے فوراً بعد یہ بھی موجود ہے "لیکن حسنِ صناعت اور عدمِ ابہام ان (ترقی پسند نظموں) سے یقیناً بہتر ہیں" فرمائیے اس میں وجہ اعتراض کیا اور کہاں؟

ہاں غزل کی طرف رجحان پر میں نے اتنا ضرور لکھا ہے کہ یہ ایک اعتبار سے مسرت خیز اور خوش آئند ہے لیکن ایک حیثیت سے اندیشہ ناک بھی؟ تو ان دونوں پہلوؤں کی خاصی واضح توجیہ اور اس سلسلے میں مشورہ بھی عرض کر دیا گیا ہے۔ آپ نہ معلوم کس قسم کا الاؤنس مانگتے ہیں؟ الاؤنس تو میں نے خود ہی کافی دے دیا ہے، اور کم از کم آپ کو تو اس کی بھی ضرورت نہیں۔ غزل گوئی میں میں نے جن چار صاحبوں کا ذکر کیا ہے ان میں سے دو نمایاں ترین حضرت عامر عثمانی اور آپ ہی کا نام ہے۔ پھر اپنی پسند میں بھی آپ کو جگہ دی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ سب باتیں اس لیے کی ہیں کہ آپ کا کلام اور تمام

شعراء پر کسی نہ کسی حیثیت سے فوقیت رکھتا ہے، نہ اس خط سے پہلے تو مجھے جناب سے ذاتی یا کتابتی تعارف بھی نہ تھا!

اپنے بحروں کا انتخاب، سو وہ بھی بے شک ذوق اور وجدان سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن ہم بہ حیثیت طالب علم ادب اسی بحروں کے انتخاب سے شاعر کا مذاق مستنبط کرتے ہیں۔ اور جو کچھ ہماری سمجھ میں آتا ہے بیان کر دیتے ہیں۔ قدیم و جدید کا امتزاج اسالیب زبان میں ممکن ہے جذبہ میں نہیں۔ اور اگر جذبہ (یا واردات) اپنے اظہار کے لئے مناسب پیرایہ نہ ڈھونڈھ سکتا ہو۔ تو یہ بھی اس جذبے کے نقصان پر دلالت کرتا ہے۔ بحر اور الفاظ کا انتخاب ہمارے شعراء نے بہت معمولی بات سمجھا ہے۔ لیکن جس طرح قیافہ انسان کے بطون کو ظاہر کرتا ہے۔ اسی طرح یہ دونوں عناصر بھی شعر، شاعر کے جذبے کو فاش کرتے ہیں۔ میرا ارادہ ایک بار ہوا تھا کہ اس موضوع پر کچھ لکھوں۔ لیکن کچھ تو مطالعہ کی عدم تکمیل اور کچھ عدم فرصت اس کی مانع ہوئیں۔ انشاءاللہ اس پر زبانی گفتگو ہوگی۔ میں آج در نہ کل علی الصبح لاہور پہنچ رہا ہوں۔ انشاءاللہ دو تین دن تک قیام رہے گا۔ اور یہ خط بھی آپ کو وہیں سے روانہ کروں گا۔ کیونکہ آپ کا پورا پتہ معلوم نہیں!

والسلام ——— مستعدِ خدمت ——— عاصی ضیائی

بقیہ قوالی کی نفسیاتی ماہیت

آپ اس کی نسبت کیا کہتے ہیں؟" میں نے کہا: "بے شک اس پر حال کی کیفیت طاری ہے۔ مگر اس کے حال میں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حال میں بڑا فرق ہے" اس نے پوچھا "وہ کیا؟" میں نے کہا "یہ بات پیر صاحب سے جاکر پوچھ لو۔ وہ بتائیں گے"۔ اس پر وہ اصرار کرنے لگا کہ "نہیں آپ ہی کہہ دیجئے" میں نے اس سے کہا: "صحابہؓ کے حال میں اور تمہارے حال میں یہ فرق ہے کہ انہیں تو میدانِ جنگ میں حال آتا تھا اور تمہیں اب حجرے کی کوٹھری میں"۔

بقیہ خدا اور رسولؐ

کائنات ہم تک دے رہی ہے، مگر خدا کا مقرر کردہ اخلاقی ضابطہ مجرد کائناتِ انفس و آفاق کے مشاہدے اور تجربات سے نہیں ہاتھ آتا۔ وہ تو رسول ہی کے ذریعے ملتا ہے۔ جسے اس کے رسولوں پر اعتماد نہ ہو، وہ جس وادی میں چاہے سر مارے، اسے کون روکنے والا ہے۔

——— لیکن وہ خواہ مخواہ "مسلمانی" کے آبرو مندانہ موقف پر سے تو نہ بولے!

تجزیہ و تزکیہ

آپ لوگوں کا خدا ـــــ!

(تخاطب اُن سے جو خود سمجھ جائیں)

ماشاء اللہ! آپ بھی خدا کو مانتے ہیں! بڑی مبارک بات ہے!

مگر آپ کا خدا ہے بڑا دلچسپ! اس نے بندے پیدا کر دیئے مگر ان کے لئے کوئی سامانِ ہدایت نہیں کر سکا! ایسا ہو جاتا تو شاید دلچسپی ہوتی لیکن وہ سیاست میں مداخلت تو نہیں کرتا! بالکل غیر سیاسی (Non Political) قسم کا خدا ہے ـــــ بلکہ آپ ہی سے معلوم ہوا کہ وہ "گونگا" بھی ہے! اپنے بندوں سے خطاب کرنے کی قوت سے محروم! یہ بھی انکشاف ہوا کہ آپ کا خدا آپ کے لئے کوئی فرائض و حقوق طے کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے! بلکہ اس کا مقام یہ ہے کہ آپ اس کے حقوق و فرائض طے فرماتے ہیں کہ آپ کی زندگی کے کس کس حصے میں کہاں تک مداخلت کرے اور کہاں تک نہ کرے، اور کن کن مشاغل کو اختیار کر سکتا، کن کو نہ کرے! ـــــ اور آپ کا حال یہ ہے کہ آپ نے اپنے دائرہ حیات میں شاید قدم رکھنے کی بھی اجازت نہ دی!

تو پھر وہ آپ کا نرالا خدا کرتا کیا ہے؟ پڑا اونگھتا رہتا ہے۔ یا جو سر کھیلتا ہے یا زندگی کے سرکس کا تماشا دیکھتا رہتا ہے؟ ـــــ اسے کسی کام میں لگائیے!

بیچارے واعظ نے اُسے عرش پر بیٹھا رکھا تھا۔ تو اقبال نے واعظ کی خبر لے ڈالی اور حیرت سے کہا کہ "خدا وند یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں" ـــــ غالباً اس پر آپ نے بھی بارہا سر دھنا ہوگا! لیکن اب تو آپ نے خود اقبال کی خبر لے ڈالی! اقبال کا خدا وہ ہے جو بندوں کے معاملات میں دخل دیتا ہے محض دخل نہیں "حکم" دیتا ہے اور عبودیت اور طاعت کا مطالبہ کرتا ہے ـــــ لیکن اب آپ پھر واعظ کا سا خدا کہیں سے نکال لائے ہیں۔ جسے ہر ایرا غیرا زندگی کے دائرے سے باہر دھکیل کر بے بسی کے تخت پر بٹھا سکتا ہے۔ یہ آپ کا خدا! خدا ہے کہ مٹی پتھر کا بت ہے جس کے ساتھ آپ جو سلوک چاہیں کرتے رہیں اور وہ "ہوں" بھی نہ کر سکے!

مگر ایسے بیکار خدا کی ضرورت ہی آپ کو کیا پڑی تھی؟ کیا اس کے نہ ہونے سے کہیں کوئی رخنہ واقع ہوتا ہے؟ کوئی کمی آجاتی ہے؟ جس خدا کی رہنمائی کے بغیر سیاسی زندگی درست ہو سکتی ہے، نکاح و طلاق کے مسائل بھی اس کی مداخلت کے بغیر نپٹ سکتے ہیں، طہارت اور غسل کے طریقے بھی اختیار کئے جا سکتے ہیں، اعضاء بھی اپنے فرائض سرانجام دے سکتے ہیں۔ حیوانات بھی جہد للبقاء کا فرض انجام دے سکتے ہیں، نباتات کی نشوونما بھی ہو سکتی ہے، جمادات بھی اپنا پارٹ ادا کر سکتے ہیں ـــــ ہاں! ہاں! چاند تاروں کی گردش، موسموں اور دن رات کا چکر، ہواؤں اور پانیوں کی روانی، بلبلوں کی چہک اور پھولوں کی مہک، ان میں سے کوئی بھی چیز آپ کے خود تراشیدہ خدا کی منت کش نہیں ہو سکتی ہو سکتا ہے کہ آپ کو اپنے خدا کی اس لئے ضرورت ہو کہ قسمیں کھانے اور شاعری کرنے میں اس کا استعمال کیا جا سکے ـــــ اگر مقصد یہی ہے تو ٹھیک ہے!

قند و نمک

اپوا کانفرنس

"اپوا" کا کریلا امریکہ کے فورڈ فاؤنڈیشن مشن کی "خیرات" پانے سے نیم چڑھا تو ہو ہی جانا چاہیئے تھا۔ چنانچہ ملکی پیمانے سے صہبائے ترقی چھلک کر بین الاقوامی پیمانے میں چھلکنے پر مجبور ہو گئی ہے!

لاہور کانفرنس کے ذریعے قوم کی بیٹیوں پر ایک نئی تاخت کرنے کے لیئے باہر کے مختلف ملکوں سے "اپوا" کی زندہ دلی منتخبہ خواتین کو یکجا کر کے یہ مظاہرہ کیا گیا ہے، کہ یورپ کی حیا باختہ تہذیب سے اب کوئی قطعۂ ارضی محفوظ نہیں رہا!

یہ کانفرنس اور اس کے پیچھے کام کرنے والی تحریک کوئی معمولی چیز نہیں ہے، اس تحریک کی پشت پر امریکہ کی دعائیں بھی ہیں، خوشنودی اور برکات بھی ہیں، اس کے ڈالر بھی ہیں، ——— بلکہ ایک جہانگیر فسادِ معاشرت بھی ہے اور بیش بہا لٹریچر ہے، چٹ پٹی صحافت ہے، تصاویر اور رقص و طرب ہیں، سینما اور دوسری تفریحات ہیں! لیکن بس اتنے ہی پر نہیں ہو جاتی، ہماری اسلامی حکومت خود اس کی سرپرست ہے، وہ عوام کے خزانے سے اس عوام کے ناپسندیدہ ادارے کی مدد کرتی ہے، سرکاری روزنامے میں صرفِ کثیر سے اس کی ترقی کی تاریخ ہر سال شائع کرتی ہے اور اس کے اکابر اس کے مختلف ہنگاموں کا اپنے دستِ بابرکت اور زبانِ فیض ترجمان سے افتتاح فرماتے ہیں! ——— آخر قرار دادِ پاس کر کے اب اسلام کی کچھ نہ کچھ عملی خدمت کرنا بھی تو ضروری ہے!

لاہور کانفرنس جس زیادہ بے اور طنطنے سے منعقد کی گئی تھی اس کے مقابلہ میں جب ہم اس کی روداد کو دیکھتے ہیں تو یہ کانفرنس اپنے مقصد میں سخت ناکام رہی ہے۔ اول تو یوں بھی اس کی اصل روح نمائش کاری کے سوا کچھ نہ تھی، چنانچہ اس کانفرنس نے اگر ہماری سوشل زندگی پر کوئی اثر ڈالا ہے تو صرف یہ کہ انارکلی کے کچھ دکانداروں کے ہاں سے سینٹ اور لونڈر اور پوڈر زیادہ اٹھ گیا ہوگا، پھول والوں کے ہار شاید بہت گراں نرخوں پر بکے ہیں، کچھ ہوٹلوں اور ریستورانوں کو کمائی کرنے کا اچھا موقع مل گیا ہوگا، موٹر ٹیکسی کے کاروبار کے لیئے دو چار روز کا سیزن خوب گرما گرم رہا ہوگا، یا پھر اخبارات کو خبروں کا مواد اور تصویریں خاص طور پر حاصل ہو گئی ہونگی ——— اور آخر ہو کیا؟

ان لوگوں کے کھوکھلے پن کا یہ حال تھا کہ ایک صاحبہ نے تقریر فرمائی سادگی کی اہمیت پر اور اخبار نویسوں کی مخبری کے مطابق خود نیلے ساٹن کا شوخ و شنگ سوٹ مع زرتار براق کناریوں کے زیبِ بدن فرما کر اور بنا ؤ میں کوئی کسر چھوڑے بغیر تشریف لائی تھیں۔ جب سادگی کی مبلغہ کا یہ حال تھا۔ جو دوسری "اکابرات" ترقی پسندی کی تلقین فرمانے والی تھیں ان کا اندازہ کیا جا سکتا ہے!

ان حالات نے خود "اپوا" ہی کے اندر سے ایک حساس خاتون کو مجبور کر دیا کہ وہ اس نمائش کا پردہ چاک کر کے حقیقی خدوخال دنمایاں کر دے اس خاتون کی تقریر جسے بیچ ہی میں روک دیا گیا تھا بڑی ہی صاف صاف اور کھری کھری باتوں پر مشتمل تھی۔ مثلاً اس نے کہا کہ یہ تنظیم محض سرکاری عہدے داروں کی بیویوں کے عہدوں کی ایک بساط ہے، کوئی معقول خدمت انجام دینے کی بجائے یہ محض نمائش گاہ کے مظاہرے کا میدان بن گئی ہے، عوام سے ربط پیدا کرنے کے بجائے اس کے اجلاس گورنمنٹ ہاؤس میں ہوتے ہیں، اور حقیقی سوشل ورکروں کو اس میں پہنچنے کا کوئی موقع ہی نہیں دیا جاتا۔ اس خاتون نے بے شمار خالی بنچوں کی طرف کرتے ہوئے توجہ دلائی کہ جو کانفرنس اتنے ڈھول ڈھکے سے بین الاقوامی پیمانے پر ہو رہی ہے

اور جس کے لئے بے تحاشہ روپیہ لٹایا گیا ہے۔ اس کی کارروائی سے پبلک کی دلچسپی کا عالم کیا ہے! (مینا بازاروں اور میلوں ٹھیلوں پر بھیڑ جمع کر لینا اور بات ہے اور چند گھنٹے بیٹھ کر کسی مجلس کی کارروائی میں حصہ لینے کی تربیت دینا اور چیز ہے)! اس خاتون کی تقریر کو جس بوکھلاہٹ کے ساتھ ختم کیا گیا اس نے تو غیر ملکی مہمانوں کے سامنے اور بھد کر دی!

کانفرنس نے شہادت بہم پہنچا دی ہے کہ اوپر کے چند لوگوں کی بیگمات نے اپوا کا جو کھیل رچا رکھا ہے۔ اس سے ہمارے ملک کی عام خواتین کو بھی تک کوئی دلچسپی نہیں ہے!

لیکن ہمارے تبصرے کا مدعا یہ نہیں کہ اس فتنہ کو ہلکا سمجھا جائے! جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ عملاً یہ چند خواتین کا کھیل سہی، لیکن اس کی حقیقت کے لحاظ سے آپ یوں سمجھئے کہ جیسے یہ چند خواتین پورا امریکہ ہیں، پورا یورپ ہیں اور پورا دورِ تہذیب ہیں ——— اور ہمارے اسلام پسند عوام اور ہماری اسلام پسند خواتین کو اتنی بھاری قوت کا سامنا ہے۔

ایک قوت کے بھاری قوت ہونے کے سبب لرزہ براندام ہو کر مایوسی کے ساتھ ہتھیار ڈال دینے کی ضرورت نہیں! یہ قوت بڑی بھاری سہی مگر یہ ہمارے عوام کی آرزوؤں کی قوت نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک بیرونی قوت ہے ——— اور اس قوت کو رائے عامہ کے ذریعے شکست دینے کے لئے دنیا کا شاید سب سے بہترین میدان پاکستان ہی ہے!

اسلامی دستور کیا ہوتا ہے؟

غالباً سنہ ۴۹ء میں چراغِ راہ ہی کے کسی شمارے میں ہم نے ایک بڑے مشہور لکھنے والے ترقی پسند کے اس مغالطے کا تفصیلی جواب دیا تھا کہ اسلامی دستور کا مطالبہ کرنے والے عرب کے قبائلی سسٹم کو جوں کا توں اٹھا لانا چاہتے ہیں۔ ایک مغالطے کا جب اچھی طرح تجزیہ کر کے بات کو کھول دیا گیا تو پھر عرصہ تک "صدائے برنخواست" کا سماں رہا۔ لیکن ایک صاحب نے لاہور کے ایک جریدے میں پھر اسی کو دہرا کر یہ سمجھا ہے کہ وہ بڑی دور کی کوڑی لائے ہیں!

ان کی خدمت میں التماس ہے کہ اسلامی دستور کے علمبردار اتنے احمق نہیں کہ وہ اسلامی نظام کے بیرونی قالب کے ان اجزاء کو اس زمانے کے پاکستان میں جوں کا توں نصب کرنے کیلئے زور لگا رہے ہوں جو عرب کے حالات کے تقاضوں کے مطابق مصلحتہً اختیار کیا گیا تھا اور جسے ہر نئی قسم کے حالات میں اسلامی اجتہاد کے اصولوں کے تحت بدلا جا سکتا ہے!

آپ کو نہ جانے کس طرح یہ غلط فہمی لاحق ہوئی کہ اسلامی دستور کی آواز اٹھانے والے لوگوں کا اصل جھگڑا ان مسائل پر ہے کہ پارلیمنٹ یک ایوانی ہو یا دو ایوانی؟ اس کے ممبر اتنے ہوں یا اتنے؟ رائے دہندگی بیعت کے طریقے سے ہو یا پرچیاں ڈال کے؟ ایک ایک فوجی رجمنٹ کی تعداد اتنی ہو یا اتنی؟ ہم نے اپنے نظریئے اور مطالبے پر وسیع لٹریچر فراہم کیا ہے۔ اور اس میں کسی اہم پہلو کو بحث میں نظر انداز نہیں کیا۔ کم سے کم کسی شخص نے "اسلام کا نظریہ سیاسی"، "اسلام کا سیاسی نظام"، "دو دستوری خاکے" اور "جماعت اسلامی کا منشور برائے انتخابات پنجاب" کو یا ان میں سے کسی ایک چیز کو بھی پڑھ لیا ہو تو وہ اس کے بعد ایسی باتیں کرے تو یہ جہل مرکب سے آگے بڑھ کر غلط بیانی کی بیماری کا ثبوت ہوگا۔ پس براہِ کرم جس کسی کے خلاف آپ کو قلم اٹھانا ناگزیر ہو گیا ہو، پہلے اس کی اپنی کہی ہوئی بات کو سنئے، پھر اسی کی بات کا جواب دیجئے، لیکن یہ کوئی معقول طریقہ نہیں ہے کہ اس کی بات کو معلوم کئے بغیر یا اسے معلوم کرنے کے بعد جان بوجھ کر اپنی طرف سے کوئی چیز گھڑ کر اس کے منہ میں ڈالی جائے اور پھر اس

اپنی گھڑی ہوئی بات پر کر کے خیال کیا جائے کہ اختلاف کا حق ادا ہو گیا۔ اس طرح آپ کا دارالعنا ؟ ہوگا!

ہم یہ نہیں کہتے کہ اسلامی نظام سیاست کے لئے جو قالب عرب میں اختیار کیا گیا تھا۔ اس کے غیر منصوص اجزا کو یہاں سے اٹھا لایا جائے بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ ان تمام منصوص اصولوں اور ضابطوں اور دستوری ہدایات کو من و عن خدا کی کتاب اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سنت اور خلفائے راشدین کے تعامل سے اخذ کر کے قبول کر لیا جائے جو اپنی منصوص دستوری حیثیت رکھتی ہوں ——— لیکن واضح رہے کہ ہم "اصولوں" کا لفظ اس "بے معنی مگر پر معنی" انداز میں نہیں بولتے جس میں اسلامی نظام کے بعض اہلین بولتے ہیں۔ ان لوگوں کے ہاں لفظ اصول کا مفہوم کسی گول مول تصور کا ہوتا ہے کہ جس کی جو تعبیر بھی کرنی مطلوب ہو کی جا سکے، اور ہم جب اسلامی اصولوں کی اصطلاح بولتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ قرآن کریم نے اسلامی نظام کے لئے جن بنیادوں کو اپنے کھلے ہوئے الفاظ کے ساتھ بیان کر دیا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جن کی ایک متعین تفصیل و تفسیر فرما دی ہے۔ اور خلفائے راشدین نے اسی تفصیل کے مطابق ان اصولوں کو کارفرما کرنے کے کچھ قانونی و فقہی نظائر ہم پہنچا دیئے ہیں ان کو لازمی طور پر قبول کر لیا جائے۔ وہاں "اصول" کا لفظ شاعرانہ، فلسفیانہ اور ایک لحاظ سے متصوفانہ شان کے ساتھ بولا جاتا ہے۔ اور ہم اصول کا لفظ دستوری، آئینی اور ضابطائی زبان میں بولتے ہیں!

آپ نے تحدی کے ساتھ یہ دریافت فرمایا ہے کہ لاؤ ہمیں بتاؤ کہ اسلامی دستور تم کسے کہتے ہو، تو ہم اس کے جواب میں جناب والا کو یاد دلائیں گے کہ امیر جماعت اسلامی کی طرف سے "سرکاری دستوری سفارشات" پر جو تنقیدی تقریر لاہور اور دوسرے شہروں میں کی گئی تھی۔ اس میں کچھ ایسے اصول متعین کر دیئے گئے تھے کہ جن کے بغیر کوئی دستور اور کوئی ریاست "اسلامی" نہیں ہو سکتی اور جن کو اختیار کرنے سے ایک دستور اور ایک ریاست "اسلامی" بنتی ہے۔ وہ اصول اگر پیش نظر ہوں تو یہاں پھر درج کئے جاتے ہیں:-

پہلا اصول :-

(الف) خدا اور رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت مقدم ہے اور اولی الامر کی اطاعت، اس کے بعد!

(ب) اولی الامر صرف وہی ہو سکتے ہیں جو مسلمانوں میں سے ہوں، ایک غیر مسلم اسلامی حکومت میں کارکن تو ہو سکتا ہے، کارفرما نہیں ہو سکتا!

(ج) پبلک کو حکومت سے نزاع کا حق حاصل ہے افراد کو بھی اور بحیثیت مجموعی قوم کو بھی۔ حکام کو بے چون و چرا اطاعت کرانے کا حق نہیں پہنچتا یہ حق صرف خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے خاص ہے!

(د) جب پبلک اور حکام کے درمیان نزاع ہو تو اس کا فیصلہ خدا کی کتاب اور اس کے رسول صلعم کی سنت کے مطابق ہونا چاہیئے یعنی اصل فیصلہ کن قانون خدائی قانون ہے، نہ کہ کوئی انسانی قانون!

دوسرا اصول :-

(الف) جن معاملات میں اللہ اور اس کے رسول صلعم نے کوئی فیصلہ دے دیا ہے۔ ان میں کسی کو قانون سازی کا حق نہیں پہنچتا!

(ب) ہمیں اگر کسی معاملے میں قوانین بنانے کا حق ہے تو وہ ایسے معاملات میں جن میں خدا اور رسول صلعم نے کوئی واضح حکم نہیں دیا ہے!

تیسرا اصول :-

خدا کی نافرمانی میں کسی کی اطاعت نہیں، اطاعت اگر ہو سکتی ہے۔ تو صرف معروف میں ہو سکتی ہے!

چوتھا اصول :-

(الف) لوگوں کی جان و مال اور عزت کے تحفظ کی جو ضمانت دی جائے گی۔ وہ کسی شخص یا گروہ کی طرف سے نہیں بلکہ خدا اور رسول صلعم کی طرف

سے دی جائے گی۔ اور قانون خداوندی کے سوا کسی دوسرے قانون کے تحت کسی شخص کے ان بنیادی حقوق پر ہاتھ نہ ڈالا جاسکیگا!
(ب) کسی شخص کو عمل (عملی کھلی باضابطہ عدالتی کارروائی) کے بغیر قید نہیں کیا جاسکتا!

پانچواں اصول:۔

قانون کی نگاہ میں سب لوگ یکساں ہیں۔ حکمران اور رعایا، اُمرا اور غُربا، بڑے لوگ اور چھوٹے آدمی سب کے لئے اسلام میں ایک ہی قانون ہے۔ کسی کے لئے کوئی مخصوص امتیازی حقوق نہیں۔

چھٹا اصول:۔

اسلامی حکومت کا مقصد وجود "معروف" کو قائم کرنا اور "منکر" کو مٹانا ہے!

ان اصولوں کے لئے نصوص سے جو استدلال کیا گیا ہے اور ان کی تفصیل جو کچھ بیان کی گئی ہے۔ اسے براہ کرم اصل تقریر میں ملاحظہ فرمائیں اگر وہ ہم تک پہنچ سکے۔ تو مدیر چراغِ راہ کو مطلع فرمائیں، وہ بلا قیمت ھدیہ کردے گا!

پھر آپ کو ان "بائیس اصولوں" کا بھی مطالعہ فرمالینا چاہیئے۔ جن پر مختلف فرقوں کے علماء کے ساتھ ہم نے بھی پورا پورا اتفاق کیا ہے کہ ایک اسلامی حکومت ان اصولوں پر قائم ہوسکتی ہے، ذرا اس میں دیکھئے تو سہی کہ کہیں یک ایوانی اور دو ایوانی پارلیمنٹ کا کوئی جھگڑا موجود ہے۔ اور عرب کے قبائلی سسٹم کو قائم کرنے کے لئے کوئی دفعہ رکھی گئی ہے؟

آخر ہوائی باتیں کرنے سے کیا فائدہ؟

خدا اور رسولؐ

بعض لوگ آج بھی ایسے پائے جاتے ہیں۔ جن کی ذھنیت "لن نومن حتی نری اللہ جھرۃ" کی صدا دیتی ہے! ان کا مطالبہ یہ ہے کہ اگر خدا کا کوئی دین، اس کی کوئی ہدایت اور اس کا کوئی حکم و قانون ہے اور وہ اسے ہم سے منوانا چاہتا ہے تو ذرا عرش سے اتر کے آئے اور ہم سے بات کرے!

جی! خدا اور آپ سے بات کرے بس ——— یہ مُنہ اور مسور کی دال!

آپ نے اپنے آپ کو کچھ اتنا اونچا سمجھ لیا ہے کہ خدا سے آپ یہ چاہنے لگے ہیں کہ وہ آئے اور آپ سے "درخواست" کرے بالواسطہ نہیں، بلا واسطہ کرے کہ میرے بندگانِ وفادار! کچھ میرے مطالبات بھی تم سے ہیں، پھر آپ مُنہ پھیر لیں تو وہ بار بار آپ کے دروازے کا چکر کاٹے، منت خوشامد کرے کہ ذرا میرے "دین" کا بھی خیال رکھیو، کچھ میری عبادت اور کچھ اطاعت کرتے رہیو! ——— ورنہ آپ اس کے انبیاء و رسل کو تو خاطر میں لانے سے رہے!

بڑا مقام ہے آپ کا، کہ جب تک خود خدا آکر انٹرویو نہ دے تو آپ یہ ماننے ہی پر تیار نہیں ہیں کہ اس کے کچھ احکام و اوامر بھی ہیں اس نے زندگی کے کچھ اصول بھی مقرر کئے ہیں!

مگر خدا نے انسانوں سے جب بھی کلام کیا ہے، ان کو جب بھی ہدایت دی ہے اور اپنے ضابطے کی تعلیم دی ہے تو انبیاء و رسل ہی کے ذریعے دی ہے۔ چنانچہ اسلامی نقطۂ نظر سے رسالت پر ایمان لائے بغیر کسی کا خدا کو مان لینا بالکل بے کار ہے۔ خدا کے وجود کی شہادت تو

بقیہ بر صفحہ ۸

دو "خاص نمبر"

(تعارفِ کتب و جرائد)

(۱)

ہفتہ وار "جہانِ نو" کے افسانہ نمبر کے بعد ماہنامہ "مشیر" کراچی کا افسانہ نمبر سامنے آیا ہے۔ دو سو صفحے کی ضخامت، کتابت و طباعت اچھی، سرورق کا ڈیزائن نیا، اور اس پر قیمت صرف ایک روپیہ چار آنے! ۔۔۔۔۔ کے خرادکیا ہو؟

سب سے پہلے "افسانہ کی ماہیت" پر سید ابو الاعلیٰ مودودی کے خط کا اقتباس درج ہے۔ یہ اقتباس مذہبی طبقے کی اس غلط فہمی کا ازالہ کرتا ہے کہ افسانہ جھوٹ کی تعریف میں آتا ہے۔ پھر نجات اللہ صدیقی کا چند لفظی افسانہ ہے "بڑا کامیاب" - ادیب کی شہرت پرستی پر یہ ایک کاری ضرب ہے "معروضات" کے عنوان سے مرزا عبد الغفور بیگ صاحب مرتب "مشیر" نے بعض ضروری امور کو قلمبند کیا ہے۔ غیر اسلامی ادب پر سرسری تبصرہ بھی ہے اور اسلامی مکتب ادب کا تعارف بھی! مرزا صاحب کے اس احساس میں کہ:-

> جنسی رسالوں کے "عورت" یا "مرد" نمبروں کو چھوڑ دیجئے ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ "حالی نمبروں" تک کو آپ "ردی نمبر" یا "جنسی بھوک نمبر" پائیں گے۔ اچھے اچھے زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کے علمبرداروں کے ضخیم مجلدوں کو ٹٹول ڈالئے۔ آپ کو زلفِ برہم کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ ادبیات کے ان جاگیرداروں کے ہاں اردو ادب کو آپ اس طرح بے جان و بے آبرو پائیں گے جس طرح آج ہمارے سماج کے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے ہاں انسانیت بے جان و بے آبرو ہے!

ہم سب برابر کے شریک ہیں! "ادبیات کے جاگیرداروں" خوب پر معنی ترکیب ہے جس نے کئی فقرے لکھنے سے مرزا صاحب کو بے نیاز کر دیا ہے۔ پھر یہ بھی کتنی درست رائے ہے کہ:-

> اگر ایک ادیب حساس اور باشعور ہونے کے ساتھ ساتھ ایماندار اور باضمیر بھی ہے۔ تو ناممکن ہے کہ اسکے قلم سے مخرب اخلاق اور فحش چیزیں نکلیں!

یہ وہی بات ہے جو قرآن کریم نے (الشعراء) "یتبعھم الغاوٗن" کہنے کے بعد "الا الذین امنو" کہہ کر واضح کی ہے۔
پھر آپ اپنے قارئین کو بتاتے ہیں۔ کہ "اس نمبر کے مطالعہ سے یہ واضح ہو جائے گا کہ اصلامی اور اخلاقی ادب کیا ہے اور ایک باشعور ایماندار ادیب کا راستہ ادب کے میدان میں آج کل کے رواجی ادب سے کس مقام پر الگ ہوتا ہے!
مرزا صاحب نے ایک جگہ "مکتب فکر" کی جگہ "مکتبۂ فکر" کی ترکیب استعمال کی ہے حالانکہ "مکتب" اور "مکتبہ" کا مفہوم بالکل جدا ہے
تعارفی اداریہ کے بعد ایک مخصوص مقالہ "اردو افسانہ نگاری میں اسلامی عناصر" عامر ضیائی رامپوری کے قلم سے سامنے آتا ہے مگر مقالہ پڑھنے کے بعد مناسب یہ معلوم ہوا کہ اس کا عنوان "اردو افسانہ نگاری پر اسلامی نقطۂ نظر سے تبصرہ" ہونا چاہیے تھا۔ اس مقالہ میں فورٹ ولیم کالج کے "مکتب ادب" سے ترقی پسند مکتب ادب تک سارے ہی ادوار کا جائزہ لیا گیا ہے، مختصر مگر جامعیت کے ساتھ!

نئی چیزوں میں سب سے پہلے راقم الحروف کا لکھا ہوا "جشنِ آزادی کا پانچواں جلوس" سامنے آتا ہے۔ اس کی مقصدی اور فنی حیثیت پیروڈی نما ڈرامائی سرِدن کا کام ہے۔ عاصی ضیائی کا "بقول مزدک" درحقیقت "کیوبا کے دھند" سے اگلا قدم ہے۔ موضوع وہی اشتراکیت ہے مگر "کیوبا کے دھند" میں زیادہ تر اشتراکی پروپیگنڈا زد پر آیا تھا۔ اور "بقول مزدک" میں اس کے فلسفہ کی گہرائیاں ہدف بنتی ہیں۔ خاکہ اڑانے کی یہ کوشش مقصدی اور فنی لحاظ سے کامیاب ہے۔ اس طنزیہ میں مصنف نے مزاح کے رنگ کو ابھارنے کے لئے انگریزی طرز کے کچھ مصادر گھڑے ہیں، مثلاً کوشنا (کوشش کرنا)، تشریحنا (تشریح کرنا)، یقیننا (یقین کرنا)، پیشنا (پیش کرنا)۔ مگر بہت سے مقامات پر مصنف اپنی ترقی پسند گرامر کو نبھانے میں تساہل کر گئے ہیں۔ مثلاً "موت کے گھاٹ اتارنا" کی جگہ "موتا دینا"، "مرتب کرنے کی جگہ" "مرتبانا" یا "ترتیبانا"، "اصطباغ لینے کی جگہ" "اصطباغنا" اور "اصطباغ دینے کی بجائے" "اصطباغانا"، "گنجائش نکالنا کی جگہ" "گنجائشنا"، "ہڑتال کرنے کی جگہ" "ہڑتالنا"، "خبر سنانے کی جگہ" "خبرانا"، "گالیاں نذر کیں کی جگہ" "گالیاں نذرائیں"، "انکار کرنے کی جگہ" "انکارنا"، "تعجب ہونا یا کرنے کی جگہ" "تعجبانا"، "فریب میں مبتلا کرنے کی جگہ" "فریبانا" اور "عزیز رکھنے کی جگہ" "عزیزنا" کے مصادر استعمال کئے جانے چاہئیں تھے۔

منظر حسین کا "ڈوبتا ہوا" اگرچہ کچا اور نا کام افسانہ نہیں ہے۔ مگر اس میں نہ تو غیر معمولی شوخی ہے نہ گہرائی۔ علی سفیان آفاقی "ادب کا جغرافیہ" لئے ہیں مگر یہ لطیف ہونے کی بجائے گنجلک ہو گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ استعاریت کا پوری طرح منصوبہ نہیں بنایا گیا اور بنایا گیا تھا تو اسے سنبھالا نہیں جا سکا۔ علی سفیان اپنے اس مزاحیہ خاکے میں اپنے پہلے مقام سے آگے نہیں بڑھے بلکہ دو قدم پیچھے ہی ہٹے ہیں!

ضیاء الاسلام انصاری کا "غزل کا سفر" تنقیدی مقالے میں افسانے کا رنگ بھرنے سے دلچسپ پذیر ہوا ہے۔ طنز و مزاح سے اس کا مزاج بنا ہے۔ اور اوسط درجے کی اچھی چیز ہے۔

آثم میرزا اگرچہ اس بزم میں نووارد ہیں، لیکن "اندھیرے سے اُجالے تک" کو پڑھ کر بڑی امید ہوتی ہے کہ وہ کچھ بنیں گے۔ وہ دکھاتے ہیں کہ صفیہ جو ایک فوجی کلب کا بادیۂ تفریح بن کر جنسی رنگینیوں کے پیچھے بھاگتی ہے وہ آخر کار ان رنگینیوں کے مہلک جراثیم کا شکار ہوتی ہے۔ لیکن ایک مسلم دل و دماغ کا فوجی ڈاکٹر جو اس کے خطرناک آغاز کی شوخیوں سے نفرت رکھتا تھا۔ وہی اس کے دردناک انجام کو دیکھ کر چارہ گر بنتا ہے اور انسانی ہمدردی کے جذبات کے تحت اس کو ڈوب جانے سے بچا لیتا ہے۔ آثم میرزا ابھی ابتدائی منزل میں ہیں اس کے پیشِ نظر ہم ان "صراحتوں" سے زیادہ تعرض کرنا مناسب نہیں سمجھتے جو ان کے افسانے میں ایک بے جوڑ سی چیز بن کر کھٹکتی ہیں ——— یہ صراحتیں بہرحال اس "کنایت" سے زیادہ بہتر ہیں جو بسا اوقات مقصدیت کو مجروح کر دیتی ہے اور ایک افسانے کو جو معنی کوئی پہنانا چاہے وہ پہنائے جا سکتے ہیں!

احمد اسحاق کی کہانی "چراغ بجھ گیا" کا مقصد بھی وہی ہے۔ جو "اندھیرے سے اجالے تک" کا ہے۔ لیکن پلاٹ یا خاکہ دوسرا ہے۔ ریحانہ کو اس کا شوہر خود ہی دلانہ تہذیب کے دائرے سے نکال کر بے حیائی کی فضا میں لاتا ہے۔ اور اسی فضا میں وہ بادلِ ناخواستہ ایک بچے کو جنم دیتی ہے۔ "وہ آخر کہاں تک ان ذمہ داریوں سے بچتی جو قدرت نے اس پر ڈال دی تھیں"۔ لیکن بچہ اس کی سوشل رنگینیوں کے سامنے آڑ بن گیا۔ اختر کے مشورے سے بچے کیلئے ایک آیا کا انتظام کر دیا گیا اور ریحانہ پھر تفریحات کی دنیا میں گم ہو گئی۔ نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ بچے کو بیمار چھوڑ کر وہ رنگ رلیاں منانے کے پروگراموں میں باقاعدگی سے شرکت کو نبھاتی ہے اور آخر کار یہ ننھا سا چراغ گل ہوتا ہے ——— اور دنیا کچھ جنم لیتا ہے!

اعظم ادیب کی انسانویت آمیز نظم "جھاڑیوں کے پیچھے" بڑی اچھی چیز ہے، نیا موضوع تلاش کیا گیا ہے، اسے نبھایا گیا ہے مگر

اس کا حق ادا کیا گیا ہے۔ بحر کا انتخاب بھی قابلِ داد ہے!

شمیم جاوید نے "مجاہد" کے عنوان سے سلطان صلاح الدین ایوبی کے عہد کی ایک کہانی نظم کے پیرائے میں پیش کی ہے ـــــ مگر اس کی فنی کمزوریوں اور اس کے اندر شعریت کی کمی دیکھ کر دل نہیں مانتا کہ یہ کارنامہ شمیم جاوید کا ہوگا۔ کہیں نام تو غلط نہیں چھپ گیا کہانی جذبات نگاری کے لئے بڑا وسیع مواد رکھتی ہے۔ مگر شاعر یا افسانہ نگار! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا کرایہ کا کاریگر ہے!

"اسی برس بعد" کے عنوان سے مترو کے رنگ کے ایک عربی افسانہ کا ترجمہ عبدالقادر حسن (رفیق دارالعروبہ) کے قلم سے شریکِ اشاعت ہے۔ یہ ایک متوسط درجے کی چیز سے آگے نہیں جا سکا۔ اس میں تاریخیت اور افسانویت دونوں میں بڑی کشمکش ہے اور تاریخیت کو مجروح کئے بغیر افسانویت کا رنگ جما دینے کا کمال نہ تو اصل مصنف "سعید العریان" دکھا سکا ہے اور نہ ہی اس کے نقائص کو مترجم کا قلم زائل کر سکا ہے۔ اس کے مقابلے میں احسان بی اے کا "دہ دن" تاریخی افسانہ ہونے کے لحاظ سے بہت ہی اونچا ہے۔ واقعہ نگاری میں مورخانہ ذمہ داری سے کام لیا گیا ہے۔ اور ماحول کی عکاسی اور جذبات نگاری اور کرداروں کی تصویر کشی میں افسانہ نگاری کا حق ادا کیا گیا ہے۔ اسے کامیاب اسلامی افسانوں کی صف میں جگہ ملنی چاہیئے۔ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ اوریجنل ہے یا ترجمہ!

اور یہ ہے خاتمہ کا افسانہ "تھکی ہوئی روحیں" ـــــ اسعد گیلانی کے قلم سے! افسانہ نگار کے پیشِ نظر عورتوں کو بگاڑنے والی گندی مغربی تہذیب ہے اور وہ اس تہذیب کے سمندر میں ایک عجیب و غریب قسم کے کردار کا "جزیرہ" دکھاتا ہے جس کا نام حامد ہے جو ... بناوٹی اور نمائشی زندگی کے تکلفات سے تھکا ہوا ہے جسے سڑکوں پر کھٹ کھٹ چلنے والی نوجوان لڑکیاں ایک "خطرہ" محسوس ہوتی ہیں۔ اور اس طرح کے خطروں کے دامنوں کی بو میں وہ "عشقِ مرکب" (اسعد کی اس ایک ترکیب ہی کو حاصلِ افسانہ قرار دے لیجئے) کی بو محسوس کرتا ہے۔ اس کے نزدیک شوخ و تنگ بیگمات کے چال چلن کے لئے "مہذب طوائفوں" سے کم کوئی تعریفی کلمہ نہیں۔ ہوٹلوں میں "نفسانی تعفن" پا کر وہ ان کی فضا سے بھاگتا ہے اور اس کی ذہنیت بڑے عجیب طریق سے نشو و نما پاتی ہے۔ اس کی بہن رضیہ اپنی بحثوں میں اس کے سامنے مغربی معاشرت کی وکالت کرتی ہے۔ لیکن نتیجہ صفر۔ حامد کو کوئی "باوقار لڑکی" ماحول میں نظر نہیں آتی، لیکن آخر کار اس کا تعارف زہرہ سے ہوتا ہے۔ اور تعارف سے چل کر معاملہ منا کحت پر منتج ہوتا ہے۔ لیکن پہلے ہی لمحہ میں زہرہ کی حقیقت کھل جاتی ہے کہ وہ نسوانیت کی روح سے خالی عورت ہے، ایک پتھر، برف کی ایک سل! یہ برف کی سل حامد کے جسم سے زندگی کے سارے شرارے نچوڑ لیتی ہے اور حامد کا لت چھوڑ کر اس سے جان بچا کر بھاگتا ہے اور فوج میں بھرتی ہو جاتا ہے۔ ٹریننگ کے بعد اُسے ترا خیل کے محاذ پر بھیجا جاتا ہے۔ جہاں رضیہ بھی زنانہ امدادی دستے کے ساتھ سپاہی بن کر پہنچتی ہے ـــــ یہاں آ کر حامد اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے کہ عورت کا استحصال کس طرح ہوتا ہے ـــــ اور خود رضیہ کا!

گو حامد مایوسی اور بے اطمینانی کے گڑھے میں گر جاتا ہے۔ اس کا ضمیر اس کی قابلِ رحم حالت دیکھ کر پکار اٹھتا ہے کہ کاش وہ کسی ایسے مقصد کا معمولی سپاہی ہوتا جو انسان کو اس کی انسانیت واپس دلا سکے! آہ "وہ ایک پیاسا پیاسا تھا جو پانی کا نام نہ جانتا تھا!"

شائع شدہ چیزوں کا انتخاب جو پیش کیا گیا ہے۔ اس کے گلدستہ میں جمیل عباس کا "گونگے طوفان"، اسعد گیلانی کا "کیڑے مکوڑے" نصر اللہ خاں عزیز کا "ایسرونی سار روز نامچہ" آباد شاہ پوری کا "سیلاب" عاصی نیپالی کا "شہتیر اور تنکے"۔ اور عرفان غازی کا "کیچپ پلو" نعیم صدیقی کا "تنقید نگار"، اور ا۔ ا۔ ث کا "بے نام اللہ کا" اور انگریزی زبان کا "اچھی چیزیں ہیں۔ اس انتخاب میں راقم الحروف کی دو کہانیاں "نقطہ اور لکیریں" اور "افسانہ کی پری" شامل ہیں!

لیکن انتخاب بہ حیثیت مجموعی ہم مطمئن نہیں ہیں۔ جیسے کہ جیلانی بی اے کے "احوبہ" جیسے افسانے کو چھوڑ کر "اذان" کو لیا گیا ہے۔ اور رشید احمد کے ہاں سے "جہاں سے وہ چلی تھی" کو "مس" پر ترجیح دی گئی ہے۔ اسی طرح ماہر القادری کی کہانی "دفتر میں" ایک سوچے سمجھے انتخاب کا ثبوت نہیں دیتی!

مجموعی طور پر اس نمبر کی اشاعت سے اسلامی مکتبِ ادب کا قدم ترقی کے راستے پر اور آگے اٹھ گیا ہے جس کا خیر مقدم پورے جذباتِ مسرت سے کرتے ہیں! یہ نمبر گندے ادب کے تالاب میں پاکیزگیٔ ذوق کا ایک سفینہ ہے ——— اگرچہ ہے کاغذی!

---

(۲)

ہفتہ وار "جہانِ نو" سیفٹی ایکٹ کے خنجر سے ایک بار زخمی ہو کر اٹھا۔ تو معرکہ اسلام و فرنگیت کے میدان میں جانبازی کی شان کے ساتھ دوبارہ کود گیا۔ ابھی چار ہاتھ دکھائے ہی تھے کہ پھر سینے پر گھاؤ کھا کر گر پڑا بظاہر یہ جان لیوا زخم تھے۔ مگر صبر کے مرہم سے آخر کار یہ مندمل ہو گئے۔ اب وہ تیسری بار میدان کارزار میں قدم رکھ رہا ہے ——— اور اس شان سے کہ ایک ہاتھ میں صداقت کی تیغ دو دم بھی متحرک ہے اور ایک کندھا جمہوریت کے جنازے کے لئے بھی پیش کر رکھا ہے۔ "بہ زمانہ جام بدست و جنازہ بردوش است" کی بجائے نقشہ یہ ہے۔ کہ "سپاہی تیغ بدست و جنازہ بردوش است"!

اس تیسرے دورِ اشاعت کا پہلا شمارہ "جمہوریت کا جنازہ نمبر" ہے۔ بحمد اللہ کہ نمبر کامیاب ہے! اسعد کے ذوقِ ترتیب اور قلمی انتقاد کی محنتوں کی ہم داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

نتائجیہ کا عنوان ہے "باقی ہے ابھی رنگ مرے خونِ جگر میں!" ——— اس مصرعے کے لکھنے کے بعد اگر قلم کید رید حرکت نہ بھی دی جاتی توضیحِ مدعا کی وضاحت بلکہ جہانِ نو کی تاریخ کے بیان میں کوئی کمی واقع نہ ہوتی!

صفحہ ۹ پر سیفٹی ایکٹ کے خلاف قرآن و حدیث کی عدالت کا فیصلہ درج ہے۔ پھر قرآن و حدیث کے نظامِ قانونی کے ایک بڑے سربراہ کار سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک قانونی ارشاد زینتِ قرطاس ہے۔ پھر پاکستان میں اسلامی نظام کیے ہوگی کا حاصلِ مطالعہ و تحقیق چند لفظوں میں پیش کیا گیا ہے، اور آخر میں قائد اعظم کی رائے درج کی گئی ہے!

مدیر جہانِ نو نے ملک کے سیاسی اور صحافتی اور مذہبی اکابر سے پیغامات بھی طلب کئے تھے۔ مگر کل پیغامات جو بروقت موصول ہو سکے صرف چھ تھے جن میں سے سب سے زیادہ امتیازی حیثیت خان عبد القیوم خان وزیر اعظم صوبہ سرحد کی ہے۔ دوسروں کے لئے اس جنازے کو کندھا دینا فرضِ کفایہ ہوگا۔ مگر آپ کے لئے یہ فرضِ عین تھا!

اسعد گیلانی نے انتخاباتِ پنجاب کا بڑا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ جس سے بہت استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ نصر حسین نے بھی انتخاباتِ پنجاب کو چونکہ اندر سے خوب اچھی طرح دیکھا ہے۔ اس لئے "فتح و شکست" کے عنوان سے جو رپورتاژ پیش کیا ہے۔ وہ بڑی سیاسی اور ادبی قدر و قیمت کا حامل ہے۔ انتخاباتِ سرحد کا نقشہ محمد صدیق الحسن صاحب نے کھینچا ہے، اور خوب کھینچا ہے، لیکن ہم زیادہ تفصیل چاہتے تھے۔

اس نمبر کا حاصل اسعد گیلانی کا لکھا ہوا رپورتاژ "ایک ایڈیٹر اور ایک وزیر" ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ زندگی کے جس گوشے سے اسعد گیلانی نے نقاب اٹھائی ہے، اور عالم بالا کے جس منظر سے ہماری آنکھوں کو حصہ دلوایا ہے۔ وہ اپنی شان میں بالکل نرالا ہے۔ اسعد کی اس آپ بیتی کو پڑھتے ہوئے یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہم خود براہِ راست اس محفل میں شریک ہیں جس میں ہمارا ذکر ہو ہم سے بہتر ہے۔ ہمیشہ رہتا ہی ہے۔ یہ ہماری

قسمتوں کا فیصلہ کرنے والی عدالت ہے جس کے جج اپنے مشیروں کے ساتھ بیٹھ کر دلائل سے معاملات نہیں چکاتے بلکہ اپنے جذبات پر فیصلے کرتے ہیں۔ اس عدالت کے چیف جسٹس اکثر طنز میں کہا کرتا ہے "آئینِ عدالت سے نمٹنے کا گر سکھاتے ہیں کہ قصور کیا ہو یا نہ کیا ہو، پیش ہو کر ہر الزام پر کہہ دو کہ بجا فرمایا حضور نے" اور "غلطی تو اس خاکسار ہی سے ہوئی ہے" اور "معافی چاہتا ہوں" ورنہ قاضی اور کسی تصریح و توضیح اور صفائی کے کسی بیان کو سن کر یہی کہے گا کہ "میں مطمئن نہیں ہوں" ۔۔۔۔ اور قاضی کے اظہار عدم اطمینان کے بعد کی خموشی کے معنی یہ ہیں کہ سیفٹی ایکٹ کا وار ہوا!

باقی سب مضامین سیفٹی ایکٹ اور پروڈا وغیرہ قوانین سے اور جس بے جا کے اصول سے سنجیدہ بحث کرتے ہیں۔ یہ مضامین جو سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا امین احسن اصلاحی اور دوسرے اصحاب کے ہاں سے "ماخوذ" ہیں جہاں تو کے نئے قارئین کے لئے تو بالکل نئے ہی ہیں۔ لیکن جو ان کو پہلے پڑھ چکے ہیں۔ وہ اگر پھر پڑھیں گے تو اس تکرار مطالعہ کو مفید ہی پائیں گے!

سائز جہان نو کا خاص ہے ضخامت ۲۰ صفحات، سرورق کا ڈیزائن نہایت خوشنما۔ آرٹ پیپر پر چھپا ہوا۔ اور قیمت سوا روپیہ ہے اس نمبر کو خرید کر جمہوریت کے جنازے میں شرکت کا ثواب دارین حاصل کیجئے!

بقیہ: میں نہیں چاہتا، مگر۔

ہے۔ ہم جو کام نہیں کرنا چاہتے وہ کرتے ہیں جو کرنا چاہتے ہیں وہ نہیں کر سکتے جس چیز کو حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ نہیں ملتی اور جس سے بھاگتے ہیں اُسے کوئی ہمارے سر منڈھ دیتا ہے ہم جن کو لیڈر بنانا چاہتے ہیں ان کو کروڑوں ووٹ دے کر بھی نہیں بنا سکتے اور جن کو ایک ووٹ بھی نہیں دینا چاہتے وہی ہمارے وزیر بن جاتے ہیں۔ ہم جس قانون کے خلاف چیختے ہیں وہ ہمارے اوپر مسلط رہتا ہے اور جس چیز کو قانون کی شکل میں دیکھنا چاہتے ہیں وہ کبھی قبول نہیں کی جاتی۔ عجیب تماشا ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ جیوں مگر زندگی ہے کہ میری جان نہیں چھوڑتی!

لیجئے رشید صاحب اور ذوالفقار صاحب اور چوہدری قمر الزماں کے ریڈیو بجنے لگے۔ اور ان کے لاؤڈ سپیکر پوری آواز میں استغاثہ کئے جا رہے ہیں۔ میری چھ سال کی لڑکی "نواب جادہ اکرام اللہ جندہ باد" کے نعرے لگا رہی ہے باہر بچوں کا خلاف قانون مجمع کرکٹ کھیلنے لگ گیا اور سیجئے میرے دو سالہ بچے نے بھی پنجابی کی پڑی کی گاڑھی گالی اگل دی ہے اور رشید کی کتوری اپنی نسوانی بھونک سے کسی کا استقبال کر رہی ہے۔ اور ادھر میرے مکان کی طرف رخ کرکے خواتین کا ایک غول ریڈ کراس کے ہفتے کی تحریک کے تحت غالباً چندہ لینے کے لئے مارچ کر رہا ہے۔ اور ان کے جلو میں ہاکر اخبارات لئے چلا آ رہا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ بات کو ادھورا چھوڑ دوں مگر......!

ضیا محمّد ضیا

ساتھیو! ہمّت دکھاؤ

(ایک طویل خطاب)

آدمیت ہو رہی ہے بربریت کا شکار
آج ہر خونی درندہ امن کا لیتا ہے نام

چار سو چھایا ہے مظلوموں کی آہوں کا غبار
ہے لیٹروں کی زباں پر پاسبانی کا پیام

گردنِ مزدور پر ہے پنجۂ سرمایہ دار
بولتی ہے عدل کے پیکر میں رُوحِ انتقام

اہلِ دولت ڈالتے ہیں اہلِ محنت پر دباؤ
جل رہے ہیں سینۂ انساں میں نفرت کے الاؤ

ساتھیو! ہمت دِکھاؤ
ساتھیو! ہمت دکھاؤ

آدمی پھر آدمی کی جان کا دشمن ہُوا
آج برپا ہے زمیں کے چپّے چپّے پر فساد

کل تلک جو راہبر تھا آج وہ رہزن ہُوا
اُٹھ چکا ہے آدمی سے آدمی کا اعتماد

جو محافظ تھا وہی غارت گرِ گلشن ہُوا
سامنے ملکوں کے ہے اپنی غرض اپنا مفاد

سینۂ انساں پہ وحشت نے لگائے سخت گھاؤ
بڑھ رہا ہے دن بدن قوموں کا آپس میں تناؤ

ساتھیو! ہمت دکھاؤ
ساتھیو! ہمت دکھاؤ

جنگ کی تیاریوں میں لگ گئے شیطاں تمام
ہوگیا ہے تیز تر پھر اسلحہ سازی کا کام
کارخانوں میں بموں کے تجربے ہیں صبح و شام
امن کے چھیڑو ترانے آشتی کے گیت گاؤ
ساتھیو! ہمت دکھاؤ

پس رہے ہیں ظلم کی چکّی میں بیچارے عوام
بُن رہے ہیں آپ انساں اپنی محکومی کے دام
ابنِ آدم آج بھی ہے ابنِ آدم کا غلام
توڑ کر بندِ غلامی جشنِ آزادی مناؤ
ساتھیو! ہمت دکھاؤ

خرمنِ امن و اماں پر گر رہی ہیں بجلیاں
چل رہی ہیں ہر طرف ظلم و ستم کی آندھیاں
باغِ عالم میں بہاروں پر جھپٹی ہے خزاں
گھر گئی گرداب میں تہذیبِ انسانی کی ناؤ
ساتھیو! ہمّت دکھاؤ

یہ صنم قوم و وطن کے یہ بُتانِ رنگ و خوں
پھونکتے ہیں قلبِ انساں پر تعصّب کا فسوں
ہے انہی سے آج تقدیرِ اُمم خوار و زبوں
توڑ ڈالو ان بتوں کو خاک میں ان کو ملاؤ
ساتھیو! ہمّت دکھاؤ

کس قدر سنساں ہوئی ہے زندگی کی رہگذر
قافلے لوٹے گئے مارے گئے راہی ہزار
خونِ انساں سے ہوئے ہیں دشت و کہسار لالہ زار
ہوگیا دشوار کتنا جان و عزّت کا بچاؤ
ساتھیو! ہمت دکھاؤ

بے خدا تہذیب نے دکھلا دیا اپنا مزاج
جل رہا ہے معصیت کی آگ میں سارا سماج
ہے تمہارے پاس دردِ آدمیّت کا علاج
کھول کر سارے مفاسد اس تمدّن کے بتاؤ
ساتھیو! ہمّت دکھاؤ

نوچ لی ہے شیطنت نے چہرۂ زن[1] کی نقاب
بر سرِ بازار کھلتے ہیں سیہ کاری کے باب
عصمتیں بکتی ہیں اور نیلام ہوتے ہیں شباب
تیز تر ہے معصیت کے تند طوفاں کا بہاؤ
ساتھیو! ہمت دکھاؤ

ظلمتِ شب سے عیاں نورِ سحر ہونے کو ہے
اک نیا سورج اُفق پر جلوہ گر ہونے کو ہے
ذرّہ ذرّہ خاک کا شمس و قمر ہونے کو ہے
آنے والی صبح کے انوار کی باتیں سناؤ
ساتھیو! ہمت دکھاؤ

سو رہا ہے پہلوئے انساں میں انساں کا ضمیر
اب بھی چلتا ہے دماغوں پر فسونِ شیخ و پیر
ہے ابھی مُرغِ خرد دامِ توہم میں اسیر
چہرۂ علم و یقیں سے ریب کے پردے ہٹاؤ
ساتھیو! ہمت دکھاؤ

ڈھل رہا ہے ملحدانہ فلسفوں کا آفتاب
تشنۂ تعبیر رہ جائینگے شیطانوں کے خواب
پہلوئے گیتی میں کروٹ لے رہا ہے انقلاب
تم بھی اُٹھو اور نئی تہذیب کا پرچم اُٹھاؤ
ساتھیو! ہمت دکھاؤ

بادۂ مقصود سے خالی ہے انساں کا ایاغ
ڈھونڈتا ہے ظلمتوں میں آبِ حیواں کا سراغ
بجھ گئے ہیں مشرق و مغرب میں عرفاں کے چراغ
جہل کی اندھیاریوں میں علم کے دیپک جلاؤ
ساتھیو! ہمت دکھاؤ

منتظر ہے اک نئی ترتیب کا آئینِ دہر
بستی بستی، قریہ قریہ، گاؤں گاؤں، شہر شہر
اُٹھ رہی ہے ہر جگہ تحریکِ اسلامی کی لہر
آؤ اور اِن منتشر لہروں کو اک طوفاں بناؤ
ساتھیو! ہمت دکھاؤ

[1] "چہرۂ زن" کے بجائے "روئے عصمت" بھی ہو سکتا ہے (مرتب)

سرد جو چنگاریاں تھیں شعلہ ساماں ہوگئیں
نیل کی بے مایہ موجیں ایک طوفاں ہوگئیں
آرزوئیں موت کی جینے کا ساماں ہوگئیں
ہاں وہی جیتے ہیں جنکے دل میں ہے مرنے کا چاؤ
ساتھیو! ہمت دکھاؤ

اسکی پیشانی کی عظمت اسکے چہرے کا جلال
مہرِ روشن کی طرح بے داغ سیرت کا جمال
آشکار اُس روح پرور گفتگو سے دل کا حال
غیر متزلزل[2] ارادوں میں چٹانوں کا جماؤ
ساتھیو! ہمت دکھاؤ

قافلوں کی آمد آمد کا وہ منظر یاد ہے
یاد ہے ہاں وہ فضائے روح پرور یاد ہے
واں کی ہر شیریں حکایت مجھ کو یکسر یاد ہے
ہم نے جب ڈالا تھا ساحل پر سمندر کے پڑاؤ
ساتھیو! ہمت دکھاؤ

بارھویں منزل میں داخل ہوچکا ہے کارواں
بڑھ رہے ہیں شوقِ منزل میں نئے پیر و جواں
پڑ رہے ہیں وقت کی راہوں میں قدموں کے نشاں
کفرِ حق کی گرمئ رفتار پر کھاتا ہے تاؤ
ساتھیو! ہمت دکھاؤ

پھر امیرِ کارواں کا وہ عظیم الشان خطاب
اے رفیقو حق نے تم پر کھول دی راہِ صواب
تھام لو ہاتھوں میں اپنے دامنِ اُم الکتاب
ماسوا سے توڑ کر رشتے خدا سے لو لگاؤ"[1]
ساتھیو! ہمت دکھاؤ

ہاں قدم آگے بڑھاؤ اے رفیقانِ سفر
صاف ہوتی جارہی ہے اب ہماری رہگزر
منزلِ مقصود کے آثار آتے ہیں نظر
عرصۂ سعی و عمل میں خفتہ جذبوں کو جگاؤ
ساتھیو! ہمت دکھاؤ

[1] امیر جماعت نے اجتماع کراچی کے موقعہ پر اپنے الوداعی خطاب میں تعلق باللہ کی خصوصی تلقین فرمائی تھی! [2] "تا" کی حرکت ضرورتِ شعری کے پیشِ نظر ساقط کردی گئی ہے!

راستے تم پر تصدّق منزلیں تم پر نثار
ہاں نہ تھک جائیں تمہاری ہمتوں کے راہوار
بحر و بر کی وسعتوں پر ہے تمہارا اختیار
مشکلاتِ راہ کو پاؤں کی ٹھوکر سے اُڑاؤ

ساتھیو! ہمت دکھاؤ

چھوڑ کر اندیشۂ سود و زیاں بڑھتے چلو
راہِ حق میں صورتِ سیلِ رواں بڑھتے چلو
والہانہ سوئے آوازِ اذاں بڑھتے چلو
بارگاہِ ایزدِ اکبر میں اپنے سر جھکاؤ

ساتھیو! ہمت دکھاؤ

کارِ دیں پر غلبۂ دُنیائے دُوں ہونے نہ دو
نوعِ انساں کی تمنّاؤں کا خوں ہونے نہ دو
امن و آزادی کا پرچم سرنگوں ہونے نہ دو
گردنِ انساں کو انساں کی غلامی سے چھڑاؤ

ساتھیو! ہمت دکھاؤ

وقت کا تم سے تقاضا ہے مرے دانشورو
اے سخن دانو، خطیبو، اے ادیبو، شاعرو
اک نئے ماحول کی تخلیق کا ساماں کرو
اِس زمیں کو نسلِ آدم کے لئے جنّت بناؤ

ساتھیو! ہمّت دکھاؤ

پھینک دو نارِ جہنّم جنّتِ شدّاد میں
زلزلے ڈالو جہانِ جبر و استبداد میں
بجلیاں لا کر گراؤ خرمنِ بیداد میں
اور ایوانِ ملوکیت کی بنیادیں ہلاؤ

ساتھیو! ہمت دکھاؤ

بزمِ عالم میں خوشی کے دَور کا آغاز ہو
اِک نئی جنّت نئے فردوس کا در باز ہو
نظمِ گیتی کا نیا آئیں، نیا انداز ہو
عدل کی بنیاد رکھو ظلم کی دیوار ڈھاؤ

ساتھیو! ہمت دکھاؤ

منزلیں حق و صداقت کی بہت دشوار ہیں | آرزوئے زندگی ہونیکو ہے حاصل تمہیں
ہاں یہ راہیں سخت ہیں یہ وادیاں پُرخار ہیں | دیکھتی ہے گود پھیلائے ہوئے منزل تمہیں
حوصلوں کی ہے ضرورت ہمتیں درکار ہیں | روکنے پائے نہ کوئی راہ کی مشکل تمہیں
رزم گاہِ خیر و شر میں جان کی بازی لگاؤ | سامنے رکھو نگاہیں اور قدم آگے بڑھاؤ

ساتھیو! ہمت دکھاؤ | ساتھیو! ہمت دکھاؤ

(بقیہ انسان مطلوب)
بہت ہی رنج کے ساتھ صرف ایک چیز اشارۃً عرض کی جاتی ہے۔ اقبال جو ہمیں میر و سلطان سے بے نیازی کا درس دے گیا ہے جب ہم اس کے ہاں بعض حکمرانوں — بلکہ ہندوستانی ریاستوں کے بعض معمولی راجاؤں کے قصیدے — اور اقبال کے فلسفۂ خودی کو مجروح کرنے والے قصیدے دیکھتے ہیں تو جی چاہتا ہے کہ کاش کہ ہم ان قصیدوں کو اس کی کتابوں سے کسطرح کو الگ کرسکتے!

یہ ہیں وہ اصل وجوہ جن کے تحت اقبال کا پیغام اب تک براہِ راست اپنے اثر سے کوئی ایک فرد بھی تعمیر نہیں کرسکا — مگر اس کے معنی یہ نہیں کہ اس کی کوششیں رائگاں جارہی ہیں۔ نہیں اس کی فکر نے اور اس کے جذبات نے ایک ایسی فضا مہیا کی ہے جس سے "دعوتِ اسلامی" کو فروغ پانے کا موقع حاصل ہوسکتا ہے۔ اور اقبال جو کام خود سرانجام نہیں دے سکا، شاید کسی دوسرے کے ذریعے مکمل ہوجائے — وہ خود بھی تو ایک دوسرے آنے والے کی امیدیں دل میں باندھے رخصت ہوا ہے:-

سر آمد روزگارے ایں فقیرے | دگر دانائے راز آید کہ ناید

اور:-

اگرچی آید آں دانائے رازے | بدہ اورا نوائے دلگدازے
ضمیر امتاں را می کند پاک | کلیمے یا حکیمے نے نوازے

بہر حال اقبال کا یہ کارنامہ کہ اس نے مغربی فلسفے کے خلاف اعلانِ جنگ کرنے کی پہلے پہل جرأت کی اور ہمیں اس محاذ پہ معرکہ آرائی کی دعوت دی، اور اسلام کو کھل کر اپنا دین کہنے کی اس دور میں مثال قائم کی، ایک ایسا کارنامہ ہے کہ جس کی بنا پہ ہم اس کے ممنونِ احسان ہیں اور قوم اور انسانیت کے لیئے اس کی یہ خدمت اتنی بڑی ہے کہ توقع ہے کہ اللہ تعالےٰ کے ہاں اس کی وہ کوتاہیاں جو اس کے مخصوص حالات میں واقع ہوئی ہیں نظر انداز کر دی جائیں۔

اقبال کا "انسانِ مطلوب"

(کچھ تشریح — کچھ تنقید)

نعیم صدیقی

دنیا کا کوئی فرد بھی نبی صلعم کے سوا ایسی عقیدت کا مستحق نہیں ہے۔ کہ اس کے ہر قول و فعل کو بے چون و چرا قبول کر لیا جائے اور اسے زندگی کے کسی معاملے میں سند کی طرح پیش کیا جائے۔ ایک "مسلم" کی حیثیت سے غیر نبی کو چاہے وہ کوئی ہو تنقید کی کسوٹی پر پرکھنا۔ اور کتاب و سنت کی چھلنی سے چھاننا ضروری ہے۔ اقبال جس کے سرچشمۂ فکر سے راقم الحروف نے بہت کچھ اخذ کیا ہے۔ اور جس کا احسان تا دمِ آخر تسلیم کرنا میرے لئے واجب ہے۔ اس پہلو سے بھی مظلوم ہے کہ اس کی قوم کی اکثریت اس کے پیغام اور اس کی دعوت سے بے خبر ہے۔ بلکہ بہت سے لوگ اس کو تحقیر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور رجعت پسندی کا خطاب دیتے ہیں۔ اور وہ اس پہلو سے بھی مظلوم ہے کہ جنہوں نے اس کے کلام میں اپنی پسند اور ذوق کے رجحانات کی کچھ جھلک دیکھ لی ہے یا اس سے کسی نہ کسی حد تک استفادہ کیا ہے۔ وہ اسے جذباتی عقیدتوں کا مرکز اور اپنے لئے "سند" بنا بیٹھے ہیں۔ اقبال کا اصل راز داں اور اس کا حقیقی قدرشناس وہ ہے۔ جو اس کی فکر میں سے اسلامی عناصر کو غیر اسلامی آمیزشوں سے (جن سے اقبال کی سی شخصیت کا، اقبال کے سے دور میں اور اقبال کے سے حالات میں بچ نکلنا ممکن ہی نہ تھا) پاک کر کے نکھارے اور اس کی قوم کو بھی اور ساری دنیا کو بھی ان سے متمتع ہونے میں سہولتیں پیدا کرے۔ دوسرے لفظوں میں حقیقی اقبال کو نمایاں کیا جائے۔ حقیقی اقبال اپنے کلام کے سمندر کی سطحی موجوں کے نیچے ایک خاموش طوفانِ انقلاب کی حیثیت میں موجود ہے۔ کچھ لوگ ہیں جو اس کے سمندر پر تیرنے والے خس و خاشاک، اس کی لہروں اور رووں، اور اس کے گردابوں اور بھنوروں سے کھیلتے رہتے ہیں —— حالانکہ اقبال یہ نہیں ہے۔ اقبال زیادہ گہرا ہے۔ بچارا خود کہتا ہے ؎

بحرم و از من کم آشوبی خطاست   آں کہ در قعرم فرود آید کجاست

یک جہاں بر ساحلِ من آرمید   از کراں غیر از رم موجے نہ دید

جو لوگ ساحل پر سے اقبال کے یم بیکراں کا جائزہ لیتے ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ مغرب کی آندھی سے جو موجیں اس کی سطح پر اُٹھ رہی ہیں اور جو خس و خاشاک اِدھر اُدھر سے اس پہ تیر رہے ہیں، یہی ہے حقیقی اقبال! لیکن اقبال ان کو تنبیہ کر رہا ہے کہ ساحل سے میرا جائزہ نہیں لیا جا سکتا۔ میرے اندر اتریئے اور گہرائیوں میں دیکھئے کہ میں کیا ہوں!

اقبال کی طرح جن لوگوں کا اصل فکری جوہر مومنانہ ہے ان کا فرض یہ ہے کہ وہ اقبال کے کلام کی گہرائیوں میں ڈوب کر اس کی اصل دعوت کو سامنے لائیں۔ اور اس دعوت کو دوسری آمیزشوں سے بالکل پاک کر دیں۔ اسی عزم کے ساتھ ان سطور میں ہم اقبال کے "انسانِ مطلوب" کا نقشہ پیش کر رہے ہیں۔

زمانۂ حاضر کی مادّی فکر نے اپنی کوکھ سے جس نمونۂ انسانیت کو جنم دیا ہے۔ اس پر ضربِ کلیم میں چند لفظوں میں اقبال نے اتنا جامع تبصرہ کر دیا ہے کہ اس کی حقیقت سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں رہتی۔ اس بچارے کا حال یہ ہے کہ :۔

عقل کو تابعِ فرمانِ نظر کر نہ سکا!

اس مصرع سے اگر پوری بات سمجھ میں نہ آئے تو یہ بھی پڑھ ڈالیئے :۔

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا — آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا

فلکیات اور طبیعات کے کونے کونے کی سیاحت تو دورِ حاضر کے انسان نے کر لی، مگر اپنے افکار کی دنیا کے حقائق کو بایں ہمہ علم النفس و علم المنطق و علم الاشیاء وہ اس حد تک نہیں پا سکا کہ کمالِ انسانیت کی طرف ٹھیک ٹھیک اقدام کر سکتا۔ افکارِ انسانی کی دنیا میں کشمکش در کشمکش کا نقشہ دکھائی دیتا ہے۔ اور ذہنی الجھنیں اور فکری ژولیدگیاں روز افزوں ہیں۔ فلسفہ کے ٹکڑے اس میں نئے جالے تن رہے ہیں۔ انسانی زندگی کی تعمیر کے لئے کوئی اطمینان بخش اور قطعی عقاید بہم نہیں پہنچ سکے۔ حکمت جس پر سارا دار و مدار ہے وہ کوئی صراطِ مستقیم نہیں دکھا سکی۔ بلکہ وہ اس سرے سے اُس سرے تک قدم قدم پر خم و پیچ پیدا کر رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دورِ حاضر کا انسان "فیصلہ نفع و ضرر" نہیں کر سکا۔ اب تک یہ طے نہیں ہوا کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے، نیکی کسے کہتے ہیں اور بدی کسے کہتے ہیں، خیر کس چیز کا نام ہے۔ اور شر کس کو کہتے ہیں، نفع کس ہاتھ ہے اور نقصان کس رُخ! اخلاقی اصولوں کو فائدے اور نقصان کا معیار بنانے کے بجائے فائدے اور نقصان کو اخلاق کا معیار بنایا گیا۔ مگر اس وادئ تفلسف میں ٹھوکریں کھاتے صدیاں گذر گئیں۔ اور آخری نقطۂ صداقت نہ ملا۔ نفع نقصان کس کا؟ افراد یا طبقوں کا، یا قوموں کا یا پوری انسانیت کا؟ نفع و نقصان کس نوعیت کا؟ خالص مادّی یا ذہنی یا اخلاقی؟ نفع و نقصان کی ترازو کیا ہو؟ خواہش یا جذبات یا عقل یا کچھ اور؟ ترازو مل جائے تو تولنے والا کون ہو؟ ایک ایک فرد، یا ان کے چند نمائندے یا پوری قوم، یا ساری انسانیت؟ ان سارے سوالوں کے بے شمار جواب موجود ہیں۔ مگر ہر جواب چند نئے سوال پیدا کر کے انسانی عقل کو اضطراب میں ڈال دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ :۔

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا — زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

اتنی سائنس، اتنی ایجادات، اتنے علوم، اتنے ذرائع و وسائل اور ان سب کے باوجود زندگی پر بھوک اور ننگ، لوٹ کھسوٹ، فتنہ و فساد، مکر و سازش، خون ریزی اور تباہی کی تاریک رات مسلط ہے ___ مشرق میں بھی، مغرب میں بھی، جمہوریت کے سائے میں بھی اور اشتراکیت کی جنت میں بھی ___ اور اس تاریک رات کو سحر کرنے کی تدبیر دورِ حاضر کا انسان معلوم نہ کر سکا!

دورِ حاضر کے "انسان" پر کتنا گہرا اور کتنا جامع اور کتنا مختصر تبصرہ ہے!

* * *

اقبال مادّہ پرست تہذیب کے پیدا کردہ انسان کے مقابلے میں جس انسان کو پیش کرتا ہے۔ اب آئیے۔ اس کا جائزہ لیجئے۔ یوں تو اقبال کے انسانِ مطلوب کے متعلق ہم جگہ جگہ سے اشارات تلاش کر سکتے ہیں۔ لیکن خوش قسمتی سے

ایک تمام پرکئی صفحے اسی مدعا کے لئے مخصوص ملتے ہیں۔ جاوید نامے کے خاتمے پر "خطاب بہ جاوید" کے عنوان سے اقبال نے درحقیقت اپنے انسان مطلوب کا نقشہ پیش کیا ہے جس کے سانچے میں وہ اپنے نورِ نظر کو ڈھالنا چاہتا تھا۔ اس خطاب کو ذرا عام کر کے دیکھئے اور اقبال نے بھی اسے درحقیقت عام رکھا ہے۔

فرمایا ہے:۔

مادرت درسِ نخستیں با تو داد — غنچۂ تو از نسیم او کشاد

دولتِ جاوید از و اندوختی — از لبِ او "لا الٰہ" آموختی!

بات بڑی واضح ہے کہ اقبال کا انسانِ مطلوب پیدا کرنے کے لئے سب سے پہلے ایسی ماں کی گود مطلوب ہے جو اپنی لوریوں میں بچے کو جو پہلا سبق گھول کر پلائے وہ لا الٰہ کا سبق ہو۔ اس کام کے لئے ناچنے اور تھرکنے والی، بازاروں اور پارکوں میں گھومنے والی، پارٹیوں اور ضیافتوں میں تفریحِ نظر بننے والی اور پریڈوں اور سلامیوں کے لئے کیمروں کے سامنے آنے والی اور ڈرامے دکھلانے اور مینا بازار لگانے والی ماں کی ناپاک گود اور اس کا ناپاک دودھ اور اس کی ناپاک لوریاں بالکل بے کار ہیں۔ ایک پاکباز ماں کی پاکیزہ گود کا یہ درسِ نخستیں — یعنی لا الٰہ — وہ ننھا سا بیج ہے جس کو ایک گوشت کا لوتھڑا جب اپنی روح کی گہرائیوں میں جذب کر لیتا ہے تو اس کے اندر سے وہ انسان نمودار ہوتا ہے جس کی تخلیق کے لئے فضا کو سازگار کرنے کی خاطر اقبال نے عمر کھپائی ہے:۔

لیکن بہت سی مائیں لا الٰہ کی لوریاں گاتی رہتی ہیں۔ اور لا الٰہ کا انسان پیدا نہیں ہوتا۔ کیوں؟ اس لئے کہ لا الٰہ کے ساتھ سوز و ساز نہیں ہوتا۔ چنانچہ اقبال کی تلقین یہ ہے کہ "لا الٰہ" کے ساتھ ذوقِ نگاہ کی بھی ضرورت ہے۔ اور لا الٰہ سیکھنے کے ساتھ "سوختن در لا الٰہ" کو بھی سیکھنا پڑتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ چیز اگر اور کہیں سے نہ ملے تو اسے مجھ سے سیکھو!

لا الٰہ گوئی! بگو از روئے جاں!

تم نے لا الٰہ پڑھنا سیکھ لیا؟ — مگر اسے ہونٹوں سے پڑھنے کے بجائے اپنی روح کی زبان سے پڑھو! پھر وہ کہتا ہے کہ "لا الٰہ" ایک ایسی زندہ حقیقت ہے جس پر ساری کائنات کی بنیاد رکھی گئی ہے۔

مہر و ماہ گردد ز سوزِ لا الٰہ — دیدہ ام ایں سوز را در کوہ و کہ

واضح رہے کہ اقبال یہاں صوفیانہ وعظ گوئی اور نکتہ آرائی نہیں کر رہا ہے۔ وہ سنجیدگی سے اپنے ایمان کو پیش کر رہا ہے۔ اس کا مدعا یہ ہے کہ پورا نظامِ شمسی اور زمین کا ایک ایک پہاڑ اور ایک ایک تنکا "لا الٰہ" کی حقیقت پر قائم ہے۔ ہر چیز یہ شہادت دے رہی ہے کہ سارے نظام کے پیچھے ایک ہی خالق، ایک ہی آقا، ایک ہی قانون ساز اور ایک ہی مقتدر کی فرماں روائی چل رہی ہے۔ اور اس کارخانے میں نہ "شرک" کی کوئی گنجائش ہے نہ دہریت "الحاد" کی!

پھر وہ بات کو اور زیادہ کھولتا ہے:۔

ایں دو حرفِ لا الٰہ گفتار نیست — لا الٰہ جز تیغِ بے زنہار نیست

زیستن با سوزِ او قہاری است — لا الٰہ ضرب است و ضربِ کاری است

جی ہاں! یہ محض لفاظی نہیں ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی بات نہیں ہے، یہ قولِ ثقیل ہے، یہ ایک تلوار ہے کہ جو حق اللہ

باطل کو، خدا پرستی اور خدا ناشناسی کو، اسلام اور جاہلیت کو، توحید شرک و الحاد کو باہم منقطع کر دیتی ہے۔ آپ نے مردِ مسلماں
سے جونہی لاالہ کہا تو غیر اللہ سے ــــ جو آج چاروں طرف سے آپ کو محیط ہے ــــ آپ کی جنگ ٹھن گئی۔ آپ نے
ایک اللہ سے رشتہ جوڑا تو لاکھوں طاغوتوں سے کشمکش کی بسم اللہ ہوگئی۔ ایسے "لاالہ" کی گرما گرمیوں کے ساتھ جینا
"قہاری" کے مقام سے ورے ورے کیا ممکن بھی ہے۔ اس لاالہ کی ضرب ــــ کاری ضرب ــــ کتنی ہی مورتوں
کتنی ہی مجتوں اور دلچسپیوں، کتنے ہی منافعوں کی گردنیں کاٹ کے رکھ دیتی ہے۔ یہ کوئی کھیل تو ہے نہیں!
اقبال کا "انسان مطلوب" جب "لاالہ" کہتا ہے تو وہ محض "وظیفہ" نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک "جہاد" ہوتا ہے۔ وہ
ان لاالہ خوانوں کو جو اپنی پوری عملی زندگی سے اپنے قول کی خود تردید کرتے رہتے ہیں یوں نشتر چھوتا ہے :-

مومن و پیشِ کساں بستن نطاق؟ مومن و غداری و فقر و نفاق؟
با پشیزے دین و ملت را فروخت ہم متاعِ خانہ و ہم خانہ سوخت

وہ سوال کرتا ہے کہ کیا ایک مومن سے جس نے لاالہ پر زندگی استوار کرنے کا عزم کر لیا ہے۔ یہ توقع کی جانی چاہیے
کہ وہ دوسروں کے سامنے کمر خدمت باندھ کر کھڑا ہو اور وہ نوکری اور عہدے اور انعام کے لئے غداریاں کرے۔ اور
نفاق کا مظاہرہ کرے؟ کیا اسے ایسا ہی ہونا چاہیے کہ وہ ایک حقیر سی تنخواہ پر دین و ملت کے مقاصد و مفاد کو بیچ ڈالے؟ ــــ
ہاں مگر اس آسمان کے نیچے ایسا بھی ہوا ہے اور ہو رہا ہے!
اس کی وجہ؟ ــــ

لاالہ اندر نمازش بود و نیست نازہا اندر نیازش بود و نیست

ہاں وجہ یہ کہ اس کی عبادت میں روحِ جاں سے نکلے ہوئے " لاالہ " کی جو گرما گرمیاں ہوتی تھیں۔ وہ نہیں رہیں۔ اور
خدا کے سامنے سجدہ نیاز کر کے بندوں کے مقابلے میں وہ جو بے نیازی اخذ کیا کرتا تھا۔ وہ اس سے محروم ہو چکا ہے۔ اب صوم و
صلوٰۃ کچھ ہیں بھی تو ان میں نور نہیں ہے۔ چنانچہ اس کی گردش اس حد کو جا پہنچی ہے کہ :-

آنکہ بود اللہ اورا ساز و برگ فتنۂ او حُبِّ مال و ترسِ مرگ

کل تک جس کے لئے اللہ ہر ضرورت میں کافی تھا، آج وہ اس سے کٹ کر "حبِ مال" اور "ترسِ مرگ" کے فتنے میں
مبتلا ہے۔ اس کی ساری تاریخ کے دو ہی محرکات ہیں، ایک یہ کہ مال کیسے میٹا جائے۔ اور دوسرے یہ کہ موت سے کیسے بچا جائے؟
ــــ کتنی صحیح تصویر ہے۔ اسلام نے کتنی محنت سے انسانیت کو ان دو بلاؤں سے بچا نکالا تھا۔ مگر اس کے اپنے سپاہی ان
کا شکار ہو گئے۔ آج مسلمان کی تصویر یہ ہے کہ :-

دین او اندر کتاب و اُو بگور

ضمناً اس موقع پر علامہ مرحوم نے بہاء اللہ (ایرانی) اور مرزا غلام احمد (قادیانی) کی نبوت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔
یعنی جب لاالہ سے یہ دوری پیدا ہوئی اور حبِ مال و ترسِ مرگ کا فتنہ مسلط ہو گیا۔ تو اس فضا میں ان دو مدعیوں کو پنپنے
کا موقع ملا کہ جن میں سے ایک نے مسلمان کو حج سے اور دوسرے نے جہاد سے آزاد کر دیا۔ آہ کہ

از خودی مردِ مسلماں در گذشت اے خضر دستے کہ آب از سر گذشت

پھر اقبال اس لب گورِ مسلمانی کا ماتم کرتے ہوئے سوچتا ہے کہ وہ سجدہ جس سے زمین کانپ جاتی تھی اور جس سے

گردشِ ماہ و مہر تک ہم آہنگ ہوتی تھی، وہ کہ جس کے نشان کو قبول کرنے کے بعد پتھر بھی فربۂ سوز سے دھواں بن کر ہوا میں تحلیل ہو جانا چاہئے ـــــ وہ کیا ہوا؟ ـــــ "آن شکوہِ ربیّ الاعلیٰ کجاست؟" اور پھر یہ سوال اٹھتا ہے کہ کوتاہی اس سجدے میں تھی یا خطا ہم میں ہے؟ کس کی وجہ سے حالت یہ ہے کہ :۔

صاحبِ قرآن و بے ذوقِ طلب؟ العجب! ثم العجب! ثم العجب!!

یہاں تک اقبال اپنے انسانِ مطلوب کے اس "نقشِ ماضی" کو دیکھتا ہے جو کمال کی بڑی او نچائیوں پر جاکر پھر گرا ہے تو انتہائی پستیوں میں جا گرا ہے۔ اور اب پھر وہ اُس ہیولیٰ سے مخاطب ہوتا ہے جسے وہ اسی نقشِ ماضی کے نقشے پر اٹھانے کے درپے ہے۔

گر خدا سازد ترا صاحب نظر   روزگارے را کہ می آید نگر
عقلہا بے باک و دلہا بے گداز   چشمہا بے شرم و غرق اندر مجاز
علم و فن و دین و سیاست عقل و دل   زوج زوج اندر طوافِ آب و گل

وہ اپنے ہیولیٰ کو اس خطرناک ماحول سے آگاہ کرتا ہے جس میں اسے پروان چڑھنا ہے۔ اس ماحول میں عقلیں جتنی بیباک ہیں، دل اتنے ہی بے گداز ہو گئے ہیں۔ آنکھیں شرم کے نور سے خالی اور جلوہ زارِ مجاز سے لذت اندوز ہونے میں محو ہیں۔ اس ماحول میں علوم اور آرٹ، دین اور سیاست، عقل اور جذبات سب کے سب تن پروری اور مادی مفاد کے گرد گھوم رہے ہیں۔ پھر وہ خاص طور پہ ایشیائی ماحول کا ذکر کرتا ہے کہ یہ سرزمین جہاں سے ہمیشہ دین و ہدایت کے آفتاب ابھرتے رہے ہیں۔ آج اپنی حقیقت سے نا آشنا اور یورپ پہ پوری مرعوبیت کے ساتھ فدا ہے۔ اس کا قلب "وارداتِ نو بنو" سے محروم اور ایجادی فکر سے خالی ہے۔ یہ "ساکن و یخ بستہ" اور "بے ذوقِ سیر" خطہ ایک طرف بادشاہوں اور ملاؤں کا شکار ہو چکا ہے۔ اور دوسری طرف اس خطے میں عقل اور مذہب اور عزت سب کا سب فرنگی آقاؤں کی مٹھی میں ہے۔

یہ ماحول ہے جس میں اقبال اپنے انسانِ مطلوب کو برپا کرنے والا تھا! ـــــ اور اس ماحول کو اس نے "دگرگوں" کرنے کے لئے اپنے سینے میں اپنے دل کا مسلسل خون کیا ہے!

پھر وہ اپنے ہیولیٰ کو بتایا ہے کہ اپنے دورِ تہذیب کو میں نے دو طریقوں سے مخاطب کیا ہے میں نے کچھ باتیں مغربی طرز کے حرفِ پیچا پیچ کی صورت میں کی ہیں (تشکیل جدید الہیاتِ اسلامیہ) کچھ حرفِ نیش ار کی صورت میں! اُدھر جو ہر فکر ہے اور ادھر جوہرِ ذکر! ایک سے عقلوں کو متاثر کرنا مطلوب ہے۔ دوسری سے دلوں کو!

اے ترا بادا! وارثِ این فکر و ذکر!

اقبال کی نگاہ ہمیشہ اپنے نوجوانوں پر رہی ہے۔ کیونکہ اس کا انسانِ مطلوب اپنے ہیولیٰ کے لئے نوجوانوں ہی سے چیک لے سکتا ہے۔ مگر نوجوانوں کا حال کیا تھا؟

نوجواناں تشنہ لب، خالی ایاغ   شستہ رو، تاریک جاں، روشن دماغ
کم نگاہ و بے یقین و نا امید   چشمِ شاں اندر جہاں چیزے ندید
ناکساں منکر ز خود مومن بہ غیر   خشت بند از خاکِ شاں معمارِ دیر

پیاسے بھی ہیں، اور پیالے بھی خالی ہیں۔ چہرے خوب ہرا بھرے۔ مگر ان چہروں کے پیچھے روحیں بالکل تاریک۔ روحیں تاریک مگر بظاہر اپنی گفتگوؤں میں بڑے روشن دماغ! حقیقتوں کو سمجھنے میں کمزور، اعتماد سے محروم، کسی اصولِ حق پر جم کر کام کرنے کے بجائے نتائج کے بارے میں مایوسانہ ذہنیت، اپنے ہاں کے ہر اصول کے بارے میں انکار اور شک اور اغیار کی تہذیب کے ہر جزو پر ایمان! ـــــ نتیجہ یہ کہ ان کی مٹی سے معمار دیر اشیں بنا رہا ہے۔ لیکن یہ مٹی تعمیرِ حرم کے کام آنے کی نہیں!

نوجوان یوں بھی تہذیب مغرب کے عالمگیر غلبہ سے مسحور تھے ہی، لیکن "نظامِ تعلیم" نے بگاڑ کی تکمیل کر دی "مکتب" یعنی نظامِ تعلیم (جو اب تک جوں کا توں چل رہا ہے) کا کارنامہ یہ ہے کہ :۔

نورِ فطرت را ز جانہا پاک شست ــــ یک گلِ رعنا ز شاخِ او نہ رست

فطرت اپنی طرف سے جو ابتدائی نور دے کر انسان کو بھیجتی ہے۔ اسے مزید روشن کرنے کے بجائے نظامِ تعلیم نے ہمارے نوجوانوں کے اندر سے بالکل دھو ڈالا ۔ پھر کیسے یہ ممکن تھا کہ اس نظامِ تعلیم کے چمن میں ایک "گلِ رعنا" بھی پیدا ہو سکتا ہے ـــــ وہی! اقبال کا انسانِ مطلوب!

وہاں تو بچۂ شاہیں کو بطخ کے آداب و روایات سکھانے کی مہم جاری ہے!

اس نظامِ تعلیم کے مقاصد سے آگاہ کرنے کے بعد اقبال اپنے انسانِ مطلوب کے ہیولیٰ سے کہتا ہے کہ :۔

صد کتاب آموزی از اہلِ ہنر ــــ خوشتر آں درسے کہ گیری از نظر

یعنی مختلف علوم کے ماہر پروفیسروں سے سینکڑوں کتابیں پڑھ ڈالنے سے زیادہ قیمتی وہ ایک سبق ہے کہ جو "اہلِ نظر" سے لیا جائے۔ صوفیوں والے اہلِ نظر نہیں ـــــ وہ اہلِ نظر جو زندگی کے اصل حقائق سے براہِ راست دلچسپی رکھتے ہوں، جن کی فکر بینا ہو، جن کو خیر و شر کی تمیز ہو، جن کے سینے میں دردمند دل موجود ہو۔ ان اہلِ نظر کا درس کیا ہوتا ہے؟ عملی تربیت!!

پھر تاکید یہ ہے کہ :۔

کم خور و کم خواب و کم گفتار باش ــــ گرد خود گردندہ چوں پرکار باش

یعنی اقبال اپنے انسانِ مطلوب کو نہ تو خور و خواب کا غلام بننے دینا چاہتا ہے اور نہ بالتوئی! خواہشات کی غلامی بھی جوہرِ آدمیت کو تباہ کر دیتی ہے۔ اور زبان کو زیادہ حرکت میں رکھنا بھی اس کے وقار اور سنجیدگی کے پہلو کو زنگ خوردہ کرتا ہے۔ آدمی کی توجہات کا مرکز روٹی اور بستر نہیں اور نہ یاوہ گوئی کی مجالس، بلکہ اس کا اصل مرکزِ توجہ اس کی اپنی ذات اس کی اپنی روح، اس کی اپنی خودی، اس کی اپنی نفسیات اور اس کی اپنی سیرت ہے۔ اقبال کے نزدیک خدا کے انکار سے آدمی جتنا کافر ہوتا ہے، اپنے انکار سے اُس سے کچھ زیادہ ہی کافر ہو جاتا ہے۔ اپنے انکار کے معنی دراصل اپنے فرائض، اپنی ذمہ داریوں اور اپنے عہدِ الٰہی اور خلیفۂ الٰہی ہونے کے احساس کا انکار ہے۔ اس کو آپ انکارِ خودی کے الفاظ سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ اقبال نہیں چاہتا کہ اس کا انسانِ مطلوب خدا اور دین اور انسانیت کے مطالبات کے جواب میں کہے کہ "میں تو کچھ بھی نہیں ہوں" "میں تو عدمِ محض ہوں" "میرا تو وجود ہی نہیں ہے" "میرے ارادوں کی کیا حقیقت" "اختیار میں ہے کیا؟" ـــــ وہ اس طرح کی فراریت کا سخت مخالف ہے۔ یہ خدا کو خدا مان کر پھر مقامِ طاعت

سے بھاگنے کی ایک چال ہے، اسی لئے ہر آدمی کو کافر کے مقابلے میں "الکفر" بنا دیتی ہے۔
اور آگے چلئے تو وہ خد و خال بڑے تسلسل سے سامنے آتے ہیں۔ جو اقبال نے اپنے "انسان مطلوب" کے لئے پسند کئے ہیں

شیوۂ اخلاص را محکم بگیر   پاک شو از خوفِ سلطان و امیر

حق کی راہ اور اصول کی راہ ـــــ یا اسلام کی راہ ـــــ اخلاص کی راہ ہے، اس راہ پر وہی بڑھ سکتے ہیں جو سلطان و امیر کے خوف کو لوح کر الگ کر دیں۔ اور بے باکی سے سچائی کا علم اٹھا سکیں۔

عدل در قہر و رضا از کف مدہ   قصد در فقر و غنا از کف مدہ

یہاں جگہ جگہ معلوم ہوتا ہے کہ ارشاداتِ نبوت سے استفادہ کیا گیا ہے، کیونکہ الفاظ و اصطلاحات غمازی کر رہے ہیں۔ "عدل در قہر و رضا" اور "قصد در فقر و غنا" تو جبھی ممکن ہے کہ:

حکم دشوار است؟ تاویلے مجو   جز بہ قلبِ خویش قندیلے مجو!

سبحان اللہ! دلوں کا چور کس خوبی سے پکڑا ہے۔ دین میں مفسدین کی نقب زنی کی ساری تاریخ سامنے آجاتی ہو جہاں کتاب و سنت میں کوئی حکم ذرا مشکل نظر آیا، کوئی شے خواہشات کے خلاف محسوس ہوئی۔ کوئی پابندی گراں گذری تو اس کی من مانی تاویل کر لی ـــــ پھر جب ایک تاویل قرآن کے مزاج کے خلاف ہونے کی وجہ سے نظامِ دین میں فٹ بیٹھتی نظر نہ آئی تو ایک نیا فلسفہ یا ایک پورا نظامِ تاویل بنا ڈالا جس کے سانچے میں کتاب و سنت کے سارے دفاتر ڈھال لئے۔ اسی فتنے نے خوارج کو برپا کیا، اسی سے شیعیت پیدا ہوئی۔ یہی باطنیت کا سبب ظہور بنی، اسی نے اکبر کا دینِ الٰہی گھڑ ڈالا، اسی نے سرسید کا اندازِ فکر مہیا کیا، اسی نے قادیانیت کو پروان چڑھایا، اور آج یہی فتنہ ہے جو ہماری آنکھوں کے سامنے "انکارِ حدیث" کی شکل اختیار کر رہا ہے۔ اب تاویل کے چور دروازے کھلے کھلے شاہ دروں میں بدل رہے ہیں۔ ایک ہی تاویل ایسی نکل آئی ہے کہ چھوٹی چھوٹی تاویلوں کی ضرورت ہی نہ رہی۔ بڑی بے تکلفی سے اب آپ اسلام کی شہر پناہ میں خالص فرنگی فلسفۂ جمہوریت کو بھی اور مارکس کے فلسفہ معشیت کو بھی داخل کر سکتے ہیں، بلکہ تختِ اقتدار پر بٹھا سکتے ہیں۔ اور اقبال کی روح چیختی ہے کہ

حکم دشوار است! تاویلے مجو!

تاویل نہ کر تو کیا کر؟ ـــــ اس کا جواب بھی نبی صلعم کے فرمان سے دیا کہ "استفت قلبك" اپنے ضمیر کے مفتی سے فتویٰ پوچھ! اپنے قلب کی قندیل سے راستہ دیکھ، اسے اوٹ میں۔ کہ کر ٹامک ٹوئیے مارنے سے فائدہ! اقبال نے یہ چاہا ہے کہ اس کا انسانِ مطلوب احکامِ الٰہی کی ذمہ داریوں کا بوجھ مردانہ وار اٹھائے اور کرائے کے قلیوں کی طرح جعل سازیاں نہ کرے مگر احکامِ الٰہی کی ذمہ داریوں کے لئے حفظِ جان و تن ضروری ہے اور حفظِ جان و تن کی خبر اُلٹا بتا رہی ہیں:

حفظِ جاں با ذکر و فکرِ بے حساب   حفظِ تن با ضبطِ نفس اندر شباب

روحوں اور دلوں اور دماغوں کی صحت و بقا کے لئے "ذکر" اور "فکر" کی ضرورت ہے! ذکر اس لئے کہ خدا اور اس کے حقوق و مطالبات نگاہوں کے سامنے رہیں۔ اور خیالات کی ہمہ وقت چلتی ہوئی چکی میں شیطان کہیں اپنا دانہ نہ ڈال جائے۔ فکر اس لئے کہ اپنے ماحول کو سمجھا جائے، اس میں حق کے فروغ کے لئے بہترین طریق کار سوچا جائے۔ اور باطل کو شکست دینے کے لئے موزوں تدابیر ڈھونڈ نکالی جائیں۔ زندگی کے معاملات کو خدا کی رضا کے

مطابق ڈھالنے اور اس کے احکام کو لمحہ بہ لمحہ کے مسائل پر منطبق کرنے کا سامان کیا جائے۔ یوں ہوتا ہے "حفظِ جاں" اور "تحفظِ تن"!
— سو اس کا ایک بڑا اصول ہے "ضبطِ نفس اندر شباب"!

"شباب" ایک آگ! — جسے اگر قابو میں نہ رکھا جائے تو وہ اس کا کام صرف "پھونک ڈالنا" ہے، اور قابو میں رکھا جائے۔ تو یہ آگ زندگی کی رگوں میں خون بن کر دوڑتی ہے۔ ہاں ہاں شباب، ایک طوفان! جسے اگر بے مقصد بہنے کا موقع مل جائے تو بڑی تباہی ہے۔، اور اگر اسے اخلاقی رود گاہوں میں بہنا سکھا دیا جائے۔ تو یہ انسانیت کے کھیتوں کو سیراب بھی کرتا ہے۔ اور تمدنی اداروں کی کلیں بھی چلاتا ہے۔! — لوگ جوانیاں گھٹیا مقاصد میں لٹا کر اپنے خالی کئے ہوئے خزانہ ہائے قوت کے ساتھ لبا اوقات اونچے مقاصد کے لئے کام کرنے کو پلٹتے ہیں۔ مگر اونچے مقاصد کے لئے بڑھاپے کچھ کر نہیں سکتے! — چنانچہ نبی صلعم کے ذریعے آخرت میں ہونے والے جو اہم سوال ہمیں معلوم ہوئے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ "اپنی جوانی کس مصرف میں کھپا کے آئے ہو" — کتنی بڑی چیز ہے۔ ضبطِ نفس اندر شباب! مغرب نے جو درس دیا ہے وہ تو ہے "ضبطِ تولید اندر شباب"۔ مگر اقبال کا سبق ہے ضبطِ نفس اندر شباب!

حفظِ جان و تن علامہ اقبال کے "انسانِ مطلوب" کے لئے بایں وجہ اشد ضروری ہے کہ:۔

حاکمی در عالمِ بالا و پست — جز بہ حفظِ جان و تن نآید بدست

حفظِ جان و تن جسے حاصل نہیں۔ وہ نہ اس دنیا میں کارفرما ہو سکتا ہے، نہ عالمِ بالا میں اس کے لئے مقامِ سروری ہے۔ یہاں بھی غلامی، وہاں بھی غلامی!

اور پھر محدود مقاصد کا آشیانہ بنا کے اس میں بیٹھ رہنا اقبال کے انسانِ مطلوب کا کام نہیں، وہ تو ارتقاء کا سفر کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ اور فرض ادا کرنے کی لذت ہی اس کا اصل مقصود ہے۔ اسے ہدایت یہ ہے کہ:۔

گر نگہ بر آشیاں داری مپر

آشیاں سے زیادہ دلچسپی ہے تو پھر سرے سے پرواز ہی نہ کر۔ رہا رزق تو وہ ہر کسی کو ملتا ہے۔ زاغ و کرگس جیسے آشیاں پرستوں کو مرگھٹ میں سے، اور بازوں کو چاند سورج کی فضاؤں میں سے! ذوقِ پرواز کو رزق کے تابع کرنا بڑی پستیٔ نگاہ ہے۔

پھر اقبال اپنے ہیولے کو "سرِ دیں" کھول کر بتاتا ہے:۔

سرِ دیں صدقِ مقال، اکلِ حلال — خلوت و جلوت تماشائے جمال
در رہِ دیں سخت چوں الماس زی — دل بحق بر بند و بے وسواس زی

یعنی دینداری کا سارا دار و مدار "صدقِ مقال" اور "اکلِ حلال" پر ہے۔ بول چال میں راستبازی اور کمانے میں حلال کا اہتمام! وہ اصول "زبان" کے لئے۔ اور یہ اصول "پیٹ" کے لئے! — لیکن ان اصولوں پر چل وہی سکتا ہے۔ جو خلوت اور جلوت دونوں حالتوں میں "تماشائے جمال" کی استعداد پیدا کرے۔ یعنی خدا کو حاضر و ناظر سمجھے اور محسوس کرے کہ اس کے قول و فعل کا ریکارڈ محفوظ کیا جا رہا ہے۔ اس "تماشائے جمال" کی حقیقت کو واضح کرنے کے لئے مظفر پسر سلطان محمود جو شاہانِ گجرات میں سے تھا کے تقویٰ کی ایک مثال پیش کی ہے۔ کہ اس کے ایک محبوب گھوڑے کا علاج معالج نے شراب سے کیا۔ اور وہ تندرست ہو گیا۔ تو اس کے بعد سے مظفر نے اس گھوڑے کو اپنی سواری کے لئے کبھی پسند نہ کیا

یہ جذبہ انگیز واقعہ سامنے رکھ کر اقبال اپنے انسانِ مطلوب سے کس انداز پرسوز سے کہتا ہے کہ :۔

اے ترا بخشد خدا قلب و جگر — طاعتِ مردِ مسلمانے نگر!

ایسی ہوتی ہے طاعتِ مردِ مسلمان!

بات آگے چلتی ہے..... دین کی انتہا اگر عشق ہے تو اس کا قدم اول "ادب" ہے۔ حفظِ مراتب، پاسِ خورد و کلاں، امتیازِ خویش و غیر، شعورِ حقوق، احترام اور شفقت اور مساویانہ بے تکلفی کے مواقع کی صحیح تقسیم و تفریق! اقبال اس معاملے میں اتنا حساس ہے کہ :۔

نوجوانے را چو بینم بے ادب — روزِ من تاریک مے گردد چو شب

تاب و تب در سینہ افزاید مرا — یادِ عہدِ مصطفیٰ آید مرا

کیونکہ عہدِ مصطفیٰ میں مسلم سوسائٹی میں حفظِ مراتب کا وہ معیار قائم ہوا تھا جس کی نظیر پھر پیدا نہ ہو سکی۔ اقبال بہر حال جس انسان کی تعمیر کا سامان کرتا رہا ہے اسے وہ "بے ادب، بے رنگ و بو، بے آبروئے دستِ" کا نمونہ نہیں دیکھنا چاہتا۔

وہ یہ بھی تلقین کرتا ہے کہ :۔

سترِ زن یا زوج یا خاکِ لحد — سترِ مرداں حفظِ خویش از یارِ بد

عورت کی آبرو کی حفاظت زندگی میں شوہر کے ذریعے ہے اور موت کے بعد قبر کی مٹی کے ذریعے..... لیکن مردوں کو اپنی آبرو بچانے کے لیے "صحبتِ بد" سے بچنا ضروری ہے۔ "صحبتِ بد" چوروں اور ڈاکوؤں میں بیٹھنا ہی نہیں۔ آجکل "صحبتِ بد" بھی ترقی کر گئی ہے..... اس کے مواقع اب ریستورانوں، کلبوں، سینماؤں اور کافی ہاؤسوں، آرٹ سوسائٹیوں، مشاعروں اور ادبی محفلوں میں پائے جاتے ہیں نہ کہ چانڈو خانوں میں!..... اقبال اپنے انسانِ مطلوب کو اس خطرے سے بچانا چاہتا ہے۔

اس کے انسانِ مطلوب کو بڑا باوقار ہونا چاہئے۔ وہ کبھی اپنے لب پر حرفِ بد نہ لائے، گالیاں نہ بکے، گندی زبان نہ استعمال کرے، چاہے اُسے کسی سے کتنا ہی اختلاف ہو۔ مومن اور کافر سبھی خدا کی مخلوق ہیں اور احترامِ آدمیت مسلم کا بنیادی اخلاق ہے۔ بندۂ عشق تو خدا سے عالی ظرفی سیکھتا ہے اور کافر و مومن سب کے لئے یکساں شفیق ہو جاتا ہے۔ اس موقع پر "کفر و دین" اور "پہنائے دل" کے الفاظ سے غلط فہمی نہ ہونی چاہئے، یہاں کفر و دین کا استعمال بالکل کافر و مومن کے معنی میں ہوا ہے۔ "پہنائے دل" میں جگہ دینے کا مدعا بھی وہی ہے جو شفقت کرنے کا ہے۔

اقبال نے خود امارت کے امکانات سامنے رکھتے ہوئے فقر کی زندگی گذاری ہے، چنانچہ وہ اپنے انسانِ مطلوب کو بھی ہدایت کرتا ہے کہ چاہے تو علاقے کا رئیسِ اعظم ہی کیوں نہ ہو جائے فقیرانہ مسلک کو کبھی نہ چھوڑے۔ دنیا میں "دو وقت" کے سوا اور کسی سامان کے لئے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، اور سب کچھ مل جاتا ہے۔ ساتھ ساتھ یہ تاکید ہے کہ:۔

نعمت از حق خواہ واز سلطاں مخواہ

جو ضرورت بھی ہو اس کو براہِ راست اپنے رازق سے طلب کر، اقتدار سے کبھی نہ مانگ۔ اقتدار رزق دیتا ہے تو اس کی عادت ہے کہ بڑی بھاری قیمت بھی وصول کرتا ہے..... ایمان و ضمیر کی قیمت! جینے کے لئے آدمی کو رزق بہرحال ملتا ہے، البتہ

کثرتِ رزق کی ہوس اسے کنوئیں جھنکواتی ہے۔ لیکن

اے بسا مردِ حق اندیش و بصیر — می شود از کثرتِ نعمت ضریر
کثرتِ نعمت گداز از دل برد — ناز می آرد، نیاز از دل برد

اکثر دیکھا جاتا ہے کہ خدا پرست اور صاحبِ نظر لوگ کثرتِ نعمت کے مقام پہ پہنچ کر اندھے ہو جاتے ہیں۔ اقبال اپنے عمر بھر کے مشاہدوں کا نچوڑ شہادت کے طور پہ پیش کرتا ہے کہ

سالہا اندر جہاں گردیدہ ام — نم بچشمِ منعماں کم دیدہ ام

اقبال کہتا ہے کہ میں تو اس پہ قربان جاؤں جو خدا پرستی کو برقرار رکھنے کے لئے درویشانہ انداز سے زندگی گزارے اور میں اس پر افسوس کرتا ہوں جو دولت کے لئے خدا سے بیگانہ ہو کر جئے!

اقبال کو فکر ہے کہ اس کے انسانِ مطلوب کا ہیولیٰ جب اپنے گرد و پیش مسلمان نامی ایک قوم کو دیکھے گا جو اسلام کی اجارہ دار بھی بنی بیٹھی ہے اور پھر اسلام سے آزاد بھی ہے۔ جو اسلام سے اپنے لئے حکم حاصل کرنے کے بجائے خود اسلام کو اپنے پیچھے چلانا چاہتی ہے۔ تو اس کا ذہن الجھے گا۔ وہ جب اپنے "سوادِ اعظم" کا حال دیکھے گا تو ہو سکتا ہے کہ اسی کو معیار سمجھ بیٹھے وہ جب اپنی قوم سے نمونہ حاصل کرنا چاہے گا تو ہو سکتا ہے کہ وہ بالکل مایوس ہو کر بیٹھ جائے۔ اس لئے پہلے ہی انتباہ کر دیا کہ۔

درمسلماناں مجو آں ذوق و شوق — آں یقیں، آں رنگ و بو، آں ذوق و شوق

اس قوم کے عالم وہ ہیں وہ علمِ قرآن سے بے نیاز ہیں۔ صوفی وہ ہیں جو لمبے بالوں کے ساتھ ڈراؤنی صورتیں لئے چیر پھاڑ کھانے والے بھیڑیئے بنے کمین گاہوں میں بیٹھے ہیں۔ مگر ایک پہلو کا حال یہ ہے تو دوسرے کا اس سے بھی بدتر ہے۔

ہم مسلمانانِ افرنگی مآب — چشمۂ کوثر بجویند از سراب

اقبال صاف متنبہ کرتا ہے کہ افرنگی مآب مسلمان جو سرابِ مغرب میں چشمۂ کوثر کی تلاش میں مصروف ہیں وہ بھی کسی کام کے نہیں ہیں۔ لنکا میں جو بنے سو باون گز کا۔ یہ دین سے نہ یہ واقف نہ وہ آگاہ! یہ بھی اہل نہیں، وہ بھی اہل نہیں! بات تو بڑی تحقیق ہے مگر تذکرہ افراد کا نہیں، قوم کے عناصر کا ہے اور من حیث المجموع ان تینوں عناصر کا حال ہے ہی اتنا افسوسناک! امید کی جھلک ہے تو یہ کہ اگرچہ "خیر و خوبی بر خواص آمد حرام" کا نقشہ ہے مگر:۔

دیدہ ام صدق و صفا را در عوام

ایسی زوال پذیر رفتہ قوم کی رو میں بہنے سے اقبال اپنے انسانِ مطلوب کے ہیولے کو بچانا چاہتا ہے اور وہ اسے تعلیم دیتا ہے کہ وہ "اہلِ دین" اور "اہلِ کیں" میں امتیاز کرے اور اپنے رابطہ کسی "ہم نشینِ حق" سے استوار کرے۔

اس مقام پر ایک تھوڑا بڑے گہرے مدعا کا حامل ہے اقبال کے "انسانِ مطلوب" کی تکمیل اس بات کی منت کش ہے۔ کہ ایک ایسا "مردِ حق" مہیا ہو جو اس میں انقلابی حرکت پیدا کرے۔ اس مردِ حق کی تعریف سنیئے۔

مردِ حق از آسماں افتد چو برق — ہیزم او شہر و دشت غرب و شرق
ماہنوز اندر ظلامِ کائنات — او شریکِ اہتمامِ کائنات
او کلیمؑ و او مسیحؑ و او خلیلؑ — او محمدؐ، او کتاب، او جبرئیل

یعنی دنیا میں بسا اوقات ہزاروں مردان کار ابھی سے اچھی صلاحیتیں لیے پڑے رہتے ہیں لیکن اس وقت تک وہ اپنے نصب العین کے لیے کوئی اجتماعی حرکت نہیں کر سکتے۔ جب تک کہ ایک "مرد حق" نمودار نہیں ہو جاتا۔ اور وہ "مرد حق" وہ شہسوار تاریخ وہ قیادت مآب، وہ انقلابی مجدد جب نمودار ہوتا ہے تو اس طرح ہوتا ہے کہ جیسے یکایک آسمان سے بجلی گر پڑے اور مشرق سے مغرب تک شہر و دشت میں آگ بھڑکنے لگے۔ اقبال یہاں ذرا فلسفیانہ تصوف کا انداز اختیار کر کے بات کو گہرا کر دیتا ہے کہ ہم عام لوگ تو کائنات کی مادی تاریکیوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ لیکن مرد حق جو ہر دور میں کاروان حق کا امام بنتا ہے ایک ایسی تاریخی طاقت ہے جو گویا نظم کائنات کا ایک اہم عامل (Factor) ہے۔ یہ تاریخی طاقت ایک زمانے کے لیے کلیم بنتی ہے تو دوسرے دور کے لیے مسیح ہوتی ہے۔ یہ ایک وقت میں خلیل ہے تو دوسرے زمانے میں محمدؐ ہے۔ ہاں یہ مرد حق اسی فطری اہتمام ہدایت کا ایک پرتو ہوتا ہے۔ جو انبیاؑ و کتب اور جبریلؑ کی صورت میں کام کرتا ہے اس کا کام ہوتا کیا ہے؟..... سنیئے :-

آفتاب کائناتِ اہلِ دل　　از شعاعِ او حیاتِ اہلِ دل
اول اندر نارِ خود سوزد ترا　　باز سلطانی بیاموزد ترا
ما ہمہ یا سوزِ او صاحب دلیم　　ورنہ نقشِ باطلِ آب و گلیم

وہ نمودار ہوتا ہے تو سوسائٹی کے تمام اہلِ دل افراد کی کائنات کا آفتاب بن جاتا ہے اور بے شمار منتشر کرّے فوراً اس کے گرد منظم ہو کر ایک مکمل نظامِ شمسی میں ڈھل جاتے ہیں۔ وہ اپنی دعوت پر لبیک کہنے والوں کو آزمائش کی بھٹیوں میں سے گزارتا ہے۔ یہاں تک کہ نظامِ زندگی کی باگ ڈور سنبھالنے کے قابل بنا کے چھوڑتا ہے۔ یہ اسی کا دیا ہوا سوز ہے کہ جس سے کوئی صاحب دل آج صاحبِ دل نظر آتا ہے۔ ورنہ یہ سوز نہ ہو تو آدمی محض آب و گل کا ایک نقشِ باطل ہے اور کچھ نہیں!

واقعہ یہ ہے کہ اس ٹکڑے میں اقبال نے پورے سلسلۂ نبوت اور ختم نبوت کے بعد قائم ہونے والے سلسلۂ تجدید کی حقیقت و ضرورت یہاں اشاروں میں بیان کر دی ہے۔

مگر ——

ترسم ایں عصرے کہ تو زادی دراں　　در بدن غرق است و کم داند ز جاں
چوں بدن از قحطِ جاں ارزاں شود　　مردِ حق در خویشتن پنہاں شود
در نیاید جستجو آں مرد را　　گرچہ بیند روبرو آں مرد را

یہ دورِ تن پرستی کا ہے جس میں روحانیت کے قحط کی وجہ سے اگر مردِ حق رونما بھی ہو تو وہ بے بصیرت نگاہوں کے لیے پنہاں ہو کر رہ جاتا ہے۔ جستجو اس مرد کو سامنے دیکھ کر بھی نہیں پا سکتی، کیونکہ فضا اس کے خلاف تعصبات سے آلودہ ہو جاتی ہے۔ اور نگاہیں اغراض پرستی کی وجہ سے دھندلی ہوتی ہیں۔

اقبال اپنے انسانی ہیولے کو تاکید کرتا ہے کہ تو اپنی تلاش جاری رکھ، چاہے مشکلات کتنی ہی کیوں نہ ہوں۔ لیکن اگر وہ کسی طرح ہاتھ نہ لگے تو پھر

پیرِ رومی را رفیقِ راہ ساز　　تا خدا بخشد ترا سوز و گداز

"پیرِ رومی" کی رہنمائی قبول کرے۔ یہ اقبال کا انتخاب ہے۔ آپ اس سے اتفاق بھی کر سکتے ہیں اور اختلاف بھی! اقبال نے پیرِ رومی کو دراصل جن وجوہ سے اپنے ذوق کے قریب پایا ہے۔ ان میں ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ حافظ اور عمر خیام وغیرہ کے بر خلاف مولانا روم فلسفۂ یونان کے مخالف تھے۔۔۔ اور اقبال اپنے دور کے مغربی طوفانِ فلسفہ کے خلاف اعلانِ جنگ کئے ہوئے ہے۔ اسی مناسبت نے دونوں میں رابطہ پیدا کر دیا۔ ورنہ بعض دوسرے پہلوؤں سے دیکھا جائے تو انتخاب کچھ زیادہ معیاری نہیں۔ مولانائے روم وہ "مردِ حق" بمشکل قرار پا سکتے ہیں جن کی صفات اقبال نے اوپر متعین کی تھیں، کیونکہ رومی کے ہاں "در نارِ خود سوزد" کا اہتمام تو یقیناً ہے۔ مگر "سلطانی بیاموزد" کے کوئی آثار نہیں ملتے۔ لیکن اقبال سے پوچھئے تو وہ کہتا ہے

شرحِ او کردند و اورا کس ندید   معنیٔ او چوں غزال از ما رمید

مولانا روم کے کلام کی شرحیں تو لکھی گئیں مگر اس کی حقیقت کو لوگ پا نہ سکے۔ لوگوں نے رومی کے کلام سے سیکھا تو "رقصِ تن" سیکھا، لیکن وہاں جو درس "رقصِ جاں" کا دیا گیا تھا، اسے لوگوں نے گم کر دیا!

یہ "رقصِ جاں" کیا ہوتا ہے؟ ——

علم و حکم از رقصِ جاں آید بدست   ہم زمیں ہم آسماں آید بدست
فرد از وے صاحبِ جذبِ کلیم   ملت از وے وارثِ ملکِ عظیم
رقصِ جاں آموختن کارے بود   غیرِ حق را سوختن کارے بود
تا ز نارِ حرص و غم سوزد جگر   جاں بہ رقص اندر نیاید اے پسر!

سچی بات یہ ہے کہ یہاں آکر اقبال کے کلام میں تصوف آمیز شاعرانہ فلسفے نے بڑی رمزیت پیدا کر دی ہے۔ "رقصِ جاں" کی حقیقت کو متعین کرنا بہت مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اگر ان اشارات کو جمع کیا جائے کہ رقصِ جاں وہ طاقت ہے کہ جس سے علوم و فنون اور تاج و تخت ملتے ہیں، زمین اور آسمان کی قوتیں مسخر ہوتی ہیں، فرد اس سے جذبۂ کلیم اپنے اندر پیدا کر لیتا ہے، قوم اس کے ذریعے ملکِ عظیم کی وارث بنتی ہے، رقصِ جاں سیکھنا مشکل ہوتا ہے کیونکہ اس منزل میں "غیر اللہ" کو نذرِ آتش کرنا ہوتا ہے۔ اور جب تک لالچ اور غم جگر کو پھونک رہے ہوں، روح رقص میں آ نہیں سکتی —— تو اندازہ یہ ہوتا ہے کہ شاید اس سے مراد وہ کیفیت ہے جو جذبہ و ایمان کو تحریکیت کی شان دیتی ہے اور جو انقلابی جدوجہد کا ولولہ پیدا کرتی ہے۔ یا ہو سکتا ہے کہ مراد کچھ اور ہو۔ بہرحال "رقصِ جاں" اپنے مفہوم میں قطعی نہیں ہے۔

اقبال اپنے انسانی ہیولے سے پوری بات کہہ چکنے کے بعد خاتمہ کے کلمات یوں کہتا ہے کہ:۔

اے مرا تسکینِ جانِ ناشکیب   تو اگر از رقصِ جاں گیری نصیب
سِرِّ دینِ مصطفیٰ گویم ترا   ہم بہ قبر اندر دعا گویم ترا

یہ ہے وہ پورا نقشہ جس پر اقبال نے دورِ حاضر کے انسان کے مقابلے میں ایک اور نمونۂ انسانیت استوار کرنے کی تمنائیں کی ہیں۔ اس کی پوری سیرت بیان کر دی ہے۔ اس کے اوصاف سامنے رکھ دیئے ہیں اور اس کی نوعیت کو چاروں طرف سے اس طرح متعین کر دیا ہے کہ کوئی تاویل کرنا مشکل ہے۔

اب آپ خود سوچ کر فرمایئے کہ یہ انسانیت کے کون سے نمونے کی تصویر کشی ہے؟ کیا یہ انسان اشتراکی فکر کا انسان ہے؟ کیا یہ ترقی پسندی کا نمونہ ہے؟ کیا یہ برطانیہ پرستوں اور امریکہ کے ذہنی غلاموں کے مماثل ہے؟ —— اور یہ نمونہ

دنیا میں کونسا کام سرانجام دینے کے لیئے ہے ؟ آیا تجدید و احیائے اسلام کا یا کفر کی علم برداری کا ؟

سوچیئے اور خوب سوچیئے اور اقبال کے ہاں سے متفرق خیالات نکال نکال کر ان سے فائدہ اٹھانے کے بجائے اس کیجا پیش کردہ مجموعی تصویر پر رائے دیجیئے کہ یہ کس کی تصویر ہے ! ــ جی ہاں ! یہ بالکل "مردِ مومن" کی تصویر ہے ، یہ اقبال کا شاہین ہے ، یہ "جاوید" (فرزندِ اقبال مراد نہیں ہے) ہے ! ــــ اور آپ کھل کے اپنے دل کے جذبات اگل ڈالیئے ! ــــ ہاں ہاں ! کہیئے ! ٹھیک ہے یہ ملائیت کا نمونہ ہے ، یہ رجعت پسندی کا پیکر ہے ، یہ ماضی پرستی کا مجسمہ ہے !

جو کچھ ہے یہی ہے اقبال کا انسانِ مطلوب !

یہاں تک تو ہم نے "شرحِ اقبال" اور "تعارفِ اقبال" کا فریضہ ادا کیا ہے ۔ اب ناقدانہ ذمہ داریوں کا تقاضا بھی پورا کرنا ہے ۔ زبان اور اسلوبِ بیان اور فن کے لحاظ سے یہاں کچھ زیادہ موقع گفتگو نہیں ہے ۔ پورے جاوید نامے میں روانی و شگفتگی کا جو زور ہے وہ کم و بیش اس آخری ٹکڑے میں بھی موجود ہے ۔ مقصد و مدعا کے لحاظ سے بھی کوئی بڑا نقطۂ اختلاف نہیں ہے ۔

سوال صرف ایک ہے ؟ اقبال کی سالہا سال کی جگر کاویاں اور اتنے گہرے مخلصانہ اسلامی جذبات جو ایک نئے انسان کی تخلیق کے لیئے مچلتے رہے ہیں ، عملاً کوئی نتیجہ کیوں نہ پیدا کر سکے ! اقبال اپنے انسانِ مطلوب کے خیالی ہیولیٰ کو پیکرِ عمل دینے میں کیوں ناکام رہا ؟

وہ اپنے آپ کو انسانیت کے ایک مطلوبہ معیار کے قریب کیوں نہ لے جا سکا ؟ وہ خود ہی اپنی حسرتوں اور اپنے ارمانوں کا جواب کیوں نہ بن سکا ؟ جو لوگ نو عمری میں سب سے زیادہ اس سے قریب رہے ، جنہوں نے جوانی میں اقبال سے وابستگی پیدا کی ، جو اقبال کے چند اونچے درجے کے سمجھنے والے گنے جاتے ہیں ۔ کیا وجہ ہے کہ ان میں سے ایک بھی اقبال کا انسانِ مطلوب نہ بن سکا ؟ کیا وجہ ہے کہ اس کا پاکستان کا تخیل تو عملی شکل اختیار کر گیا مگر وہ جس پاک انسان کے خواب دیکھتا تھا اس کا ہلکا سا پرتو بھی کسی ایک متنفس نے قبول نہ کیا ؟ کیا وجہ ہے کہ خود "جاوید" وہ کچھ نہ بن سکا جس کی طرف بظاہر روئے سخن تھا ؟ ــــ اور کیا جاوید کو ایک مردِ مومن ، ایک شاہین ، ایک عقاب اور ایک قاری نظر آنے والا چلتا پھرتا قرآن بنانے کے لیئے جرمن گورنس کی خدمات ہی موزوں ہو سکتی تھیں ؟

اقبال نے یہ راگ تو فی الواقع گہرے ایمانی جذبات کے ساتھ الاپا کہ انسانیت کے ایک نئے پاکیزہ نمونے کا ظہور ہونا چاہیئے بلکہ اس نے یہ بھی چاہا کہ ایک نئی ملت برپا ہو ــــ "بیا نقشِ دگر ملت بریزیم" ــــ مگر ایک نئی ملت کا نقش بٹھانا تو کجا اس ملت کے لیئے خودی کی جیسی اکائیوں کی ضرورت تھی ۔ ویسی ایک اکائی بھی تو بن نہ سکی ! وہ اکائی نہ اقبال کے فلسفے کے ماہرین میں سے نمودار ہوئی ، نہ اس کے قدر شناس اور عزیز ترین بے تکلف دوستوں میں سے ابھری ، نہ اس کے فیضِ صحبت سے مستفیض ہونے والے نوجوان طلبا میں سے بلکہ خود اس کی اپنی اولاد میں سے کوئی ایک فرد وہ اکائی نہ بن سکا ــــ نہ خود اقبال "جو کردار کا غازی" ہونے سے صاف صاف انکار کرتا ہے ۔

ہم پوچھتے ہیں کہ اس کے قدر دانوں اور رمز شناسوں کے محدود حلقے سے آگے گزر کر پوری قوم کو لے لیجیئے اور کسی ایک فرد پر انگلی رکھ کر یہ بتایئے کہ یہ شخص اقبال کو پڑھ کر ویسا مردِ مومن اور ویسا شاہین و عقاب بنا ہے یا بننے کی جدوجہد میں مصروف ہے جس کا نمونہ اقبال کے ذہن میں بسا ہوا تھا !

کیا اس کی کوئی خاص وجہ نہیں ہے ؟ یقیناً ہے ! ——— اگر کوئی خاص وجہ ہے تو اقبال کے رمز شناسوں اور اس کے ناقدوں کا فرض ہے کہ اس وجہ کو دریافت کریں ! آخر اقبال کا اتنا اونچا فلسفہ اس کے گہرے پُرخلوص جذبات ، اس کی عمر بھر کی کمائی ہوئی فکر ایسی چیز تو نہ تھی کہ ہوا میں غبار پریشان بن کر اُڑ جائے ، بلکہ اس سے تو ایک نئی تاریخ کو جنم لینا چاہیئے تھا !

یہ ہے وہ اصل نقطۂ بحث و نظر جس پر متوجہ ہونے کی ضرورت ہے ۔

ہمارے نزدیک اس کے چند اسباب ہیں جن پر پورا استدلال کرنے کا موقع یہاں نہیں ہے ۔ البتہ اُن اشارات کو سامنے رکھ کر اگر مختلف اصحاب سوچیں تو ان کی تحقیق بڑی قدر و قیمت کی حامل ہو سکتی ہے ۔ ہم ان اسباب کو اشارۃً نمبر وار درج کرتے ہیں : ـ

(۱) اقبال نے شعر کا آغاز "رومانس" کی وادیوں سے کیا ہے ۔ ان وادیوں کی پری وہی ہے کہ کبھی اس کی گود میں پلی دیکھ کر اور کبھی "سلیمیٰ" کے شاعرانہ سانچے میں ڈھال کر اقبال اس سے متاثر ہوتا ہے ۔ آگے چل کر یہ پری "حسن ازل" کا لبادہ اوڑھ لیتی ہے اور اقبال اس کے پیچھے کبھی "نیکر" کے کنارے دوڑتا ہوا اور کبھی چاند تاروں کی طرف پرواز کرتا ہوا ملتا ہے ۔ اس طرح رومانس جمال فطرت کی طرف تحویل قبلہ کر لیتا ہے ...... اور یہ جمال فطرت کے معصوم تر ذوق میں ڈھلا ہوا رومانس اقبال کے ساتھ بہت دور تک چلتا ہے ——— بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ آخر تک !

یہ دَور وہ ہے کہ جس میں اقبال اپنی ذات کی دنیا سے باہر نہیں جھانک سکا ، مگر جب اس نے پہلے پہل دل کے دریچے کھول کر باہر دیکھا ہے اور مغرب کی تیار کی ہوئی فضا میں دیکھا ہے تو اس کی پہلی نظر وطن کے بُت پر پڑی ہے ۔ کہ جو تازہ خداؤں میں سب سے بڑا تھا ۔ اقبال اس صنم سے فوراً متاثر ہوا ہے اور اسے رومانس کی پری کے مقابلے میں اس صنم کو محورِ جذبات بنانے کا مقام زیادہ اونچا نظر آیا ہے ۔ چنانچہ وہ ایک مرتبہ تو وہ اس کے سامنے کھڑے ہو کر نغمے الاپنے پر مجبور ہو گیا ہے "ہندوستان ہمارا" اور "ترانۂ وطن" اور "اے ہمالہ ! اے فصیل کشورِ ہندوستان !" اسی دَور کے نغمے ہیں ۔ مگر پھر جلد ہی آنکھ کھل گئی ، اور حالی ، اکبر ، سرسید ، ابوالکلام آزاد ، ظفر علی خان ، محمد علی جوہر وغیرہم کے دَور میں "مسلم نیشنلزم" کی جو فضا بن رہی تھی اقبال معاً اس میں جذب ہو گیا ۔ اقبال کا اصل موقف یہی "مسلم نیشنلزم" ہی رہا ہے ۔ اگرچہ بیچ بیچ میں اس کے قلب پر بار بار اسلامیت کا پرتو پڑتا رہا ہے اور اس نے بہت سے مقامات پر حقیقی اسلام کے فلسفہ و اصول اور مقاصد و مقتضیات کو نکھار کر پیش کرنے میں اولیت کا مقام حاصل کیا ہے ۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اس کی اسلامیت کا دامن مسلم نیشنلزم کی گرد سے کبھی پاک نہ ہو سکا ۔ یہ دونوں ندیاں اس کے سینے میں متوازی طور پر رواں دواں رہی ہیں ۔ کہیں یہ دونو آ کر مل گئی ہیں ، کہیں پھٹ کر الگ ہو گئی ہیں اور کبھی ایک کی رفتار دھیمی ہو گئی ہے اور کہیں دوسری کی موجیں کمزور پڑ گئی ہیں ۔ اس نیشنلزم کی آمیزش نے اس کے پیغام کو نتیجہ خیز نہیں بننے دیا !

اسلام کو قوم پرستی کے اثرات سے الگ کر کے بھی اقبال نے یہاں جہاں پیش کیا ہے ۔ وہاں بلاشبہ اس کے ایک جامع نظام زندگی ہونے کا تصور تو دلا دیتا ہے ۔ مگر اس تصور کے ساتھ اس کے انقلابی تحریک ہونے کا احساس بیدار نہیں کر سکا ! ورنہ اگر وہ اسلام کے انقلابی تحریک ہونے کو محسوس کرتا اور محسوس کرانا چاہتا تو اس کا قبلۂ فکر رومی نہ ہوتا کوئی اور ہوتا ! وہ اگر اسلام کی تحریکیت کا راز پالیتا تو اس کے جاوید نامے میں آپ "تحریک مجاہدین" اور "شہادت بالاکوٹ" کی جلوہ پاشیاں تو ضرور دیکھتے لیکن اسی کمی کی وجہ سے اقبال کو "سلطان ٹیپو" کی اہمیت تو محسوس ہوئی لیکن سید احمد اور شاہ اسمٰعیل شہید کی خون کی لکھی ہوئی تاریخ کی ایک سطر بھی سامنے نہ آئی ۔ وہ پھر تری ہری کو تو کہیں سے ڈھونڈ کے لے آیا لیکن شاہ ولی اللہ سے ہاتھ نہ آسکے تصنیف النا

شد سلطان بیگڑوہ کو تو پا سکا مگر اس کی نگاہ مجدد الف ثانی پر چپکتی ہوئی پڑی۔

(۲) اقبال کا ہر گہرا مطالعہ کرنے والا جو اس کے چند دل پسند اشعار لے کر نہ بیٹھ گیا ہو، یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ جس مغربی فلسفے کے خلاف لڑا ہے، اس سے خود شدید طور پر متاثر بھی ہوا ہے۔ اس کے پیغام کے بڑے اہم نکات ایسے ہیں کہ جن کو سمجھنے کے لیے "قرآن" کی طرف رجوع کرنے سے زیادہ مغربی نظریہ بازوں کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً اس کا فلسفۂ خودی ہو یا اس کا نظریۂ زمان و مکان ان میں سے کسی کو بھی سمجھنے کے لیے ناگزیر ہے کہ فلسفۂ مغرب پر عبور حاصل کیا جائے۔ لیکن اقبال مغربی فلسفیوں کا محض ترجمان نہیں ہے اور وہ "آنچہ استادِ ازل گفت ہماں می گویم" کے اصول پر مغربی الہامات کا پیغمبر نہیں ہے بلکہ اس نے ہر چیز کو چھان پرکھ کر اور اپنا کر اور پھر پوری طرح ہضم کر کے اسے کوئی خاص شکل دی ہے۔ ضروری نہیں کہ اس کے چھاننے پرکھنے کا معیار ہر جگہ صحیح اور خالص اسلام ہی رہا ہو۔ بلکہ صحیح یہ ہے کہ اس کا معیار اس کا "انا" تھا۔ کیونکہ مغربی فلسفہ اگر اس کے اندر اسلام سے قبل نہیں اترا ہے۔ تو اس سے انکار تو ناممکن ہے کہ دونوں ساتھ ساتھ آئے ہیں۔ اور ان دونوں میں سے کوئی ایک بھی دوسرے کے لیے معیار بننے کا مقام نہیں رکھتا تھا۔ لہٰذا قدرتی طور پر اقبال کا "انا" جو کچھ بھی اور جیسا کچھ بھی تھا ان دونوں کے لیے معیار بنا ہے۔ یہ "انا" مغربی فلسفے کے اثرات ہضم کر کے خود متغیر ہوتا چلا گیا ہے اس لیے اس کا معیارِ فکر و نظر برابر ارتقاء کرتا رہا ہے۔

اسلام کا رجحان اقبال کی روح میں مغربی فلسفے کے ردِ عمل کے طور پر نمودار ہوا ہے۔ اس کا اقدام مستقل اور مثبت نہیں تھا! صورتِ حالات کچھ اس طرح کی تھی جیسے بسا اوقات حد سے بڑھی ہوئی گناہ گاری آدمی کے لیے ہدایت کی تحریک بن جاتی ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے گناہ کرتے کرتے کسی ایسے بڑے گناہ کے مقام پر پہنچتا ہے کہ جس کے صدور سے ضمیر میں ایک دھماکا پیدا ہوتا ہے اور وہ "توبہ" کو جگا دیتا ہے۔ اس طرح جب توبہ جاگتی ہے تو انسانی فطرت میں بڑے بڑے انقلابی حوادث رونما ہو جاتے ہیں۔ اقبال مغربی فلسفے کی گہرائیوں میں ڈوبتے ڈوبتے جب بالکل تہ تک پہنچ گیا تو اسے اپنے اندر سے ایک آواز اچانک سنائی دی کہ "تم تو مسلمان ہو!" ــــ مسلمانوں میں پیدا ہوئے، تمہارا ایک دین ہے، اس دین کی ایک کتاب ہے۔ تم ایک خاص خاندان میں پیدا ہوئے ہو، تم ایک خاص قوم کے فرد ہو۔ تم ایشیائی ہو ــــ یہ اقبال کے "انا" کی آواز تھی! اس کی اپنی آواز، اس کے ماں باپ کی آواز، اس کے خاندان کی۔ روایات کی آواز، اس کی قوم کی آواز، اس کی قوم کی تاریخ کی آواز، اس کے دین کی قدروں کی آواز ــــ اور اقبال کی یہ خصوصیت تھی کہ اس کی روح میں یہ آواز زندہ رہ گئی، ورنہ مغرب زدہ طبقے کے ضمیروں کو آپ بالعموم بالکل بنجر پائیں گے۔ اقبال اس آواز کو سن کر چونک اٹھا، اور اس نے اسلام کی طرف ذہنی ماحول کی تاریکیوں میں ٹٹول ٹٹول کر اقدام کرنے کی کوشش کی اور پھر اس نے اپنے قلب کو مغربی فلسفے اور اسلامی فلسفے کا میدانِ معرکہ بنا ڈالا۔ اس معرکے میں جو آخر دم تک جاری رہا ہے۔ اقبال جن مختلف ذہنی کیفیات سے گزرا ہے اور اس کے سینے میں جو گوناگوں اتار چڑھاؤ پیدا ہوتے ہیں۔ آج ہم ان کا مطالعہ بانگِ درا سے لے کر ارمغانِ حجاز تک کے اوراق میں کر سکتے ہیں۔

اقبال کے ہاں آپ آج اگر کہ مغربی نظریے کو ملاحظہ فرمائیں تو وہ اسلامی فکر کے ساتھ ترکیب پا کر ایک ایسی نئی صورت اختیار کیے ہوئے ملے گا کہ اسے پہچاننے میں کچھ نہ کچھ دقت ہوتی ہے اور اسی طرح اس کی تعبیراتِ اسلام مغربی فلسفے کے ہلکے سے رنگ میں رنگ کر ایک دلچسپ کیفیت اختیار کر گئی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ پیغام نکھر نہیں سکا، بلکہ ایک حد تک انتشار کا انداز رکھتا ہے!

(۳) اقبال کی ایک بڑی مشکل اس کا ذوقِ تصوف ہے۔ تصوف اس کی آبائی دولت تھی ہی، لیکن آگے چل کر جیسا اس نے ذوقِ سخن کے تحت فارسی اور اردو کے میکدہ ہائے شعر سے بادہ نوشی کی ہے تو یہاں بھی اسے مئے سخن تصوف آمیز ملی ہے۔ پھر مغربی فلسفے کے ردِ عمل کے تحت جب اس نے اسلامیت کے رنگ میں رنگا ہوا ایک فلسفہ مرتب کرنے کی طرف توجہ کی ہے تو اپنے قومی سرمایۂ علم میں اسے تفلسف کے پیدا کردہ دفترِ دیوانہ تر اپنے صوفیوں کے ہاں ملے ہیں۔ چنانچہ اس نے اپنے لئے "پیر" انتخاب کیا تو مولانائے روم کو کیا!

اپنے "انسانِ مطلوب" "کالانعام" کھینچتے کھینچتے، اپنے مقاب ... اور شاہین کا قصیدہ پڑھتے پڑھتے جب وہ اس کا نمونہ نکالنے کے لئے مولانا روم پر جا انگلی رکھتا ہے تو اس کے سارے تعمیر کردہ محل گر پڑتے ہیں۔

پھر تصوف کی دنیا میں اقبال کو ایسے عجمی آثار ملے ہیں جو اس کے فلسفے کے بھی صریحاً خلاف تھے اور اسلام میں ان کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ اس پیچیدگی نے ایک طرف اقبال کو مجبور کیا کہ وہ عجمی تصوف کے خلاف لڑے اور دوسری طرف اس کا ذوقِ تصوف تھا کہ جس نے اس سے بہت سی اہم باتیں [illegible] نے میں کہلوائی ہیں اور اس نے نے ان کی معنویت کو بہت الجھا دیا ہے۔

اکیلا تصوف ہوتا تو بھی ایک بات تھی، ایک طرف شعریت، دوسری طرف تفلسف اور تیسری طرف تصوف، تینوں سے ترکیب پا کر اس کا پیغام اپنی ساری وسعتوں اور بلندیوں کے باوجود نہ تو واضح کر سکا اور نہ اس میں یہ قوت ہی رہی کہ وہ قوم کی قوم کو تو کیا، اس قوم کے کسی ایک فرد کو از سرتا پا بدل کر دکھاتا ...... اور مٹی کے ان تودوں سے کوئی شاہین و عقاب واقعی پیدا کر سکتا!

(۴) اقبال اپنے دور کی عالمگیر تحریکات کے بارے میں بھی اسلام کے موقف پر کھڑے ہو کر وہ جرأت مندانہ دوٹوک فیصلے نہیں دے سکا جن کی توقع اس سے ہو سکتی تھی۔ جمہوریت، فاشزم اور سوشلزم تینوں کے بارے میں وہ ایک "بین بین" مقام پر رہا ہے ــــ یعنی کچھ حمایت اور کچھ مخالفت۔ بخصوصیت سے سوشلزم کے متعلق یہ دو رنگی بہت انتشار انگیزی کا موجب ہوئی ہے۔

(۵) اور آخری چیز ــــ صرف دل پہ پتھر رکھ کر ہی کہنے کی چیز ــــ تنقیص کے لئے نہیں، ایک مسلمان کے سے جذبہ خیرخواہی کے ساتھ ــــ یہ ہے کہ اقبال ہی کے تضادِ فکر و عمل نے اپنی سطح سے بہت نیچے گرا دیا ہے۔ دنیا میں کسی دعوت کے معنی الفاظ کی ڈکشنریوں میں نہیں، عمل کی ڈکشنری میں تلاش کئے جاتے ہیں اور وہی عملی معنی ہی رائج ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ اقبال کی اچھی خدمات کو قبول فرما کر مرحوم کی مغفرت فرمائے ــــ لیکن اس تاریخی حقیقت کو ہم چھپا نہیں سکتے کہ اقبال نے جو کچھ دوسروں سے چاہا وہ کچھ خود نہ بن سکا! ہم اپنے ایک محترم رفیقِ اسلام سے اس کی خدمات کی وجہ سے جو محبت رکھتے ہیں، اسی کی بنا پر قلم کو یہ گوارا نہیں کہ وہ اس کے اعمال نامے کو اپنی جولانگاہِ تحقیق بنائے ورنہ تضاد کی بہت سی مثالیں ایسی ہیں کہ جن کو سامنے رکھ کر ہم کڑھتے ہیں کہ کاش کہ اقبال جیسی عظیم المرتبت ہستی میں یہ نہ ہوتیں۔ (بقیہ بر صفحہ ۴۴)

لہ مولانائے روم کی فکر اور موصوف کے کارنامۂ فکر کی قدر و قیمت ہماری نگاہوں میں ہے لیکن وہ صوفی ہیں، شاہین نہیں ہیں۔ ع

میں نہیں چاہتا، مگر۔۔۔

نعیمہ صدیقی

میں بعض اوقات مطالعہ کے کمرے میں بیٹھ کر کوئی چیز پڑھ رہا ہوتا ہوں، اپنے بجلی کے دفتر کے فائل کھولے ان پر دماغ سوزی کر رہا ہوتا ہوں اور اچانک کچھ بچے سامنے کے صحن میں کرکٹ کھیلنے لگ جاتے ہیں، میرے بچے، پڑوسیوں کے بچے، نامعلوم لوگوں کے بچے ۔۔۔۔ پلٹن کی پلٹن کہیں سے نکل آتی ہے اور ایک طوفان مچا دیتی ہے۔ بال کو بلا لگتا ہے تو بڑا دماغ پاش دھماکہ ہوتا ہے اور پھر کبھی واہ واہ ہوتی ہے، کبھی جھگڑا ہو جاتا ہے، کبھی گالم گلوچ پر نوبت آجاتی، کبھی ہاتھا پائی شروع ہو جاتی ہے، پھر تحکیم و صالحت ہوتی ہے، یہاں تک کہ آخر کار کوئی مقدمہ مرتب ہو کر میرے سامنے آجاتا ہے۔ مدعی فریق اپنی ہانکتا ہے اور مدعی علیہ اپنی، کوئی کسی کی نہیں سنتے دیتا۔ اس میں کیا کرایا مطالعہ غارت ہو جاتا ہے، بنے بنائے حسابات ذہن میں گڈ مڈ ہو جاتے ہیں، صاحب کے اعتراضات کے جوابات جو سوچے ہوتے ہیں وہ غبار پریشاں بن جاتے ہیں، حریف کلرکوں کو شکست دینے کے لئے جو تجویزیں جمع کی ہوئی ہیں وہ نہ جانے کدھر غائب ہو جاتی ہیں۔ بچوں کے کھیل میں میری گھنٹوں کی کمائی لٹ جاتی ہے۔ ان میں سمجھوتہ کرا کے یا ان کو ڈانٹ ڈپٹ کر بھگاتا ہوں مگر وہ پھر آکر اکھاڑا جما دیتے ہیں۔ میں نہیں چاہتا ہوں کہ ایسا ہو مگر یہ ہوتا ہے، روز ہوتا ہے، کئی کئی بار ہوتا ہے، میری مرضی کے خلاف ہوتا ہے میرے دھمکانے کے علی الرغم ہوتا ہے اور میں خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہوں۔

صبح سیر کو نکلتا ہوں تو مسٹر رشید احمد ایم۔ ایس۔ سی، جو میرے بڑے بے تکلف دوست ہیں ان کی سفید "کتوڑی" (کتیا کی تصغیر پنجابی علم قواعد میں)، اپنی ایک ناز آمیز اور نزاکت آمیز "بھونک" سے میرا استقبال کرتی ہے۔ میں چاہوں یا نہ چاہوں وہ ضرور کرے گی۔ پھر کبھی رشید کے ہاں شام کو جاتا ہوں تو یہ لپک کر آتی ہے اور میرے جوتے چاٹنے اور میری شلوار کے پائنچوں کو سونگھنے کی کوشش کرتی ہے ۔۔۔۔ اور یہ چیزیں مجھے سخت ناپسند ہیں۔ مگر رشید کی کتوڑی "بھاگی" (اس کا نام) کو یہ پسند نہیں اور وہ کبھی معاف نہیں کرتی۔ دل نہیں چاہتا مگر رشید کے پاسِ خاطر سے کئی مرتبہ ناگواری کے احساس کو ایک جھوٹی مسکراہٹ کے تلے دبانا پڑتا ہے۔ اس معاملے کو آپ کچھ ویسا ہی سمجھیں جیسے بال روم میں آپ کے کسی دوست کی بیوی آپ کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر ناچنے کے لئے فکری اور عملی اقدام کریں۔ سوچیے کہ اس صورت میں یہ کتنی بری بات ہو گی کہ آپ اس امڈ کر آنے والی خاتون کو قبول کرنے سے انکار کر دیں اور کوئی شرم، کوئی حیا، کوئی عصمت داری کا جذبہ آپ کو غیر مہذب بنا دے۔ مصیبت یہ ہے کہ ہماری پوری دنیا ایک بال روم ہے اور اس میں کئی رشید ہیں اور ان کی کئی کتوڑیاں ہیں اور یہاں اصول یہ ہے کہ جیسے چاہو تو میرے کتے کو بھی چاہو! آپ چاہیں یا نہ چاہیں، یہ اصول مانے بغیر چارہ نہیں۔

رشید کی اس کتوڑی کے کرشمے یہیں تو ختم نہیں ہو جاتے، بلکہ دن بھر وہ رشید اور اس کے بچوں اور دوستوں کو سونگھنے اور چاٹنے کے بعد جب رات ہو جاتی ہے تو کوٹھی سے نکل کر سیدھی سڑک پر آجاتی ہے۔ سڑک پر ایک خاص جگہ گویا پہلے سے مقرر ہے، جیسے انسانی شہروں میں وائی، ایم، سی، اے اور وائی، ڈبلیو، سی، اے ہال ہیں۔ سڑک کے اسی مقررہ بے وعدہ یا

اور بے سقف و فرش والی، ایر کنڈیشنڈ، اے سی، اسے ہال میں ہر طرف سے کتے کتیاں اور کتورے کتوریاں جمع ہو جاتی ہیں۔ رشید کی کتوری اور اس کے ملنے جلنے والے اور ملنے جلنے والیاں بڑی ترقی پسند ہیں، وہ جدید تقاضوں کو جانتے اور جانتی ہیں، اس لئے وہ تت اپنے ساتھی بدل بدل کر گنگناتے ہیں، غراتے ہیں، ناچتے ہیں، کھیلتے ہیں، تقریریں کرتے ہیں، افسانے اور نظمیں پڑھتے ہیں ـــ یہاں تک کہ آدھی رات ہونے پر بالکل ہی ترقی پسند ہو جاتے ہیں۔ یعنی وہ ایسی حرکات پر اُتر آتے ہیں جن کا مزے لے کر بیان کرنے کے لئے کرشن چندر اور منٹو کی ضرورت ہوتی ہے اور جن کا باریک تجزیہ کرنے کے لئے کوئی احمد ندیم قاسمی درکار ہوتا ہے۔ مجھے چونکہ نیند دیر میں آتی ہے اور یہ سارا ہنگامہ رومان میرے مکان کے قریب ہوتا ہے اس لئے مجھے بڑی تکلیف ہوتی ہے، اور میں نہیں چاہتا کہ یہ ایک دن بھی ہو، لیکن یہ روز ہوتا ہے۔ اور میں اس کے خلاف تکلیف کا احساس کرتا رہوں گا اور یہ عالم حیوانات کی "اپوا" اپنا کام کرتی رہے گی۔

صبح کی پہلی کرن کے ساتھ رشید کا ریڈیو طوفانِ صوت بپا کر دیتا ہے اور جب تک رشید کے گھر میں کوئی زندہ وجود موجود رہتا ہے یہ طوفان نہیں تھمتا، یہاں تک کہ ہم نغمہ ہائے شہ کار کی توہین کرتے ہوئے سو جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ رشید ریڈیو کو ہمیشہ آن رکھتے ہیں تاکہ جب کوئی پروگرام شروع ہو تو اس کی تکبیر اولیٰ فوت نہ ہونے پائے۔ اور یہ شبہ بھی مجھے ہے کہ رشید نے ریڈیو کا رخ ٹھیک میرے مکان کی طرف رکھنے کا فیصلہ کر رکھا ہے۔ آواز کی رو شہادت دیتی ہے کہ میری کور ذوقی کی اصلاح کا خاص اہتمام ہے۔ میں ذرا رجعت پسند قسم کا آدمی ہوں اور میری ذہنیت میں بچپن اور احوال کی تربیت کے زیرِ اثر کچھ ایسا فساد و اختلال موجود ہے کہ میں اپنی بیوی کو اور اس سے زیادہ اپنے بچوں کو اسلام کی اُٹھان پر اُٹھانا چاہتا ہوں، مگر میرے اس فسادِ ذہن کے خلاف ایک رشید ہی نہیں، میرے دوسرے پڑوسی سید ذوالفقار بھی اور میرے پچھواڑے بسنے والے، چوہدری قمرالزمان بھی برابر اپنا کام کر رہے ہیں۔ چنانچہ میری بیوی کو، میرے بیٹے کو اور میری بیٹی کو ایک ایک بائی ایک ایک بیگم اور ایک ایک قوال کا نام یاد ہے۔ ان کے مخصوص آرٹ کی پہچان ہو گئی ہے۔ ان کی گائی ہوئی غزلیں یاد ہیں، ان کی لے اور دھن کی تصویر حاصل ہے۔ جیسے میرے مکان کے آس پاس کی فضا موسیقی کا ایک ہمہ وقتی کالج ہو اور ہمیں برابر سبق مل رہے ہوں۔ میں چاہوں تو بھی اور نہ چاہوں تو بھی ذوقِ لطیف کی خوراکیں مجھے اور میرے اہل و عیال کو برابر دی جا رہی ہیں۔ ہمارے ہاتھ پاؤں جکڑ کر جیسے ہمارے حلق میں سنکھیا کا محلول اُتارا جا رہا ہے۔ اور کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈالا جا رہا ہے۔ جیسے ہمیں جبراً پیپ اور کچ لہو سے سرنج بھر بھر کر روزانہ انجکشن کئے جا رہے ہوں۔ اِدھر قرآن پڑھا جا رہا ہوتا ہے اور اُدھر آ ـــ ہا ـــ آ آ آ ـــ ہا ـــ شروع ہو جاتی ہے۔ اِدھر نماز کے لئے نیت باندھی جاتی ہے۔ اور اُدھر طاؤس و رباب کا طوفان اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اِدھر سیرتِ نبوی اور احادیثِ نبوی کا درس ہو رہا ہوتا ہے۔ اور اُدھر فلمی ریکارڈ بجنے لگتے ہیں۔ فرمائیے، میں کیا کروں۔

ذرا دیکھئے، میں دفتر جا رہا ہوں۔ سامنے سے زندگی سے مخمور بیگمات کا ایک غول چلا آ رہا ہے۔ اس غول میں آدھی تعداد بے برقعہ خواتین کی ہے، آدھی برقعہ والیوں کی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ ذرا سکڑ سمٹ کر اور ذرا سترا کر ایک طرف سے گزر جائیں۔ اور کم سے کم میری ڈاڑھی دیکھ کر اور مجھے ملا سمجھ کر کچھ تکلف زدہ ہو کر ہی اپنے اوپر ایک کیفیت حجاب طاری کریں۔ مگر نہیں وہ تو آنکھیں میری آنکھوں میں گاڑے بڑھی چلی آ رہی ہیں جیسے مجھے پامال کرتی ہوئی گزر جائیں گی ذرا ملاحظہ ہو کہ برقعے والیوں نے بھی جب دیکھا کہ کوئی مرد سامنے آ رہا ہے تو انہوں نے بھی نقاب اُٹھا دیئے۔ متحیر بے بس ہو کر میں ایک طرف ہٹتا ہوں بیچ ہی نکلا تھا کہ یہ غول میرا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ ایک "زنانہ مردوے"

نے ایک کاغذ میری طرف بڑھاتے ہوئے فرمایا کہ آپ جنگ کے خلاف ہونگے اور یقیناً آپ کی تمنا بھی ہوگی کہ دنیا میں دوبارہ جنگ نہ ہو۔ میں جواب کیا دیتا کہ نہ زمین پر ہوں نہ آسمان پر..... جان چھڑانے کے لئے دستخط کر دیئے۔ اور لپکا دفتر کی طرف! ابھی چند ہی قدم چلا تھا کہ آٹھ آٹھ دس دس بارہ بارہ سال کی لڑکیوں کی ایک پارٹی نظر پڑی۔ میں پہلے تجربے کے پیش نظر سڑک کے اس کنارے کو چھوڑ کر دوسرے کنارے چلا گیا۔ مگر ستم ہوا کہ یہ ٹولی بھی سڑک کو عبور کرکے دھم سے میرے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ ان کی "لیڈر" نے کہا کہ ہم "اسلامی مدرسہ طالبات" کی لڑکیاں ہیں اور ہمارے ہاں ڈرامہ ہونے والا ہے۔ اس کے لئے چندہ چاہیئے۔ نہ پوچھیئے کہ میرے دل کا حال کیا ہوا۔ کیا اس تربیت کے لئے کسی "اسلامی مدرسہ طالبات" کی ضرورت تھی؟ سرکار کے اسلامی مدرسے اس کام کے لئے کچھ کوتاہ تو نہیں تھے۔ میں نے پوچھا کیا ڈرامہ ہوگا؟ جواب ملا روپ متی اور باز بہادر کا۔ میں نے پوچھا کہ اس کا مقصد کیا ہے؟ ان معصوم بچیوں نے بتایا کہ اس کی آمدنی سے غریب لڑکیوں کی فیسوں کی معافی کا انتظام کیا جائیگا۔ اس کے علاوہ ایک مقصد یہ بھی ہے کہ وزیر تعلیم آرہے ہیں۔ ان کو ڈرامہ دکھایا جائیگا۔ اور پھر ان کے سامنے مدرسہ کے لئے مزید گرانٹ کی درخواست پیش کی جائیگی۔ پچھلے سال بھی گرانٹ میں اضافہ کرانے میں اسی طرح کامیابی ہوئی تھی۔ میں نے ان سے بڑی نرمی سے کہا کہ تم مسلمان گھروں کی شریف بیٹیاں ہو۔ تمہارا کام یہ ہے کہ عائشہ اور فاطمہ کے نقشے پر اپنے آپ کو استوار کرو۔ اس کے جواب میں انہوں نے بجز اس کے کچھ نہ کہا کہ استانیوں نے ہمیں بھیجا ہے۔ ان سے اتنی لمبی چوڑی گفتگو کرنے اور ان کا وقت لینے کے بعد جب ان کا اصرار میں نے ان لفظوں پر دم توڑتا دیکھا کہ "کچھ تو دے دیجئے"۔ تو مجبوراً دونی جیب سے نکال کر ان کی لیڈر کے ہاتھ پر رکھی —— اور پھر جب سے اب تک ضمیر کا احساس گناہ مجھے کاٹتا ہے کہ میں نے ایک قوم سوز فتنے کی جڑوں کو پانی دینے میں حصہ لیا۔ میں مجرم ہوں۔ ہمارے وزیر مجرم نہیں ہونگے۔ ہمارے استاد اور استانیاں مجرم نہیں ہونگی۔ ہمارے ناظمین مدارس مجرم نہیں ہونگے..... لیکن میں بہر حال مجرم ہوں۔

اس طرح کے حادثات سے خدا جانتا ہے کہ میں دوچار ہونا پسند نہیں کرتا، مگر یہ روز ہوتے ہیں۔ شائد ہی کوئی دن خالی گیا ہو۔ میرے گھر میں یہ اہتمام ہے کہ زبان پاکیزہ استعمال کی جائے۔ اور یہ اہتمام ایک مدت سے ہے اور اس کے بڑے اچھے اثرات بھی ہونے چاہئیں۔ مگر چند دن کی بات ہے میری چھ سال کی لڑکی کہیں سے "مسلیگ بعدہ باد"۔ "نواب حاجہ اکرام اللہ جندہ باد" اور "گدار مردہ باد" کا سبق لے آئی ہے۔ اب دن رات یہی نعرے اس کی زبان پر رہتے ہیں۔ اس نے اچھی خاصی سیاست سیکھ لی ہے۔ خربوزے سے خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ اب یہ سیاست دوسرے بچوں میں بھی پھیل نکلی ہے اور اب شائد اس کی تان "لاٹھی چارج" پر ہی ٹوٹے گی۔ ادھر پرسوں سے میرا دہ سالہ بچہ ایک گندی پنجابی گالی کہیں سے سیکھ آیا ہے۔ گھر میں جانتے بوجھتے میرے سامنے تو وہ اس ادب لطیف کو استعمال نہیں کرتا لیکن باہر کھیل میں وہ اس طرح کی شاعری کرنے لگا ہے۔ آپ خیال فرمائیے کہ جس باپ اور جس ماں نے سالوں اپنے بچوں کے اندر ذہنیت و سیرت کی ایک فصل اگانے میں محنتیں کھپائی ہوں وہ جب اس فصل کو اجڑتا دیکھیں تو ان پر کیا گذرے گی۔ مگر جو کچھ بھی گزر رہے، گزر رہی ہے اس سے ہوتا کیا ہے، اکن ہو رہیاں ہو رہی ہیں اور ہم دیکھ رہے ہیں۔ ابھی نہ جانے اور کیا ہوگا۔

گھر میں اخبار آتے ہیں۔ یہ انتظام اس لئے کیا گیا ہے کہ یہ لوگ دنیا کے حالات سے ناواقف نہ رہیں۔ مگر اخبارات کا حال یہ ہے کہ ان میں بحثوں اور اختلافی نوٹوں میں، بڑے گھٹیا جذبات استعمال کئے جاتے ہیں۔ فکاہی کالموں میں حریفوں پر

کیچڑ اچھالنے کی دہ وہ مثالیں پیش کی جاتی ہیں کہ جو پڑھے عش عش کر اُٹھے۔ اِدھر سینما کے اشتہاروں کی تصاویر اور عبارات ہیں کہ بڑھی چلی آرہی ہیں۔ اگلے دن کا ذکر ہے کہ میرا بچہ مجھ سے پوچھتا ہے۔ کہ "ابا! رومان کیا ہوتا ہے"؟ اس سے پہلے میری چھوٹی لڑکی نے ایک عورت کی نیم برہنہ رنگین تصویر دکھا کر مجھ سے کہا کہ یہ میری پیاری امی ہیں۔ دوسری لڑکی نے بھی ایک مرتبہ ایک ایکٹرس اور ایکٹر کی اشتہاری تصویر دکھا کر سوال کیا کہ ابا یہ اس طرح کیوں کر رہے ہیں؟ ——— اب میں آپ کو کیا بتاؤں کہ "اس طرح" کا مفہوم کیا تھا۔ اسی طرح بڑا لڑکا ایک اخبار دکھا کر مجھ سے پوچھنے لگا کہ یہ لفظ "لیکوریا" کیا ہوتا ہے۔ ایسے ایسے جو واقعات ایک ذہنی قیامت بن کر مجھ پر گزرے ہیں ان کے پیشِ نظر بارہا جی چاہا کہ ان اخبارات کو روزانہ پڑھنے سے پہلے اور پڑھنے کے بعد...... خصوصاً ان کے لغویات کے عین اوپر...... بچوں ہی کے ہاتھوں سے اٹھارہ اٹھارہ جوتے لگوائے جایا کریں، جیسے کسی کو اٹھارہ گولوں کی سلامی دی جاتی ہے۔ ان کاغذوں پہ روزانہ بڑے مہلک قسم کے اخلاقی امراض کے جراثیم چھپک چھپک کر بھیجے جاتے ہیں اور کتنے ہی ذہنی زہر ہیں کہ جن سے ذہن کو آلودہ کر کے اشاعت کے دفتروں سے نکالا جاتا ہے۔ ہم ان جراثیم اور زہروں کو پیسے دے دے کر خریدتے ہیں۔ جوان کو پسند کرتا ہے وہ بھی خریدتا ہے اور جو ان سے کراہت کرتا ہے وہ بھی خریدتا ہے۔ لیڈر بھی خریدتے ہیں، مولوی اور امام بھی خریدتے ہیں، معلمینِ اخلاق اور مصلحینِ قوم بھی خریدتے ہیں۔ آپ بھی خریدتے ہیں اور میں بھی خریدتا ہوں۔ میں خریدنا نہیں چاہتا ہوں مگر خریدتا ہوں، ہم سب زمیندار اور آفاق خریدتے ہیں۔ ادبِ لطیف اور فلمی اسٹار خریدتے ہیں۔ نفسیات اور جنسیات خریدتے ہیں۔ شمع اور مست قلندر خریدتے ہیں "مرر" اور "سن بائتھ" خریدتے ہیں۔ ہم ان کو معلومات کے لئے خریدتے ہیں اور معلومات کے ساتھ اخلاق باختگی ہمارے پلّے پڑتی ہے۔ ہم ان سے تفریح حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن تفریح کے ساتھ تخریب ہمارے سر مڑھ دی جاتی ہے۔ اب فرمائیے کہ آپ کے اور میرے چاہنے اور نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔

چاہنے کو تو میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ ہسپتال روڈ کے فٹ پاتھ پر جذامی اور لنگڑے اور لولے گا گا کر، فریاد کر کر کے سر جھکا جھکا کر، کٹے ہوئے اعضا دکھا دکھا کر راہگیروں سے ایک ایک پیسہ اگلوائیں۔ کیوں نہ حکومت ان کے لئے ادارات قائم کرے۔ اور عوام کو انفاق فی سبیل اللہ کی تعلیم دے...... لیکن میرا یہ نہ چاہنا ویسا ہی ہے جیسے میں یہ نہیں چاہتا ہوں کہ میرے وطن کی سرزمینِ مقدس میں سیفٹی ایکٹ کا دبدبہ چلے اور اس کی منڈیوں اور صنعت و زراعت پہ ڈالر کی حکمرانی ہو اور بادشاہِ انگلستان سے ہمارا سیاسی پیری مریدی کا رشتہ قائم رہے۔ اور کامن ویلتھ کی سازش میں ہم مسکین بن کر شریک رہیں۔ لیکن آخر میں یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ آپ کے اور میرے چاہنے نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے چاہتے رہیے اور نہ چاہتے رہیے!

اب میں اپنے دفتر ہی میں جس صورتِ حالات سے دوچار رہتا ہوں وہ یہ ہے کہ میرے ساتھی کلرک "صاحب" (واضح رہے کہ انگریزی صاحب کے جانے کے بعد اس کی کرسی پہ اب جو بھی بیٹھتا ہے۔ صاحب ہی کہلاتا ہے) کو فرشی سلام کرنے میں اور خوشامدی کلمات سے راضی کرنے میں ایک دوسرے سے روز مسابقت کرتے ہیں۔ مجھے یہ طبعاً گوارا نہیں کہ اپنی خودی اور عزت اور اپنے احساسِ انسانیت کو الفاظ کی ایک خوشنما طشتری میں سجا کر کسی کے سامنے بطور ہدیہ پیش کروں۔ کیونکہ میرے نزدیک جھکاؤ اگر ہو سکتا ہے تو صرف ایک اللہ کے لیے۔ مگر اگر میں اپنے مزاج کے اس تقاضے پہ جم جاؤں تو مجھے پہلے تو طرح طرح سے یہ جتایا جائیگا کہ جب اتنے ہی خوددار اور غیور تھے تو ضمیروں کی اس منڈی

میں آئے ہی کیوں تھے ـــ اور جب اس پر بھی میں سیدھا نہ ہونگا تو مجھے کسی نہ کسی طرح نوکری سے نکال باہر کیا جائیگا۔ بلکہ الاٹمنٹ کے مکان سے بھی۔ اور پھر میرے لئے سوائے اس کے کوئی راستہ نہ ہوگا کہ اپنے ہاتھ یا پاؤں کے نیچے خود ہی کاٹ کر ہسپتال روڈ کے فٹ پاتھ کے فقیروں میں جا بیٹھوں۔ فرض کیجئے کہ مجھے نوکری سے نکالنے کے لیے عالمِ بالا کوئی کامیاب تدبیر نہ نکال سکے تو میری ترقی کے راستے میں تو لازماً دیوارِ چین کھڑی ہو جائیگی۔ اس لئے دوسرے کلرکوں سے نمونہ لے کر انہی کی طرح ایکٹنگ کرتا ہوں اور انہی سے مناسب الفاظ اور تقرے سیکھتا ہوں جو "صاحبوں" کے سامنے گفتگو اور تحریر میں استعمال کرنے چاہئیں۔ بلکہ دس بارہ بوتلیں شہد کی خرید لیتا ہوں اور وقتاً فوقتاً محکمے کے اوپر والے "یتیموں" میں ان کی خیرات کرتا رہتا ہوں۔ کہتے ہیں کہ خیرات کا بدلہ اللہ میاں "دہ در دنیا اور ستر در آخرت" کے فارمولے سے دیتے ہیں بھائی اتنا تو آپ مانیں گے کہ حدیث میں مسلمانوں کو باہم بھائیوں کی طرف ہدیہ و تحفہ دینے کی تاکید کی گئی ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اس ہدایت پر عمل کرنے سے محبت بڑھتی ہے۔ بے تکلفی پیدا ہوتی ہے۔ بدگمانیاں دُور ہو جاتی ہیں۔ شکایتیں اور گلے دُھل جاتے ہیں اور دل اور دل میں جوڑ پیدا ہوتا ہے۔ آپ کہیں گے کہ یہ مصنوعی استدلال ہے اور شریعت کا یہ اُلٹا استعمال ہے اور ایسی جسارت نہیں کرنی چاہیئے۔ واقعہ یہی ہے کہ کرنا میں بھی نہیں چاہتا مگر ماحول کی طاقت ہے کہ یہ سب کچھ کرا لیتی ہے۔

اب بات چھڑی ہے تو فاش کرنے کی کچھ اور چیزیں بھی کیوں نہ فاش کر دوں۔ ہمارے بجلی کے دفتر میں عمل دستِ غیب بھی بہت ہوتا ہے۔ خصوصاً نیا میٹر لگوانے کی درخواست جب کبھی بھی آئی ہے تو ہمارے کلرک اسے بغیر اس کے قبول نہیں کرتے کہ اس پر مقررہ اسٹیمپ فیس ادا کی گئی ہو۔ گھریلو میٹر کے لیے یہ فیس سو روپے ہے۔ اور صنعتی میٹر کے لیے ڈھائی سو سے ایک ہزار تک۔ یہ فیس وصول ہونے کے بعد نیچے سے اوپر تک کے لوگوں میں ایک مقررہ تناسب سے بٹ جاتی ہے۔ "صاحب" کو ۵۰ فیصدی ملتا ہے اور بقیہ میں سے ۲۰ فی صدی ہیڈ کلرک کے اور ۳۰ فیصدی سارا کارنامہ انجام دینے والے کلرک کے ہوتے ہیں۔ میرا ضمیر کہتا ہے کہ کہ اس قوم دشمنی کی کارروائی میں حصہ لینا اسلام میں بھی حرام ہے اور یوں بھی ایک اخلاقی جرم ہے۔ لیکن اگر میں اس کاروبار سے بچنا چاہتا ہوں تو سارا عملہ مجھے تنگ کرتا ہے۔ مجھ سے بحث کی جاتی ہے۔ میرا مذاق اُڑایا جاتا ہے اور آخر کار میری شکایتیں ہونے لگتی ہیں۔ علاوہ بریں جب کوئی عزیز یا دوست کسی طرح کا کام لے کے میرے پاس آتا ہے۔ تو مجبوراً مجھے دوسرے ساتھیوں کو اپنے ہاتھ سے "ھٰذا من فضلِ ربی" کا مالِ غنیمت دلوانا پڑتا ہے۔ اب میں سوچتا ہوں کہ "گنہگار بھی ہوں اور گناہ بھی نہ ہوا"۔ ملّا کی کرلی تو پیشہ کرنے سے گریز کیوں؟ گڑ کھاؤں اور گلگلوں سے پرہیز۔ چنانچہ گلگلے کھانے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔ کام بڑا بُرا ہے۔ لیکن لے کے کرنے سے صاحب سے لے کے عملے تک ہی سب لوگ راضی نہیں ہو جاتے۔ بلکہ خود میری بیوی بھی اُسی روز زیادہ فدا کار بنتی ہے جس روز اس طرح کا مالِ غنیمت لے کے گھر جاتا ہوں۔ اب آپ سمجھ گئے ہونگے کہ میرے چاہنے نہ چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔

میں مسلسل تجربات سے یہ مان گیا ہوں کہ "ہوتا ہے وہی جو منظورِ خدا ہوتا ہے"۔ تقدیر کا مسئلہ برحق ہے۔ بندہ مجبور ہے۔ فیصلے اوپر سے ہوتے ہیں اور یہ پہلے سے لکھ دیا گیا ہے کہ کس کو دوزخ میں جانا ہے اور کس کے لئے جنت آراستہ کی گئی ہے۔ لوگ "ماحول ماحول" کے لفظوں سے جس حقیقت کو بیان کرتے ہیں وہ یہی مشیتِ الٰہی

بقیہ برصفحہ

مُقوّیات کا سرتاج، سلورین پلز

مردوں کے لئے ایک اچھا متوازن اور آج کل کا آزمودہ جنرل ٹانک ہے جو بھوک کو بڑھاتا ہے اور جسم میں تازہ اور سُرخ خون پیدا کرتا ہے۔ قوت اور طاقت پیدا کرتا ہے۔

سلورین پلز

پر آپ بھروسہ کرسکتے ہیں۔ قیمت ۴۰ گولی چار روپے بارہ آنے ۔ ۸۰ گولی نو روپے (للعہ)

فیملین (نِسائی خاص)

یہ گولیاں عورتوں کی جملہ پوشیدہ شکایتوں کو دور کرنے میں اکسیر ہیں سیلان ماہواری کی بے قاعدگی اور اسی قسم کی دوسری زنانہ شکایتوں سے پیدا شدہ نقائص کو دُور کرنے میں لاثانی ہیں۔ استقرارِ حمل کو مدد دیتی ہیں، گویا عورتوں کے لئے ایک جنرل ٹانک ہے جس کا متواتر استعمال عورتوں کے نظامِ عصبی کو درست کرتا ہے، جن عورتوں کو اسقاطِ حمل کی بار بار شکایت ہوتی ہو اُن کے لئے بے حد مفید ہے۔

قیمت مکمل کورس :۔ ۴۰ گولی ۲۰ یوم کی خوراک دو روپے بارہ آنے (۱۲/۲)

حاذق دواخانہ۔ بندر روڈ۔ کراچی

روح افزا
DAWAKHANA

اسلامی ادب کا علمبردار

ماہنامہ

چراغ راہ

کراچی

مندرجات

ہندوستان

جون ۱۹۵۲ء

قیمت فی پرچہ

پاکستان ـــــ ۸ر

بھارت ـــــ ۱۰ر

جلد ـــــ شمارہ ۷

چندہ سالانہ

پاکستان [illegible] روپے

بھارت [illegible] روپے

دفتر چراغ راہ ملا ٹیا بلڈنگ آرام باغ روڈ کراچی

سوچ بچار

سیکورٹی ایکٹ

سیفٹی قوانین کے خلاف پبلک کی طرف سے جتنا احتجاج ہوا ہے اور رائے عام جس جذبے سے ان کا استقبال کرتی رہی ہے اس کے پیش نظر ہم پوری جرأت کے ساتھ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو چیلنج کرتے ہیں کہ وہ ان قوانین کے لئے ایک مرتبہ استصواب کر دیکھیں۔

لیکن ہماری حکومت بغیر استصواب کے جانتی ہے کہ ان قوانین کیلئے رائے عام کی تائید کہاں تک حاصل ہے چنانچہ رائے عام کے جذبات کے خلاف اس طرح کے کالے قوانین کو جو ہمارے ملک کی رولنگ کلاس کیلئے محافظت خود اختیاری کے اسلحے ہیں، جاری رکھنے کیلئے حکمران کی ساحری عجیب عجیب حیلے نکال رہی ہے۔ ایک ہی قانون کو اس کی ایک دو دفعات میں اور کسی حد تک اس کے الفاظ کی ترتیب میں فرق پیدا کر کے بار بار سامنے لایا جاتا ہے اور پبلک کو دھوکا دیا جاتا ہے کہ یہ اب تو تمہاری شکایات کا بالکل ازالہ کر دیا گیا ہے۔ دیو استبداد ایک ہی ہے مگر اس کم بخت کو نت نئے لباسوں میں لایا جاتا ہے۔

مرکز کی طرف سے جو پبلک سیفٹی آرڈی نینس تلوار بن کر عوام کے شہری حقوق کے سروں پر لٹک رہا تھا، بلکہ جس نے اپنی کاٹ برابر دکھائی ہے، اسے واپس لیکر بظاہر ایک نیا قانون لا کھڑا کیا گیا ہے۔ اس مرتبہ بہت بڑی تبدیلی تو یہ ہے کہ نام بدل دیا گیا ہے تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ سیفٹی ایکٹ تو کوئی اور جانور تھا اور سیکورٹی ایکٹ بالکل دوسرا حیوان ہے۔ مگر یہاں کھال بدلی گئی ہے جانور نہیں بدلا گیا۔ لیبل بدلا گیا ہے مگر بوتل کے اندر جو ہلاہل بھرا پڑا تھا وہ اب بھی زہر ہی ہے۔

تفصیل سے تو اس پر کچھ لکھنے کیلئے اشاعت ستان میں جگہ ہی نہیں رہی۔ مجملاً اس ایکٹ کے اہم اجزاء سے قارئین کو تعارف کرایا جاتا ہے:۔

۱- اس ایکٹ کی میعاد نفاذ تین سال مقرر ہو گئی ہے۔

۲- اس بل کا ایک بڑا مقصد یہ ہے کہ ایسے افراد جن سے پاکستان کے وجود یا اس کے دفاع یا اس کے خارجی مفاد کو کوئی ضرر پہنچے ان کو عدالتی کارروائی کے بغیر انتظامیہ نظر بند کر سکے۔

۳- ایسے نظر بندوں کو ایک مہینہ کی مدت میں تحریری طور پر ان وجوہ کی اطلاع دی جائے گی جو باعث نظر بندی ہوں۔

۴- ان وجوہ کے خلاف تین مہینہ کی مدت تک وہ اپنا تحریری اظہار پیش کر سکتا ہے۔

۵- کسی نظر بند کے وجوہ نظر بندی کا جائزہ لینے کیلئے جب حکومت ضرورت محسوس کرے ایڈوائزری بورڈ کا تقرر عمل میں لائیگی۔ یہ بورڈ ایسے دو افراد پر مشتمل ہوگا جو ہائیکورٹ کے جج ہوں یا اس منصب کیلئے صلاحیت رکھتے ہوں۔ یہ بورڈ کسی شخص کی نظر بندی، کسی اخبار کی بندش یا کسی جماعت کے خلاف قانون قرار دیئے جانے کے احکام و وجوہ کی نظر ثانی کرے گا۔

۶- ایک سال تک کے عرصے میں ضروری نہیں ہے کہ حکومت کسی نظر بند کا معاملہ ایڈوائزری بورڈ کے سامنے لائے۔ البتہ ایک سال کے بعد بھی نظر بندی کو جاری رکھنا ضروری ہو تو پھر حکومت کو معاملہ لازماً بورڈ کے سامنے لانا ہوگا۔

۷- بورڈ کے سامنے نظر بند کو اصالتاً یا وکالتاً پیش ہونے کی اجازت نہ ہوگی، بلکہ بورڈ کا تو اس کا مجاز ہی نہ ہوگا کہ وہ نظر بند کو اصالتاً یا وکالتاً پیش ہونے کے لئے طلب کرے یا اسے اس کی اجازت دے سکے۔ نیز نظر بند کوئی گواہ بھی پیش نہیں کر سکے گا۔

۔ معاملہ نظر بندی میں نظر بند کا جواب [illegible] فیصلہ کرنا اس کا کام نہیں۔

۹۔ فیصلہ کرنے والی عدالت خود حکومت مغربی پاکستان ہو گی۔

اس کے ساتھ ساتھ پریس کو ٹھیک کرنے کے لئے یہ والی فیصلے کئے گئے ہیں۔

۱۔ حکومت ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر کو کسی خبر یا پمفلٹ کے بارے میں ذرائع معلومات کے افشا پر مجبور کر سکتی ہے۔

۲۔ حکومت کسی اخبار کو ہدایت کر سکتی ہے کہ قبل اشاعت اس کا سارا یا کوئی خاص حصہ کسی شخص مجاز کے سامنے منظوری کے لئے پیش کیا جائے۔

۳۔ کسی اخبار، جریدے، پمفلٹ یا دوسری مطبوعات کی اشاعت کو کلی طور پر یا جزوی طور پر حکومت روک سکتی ہے۔

۴۔ اختیارات کی تکمیل کے لئے حسبِ معمول ایک دفعہ کے تحت یہ طے کیا گیا ہے کہ اس ایکٹ کے تحت صادر ہونے والا کوئی حکم یا عمل میں آنے والی کوئی کارروائی کسی عدالت میں زیرِ بحث نہیں لائی جائے گی۔ نیز اس ایکٹ کے مطابق اقدام کرنے والے کسی شخص کے خلاف کوئی قانونی کارروائی نہ ہو سکے گی اور نہ کسی جائداد کو پہنچنے والے نقصان کے متعلق کچھ کیا جا سکے گا!

یہ ہے بینادی آزادیوں کا نعم البدل! ـــــــ زندہ باد!

ہم اس ایکٹ کے تقاضوں پر کوئی تفصیلی تجزیہ کئے بغیر اور اس پر رائے زنی کئے بغیر صرف اتنا ہی عرض کریں گے کہ یہ ایکٹ اب ایک کھلا کھلا سوال بن کر پاکستان کے شہریوں کے سامنے کھڑا ہے اور وہ سوال یہ ہے کہ:۔

یہ ملک مردوں کا قبرستان ہے یا زندوں کا وطن ہے؟

یہاں بے شعور بھیڑ بکریاں اور ڈھور ڈنگر بستے ہیں یا سوچنے سمجھنے والے انسان؟

یہ سلطنت ایک خاص گروہ کی جاگیر ہے یا آزاد کروڑ افراد کا وطن؟

رفیعہ صدیقی ۱۱ جون

؟

بقیہ روپے کا زمانہ

ہے، وقتاً فوقتاً ختم درود ہوتا رہتا ہے، میلاد کی مجلس کے لئے چندہ آتا ہے، بعض لوگ جب ملک جلال دین کے لئے دعا ہوتی سنتے ہیں اور وہ بھی لمبی عمر یعنی جبا نتوں میں تو وہ بھی اٹھ کر کہتے ہیں کہ بھائیو! میری بیوی یا میرا دامادیا میرا چچا بیمار ہے اس کے لئے بھی دعا کر دینا۔ لیکن یہ دعا کچھ ادھوری ہے اور ملک جلال دین والی دعا بالکل اور ہوتی ہے۔ یہ دعا مرجھائی ہوئی سی ہوتی ہے، بے دل سے ہوتی ہے اور چھوٹی سی ہوتی ہے اور امام صاحب اس قسم کی دعاؤں کے ذریعہ فساد پیدا کر دیتے ہیں۔ وہ نہ تو کچھ تمہیں اور دعائیں کرتے پھرتے ہو۔ تم ملک جلال دین کے ساتھ برابری نہیں کر سکتے۔ اس کے ہاں سے سب کچھ آتا ہے اور تم مہینوں تمہیں پوچھتے ہو کہ امام مسجد کا کیا حال ہے! چنانچہ بعض سمجھدار آدمی جب دعا کرانا چاہتے ہیں تو نماز سے پہلے ہی امام کو الگ مل کر روپیہ دو روپیہ یا کھانا یا کپڑا پیشکش کر دیتے ہیں۔ اس طرح دعا اچھی خاصی باعزت ہو جاتی ہے۔

آپ کا مقصد ہو تو روپیہ چاہئے کیونکہ قرآن بھی روپے کے عوض بکتا ہے۔ دانت نکلوا لیجئے تو روپیہ دیجئے، پیشاب اور تھوک اور جسم ٹیسٹ کرائیے تو روپیہ رکھ دیجئے، اپنے بیت الخلا میں پاخانہ فرمانے کیلئے روپیہ کی ضرورت ہے۔ آپ تمباکو نوش ہوں تو چلم سلگانے کے لئے گوبر کے اپلے اسی طرح ایک آنے کے دس ملیں گے جیسے یو پی میں آم ـــــ جنازہ پڑھائیے تو فیس ادا کیجئے، قبر کھدوائیے تو نذرانہ دلوائیے۔ اتنے تک تو خیر تھی خود انسانیت ایک دکان بن گئی ہے جس میں نون، تیل، ادرک کی بجائے ہمدردی، برادر نوازی، خندہ پیشانی، توجہ وغیرہ کی جنسیں روپے کے عوض بکتی ہیں۔ پھر کیا اسے روپے کا زمانہ کہنا غلط ہوگا؟ روپیہ پاس ہو تو لوگوں کے ایمان اور ضمیر خریدئیے، صحافیوں اور ادیبوں کے دماغ خریدئیے، سیاسی پارٹیوں کی مجلسیں خریدئیے، بڑے اہم راز خریدئیے، پرنٹنگ پریس کی امداد دے کر قوموں کی آزادیاں خریدئیے، فتوے اور سند خریدئیے، دوستیاں اور محبتیں خریدئیے ـــــ اور پیسہ نہ ہو تو ماضی کے گن گائیے اور حال کا ماتم کرتے رہئیے اس کے علاوہ اور آپ کس کام کے ہوں گے!

روپے کا زمانہ ہے! ـــــــــ یہ روپے کا زمانہ ہے!

چراغِ راہ کا شعر نمبر

(۲)

انفرادی تبصرہ

عاصی ضیائی رامپوری

(نوٹ: عاصی ضیائی کے تبصرے کی یہ دوسری قسط اسلامی ادب کی دنیا میں پہلی مرتبہ بے باکانہ تنقید کا راستہ کھول رہی ہے۔ اب تک جس مرحلے میں ہم تھے وہ باہم دیگر حوصلہ افزائی کا، اور باہر کے لوگوں کی حد تک تعارف کا مرحلہ تھا مگر یہ تنقید ہمیں اس مرحلۂ اول سے نکال کر نئے مرحلے میں داخل کر رہی ہے دیں بریں یہ کوشش بڑی "تاریخی" قسم کی ہے اور توقع ہے کہ یہ ہمارے حلقہ میں تنقیدی حس کے لئے محرک ثابت ہوگی۔

یہ نہ معلوم ہو سکا کہ عاصی صاحب نے اپنی پہلی قسط میں جن افراد کو خاص طور پر چُنا تھا ان میں سے ایک کو ساقط کیوں کر دیا اور ترتیب بھی نجانے کیوں بدل دی۔ تاہم رائے بدلنے کا حق نقاد کو حاصل ہے۔

اس کا افسوس ہے کہ صرف چار شعراء کو سامنے لا کر شعر نمبر کے بہت سے دوسرے صاحب صلاحیت نوجوان شعراء کو ان کی ادب میں بالکل ختم کر دیا گیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کیا جا سکتا تھا کہ بعض شعراء کا تفصیلی تذکرہ کرنے کے بعد بعض پر ایک اجمالی نگاہ ڈال لی جاتی۔ لیکن ناقد سے کوتاہی ہو گئی ہے۔

ناقد کا مقام جج کا سا ہوتا ہے لیکن تنقید کی عدالت کا معیارِ فیصلہ صرف زبان و فن کا اٹل قانون ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ناقد کا ذاتی ذوق بھی شامل ہوتا ہے۔ اس ذاتی ذوق کی وجہ سے ناقد بسا اوقات ایسی رائیں بھی دیتا ہے جن سے اس کی کرسی پر بیٹھنے والے کسی دوسرے ناقد کو انتہائی اختلاف ہو سکتا ہے لیکن قاعدے کی بات ہے کہ جج سے بحث نہیں کی جا سکتی ورنہ سارا نظامِ عدالت خطرہ میں پڑ جاتا ہے۔ بنا بریں اپنے دوسرے ناقدانہ شعور رکھنے والے رفقاء سے ہم گزارش کریں گے کہ وہ جج صاحب سے بحث نہ کریں ورنہ "توہینِ عدالت" ہو جائے گی۔ چراغِ راہ میں یوں بھی آئندہ کی دو مسلسل خاص اشاعتوں میں ایسی کوئی چیز شائع کرنے کی گنجائش ہی نہیں رکھتا۔

کسی مخلص اور ذہین ناقد کی سخت تنقید کے معنی ہرگز یہ نہیں ہوتے کہ وہ اپنے "موکل" کے خلاف نفرت پیدا کرنا چاہتا ہے یا اسے اس کے مقام سے گرانے کے درپے ہے بلکہ حقیقت میں وہی شاعر و ادیب خوش نصیب ہوتا ہے جس پر ایک مخلص و ذہین ناقد تنقید کا سب سے زیادہ بھرپور وار کرے!

یہ باتیں اس لئے کہنی پڑیں کہ ہمارے رفقاء بہتر سے بہتر زاویۂ نگاہ لے کر اس مقالے کا مطالعہ کریں۔ — ان جملی پہلی قسط میں ہم سرسری جائزہ کے تحت شعر نمبر میں عام نظموں کا اجتماعی مزاج، رجحان اور آئندہ توقعات کا اندازہ کر چکے ہیں۔ اب چند قابل ذکر

والوں پر تبصرہ مقصود ہے لیکن آگے بڑھنے سے قبل ایک بار پھر معذرت کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ پچھلے مقالہ میں میری انتہائی کوشش رہی کہ اچھی بے لاگ رائے لکھی جائے اس کے باوجود بعض رفیقوں کو مجھ سے جانبداری اور سہل نگاری کی شکایات رہی اور زیرِ نظر مقالہ پر شاید یہ شکایات اور تند و تلخ ہو جائے کیونکہ سابق مقالہ بہرحال اجتماعی اور عمومی جائزہ پر مشتمل تھا اور اس میں بھی اگر احباب کے خیال میں کچھ قابلِ اعتراض باتیں تھیں تو یہ تو شاید انفرادی تبصرہ کی بنا پر پہلے سے بھی زیادہ سامانِ گلہ اپنے اندر رکھتا ہو لیکن اگر ہمارے ساتھی یہ جان لیں کہ میں کوئی اچھا کیا معنی معمولی نقاد بھی نہیں نہ اس کا مجھے کبھی دعویٰ ہی تھا، تو کم از کم مجھ پر "معاصرانہ چشمک" کا شبہ کرنے کی بجائے مجھ سے وابستگیٔ تحریک کے خلوص کی امید ضرور رکھیں گے۔

ماہر القادری پچھلے پندرہ سال کے اندر اردو شعراء کی ایک کثیر تعداد اتنی جلد آسمانِ ادب پر جلوہ گر ہوئی اور آناً فاناً ملک بھر کے گوشے گوشے میں مقبول ہو گئی کہ تعجب ہوتا ہے لیکن شاید اس سے بھی بڑھ کر تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ شہابِ ثاقب جتنی تیزی سے چمکتے ہوئے چھوٹے تھے اتنی ہی تیزی سے مٹ بھی گئے۔ شکیل بدایونی، خمار بارہ بنکوی، ساغر نظامی، احسان دانش، اقبال صفی پوری اور کتنے ہی دوسرے خوش گو طوفان کی طرح اٹھے اور حباب کی طرح بیٹھ گئے۔ لیکن ماہر ان کے درمیان مستثنیات میں سے ہے۔ اس نے عروج کے زینے کی ہر سیڑھی پر نہایت آہستگی اور اطمینان کے ساتھ قدم اٹھایا اور دن گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنی ادبی ساکھ بڑھاتا چلا گیا۔ کم از کم ابھی تک میدانِ ادب کا وہ سپاہی ہے جو پیچھے نہیں ہٹا اور آئندہ بھی کوئی امید نہیں کہ اپنا مقام چھوڑ سکیگا۔ لیکن مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ اب تحریکِ اسلامی کے ساتھ وابستگی کے بعد ماہر آگے نہیں بڑھ رہا میرے پیشِ نظر اس وقت ماہر صاحب کا سابق مجموعۂ کلام نہیں، ورنہ مثالوں سے واضح ہو سکتا کہ "محسوسات" والا ماہر اب کچھ ٹھٹک سا گیا ہے اگرچہ اس وقت بھی ان کے ہاں سوز و گداز ابتہاج اور ندرتِ فکر کا اچھا خاصا سامان تھا، لیکن تحریک میں آ کر متانت کے ساتھ ساتھ ایک طرح کی موت ([illegible]) آگئی ہے۔ البتہ کثرتِ مشق کی وجہ سے جو چیز ان کے تمام شعروں میں ہمیں متاثر کرتی ہے وہ ان کی سلاست، برجستگی اور چستیٔ بندش ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پے در پے کئی مصرعے نہایت بے ساختگی کے ساتھ مشینی انداز میں موزوں ہوتے چلے جاتے ہیں ؎

اسلام کا پرچم نہ جھکا ہے نہ جھکیگا — پھونکوں سے یہ فانوس بجھا ہے نہ بجھیگا

جبرِ باطل سے گزرنے کا زمانہ آیا — صرف اللہ سے ڈرنے کا زمانہ آیا

مفلسی ہے اور بے کاری بھی ہے — رشوتوں کی گرم بازاری بھی ہے

یقیں کی آتشِ خاموش کو بھڑکا دیا تو نے — کہ مصری نوجوانوں کا لہو گرما دیا تو نے

بھٹکے ہوؤں کو راہ دکھاتے ہوئے چلو — ایقاں کے چراغ جلاتے ہوئے چلو

میں نے صرف ایک ایک شعر عموماً مطلعوں پر اکتفا کی ہے ورنہ یہ ان کے علاوہ دوسری تمام نظمیں پوری کی پوری ایسی ہی بے ساختہ اور برجستہ ہیں۔ مگر جہاں یہ فنی پختگی دیکھ کر ذہن تعریف خیز تعجب ہوتا ہے وہیں یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ ماہر نے شعر میں نئے تجربوں سے گریز کیا ہے۔ ان کے ہاں نئی ترکیبیں، الفاظ کے نئے معنی، اپنی وضع کردہ اصطلاحیں نہیں ہیں حتیٰ کہ نظم کی ہیئت (FORM) اور اسلوب (TECHNIQUE) جدت سے خالی ہیں مانو لگے بندھے ضابطوں پر جو متقدمین نے وضع کر دیے ہیں ماہر کی شاعری قدم قدم بڑھی جا رہی ہے اس سے شاعر کی محتاط اور ایک حد تک مرنجاں مرنج طبیعت کا اظہار ہوتا ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ انسانی فکر و عمل کی ہر نوع میں جری مجتہدانہ اقدام ہی قبولیتِ دوام بخش سکتا ہے۔ ایسے اقدام میں خطرے بھی ہوتے ہیں اور اکثر اقدامات کا انجام ناکامی بھی ہوتا ہے، لیکن جو لوگ عہد بدریا در منافع بے شمارست پر نظر رکھتے ہیں وہ ان نکلتوں کو خاطر میں نہیں لاتے۔ البتہ دھیمی اور منکسر طبیعتیں عہد دگر خواہی سلامت برکنار است پر عمل کرنا پسند کرتی ہیں۔ شاعری کا بھی یہی حال ہے، اور اگر ماہر صاحب تحریکِ اسلامی کے شاعروں کو زندگی کے ادب میں سرخرو کرنا چاہتے ہیں تو انہیں اس پرعافیت تقلید کو خیرباد کہہ دینا چاہئے موجودہ حیثیت میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی طبیعت پر جبر کر کے شعر کہتے ہیں۔ ان میں وہ حقیقی واردات اور ولولہ جو کسی نصب العین عشق کا ثمرہ ہوتا ہے پیدا نہیں ہوا۔ وہ حقیقی جوشِ تاثر جو از دل خیزد بر دل ریزد کی شان کا مظہر ہو ابھی ان کے ہاں نہیں آیا۔ تحریک سے وابستگی کے قبل بھی یہ جذبہ غالباً مفقود تھا لیکن طبیعت پر کوئی پابندی نہ تھی اور فکر کی راہیں بے شمار [illegible]

بہت سے پرانے مسلم الثبوت اساتذہ کے لئے بھی مایۂ رشک ہو سکتی ہے، اور لوگ اسلام پسند شعراء میں ایک شخص میں حسرت اور اصغر کا امتزاج دیکھ کر جان سکتے کہ اسلام کا فکر و نظریہ غالب آ جانا ذوقِ شعر کو پاکیزہ بنانے میں کس حد تک کام کرتا ہے۔

عاصی کرنالی پچھلے مقالے میں میں نے عاصی کرنالی کو اسلامی شعراء کی بزم میں اپنے ذوق کے بموجب سرِ فہرست رکھ دیا تھا۔ آج کی صحبت میں اس اجمال کی تفصیل مقصود ہے۔ میری نظر سے عاصی کی ایک آدھ ایسی نظم بھی گزری جو اسلام پسند شاعری میں نہیں شمار ہو سکتی، لیکن اسکو دیکھ کر کم از کم یہ ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ عاصی پہلے بھی اک خوش فکر اور صحیح واردات کا شاعر تھا اور تحریک سے وابستہ ہونے کے بعد بھی وہ کم از کم اپنی قوتِ شاعری کے اعتبار سے نہیں بدلا۔ صرف یہی ایک بات کسی شاعر کے لئے سرمایۂ افتخار ہو سکتی ہے اور جہاں تک میں نے مطالعہ کیا ہے ہمارے گروہ میں ابھی تک کسی کو یہ بات میسر نہیں۔

عاصی کی شاعری فکر کے اعتبار سے تو کوئی نئی شئی نہیں۔ البتہ اسلوب و انداز میں وہ موجودہ تمام اردو شاعروں کی صفِ امتیاز میں بیٹھنے کے لائق ہے ایک عام خیال کو خوبصورت پیرایۂ شعر عطا کرنا یوں بھی شاعر کو ایک بلند مرتبہ بخشتا ہے، نہ کہ جب وہ خیال بھی عام حالات کے تحت شاعری سے دور پسندیدہ سمجھا جاتا ہو۔ ہمارے قدیم فارسی اور اردو شعر کے ہاں اگر اسلام پسندی پائی جاتی ہے تو زیادہ تر اس کا تعلق محض کسبِ ثواب کے جذبے سے ہوتا ہے۔ چنانچہ یا تو اسلام کا اظہار کرنے والے شعراء معمولی حیثیت کے "میلاد خواں" قسم کے ہوتے ہیں، یا اچھے شاعروں نے بطور تبرک اپنے دیوان کے شروع میں حمد و نعت پر مشتمل ایک آدھ غزل کہہ کر ٹال دی ہے اور وہ بھی ایسی جو ان کی عام شاعری کے مقابلے میں بہت پست ہے۔ کیونکہ اس پر کاوش کرنا بھی انہوں نے فضول سمجھا اور حقیقت بھی یہ ہے کہ کسی غزل یا نظم اُن کی عام شاعری سے اتنی ہی مختلف ہو سکتی تھی جتنی کہ اُن کی عملی زندگی ان کے عقائد سے۔ جب اُن کی پوری شاعری ان کی زندگی کی طرح شراب و شاہد کی تعریف، شعائرِ دینی کے تمسخر، خدا اور انبیاء وغیرہ کے گستاخی میں گزری ہو، تو وہ محض ایک آدھ غزل حصولِ تبرک یا پابندئ رسم کی خاطر لکھنے کیلئے اس سے زیادہ کیا کر سکتے ہیں کہ سیدھے سادے عقائد موزوں و مقفی عبارت میں نظم کر ڈالیں؟ بس یہی کل کائنات ہے ان کی دینی شاعری کی۔

البتہ اسلام میں سے دو چیزیں ان حضرات نے موضوعِ شاعری کیلئے ایسی چُن لیں جنکو اتنا غیر اہم نہیں کہا جا سکتا۔ ایک تو تصوف و اخلاق اور دوسرے نعتِ رسول کریمؐ۔ سو اول الذکر جس طرح متاخرین صوفیہ کی غلطی سے ہر رطب و یابس فلسفے کو گورکھ دھندا بنا دیا اسی طرح شعراء نے بھی اس میں ہر عجمی و جاہلی تصور کی خوب رنگ آمیزی کر کے اصلیت سے دور ہٹا دیا اور اس کا مقصد یہ نہ رہا کہ شاعری کو اسلامی قدروں کا پابند کیا جائے بلکہ اس کو بھی اپنے پورے جاہلی نظامِ فکر میں درست بیٹھنے کے قابل بنا کر نازک خیالی اور بلند پروازی کے کمالات دکھلائے جائیں۔ رہی نعت، جس پر لکھنے والے ہمارے بعض بہت اچھے شاعر بھی ہیں، اس میں یہ بات تو ضرور نظر آتی ہے کہ "باخدا دیوانہ باش و با محمدؐ ہوشیار" پر ہمیشہ کاربند رہے، لیکن چونکہ اس مبارک ذکر کے قلم تک آتے ہی وہ جذباتی محبت شاعر پر طاری ہو جاتی تھی جو ادنیٰ سے اعلیٰ تک ہر مسلمان کے دل میں جاگزیں ہے، اس لئے اس میں بھی حضور صلعم کے حقیقی کارنامے اور مشن کی وضاحت کے بجائے محض سراپائے مبارک کی توصیف یا آپؐ کے خدا کے ہاں مرتبے یا گنہگاروں کی شفاعت کرنے کے بیان تک ان کی شاعری محدود رہی ہے۔ اور چونکہ طبیعت میں عام شاعری کے اثر سے مبالغہ آرائی اور بے عملی رچ گئی تھی اس لئے اس میں بھی بہت جگہ اعتدال کا دامن چھوٹ چھوٹ گیا ہے، بلکہ کہیں کہیں تو کھلم کھلا شرک تک نوبت پہنچ گئی ہے

—— یہ ہے حال ہمارے عام مسلمان شاعر کا، جو اپنے فکر و عمل پر اسلام طاری نہ کر سکا تو خالص دینی مضامین میں بھی اسلام کا صحیح و متوازن نقطۂ نظر نہ نبھا سکا۔ حد یہ ہے کہ اقبال سا سوجھ بوجھ رکھنے والا اسلام پسند شاعر یہاں آ کر آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ معلوم اقبالیات کے مفسر اس شعر کی جو آنحضرتؐ کی شان میں کہا گیا ہے کیا تاویل کریں گے؟

نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل، وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسیں، وہی طٰہٰ!

اس سے پہلے کا حال ہمیں نہیں معلوم ——— ابتدا ہی میں غزل اپنی تمام رعنائیوں سے عروج آ جاتی ہے اور بہت کم اس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے، کہ آج تک کی غزل گوئی میں سے کثیر حصہ صرف ہر زمانے کا ساتھ دینے والے عناصر بھی شامل کرتے جائیں۔ وہ جو کچھ کہتا ہے عصر حاضر کی روشنی میں کہتا ہے کیونکہ وہ اسی میں سانس لے رہا ہے اور اس میں شک نہیں کہ تدریج غزل چاہے کی یہ بات قطعاً یاد نہیں مگر رقی مثال کے طور پر یہ شعر

جمال یار، ادا آشنا نہ دست حریص کہاں بچیں گے مری عصمت نگاہ کے پھول

غالباً تمام روایات غزل سے بغاوت کا اعلان کرتا ہے اور پھر بھی خالص غزل کی اقلیم کا شعر ہے۔ یہ آہنگ اور یہ جسارت شاعر کے اعلیٰ ذوق کی مظہر ہے ایسا تخیل جو باغی کو بھی ریاست میں بنیادی حقوق دلا سکے یقیناً حیرت انگیز لیاقت کا مالک ہوگا۔ پھر اس شاعر کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہوگی جو تغزل و سخن میں بھی ذوق سلیم کی عدالت سے کسی شعر کے متعلق ایسا ہی فیصلہ کروا لے!

مگر روایات ادب سے یہ بغاوت بجائے خود مستحسن نہیں۔ اس کے لئے ذوق کی بلند معیاری شرط ہے اور یہ شرط عاصی میں پائی جاتی ہے البتہ یہ بات بھی کھٹکتی ہے کہ عاصی کی شاعری جوانی کی طرح ایک موقف پر نہیں ٹھہری ہے اس کا جذبہ تو اپنی جگہ مکمل ہے لیکن فکر ابھی بہت کچھ تربیت کی محتاج ہے اس نے بہت سے مسائل کو اپنی غزلوں میں چھیڑا ہے، مگر کوئی نقطہ نظر نہیں پیش کر سکا ہے۔ بیشک یہ بھی قابل تعریف ہے کہ پامال یا معمولی مضمون کو خوبصورت الفاظ و انداز بیان کا جامہ پہنا دیا جائے، لیکن شاعر کی عظمت کیلئے یہ کافی نہیں اس کیلئے یہ بھی ضروری ہے کہ شاعر کے پاس تنقید کے علاوہ ایجابی نظر بھی ہو خصوصاً کسی نصب العین سے وابستہ شاعر کیلئے تو یہ قطعاً ناگزیر ہے اقبال اور دوسروں سے پہلے بھی لوگ اسلام کو بحیثیت نظام زندگی کے جانتے تھے پھر اقبال میں کیا خصوصیت ہے کہ انکی ہم پر عظمت بیٹھی ہوئی ہے؟ یقیناً یہی کہ انھوں نے اپنے نصب العین میں سے کوئی اہم خصوصیت کو اپنی فکر کا مرکز و محور بنایا اور پھر انسانی زندگی اور فطرت کائنات کے دھندلے عکس اسی مرکز کے گرد بکھرے پھول کو جمع کرتے چلے گئے کائنات بہت وسیع ہے اور اس کے علم و آہنگ پر غور کیا جائے تو ایک اعلیٰ ... کے مشاہدے کے لئے بے شمار نکتے اس میں سے نکل سکتے ہیں اور لوگوں کی دلچسپی کا باعث ہو سکتے ہیں۔ جس طرح ایک سائنسدان چند بنیادی مسلمات پر ایمان لا کر طبعی دنیا کے لئے نت نئے پانی ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالتا چلا جاتا ہے اور ان سب کو وہ انہی بنیادی مسلمات پر منطبق کرتا چلا جاتا ہے اسی طرح ایک شاعر بھی بعض بنیادی صداقتیں تسلیم کر کے ذہن و روح کی دنیا سے بے شمار معانی کے انبار لگا سکتا ہے، خصوصاً یہ کام اس شاعر کیلئے اور بھی آسان ہو جاتا ہے جو ذوق سلیم رکھنے کے ساتھ قلب و نظر کو بھی حلقہ بگوش اسلام بنا چکا ہو اور اس کی صداقت میں پوری طرح ڈوب چکا ہو۔

پس عاصی کے لئے ضروری ہے کہ وہ مطالعہ کائنات کو تیز اور دقیق تر کر دیں غور و تامل کی عادت ڈالیں اور اپنا ایک مزاج فکر بنا لیں، ان کی غزل گوئی کامیاب ہے لیکن اسے مزید موثر بنانے کیلئے فکر کا زیادہ گہرا اور گمبھیر ہونا بھی ضروری ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ اگر کسی منصوبے کے تحت اپنی شاعری جاری رکھیں اور اس میں کوئی مخصوص نصب العین نگاہ میں ملحوظ رکھیں تو انہیں بھی اقبال کی طرح نظم کی وادیوں سے گزر کر دوبارہ غزل کی طرف آنا ہوگا اور اس صورت میں ان کی غزل زیادہ عظیم، زیر پا اور دلنشیں خیالات کی حامل ہوگی۔

سر دست عاصی کی شاعری میں اقبال سے اثر پذیری خاصی پائی جاتی ہے مگر زبان و بیان اقبال کی نسبت ان کے ہاں زیادہ تر سبک اور رواں ہے اقبال کی سی مارائیت کی جگہ عاصی کے ہاں ایک نوشگفتگی اور رعنائیت ملتی ہے جس میں اگر فکر کی گیرائی اور گہرائی بھی شامل ہو جائے تو آئندہ کے مورخ عاصی کو اقبال کا نعم البدل قرار دینے میں حق بجانب نہ ہوں گے۔

نعیم صدیقی اس مقالے کی تاخیر کا ایک اہم سبب یہ بھی ہوا ہے کہ میں نے نعیم کی شاعری پر بھی کچھ لکھنا اپنے ذمہ لیا تھا اور اس کمان بازی سے سبکدوشی حاصل کرنا میرے لئے بہت مشکل نظر آیا۔ اس لئے میں حتی المقدور ٹالتا ہی رہا۔ یہ تساہل دراصل نعیم صاحب کے حرف حرف کی تاثیر نہیں۔ ان کی شاعری کو چھیڑنے اور پڑھنے کا تجربہ تھا میں نے اکثر غور کیا کہ آخر اس موضوع پر کس طرح ابتدا کی جائے کس رخ سے چھیڑا جائے کہ ہر بات منظم و مرتب ہو کر یکے بعد دیگرے ...

مصرع جس سطح ہی سطح میں نسلوں بستیں ہے ختم کر دی جاتی تو یہ ایک نظم کی طرف سے بیان ہو جاتا۔

نعیم کے اجتہاد فی الشعر کو بھی ناکام بنانے میں اسی صحافیت کا ہاتھ ہے نعیم نے شاعری میں بہت سے نئے تجربے کئے ہیئت، اسلوب، موضوع سبھی میں انھوں نے عام روش سے کہیں کہیں انحراف کیا ہے مگر بیشتر تجربے اسی عجلت پسندی' اور سطحیت کا شکار ہو گئے ہیں۔ مثال کے طور پر "زنانہ فوج" کو دیکھئے۔ ہیئت کے اعتبار سے یہ نظم تین تین ہم قافیہ مصرعوں کے بند پر مشتمل ہے۔ لیکن نعیم نے شاید اس کو لکھنے کے بعد ترنم سے یا تحت اللفظ ہی سہی، پڑھ کر نہ دیکھا۔ یہ بحر اور یہ ہیئت متقاضی تھی کہ ہر تین مصرعوں کے بند کے بعد ایک ٹیپ ضرور ہو جس کا قافیہ اوپر کے بند سے متعلق نہ ہو۔ بلکہ اگر ٹیپ ایک مصرع کی ہو تو ہر ٹیپ کا قافیہ یکساں ہو کر نظم کو قدیم اصطلاح کے مطابق مربع بنا دیا جائے۔ اور اگر دو مصرعی ٹیپ ہو تو ہر ٹیپ اپنا قافیہ ردیف مستقل رکھے۔ موجودہ صورت میں جب قاری تین مصرعے پڑھتا ہے ؎

عورت کو بھی مردوں سے مساوات کا حق ہے
عورت کو بھی اظہارِ کمالات کا حق ہے
عورت کو بھی پیکار میں خدمات کا حق ہے

تو ذہن فوراً ایک تبدیل شدہ قافیہ مانگتا ہے جس پر ایک بات مکمل ہو جائے مگر جب فوراً دوسرا بند شروع ہو جاتا ہے ؎

حق یہ ہے کہ خاتون کی ایجاد ہے پردہ
دام و قفسِ جذبۂ آزاد ہے پردہ
خاتون پہ ہاں مرد کی بیداد ہے پردہ

تو ایک مایوسی اور ایک طرح تشنگی ہوتی ہے پھر یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید اس کے بعد کوئی ٹیپ آئے لیکن بند پر بند گزرتے چلے جاتے ہیں اور ٹیپ نہیں آتی' اور پوری نظم پڑھتے وقت ہر بند تشنہ اور ہر بات نامکمل سی محسوس ہوتی ہے۔ اس کمی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اثر انگیزی میں کمی آ جاتی ہے کیونکہ ذہن جو گویا ہر بند کے خاتمے پر حقیقی خاتمے کے لئے [اور] قافیہ بدلنے کا منتظر رہتا ہے ہر بار ناکام ہو کر مایوس ہو جاتا ہے اور بجائے اس کے مطالب پر غور کرنے کے اس ٹیپ کے انتظار میں آخر تک گوش بر آواز رہتا ہے۔

یہ تو اسلوب کا نقص تھا اب انداز بیان کو لیجئے مع قافیہ کی پابندی کی خاطر بہت ایسے معائب ہیں جو اچھے ذوق کے شاعر کے لئے موزوں نہیں۔ خصوصاً اب تو باشن بھی بازاریں کہتے۔ اسی طرح "ہر" کو بہ حسرت سے متواتر ہی دیکھتے داغ کیلئے موزوں تنا ایک نیا اجتہاد ہے مگر اچھا معلوم نہیں ہوتا اس موقع پر حاصی کتالی کا وہ مصرع ذہن میں رکھیئے "عمر کہاں بچیں گے مری عصمت نگاہ کے پھول" عصمتِ نگاہ کو پھول سے تشبیہ دینا بھی قطعاً نئی بات ہے مگر بالکل گراں نہیں گزرتی۔ اسی طرح ؎

بنتی کہیں بگڑی ہے تو قسمت کہیں پھوٹی
الفت کہیں چھوٹی ہے تو منگنی کہیں ٹوٹی
ماتھا کہیں پیٹا ہے تو چھاتی کہیں کوٹی

قسمت پھوٹنا' ماتھا پیٹنا' اور چھاتی کوٹنا بہت عامیانہ مذاق کے محاورے ہیں انکو شعر میں لانا درست نہیں۔ اسی طرح کے نقائص اور بہت سی نظموں میں ملتے ہیں۔ ان کا اصل سبب نعیم کی بے توجہی اور عجلت پسندی معلوم ہوتا ہے ورنہ غور و فکر اور اصلاحی نظر بار بار ڈالتے رہنے سے یہ اسقام دور ہو سکتے تھے۔ اسی طرح کی چیزیں نعیم کے ہاں بعض اوقات اتنی سوقیانہ بلکہ کبھی کبھی ناشائستہ ہو جاتی ہیں کہ اکثر صاحبوں کو ان پر اعتراض ہوتا ہے۔ [ایک آدھ مثال تو ایسی ہے کہ میں اسے نقل کرنے کی جرأت بھی اپنے میں نہیں پاتا۔]

اس طرح کے سہو قلم —— اگر نعیم صاحب بُرا نہ مانیں تو کہوں —— زبان اور اس کے مخصوص مفہومات سے کم واقفیت کا نتیجہ ہیں۔ اگر نعیم صاحب آج سے سو سال پہلے لکھنؤ یا دہلی میں اس قسم کی نظمیں سناتے تو شاید اساتذہ چھوڑ کر عام لوگ بھی ان سے شاعری ماننے سے انکار کر دیتے۔ اس زمانے میں شعر کا معیار ہی یہ تھا کہ خیالات پر اتنا بیتی نہ تھا جتنا صحیح زبان پر۔ اس لئے

---

[1] خیر ملاحظہ "تنقید" تو آزاد پر بڑا احسان ہے یہ وقت آدمیوں کا کام ہے کیا آپ کا یہ خاص طرح کا انداز اس بنا پر ہوا کہ آپ کی تنقید حوصلے ان کو ہی کرنے کرا آتی ہے؟ اگر ایسا ہے تو ایسی نعت کو بھی پڑھ لو خلیج کر پائیں کا فرض کہ یہ ان کے قرب و قرین مستحق ہے۔ (رف۔ س)

"روپے کا زمانہ"

نعیم صدیقی

پتھر کا زمانہ، دھات کا زمانہ، مشین کا زمانہ، بجلی اور ایٹم کا زمانہ ——— یا مذہب کا زمانہ اور سیاست کا زمانہ ———

مگر اب کاہے کا زمانہ ہے؟ آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ بین الاقوامیات کا زمانہ ہے، ڈپلومیسی کا زمانہ ہے، جنگیات کا زمانہ ہے، معاہدوں اور بلاکوں اور سازشوں کا زمانہ ہے۔ میرے بچوں کے اتالیق فرمایا کرتے ہیں کہ یہ زمانہ مشاعروں کا زمانہ ہے۔ میرے پڑوسی کا قول یہ ہے کہ باقی ساری باتیں غلط ہیں اور ٹھیک بات ایک ہی ہے کہ یہ زمانہ افتتاحی تقریروں کا، نمائشوں کا، استقبالیوں کا، ایڈریسوں کا، مینابازاروں کا اور ایک حد تک وزیروں اور ان کی بیگمات کا زمانہ ہے۔ پروفیسر عطاء الرحمٰن کا خیال ہے کہ یہ انجمنوں کا اور باتوں کا یعنی "نشستند و گفتند" کا زمانہ ہے۔ چلیے یا کہتے ہیں کہ قحط کا زمانہ ہے کیونکہ یوں بھی جیٹ بیساکھ کا مہینہ قیامت ہوتا ہے۔ بس یہ غلط جوہوں نے زمین دوزکھتوں میں آثار دیا ہے اور اوپر سے ہمارے وزراء جیسی روح لیے فرشتے ہیں پھر قیامت یہ کہ صغیر اعظم بہت زیادہ بڑھ کر واقع ہوئے ہیں۔ ہمارا نانی کہتا ہے کہ بے غیرتی اور بے حیائی کا زمانہ ہے بڑے بڑے اشراف کی عورتیں برقع رخ زیبا سے اٹھائے شہر کی ہر سڑک پر اور خصوصاً انارکلی میں سیرگشت کرتی ہیں۔ آگے آگے عورت چلتی ہے پیچھے پیچھے خاوند نوکر بنا کر کسی بچے کو گودی میں لئے مارچ کر رہا ہوتا ہے۔ لیکن سب سے زیادہ لگتی ہوئی بات مالی کی ہے وہ کہتا ہے کہ یہ آخری زمانہ ہے اور قیامت کے آثار ہر طرف ظاہر ہو رہے ہیں۔

ہماری اپنی رائے اگر کوئی پوچھے تو ہم یہ عرض کریں گے کہ علمی حیثیت سے تاریخی زمانوں کی جو تقسیم کی جاتی ہے اس کے لحاظ سے اس زمانے کو روپے کا زمانہ کہہ سکتے ہیں۔ روپے کا زمانہ اس معنی میں نہیں کہ آج کل روپے بہت بنتے ہیں اور ٹکسالیں زیادہ کام کرتی ہیں۔ یوں سوچیے تو اس زمانے کو نوٹوں کا زمانہ کہنا چاہیئے۔ روپے کا زمانہ اس معنی میں کہ اب سارے ہی کام روپے سے چلتے ہیں۔ اگلے وقتوں میں کچھ موٹے موٹے کام روپے سے چلا کرتے تھے لیکن ایک دنیا کی دنیا تھی کہ جو روپے کی مداخلت سے آزاد تھی۔ مجھے یاد ہے کہ اپنے گاؤں میں ایک دفعہ ہمیں شہد کی ضرورت پڑ گئی کوئی بچہ بیمار تھا۔ اتا پتا لیا تو معلوم ہوا کہ شہد صرف جاجے تیلی کے گھر میں ہے۔ میرے خسر اس کے ہاں دو روپے لے کر پہنچے اور اسے ضرورت بتائی اور دو روپے اس کے سامنے رکھ دیئے کہ آدھ پاؤ شہد چاہیئے، تم جتنے پیسے لینا چاہو لے سکتے ہو۔ جاجے تیلی نے کہا کہ آپ کے بچے کے لئے اگر شہد کی ضرورت ہے تو بلا قیمت چاہیں تو سیر بھر لے جا سکتے ہیں لیکن اگر قیمت کا سوال ہے تو دو روپے میں ایک تولہ بھی نہیں دوں گا لیکن اب وہ اگلی باتیں گئیں، اب تو اس گاؤں میں بھی جا کر آپ پانی کا گلاس مانگیں تو پہلے یہ معلوم کیا جائیگا کہ آپ دیتے کیا ہیں۔ اس لئے ہم اپنے زمانے کو روپے کا زمانہ کہتے ہیں۔

کوئی زمانہ محض اس وجہ سے روپے کا زمانہ نہیں بن جاتا کہ اس میں عام ضروریاتِ زندگی قیمتاً ملتی ہیں۔ بلکہ روپے کا زمانہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ زندگی سے تعلق رکھنے والی مادی چیزیں ہی نہیں، خالص روحانی و اخلاقی چیزیں بھی منڈی کا مال بن گئی ہیں۔ مذہب روپے کا، اخلاق روپے کا، شرافت روپے کی، انصاف اور دیانت روپے کی، ہمدردی اور خیرخواہی روپے کی، مسکراہٹیں روپے کی، بے تکلفی روپے کی، دوستی روپے کی ——— تو پھر اس زمانے کو روپے کا زمانہ نہ کہیں گے تو کیا کہیں گے؟

کرمے سے پوچھئے اُسے پٹواری سے کم تھا۔ پٹواری سیدھے منہ بات نہیں کرتا تھا کبھی وہ اسے جانگلو کہتا، کبھی اس کا مذاق اڑاتا، کبھی اسے کرسی چھوڑنے کو کہتا، لیکن ادھر بیس روپے بھینٹ چڑھے اور ادھر پٹواری کی زبان بدل گئی، آداب بدل گئے، اخلاق بدل گئے، سارا معاملہ بدل گیا ـــــ کرمے نے محسوس کیا جیسے پٹواری سے زیادہ شریف اور معقول اور مہذب آدمی کوئی اور نہ ملیگا۔ شاید کوئی تحصیلدار اور افسر مال بھی ایسا نہ ہوگا "چوہدری جی" کہے بغیر اس نے کبھی خطاب نہیں کیا۔

انور ڈرائیور کو ڈرائیونگ لائسنس لینا تھا کئی دن وہ دفتروں کے چکر کاٹتا رہا اور شنوائی نہ ہوئی۔ ہر جگہ یہ معلوم ہوا کہ کام کا رش ہے، کہیں فرصت نہیں، اور ہر جگہ تیوری چڑھی ہوئی نظر آتی کہیں اُسے بات کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ لیکن دس پندرہ روپوں کا چڑھاوا دیتے ہی دنیا بدل گئی۔ تمام اہلکار ہنس مکھ بن گئے، ہر چہرے پر تبسم آگیا، ہر دفتر میں فرصت نکلنے لگی۔

جہاں خان کی بیٹی کو نمونیہ تھا۔ وہ روز اسے ڈاکٹر کے ہاں لے جاتا، دو گھنٹے تک بیٹھنا اور ڈاکٹر ایک پرزہ لکھ دیتا اور ایک مکسچر اور کچھ گولیاں اُسے مل جاتیں کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ وہ سب سے پہلے پہنچا مگر اس کی باری ہمیشہ سب سے آخر میں آئی۔ اس نے بہت چاہا کہ ڈاکٹر اس کی عزیز از جان حشمت بیٹی کو دیکھے اور توجہ سے دیکھے۔ وہ نمونیہ کی مریضہ تھی اور اس کی ہر رات بڑے ہی کرب میں کٹتی۔ وہ سخت کھانستی اسے درد ہوتا، اسے بخار رہتا، وہ ماں باپ کے لئے آزمائش تھی اور ماں باپ تھے کہ لوگوں کی خصوصاً ڈاکٹر کی ہمدردی اور تسکین دہانی کے بڑے محتاج تھے۔ وہ دو چار میٹھے لفظوں کے بھوکے تھے، مگر ان لفظوں کی قیمت انہوں نے ادا نہیں کی تھی۔ اس لئے ایک مکسچر کی تین خوراکیں اور چھ گولیاں تو روزانہ مل جاتیں لیکن ہمدردی اور تسلی کا کوئی لفظ نہ مل سکتا۔ ڈاکٹر جہاں خان کے سامنے دوسرے مریضوں سے خوب گھل مل کر باتیں کرتا، ہنستا، مسکراتا، دل لگی کرتا، لطیفے قصے چھیڑ دیتا، بیماری ہی کے نہیں، زندگی بھر کے مسائل پر بات چیت کرتا۔ یہ موٹر گاڑی آپ نے کب خریدی ہے، شکار کو جاتے ہیں یا نہیں، عہدے میں ترقی کی کب امید ہے، مس جمیلہ کی کوٹھی میں اب کون کرایہ دار آیا ہے؟ ـــــ" اور جہاں خان اس پر کڑھتا کہ آخر ان باتوں کی کیا ضرورت ہے؟ ان کے بجائے ڈاکٹر کیوں نہ جہاں خان سے حشمت کا حال پوچھے کہ اس نے رات کیسے کاٹی؟ اب تکلیف میں کمی محسوس ہوتی ہے یا اضافہ؟ دوا بدلنے کی ضرورت ہے یا نہیں؟ چنانچہ جہاں خان بھی بیٹھا اس انتظار میں رہتا کہ شاید اسے ڈاکٹر سے بات کرنے کا موقع مل جائے لیکن ڈاکٹر اس طرح کی غیر ضروری باتوں میں مصروف رہتا اور حشمت کھانستی رہتی، بین بین کرتی رہتی اور جہاں خان بے تاب ہوتا رہتا۔ جہاں خان اپنی جگہ در اصل احساس کمتری بھی رکھتا تھا، وہ خود محسوس کرتا تھا کہ ڈاکٹر کو حشمت کی بیماری سے اتنی کمائی نہیں ہوتی ہے کہ اس پر زیادہ وقت دے سکے، لہٰذا خواہ مخواہ کی کوشش کو وہ بےکار محسوس کرتا۔ وہ ایک مرتبہ اس نے ڈرتے ڈرتے دوا بدلنے کے لئے کہا بھی ـــــ ڈرتے ڈرتے اس لئے کہ اسے یوں لگتا تھا کہ ڈاکٹر اسے دھکے دے کر کہیں باہر نہ نکال دے ـــــ

ـــــ لیکن ڈاکٹر نے کہا کہ یہی دوا دیتے جاؤ۔

جہاں خان سے آخر نہ رہا گیا۔ اس نے بیوی کی سونے کی انگوٹھی بیچ ڈالی، پندرہ روپے ملے۔ پانچ روپے اس نے ڈاکٹر کو دیئے۔ حالات بدل گئے۔ پانچ روپے دیتے ہی جہاں خان کو جرأت گفتار ہوگئی اور ڈاکٹر دوسرے تمام لوگوں کو چھوڑ کر اچانک متوجہ ہوگیا۔ پوری حالت سنی، نسخہ بدلا، بیماری کو دیکھا بھالا اور جہاں خان بہت مطمئن تھا۔ اس کی بچی کی آدھی بیماری تو ڈاکٹر کے ہاں بیٹھے بیٹھے دور ہوگئی۔ پانچ روپے اثر کر رہے تھے اور مکسچر اور گولیوں سے زیادہ اثر کر رہے تھے۔ اب ڈاکٹر کے چہرہ پر جہاں خان کے لئے مسکراہٹ بھی تھی، اس میں حشمت کے لئے انسانی ہمدردی بھی ابھر آئی، اس کے ماں باپ کے لئے دلسوزی بھی پیدا ہوگئی۔

واقعی یہ تمدن روپے کا تمدن ہے اور تو اور، ہمارے امام مسجد صاحب بھی جس دلسوزی سے ملک جلال دین کی صحت کے لئے ہر نماز کے بعد باواز بلند دعا مانگتے ہیں وہ خود بتاتی ہے کہ ملک جلال دین کے گھر سے روزانہ شام کا کھانا آتا ہے، ہر دوسرے مہینے کوئی نہ کوئی اترا ہوا کپڑا مل جاتا ہے اور مزید...

آتش نوائی

ضیا محمد ضیا

زمانہ جا رہا ہے کفر کی فرمانروائی کا
کہ دور آتا ہے پھر اسلام کی کشور کشائی کا

بجا دو پھر زمانے بھر میں ڈنکا پوری قوت سے
محمد کی رسالت کا، خدا کی کبریائی کا

عیاں ہے اب بھی دنیا میں فتورِ عقلِ انسانی
کہیں سودا بڑائی کا کہیں دعویٰ خدائی کا

نئی راہیں نکالی ہیں فسادِ دیدہ و دل نے
یہ خواہش خود نمائی کی یہ شیوہ خودستائی کا

فریبِ خواجگی دیکھا فریبِ بندگی دیکھو
ڈھنڈورا پیٹتا ہے شیخ اپنی پارسائی کا

ہوئی جاتی ہے اکثر پیروؤں میں بیدلی پیدا
ذرا آئیں سکھا دو پیشوا کو پیشوائی کا

جہانِ رنگ و بو میں ہمنشیں ایسا بھی ہوتا ہے
دیا کرتے ہیں منصب رہزنوں کو رہنمائی کا

بچایا یاس نے آکر ہمیں رنجِ فراواں سے
نہیں اب دوستوں سے ہم کو شکوہ بیوفائی کا

اٹھی سطحِ زمیں سے گم ہوئی جا کر فضاؤں میں
خرد کو ہو گیا احساس آخر نارسائی کا

دلوں کو پھونک ڈالا میرے ایماں کی حرارت نے
زمانے بھر میں شہرہ ہے مری آتش نوائی کا

کبھی بجلی کا خطرہ ہے کبھی صیاد کا ڈر ہے
مزہ کیا صحنِ گلشن میں ضیا نغمہ سرائی کا

نظریۂ سزا

(چوہدری فقیر اللہ بی۔ اے آنرز۔ ایل۔ ایل۔ بی)

سزا کی تعریف انسانی سوسائٹی جب ترقی پذیر ہوئی۔ تو چند ایک قواعد وضوابط وضع کئے گئے۔ جوکہ انسانی سوسائٹی کی زندگی کو باقاعدگی کا رنگ دے سکیں۔ کچھ عرصہ تک جب کہ انسانی سوسائٹی اتنی وسیع و عریض نہیں تھی۔ یہ طاقت قطعی صورت میں باپ کی حکمران طاقت میں ظہور پذیر رہی۔ اور باپ اپنے ماتحت خاندان کے افراد کے حقوق کے تحفظ کا ضامن ہوتا تھا۔ اس کے بعد دوسرا دور آیا تو ایک قبیلہ کے حقوق کی نگرانی سردار قبیلہ کے سپرد کی گئی اور قبیلہ کے حقوق پر کوئی بیرونی طاقت ڈاکہ ڈالتی تھی تو سردار ہر ممکن طریقے سے اس طاقت کو حقوق کے تسلیم کرنے پر مجبور کرتا تھا۔ مرور زمانہ کے ماتحت یہ طاقت بادشاہ کی شکل میں اپنی رعایا کے حقوق کے تحفظ کی ضامن بنی۔ اور باپ اور سردار کی طاقتیں بہت ہی کم ہو گئیں۔ آہستہ آہستہ بادشاہ کی آمرانہ حکومت نے جمہوری نظام حکومت کو جگہ دے دی اور ریاست اپنے افراد کے حقوق کی ضامن ہو گئی۔

ابتدائے آفرینش سے ہی حقوق کو تسلیم کروانے کے لئے طاقت کا استعمال جاری رہا ہے کوئی باپ اپنے ماتحت خاندان کا اور کوئی سردار اپنے قبیلہ کے افراد کے حقوق کا ضامن نہیں ہو سکتا تھا تا وقتیکہ اس کے ہاتھ میں قطعی طاقت نہ ہوتی، اور اس طاقت کے بل بوتے پر وہ مجرم کو پکڑ کر سزا دے سکتا۔ آج بھی ریاست کے قانون (National Law and Civil Law) کو نافذ العمل کرنے کے لئے سب سے زیادہ ضرورت ریاستی طاقت کی ہے۔ اگر کسی ریاست کے پاس کسی خاص جرم کو روکنے کی طاقت موجود نہیں تو وہ ریاست اُس حد تک اپنے افراد کے حقوق کے تحفظ کا فریضہ ادا کرنے سے قاصر ہے۔ گویا سزا وہ حربہ ہے۔ جوکہ اس انسان کے خلاف استعمال کیا جاتا ہے، جو انسانی سوسائٹی کے مقررہ اصولوں کو توڑ پھوڑ کر اور دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈال کر اپنی حرص و آز کی تسکین کرنا چاہتا ہے۔

حقوق کی تعریف انسانی زندگی کئی شعبوں میں منقسم ہے۔ مثلاً روحانی شعبہ، اخلاقی شعبہ، سماجی شعبہ وغیرہ وغیرہ۔ ان شعبوں میں سے کئی ایسے شعبے ہیں جوکہ انسان کو اس دنیا میں بحیثیت انسان کے رہتے ہوئے قبول کرنے انتہائی ضروری ہیں۔ مثلاً سماجی شعبہ، گھریلو زندگی کا شعبہ وغیرہ وغیرہ۔ ان دنیاوی شعبہ ہائے حیات میں کام کرنے کے لئے ہر انسان عملی رنگ اختیار کرتا ہے۔ یہاں تک تو ہر چیز ٹھیک چلی آتی ہے لیکن عملی رنگ اختیار کرنے میں ہر انسان انفرادی طور پر ذاتی منفعت بازی کے جذبہ کے ماتحت ایسی حرکات کا مرتکب[1] ہو جاتا ہے۔ جوکہ عام انسانی سوسائٹی کے لئے مستقبل میں ضرر رساں ثابت ہوتی ہیں۔ لہٰذا حکومتِ وقت نے ہر زمانے میں کوشش کی ہے کہ انسانی زندگی میں باقاعدگی پیدا کرنے کے لئے دائرہ ہائے عمل متعین کر دیئے جائیں اور اس طرح ہر حکومت کا منشاء انسانی زندگی میں تصادم کے مواقع کو کم سے کم کرنا ہوتا تھا۔ لیکن انسانی فطرت نے اس کے خلاف ہمیشہ بغاوت کی ہے۔ اس بغاوت کے عنصر کو دبانے کے لئے قانون کا بوجھ انسان کے کندھوں پر ڈال دیا جاتا ہے۔ کیونکہ دائرہ ہائے عمل کے تعین سے ہر انسان کی عملی زندگی باقاعدہ بن جاتی ہے اور دیگر افراد اس کے دائرہ عمل میں مداخلت کرنے کے مجاز نہیں ہوتے۔ گویا دوسرے الفاظ میں

---

[1] ایک فرد بیک وقت فرد بھی ہوتا ہے اور سماج کا رکن بھی، اور پھر اس کے ذہن کی ساخت بھی کچھ ایسی ہے کہ اس کے اندر انفرادیت کا جوہر اور اجتماعیت کا جوہر کشمکش کرتا ہے کیونکہ اس کا اپنا ذاتی مفاد اور سوسائٹی کا اجتماعی مفاد دونوں بیک وقت اس کے اندر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس کشمکش میں بار بار انفرادیت اجتماعیت کی حق تلفیاں کرتی ہے کیونکہ آدمی فرد پہلے ہے اور سماج کا رکن بعد میں، اور اس میں انفرادی خودی کی تحریک نسبتاً زیادہ زوردار ہے۔ یہی اصل علت ہے جرائم کی۔ (مدیر)

کے حقوق کے تحفظ کا فرض اپنے ذمہ لیتا ہے۔ وہ اگر برضا و رغبت اس پر تیار نہ ہو تو پھر تصادم کو روکنے کے لئے حکومت کی طاقت ہوتے اس کے فرائض کی ادائیگی پر مجبور کرنے کو موجود ہوگی۔ تاکہ دائرہ ہائے عمل کا تعین قطعی صورت میں قائم رہے۔ گویا حقوق زندگی کے شعبہ جات کا وہ حصہ ہوتے ہیں جو کہ ایک فرد کے متعین دائرۂ عمل میں حرکت کی کھلی ضمانت ہوتے ہیں۔ لیکن یہ کھلی ضمانت مساوی فرائض کی پابندی بھی فرد پر عائد کرتی ہے۔ مثلاً اگر ایک انسان کا زندہ رہنا ایک حق ہے۔ تو مساوی صورت میں تمام بنی نوع انسان پر ایک فرض عاید کیا گیا ہے کہ اس مخصوص فرد کی زندگی کا احترام کیا جائے۔

حقوق کی ضمانت

انسانی فطرت میں بغاوت کا عنصر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ اس لئے اپنی کوتاہ بینی کا شکار رہتے ہوئے انسانی فطرت اپنی ذاتی منفعت کے مقصد کے پیشِ نظر دوسروں کے دائرہ ہائے عمل میں بھی مداخلت کر لیتی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس تصادم کی وجہ سے انسانی زندگی میں ایک خلفشار سا پیدا ہو کر وہ باقاعدگی جو کہ مقصود ہوتی ہے ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ حقوق کی ضمانت کے لئے کوئی ایسا طریقہ سوچا جائے جس سے انسانی فطرت کا وہ باغی عنصر جو کہ دوسروں کے حقوق سے متصادم ہونے کا محرک ہوتا ہے اپنی موت آپ مر جائے۔ چنانچہ مذہب نے دوزخ اور جنت کی حقیقتوں سے روشناس کرا کے انسان کو دوسروں کے حقوق کی نگہداشت کرنے کی طرف مائل کیا۔ پھر ہر دور کے فضلا نے اخلاقیات کی اہمیت کو انسانی سوسائٹی کے لئے لازمی قرار دیتے ہوئے ان پر عمل کرنے کی صورت میں ارضی جنت اور ان کے ترک کی صورت میں ارضی دوزخ کے تصور سے لرزہ براندام کیا۔ اور ہر زمانے کی حکومتوں نے انسانی فلاح و بہبود کے لئے ان وسیع و عریض حقوق کے حلقوں سے مخصوص حقوق کو متعین کر کے اُن کی حفاظت کا یقین عدل گستری کی صورت میں کیا

ان تینوں صورتوں میں سے پہلی دو صورتیں تو انتہائی مہذب انسانی سوسائٹی[1] میں تو نافذ العمل ہو سکتی ہیں۔ ان دونوں صورتوں میں فرد اپنے پر خود حکمران ہوتا ہے، اپنا خود محاسب ہوتا ہے اس لئے مذکورہ نظام اس وقت نافذ ہو سکتے ہیں جبکہ ہر فرد بنی نوع انسان اپنے میں اس قدر زیادہ وسیع النظری پیدا کرے جو کہ اجتماعی منفعت کی خاطر ذاتی منفعت کو قربان کرنے کی محرک ہو سکے یہ بہت ہی معیاری چیز ہے[2] اور باغی فطرت سے معیاری چیز کا مطالبہ کرنا عبث ہے۔ اس لئے اس معیاری چیز کو حاصل کرنے کے لئے صرف تیسری صورت ہمارے پاس رہ جاتی ہے یعنی ریاست کی عدل گستری (Administration of Justice)، گویا انسانی سوسائٹی کی باغی فطرت کو دبانے کیلئے صرف ایک ہی ذریعہ عمل میں لایا جا سکتا ہے اور وہ حکومت کا محکمۂ انصاف ہے۔

محکمۂ انصاف کی اساس محکمۂ انصاف کی اساس اس چیز پر مبنی ہے کہ جائز حقدار کو اس کا حق ملے تو گویا حقوق کا احترام کرانا

---

[1] دوزخ و جنت کا عقیدہ داخلی اسلام کے لئے ہے اور سہر حال داخلی اسلام کے بغیر محض خارجی قانونی اصلاح کے طریقے کارگر نہیں ہو سکتے لیکن دوسری طرف سارا زور داخلی اصلاح پر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ سوسائٹی کو فساد سے بچانے کے لئے دونوں ہی تدابیر ضروری ہیں۔ چنانچہ اسلام نے دونوں ہی کا اہتمام کیا ہے۔ اور یہ مذہب و تہذیب (بلکہ کہنا چاہئے "دین") کے دو شعبے ہیں۔ لیکن صاحب مضمون نے "مذہب" کا ذکر جس انداز میں بیان کیا ہے۔ اس سے "دوزخ اور جنت" کا تصور ملتا ہے۔ لیکن اسلام جیسے دین کا جو روحانی اور قانونی اصلاح کا جامع ہے تصور اس سے واضح نہیں ہوتا۔ (ن۔ ص)

[2] محض اعتقادی اور اخلاقی یا روحانی اصلاح سے ایک صالح معاشرہ کا بلا کسی فساد و انتشار کے اجتماعی زندگی کو چلائے جانا ناقابل یقین خیال آرائی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو اسلام قانونی نظام پیش نہ کرتا۔ (ن۔ ص)

[3] یہاں صرف ایک ہی جگہ الفاظ کا استعمال صحیح نہیں۔ کہنا یہ چاہئے تھا کہ سماج کو پرامن رکھنے کے لئے اول الذکر دونوں ذرائع کے بعد ایک تیسرا ذریعہ اختیار کرنا بھی شدید اہمیت رکھتا ہے۔ (ن۔ ص)

محکمۂ انصاف کی بنیاد ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ بنیاد کس طاقت پر قائم رکھی جا سکتی ہے۔ دُنیا کے تمام ممالک کے نظام تامے اٹھا کر دیکھ لیجئے سوائی حقوق کے احترام کے لئے سزا ایک لازمی عنصر کی حیثیت سے موجود ہے۔ اور یہی سزا کی خصوصیت دوزخ کی صورت میں یا برادری سے اخراج کی صورت میں مذہبی یا اخلاقی قسم کے تقاضوں میں تسلیم کی گئی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کسی خاص جرم کی کیا سزا ہونی چاہیئے یا سزاؤں کی نوعیت میں کیا تخصیص ہونی چاہیئے۔ مختلف جرائم کے لئے مختلف نظام ہائے انصاف مختلف حکم لگاتے ہیں۔

اس سلسلہ میں اہم سوال دو ہیں۔ سزا کیسی ہونی چاہیئے؟ اور کیا ہونی چاہیئے؟ انہی دو سوالوں پر کسی خاص ملک کے محکمۂ انصاف کی توجہ منعطف ہوتی ہے۔ اور ان دونوں سوالوں کے جوابات ہی کسی ملک میں جرائم کی قلت یا زیادتی کا موجب بنتے ہیں۔ ان کا کوئی خاص جواب مہیا کرنے سے پہلے ہمیں سزا کے متعلق موجودہ نظریات کا جائزہ لینا چاہیئے۔

نظریۂ عبرت انگیزی

سزا اس قسم کی ہونی چاہیئے کہ باغی عنصر میں جو جذبۂ بغاوت عود کر رہا ہو، وہ اس کی سزا کو دیکھ کر عبرت پکڑے۔ اس نظریہ کو انگریزی اصطلاح میں نظریہ عبرت انگیزی (Retributive) کہتے ہیں۔ جہاں تک اس نظریہ کا تعلق ہے تاریخ شاہد ہے کہ عبرتناک سزائیں ہمیشہ جرائم کی تعداد کو کم کرنے کا ذریعہ بنی ہیں۔ جب بھی سخت سزائیں نافذ کی گئیں تو ملک میں جرائم کی تعداد میں حد سے زیادہ کمی واقع ہو گئی۔ گویا دیگر تمام یکساں حالات میں جتنی سزائیں عبرتناک ہوں گی اتنی ہی جرائم کی تعداد کم ہو گی۔

نفسیاتی طور پر انسان کو جرم کرنے کے لئے ایک اکساہٹ ہوتی ہے۔ اس اکساہٹ اور بعد کے نتائج میں اندرونی طور پر ایک جنگ ہوتی ہے۔ اگر اکساہٹ کامیاب ہو جائے، یعنی بعد کے نتائج (سزا) کا ردِّ عمل (Action) اکساہٹ کے عمل کا مقابلہ کرنے میں ناکافی ثابت ہو تو اس نظریہ کے لحاظ سے یہ صورت عبرت کے عنصر کے ناکافی ہونے پر دلالت کرے گی اور فرد جرم کرنے کی طرف راغب ہو جائے گا۔ لیکن اگر سزا کا ردِّ عمل جیت جاتا ہے جو کہ عبرت کے مناسب عنصر کی موجودگی کا ترجمان ہوگا۔ تو فرد جرم کرنے سے احتراز کرے گا گویا سزا کو جرائم کی روک تھام کے لیے مؤثر بنانے کے لئے سزا کے عبرت انگیز ہونے کے نظریہ کو قبول کرنا انتہائی ضروری ہے اور قبولیت کے بعد اُس کو زمانہ کے حالات کے مطابق یوں ڈھالتے جانا ہوگا کہ سزا نفسیاتی طور پر اکساہٹ سے پیدا شدہ تحریک عمل کے لئے قاطع رکاوٹ کی حیثیت میں موجود رہ سکے۔

دوسرا نظریہ

دوسرے نظریہ کے ماتحت مجرم پر خوف طاری کر کے اُسے جرم کے اعادہ سے بچانا مقصود ہوتا ہے۔ یعنی جب بھی اکساہٹ پیدا ہو تو مجرم کی آنکھوں کے سامنے پہلی سزا کا نقشہ اتنا واضح طور پر جم جائے کہ اس کی اکساہٹ پیدا ہوتے ہی مر جائے۔ گویا اس نظریہ کے تحت سزا کو اتنا خوفناک ہونا چاہیئے کہ اکساہٹ کی کوئی زیادہ سے زیادہ مقدار بھی جرم کی طرف مائل نہ کر سکے۔ بالفاظ دگر مجرم کی انفرادی اصلاح کے لئے سزا کو ایک خوفناک صورت میں موجود رہنا چاہیئے، اور اس کا سابقہ اس پر ڈال ہو سکے یعنی دیگر مساوی حالات میں جتنی سزا خوفناک ہوگی، اتنا ہی مجرم جرم کرنے سے اجتناب کرے گا۔

نظریۂ تسکینِ انتقام

تیسرے نظریئے کے ماتحت حکومت مجرم کو سزا دے کر مظلوم فرد کے لئے تسکینِ انتقام کے اسباب مہیا کر دیتی ہے۔ کیونکہ نفسیاتی طور پر جب کسی خاص فرد کے حقوق پر کوئی جارحانہ حملہ کرتا ہے تو مظلوم میں لازمی طور پر ایک انتقامی جذبہ پیدا ہو جاتا ہے جو کہ اس کے اندر اندر ہی ایک آتش فشاں لاوہ کی طرح جوش کھاتا رہتا ہے۔ چنانچہ زمانہ قدیم میں ہر فرد کو انتقام لینے کی اجازت ہوتی تھی۔ لیکن یہ طریق کار بڑھتی ہوئی انسانی سوسائٹی کے ارتقائی دور میں کئی مشکلات کا حامل ہوتا گیا۔ اس لئے حکومت نے مظلوم

---

[1] سزا کو نرم کرنے کے حامی بھی خاص حالات میں بعض خاص جرائم کی روک تھام کے لئے سنگین سزاؤں سے مدد لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں (ر-ف)

افراد کی طرف سے خود انتقام لینے کا بیڑا اٹھا لیا۔ چنانچہ آج مجرم کو سزا دے کر مظلوم کے انتقام کی آگ کو فرو کیا جاتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ سزا کو انتقام کا جوش فرو کرنے کا ذریعہ بھی ہونا چاہیئے تاکہ وہ انتقامی آگ جو کہ فرو نہ ہونے کی صورت میں مزید جرائم کے ارتکاب کی محرک ہوتی ہے سزا کے نفاذ سے بجھ سکے۔ لہٰذا دیگر مساوی حالات کی موجودگی میں جتنی کوئی سزا زیادہ سے زیادہ انتقامی آگ کو فرو کرنے کا ذریعہ بنتی ہے اتنا ہی اُس کے مابعد پیدا شدہ جرائم کی تعداد میں کمی واقع ہوتی جاتی ہے۔

نظریۂ اصلاح اصلاحی طریقہ سے مجرموں کے دماغ سے مجرمانہ ذہنیت کا قلع قمع کرنے کے لیے یہ نظریہ وضع کیا گیا ہے۔ اس نظریہ کے حامی اس خیال کے علمبردار ہیں کہ جرم ایک بیماری[1] ہے۔ اور اس بیماری کے اثر کے ماتحت فرد جرم کا مرتکب ہوتا ہے لہٰذا اُسے کسی قسم کی سزا دینا قرینِ انصاف نہیں۔ بلکہ بہتر یہ ہے کہ مجرم کی اس بیماری کے علل و اسباب سوچ کر اس کے ذہن کو تندرست بنایا جائے۔ یہ نظریہ کسی طرح بھی قبول نہیں کیا جا سکتا۔ جرم کسی بیماری کے ماتحت نہیں کئے جاتے بلکہ ایک اُکساہٹ کے ماتحت بالارادہ کیے جاتے ہیں۔ اب جرم کی اُکساہٹ کے کئی موجب ہو سکتے ہیں اس لیے ان علل و اسباب کی روشنی میں ہر انفرادی مقدمہ کا فیصلہ کرنے کے لیے کئی ماہرین[2] نفسیات کی ضرورت کے ساتھ ساتھ کئی ایک ماہرین اصلاح کی ضرورت بھی محسوس ہوگی۔ بعلاوہ ازیں اگر ایک دفعہ کے علاج کے بعد مجرم دوسری دفعہ جرم کے ارتکاب کا مرتکب ہو تو پھر ذمہ داری اُس طبی یا نفسیاتی علاج پر ہوگی مجرم پر نہیں ہوگی۔ گویا جرم کی اُکساہٹ کا تدارک واقعی علاج نہیں ہو سکیگا اور نتیجہ ازدیادِ جرائم کی صورت میں ظہور پذیر ہوگا۔ اس لیے اصلاحی نظریۂ سزا کو کسی حد تک، قبول کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کو بطور مقصد (ـــــ) کے کبھی بھی کسی ریاست کے محکمۂ انصاف میں قبول نہیں کیا جا سکتا۔ اُکساہٹ کی روک کے لیے اصلاح کبھی بھی ان نتائج کی حامل نہیں ہوگی جو کہ اول الذکر تین نظریات کی قبولیت کے سلسلہ میں حاصل ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ اُکساہٹ کی محرک انسان کی باطنی فطرت ہے۔ کوئی نفسیاتی بیماری نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ چند ایک حالات میں کوئی نفسیاتی بیماری بھی جرم کی محرک ہو لیکن ان مجرموں کی رعایت کے لیے عام نظریۂ سزا کو سرے سے تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ پاگل انسانوں کے جرموں کی طرح ان جرموں کی بھی ایک نوعیت مقرر کر دی جائے۔ جن کے لیے اصلاحی قسم کی سزا تجویز کی جایا کرے۔ مثلاً کمسن مجرموں کی صورت میں انہیں ایسی تربیت دی جانی چاہیئے کہ وہ جرم سے متنفر ہو کر پاکیزہ زندگی بسر کرنے کو پسند کریں کیونکہ اصلاحی نظریۂ سزا کا حلقہ اثر بالکل محدود سا ہے۔ اس لیے عام نظریۂ سزا کا تعین کرنے کے لیے ہمیں اس کو چھوڑ دینا پڑے گا۔

اب اول الذکر تین نظریات کے تحت جو ضابطۂ تعزیر مقرر کیا جائے گا، اس میں اگر تین مقاصد کی تکمیل کما حقہٗ ہو جائے گی تو وہ ضابطہ سوسائٹی کو جرائم سے پیدا شدہ خلفشار کو پاک کرنے میں پوری طرح کامیاب ہو سکے گا۔ اور اگر ان میں سے ایک مقصد بھی کما حقہٗ پورا نہ ہو سکا تو سمجھ لیجئے کہ جرائم کا بے پناہ سمندر اس معمولی سے روزن سے بہ نکلیگا اور سوسائٹی میں خلفشار پیدا کرنے کے لیے ایک طوفان کا پیش خیمہ ہوگا۔ اب ہم ایک ایک نظریہ کے حسن و قبح پر بحث کر کے ایک معیاری نظریہ کے لیے زمین ہموار کریں گے۔

سزا کا عبرتناک ہونا ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ سزا کا عبرتناک ہونا جرائم کی تعداد میں کمی کا موجب ہوگا۔ جرم کی محرک ایک اُکساہٹ ہوتی ہے جو کہ موافق حالات میں زیادہ طاقت کے ساتھ اُبھر آتی ہے، اور ناموافق حالات میں دب کر رہ

---

[1] اس نظریہ کی جڑ ہی غلط ہے۔ دراصل یہ جو ہے جرم اور مرض کی مشابہت کا غلط تخیل۔ مرض میں ارادے کا دخل نہیں ہوتا۔ لیکن جرم میں مجرم اپنے ارادے سے فیصلہ کرتا ہے (ن۔ ص)۔

[2] ماہرین نفسیات کتنے ہی ماہر کیوں نہ ہوں انسانی ذہن اتنی پیچیدگیاں اور گوناگونیاں رکھتا ہے کہ اس کے احوال اور کوائف پر حکم لگانا آسان نہیں ہوتا۔ (ن۔ ص)

جاتی ہے۔ آج کل کی سزا جو کہ دنیائے تہذیب و تمدن میں روا رکھی جا رہی ہے۔ وہ پھانسی، سزائے قید اور جرمانہ وغیرہ اشکال رکھتی ہے۔ (واضح رہے کہ میں یہاں صرف جرائم پر بحث کر رہا ہوں۔ دیوانی حقوق کے لئے علیحدہ بحث کی ضرورت ہے) یہ تینوں سزائیں کچھ اس طریقے سے نافذ کی جاتی ہیں کہ اس کا عبرتناک عنصر کا یکسر ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔ مثلاً پھانسی کی سزا کو جیل کی چار دیواری کے اندر بروئے کار لایا جاتا ہے جبکہ وہاں کے قیدیوں اور ملزموں کو بھی جیل کی کوٹھڑیوں میں بند کر دیا جاتا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میرے ایک دوست جو کہ اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ جیل کے عہدہ پر سنٹرل جیل لاہور میں ملازم تھے، مجھے بتایا کہ اسی دن پانچ آدمیوں کو پھانسی لگایا گیا تھا لیکن عمومی زندگی پر ان پانچ زندگیوں کو ختم کرنے سے کیا اثر پڑا؟ میں تو سمجھتا ہوں کہ صفر بھی نہیں! عوام کو پتہ تک نہیں تھا اور احاطۂ جیل میں چند مجرموں پر انتہائی سنگین سزا نافذ ہو رہی تھی۔ گویا موجودہ سزاؤں میں عبرتناکی کا عنصر بالکل نہیں ہے۔ صرف جیل کی چار دیواری کے پاس سے گزرتے ہوئے ایک خیال سا آتا ہے کہ یہاں مجرم قید ہیں، اور بس۔ اور یہ خیال بھی وقتی حیثیت کا حامل ہوتا ہے۔

گویا آج کی موجودہ سزاؤں میں عبرتناکی کے عنصر کو پوری طرح شامل کرنے کی ضرورت ہے۔ مثلاً اگر قاتل کو برسرِ اجلاس پھانسی کی سزا دی جائے تو وہ ایک زبردست عبرتناک سزا ثابت ہو سکتی ہے اور عوام میں قتل کے جرم کے لیے جو گھبراہٹ پیدا ہوتی ہے وہ روزمرہ زندگی میں تختہ دار پر لٹکنے والے قاتلوں کے تصور سے اپنی موت آپ مر جائے گی۔ اس طرح اگر دیگر مجرمین عبور دریائے شور کی سزا بھی بھگت کر آجائیں تو عوام کو معلوم نہیں ہو سکتا کہ یہ صاحب مجرم رہے ہیں۔ بلکہ بعض حالتوں میں اس کے متعلق گمان بھی پیدا نہیں ہوگا کہ حضرت کی زندگی کسی جرم کے داغ سے آلودہ ہے۔ لیکن اگر اس سزا کی بجائے کوئی ایسی سزا تجویز کی جائے جو کہ مجرم کو دوسروں سے ممیز کر سکے۔ تو وہ ایک چلتا پھرتا عبرت انگیز منظر ہوگا۔ جس سے عوام الناس میں جرم کے ارتکاب سے بچنے کی انتہائی کوشش کی جائے گی۔ لہذا مجوزہ سزاؤں میں عبرتناکی کے عنصر کو شامل کرنا لازمی و لابدی ہے۔

جرائم سے جبری پرہیز کرانے والی سزا موجودہ سزاؤں میں پرہیزی عنصر کی موجودگی کسی حد تک قائم ہے اور اس کے لئے قید کا ذریعہ اختیار کیا گیا ہے۔ لیکن موجودہ قید میں وہ صلاحیت نہیں جو کہ قیدی کو ڈرا کر بعد ازاں اُسے جرائم کے ارتکاب سے بچا سکے۔ بلکہ ایک قیدی جب قید سے باہر نکلتا ہے تو اس کے دل میں جرم کرنے کا زیادہ اشتیاق ہوتا ہے۔ کیونکہ پیران متاں انہیں استاد بنا کر باہر بھیجتے ہیں۔ گویا مجوزہ سزائیں اس پہلو سے بھی اصلاح کی کافی گنجائش ہے۔

انتقام کی تسکین جہاں تک اس پہلو کا تعلق ہے، موجودہ سزائیں انتہائی طور پر ناکام رہی ہیں۔ مثلاً اگر کسی چور کو دو سال کی سزا دی جاتی ہے تو اس سے نقصان پہنچنے والے کو کیا فائدہ ہوتا ہے۔ بلکہ عام حالتوں میں سزا اتنی قلیل سی اور ناکافی ہوتی ہے کہ جذبۂ انتقام فرد ہوتا ہی نہیں۔ اس لئے اپنی آپ مدد کرنے کی اکساہٹ پیدا ہوتی رہتی ہے۔ نتیجۃً جرائم کے ارتکاب میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس لئے موجودہ سزاؤں میں اس عنصر کو بھی بدرجہ اتم پیدا کرنا ضروری ہے۔

طریقِ کار اب ایک موزوں ضابطہ تعزیرات کے لئے ایک خاکہ ذہن میں آنے لگا ہے اور اس خاکہ کے مطابق سزاؤں میں مذکورہ واضح کردہ تینوں عناصر کو پورے طور پر نمایاں کرتا ہمارا مقصدِ بحث ہے۔ تاکہ پیش نظر ضابطۂ تعزیرات کے تحت کم از کم جرائم سوسائٹی میں وقوع پذیر ہو سکیں۔ ایک معقول ضابطہ تعزیرات کو ایسی سزائیں مقرر کرنی چاہئیں جو بیک وقت عبرتناک بھی ہوں، پرہیزی اثر رکھنے والی بھی ہوں اور انتقامی آگ کو پورے طور پر ٹھنڈا کرنے کی خصوصیت بھی رکھتی ہوں۔

اس موقع پر ایک خاص نظریہ پر بحث کرنا ضروری ہے، یعنی موجودہ زمانہ میں سزاؤں کو زیادہ سے زیادہ نرم کرنے کی کوشش

کی جا رہی ہے اور عام مہذب ممالک میں شدید سزاؤں کے خلاف ایک جہاد کی مہم جاری ہے۔ وہاں کی رائے عامہ شدید سزاؤں کو وحشت[1] و بربریت تصور کرتے ہوئے انہیں ختم کرنا چاہتی ہے۔ یہ نظریہ سوسائٹی پر کیا اثرات ڈالے گا؟ اس سوال کا جواب تو طویل تجربہ ہی دے سکتا ہے۔ لیکن جہاں تک دلائل کا تعلق ہے یہ حقیقت واضح ہے کہ نرم سزاؤں کی صورت میں سوسائٹی جرائم کا شکار ہو کر رہ جائے گی کیونکہ ناکافی سزا جرم کی اکساہٹ کو ختم کرنے کا موجب نہیں ہو سکے گی۔ مزید برآں یہ رعایت کن لوگوں سے کی جا رہی ہے؟ انہی تا جو انسانیت کے دشمن ہیں! انسانیت کے دشمنوں سے بدترین سلوک کرنا ایک ایسا طریقہ ہے جس سے ان کی تعداد کو کم سے کم کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے انسانی سوسائٹی کو جرائم سے پاک کرنے کے لئے ضروری ہے کہ جرائم کی محرک اکساہٹ کے لئے ایسی روک تیار کر دی جائے جو کہ ہر حالت میں اکساہٹ کو پیدا ہوتے ہی ختم کر دے بالفاظ دیگر سزا اتنی ہو۔ یہ صورت میں انسان کی آنکھوں کے سامنے پھرتی رہے کہ اکساہٹ کسی طور بھی اُسے مغلوب کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

لہٰذا ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ جتنی کوئی سزا سخت ہو گی، عبرتناک ہو گی یا پرہیزی ہو گی، اتنا ہی وہ سوسائٹی کو جرائم سے پاک کرنے والی ہو گی۔

سزا کیسی ہونی چاہیئے؟

نرم سزا کے نظریہ کو قبول کرنے سے سوسائٹی میں جرم کی اکساہٹ ہر وقت اپنے پورے جوش و خروش کے ساتھ موجود رہے گی، اور ناکافی سزا کی صورت میں اس کی روک ناممکن ہو گی، اس لئے جرائم کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ مثلاً آج یورپ کے ہر ملک کی عدالتوں کے ریکارڈ دیکھنے سے ظاہر ہو سکتا ہے کہ جرموں کی تعداد روبہ ترقی ہے۔ اور اگر سزائیں نرم سے نرم تر کر دی جائیں تو گویا انسانی فطرت کا عنصر بغاوت اپنی پوری طاقت سے کام کرنے لگے گا! نتیجہ یہ ہو گا کہ معمولی معمولی باتوں پر افراد قانون کو ہاتھ میں بے باک کریں گے، اور اس طرح حکومت کا محکمۂ انصاف جو کہ اپنا انتقام آپ لینے کی قباحتوں (Evils of Voilent Self Help) کے سدِ باب کے لئے انسانی سوسائٹی نے اختراع کیا تھا، آہستہ آہستہ اپنے مقصد میں ناکامیاب رہنے کی وجہ سے اپنی موت آپ مر جائے گا اور انسانی سوسائٹی پھر اُسی عام وحشت و بربریت کا شکار ہو کر رہ جائے گی جس کی رُو سے طاقت ہی معیارِ انصاف قرار پاتی ہے۔ گویا سزاؤں کی وحشت و بربریت کے دور کرنے کی نازک خیالی ریاست کو وحشت و بربریت کی طرف لے جائے گی جیسی [illegible] انسانی سوسائٹی کے لئے ناقابلِ قبول ہے۔ اس لئے صرف نازک خیالیوں کا شکار ہو کر اپنی موت پر آپ دستخط کر دینا لکھنؤ کے اُن بانکوں کی وضعداری کے مترادف ہو گا جو کہ ماہ دسمبر میں بھی ململ کے انگرکھے پہننے کی کیا تنے پھرا کرتے تھے اور اچانک کسی ذات نمونیہ کا شکار ہو جاتے تھے۔

جرم و سزا کے معاملے میں اس طرح کی فلسفیانہ نازک خیالی انسانیت کیلئے من حیث الانسان کبھی بھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتی کیونکہ فطرت کا اقتضاء بنی نوعِ انسان کو ختم کرنا نہیں۔ بلکہ اس کو آگے کی طرف لے جانا اور بامِ رفعت پر پہنچانا ہے۔ گویا سزا کے معاملہ میں نرمی اختیار کرنا سوسائٹی

---

[1] دراصل جب الحاد اور مادہ پرستی کے فلسفیوں کی بنیاد پر ذہنوں اور سیرتوں کی تعمیر کی جائے گی اور جرائم کے محرکات کے راستے سے اقتصادی اور اخلاقی رکاوٹیں دور ہو گئیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ سوسائٹی من حیث المجموع جرائم کا ایک خارزار بن جائے اور افرادِ معاشرہ کی اکثریت کسی نہ کسی گوشے میں ناجائز مجرم ہو چنانچہ جرائم کو ناگزیر اور مستقل یا سمجھ کر سوسائٹی کے دماغوں نے سزاؤں کی نرمی کے لئے وکالت کی کیونکہ جب یہ طے ہو جائے کہ جرائم بھی کئے ہی جاتے ہیں اور سزائیں بھی دی ہی جاتی رہی ہیں تو پھر کیوں نہ جرم ختم کرنے کے ارادے سے سنگین سزائیں دینے کا سلسلہ ترک کر دیا جائے اور جرم و سزا کو سوسائٹی کے طبعی لوازم کے طور پر تسلیم کر لیا جائے۔ ان میں سے تاملوں، یہودیوں، ڈاکوؤں، زانیوں اور شرابیوں کے افعال میں تو معترضین کے وجہ بجھ کر دوں گر کوئی وحشت و بربریت محسوس نہیں ہوتی لیکن جب سوسائٹی ان کی اصل سوز حرکات کی مدافعت کے لئے ان کو کافی سزا دینا چاہتی ہے تو اس سزا میں انکو وحشت و بربریت محسوس ہوتی ہے۔ انکے اور مجرمین کیلئے بڑے جذبات شفقت و رحمت اُبھر آتے ہیں۔ مگر جن کے خلاف جرائم کئے جاتے ہیں ان کیلئے شفقت و رحمت کا کوئی حصہ [illegible]

میں جرائم کے اضافہ کا موجب ثابت ہوگا۔ لہٰذا یہ نظریہ بطور مقصد کے قبول کرنا بنی نوع انسان کے حق میں زہر قاتل ہوگا۔ بخلاف اس کے جرائم کی روک تھام کے لئے سزا کو سخت اور شدید ہونا چاہیئے

معیاری سزا کا عبرتناک ہونا

جیسا کہ ظاہر کیا جا چکا ہے، دیگر مساوی حالات میں جتنی کوئی سزا زیادہ عبرتناک ہوگی، اتنی ہی جرائم کی اکساہٹ کے راستہ میں رکاوٹ پیدا کر سکے گی۔ اس لئے سزائیں بجائے درپردہ دینے کے بر سر عام دی جائیں تو دیگروں کو زیادہ عبرت ہوگی۔ عام حالات کی تواریخ اٹھا کر دیکھو، جب کبھی بھی عوام میں کسی چیز سے ڈر پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے تو اس کے لئے جو سزا تجویز کی جاتی ہے وہ بر سر عام دی جاتی ہے۔ مثلاً فاتح ہمیشہ باغیوں کو بر سر عام سزا دیتے رہے ہیں، تاکہ مفتوحین کے دلوں میں سے بغاوت کا عنصر ختم کیا جائے۔ لہٰذا موجودہ جیل خانوں میں بند رکھنا یا چوری چھپے شاذ ہی سے شدید سزاؤں کا نافذ کرنا عبرت پیدا کرنے کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔ اگر تختہ دار پر ایک انسانی زندگی کا خاتمہ کیا جا رہا ہو تو حکومت کا یہ کام ہے کہ جان لینے میں ایسا طریقہ اختیار کرے کہ جمہور اس سے کوئی سبق سیکھیں۔ اس لئے سزاؤں کو عبرتناک بنانے کے لئے ضروری ہے کہ وہ شدید ہوں اور بر سر عام دی جایا کریں۔

معیاری سزا کا پرہیزی عنصر

جہاں تک قید میں ڈال دینے کا تعلق ہے قیدی جیل میں محبوس ہو کر شدید جرائم کے ارتکاب سے بچا رہتا ہے، یا رہائی کے بعد بھی وہ اپنی قید کی مصیبت کو یاد رکھ کر جرائم سے بچنے کی کوشش کرتا ہے لیکن جہاں تک موجودہ بندی خانوں کا تعلق ہے وہاں قیدیوں کو یوں خلط ملط ہونے کا موقع ملا رہتا ہے کہ عادی مجرم دیگر معصوم مجرموں پر پوری طرح اثر انداز ہو کر انہیں جرم کے ارتکاب کی طرف مائل رکھتے ہیں۔ مزید برآں جیل کے معیار زندگی اور بیرونی عمومی معیار زندگی میں چنداں فرق نہیں ہے[1]، اس لئے مجرم جرم کے ارتکاب کے بعد بھی اپنے آپ کو قید خانہ کی چار دیواری میں اجنبیت کا شکار محسوس نہیں کرتا۔ زیادہ سے زیادہ سزا کا پرہیزی مقصد بھی بہت حد تک اس طبقہ کے لئے اثر انداز ہوتا ہے جس کے افراد ایک بلند معیار زندگی[2] کو چھوڑ کر جیل کی پست زندگی میں ایک مصیبت محسوس کرتے ہیں۔ اور ایسے مجرم تعداد میں ہمیشہ قلیل ہوتے ہیں۔ اس لئے موجودہ احتیاجی عنصر جو کہ سزا میں موجود ہے۔ اپنے اثر کے لحاظ سے اگر صفر نہیں تو صفر کے برابر ضرور ہے۔

سزا کو احتیاجی بنانا اس لئے ضروری ہے کہ ایک مجرم جب جرم کی پاداش میں کوئی اجنبی سا ماحول اپنے لئے محسوس کرے تو آئندہ زندگی میں اس اجنبی ماحول کے ڈر سے اکساہٹ کو جرم کے ارتکاب کا موجب نہ بننے دے۔ اب اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے سب سے اچھی سزا بدنی تکلیف ہوتی ہے جو کہ کسی وقت بھی اپنے تصور سے انسان کو لرزہ براندام کر دیتی ہے۔ اور بدنی سزا کی اہمیت کو موجودہ ضابطۂ تعزیرات پوری طرح تسلیم کرتے ہیں۔ مثلاً وہ مجرم جو کہ جیل کی چار دیواری میں جرائم کے ارتکاب سے باز نہیں آتے انہیں بید لگائے جاتے ہیں نتیجہ یہ اخذ ہوا کہ بندی خانے میں مقید مجرم کی جرم کی اکساہٹ کو روکنے کے لئے بدنی سزا تجویز کی جاتی ہے۔ اگر ایسی ہی سزا پہلی صورت میں ہی نافذ کر دی جائے تو وہ احتیاجی طور پر کامیاب سزا ثابت نہ ہوگی؟[3] ۔۔۔ لازماً ہوگی!

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کتنے معصوم مجرم جن کے لئے قید ہی باعث اصلاح بن سکتی ہے، ان کو اتنی سخت سزا کیوں دی جائے لیکن

---

[1] یہ بات شاید اے کلاس کے بارے میں تو بجا ہو، اور کسی حد تک بی کلاس کے متعلق بھی لیکن عام سی کلاس کا معیار بہت پست ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہمارے جیل خانوں میں رشوت کا زور ہے اور رشوت کے بل بوتے پر سی کلاس کا قیدی بھی جنت پا جاتا ہے۔ (ن۔ ص)

[2] یہ لوگ تو اپنے روپیہ کے بل پر جیل میں ہر سامان راحت حاصل کر لیتے ہیں۔ (ن۔ ص)

[3] سمجھ میں نہ آسکا کہ مضمون نگار کی مراد "احتیاجی عنصر" سے کیا ہے؟ (ن۔ ص)

مجھے یہاں پھر کہنا ہوگا کہ یہ جذباتِ ہمدردی مجرموں کے آڑے کیوں آتے ہیں جبکہ وہ انسانی سوسائٹی کے بے ضرر رساں ہیں؟ ان باغیوں سے کسی قسم کی ہمدردی کرنا ان کی تعداد میں اضافہ کرنے اور عام بنی نوعِ انسان کو مصیبت کے منہ میں دھکیلنے کے مترادف ہوگا۔ پھر کیوں نہ جرائم کی روک تھام کیلئے سخت سزا کا نظریہ قبول کر لیا جائے؟ آخر سزا تو اسی کو ہی ملے گی جو جرم کا مرتکب ہوگا۔ کسی امن پسند شہری کو سخت سزا سے کیا ڈر ہو سکتا ہے؟ لیکن اس کے اثرات سوسائٹی پر یہ ہوں گے کہ مجرموں کی تعداد میں تنزل ہوتا رہے گا اور مقابلتہً امن پسند شہریوں کی زندگی زیادہ محفوظ ہوتی رہے گی یقین جانئے کہ سزاؤں کا اجتماعی عنصر مجرموں کی انفرادی اصلاح کا کام بوجہ احسن ادا کر سکیگا بلکہ سزا دینے کا ایک خاص مقصد ہے

معیاری سزا کا منتقمانہ ہونا

نفسیاتی طور پر جب کسی انسان کے حقوق پر کوئی دوسرا انسان چھاپہ مارتا ہے تو اس بے رحمی کے خلاف مظلوم کے دل میں ایک جذبۂ نفرت و حقارت پیدا ہو جاتا ہے جو کہ چھاپہ مارنے والے انسان کے خلاف کارروائی کرنے کے لئے ایک خاص اکساہٹ کو دل میں پیدا کرنے کا محرک ہوتا ہے۔ اس خاص نفرت و حقارت کے جذبہ کی تحریک کے تحت جو عمل ظالم کے خلاف مظلوم بروئے کار لاتا ہے وہ انتقام کے نام سے موسوم ہے۔ اور آج دنیا کے جرائم کی رپورٹوں کو اٹھا کر دیکھ لیجئے زیادہ تعداد ایسے مجرموں کی ہوگی جو کہ منتقمانہ جذبہ کے ماتحت جرائم کے مرتکب ہوئے۔ اس لئے سزا کو ایسا ہونا چاہیئے جو کہ اس انتقامی آگ کو فرو کر سکے۔ جہاں تک ذاتی حقوق سے متصادم ہونے کا تعلق ہے، فرد کو اختیار ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی انتقامی آگ کو فرو کرنے کیلئے سزا کے تعین میں کچھ دسترس رکھ سکے۔ البتہ سزا کے معیار کے متعلق قطعی فیصلہ عدالت کے ہاتھ میں ہونا چاہیئے۔ مثلاً قتل کے جرم سے پیدا شدہ انتقامی آگ کو فرو کرنے کے لئے تین ممکن طریقے استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ یعنی عفو۔ قصاص یا دیت۔ اب ان تینوں چیزوں میں سے جس کسی کے متعلق مظلوم چاہے اپنی خواہش انتقام کے مطابق ملزم سے سلوک کروا سکتا ہے۔ اگر عفو کا طریقہ استعمال کرنا چاہے تو ملزم بری ہو سکتا ہے۔ یا وہ دیت لینے کو پسند کرے تو اس کے لئے معیار عدالت کو مقرر کرنا ہوگا اور اگر وہ قصاص چاہے تو عدالت حسبِ قانون قصاص نافذ کر دے گی۔ گویا ایک مظلوم کے جذبۂ انتقام کو نکلنے کے لئے عدالتی کارروائی کے اندر ایک راستہ مل جائیگا

مذکورہ بالا مبحث کے بعد ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ایک معیاری ضابطۂ تعزیرات کے تحت جہاں تک ذاتی حقوق سے متصادم ہونے کا تعلق ہے، فرد کو اختیار ہے کہ وہ اپنی انتقامی آگ کو فرو کرنے کے لئے عدالتی کارروائی کے اندر گنجائش پا سکے۔ مثلاً عفو کی حالت میں ملزم بری ہوگا، دیت کی صورت میں فوجداری مقدمہ کی نوعیت دیوانی نوعیت میں بدل جائے گی۔ اور قصاص کی صورت میں فوجداری نوعیت قائم رہے گی۔ ہر سہ حالتوں میں عدالت مقدمہ کے حالات کے مطابق سزا کا معیار مقرر کرنے میں قانون کی حدود کے اندر آزاد ہوگی۔

سزا کیا ہونی چاہیئے؟

سزا کا معیار جرم کی نوعیت پر مبنی ہے۔ جہاں تک عدالتی کارروائی کر Procedure کا تعلق ہے۔ دنیا کے ہر ملک میں علیحدہ علیحدہ ضابطے رائج ہیں۔ لیکن ایک چیز سب ممالک کے ضوابط میں یکساں طور پر نظر آئے گی، اور وہ ہے جرائم کی دو حصوں میں تقسیم۔ ایک تو وہ جرائم ہیں جو کہ ان حقوق سے متصادم ہونے کی صورت میں پیدا ہوتے ہیں جن کے تحفظ کی ذمہ داری حکومت نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے، یا وہ جرائم جو خود حکومت کے خلاف کئے جائیں۔ اور دوسری قسم ان جرائم پر مبنی ہے جو کہ انفرادی حیثیت میں انسان کے ذاتی حقوق کو نقصان پہنچانے سے وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ پہلی قسم کے جرائم کی صورت میں حکومت کی مشینری تعزیر کے لئے خودبخود حرکت میں آتی ہے۔ لیکن دوسری قسم کے جرائم ہونے پر حکومت کی طاقت اس وقت تک حرکت میں نہیں آتی جب تک کہ اسے مظلوم فرد اپنی مدد کے لئے نہ پکارے۔ اب مختلف ممالک میں ان دونوں اقسام کے جرائم کی تقسیم مختلف طرح کی گئی ہے مثلاً کسی ملک میں ایک خاص حق کا تحفظ ریاست کے ہاتھ میں دے دیا گیا ہے اور دوسرے ملک کے

کے مطابق وہ حق فرد کی تحویل میں رکھا گیا ہے۔ اب اس تقسیم جرائم میں بھی اس بات کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے کہ منتقم ذاتی کو فرو کرنے کے لئے کیا اقدام کیا جا سکتا ہے۔ اور جرائم کی نوعیت متعدی ہے، یا بالذات وغیرہ وغیرہ۔ مثلاً کسی جرم کے ارتکاب سے جتنے گہرے نقوش سوسائٹی پر باقی رہ جاتے ہیں انہی کے مطابق تقسیم جرائم میں ایک معیار قائم کیا جانا چاہیئے گویا ایک جرم پوری سوسائٹی کے لئے اگر بُرے اثرات کا حامل ہوگا تو ریاست اس کی سزا دینے کے لئے بطور خود حرکت میں آنا ضروری سمجھے گی۔ اور دوسری طرف ایسا جرم جس کے اثرات زیادہ تر مظلوم فرد تک محدود رہ جانے والے ہوں۔ اس کی سزا مجرم کو دلوانے کے لئے حکومت کی مشینری اسی وقت حرکت میں آئیگی جب مظلوم فرد خود تحریک کرے گا۔

گویا ہماری نگاہ میں کئی جرائم کی ان دو قسموں میں تقسیم ضروری ہے البتہ تقسیم کا معیار بدل دیا گیا ہے۔ یعنی انفرادی نوعیت کے جرائم میں فرد ایک فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے کہ کیا اُسے حکومت کی مشینری کو اپنی مدد کے لئے حرکت میں لانا ہے، یا نہیں۔ اور اگر لاتا ہے تو کیا قصاص کے نظریہ کے ماتحت یا دیت کے نظریہ کے ماتحت استمداد کی درخواست کرتی ہے۔ لیکن اجتماعی نوعیت کے جرائم میں ریاست کی مشینری کو فوراً حرکت میں آجانا چاہیئے۔ اور ایسے جرائم میں قصاص کا نظریہ ہی قطعی نظریہ ہونا چاہیئے یعنی اجتماعی جرائم کی سزا قصاص کی صورت میں ہوگی کیونکہ حکومت دیت لے کر جرائم کی تجارت نہیں کر سکتی۔ البتہ فرد کو اس کی گنجائش حاصل ہے کہ وہ چاہے تو مجرم کو شدید سزا سے بچالے۔

اب تقسیم جرائم میں ہمیں یہ سوچنا ہے کہ کون کون سے جرائم سوسائٹی کے خلاف ہیں، اور کون کون سے فرد کے خلاف۔ آج کے قانونی نظام ہمیں اس معاملے میں ایک معیاری تقسیم دینے سے بالکل قاصر ہیں۔ چنانچہ فساد اور فحش کاری سوسائٹی سے ختم نہیں ہوئی۔ اس لئے مجوزہ تقسیم میں ہمیں اس مقصد کو اولین اہمیت دینی ہے کہ سوسائٹی سے فحش کاری اور فساد ختم ہو جائے لازم ہے کہ فحش کاری و فساد سے متعلقہ وہ جرائم جو کہ پوری سوسائٹی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ حکومت کی تحویل میں دے دیئے جائیں تاکہ سخت و شدید سزا کے استعمال سے یہ بیماریاں انسانی سوسائٹی میں کم از کم ہو سکیں۔ اور باقیماندہ جرائم کو فرد کی تحویل میں رہنے دیا جائے۔

بڑے بڑے جرائم ہم جرائم کو تین بڑے حصوں میں منقسم کرتے ہیں:۔

(۱) ریاست کے خلاف جرائم (Offences against the state) جن میں وہ تمام جرائم شامل ہیں جو کہ حکومت کی روزمرہ کی تعین شدہ حدود کو توڑنے سے معرض وجود میں آتے ہوں۔ مثلاً اوزان کی کمی وبیشی، جعل سازی، جھوٹی شہادت دینا یا سچی شہادت کو چھپانا، حکومت کے ملازمین کی قانونی طاقت کی ہتک کرنا۔ ملازمین کے عام برتاؤ کے متعلق جرائم وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔

(۲) اجتماعی زندگی کے خلاف جرائم، جن میں امن عامہ کے خلاف جرائم، مذہب کے خلاف جرائم، اولاد کشی، خودکشی، اغوا، زنا، غیر فطری جرائم، چوری، جبر زنا، لوٹ، بددیانتی، دھوکا دہی، شرارت، مجرمانہ مداخلت بے جا، اعانت مجرمانہ وغیرہ جیسے جرائم شامل ہیں۔

(۳) انفرادی زندگی کے خلاف جرائم، ان میں قتل عمد، قتل، قاتلانہ حملہ، دیگر ضربات شدید وخفیفہ، خطرناک وغیرہ کے متعلقہ جرائم، مجرمانہ ترک ملازمت اور ازالہ حیثیت عرفی کی قسم کے جرائم شامل ہیں۔[۱]

اس تقسیم کے بعد ضمنی نمبر ایک و دو کے متعلقہ سزائیں نہایت سخت اور عبرتناک ہونی چاہئیں۔ تاکہ ان صورتوں سے پیدا شدہ

---

[۱] اس تقسیم و تفریق میں بہت کچھ اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ (م۔ ص)

تر سوسائٹی میں اپنے افراد فقود کے لئے موافق وسازگار فضا نہ پا سکے۔ اور ضمنی عبرتین میں چونکہ جرائم انفرادی زندگی سے متعلق ہیں، اس لئے ان میں فرد کی درخواست پر حکومت کو اقدام کرنا چاہیئے، اور ضابطۂ فوجداری میں یہ رعایت رکھی جانی چاہیئے کہ ان جرائم میں فرد جس قسم کے طریق کار سے انصاف مانگنا چاہتا ہے، مانگ لے! لیکن موجودہ طریقہ کی طرح وہ بیک وقت دوگونہ طریق کار اختیار نہیں کر سکے گا۔ اُسے بہرحال ایک ہی قسم کی مدد (Legal Remedy) مل سکے گی۔ اُسے اختیار رہے کہ دیوانی مدد حاصل کرے، یا فوجداری! جو بھی اس کے انتقام کی تسکین کے اسباب مہیا کر سکے۔

نتیجہ غرضیکہ سزا کیا ہونی چاہئے؟ جرم کی نوعیت جواب دے گی۔ مذکورہ بالا تین اقسام میں سے پہلی دو قسم کے جرائم کی سزا سخت اور عبرتناک ہو گی تاکہ ملک اور سوسائٹی میں شرارت، فحاشی اور فساد پیدا نہ ہو سکے۔ اور تیسری قسم میں چونکہ شر بالذات ہے اور اس کی تسکین کے لئے انفرادی انتقامی آگ کی تسکین کی اشد ضرورت ہے۔ اس لئے اس حلقہ میں فرد کو اختیار رہے کہ وہ حکومت کی استمداد حاصل کرے۔ لیکن تینوں قانونی مددوں (Legal Remedies) میں سے وہ صرف ایک کو بطور طریق کار ( ) قبول کر سکتا ہے۔ اور اس کے بعد عدالت اس طریق کار کی پیروی میں مقدمہ کے حالات کی روشنی میں مناسب سزا تجویز کر سکتی ہے۔

ضابطہ فوجداری کیسا ہونا چاہیئے؟ مذکورہ بالا فیصلہ کن نتیجہ اخذ کرنے کے بعد ہمیں موجودہ ضابطۂ فوجداری پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ انصاف کے نام پر انصاف کا خون کیا جا رہا ہے۔ کئی ممالک میں مقدمات متعلقہ جیوری اور مقدمات متعلقہ مجسٹریٹ کی تقسیم کار فرما ہے۔ یعنی (Indictable) اور (Non Indictable) جرائم کی تفصیل کی گئی ہے۔ بعد ازاں کئی ممالک میں یہ تقسیم مقدمات متعلقہ سمن اور مقدمات متعلقہ سے کی گئی ہے۔ بہرحال ہر ملک کے ضابطۂ فوجداری کو اٹھا کر دیکھ لیجئے تو معلوم ہو گا کہ ایک حصہ مقدمات کا وہ ہوتا ہے جو کہ فوراً معمولی سی شہادت پر فیصل ہو جاتا ہے اور دوسرا حصہ کافی طویل عرصہ میں کئی ایک قانونی موشگافیوں سے گزرتا ہوا فیصلے کی حد تک پہنچتا ہے۔ لیکن انصاف میں دیر کا ہمیشہ انصاف کی ساکھ کو ختم کر دیتی ہے۔ اس لئے انصاف کی ساکھ کو قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ضابطۂ فوجداری میں ایسی شرائط رکھی جائیں کہ مقدمات کم از کم وقت میں ختم ہو کر فیصل ہو سکیں۔ خواہ اس سلسلہ میں انگلستان کی چلتی پھرتی عدالتوں کا سا سلسلہ ہی کیوں نہ قائم کرنا پڑے تاکہ موقع پر شہادت لے کر اُسی وقت فیصلہ سنا دیا جائے اور موقعہ پر ہی سزا بھی دے دی جائے۔ اس لئے اس سلسلہ میں ہمیں اپنے مروجہ عدالتی سسٹم میں بھی بنیادی تبدیلی کرنی ہو گی۔ یعنی بجائے اس کے کہ کسی مقدمہ کے متعلقات عدالت کے پاس جائیں عدالت موقعہ پر پہنچ کر متعلقات کو فراہم کر کے فیصلہ سنایا کرے گی۔ یعنی مجسٹریٹ کی کائنات صرف کمرہ عدالت کے اندر پیش کردہ واقعات تک ہی محدود نہیں ہو گی، بلکہ اُسے بیرونی دنیا سے صحیح واقعات کو فراہم کرنے کی اجازت ہو گی۔

اسلامی نظریہ اس معیاری قسم کے ضابطۂ تعزیرات اور ضابطۂ فوجداری کے بعد ہم کو یہ معلوم کرنا ہے کہ اسلام ان مفروضات کو کہاں تک پورا کرتا ہے؟ اسلامی نظریہ کے مطابق انصاف بے لوث ہونا چاہیئے اور اس کی رفتار کارروائی کو بھی تیز ہونا چاہیئے اسلام کے نظریہ کے مطابق مجسٹریٹ، شہادتی ملزم اور مستغاث کی سب کے سب خدا ترس ہونے ضروری ہیں اور ان میں سے بھی مجسٹریٹ اور شہادتی کا وقت تو بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اس لئے اسلامی نظریہ کے مطابق "انصاف کیا جانا چاہئے" بیچا نہیں جانا چاہیئے" اس لئے [illegible] فوجداری تجویز کیا جائے اس میں عدالت جلد مستغاث کی شکایت کا ازالہ کرنا اور بے لوث انصاف کرنا اگر بطور بنیادی اصولوں کے [illegible]

کرلئے جائیں تو بسلسلہ مقصد انصاف پسندی پورا ہو جاتا ہے۔

جہاں تک ضابطۂ تعزیرات کا تعلق ہے، اسلامی نظریہ کے مطابق جرائم دو شعبوں میں منقسم ہیں:۔

پہلا حصہ وہ ہے جس میں جرم کا شر ایک ذات تک ہی محدود ہوتا ہے اور سوسائٹی پر من حیث المجموع ایسے جرم کا کوئی گہرا اثر نہیں پڑتا مثلاً کسی کو ضرب لگانا، کسی کو گالی دینا وغیرہ وغیرہ۔ اس سلسلہ میں شاکی کو اجازت ہے کہ وہ معاف کر دے، یا قصاص کیلئے دعویٰ کر دے، یا دیت لینے کے لئے درخواست کرے گویا اس شعبہ میں فرد ہی حکومت کی طاقت کو اپنی انتقامی تسکین کے لئے حرکت میں لاتا ہے، اور اس طاقت کو عملی صورت دینے کیلئے راستہ کا تعین بھی کر دیتا ہے۔

باقیماندہ جرائم دوسرے حصے میں آتے ہیں۔ ان کے انسداد کے لئے حکومت کی طاقت از خود محرک ہوتی ہے اور اس قسم کے مجرموں کو سخت اور عبرتناک سزائیں دلواتی ہے تاکہ سوسائٹی میں ایسے متعدی جرائم پھیل کر فحش کاری، فتنہ و فساد اور امن عامہ کیلئے خطرناک صورتِ حالات نہ پیدا کر دیں۔

لہٰذا ہم نے جو معیاری ضابطۂ تعزیرات اور ضابطۂ فوجداری تجویز کیا ہے۔ وہ عین اسلامی نظریہ کے مطابق ہے۔ اس لئے مختصراً ہمارے ضابطۂ تعزیرات کے تین حصے ہونے چاہئیں جن میں ایک وہ حصہ ہو جس میں براہِ راست حکومت کے خلاف اقدامات کے متعلق سزائیں تجویز ہوں۔ دوسرے حصے میں سوسائٹی سے متعلقہ جرائم جن سے فتنہ و فساد، فحش کاری اور امن عامہ کے منافی حرکات سرزد ہونے کا اندیشہ ہو) کے لئے سزائیں تجویز کی جائیں۔ اور ضابطۂ تعزیرات کے یہ دونو حصے حکومت کی مشینری کے ذریعہ سے نافذ کئے جائیں۔ تیسرا حصہ ان جرائم سے متعلق ہو جس میں جرم کی نوعیت انفرادی نقصان کی ہو، اور اس میں صرف شاکی کی ذات کو ہی تکلیف پہنچی ہو۔ اس قسم کے جرائم میں حکومت کی مشینری کو حرکت میں لانے کے لئے شاکی کا شکایت کرنا اشد ضروری ہے۔

اس تقسیم کے بعد اب عدالتوں کے معیار کو بدلنا ہے کیونکہ سزائیں سخت اور عبرتناک ہونگی اور بعض تو بدنی قسم کی سزا پر مبنی ہونگی اس لئے غلط سزا دینے پر ایک فرد کو سخت تکلیف پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ پس شہادت کے متعلق قانون کو زیادہ باقاعدہ بنا کر جھوٹی شہادت کے لئے بھی سخت، عبرتناک اور بدنی سزا تجویز ہونی چاہیئے تاکہ کوئی جھوٹی شہادت دینے کی جرأت نہ کر سکے۔ مزید برآں عدالت کا علاقہ صرف عدالت کے کمرہ میں پیش کردہ شہادت سے پیدا شدہ نتائج تک ہی محدود نہیں رہنا چاہیئے بلکہ ایک خدا ترس مجسٹریٹ کا فرض ہے کہ حالات کا خود مشاہدہ کر کے اصلیت تک پہنچنے کی کوشش کرے اور محکمۂ احتساب کے افسران اور ان کے پیش کردہ شہادتوں پر ہی اکتفا نہ کرے ورنہ آج کی طرح انصاف کا جنازہ نکل جائے گا اور لوگ اخلاقی گراوٹ میں گرتے ہی چلے جائیں گے۔

اوپر کی گفتگو ہمیں اسلامی نظریۂ سزا کے قریب لے جاتی ہے اور ہم ان لکیروں کے دیکھنے کے قابل ہو جاتے ہیں جو اسلامی نظام تعزیرات کا خاکہ بناتی ہیں۔ اب تفصیلات طے کرنے کے لئے کتاب و سنت، اور خلافت راشدہ کے نظائر اور ائمہ فقہاء ؒ کے اجتہادات سے موجودہ قانونی اور عدالتی نظاموں کا مطالعہ کر کے اگر ہمارے بہترین دماغ سر جوڑ کر بیٹھیں تو یہ مہم ایک مناسب مدت میں سر کی جا سکتی ہے۔

عالمِ ناممکنات

ابوالبیان حماد

خارزارِ دشتِ الفت میں رکھا جس نے قدم
وہ کسی سے لرزہ براندام ہو سکتا نہیں

وقف کردی زندگی جس نے محبت کے لیے
کچھ اُسے اندیشۂ انجام ہو سکتا نہیں!

حشر میں ہو جائیں گے آسودۂ اظہار ہم
شوقِ دیدار تشنہ کام ہو سکتا نہیں

بندشوں کو توڑ کر میں پُرفشاں ہو جاؤں گا
طائرِ مجبور زیرِ دام ہو سکتا نہیں

میں جو چاہوں تو پلٹ دوں یہ بساطِ کائنات
ہو اگر ہمت تو پھر کیا کام ہو سکتا نہیں

یا تو مٹ جائیگا یا حق کو کرے گا سربلند
مردِ مومن اور پھر ناکام! ہو سکتا نہیں

ہے یہی طوفِ حریمِ دوست کی اِک یادگار
چاک اپنا جامۂ احرام ہو سکتا نہیں

جذبۂ غم اور کوئی طرزِ نو ایجاد کر
نالۂ دل عشق کا پیغام ہو سکتا نہیں

توڑ دے اب ساقیا! جام و سبو چنگ و رباب
سازگارِ عیش یہ ہنگام ہو سکتا نہیں

مئے گسارانِ حقیقت کو نہ رکھ محرومِ کیف
یہ شعارِ ساقیِ گلفام ہو سکتا نہیں

موجبِ تسکینِ خاطر ہے مرا سوز و گداز
عشق میں حاصل کبھی آرام ہو سکتا نہیں

ہاں کئے جاؤ ستم جرمِ محبت کی قسم!
میں کبھی مستوجبِ انعام ہو سکتا نہیں

مستقل اپنی حقیقت یہ بھی رکھتا ہے ضرور
دہر اک مجموعۂ اوہام ہو سکتا نہیں

چیر کر سقفِ فلک پہنچے گا تا عرشِ بریں
میرا نالہ نالۂ ناکام ہو سکتا نہیں

عشق کہتے ہیں جسے ایثار و قربانی ہے وہ
عشق میں اے دل کوئی خود کام ہو سکتا نہیں

جس طرف پھرتا ہوں پھرتا ہے زمانہ ساتھ ساتھ
میں غلامِ گردشِ ایام ہو سکتا نہیں

اور بھی تو کر رہے ہیں ارتکابِ جرمِ عشق
ایک میں ہی موردِ الزام ہو سکتا نہیں

جس میں اے حماد ہو درد و گداز و سوز و ساز
پھر وہ دل کیا مہبطِ الہام ہو سکتا نہیں؟

اقبالؒ کے قدرداں

حفیظ صدیقی

ہوا ہے خوگرِ اسراف جن کا کبرِ شیطانی
ہوس کی بندگی نے جن سے چھینا نورِ ایمانی
ہیں صوفے جن کے افرنگی ہیں قالین جن کے ایرانی
وہی ہیں جو تڑپ جاتے ہیں خود ہی گا کے یہ مصرع
"لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی"

گنے جاتے ہیں جو قوت کے سچے حمد خوانوں میں
غلامی جن کے ذہنوں میں خوشامد ہے زبانوں پر
عقابی روح ہے بیدار ایسے ہی جوانوں میں
ترانہ ہے یہ اک ان کے پسندیدہ ترانوں میں
"تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں"

ضمیر اپنا جو در در بیچ کر یاں پیٹ بھرتا ہے
وہ جس کا ہر اصولِ زندگی مندی کا سودا ہے
جو اپنے دین و ایماں کو کرائے پر چڑھاتا ہے
وہ اکثر گنگناتے ہیں "خودی کو کر بلند اتنا"
"خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے"

یہ ہیں استاد طبلہ خاں کہ جن کے دم سے ہے ہل چل
گھر پہ باقی ہیں بڑی کافر بڑی چنچل
ادھر مقصود انکو ناچتی پھرتے ہوئے چھاگل
وہیں رہتا ہے گا کر بل کھاتا "طاؤس و رباب آخر"
نہیں کہنے سے بجتا ہے "شمشیر و سناں اول"

جو ان سے بڑھ نہ جائیں ہاتھ سے کہنا کیا ہے؟
اگر زندہ ہیں ہم تو زندگی کا مدعا کیا ہے؟
یہ دیکھیں ابتدا کو اور نہ سوچیں انتہا کیا ہے
انہی سے پوچھئے اس نکتۂ حکمت کی تفسیریں
"نظامِ فکرِ انساں میں مقامِ کبریا کیا ہے؟"

ذرا سا کوئی خطرہ ہو تو دم جن کا اکھڑتا ہے
جو تنکا بھی ہلے، ذہنی توازن تک بگڑتا ہے
وہ جن کی قبرِ تن میں زندگی کا لاشہ سڑتا ہے
وہ ایماں کے حلاوت آشنا سر اس پہ دھنتے ہیں
کہ "مومن ہو سپاہی تو وہ بے خنجر بھی لڑتا ہے"

وہ ملت کے مفکر جو تجدد پر ہوئے شیدا
جنہوں نے رشتۂ قرآن و سنت کا تک چھوڑا
انہی کی سعی سے اقبالؒ کا پیغام یہ پھیلا
"حضورِ مصطفےٰ خود را رساں او سر بسر دیں است"
"وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسین وہی طٰہٰ"

ہیں اس کے شعر آویزاں مقدس آستانوں میں
بہت مقبول ہے وہ نعت خوانوں نوحہ خوانوں میں
صدائیں گونجتی ہیں اس کی ایسے بادہ خانوں میں
بہت ہی وجد کرتی ہو گی روحِ شاعرِ مشرق
کہ اہلِ عرش کے طائر ہیں میرے قدردانوں میں

ادب اور زندگی

قیوم فاروق بی اے

انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر سے آج تک جو چند مسائل بڑے متنازعہ فیہ اور بڑی گرماگرم بحث و تمحیص کا موضوع رہے ہیں ان میں سے ایک ادب (Literature) کے مقام و مفہوم اور حیاتِ انسانی سے اس کے ربط و تعلق کی نوعیت کے تعین کا مسئلہ بھی ہے اس سلسلہ میں زیادہ دو مکاتب فکر میں بٹی ہوئی ہے۔ ایک مکتبِ فکر (School of Thought) ادب کو زندگی سے مطلقاً آزاد و ماورا سمجھتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ادب میں مقصدیت یا افادیت کا خیال جبھی روحِ ادب کو کچلنے کے مترادف ہے ادب احساس و وجدان کی پیداوار ہے۔ اور احساس و وجدان کسی قسم کے حدود کے بارِ گراں کا متحمل نہیں ہو سکتا، ادب کا حاصل اگر کچھ ہے تو وہ ادب ہی ہے۔ اپنے حسی مشاہدہ کو بہترین اور مؤثر ترین پیرایہ میں بیان کر لینا ہی ادیب و فنکار کا کمال ہے، اور یہی "تخلیقِ حسن" ہے۔ ادب کے متعلق اس نظریہ کو "نظریہ" ادب برائے ادب" کا نام دیا گیا ہے۔ اس کے برعکس دوسرا مکتبِ فکر جو "ادب برائے زندگی" کا علمبردار ہے ایسے عناصر پر مشتمل ہے جو زندگی کو بالکل الگ الگ بلکہ متضاد تصور رکھتے ہوئے بھی اس اتفاق میں متحد و مشترک ہے کہ "صنعت حیاتِ انسانی کے تابع ہے اس پر فوقیت نہیں رکھتی"۔ ان کی نگاہ میں ادب کا اولین فرض زندگی کی رہنمائی اور تعمیر ہے۔ وہ ادب ان کے ہاں ادب کہلانے کا مستحق نہیں جس میں حرکت، جدوجہد اور جرأت کا پیام نہیں۔ وہ بے مقصد ادب کا کوئی تصور نہیں رکھتے افادیت ان کے نزدیک ادب کا جزو لاینفک ہے۔ ان کا ایک ترجمان اپنے نظریہ کی ترجمانی یوں کرتا ہے۔

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن	جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا!
مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے	یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا!
جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا	اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا!
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو	جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا!
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں	جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا!

آج کی مجلس میں ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ہر دو نظریات ادب کے عوامل (FACTORS) اور تقاضے، اسباب اور اثرات و نتائج کیا ہوں گے اور ان کی روشنی میں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ ہمارے لئے قابلِ قبول نظریہ کون سا ہے۔ مسئلۂ زیرِ نظر کی تحقیق کے بطور مقدمہ "ادب" اور "زندگی" کا غیر مبہم، سادہ اور واضح مفہوم ذہن نشین ہونا اشد ضروری ہے۔

ادب کا اصل محرک یقیناً عشق یا وجدان ہے۔ یوں تو ہر ذی روح کرب و مسرت، نفرت و محبت اور ہمدردی وغیرہ کے احساسات (FEELINGS) سے تھوڑا بہت آشنا ہوتا ہے لیکن بعض لوگ عامۃ الناس سے بدرجہا زیادہ حساس ہوتے ہیں۔ ان میں اثر قبول

کرنے کی صلاحیت بے پناہ ہوتی ہے۔ ان کی شدتِ احساس کی لطافت، بسا اوقات اپنے جیتے مشاہدہ کا اظہار ایسے طریق پر کرواتی ہے کہ سامع یا مخاطب کے دل و دماغ میں بھی کم و بیش اسی تجربہ و احساس کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ پس جو شخص یہ دو صلاحیتیں رکھتا ہے یعنی شدتِ احساس اور اظہارِ احساس پر قدرت، وہی ادیب و فنکار ہے۔ اور اس کا اظہارِ احساس ــــ "ادب" ــــ لیکن ادب کا سرچشمہ وجدان یا احساس ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ ادب شترِ بے مہار قسم کی کوئی شے ہے اور اس کا انسانی عقل و فہم سے کوئی تعلق نہیں۔ بقول پروفیسر ڈیوی "فن، وجدان اور ذوق، تجربہ کا تحقق پسندانہ انعکاس ہوتے ہیں"۔ آخر یہ احساس و وجدان بھی تو ماحول اور تربیت ہی کی پیداوار ہوتے ہیں۔ آج ایک فاقہ کش انسان کو سسکتے دیکھ کر یا ایک مجاہد کے سر پر اس کی حق گوئی اور ایمان کی وجہ سے مصائب کے پہاڑ ٹوٹتے دیکھ کر ایک فنکار ممکن ہے کوئی خاص اثر نہ لے لیکن عین ممکن ہے کل اس کے ذہنی و قلبی عالم میں بوجوہ ایسا انقلاب آ جائے کہ ایک ایسے ہی منظر کو دیکھ کر اس کی روح کانپ اٹھے، دل تڑپ جائے اور اس کی آنکھوں میں آنسو مچل جائیں اور کرب و درد کا شدید احساس ایک عظیم ادب پارے کی تخلیق کا باعث بن جائے، یا اس کے سراپا میں آتشِ عمل فروزاں ہو جائے، اس کی رگ رگ میں گرمی اور جرأت پیدا ہو جائے اور یہ عالم ایک ولولہ انگیز "ترانے" کا روپ دھار لے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کے احساس و ادراک کی وجہ سے مفکرین عظام فن و ادب پر روشن بین عقل کے پہرے کو لازمی سمجھتے ہیں۔ اوپر کی گفتگو سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ اصل چیز جس کا احتساب کیا جاتا ہے وہ ادب نہیں بلکہ اس امر کا محرک احساس و وجدان ہے، اور احساس و وجدان کا بہت کچھ انحصار انسان کے نظریۂ حیات پر ہے۔

زندگی ایک پیدا سوال ہے۔ یہ حیرت خانۂ عالم کیوں اور کیونکر معرضِ وجود میں آیا ہے، اور ہماری اصل حیثیت اس میں کیا ہے؟ اس کی دو ہی عقلی توجیہات ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ یہ تمام موجودات بشمول انسان اتفاقیہ طور پر نہ جانے کس طرح پیدا ہو گئی ہیں۔ اور اب ان میں لگے بندھے قوانین کے ماتحت تغیر و تبدل اور ارتقاء کا عمل جاری رہتا ہے۔ یہ جہان کہنہ سراسر بے مقصد ہے۔ اور مستقبل میں کسی بھی وقت اتفاقیہ طور پر فنا ہو جائے گا۔ چونکہ ہمیں روزمرہ زندگی میں کسی مافوق الفطرت ہستی کا وجود نظر نہیں آتا ہے۔ اس لئے ہمیں ایسی خیال آرائی کی ضرورت نہیں۔ یہ نظریہ کسی حد تک عقلی تو ضرور ہے، لیکن علمی یقیناً نہیں بلکہ سراسر ظنی اور گمانی نظریہ ہے، جو کوئی مثبت حقیقت پیش کرنے کی بجائے محض منفی پہلو پر قائم ہے۔ اس کے برعکس دوسرا نظریہ جو علمی اور مثبت بنیادوں پر قائم ہے، یہ کہتا ہے کہ ایک قادرِ مطلق حکیم و دانا خالق نے ہمیں اور اس تمام کارخانۂ عالم کو پیدا کیا ہے۔ اسی خالقِ کل نے انسان کو حق و باطل اور خیر و شر کے دوراہے پر چھوڑا ہے اور جہاں ایک طرف حق اور خیر کے راستہ کی نشاندہی کر دی ہے، وہیں دوسری طرف انسان سے ساتھ کچھ ایسی خواہشات، کچھ ایسی رکاوٹیں اور کچھ ایسے عوامل بھی لگا دیئے ہیں، جو ہر گام پر اور ہر آن اسے اس صراطِ مستقیم سے دور لے جانے کا سامان کرتے ہیں۔ اس ذاتِ باری تعالیٰ نے انسان کو شعور و ادراک اور جزوی اختیار عطا کر کے اسے مطلع کر دیا کہ اس فانی دنیا اور عارضی دنیوی زندگی کے بعد ایک ایسا عالمِ آخرت ہوگا جو غیر فانی ہوگا۔ اور جس میں موجودہ عالم کے برعکس حکمران قانون طبیعی قانون نہیں بلکہ اخلاق کا قانون ہوگا۔ جو شخص صحیح ہدایت کو اپنائے گا، اور حق و باطل کی آویزش میں جس کے قدم نہیں ڈگمگائیں گے، وہ ابدی مسرت و کامرانی میں رہے گا اور اس پر میری غیر مختتم رحمتوں اور نعمتوں کی بارش ہوگی اور ہوتی رہے گی۔ دوسری طرف جس نے اپنے لئے گمراہی اور ضلالت ہی کو پسند کیا، اور جو اپنی گھٹیا خواہشات اور عنصرِ بد کا بندہ بنا، اسے عالمِ آخرت میں عبرتناک مصائب اور دکھ تکلیف کا سامنا کرنا ہوگا اور وہ ہمیشہ ابدی لعنت و عتاب میں رہے گا۔ اس مجمل توجیہہ کی تائید جہان کے ہر کونہ اور فکرِ انسانی کے ہر گوشے سے ہوتی ہے۔ یہ [illegible] کا

تنوع اور یہ کون مکان کی وسعت صاف طور پر اپنی علت کی غمازی کرتے ہیں۔ یہ حیرت انگیز ضابطے وجود اور یہ نظم و ربط عالم کسی مجتہد اور مربّر ہستی کی دانائی و حکمت اور علم کا اعلان پکار پکار کر کر رہے ہیں۔ یہ طبیعی قوانین کی کارفرمائی اور اخلاقی اور روحانی ضروریات سے اغماض اور اعلیٰ اقدار کی بے حرمتی اور بے اثری صاف ظاہر کرتی ہے کہ ایک ایسا عالم یقیناً آنے والا ہے جس میں نیک و بد، بڑے اور چھوٹے، اعلیٰ اور ادنیٰ، اور ظالم و مظلوم کے درمیان فیصلہ کیا جائے گا۔ انسان کا اپنا وجدان اس میں عنصر خیر کا وجود اور نیک و بد کا احساس "الخیر" کی موجودگی کی بین دلیل ہے۔ اطاعت اور فروتنی کا پیدائشی رجحان (INSTICT OF SELF-SUBMISSION) لازمی طور پر کسی متبوع ہستی اور برتر حاکم اور قادر مطلق کو چاہتا ہے۔ اور پھر وہ حامل خلق عظیم، محسنِ انسانیت جن کو براہِ راست ربِ کائنات کی طرف سے "ما العلم" میں سے ایک حصہ دیا گیا۔ اس نظریہ کی صحت اور حقانیت کی بہت بڑی شہادت ہیں۔ فی الواقع ان سے ایسے بڑے جھوٹ اور غلط بیانی کی توقع شاید ان کے بدترین لیکن حقیقت پسند دشمن بھی نہ کر سکیں۔

پس یہ دو صداقتیں ہیں جو ہمیں حتمی طور پر موخر الذکر توجیہہ کائنات کو اپنا لینے پر مجبور کرتی ہیں۔ موجودات کی اس توجیہہ سے دنیا کی حیثیت "مزرعۃ الآخرۃ" کی سی ہو جاتی ہے۔ اس سے حیاتِ انسانی کے متعلق جو نظریہ مستنبط ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ دنیا ایک آزمائش گاہ اور سعی و جہد اور کاوش مسلسل کا مقام ہے۔ جہاں مہلت کم ہے اور کام عظیم۔ یہاں انسان کا مقصد وجود حق پر عمل پیرا ہونا اور باطل کو اپنے وجود میں اور خارجی عالم میں ایک ساتھ شکست دینا ہے۔ یہاں محض عیش و عشرت اور آرام کی گنجائش ایک لمحہ کو نہیں۔ زندگی اس رات کا مشغلہ ہے، جو ایک طالب علم امتحان کی صبح سے پہلے بسر کرتا ہے۔ حرکت کا نام زندگی ہے اور سکون، تعطل و جمود (STAGNATION) موت ہے۔ کس قدر عظیم و دلکش اور روح افزا ہے یہ تصورِ حیات اور کس قدر مبارک اور لائق ستائش ہیں وہ مردانِ جری جو اسے اپناتے ہیں۔

آئیے اب ہم دیکھیں کہ ادب کے ہر دو نظریات میں سے ہمارے لئے قابلِ قبول نظریہ کون سا ہے۔ "ادب برائے ادب" کے حامی کہتے ہیں کہ حیات کا ہر شعبہ یا فن صرف اپنے اصولوں کو ہی اپنا معیارِ صحت اور نصب العین قرار دے۔ اپنے ان اصولوں سے باہر کوئی اصول مثلاً اخلاقیات یا روحانیات کا کوئی اصول اس فن کی رہبری کا حقدار نہ ہو۔ فن خود اپنا رہبر ہو۔ اور اس کی ترویج یا ترتیب اور ارتقاء کسی فوق الفن اصول کے ماتحت نہ ہو۔ مختصر یہ کہ حسن خود اپنا معیار ہے اور اپنے سے بالاتر کسی معیار یا اعلیٰ اور نصب العین کو ماننے کے لئے تیار نہیں۔ اس نظریہ پر جواب قائم ہوتا ہے اس کے لاینفک اجزاء حسب ذیل ہیں:۔

اوّل۔ عورت اور جنسی بھوک اس ادب پر چھائی رہے گی۔ یہ بات تو ہر چشم بینا پر واضح ہے کہ انسان میں جو پیدائشی رجحانات (INSTINCTS) پائے جاتے ہیں، ان میں سے ایک شدید ترین یہی جنسی رجحان ہے۔ اب اگر ادب کو بجز ادب و وجدان کے کوئی رہبری قبول نہیں تو لازماً اس کا وسیع ترین حصہ اسی شدید ترین رجحان کی نذر ہوگا۔

دوم۔ موت، شکست، پژمردگی اور تعطل (DEFEATISM) ایسے ادب کی دوسری اہم ترین خصوصیت ہوگی۔ فطرتِ انسانی کچھ اس قسم کی ہے کہ اگر انسان کو کسی تام مقاصد فتح کی دھن اور لگن نہ ہو تو وہ غم، شکست اور موت کے احساس میں ایک گونہ لذت محسوس کرتا ہے بلکہ اسی میں پناہ لیتا ہے۔ چند باہمت لوگوں کو چھوڑ کر جنہیں پہاڑ کی چوٹی پر چڑھنے کی دھن ہو اور جو اس راہ کی مشکلات میں ہی تسکین روح پاتے ہیں، باقی تمام لوگ فرازِ کوہ پر چڑھنے کی نسبت نشیب کی طرف اترنا پسند کرتے ہیں، اور سہل اور بے خطر ہونے کی وجہ سے اسی میں لذت پاتے ہیں۔ "ادب برائے ادب" کی ان خصوصیات کو ترجمانِ حقیقت اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے ذیل کے اشعار میں

کیا خوبصورتی کے ساتھ نمایاں کیا ہے :-

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل ان کا ——— ان کے اندیشۂ تاریک میں قوموں کے مزار!
موت کی نقش گری ان کے صنم خانوں میں ——— زندگی سے ہنر ان برہمنوں کا بیزار!
چشم آدم سے چھپاتے ہیں مقامات بلند ——— کرتے ہیں روح کو خوابیدہ، بدن کو بیدار!
ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس ——— آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار!

ایسے ادب کے انسانی زندگی ——— فرد اور جماعت دونوں کی زندگی ——— پر جو اثرات مترتب ہوں گے، آیئے کچھ ان کا بھی اندازہ کریں :-

عورت اور موت جب فکر انسانی اور تخلیقاتِ ادب پر یوں مسلط ہو جائیں تو اس کا لازمی نتیجہ انسان کے قوائے عملی کے تعطل و جمود، صنفی انتشار، اخلاقی بے راہ روی، بزدلی، افسردگی اور زندگی سے گریز اور فرار کی صورت میں نکلتا ہے۔ یہ چیزیں جہاں انسانوں کو فرداً فرداً اسفل السافلین میں گرا کے رہتی ہیں، وہیں یہ قوموں اور ملتوں کی موت کا پروانہ بھی ثابت ہوتی ہیں۔ یہ ادب زوال کا پروردہ، زوال کا نقیب اور زوال کا معاون ہوتا ہے۔ اس لئے اعلیٰ انسانی قدریں ( ) تباہ ہوتی ہیں اور جھوٹی اور غلط قدروں کی تخلیق ہوتی ہے۔ اس نظریۂ ادب کے حق میں الفاظ و فقرات کے بڑے بڑے حسین جال بنے جاتے ہیں۔ اس کے علمبردار بزعم خویش بڑے آفاقی، وسیع النظر اور فطرت انسانی کے اصل نباض ہوتے ہیں۔ لیکن حقائق کی تحقیق پسندانہ کسوٹی پر آتے ہی ان تمام نظر فریب دعاوی کی حقیقت کھل جاتی ہے اور یہ تمام نقش محل زمین پر آ رہتے ہیں۔ اس چند روزہ قیام عالم میں ایسا بے کار، بلکہ مضر ادب ہمیں کیونکر گوارا ہونے لگا۔ جبکہ عظیم مقاصد ہمیں ہر لحظہ میدانِ عمل کی طرف بلا رہے ہوں۔ یہ ادب کا نظریہ بظاہر نظر فریب ہونے کے باوجود در اصل اس قدر تشنہ ناکمل ہے کہ خود اس کے بانیوں اور رہنماؤں کو احساس ہوا ہے کہ "ادب برائے ادب" کا جمالی جواز مکتفی بالذات نہیں۔ جمالیات ایک خاص مرحلہ پر پہنچ کر اخلاقیات سے الگ نہیں رہ سکتی۔ "ادب برائے ادب" کا اصل موجد والٹر پیٹر خود اپنے مضمون "اسلوب" میں "اچھے فن" اور "اعلیٰ فن" میں تمیز کرتا ہے۔ اچھا فن وہ ہے۔ جو بلحاظ فن تکنیک اس کے نظریہ پر پورا اترتا ہے لیکن اعلیٰ آرٹ وہ ہے جو بڑے اعلیٰ مضمون میں اخلاقی ضروریات کو پورا کرتا ہو "اچھے فن" کا "اعلیٰ" ہونا ضروری نہیں۔ نظریہ ادب برائے ادب کے ایک معمار کروچے کا خیال ہے کہ ادب وجدان کا ایک اندرونی فعل ہے، جمالی فعل ذہن کے اندر کسی شکل کی تخلیق پر منحصر ہے اور یہی وہ چیز ہے جو اپنا معیار آپ ہے، اور اس کے لئے کسی بلند تر قدر کی ضرورت نہیں لیکن جہاں تک اس اندرونی فعل کے بیرونی اظہار، اور اندرونی تصنیف کے خارجی جسم ——— یعنی تخلیقی ادب ——— کا تعلق ہے، وہ نقاد کی تنقید بلکہ اخلاقی پابندیوں کی گرفت میں آ سکتا ہے، کیونکہ اب یہ اندرونی وجدان کا سوال نہیں رہا بلکہ ایک عمرانی مسئلہ ہے۔

"ادب برائے ادب" کا نظریہ فی الحقیقت ایک تنبد بے در سے کم نہیں۔ یہ ایک مہلک چیز ہے اور انسان اور انسانیت ہر دو کیلئے پیغام زوال و موت اور اس لئے قطعاً ناقابل قبول ہے۔ صحت مند اور پسندیدہ ادب وہی ہو سکتا ہے جو بہتر طریق زندگی کی نشاندہی کرے، جو انسان میں جرأت، عزم بلند اور عمل پیہم کی روح پھونکے اور جس سے انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی سنورے۔ زندگی کے مہمات مسائل سے الگ رہ کر ادب ایک ایسی جنت ہے جس میں حور نہیں۔

علامہ اقبال رسالہ "نیو ایرا" میں لکھتے ہیں کہ "حیات تمام انسانی اعمال کا منتہائے مقصود ہے، انسانی اعمال کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس کی

بازگشت

دلاد سعیدی

اٹی ہوئی تھی کائنات ظلمت و غبار سے
طلوعِ صبحِ نو ہوئی عرب کے ریگزار سے

میں اس طرح چھا گیا ہوں لیکے نامِ حق!
نظر میں احترامِ حق زباں پہ میری نامِ حق

بجز پیامِ حق رہا نہ کچھ مرے سجود میں
قیام میں، سجود میں، سلام میں، درود میں

مری صدائے حق سے دشت و کوہسار گونج اٹھے
بطونِ کاخ و قصر و قلعہ و حصار گونج اٹھے

بڑھا قبائے کفر و شرک تار تار کرکے میں!
صنمکدوں کی عظمتوں کو بے وقار کرکے میں

کیا ہے میں نے نشرِ کائنات ہست و بود میں
خدا کا آخری پیام گوشِ ھسرو جود میں

لرز اٹھے "بتانِ آب و گل" نگاہِ پاک سے
بلند حق کا غلغلہ ہوا جہانِ خاک سے

بڑھا حدودِ "امتیازِ نام و نسل" توڑ کر
"بتانِ کبر و ناز" کی کلائیاں مروڑ کر

میں سازو برگِ ظلم و جہل روندتا چلا گیا
میں ظلمتوں کی وادیوں میں کوندتا چلا گیا

بلند پستِ زندگی سے کھیلتا چلا گیا!
میں زندگی کی وسعتوں پر پھیلتا چلا گیا

نشاں مری جبیں پہ کامرانیوں کے جلوہ گر
میں فتحمندِ خشک و تر میں فتحیابِ بحر و بر

علم مرا کہاں کہاں بلندیٔ نظر ہوا
سپین و مصر و شام کے افق پہ جلوہ گر ہوا

پیامِ حق کی روشنی بہر جہت چمک اٹھی
جبینِ روم و فارس و طرابلس دمک اٹھی

علم کیا بلند میں نے سرزمینِ سندھ پر
میں رفتہ رفتہ چھا گیا تمام ارضِ ہند پر

میں فاتحِ عرب رہا، میں فاتحِ عجم رہا
سرِ غرورِ ایشیا مرے حضور خم رہا

مرے جنوں پہ دنگ رہ گئے زمین و آسماں
حدیں خرد کی توڑ کر بڑھا ہے میرا کارواں

طلوع "ارضِ پاک" سے ہوئی ہے پھر مری سحر
اٹھا ہوں آج تیغ لے کے پھر خدا کے نام پر

پہاڑ حادثوں کے میرے راستوں کو چھوڑ دیں
حدیں تعینات کی تمام اپنی توڑ دیں

کسی سے میرا سیلِ آتشیں نہ رک سکیگا اب
اٹھی ہوئی قیامتوں کا سر نہ جھک سکیگا اب

مری رگوں میں پیچ و تاب کھا رہا ہے خونِ گرم
مری رگوں میں زلزلے اٹھا رہا ہے خونِ گرم

برس رہی ہیں بجلیاں نگاہِ شعلہ بار سے
شرار اٹھ رہے ہیں میری تیغِ آبدار سے

دیارِ کفر میں رہوں گا ہو کے فتحمند میں
خدا کے نام کو کروں گا آج پھر بلند میں

حقیقی ۔۔۔ کے بس حقیقت تکاتی انحراف کی بنا پر محض حلے ڈھلنے شعر کو کس طرح تباہ کیا جا سکتا ہے! (د. سعیدی) مگر جب تک "ریلتا" "دھکیلتا" قوافی موجود ہیں ۔۔۔ بلند کافی نہیں ۔ (ن. ص)

استفسارات

کالج کے ماحول میں ڈاڑھی

کیا اس ماحول میں جو کہ آج کل اسکولوں اور کالجوں میں ہے، ایک اسلام پسند طالب علم اپنے مقصد کو کامیاب بنا سکتا ہے؟ اگر واقعی وہ اس نظامِ تعلیم کے ماحول میں اسلام کو عملی جامہ پہنائے تو کالج کی زندگی میں اسکو کون لینا دینا ہو جاتا ہے۔ کیا یہ جائز نہ ہوگا کہ وہ دینی ارکان ادا کرتے رہے لیکن ماحول کے پیش نظر ڈاڑھی وغیرہ کا مسئلہ نظر انداز کر دے، کیونکہ اس ایک چیز کی وجہ سے وہ سوسائٹی میں بیٹھنے کے قابل نہیں رہتا اور اس کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ وہ اپنے مقصد کو عام کرنے کے لئے کالج میں تقاریر وغیرہ بھی کرنے سے رہ جاتا ہے۔

میں مانتا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ حدیث بالکل صحیح ہے کہ دوسری اقوام کی مشابہت کرنا ممنوع ہے لیکن آج کل کے حالات میں ایک طالب علم محض ڈاڑھی کی بنا پر بڑی بڑی ترقیوں کو ضائع کر دیتا ہے۔ ہمارے اسکولوں اور کالجوں میں چونکہ طلبا کی اکثریت دین سے بے بہرہ ہوتی ہے اس لئے ایک اسلام پسند طالب علم ان میں کوئی حیثیت (Position) پیدا نہیں کر سکتا۔

اسلام بہت بلند مرتبہ دین ہے اور سراسر خدا کی خوشنودی ہے، اس لئے اسلام تو اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ تم محض ڈاڑھی اور اس قسم کی دو چار چیزوں کی بنا پر ترقی کا راستہ بند کر لو۔ اسلام تو یہی حکم دیتا ہے کہ تم خیالات بلند رکھو، علم حاصل کرو، ترقی کے راستوں پہ گامزن رہو اور دنیا میں سورج کی طرح چمکو، اس طرح تم قوم کو اور اپنے آپ کو اور اسلام کو زیادہ فائدہ پہنچا سکتے ہو۔ نہ کہ تم محض بالوں اور ڈاڑھی کی تراش خراش کے مسئلہ پر اٹک جاؤ، اور اس چھوٹی سی بات کے لئے ایک بڑا نقصان اٹھاؤ۔

دوسری بات یہ ہے کہ ایک طالب علم کالج میں کس طرح دین پر عمل کرنے کے ساتھ ساتھ ایک ممتاز (Shining) طالب علم بن سکتا ہے! ان دونوں کا ایک ساتھ حاصل ہونا بہت مشکل ہے۔

آپ کا یہ خط آپ کی جس ذہنی پیچیدگی کا مظہر ہے وہ اس قابل ہے کہ پورے ہمدردانہ جذبات کے ساتھ اس پر توجہ کی جائے مگر ساتھ کے ساتھ یہ خط عبرتناک بھی ہے کہ آدمی ایک غلط کام کرتے ہوئے جس کمزوری کا عملی اظہار کر رہا ہوتا ہے اس کے لئے اس کا دماغ کیسے خوشنما اور محسوس دلائل گھڑ گھڑ کر سامنے لاتا ہے۔

خصوصاً آپ کے خط کا تیسرا پیراگراف تو بالکل اس تکنیک کا شاندار نمونہ ہے جسے کراچی میڈ اسلام کے ائمہ مجتہدین دن رات استعمال کرتے رہتے ہیں۔ اسلام کے جس امر و نہی کے خلاف ان کو فتویٰ دینا ہوتا ہے یا جس حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنانا ہوتا ہے تو اس موقع کے یہ "مجددین اسلام" اپنے فتوے کی تمہید اس طرح کی باتوں سے باندھتے ہیں کہ اسلام تو بڑا اونچا، بڑا ترقی پسند، بڑا متحرک، بڑا وسیع دین ہے

وہ بھلا ایسی اور ایسی باتوں میں کیوں رکاوٹ ڈالنے لگا! ——— اور پھر اس تمہید کے بعد بے تکلف فتوای نشر کر دیتے ہیں۔

ایک شخص جو ڈاڑھی رکھنے کو اپنے لئے لازم طور پر صحیح فعل سمجھتا ہو کوئی وجہ نہیں کہ وہ کسی کے مذاق اور کسی کے اختلاف کی پروا کرے کیا ایسا نہیں ہوتا کہ آپ اگر کسی دیہاتی ماحول میں جائیں جہاں پیری مریدی اور تعویذ گنڈے اور قبر پرستی کے چرچے عام ہوں اور وہاں جا کر آپ اپنے علم اور اپنے یقین کے پیش نظر عوام کے خلاف معقول روش اختیار کریں تو کیا ایسا نہیں ہوتا کہ لوگ آپ کو بدمذہب یا وہابی کہیں ——— پھر کیا آپ ایسی حالت پیش آنے پر دینی روش ان کے حسب منشا بدل لیں گے؟ اسی طرح ایک دور افتادہ علاقے میں چیچک کا ٹیکہ لگوانے کو احمقانہ حرکت سمجھا جاتا ہو تو کیا اس میں رہ کر آپ واقعی اسکو حماقت تسلیم کر لیں گے؟ اسی طرح اگر آپ کسی بستی میں رنگین چشمہ لگا کر یا کھلا پاجامہ پہن کر داخل ہوں اور وہاں کی جنگلی عورتیں اور بچے آپ کا مذاق اڑانے لگیں تو کیا آپ فوراً ان کے مذاق کے مطابق اپنے اندر تبدیلیاں پیدا کر لیں گے؟ اسی طرح اگر کسی جگہ انگریزی بولنے پر آپ پر لوگ فسق کا فتوای لگا دیں تو آپ آئندہ انگریزی بولنے سے تائب ہو جائیں گے؟

نہیں! ——— کیونکہ آپ کو اپنے علم کے تحت پورا پورا یقین ہوتا ہے کہ آپ برسر حق ہیں اور آپ اپنے گرد و پیش کے لوگوں کے مقابلے میں حقیقت کو زیادہ اچھی طرح جانتے ہیں۔ اس خود اعتمادی کی وجہ سے... دوسروں کے مقابلے میں آپ کے اندر احساس کہتری نہیں ہوتا!

مگر سوال میں آپ نے جس مسئلہ کو پیش فرمایا ہے اس میں آپ کے باطن کی حالت ہی درحقیقت مختلف ہے۔ آپ کے اندر اسلام کی وہ شعوری روح جاگی ہی نہیں جس کے تحت آپ ڈاڑھی رکھنے کو بہ حیثیت مسلمان اپنے لئے مقدم اور موجب خیر سمجھتے، بلکہ ابھی تک دوسروں کا نمونہ ہی آپ کے ذہن میں درجہ قبولیت حاصل کئے ہوئے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ ان کے خلاف عمل کرنے کو سوچتے ہیں تو آپ کو اپنی اس حرکت میں احساس کہتری محسوس ہوتا ہے، آپ سمجھتے ہیں کہ میں ایسا کروں گا تو قدامت پسندی کا مجرم بن جاؤں گا، میں ایسا کروں گا تو یہ عزت نفس کے خلاف کوئی کارروائی ہوگی، میں ایسا کروں گا تو اپنے کچھ مسلمہ آداب و تہذیب کی خلاف ورزی کر بیٹھوں گا۔ یہ چیز ہے جو اندر چھپی ہوئی بیٹھی ہے اور اس کی تحریک سے دماغ گوناگوں دلائل گھڑتا ہے۔

خدا کا دین ——— اور اس کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا جزو بھی اس سلوک کا مستحق نہیں ہے کہ اسے احساس کمتری کے ساتھ قبول کیا جائے۔ جو چیز واقعۃً آدمی کی عقل کی نگاہوں میں اسے کہتری بنانے والی ہے اور جس کے اختیار کرنے سے وہ اپنے آپ کو حقیر محسوس کرنے لگے، آخر اسے اختیار کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اسے سیدھی طرح چھوڑ دیا جائے۔ دین تو ان لوگوں کے عمل میں لانے کی چیز ہے کہ جو اسے احساس برتری کے ساتھ، اعتماد غالب کے ساتھ اور عزت نفس کے ساتھ اختیار کریں۔ یہ انقلابی دین مجاہد ہے کا دین ہے اور اس میں جو کوئی داخل ہوتا ہے وہ گویا تنا بھر میں الحاد اور بدی کی طاقتوں کے خلاف جنگ کرنے کے لئے سپاہی بھرتی ہوتا ہے۔ آپ سوچئے کہ وہ سپاہی معرکہ ہائے اسلام کے لئے کہاں تک کارآمد ہو سکتا ہے جسے اگر اسلام ایک خاص وردی پہنا کر محاذ پر لے جائے تو اسے یہ ندامت کھائے جا رہی ہو کہ حریف میرا مذاق اڑائے گا اور وہ کیا کہے گا کہ یہ کیسی عجیب و غریب وردی میں نے پہن لی ہے! جس سپاہی کے لئے حریف طاقت کا ذوق ہی معیار فیصلہ ہو وہ آخر اس حریف کے خلاف لڑے گا کیا؟ جس کا دل اندر سے مقابل کی فوج سے مرعوب ہو رہا ہو وہ بھلا کیا جانبازیاں دکھائے گا!

آپ کہہ سکتے ہیں کہ ڈاڑھی کا معاملہ تو چھوٹا سا معاملہ ہے ——— اور ہم تسلیم کرتے ہیں کہ یہ شریعت کے درجہ اول کے مطالبہ میں شامل نہیں ہے لیکن اس چھوٹے سے معاملے میں آپ جس ذہنیت اور سیرت کی جس کمزوری سے کام لے رہے ہیں وہ بہت بڑی

نفسانی کی جیت ہے۔ آپ نے اپنے اندر ایک ایسی قوت برحال پال رکھی ہے کہ جو خدا اور رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے دین میں تصرف اور مداخلت کرنے کی جسارت کرنے والی ہے، جو عدم اطاعت کے لئے دلائل گھڑتی ہے، جو شریعت اسلامیہ میں ترامیم کرتی ہے اور جو آپ پر کافی زور دخل رکھتی ہے۔ خوب سمجھ لیجئے کہ یہ شیطان کا ایک بڑا مضبوط ذہنی مورچہ ہے دشمن کا یہ ایک مورچہ ہے جو عین آپ کی سیرت کے قلعے کے اندر قائم ہے اور اس مورچے سے جب بھی دشمنی طاقت چاہے تباہی پھیلا سکتی ہے! کیونکہ معاملہ ایک ڈاڑھی کے مسئلے تک تو رکنے کا نہیں، اور حالات صرف کالج کے ماحول تک محدود نہیں۔ اس ناسازگار ماحول میں آپ دین کا جو کام بھی جس دائرے میں جاکر کریں گے وہیں ان سارے حالات سے سابقہ پیش آئیگا جن سے آپ دوچار ہیں۔ آپ نماز پڑھیئے تو مذاق اڑایا جائیگا، آپ دینی لٹریچر مطالعہ کیجئے تو آپ کو ملا کہا جائے گا، آپ ملازم ہوکر رشوت سے پرہیز کیجئے تو شکی بنایا جائیگا، آپ گندے سینما سے پرہیز کیجئے تو رجعت پسندی کا خطاب ملے گا، آپ اسلامی نظام کا نام لیجئے تو گلی گلی ہی نہیں ملک کی پارلیمنٹ میں وزیروں تک کی زبان سے پورے انداز حقارت کے ساتھ "مولوی" بلکہ کٹھ ملا کہا جائے گا، آپ "فنون لطیفہ" سے اظہار بیزاری کرکے دیکھیے فوراً آپ کو عہد قدیمہ کی یادگاروں میں شمار کیا جائیگا، آپ سود کی مخالفت کیجئے، آپ کو احمق اور ان پڑھ سمجھا جائیگا، ـــــــ اور آپ کی عملی اصلاحات ہر جگہ آپ کی ترقی میں رکاوٹ بنے گی۔

نظام باطل کے ماحول کو تو ایسا ہونا ہی چاہیئے کہ وہ اپنے اندر اہل حق کو پنپنے نہ دے۔ اس میں اہل حق بن کر اگر پروان چڑھ سکتے ہیں تو صرف ایسے لوگ جو اپنے دین پر پورا اعتقاد، اپنے علم پر مکمل بھروسہ اور اپنے پروگرام کو عمل میں لانے کے لئے ناقابل ختم عزم رکھتے ہوں۔

یہ چیزیں اگر نہ پائی جائیں، اور محض مسلمان قوم میں پیدا ہونے اور دین کی کچھ باتیں سننے سے احساس مسلمانی حرکت میں آئے تو ایسا کمزور احساس کہ جو پہلا قدم اٹھاتے ہوئے جھجک رہا ہو وہ آخر کس کس مورچے سے پسپا نہ ہوگا اور اس کی پسپائی کی حد کیا ہوسکتی ہے؟

آپ ایک طرف تو اپنے ماحول میں مسلم اور داعی اسلام بن کر قدم رکھتے ہیں ـــ دوسرے لفظوں میں آپ نے مسلم بن کر اپنی زندگی کا اصول یہ قبول کیا کہ جو کچھ خدا کا دین کہیگا اس کے سامنے سر تسلیم خم کردوں گا اور پھر یہی اصول ہے کہ جس کی آپ تعلیم و دعوت دوسروں کو دیں گے لیکن اگر آپ سے کوئی یہ سوال کر بیٹھے کہ جس دین کو آپ نے مانا ہے اس میں ڈاڑھی رکھنے کا حکم تو بھی موجود نہ تھا وہ کیا ہوا؟ ـــــــ آپ اس سوال کا جواب کیا دیں گے؟ آپ کا راستبازانہ جواب اگر کچھ ہوسکتا ہے تو یہ کہ میں نے ایک خدا کے سامنے ہی سر نہیں جھکایا ہے بلکہ کچھ گوشوں میں اپنے ماحول اور اپنے نفس کے آگے سر جھکانے کا فیصلہ بھی کیا ہے۔ سوچیے کہ معاملہ کیا شرک تک نہ جا پہنچیگا! اور آپ کی یہ مسلمانی کیا اس مسلمانی سے حقیقت میں کچھ بھی مختلف ہوگی کہ جو چاروں طرف موجود ہے اور جو آپ کے اندر بھی پہلے سے پائی جاتی ہے، فرق اگر کچھ ہو جائیگا تو صرف اتنا کہ پہلے خدا کا دائرۂ اقتدار ذرا چھوٹا تھا، اب آپ نے اسے بڑا کردیا، اندر کے مقابلے میں ماحول اور نفس کی خدائی کا دائرہ ذرا سکیڑ دیا اور آگے کون جانے کہ یہ برتنہ برآمد کیا کیا شکلیں پیدا کرکے رہے گی!

ڈاڑھی واقعی احکام میں سے چھوٹا حکم ہے، لیکن اس کی اصل اہمیت ہی یہ ہے کہ مخالف ماحول میں اس سے چہرے کو آراستہ کرکے ایک آدمی جرأت مندی سے صاف صاف اعلان کرتا ہے کہ میں اب وہ نہیں رہا جو پہلے تھا، میں بدل گیا ہوں، میں ماحول سے اختلاف کرتا ہوں، میں فضا سے جنگ کا اعلان کرتا ہوں، میں ہوا کے ساتھ اڑنے پر تیار نہیں ہوں، وہ اپنے اسلام کو احساس کمتری سے چھپا کر اور دوسروں کی نگاہوں سے بچا بچا کر رکھنے کے بجائے ان سے پورے احساس برتری کے ساتھ کہتا ہے کہ لو اب میں نے وہ چیز قبول کرلی جس کا تم مذاق اڑایا کرتے تھے، لو میں نے اس دین کو برحق مان لیا ہے جس کے قبول کرنے والوں پر تم قدامت کی پھبتیاں کستے ہو، اور گویا وہ ان کو چیلنج کرتا ہے کہ تم کو جو کچھ کرنا ہو کرلو، جو جو ہتھیار میرے خلاف استعمال کرنے ہوں ان سب کو آزمالو۔ موجودہ مخالف ماحول میں ڈاڑھی رکھنا ذہنیت و سیرت کے انقلاب کا اعلان ہے

آپ کو اپنے ماحول کو راضی کرنے کی فکر بہرحال چھوڑنی ہی پڑے گی، یہ آپ کے لئے ناقابلِ برداشت ہو ہی جانا چاہیئے، اس میں رہتے ہوئے آپ کو بھی محسوس ہونا چاہیئے کہ جیسے آپ گندے تالاب میں ڈال گئے ہیں، یہی چیز تو اسے تبدیل کرنے اور اس کے خلاف جد و جہد کی محرک بنے گی، لیکن آپ ہیں کہ اس جد و جہد سے فرار چاہتے ہیں۔

جہاں تک عزت کا تعلق ہے، وہ آپ کے اپنے ہاتھ ہے، جب تک آپ خود اپنی نگاہوں میں ذلیل نہ ہوں گے، ماحول کبھی بھی محض تمسخر کر کے آپ کو ذلیل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا آپ دین کے اتباع میں اپنے آپ کو معزز محسوس کرنا شروع کریں، پھر اگر ماحول آپ پر ملّا اور مولوی کی پھبتیاں بھی کسے گا تو بھی آپ دیکھیں گے کہ یہ پھبتیاں خود معزز ہو کے رہ جائیں گی! ہم سب ان پھبتیوں کی زد پر ہیں، لیکن چونکہ ہم اپنے اندر احساسِ کمتری نہیں رکھتے اس لئے ان پھبتیوں میں سے پھبتی پن خود بخود ختم ہو رہا ہے اور ایک وقت ایسا آئے گا کہ یہ الفاظ بالکل دوسرا مفہوم دینے لگیں گے!

تعلیمی ترقی میں دینداری کیونکر حائل ہو سکتی ہے، اگر آپ ایک وقت دینداری کا عملی نمونہ ہوں اور دوسری طرف ذہانت و قابلیت کا ثبوت دیں، چنانچہ پاکستان کے متعدد کالجوں میں آپ کو ایسے طلبا ملیں گے جو ایک طرف دینی و اخلاقی لحاظ سے مسلم ہیں تو دوسری طرف ان کی قابلیت کی دھاک بھی بیٹھی ہوئی ہے اور وہ تقاریر اور مباحثوں میں بھی دوسروں سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔

آخر میں یہ بھی ذہن نشین کر لیجئے کہ ڈاڑھی کا حکم حدیث تشبّہ سے ماخوذ نہیں ہے، بلکہ یہ الگ اور مستقل حکم ہے!

شاعر بے عمل کیوں ہوتا ہے؟

میں بڑی سنجیدگی سے معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ شاعر بے عمل کیوں ہوتا ہے؟

قرآن میں "وانّھم یقولون ما لا یفعلون" خصوصیت سے شعرائے جاہلیت کے لئے کہا گیا ہے اور ایمان لانے والوں اور عمل صالح کرنے والوں کی پوری سوسائٹی کو ان کے مقابل اس ارشاد سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے۔

جو لوگ شعر و شاعری کو ایک اخلاقی ذمہ داری رکھنے والے مقصد کی خدمت کا ذریعہ بنائیں وہ تو خیر بچ نکل سکتے ہیں، لیکن بے مقصدی کی فضا میں جو لوگ شاعری کرتے ہیں یا مادہ پرستانہ مقاصد کو پیشِ نظر رکھتے ہیں وہ بالعموم بے عملی ہی نہیں، بدعملی کے گڑھے میں جا گرتے ہیں۔

من حیث المجموع شعر میں انہماک کے دو اثرات ہیں جو بے عملی کا موجب بنتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ خیالیت اور خیالیت کی دنیا میں بھی صنعت کاری تفکر فی نفسہٖ ایک ایسی مصروفیت ہے کہ اس کے ساتھ ٹھوس قسم کی عملیت اور دوڑ دھوپ نبھتی نہیں۔ شاعر کے دماغ میں داخلیت پسندی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اس کے لئے اپنے اندر کی دنیا میں بہت سی مصروفیات موجود ہوتی ہیں۔ خیالات کے نو بنو قافلوں کی رفتار رہتی ہے جو نت نئے معانی شاعر کے اعتبار سے لئے ہوئے گزرتے ہیں، اگر شاعر ان کے استقبال سے ذرا غافل ہو تو یہی بات پیدا ہو جاتی ہے کہ:

مئے تو اوستہ نے جا میں بتری قسمت کی ہچکی رہی

خیال کی محفل میں اگر شاعر نے ٹھیک وقت پر گزرنے والے کارواں کو پا لیا تو پا لیا، ورنہ وہ اس کا انتظار کئے بغیر گزر جائے گا اور اس کے حصہ کی چنگاریوں کی دولت ساتھ ہی لے جائے گا۔ چنانچہ زندگی کی دوسری مصروفیات میں لگے ہوئے شاعر کو اگر کسی کاروانِ فکر کی گھنٹیوں کی آواز اپنے دل سے سنائی دیتی ہے تو وہ ہر مصروفیت کو چھوڑ کر لپکتا ہے اور لپک سکے تو بے چین ہو جاتا ہے، اس کی توجہ ہر دوسری مصروفیت سے اچٹ

جاتی ہے" اور پھر اگر وہ کوئی کام کرتا ہے تو اس میں بُری طرح ناکام اور پھسڈی اور نااہل ثابت ہوتا ہے۔ اس صورتِ حالات کا مجموعی نام آپ بے عملی رکھیں گے۔

دوسرا اثر شعر میں انہماک کا یہ ہوتا ہے کہ قوتِ کار کی ندی کا بہاؤ کاوش ذہنی کی طرف ہو جاتا ہے اور یہ تو معلوم ہے ہی کہ کاوشِ ذہنی دوسرے کاموں کی بہ نسبت زیادہ قوت کھا جاتی ہے۔ پس مزید عمل کے لئے قوت باقی نہیں رہتی۔ علاوہ بریں ہر شخص اپنی صلاحیتوں کے مطابق جس کام کے لئے پیدا کیا گیا ہوتا ہے، جب وہ اسے خوش اسلوبی سے کر چکتا ہے تو اس کے اندر ایک ذہنی اطمینان پیدا ہوتا ہے کہ "کارے کردم" اس اطمینان کے پیدا ہونے کے بعد کسی دوسرے دائرے میں کام کرنے کا جذبہ ہی باقی نہیں رہتا، یا کمزور ہو جاتا ہے۔

لیکن میں اس تشریح سے اُس "تضادِ فکر و عمل" کے لئے کوئی جواز نہیں بہم پہنچا رہا، جو عام طور پر شعراء میں آپ پاتے ہیں۔ تضاد تو خالص شعراءِ جاہلیت کی سیرت کو گوارا ہو سکتا ہے مسلم شاعر یعنی جس کا ذہن اور جس کی شاعری مسلمان ہو، فکر و عمل کے تضاد کا مریض نہیں ہوا کرتا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ ٹھوس عملی سرگرمیوں میں کسی قدر پھسڈی اور کمزور ہوتا ہے، چنانچہ آپ حسان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسی بزرگ ہستی کی سیرت کے مطالعہ سے بھی اس حقیقت کو پا سکتے ہیں۔ آپ کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ میدانِ جنگ کے پیچھے خواتین کے کیمپ کی پاسبانی آپ کے سپرد تھی۔ یکایک معلوم ہوا کہ دشمن کا کوئی جاسوس کیمپ کے قریب موجود ہے۔ خواتین نے آپ کو توجہ دلائی تو آپ نے کانوں پر ہاتھ دھرے کہ یہ کام میرے کرنے کا نہیں ہے۔ بالآخر خواتین نے خود ہی ہمت سے کام لیا اور دشمن کو چوبوں سے مار ڈالا۔

لیکن واقعہ یہ نہیں تھا کہ حضرت حسان رضہ ایمان تو رکھتے ہوں اسلام پر اور شعروں میں بھی ترجمانی اسلام کی کریں لیکن عملاً کوئی اور مسلک اختیار کریں۔ قوائے عمل کی کمزوری اور چیز ہے اور تضادِ فکر و عمل چیزے دگر!

دورِ فاروقی میں معاوضے

آپ کی تصنیف "معاشی ناہمواریوں کا اسلامی حل" زیرِ مطالعہ ہے۔ کتاب نہایت ہی عمدہ پیرائے میں لکھی گئی ہے مجھے ایک مقام پر الجھن سی محسوس ہو رہی ہے۔ آپ ہی اسے بہتر طور پر سلجھا سکیں گے۔

آپ نے ص۱۹۰ پر اسلامی حکومت کے حکام کے بارے میں لکھا ہے۔ "اور بالعموم مجمع عام میں ان کی پابندی کے لئے عہد لیا جاتا تھا۔ وہ شرطیں یہ تھیں کہ ترکی گھوڑے پر سواری نہ کریں گے، باریک کپڑے نہ پہنیں گے، میدے کی روٹی نہ کھائیں گے، دروازے پر دربان نہ رکھیں گے، اور اہل حاجت کے لئے اپنے دروازے ہمیشہ کھلے رکھیں گے۔"

آگے چل کر آپ اسی صفحے پر تحریر فرماتے ہیں "چنانچہ ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر کارکن کے خلاف ایک مرتبہ دربارِ خلافت میں کچھ شکایات آئیں تو ان میں سے ایک یہ تھی کہ ان کے پاس ایک لونڈی ہے جس کو ایسی غذا ملتی ہے جو عام مسلمانوں کو نصیب نہیں ہوتی۔ اتفاق سے باقی الزامات غلط نکلے اور ایک یہی صحیح ثابت ہوا۔ عمل عمرؓ نے لونڈی ان سے الگ کر دی۔"

ص۱۹۱ پر آپ لکھتے ہیں کہ "ایک مرتبہ عیاض بن غنم عامل مصر کے متعلق اطلاع ملی کہ وہ باریک کپڑے بھی پہنتے ہیں اور دروازے پر دربان بھی رکھتے ہیں۔ عامل موصوف کو مرکز میں پکڑ بلوایا گیا، عین اس حال میں کہ باریک

لباس بدن پر موجود تھا۔ حضرت عمرؓ نے وہ لباس اتروا کر گڈریوں کا اونی جبہ پہنوایا اور کہا کہ جاؤ تم جنگل میں بکریاں چرایا کرو، انسانوں پر حکومت کرنے کے تم اہل نہیں ہو۔

اسی صفحے پر آپ نے کوفہ میں سعد بن وقاص کے مکان کی عالیشان ڈیوڑھی کو محض اس وجہ سے جلوا دینے کا واقعہ تحریر کیا ہے کہ وہ مظہر شان و شوکت بے جا تھی۔

یہ تمام باتیں نہایت معقول ہیں اور ان میں شک کرنا گمراہی ہے۔ مگر الجھن اس وقت پیدا ہوتی جب میں آپ کی کتاب تصنیف میں صفحہ ۱۳۳ پر دوسرے پیراگراف کے آخر میں یہ تحریر پاتا ہوں: "۲۰ھ میں جب باقاعدہ طور پر ملتِ اسلامیہ کے جملہ افراد کو سرکاری سپاہ قرار دے کر درج رجسٹر کرایا تو ان کے مستقل معاوضے مقرر فرمائے۔ ان معاوضوں میں زیادہ سے زیادہ کی مقدار ۵۰۰۰ درہم (موجودہ شرح کے حساب سے قریباً ۱۲۵۰ روپیہ) اور کم سے کم مقدار ۲۰۰ درہم (۵۰ روپیہ) تھی۔ بعد میں جب اسلامی ریاست کے مالیات نے مزید ترقی کی تو ان تنخواہوں میں اور اضافہ کیا گیا، ایک طرف افسروں کی تنخواہوں کو ۱۰ ہزار درہم تک بڑھایا گیا اور دوسری طرف کم سے کم معاوضہ پانے والوں کو ۲۰۰ درہم کی بجائے ۳۰۰ درہم دیئے جانے لگے"۔

یہ تو آپ تسلیم کرتے ہی ہیں کہ اسلامی حکومت میں ملنے والے کم سے کم معاوضے یعنی ۵۰ یا ۷۵ روپے اس وقت ان ملازموں کی بنیادی ضروریات کے لئے کافی ہوتے تھے یعنی اتنے معاوضے میں وہ اچھا کھانا کھا سکتے تھے، صاف ستھرے کپڑے پہن سکتے تھے، اور ایک اوسط درجہ کے مکان میں رہ سکتے تھے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ۷۵ روپے ایک اوسط درجے کی زندگی کے لئے ٹھیک تھے تو پھر خلافتِ راشدہ میں افسروں کو ۲۵۰۰ اور ۵۰۰۰ روپے کیوں دیئے جاتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ ان کو اپنی صلاحیت (Efficiency) قائم رکھنے کے لئے عام ملازموں سے اونچے معیارِ زندگی کی ضرورت تھی مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ۳۳ گنا!

آپ ہی نے صفحہ ۱۴۲ پر ایک حدیث نقل کی ہے کہ: "جو ہمارا (حکومت کا) ملازم ہو، اگر اس نے شادی نہ کی ہو تو شادی کرے، اور اگر اس کے پاس کوئی خادم نہ ہو تو خادم رکھے، اور اگر اس کے پاس مکان نہ ہو تو مکان بنوا لے، جو اس حد سے آگے بڑھے وہ خائن ہے یا چور ہے"۔

اس حدیث کے منشا کے مطابق گھر میں کچھ ملازم رکھنا، اوسط درجے کا کھانا کھانا، اوسط درجے کا کپڑا پہننا اور اوسط درجے کا مکان بنوانا اور اس قابل ہونا کہ اپنے بال بچوں کی اچھی طرح پرورش کر سکے، یہ وہ حد ہے کہ جس سے آگے نہیں بڑھنا چاہیے۔ اس حد کی قیمت آپ ۱۵۰ روپے مقرر کر چکے ہیں (اسلامی حکومت میں معمولی سے معمولی آدمی کو بھی ۷۵ روپے ملتے تھے اور یہ اس کی بنیادی ضرورت کے لحاظ سے تھے) تو جب اس حدیث کے مطابق ۱۵۰ روپے وہ حد ہے جس سے آگے بڑھنے والا چور ہے تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسلامی حکومت افسروں کو ۲۵۰۰ بلکہ ۵۰۰۰ درہم کیونکر دیتی تھی۔ یہ تو ممکن ہے کہ اس حد سے اعتدال کے ساتھ تجاوز کیا جائے، یعنی افسروں کو ۵۰۰ روپے تک، مگر ۲۵۰۰ تو اس سے غیر معتدل تجاوز معلوم ہوتا ہے۔

بہرحال اگر ہم اس حدیث کی روشنی میں اسلامی حکومت کی تنخواہ بندی کی مذکورہ بالا پالیسی کو اختیار کریں تو چپراسی کو ۱۵۰ اور

افسران کو ..... ۵ روپیہ) کی حکمت واضح کر دیجئے مجھے یقین ہے کہ خلافت راشدہ کا یہ عمل کسی نہ کسی مصلحت پر مبنی ہوگا مگر وہ مصلحت کیا ہے؟ ——— یہ آپ ہی سمجھا دیں تو بہتر ہے!

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جو حدیث میرے لئے مرکز استدلال تھی، وہ اپنے مفہوم میں یقیناً قطعی ہے۔ اس کا منشا صاف طور پر یہ ہے کہ معاوضوں کی بنیادی پالیسی بہرحال اسی نظریے پر بنائی جانی چاہیے کہ حکومت اپنے کارکنوں کی ضروریات پوری کرنے کی ذمہ دار ہے، لیکن بعض دوسرے امور ایسے ہیں کہ جو اس حدیث کی دی ہوئی بنیادی پالیسی کے ساتھ معاوضوں کے تعین میں نظر انداز نہیں کئے جا سکتے۔

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پورا دور ایسا تھا کہ اس میں کبھی بھی کارکنان حکومت اور مجاہدین کی ایسی کفالت نہیں کی جا سکی کہ جسے اس معاشی دور کے لحاظ سے بھی معیاری کہا جا سکے۔ آہستہ آہستہ مالیاتی ارتقا کے ساتھ ساتھ معاوضوں اور وظائف میں بھی ارتقا ہوتا رہا اور دور عمر رضی اللہ عنہ میں کفالت کا نظم قابل اطمینان سطح پر پہنچ گیا۔

دور فاروقی میں ریاست کی مالیات کی مدات آمد میں نہایت تیز رفتاری سے اضافہ ہو رہا تھا۔ چنانچہ اس زمانے کے حالات میں رفاہ عام کے جو جو تقاضے حکومت کے سامنے آئے ان کو بوجوہ احسن پورا کیا گیا، لیکن آمدنی پھر بھی بہت تھی۔ بجٹ سسٹم تو تھا ہی نہیں، آمدنی کو ساتھ ساتھ خرچ کرنے کا دستور رائج تھا، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے معاوضوں اور وظائف میں خوب اضافے کئے۔

اتنے بڑے جن آدمیوں کو پانچ ہزار درہم دیئے گئے، ان کی تعداد غالباً تین چار افراد سے زیادہ نہ ہوگی اور دس ہزار درہم تو دینے کی مثال غالباً صرف ایک ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خاص معاوضے خاص حالات کے تحت دیئے گئے، وہ خاص حالات کیا تھے؟

اموال کثیر کی آمد کا نتیجہ یہ تھا کہ جن بڑے بڑے کارکنوں کے ہاتھوں سے ہزاروں لاکھوں روپیہ روز گزرتا تھا ان کے ایمان و دیانت کے لئے بہت بڑی آزمائش پیدا ہو گئی تھی۔ ان کے بعد کے لوگوں کی یہ مالیاتی آزمائش دور نبوی صلعم کے کارکنوں کے مقابلے میں زیادہ بھاری تھی۔ حضرت عمرؓ نے اس آزمائش کا خاص لحاظ فرمایا اور پھر اچھے تربیت یافتہ صحابیوں اور کم تربیت یافتہ کارکنوں میں فرق کیا۔ جن کم تربیت یافتہ کارکنوں کو بڑی بڑی مالیاتی ذمہ داریاں سونپی گئی تھیں (اور ان کو ذمہ داریاں سونپنے میں دوسرے اہم مصالح پیش نظر تھے) ان کو آزمائش میں پورا اترنے کے لئے نسبتاً زیادہ معاوضے (یا وظائف) عطا کئے گئے۔ یہ استثنائی واقعات ہیں اور ان کے لئے حضرت عمرؓ نے نبی صلعم کی اس حدیث کے سامنے ہونے کے باوجود اجتہادی طور پر خاص پالیسی اختیار کی تھی، اور یہ پالیسی بجائے خود برحق ہے!

میرا خیال ہے کہ اس مسئلہ میں اب اس سے زیادہ غور و فکر کی ضرورت نہیں ہوگی!

خالص تفریحی کھیل

کیرم کھیلنا بھی کیا جوئے کی تعریف میں آتا ہے اور شرعی احکام سے اس کی ممانعت ثابت ہوتی ہے؟ اگر کسی فرد کو دیگر مشاغل اختیار کرنے کی فرصت نہ ہو تو کیا وہ کبھی کبھار چند منٹ اس کھیل پر صرف کر کے تکان دور کر سکتا ہے؟

ہمیشہ یہ ممکن نہیں ہوتا کہ تھک کر کام سے اٹھنے والا شخص ورزشی کھیلوں میں شریک ہو سکے یا مطالعہ میں لگ جائے، یا لوگوں سے مذاکرات کرتا رہے! یا از راہ آرام کا وقت سو کر یا لیٹ کر یا محض بیٹھے بیٹھے گزار دے۔ بعض حالات میں میز پر کھیلوں (In door games) کی طرف میلان ہوتا ہے کیا ایسے تمام کھیل

مسلمان کے لئے یکسر حرام ہوں گے؟

کیرم یا دوسرے میز پر کھیلوں میں سے کوئی بھی اس وقت تک جوئے کی تعریف میں نہیں آتا جب تک کہ اس میں پیسے کا عنصر شامل نہ کیا جائے یعنی کھیل کی جیت ہار کے ساتھ جب مال کی جیت ہار شامل ہو جائے گی تو وہ قماربازی میں شمار ہوگا ورنہ نہیں!

ان کھیلوں کی حرمت تو بہر حال ثابت نہیں۔ ان کے بارے میں جو احکام بھی ملتے ہیں وہ اجتہادی ہیں۔ اور اجتہادی آراء اس بارے میں دوگونہ ہیں، کچھ لوگوں نے یوں سوچا ہے کہ اس دنیا میں انسانی زندگی ایک بہت ہی محدود مدت کے لئے ہے اور وہ بھی امتحانی زندگی ہے جس طرح کمرۂ امتحان میں بیٹھے ہوئے طالب علم کا اپنے مقررہ وقت میں سے ایک منٹ بھی رائگاں جانے دینا اور فضولیات میں صرف کرنا حماقت ہو گی۔ اس طرح زمین کے کمرۂ امتحان میں کسی خلیفۃ اللہ کا اپنے وقتِ امتحان کا کوئی حصہ رائگاں جانے دینا بھی حماقت ہے۔ آدمی اپنے ایک ایک لمحہ کو کیوں نہ پوری طرح آخرت کے لئے کمائی کرنے میں صرف کرے تاکہ مستقل زندگی میں کام آنے والی پونجی میں اضافہ ہو!

اس طرزِ فکر پر جن اہلِ علم نے سوچا ہے انہوں نے ایسے تمام کھیلوں کو جو محض تفریح کا ذریعہ ہیں اور کوئی دوسری افادیت ذہن یا جسم کے لئے نہیں رکھتے قرآن کے اصطلاحی لفظ "لغو" کی تعریف میں داخل کیا ہے —— یعنی فضولیات —— اور جو چیز لغو ہو قرآن اس سے مسلمان کو باز رکھنا چاہتا ہے۔ (وھم عن اللغو معرضون! —— واذا مروا باللغو مروا کراما)۔

اس طرزِ فکر کے تحت تفریحات صرف وہ جائز ہیں جن میں افادیت کا کوئی نمایاں پہلو موجود ہو۔ مثلاً ورزشی کھیل، سیر، مطالعہ، بیوی بچوں سے دل لگی وغیرہ!

دوسرا طرزِ فکر یہ ہے کہ تفریح فی نفسہٖ اگر حرام نہ ہو تو وہ بجائے خود افادیت رکھتی ہے، لہذا اسے قطعی ناجائز تو ٹھہرایا نہیں جا سکتا۔ چنانچہ اگر حافظہ چوک نہیں رہا تو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے مثلاً، شطرنج کھیلنے کو جائز قرار دیا ہے۔ لیکن ان جیسے کھیلوں کی دنیا میں جو مفاسد عام طور پر پائے جاتے ہیں، امام موصوف کے نزدیک شریعت ان مفاسد کے ساتھ انہیں جائز نہیں قرار دے سکتی۔ مثلاً اگر کھیل کا نشہ یا لیسے ہی دوسرے فرائض میں حائل ہونے لگے، یا وہ جھگڑے اور بدزبانی کا موجب ہو، یا اس میں قمار کی آمیزش ہونے لگے تو اس کا جواز ان مفاسد کی وجہ سے عدم جواز میں بدل جائے گا۔

آپ میرا ذاتی تجربہ بھی پیشِ نظر رکھئے۔ بیٹھے کھیلوں میں سے جس پر میری للچائی ہوئی نگاہیں ابتدائی عمر میں پڑیں وہ شطرنج تھی۔ لیکن گاؤں میں جس قسم کے لوگ اس کھیل کو کھیلتے تھے اور جس طرح کی محفلیں جما کر جن موقعوں پر کھیلتے تھے اور کھیل میں جو جو بولیاں وہ بولتے تھے، ان سے مجھے طبعاً کراہت محسوس ہوتی تھی۔ چنانچہ طبیعت اس پر تیار نہ ہو سکی کہ ایسے لوگوں سے اس کھیل کا درس لیا جائے یا ان کے ساتھ مل کر کھیلا جائے یا پاس بیٹھ کر ان کو کھیلتے دیکھا ہی جائے۔ ایسے حالات میں یہ حسرت مدتوں دل میں دبی رہی۔ یہاں تک کہ جب ایک موزوں دوست بہم پہنچ گئے تو بصد شوق ان کی شاگردی اختیار کر لی، اور کھیل کے لئے ایک اور مستقل ساتھی بھی اپنے ذوق کے مہیا ہو گئے۔ بساط اور مہروں کا ایک نفیس سیٹ بھی استاد صاحب کی طرف سے ہدیۃً ملا۔ اور کوئی چھ آٹھ مہینے تک یہ سلسلہ جاری رہا ہوگا۔

یہ تو اب یاد نہیں آرہا کہ نمازوں میں اس کی وجہ سے تاخیر پیدا ہوئی تھی یا نہیں، البتہ اتنا ضرور یاد ہے کہ گھر کے بعض ضروری کام بے جا طور پر محض کھیل کی وجہ سے موخر کر دیئے جاتے تھے اور دوسرے یہ کہ ایک دن کھیل ختم کرنے کے بعد سے لیکر اگلے دن کھیل کا مقررہ وقت تقریباً معین تھا، آنے تک دماغ کھیل کا نیا نقشہ اور نئی چالیں سوچنے میں مصروف رہتا تھا۔

اس تجربہ کے پیشِ نظر جب میں نے اپنے آپ کو ہمہ تن تحریکِ اسلامی کی خدمت کے لئے وقف کرنے کا فیصلہ کیا تو مجھے اس تفریح کے جاری

رکھنے میں کراہت محسوس ہوئی اور ضمیر کے مفتی کو اس کے حق میں مطمئن نہ کر سکا! چنانچہ میرا دل پسند کھیل بھی دوسرے متروکات کے ساتھ طاق ماضی کی زینت بن گیا!

میرا رجحان دوسرے بیٹھے کھیلوں کے بارے میں بھی اپنی حد تک اسی طرح کا ہے۔ لیکن پچھلے دنوں ایک صاحب نے اس موضوع پر گفتگو کی۔ اور دریافت کیا کہ کیا اس طرح کے کھیل کبھی کبھار کھیل لینے کی بھی شرعاً گنجائش نہیں ہے جبکہ آدمی بسا اوقات کام سے تھک چکتا ہے اور کام میں دلچسپی پیدا کرنے سے بھی وہ تکان دور کر لینے کے مقام پر نہیں ہوتا۔ تو جواب دینے میں مجھے بہت تامل ہوا۔ یہ تامل اب تک باقی ہے۔ ان کھیلوں کو حرام میں کہہ نہیں سکتا اور ان کو جائز بلا کراہت ماننے پر بھی طبیعت تیار نہیں ہے۔

اب آپ کے سوال کے جواب میں میں اوپر کے دو نقطہ ہائے نظر ہی آپ کے سامنے رکھ دینے پر اکتفا کر رہا ہوں۔ ان دونوں کو سامنے رکھئے اور پھر دل کے مفتی سے ہی تنہائی پوچھئے!

بقیہ ادب اور زندگی

زندگی شاندار، موثر اور فقرہ ... ہو جائے، اس لئے ضروری ہے کہ جملہ انسانی آرٹ کو اس مقصد عظمیٰ کے ماتحت رکھا جائے اور جو شے زندگی کو حسین تر، اقتدو فی عطا کرے اسی قدر اعلیٰ اور اشرف خیال کیا جائے۔ بلند ترین آرٹ وہ ہے جو ہمارے اندر خفتہ قوت ارادی کو بیدار کر دے تاکہ ہم زندگی کی مشکلات کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کر سکیں۔ وہ تمام علوم جو خواب آور ہیں جو ہمیں ان حقائق گرد و پیش سے غافل کر دیں جن کے حصول پر زندگی کا انحصار ہے، وہ زوال، بربادی اور موت کا پیغام ہیں۔ آرٹ وہ ہے جو ہمارے اندر بیداری کی روح پھونکے، نہ وہ کہ جو ہم پر حالتِ سکر طاری کر دے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ آرٹ کا انتہائے مقصود خود آرٹ ہے وہ نادانستہ طور پر ہمیں گمراہ کرنے اور ہماری زندگی اور توانائی کو فنا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمارے لئے از بس ضروری ہے کہ ہم ایسے نادان دوستوں سے ہوشیار رہیں۔"

"ادب برائے زندگی" کے متعلق عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس میں لطافت اور حسن و جمال سے محظوظ ہونے کی گنجائش بہت کم ہے گویا یہ ایک بے جان اور خشک سا ادب ہے۔ یہ ایک بہت بڑی غلطی ہے، جس کے پھیلانے میں خود اس ادب کے علمبرداروں کی کوتاہیوں (LIMITATIONS) کا بھی حصہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس ادب میں رنگینی و لطافت اور حسن و جمال کے لئے بڑی گنجائش (SCOPE) ہے۔ یوں تو جلال و جمال کوئی الگ الگ چیزیں ہی نہیں جیسی عموماً سمجھی جاتی ہیں۔ جلال آمیز جمال دراصل حُسن کا اعلیٰ ترین مقام ہے ؎

میری نظر میں یہی ہے جمال و زیبائی
کہ سر بسجدہ ہیں قوت کے سامنے افلاک

یعنی عزم، تمانہ، جرأت مردانہ، سعی مسلسل اور عمل پیہم خود بے حد حسین و جمیل اور دلکش ہیں اور یہی "ادب برائے زندگی" کا عنصر غالب ہیں۔ اس کے علاوہ جمال فطرت میں روح کی تازگی اور مسرت کا بے پایاں سامان مل سکتا ہے۔ ہمارا اردو ادب یقیناً اس میدان میں ابھی تک بہت پیچھے ہے۔ لیکن دوسری قوموں کے ادب میں جمال کا سب سے بڑا سرچشمہ یہی فطرت (صحت مند ...) ہی ہے۔ اسی جمال سے لذت اندوز ہونا اس ادب میں ہرگز ممنوع نہیں ہے۔ علاوہ بریں ایسا بیان حسن انسانی اور ایسا اظہار خلوص و محبت و شیفتگی جس کا مجموعی اثر ذہن انسانی پر اخلاقی طور پر مُضر نہ پڑے بلکہ جہاد و تعمیر کا عزم ... محمود ہے۔ اور ناروا نہیں روا ہے۔

روح افزا
صحت بخش
سب سے اچھا شربت
ROOHAFZA

کیا کمیونزم محض معاشی نظام ہے ۔ یا اس کا کوئی تعلق مذہب
اخلاق سے بھی ہے ۔ اشتراکیت کی تجربہ گاہ میں مذہب
واخلاق کی کیا قدر و قیمت ہے اور اس تجربہ گاہ میں مذہب
اخلاق ۔ ادب ۔ عائلی زندگی وغیرہ کے متعلق جو نئی قدریں
VALUES قائم ہوتی ہیں ۔ اُن کی حقیقت کیا ہے ۔
ان سوالات کے جواب کے لئے
اِشتراکیت مذہب اور اخلاق
مباحث :
یورپ میں الحادی فکر کا ارتقا
مذہب کارل مارکس اور اینجلس کی نظر میں
مذہب لینن کی نظر میں
مسلم ایشیا پر الحادی یلغار
اشتراکیت اور اخلاقِ انسانی
اشتراکی ادب اور مذہب اور اخلاق
مکتبہ چراغِ راہ ۔ ۹ لوٹیا بلڈنگ رام باغ روڈ کراچی
ہندوستان میں ترسیل زر کا پتہ

ہم مطالبہ کرتے ہیں

کہ

دستور ساز اسمبلی پاکستان کا نیا دستور سنہ ۱۹۵۲ء کے ختم ہونے سے پہلے بنا دے

جس میں حسب ذیل امور کی قطعی صراحت ہو۔

۱ — ملک کا قانون اسلامی شریعت ہوگی۔

۲ — کوئی ایسی قانون سازی نہ کی جائے گی جو شریعت کے احکام یا اصول کے خلاف ہو۔

۳ — تمام ایسے قوانین کو منسوخ کیا جائے گا جو شریعت کے احکام یا اصول سے متصادم ہوں۔

۴ — حکومت کا یہ فرض ہوگا کہ ان برائیوں کو مٹائے جنھیں اسلام مٹانا چاہتا ہے اور ان بھلائیوں کو فروغ دے جنھیں اسلام فروغ دینا چاہتا ہے۔

۵ — لوگوں کے شہری حقوق (تحفظ جان و مال، آزادی تحریر و تقریر، آزادی اجتماع اور آزادی نقل و حرکت) کو، ان کا جرم کھلی عدالتوں میں ثابت کئے بغیر اور انھیں صفائی کا موقعہ دیئے بغیر سلب نہ کیا جائے گا۔

۶ — لوگوں کو حق ہوگا کہ انتظامیہ یا مقننہ اگر اپنے حدود سے تجاوز کرے تو وہ ملک کی عدالتوں سے چارہ جوئی کر سکیں۔

۷ — عدلیہ انتظامی حکومت کی مداخلت سے آزاد ہوگی۔

۸ — حکومت اس بات کی ضامن ہوگی کہ ملک میں کوئی شخص بنیادی ضروریاتِ زندگی غذا، لباس، مکان، علاج اور تعلیم سے محروم نہ رہے۔

ان امور کی صراحت کے بغیر کوئی دستور ہمارے لئے قابلِ قبول نہ ہوگا۔

نوٹ:۔ اگر آپ اس مطالبے سے اتفاق رکھتے ہیں اور یہ آپ کا اپنا مطالبہ ہے
تو اس پر دستخط کر کے صدر دستور ساز اسمبلی کے پاس بھیج دیجئے

جماعتِ اسلامی پاکستان

Only Title Printed at SHAN ELECTRIC PRESS Arambaugh Road, Karachi.
Printer & Publisher Ghulam Mohammed M. Chaudhri